عظیم کتب سیریز 7
عظیم طاقتوں کا عروج و زوال
تصنیف: پال کینیڈی
ترجمہ: ڈاکٹر محمود الرحمٰن
BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION
نیشنل بک فاؤنڈیشن

عظیم طاقتوں کا عروج و زوال

تصنیف: پال کینیڈی

عظیم کتب سیریز (٦)

عظیم طاقتوں کا عروج و زوال

(عالمی تاریخی تنقید کی جدید ترین شہرۂ آفاق کتاب)

تصنیف

پال کینیڈی

ترجمہ

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

ادارۂ فروغِ قومی زبان
اسلام آباد

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

نگران	:	ڈاکٹر انعام الحق جاوید
ترجمہ	:	ڈاکٹر محمود الرحمٰن
فنی تدوین	:	ڈاکٹر عطش دُرّانی
اشاعت	:	جون، 2017ء
تعداد	:	1000
کوڈ نمبر	:	GNU-621
آئی ایس بی این	:	978-969-37-1014-4
طابع	:	ملٹی کلر
قیمت	:	-/320 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:

ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk یا فون: +92-51-9261125

یا ای میل: books@nbf.org.pk

ترتیب

صنعتی انقلاب سے قبل دنیا کی عسکری حکمت عملی اور معیشت

صنعتی دور میں فوجی حکمت عملی اور اقتصادیات

عظیم طاقتوں کا عروج و زوال

دفاعی حکمت عملی اور اقتصادیات

آج اور کل

پیش لفظ

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے پاکستان میں فروغِ مطالعہ وکتب بینی کے لیے جو اقدامات کیے جارہے ہیں، منتخب، مقبول، بنیادی، ضروری اور سستی کتابوں کی اشاعت اس کا ایک حصہ ہے۔ شعروادب اور علوم وفنون کی دنیاؤں سے عمدہ انتخاب کرکے کتابوں کی اشاعت کو عام آدمی کی قوتِ خرید اور رسائی تک لے کر جانا اِس ادارے کا بنیادی فریضہ ہے۔

اس ضمن میں کتابوں کی اشاعت کے لیے بہت سے سلسلے جاری کیے گئے۔ مقبولِ عام بنیادی اور عظیم علمی کتابوں کا یہ سلسلہ بھی اسی کی کڑی ہے۔

کافی عرصہ قبل ادارۂ فروغِ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) اسلام آباد نے عظیم کتب کی اشاعت کا ایک منصوبہ بنایا تھا جس میں سے پچاس کے قریب اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ بڑے عرصے سے ان میں سے بعض مطلوب کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ اب نیشنل بک فاؤنڈیشن اور ادارۂ فروغِ قومی زبان کے ''قومی تاریخ وادبی ورثہ ڈویژن'' کے ماتحت آنے کے بعد وزیرِاعظم پاکستان کے مشیر جناب عرفان صدیقی کی تحریک پر نئی منصوبہ بندی کے تحت ادارۂ فروغِ قومی زبان کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد ان کتابوں کو فروغِ مطالعہ کے ضمن میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے۔ کتابت کی عکسی نقل اور سائز کو برقرار رکھا گیا ہے، البتہ پیش کش ذرا انداز بدل کر کی جارہی ہے۔

صنعتی انقلاب کے اثرات کے بعد جدید عالمی تہذیب وتاریخ پر زوالِ سلطنت روما اور زوالِ مغرب جیسی ایک اور معروف اور مقبول کتاب جس میں تنقیدی اور اصولی بحث کی گئی ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ معروف سکالر اور مترجم ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کیا ہے۔

میں جناب ثاقب علیم (ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغِ قومی زبان)، محترمہ تحسینہ جہان (ایگزیکٹو ڈائریکٹر)، محترمہ انجم حمید (ڈائریکٹر مطبوعات) اور جناب شکیل احمد منگلوری (ڈپٹی ڈائریکٹر مطبوعات) کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لیے معاہدے کی تیاری میں معاونت کی اور متعلقہ مواد

فراہم کیا۔

مئی 1998ء کے ایڈیشن میں شائع شدہ جناب افتخار عارف کا دیباچہ اور ڈاکٹر عطش دُرّانی کی تقدیم کو بھی شامل اشاعت ہی رکھا گیا ہے۔ کتاب پیپر بیک میں شائع کی جا رہی ہے تاکہ یہ قارئین کے ذوقِ مطالعہ اور بک شیلف کا حصہ بننے کے لیے کم سے کم قیمت میں دستیاب ہو سکے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمنس)
مینیجنگ ڈائریکٹر

دیباچہ

تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب و تمدن انسانی کے ارتقاء میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ انسانی دانش و بینش کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ دانش انسانی نے فہم و ادراک کی حدود مقرر کی ہیں، علوم و فنون کو نئے زاویے عطا کیے ہیں اور فضیلت کے ان عظیم الشان کارناموں کو چند ایسی کتابوں کی صورت میں یادگار بھی چھوڑا ہے جو ان علمی فتوحات کے سبب خود بھی بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان گراں مایہ آثار نے اپنے زمانے میں بھی اور اپنے بعد آنے والے زمانوں میں بھی ذہن انسانی کے ارتقاء میں جو کردار ادا کیا ہے صاحبان علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ہر چند کہ یہ کتابیں مختلف اقوام کا سرمایہ اور ورثہ ہیں اور مختلف زبانوں میں معرض وجود میں آئی تھیں لیکن اپنی اہمیت اور اثر و نفوذ کے سبب تراجم کے ذریعے دنیا کی دوسری تہذیبوں اور زبانوں میں بھی منتقل ہوئیں اور یوں حیات جاوداں کی منزلوں سے بہرہ ور ہو گئیں۔ اب یہ عالمی سطح پر علم و دانش کا اجتماعی سرمایہ ہیں۔

اردو زبان کے فروغ کے لیے تراجم کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اس زبان کے علمی دنیا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی کر لیا گیا تھا۔ فروغ اردو کے اداروں نے تراجم کو ہمیشہ اولین صف میں رکھا ہے چنانچہ اردو نثر کی تاریخ میں جتنا حصہ اہم طبع زاد تحریروں کا ہے کم و بیش اتنا ہی سرمایہ تراجم کا بھی ہے۔ تراجم کے بغیر شاید اردو زبان علمی موضوعات کی ان وسعتوں اور بلندیوں سے

ہمکنار نہ ہو سکتی جن پر وہ آج نظر آتی ہے۔ اردو تراجم کی تاریخ میں بعض کارنامے تو تخلیقی ادب کے ہم پایہ نظر آتے ہیں اور یہ مقام حاصل کرنا کسی بھی زبان کے لیے بڑے اعزاز اور عظمت کی بات ہے۔

اسی دیرینہ روایت کے تسلسل میں قیام پاکستان کے جشن طلائی کے موقع پر مقتدرہ قومی زبان نے پچاس ایسی کتابوں کے اردو تراجم شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جن کا شمار مختلف علوم کے حوالے سے دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے۔ زیر نظر کتاب "عظیم طاقتوں کا عروج و زوال" اسی سلسلے کی ایک تصنیف ہے جس کے مصنف دورِ حاضر کے معروف مؤرخ اور مفکر پال کینیڈی ہیں۔ اس کا ترجمہ ممتاز محقق ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کیا ہے۔

—— افتخار عارف

جدید تاریخ نویسی کا شاہکار

پال کینیڈی کی یہ تصنیف جدید تاریخ نویسی کا ایک بہت بڑا شاہکار ہے جو مقبول عام واقعاتی تاریخ کے انداز سے ہٹ کر تاریخی مسائل کے تجزیے اور مستقبل کے رجحانات کے جائزے پر مبنی ہوتی ہے۔ اپنے چھپنے کے بعد یہ کتاب اہل فکر و نظر کے حلقے میں اس قدر مقبول ہوئی کہ دنیا کے اکثر ممالک میں اسے کئی بار طبع کیا گیا۔

پال کینیڈی ییل یونیورسٹی میں ۱۹۸۳ء سے تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے آکسفورڈ سے ڈی فل کی ڈگری حاصل کی تھی اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۳ء تک ایسٹ اینجلیا یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ وہ آکسفورڈ کے تھیوڈور ہیوس ریسرچ فیلو اور پرنسٹن یونیورسٹی میں وزٹنگ فیلو بھی ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب "اکیسویں صدی کی تیاری" بھی قابل مطالعہ ہے۔

زیر نظر کتاب کو دنیا کے اکثر اہل علم نے تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا ہے اور ان کے خیال میں ٹائن بی کے بعد ایک اور شخص اُبھرا ہے جس نے جدید اور معاصر تاریخ نویسی کو اُس کے دقیق پہلوؤں اور باریک نکتوں کے حوالے سے دیکھا ہے۔ بعض عالمی رسالوں اور جریدوں نے اس کتاب کو ایک "رزمیہ" قرار دیا ہے اور بعض کے نزدیک یہ مستقبلیات کی اہم بنیاد ٹھہرتی ہے۔

سپینگلر کی "زوالِ مغرب" کے بعد یہ ایسے ہی موضوع پر دوسری اہم کتاب ہے جس میں جزئیات رسی سے مستقبل کی آئینہ نمائی کرنے اور ایک عالم اور محقق کے نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے دقت نظر کے ساتھ اس تاریخی فلسفے پر مبنی ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنے

کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ان کا ترجمہ بہت حد تک مصنف کے مقاصد کے قریب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے رواں اسلوب قائم رکھنے کی کوشش بھی کی ہے جس سے مفہوم کے ابلاغ میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ اس حوالے سے ترجمہ بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ترجمہ اُن قارئین کے لیے پیش خدمت ہے جن کی رسائی میں اصل انگریزی کتاب نہیں۔

ڈاکٹر عطش درانی
(تمغۂ امتیاز، ستارۂ امتیاز)

تعارف

یہ کتاب نشاۃ ثانیہ کے بعد کے زمانے' یعنی آج کے جدید دور کی قومی اور بین الاقوامی طاقت کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ اس میں اس حقیقت کا پتہ چلانے اور اس امر کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ پانچ صدیوں میں' یعنی جب سے مغربی یورپ کی "نئی شہنشاہیت" کا قیام عمل میں آیا اور سمندر پار ریاستوں کا عالمی نظام قائم ہوا' متعدد بڑی طاقتیں ایک دوسرے کی مناسبت سے کس طرح عروج و زوال سے دو چار ہوئیں۔ اس تصنیف میں ان اہم جنگوں کا ذکر ناگزیر تھا جو بڑی طاقتوں کے باہمی اشتراک سے لڑی گئیں اور عالمی نظام پر جن کے اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ کتاب مطلقاً" فوجی تاریخ کے بارے میں نہیں ہے۔ اس میں ان تبدیلیوں کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی گئی ہے جو ۱۵۰۰ء سے عالمی اقتصادی توازن میں رو نما ہوتی رہی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کتاب براہ راست ایک اقتصادی نوعیت کی تاریخ بھی نہیں ہے۔ اس کا تمام تر موضوع اقتصادیات اور فوجی حکمت عملی کے باہم دگر عمل پر محیط ہے' کیونکہ آج بین الاقوامی نظام میں ہر ممتاز ریاست اپنی دولت اور طاقت کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہی ہے اور اس کی وجہ محض اتنی ہے کہ اسے امیر ترین اور طاقت ور ترین بن جانے (اور پھر بدستور قائم رہنے) کی خواہش دامن گیر رہی ہے۔

"فوجی تصادم" جس کا اس کتاب کی ایک ذیلی سرخی میں حوالہ دیا گیا ہے' اس کا "اقتصادی تبدیلی" کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور میں کسی بھی عظیم طاقت کی فتح یا کسی دوسرے کا زوال دراصل اس کی افواج کی طویل معرکہ آرائی ہی کا نتیجہ رہا ہے۔ بایں ہمہ' دوران جنگ ریاست کے اقتصادی وسائل کا کم و بیش استعمال بھی اس کا سبب بنا ہے۔ مزید برآں' حقیقی جنگ وجدال کے پہلے کے عشروں میں ریاستی اقتصادیات میں جو اتار چڑھاؤ ہوتا رہا' وہ بھی ایک نمایاں وجہ ثابت ہوا۔ ان ہی اسباب و عوامل کی بنا پر اس تحقیقی مطالعہ کے لیے دوران امن کسی عظیم طاقت کی حیثیت میں بتدریج تبدیلی اتنی اہم ہے جتنی اہم دوران جنگ میں اس کی شمولیت!

ابھی ابھی جو استدلال پیش کیا گیا ہے' اس کا کتاب کے متن میں کما حقہ احاطہ کیا جائے گا' لیکن یہاں اس کا اجمالاً" تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

عالمی امور کے معاملے میں ممتاز اقوام کی متعلقہ صلاحیت کار کبھی بھی پائیدار نہیں رہی۔ اس کی نمایاں وجہ مختلف سوسائیٹوں میں پیدائش کی ناہموار شرح اور تکنیکی اور تنظیمی پیش رفت ہے جس سے ایک طبقے کو تو خاصا فائدہ پہنچتا ہے' لیکن دوسرے کو نہیں' مثلاً" ۱۵۰۰ء کے بعد دور مار توپوں سے لیس تجارتی جہازوں کے استعمال اور بحراوقیانوس میں تجارت کے فروغ سے یورپ کی تمام ریاستوں کو یکساں طور پر فائدہ نہیں پہنچ سکا بلکہ مخصوص ریاستوں کو دوسروں کی نسبت زیادہ مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ اسی طرح' بعد میں بھاپ' کوئلہ اور تانبے کے وسائل کی ترقی سے مخصوص ممالک کی طاقت میں تو اضافہ ہو گیا جبکہ دوسروں کی طاقت گھٹ کر رہ گئی۔ جونہی بعض ممالک کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے تو ان کے لئے یہ قدرے آسان ہو جاتا ہے کہ دوران امن وہ وسیع پیمانے پر اسلحہ خریدیں اور دوران جنگ فوجیں اور جنگی بیڑے خود بھی رکھیں اور دوسروں کو بھی فراہم کریں۔ سردست اس طرح کا اظہار خیال یقیناً" غیر مہذب اور کاروباری محسوس ہو گا' لیکن یہ حقیقت ہے جس طرح کسی بھی فوجی طاقت کو مستحکم کرنے کے لیے دولت کی ضرورت

پڑتی ہے اور اسی طرح دولت کے حصول و تحفظ کے لیے عموماً" فوجی طاقت درکار ہوتی ہے۔ تاہم اگر ریاستی وسائل کا معتدبہ حصہ دولت کے حصول کے برعکس فوجی مقاصد پر صرف کر دیا جائے تو اس طرح طویل المیعاد عرصے میں فوجی طاقت کے کمزور پڑنے کے امکانات نمایاں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ریاست فوجی حکمت عملی کے ذریعے اپنے علاقے میں حد سے زیادہ توسیع کر لیتی ہے' یعنی وسیع علاقے پر قبضہ کر لیتی ہے یا ایسی جنگ چھیڑ دیتی ہے جس میں خاصی رقم خرچ ہو رہی ہو---- تو اس صورت میں یہ خطرہ ہے کہ مفتوحہ علاقوں سے حاصل شدہ فوائد کی اہمیت مجموعی اخراجات سے کہیں بڑھ جائے گی---- یہ ایک ایسی ناگفتہ بہ صورت ہے کہ اگر متعلقہ ملک اقتصادی زوال کے دور میں داخل ہو چکا ہے تو خرابی کے مزید بڑھ جانے کا امکان ہے۔ سولھویں صدی میں "عظیم طاقت" کے نظام کے تحت عظیم ملکوں' مثلاً" اسپین' نیدر لینڈز' فرانس' سلطنت برطانیہ اور موجودہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عروج و زوال کی تاریخ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ جہاں ایک طرف پیداواری اور منافع اندوزی کے مابین ارتباط و ہم آہنگی رہی ہے وہیں فوجی طاقت کے فروغ کا رجحان بھی کار فرما رہا ہے۔

عظیم طاقتوں کے عروج و زوال کی کہانی جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہے' اس کا یہاں اجمالاً" ذکر مناسب ہو گا۔ پہلے باب میں ایسے تمام منظر کی جھلک دکھائی گئی ہے جو ۱۵۰۰ء کے گرد گھومتا ہے۔ اس زمانے کے ہر مرکز اقتدار کے استحکام و عیوب کا تجزیہ کیا گیا ہے' مثلاً" منگ چین' سلطنت عثمانیہ اور ہندوستان میں اس کی اسلامی شاخ' یعنی مغلیہ سلطنت' روس' جاپان اور مغربی وسطی یورپ کی مجموعی ریاستیں! سولھویں صدی کے آغاز میں یہ بات کسی طرح بھی عیاں نہ تھی کہ آخرالذکر علاقہ دیگر علاقوں کی نسبت نمایاں مقام حاصل کر لے گا۔ اگرچہ یورپ کے مقابلے میں بعض قدیم مشرقی سلطنتیں کیسی ہی موثر اور منظم رہی ہوں' لیکن یک مرکزی اقتدار کے نتائج کی صورت میں انھیں نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ یعنی اعتقاد اور رسوم کی یکسانیت کا ایسا نظام جو نہ صرف ریاستی مذہب میں جاری و ساری تھا' بلکہ تجارتی مراکز اور فوجی چھاؤنیوں میں بھی دخیل تھا۔ یورپ میں اس طرح کے اقتدار اعلیٰ کے فقدان اور اس کی مختلف سلطنتوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مابین جنگجویانہ رقابت کی وجہ سے فن حرب کو فروغ دینے کی جانب مسلسل توجہ مبذول کی جاتی رہی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ فن حرب میں نئی نئی تکنیک ایجاد ہوئیں اور کاروبار میں بھی توسیع ہوتی رہی۔ اس طرح کاروباری مسابقت کی فضا بھی ہموار ہو گئی۔ اس انقلابی رجحان میں کوئی خاص مزاحمت نہ ہونے کے بدولت یورپی معاشرہ اقتصادی ترقی اور افزوں فوجی اثرات کے نہ رکنے والے ایک لا متناہی چکر میں داخل ہو گیا' جس کے نتیجے میں یہ یورپی معاشرہ بعد ازاں دنیا کے تمام علاقوں پر سبقت بھی لے گیا۔

جہاں تکنیکی تبدیلی اور فوجی مسابقت کی قوت متحرکہ نے یورپ کو پیش قدمی کر کے آگے بڑھ جانے اور زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ جمانے کی راہ پر مزید گامزن کر دیا' وہاں اس بات کا امکان بھی موجود رہا کہ ان میں آپس میں محاذ آرائی کرنے والی ریاستوں میں سے کوئی ایک دوسروں سے آگے بڑھ جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل حاصل کرے گی۔ اور اس طرح وہ اس برعظیم کی حاکم کل بن جائے گی۔ ۱۵۰۰ء کے بعد تقریباً" ۱۵۰ سال تک ہسپانیہ اور آسٹرین ہیبسبرگ کی ماتحتی میں مذہبی رجحان پر مبنی سلسلہ سلاطین ایسا ہی کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ ہیبسبرگ کے حصول اقتدار کے جذبے کے تدارک کے لیے یورپ کی دیگر اہم

ریاستوں نے جو کوششیں کیں' وہ اس کتاب کے دوسرے باب میں مفصل بیان کر دی گئی ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب میں طریقہ کار استعمال کیا گیا ہے' ہر عظیم قوت کی استعداد اور کمزوریوں کا نسبتاً" جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اقتصادی اور تکنیکی تبدیلیاں' جن سے مغربی معاشرہ کلی طور پر متاثر ہوا ہے' بھی پیش نظر رہی ہیں۔ ایسا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قاری اس دور میں رونما ہونے والی کئی جنگوں کے اثرات کو بخوبی سمجھ سکے۔ اس باب کا خاص موضوع یہ ہے کہ ہیبسبرگ شہنشاہوں نے بے پناہ وسائل کے باوجود' پیہم معرکہ آرائیوں میں بتدریج غیر متوازن انداز اپنایا اور دفاعی طور پر اس قدر قد آور ہوگئے کہ ان کی اقتصادی بنیاد ہی ہل کر رہ گئی۔ اگرچہ یورپ کی دوسری عظیم طاقتوں کو بھی طویل جنگوں کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا' تاہم انھوں نے اپنے ہیبسبرگ دشمنوں کے مقابلے میں اپنے قدرتی وسائل اور فوجی طاقت کے درمیان کچھ نہ کچھ توازن برقرار رکھا تھا۔

عظیم قوتوں کی معرکہ آرائیاں جو ۱۶۶۰ء اور ۱۸۱۵ء کے دوران رونما ہوتی رہیں اور تیسرے باب میں جن کا مفصل ذکر کیا گیا ہے' ان کا خلاصہ باسانی پیش نہیں کیا جاسکتااس لیے کہ یہ جھگڑا ایک بہت بڑے بلاک اور اس کے بے شمار مخالفین کے مابین پیش آیا تھا۔ یہ اسی گھمبیر عرصے کی بات ہے کہ جہاں ہسپانیہ اور نیدر لینڈز جیسی سابق بڑی طاقتیں گھٹ کر دوسرے درجے تک آ پہنچی تھیں' وہاں پانچ اہم ریاستیں -فرانس' برطانیہ' روس' آسٹریا اور پروشیا) بتدریج منظر عام پر آئیں اور اٹھارھویں صدی کے یورپ کی سیاست و حرب پر چھا گئیں۔ یہ مشترکہ طور پر طویل جنگوں میں بھی شامل رہیں اور اپنے حلیف بھی تیزی سے بدلتی رہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب فرانس نے پہلے لوئیس چہارم دہم اور بعد ازاں نپولین کی سرپرستی میں یورپ پر اپنا تسلط قائم کر لیا جو اسے نہ پہلے حاصل تھا نہ بعد میں ہوا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض عظیم طاقتوں نے مشترکہ طور اس کے حرکت و عمل پر گہری نگاہ رکھی تھی۔

چونکہ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں فوج اور بحری بیڑے کے انتظام و انصرام پر اخراجات ناقابل یقین حد تک بڑھ چکے تھے' لہٰذا ایسا ملک جہاں بنکاری کا اعلیٰ نظام رائج تھا (مثلاً" برطانیہ) اس نے اپنے پس ماندہ مخالفین کے مقابلے میں اس صورت حال سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے۔ بایں ہمہ متعدد اور متنوع جھگڑوں میں اپنی طاقت کا لوہا منوانے کے لیے اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث بھی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس صورت حال سے یہ حقیقت بخوبی مترشح ہو جاتی ہے کہ ۱۸۱۵ء کے لگ بھگ دو جنگجو صفت ممالک' یعنی روس اور برطانیہ کو آخر کیوں اتنی اہمیت حاصل ہو گئی۔ دونوں نے مغربی وسطی یورپ کی خانہ جنگیوں میں مداخلت کرنے کی استعداد برقرار رکھی جبکہ انھیں جغرافیائی لحاظ سے تحفظ بھی حاصل تھا۔ دونوں نے اٹھارھویں صدی میں وسیع و عریض یورپی دنیا میں اپنے اپنے قدم جما لیے اور ساتھ ہی ساتھ اس امر کی یقین دہانی بھی کراتے رہے کہ براعظم میں طاقت کا توازن برقرار رہے گا۔ آخر کار' مذکورہ صدی کی آخری دہائیوں میں صنعتی انقلاب کے اثرات برطانیہ میں رونما ہونے لگے۔ اس سے بالآخر جو نتائج برآمد ہوئے انھوں نے برطانوی سامراج کی صلاحیتوں کو دو چند کر دیا۔ غرض' اس نے سمندر پار علاقوں میں اپنی نو آبادیات بھی قائم کرلیں اور یورپ پر نپولین کے تسلط قائم کرنے کی کوششوں کو ناکام بھی بنا دیا۔

۱۸۱۵ء کے بعد پوری ایک صدی میں مقابلتاً" طویل جنگوں کا فقدان نظر آتا تھا۔ وہاں ایک ایسا توازن

برقرار تھا جسے یورپ کی تمام اتحادی قوتوں کی حمایت حاصل تھی۔ لہٰذا کوئی ایک ملک بھی نہ تو اس قابل تھا اور نہ ہی ارادہ کرنے کی ہمت کر سکتا تھا کہ وہ دوسروں پر تسلط قائم کر لے۔ ۱۸۱۵ء کے بعد کے عشرے میں حکومت کی تمام تر فکر ملکی عدم استحکام اور (روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حوالے سے) اپنے براعظم کی حدود سے ماوراء مزید توسیعی عزائم تک محدود تھی۔ اس موافق بین الاقوامی منظر نامے نے برطانوی شہنشاہیت کا ایک عالمی طاقت بن کر ابھرنے اور بحری' نو آبادی اور تجارتی معنوں میں عروج حاصل کرنے کا سنہری موقع فراہم کر دیا۔ اپنی صنعتی پیداوار کی بدولت بھی اسے کما حقہ فائدہ حاصل ہوا۔ تاہم انیسویں صدی کے نصف تک دوسرے خطوں میں بھی صنعت و حرفت عروج پانے لگی اور اس طرح بین الاقوامی طاقت کا توازن قدیم اور سربر آوردہ ممالک کے برعکس ان علاقوں کی جانب جھک گیا جو اپنے وسائل اور انتظامی تجربے کی بنا پر پیداوار اور ٹیکنالوجی کے نئے نئے ذرائع کو اپنے تصرف میں لا رہے تھے۔ اس علاقے کے چند اہم جھگڑے مثلاً" کسی حد تک جنگ کریمیا' لیکن خصوصی طور پر امریکی خانہ جنگی اور فرانس و پروشیا کی جنگ۔۔۔۔ ایسے معاشروں کے لیے شکست و ریخت کا سبب بن رہے تھے جو اپنے دفاعی نظام کو جدید سانچے میں ڈھالنے سے قاصر تھے۔ بایں ہمہ اس کے پاس ایسی وسیع صنعتوں کا جال بھی نہیں تھا۔ جو افواج اور ایسے نت نئے ہتھیاروں کی کفالت کرتا جن سے جنگ کی صورت حال یکسر بدل رہی تھی۔

چنانچہ بیسویں صدی کے آتے ہی' بدلتی ہوئی ٹیکنالوجی کی رفتار اور ناہموار پیداواری شرح نے بین الاقوامی نظام کو پچاس سال پہلے کی نسبت زیادہ ناپائیدار اور گھمبیر بنا دیا۔ اس کا مظاہرہ ۱۸۸۰ء کے بعد اس وقت دیکھنے میں آیا جب افریقہ' ایشیا اور بحرالکاہل کے علاقے میں اپنی اپنی نو آبادیاں قائم کرنے کے لیے بڑی طاقتوں کے مابین سخت ہیجانی انداز میں دھکم پیل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو زیادہ منافع خوری تھی' دوسرا سبب یہ تھا کہ ان کی ترقی کا ستارا گردش میں آ گیا تھا۔ یہ صورت حال بھی دیکھنے میں آئی کہ زمینی اور سمندری دونوں طرح کی دفاعی صلاحیتوں میں بے محابا اضافہ کرنے کا رجحان فروغ پا گیا تھا حتیٰ کہ زمانہ امن میں بھی دفاعی اتحاد اس خیال کے تحت رونما ہونے لگے کہ مختلف حکومتیں مستقبل کی ممکنہ جنگ سے تحفظ کے لیے حلیف کی متلاشی تھیں۔ ۱۹۱۴ء سے قبل کے عرصے میں مسلسل نو آبادیاتی جھگڑے اور بین الاقوامی بحران کی جو صورت حال تھی' اس کے باوصف اقتصادی طاقت کی نشو و نما' مشیر کارکردگی عالمی توازن میں زیادہ سے زیادہ بنیادی تبدیلی کا پتہ دے رہی تھی۔ ۔۔۔۔خصوصاً" یورپی عالمی نظام میں جو تین صدیوں تک گھنایا رہا تھا اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باوجود' یورپ کی روایتی عظیم طاقتوں' مثلاً" فرانس' ہنگری اور حال میں متحد ہونے والا اٹلی۔۔۔۔مقابلے میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی جانب جا رہی تھیں۔ اس برعکس ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس کی مختلف براعظمی ریاستیں سبقت لے جا رہی تھیں۔ یہ سب کچھ زار حکومت کی ناکارکردگی کے باوجود عمل میں آ رہا تھا۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں یہ غالباً" جرمنی ہی تھا جو مستقبل کی عالمی طاقتوں کے زمرے میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ دوسری جانب جاپان تھا جو صرف مشرقی ایشیا تک اپنا تسلط قائم کرنے کا خواہاں تھا' اس سے آگے نہیں! نتیجتاً" ان تبدیلیوں نے برطانوی شہنشاہیت کے لیے اچھا خاصا اور گھمبیر مسئلہ پیدا کر دیا۔ اب اس کے لیے اپنا وہ عالمی وقار قائم رکھنا مشکل ہو گیا جو نصف صدی قبل اسے حاصل تھا۔

۱۹۰۰ء کے بعد' پچاس سال کے عرصے میں جو اہم ترقیاں رونما ہوئیں' انھیں ایک ایسی دو قطبی

محوری دنیا کی آمد کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جس کا تمام تر بحران درمیانی درجے کی طاقتوں کا ماحصل تھا۔ (اس کا تذکرہ باب ۶ اور ۷ میں کیا گیا ہے)۔ پورے نظام کی اس کایا پلٹ کو کسی طرح بھی خوشگوار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف زیرو زبر کرنے والی خون آشام پہلی عالمی جنگ سے جہاں صنعتی تنظیموں اور قومی کارکردگی کی بہتری ہوئی' وہاں جرمنی کی شہنشاہیت کو بدلتے ہوئے' مگر پس ماندہ روس کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ فائدے بھی پہنچے۔ اگرچہ چند ماہ کے اندر اندر جرمنی کو مشرقی محاذ پر فتح حاصل ہو گئی مگر مغرب میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے اتحادی ممالک اٹلی' بلقان اور مشرق سے قریب کے میدان جنگ میں ہار رہے تھے۔ بعد میں امریکہ سے حاصل ہونے والی فوجی اور خصوصاً" اقتصادی امداد کی بدولت مغربی اتحادی ملکوں کو بالآخر اپنے مخالف اتحادیوں پر سبقت حاصل ہو گئی۔ بایں ہمہ' یہ طرز عمل تمام متحارب قوتوں کے لیے سعی لاحاصل ثابت ہوا۔ آسٹریا' ہنگری میدان سے رفو چکر ہو گئے۔ روس انقلاب کی لپیٹ میں آ گیا۔ جرمنی کو شکست ہو گئی۔ حتیٰ کہ فرانس' اٹلی اور برطانیہ کو بھی اس فتح میں بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ جاپان اس سے مستثنیٰ تھا۔ اس نے بحرالکاہل کے علاقے میں اپنی طاقت میں مزید اضافہ کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی جو بلا خوف تردید ۱۹۱۸ء میں دنیا کی ایک اہم طاقت بن چکا تھا قابل ذکر ہے۔

۱۹۱۹ء کے بعد کے عرصے میں امریکہ نہایت تیزی سے خود کو غیر ملکی جھمیلے سے الگ تھلگ رکھنے لگا تھا۔ ادھر روس بھی بالشویک حکومت کے تحت سب سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس سے ایک ایسا عالمی نظام وجود میں آیا جو اقتصادیات کی بنیادی حقیقتوں سے غیر متعلق تھا۔ یہ وہ صورت حال تھی جو اس کتاب میں زیر تذکرہ پانچ صدیوں میں کبھی رونما نہیں ہوئی۔ اگرچہ برطانیہ اور فرانس کمزور ہو چکے تھے' پھر بھی سفارت کاری کے میدان میں اپنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے عشرے میں اٹلی' جاپان اور جرمنی جیسی فوجی قوتوں کی حامل اور انقلاب پسند ممالک سے انھیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ ممالک خصوصاً" جرمنی ۱۹۱۴ء سے بھی کہیں زیادہ یورپی قیادت کا گرویدہ بن چکا تھا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہی نہایت طاقتور صنعتی ملک کے طور پر دنیا میں نمایاں نظر آتا تھا اور اسٹالن کی زیر سرپرستی روس بھی نہایت تیزی کے ساتھ ایک صنعتی سپرپاور بنتا جا رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں انقلاب پسند متوسط طاقتوں کو ایک گومگو کی کیفیت سے دو چار ہونا پڑا' یعنی اگر وہ براعظمی جن ان پر مسلط نہیں ہوتے تو انھیں جلد از جلد اپنا علاقہ وسیع کر لینا چاہیے۔ بایں ہمہ' درمیانی درجے کی ان طاقتوں کے لیے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اگر وہ جرمنی اور جاپان کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ایسی صورت میں اس بات کا بہت قوی امکان تھا کہ ان کی قوت کمزور پڑ جائے۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں اتار چڑھاؤ کی جو کیفیت رونما ہوئی اس نے مذکورہ ملکوں کے روبہ زوال ہونے کے خدشات کو مستحکم کر دیا۔ قابل رشک ابتدائی فتح و نصرت کے باوجود' محوری طاقتیں پیداواری وسائل کی غیر متوازن کیفیت کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں' حالانکہ ۱۹۱۴ء۔۱۸ء کی جنگ کے مقابلے میں یہ زیادہ گھمبیر تھی۔ البتہ انھوں نے جو کارنامہ کر دکھایا وہ یا تو فرانس کا انحطاط تھا یا برطانیہ کی ناقابل تلافی کمزوری!۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ یہ بذات خود سپرپاور کے شکنجے میں آ گئیں۔ ۱۹۴۳ء کے آتے آتے اس دو قطبی محوری دنیا کا ظہور ہو گیا جس کے متعلق کئی عشرہ پہلے پیش گوئی کی گئی تھی۔ نیز'

فوجی توازن نے معاشی وسائل کی عالمی تقسیم کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

کتاب کے آخری دو ابواب میں اس زمانے کا جائزہ لیا گیا ہے جب حقیقتاً" دو قطبی محوری دنیا کا فی الواقع وجود تھا' اقتصادی' فوجی اور نظریاتی طور پر اور سرد جنگ کے متعدد بحران کے نتیجے میں سیاسی سطح پر جس کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔ نیوکلیئر ہتھیار اور دور مار میزائلی نظام کے متعارف ہو جانے کے بعد' امریکہ اور روس کے اپنی اپنی حدوں میں عالمی طاقت ہونے کا معاملہ اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں یہ صورت حال سامنے آئی کہ ۱۸۰۰ء تو کجا' ۱۹۰۰ء کے مقابلے میں جنگ کی حکمت عملی اور سفارت کاری کے اصول و آداب میں یکسر تبدیلی واقع ہو گئی۔

عظیم طاقتوں کے عروج و زوال کا عمل ہنوز برقرار تھا' حالانکہ ان کی پیداواری شرح اور متنوع ٹیکنالوجی میں نمایاں فرق قائم تھا' جس کی بنا پر عالمی اقتصادی توازن میں تبدیلی آتی تھی اور جس کے زیر اثر سیاسی اور فوجی نظام متاثر ہوتا تھا۔ ۱۹۶۰ء' ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں امریکہ اور روس دونوں فوجی لحاظ سے صف اول ہی کے حامل رہے۔ چونکہ دونوں اس محوری دنیا میں اور بسا اوقات مانوی اصطلاح میں بین الاقوامی مسائل کے غماز تھے' لہٰذا ان کی رقابت نے انھیں ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی پر اکسایا۔ کوئی اور طاقت ان دونوں کی مماثل نہ تھی۔ انہی عشروں کے دوران عالمی پیداواری توازن پہلی کی نسبت زیادہ تیزی سے بگڑ رہا تھا۔ مصنوعات کے مجموعی ماحصل اور کل قومی پیداوار (GNP) میں تیسری دنیا کا جو حصہ ۱۹۴۵ء کے بعد کے عشرے میں حد درجہ گر چکا تھا' وہ پھر فزوں ہونے لگا۔ جنگ کے زمانے میں یورپ کو جو دھچکا لگا تھا' اس سے اب وہ چھٹکارا پا چکا ہے اور یورپ' یورپی اقتصادی تنظیم کی بدولت دنیا کا عظیم تجارتی رکن بن گیا ہے۔ عوامی جمہوریہ چین بھی نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کی جانب گامزن ہے۔ جاپان کی بعد از جنگ اقتصادی ترقی اس درجہ علامتی رہی ہے کہ بعض شواہد کے مطابق اس کی مجموعی قومی پیداوار حال ہی میں روس سے بھی دو چند ہو گئی۔ اگر موازنہ کیا جائے تو امریکہ اور روس دونوں کی پیداواری شرح خاصی ماند پڑ چکی ہے اور ۱۹۶۰ء کی دہائی کے بعد عالمی پیداوار اور معاشی دولت میں ان کے حصص میں ڈرامائی طور پر کمی آئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کثیر محوری دنیا پہلے سے موجود ہے اور اس کی تصدیق اقتصادی اشاریے کے جائزے سے ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں جنگی حکمت عملی اور اقتصادیات کے مابین رد عمل پر جو تشویش ظاہر کی گئی ہے اس کے پیش نظر یہ مناسب تھا کہ ایک حتمی باب کا اضافہ کیا جائے تاکہ بڑی طاقتوں کے درمیان فوجی توازن اور پیداواری توازن کا جو غیر متصل سلسلہ پایا جاتا ہے اس کا سراغ لگایا جا سکے' نیز موجودہ دور کے سیاسی و اقتصادی طاقت کے پانچ اہم مراکز --- چین' جاپان' یورپی اقتصادی تنظیم' روس اور امریکہ ------ کو درپیش مسائل اور ان کے مواقع کی نشان دہی کی جا سکے۔ یہ اس لیے ناگزیر ہے کہ قومی تقاضوں کو بروئے کار لانے میں ان مراکز کا قدیم حصہ رہا ہے۔ عظیم طاقتوں کے عروج و زوال کی تاریخ کسی صورت میں بھی اختتام پذیر نہیں ہوئی ہے۔

چونکہ اس کتاب کا کینوس خاصا وسیع ہے' لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ اسے مختلف قارئین مختلف مقاصد کے

تحت پڑھیں گے۔ بعض پڑھنے والے اس میں وہ سب چھ پائیں گے جس کی انھیں توقع تھی' مثلاً" گذشتہ پانچ صدیوں میں عظیم طاقتوں کی جو سیاست رہی ہے' عالمی سطح پر اقتصادی اور ٹیکنالوجی کے استعمال میں تبدیلیوں سے ہر ممتاز ملک میں جو اثرات رونما ہوئے ہیں اور زمانہ امن اور جنگ کے آزمائشی دنوں میں فوجی حکمت عملی اور اقتصادیات کے مابین جو رد عمل کی کیفیت پیدا ہوئی ہے ان تمام حقائق کا یہ نظر غائر جائزہ! اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی طاقتوں کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے' نہ ہی چھوٹی چھوٹی جنگوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اپنے لب لباب کے لحاظ سے یہ کتاب یورپ کے گرد گھومتی ہے' خصوصاً" اپنے درمیانی ابواب میں! لیکن موضوع کی مناسبت سے ایسا ناگزیر تھا۔

دیگر قارئین کرام' خصوصاً" ایسے سیاسی مبصرین کے لیے "جو عالمی نظام" کے بارے میں عمومی اصول وضع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا جنگ کے جدید طرز' یہ کتاب ان کی توقعات کے مطابق نہیں ہوگی۔ غلط فہمی دور کرنے کے لیے یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کتاب میں اس نظریے سے بحث نہیں کی جا رہی ہے کہ نہایت اہم (یا کسی خاص نظام پر مبنی) جنگ "کو ندراتیف" دور کے اقتصادی اتار چڑھاؤ سے وابستہ ہو سکتی ہے۔ مزید برآں' جنگ کے اسباب و عوامل کے عمومی نظریے سے بھی اس کتاب کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس امکان کا جائزہ مقصود ہے کہ عظیم طاقتوں کے عروج و زوال سے آیا جنگ وقوع پذیر ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہ کتاب نہ تو نظریہ شہنشاہیت کا احاطہ کرتی ہے اور نہ ہی جائزہ لیتی ہے کہ شہنشاہی تسلط کس طرح متاثر ہوتا ہے (جب کہ میکائیل ڈوئیل کی تازہ ترین تصنیف "ایمپائرز" میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے) اور نہ ہی یہ حقیقت دریافت کرتی ہے کہ شہنشاہیت سے قومی استحکام حاصل ہوتا ہے یا نہیں! آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس میں کوئی ایسا نظریہ تجویز نہیں کیا گیا ہے جس کے متعلق متعدد ادارے اور سماجی و سرکاری تنظیمیں جنگ کے دوران نتائج اخذ کرنے کی اچھی خاصی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔

اس کے برعکس' اس کتاب میں ان اسکالروں کے لیے اچھا خاصا مواد یکجا کر دیا گیا جو کوئی کلیہ قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ اس میں وسیع پیمانے پر نوٹس شامل کیے گئے ہیں تاکہ دلچسپی رکھنے والے قارئین ان سے رجوع کر سکیں) سیاست دانوں کے برعکس' مورخین کو جس مسئلے کا سامنا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ماضی کے واقعات اس درجہ متنوع ہوتے ہیں کہ ان سے کسی قسم کا حتمی سائنسی نتیجہ اخذ کرنا کارے دار ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ بعض جنگیں (مثلاً" ۱۹۳۹ء کی جنگ) فیصلہ سازوں کی ان تشویش سے وابستہ کی جا سکتی ہیں کہ اجتماعی طاقت کے توازن میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی لیکن یہی کلیہ ان جنگوں کی وضاحت میں کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا جن کا آغاز ۱۷۷۶ء (امریکہ کی انقلابی جنگ)' ۱۷۹۳ء (انقلاب فرانس) یا ۱۸۵۴ء (جنگ کریمیا) میں ہوا تھا۔ اسی طرح ہم ۱۹۱۴ء میں آسٹریا اور ہنگری کی مثال دے سکتے ہیں کہ کس طرح ایک عظیم طاقت نہایت اہم جنگ چھڑنے کے نتیجے میں زوال سے دو چار ہوئی اور نظریاتی اسکالر اب تک اس مسئلے کو حل کرنے میں مصروف ہیں کہ اس وقت کی عظیم طاقتوں ---- جرمنی اور روس --- نے کس نوع کا کردار ادا کیا۔ بایں ہمہ' یہ عام نظریہ کہ آیا شہنشاہیت سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے یا شہنشاہی تسلط "طاقتی بعد" سے متاثر ہوتا ہے' اس کا جواب متصادم شہادتوں کے پیش نظر "ہاں" میں بھی ہو گا اور "نہیں" میں بھی!

تاہم اگر کوئی شخص بنیادی نظریے کو الگ تھلگ رکھ کر محض سیدھے سادے طریقے سے گذشتہ پانچ سو برسوں میں عظیم طاقتوں کے عروج و زوال کے تاریخی ریکارڈ کا جائزہ لیتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو

جائے گی ان سے کچھ نہ کچھ حتمی نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔۔ اگرچہ اس عمل میں انفرادی دعوے کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے' مثلاً" اقتصادی اور پیداواری توازن میں اکثر و بیشتر جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور عالمی نظام میں جس طرح محض جاہ و حشم کا غلغلہ رہا' ان حقائق کے مابین جو بھی ربط تھا' اس کی دریافت ضروری ہے۔ سولھویں صدی کے بعد تجارت کا رخ بحیرہ روم سے بحر اوقیانوس اور شمال مغربی یورپ کی جانب رہا ہے یا عالمی مصنوعات کے منافع کے حصص کی تقسیم ۱۸۹۰ء کے بعد کی دہائیوں میں مغربی یورپ سے دور کے علاقوں میں ہوتی رہی ہے۔ یہ دونوں مثالیں خوش آئند ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اقتصادی تبدیلی سے نئی عظیم طاقتوں کو فروغ حاصل ہوا جس سے آنے والے زمانے میں فوجی اور علاقائی نظام پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی پیداوار کا توازن جو گزشتہ کئی دہائیوں سے بحر اوقیانوس کی سمت مرکوز رہا ہے' صرف یہی ماہرین معاشیات کی دلچسپی کا باعث نہیں ہے۔

اسی طرح تاریخی حقائق سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ایک اہم فوجی ملک (یا عالمی شہنشاہیت) کی حیثیت کی حامل کسی بھی عظیم طاقت اور اس کے اقتصادی عروج و زوال اور اس کی پیداواری ترقی و انحطاط کے مابین ایک واضح ربط ہوا کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی حیران کن امر نہیں اس لئے کہ یہ دونوں متعلقہ حقیقتوں سے اس کا سوتا پھوٹتا ہے۔ اول یہ کہ وسیع پیمانے کے فوجی مرکز کے استحکام کے لئے اقتصادی وسائل نہایت ضروری ہیں۔ دوسرے' جہاں تک بین الاقوامی نظام کا تعلق ہے' دولت اور طاقت دونوں ہمیشہ لازم و ملزوم رہی ہیں اور اسی تناظر میں انہیں دیکھنا چاہئے۔ آج سے تین سو سال قبل جرمنی کے ایک تاجر ادیب وون ہورنیک نے لکھا تھا:

> "اگر کوئی ملک آج طاقت ور اور دولت مند نہیں ہے تو وہ ہر دو صورت
> میں اپنی دفاعی اور وسائل پر انحصار نہیں کرے گا' بلکہ اصولی طور پر یہ
> جائزہ لے گا کہ اس کے پڑوسی ملک کے پاس یہ چیزیں زیادہ ہیں یا کم"

اگلے ابواب میں اس بیان کی صداقت بارہا سامنے آئے گی۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں نیدرلینڈ گزشتہ سو سال کے مقابلے میں کہیں زیادہ دولت مند تھا' اس کے باوجود اسے عظیم طاقت ہونے کا اعزاز حاصل نہیں تھا اس لئے کہ اس کے پڑوسی ممالک فرانس اور برطانیہ کے پاس یہی چیز بہت زیادہ مقدار میں موجود تھی' یعنی ان کے پاس وافر طاقت بھی تھی اور دولت بھی! ۱۹۱۴ء میں فرانس ۱۸۵۰ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کے باوجود حد درجہ مستحکم و مضبوط جرمنی کے سامنے اس کی تاب و توانائی ماند پڑ گئی تھی۔ آج برطانیہ کے پاس وکٹوریہ عہد کے مقابلے میں دولت کی فراوانی بھی ہے اور اس کی مسلح افواج نہایت جدید اور طاقت ور ہتھیاروں سے لیس بھی ہیں' اس کے باوجود یہ حقائق بے معنی سے ہو کر رہ گئے ہیں اس لئے کہ عالمی پیداوار میں اس کا حصہ ۲۵ فی صد سے گھٹ کر محض ۳ فیصد رہ گیا ہے۔ اگر کسی ملک کے پاس "یہ چیزیں زیادہ ہیں" تب تو معاملہ ٹھیک ہے اور اگر اس میں کوئی کمی ہے تو اندیشے کی بات ہے۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی ملک کی اقتصادی اور فوجی استعداد ساتھ ساتھ عروج و زوال سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ بہت سے پیش کردہ تاریخی شواہد اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کسی ملک کی متعلقہ اقتصادی صلاحیت کے خط منحنی اور اس کے فوجی/علاقائی اثرات کے منحنی کے مابین تاخیر وقت ہوا کرتا ہے۔ یہاں یہ بات دہرائی جائے گی کہ اس کی وجہ معلوم کرنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ اقتصادی لحاظ سے فروغ

پانے والی طاقت ------ مثلاً" ۱۸۶۰ء کی دہائی کا برطانیہ ۱۸۹۰ء کے عشرے کی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور آج کا جاپان میں اسلحہ خریدنے کی بجائے دولت مند بن جانے کو زیادہ فوقیت دی۔ نصف صدی گزرنے کے بعد ترجیحات میں یقیناً" تبدیلی آ جائے گی۔ ماضی میں اقتصادی نوعیت کی توسیع کے ساتھ ساتھ سمندر پار علاقوں کی وجہ سے مجبوریاں بھی سامنے آئیں (مثلاً" بیرونی منڈی اور خام مال پر انحصار' فوجی اتحاد' خصوصاً" اڈا اور نو آبادیات)۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مخالف قوتیں نہایت سرعت کے ساتھ اقتصادی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور بیرونی ملکوں میں اپنا اثر قائم کرنے کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔ آج دنیا مقابلے کی ایک ایسی منڈی بنی ہوئی ہے جہاں بازاری حصص میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ قنوطی مزاج مبصرین زوال کی بات کرتے ہیں جبکہ محب وطن سیاست دان "تبدیلی" لانا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایسے گھمبیر حالات میں عظیم طاقت دو نسل پہلے کے مقابلے میں دفاع پر اب زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہے گی اور پھر بھی یہ سوچے گی کہ دنیا آج قطعاً" غیر محفوظ جگہ ہے ------ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ دوسری طاقتیں نہایت تیزی سے عروج پا گئی ہیں اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ سلطنت ہسپانیہ نے ۱۵۸۰ء کے عشرے میں جب اس کی معاشی حالت بہتر تھی فوج پر اتنا خرچ نہیں کیا تھا جتنا ۱۶۳۰ء اور ۱۶۴۰ء کی پر شور دہائیوں میں خرچ کیا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں پامسٹر کی وفات کے وقت برطانیہ کی اقتصادی حالت نسبتاً" بہتر تھی' اس کے باوجود دفاع پر اتنی رقم خرچ نہیں کی گئی جتنی زیادہ ۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ کے دور میں ہوئی۔ تو کیا اس سے اہل برطانیہ کو تحفظ حاصل ہو گیا؟ یہی مسئلہ جس پر درج ذیل سطور میں بحث کی جائے گی' آج امریکہ اور روس کو درپیش ہے۔ عظیم طاقتیں زوال پذیر ہونے کی صورت میں "تحفظ" پر دیدہ و دانستہ زیادہ رقم خرچ کرتی ہیں اور اس طرح "سرمایہ کاری" کے منافع بخش وسائل کو اس مد میں جھونک دیتی ہیں اور اپنے لیے طویل المیعاد قسم کا بحران پیدا کر لیتی ہیں۔

اس کتاب میں پانچ سو سال کا جو ریکارڈ پیش کیا گیا ہے اس سے ایک عمومی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یورپی یا عالمی تسلط کے لیے لڑی جانے والی مشترکہ اہم جنگوں اور ہر فریق کی جانب سے خرچ کیے جانے والے پیداواری وسائل کے درمیان ایک مستحکم ربط پایا جاتا ہے۔ یہ بات دوسری جنگوں پر بھی صادق آتی ہے' مثلاً" ہسپانوی' آسٹرین ہیپسبرگ کے خلاف لڑی جانے والی جنگیں' اٹھارھویں صدی کی ایک اہم معرکہ آرائی جو ہسپانیہ کی تخت نشینی کے لیے ہوئی تھی' سات سالہ جنگ اور نپولین کی جنگ۔ پھر موجودہ صدی کی دو عالمی جنگیں! ایک طویل اور پسپا کر دینے والی جنگ بالآخر ہر اتحادی کے صبر و تحمل کا پیمانہ بن جاتی ہے۔ چاہے کسی کے پاس "یہ زیادہ ہو" یا "یہ کم ہو" جنگ طویل ہونے کی صورت میں یہی چیز اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔

بہرحال کوئی بھی شخص معاشی جبریت کے جال میں جکڑے جائے بغیر ان مشاہدات کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کتاب کی مخصوص دلچسپی گزشتہ پانچ صدیوں کے دوران عالمی امور کے وسیع تر رجحانات کا سراغ لگانے میں ہے' اس میں یہ بحث قطعاً" نہیں کی گئی ہے کہ معاشیات ہی ہر واقعہ کا تعین کرتی ہے یا ہر ملک کے عروج و زوال میں اسی کا ہاتھ کار فرما رہتا ہے۔ بہت سے شواہد دوسری باتوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں' مثلاً" جغرافیہ' فوجی تنظیم' قومی جذبہ' اتحاد کا طریقہ کار' اور دیگر بہت سے امور' متحدہ نظام سے وابستہ ارکان کی طاقت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں' مثلاً" اٹھارھویں صدی میں متحدہ صوبے یورپ کے نہایت دولت مند حصے تھے جبکہ روس نہایت غریب تھا۔ تاہم ڈچ کو زوال آیا اور روس کو عروج نصیب ہوا۔ انفرادی حماقت (جیسے ہٹلر کی) اور میدان جنگ کی نہایت اعلیٰ صلاحیت (آیا سولھویں صدی میں ہسپانوی سپاہ یا

موجودہ صدی میں جرمن کی پیادہ فوج کی) بھی انفرادی فتح و شکست کی وجوہات کا مظہر ہوتی ہے۔ البتہ جو بات قابل تردید نہیں ہوتی وہ یہ ہے کہ طویل منصوبہ بندی کے تحت لڑی جانے والی عظیم طاقت کی جنگ میں کامیابی اسی کو حاصل ہوتی رہی ہے جس کی پیداواری صلاحیت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یا پھر ہسپانوی کپتانوں کے بقول اسے فتح نصیب ہوتی ہے جس کا آخری سکہ محفوظ ہو۔ آگے کی عبارتوں میں اس فیصلے کی بخوبی تصدیق ہو جائے گی۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ ممتاز ملکوں کی طاقتی پوزیشن نے گزشتہ پانچ صدیوں کے دوران اقتصادی پوزیشن کو یکساں رکھا ہے۔ چنانچہ یہ سوال حد درجہ موزوں اور مناسب ہے کہ موجودہ دور کے اقتصادی اور تکنیکی رجحانات کے اثرات آج کے توازن اقتدار پر کیا مرتب ہوں گے۔ اس سے اس کلیے کی نفی نہیں ہوتی کہ انسان اپنی تاریخ خود ہی بناتا ہے' مگر تاریخی حالات کے دائرے میں رہ کر ہی بناتا ہے۔ اس طرح امکانات محدود بھی ہو سکتے ہیں اور بڑھ بھی سکتے ہیں۔

اس کتاب کے لیے پہلا نمونہ ۱۸۳۳ء کا وہ مضمون تھا جسے پروشیا کے نامور مورخ لی صولڈ وون زینکی نے "عظیم طاقتیں" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس نے اسپین کے زوال کے بعد بین الاقوامی طاقت کے توازن میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت کا جائزہ لیا تھا اور یہ باور کرنے کی کوشش کی تھی کہ بعض ممالک کس طرح بام عروج پر پہنچنے کے بعد روبہ زوال ہو گئے۔ زینکی نے اپنے عہد کے تجزیے کے ساتھ مذکورہ مضمون کو ختم کیا تھا اور یہ واضح کیا تھا کہ نپولین کے جنگ میں برتری حاصل کرنے کی کوشش میں فرانس کو جس شکست کا سامنا کرنا پڑا اس کے کیا اثرات رونما ہوئے۔ ہر عظیم طاقت کے مستقبل کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ بھی مورخ کے منصب سے تجاوز کرتے ہوئے قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگا۔

عظیم طاقتوں کے متعلق مضمون لکھنا کچھ اور ہے' اور تمام وقعات کو کتابی صورت میں پیش کرنا کچھ اور!۔ میرا ابتدائی رجحان تو یہی تھا کہ ایک مختصر اور "مضمون نما" کتاب لکھوں۔ میرا گمان تھا کہ قارئین (مبہم طور پر سہی) تبدیل ہوتی ہوئی پیداواری شرح کے پس منظر سے واقف ہوں گے اور وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کسی بھی عظیم طاقت کو مخصوص نوعیت کے کن کن جغرافیائی حکمت عملیوں پر مبنی مسائل کا سامنا ہے۔ جب میں نے اس کتاب کے ابتدائی ابواب تبصرے کے لیے بھجوانے شروع کیے یا اس کے موضوعات پر تبادلہ خیال کیا تو مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ میرا پہلا تصور غلط تھا۔ زیادہ تر قاری اور سامع پس منظر کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسا کوئی تجزیہ دستیاب نہ تھا جو یہ بتاتا کہ اقتصادی اور فوجی طاقت کے توازن میں کیوں کر بگاڑ پیدا ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نہ تو اقتصادی اور نہ ہی فوجی مورخین اس میدان میں اترے تھے۔ چنانچہ یہ موضوع بے توجہی کا نشانہ بنا۔ متن اور نوٹس دونوں میں خاصی تفصیل درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بڑی عظیم طاقتوں کے عروج و زوال کی تاریخ میں جو خلا ہے اسے پر کیا جائے۔

صنعتی انقلاب سے قبل کی دنیا کی عسکری حکمت عملی اور معیشت

۱

عروج مغرب

متعدد دانشوروں نے سنہ ۱۵۰۰ء کو جدید اور قدیم دور کے مابین خط تقسیم قرار دیا ہے۔ اس سال کے دوران یورپی باشندوں کا اس بات میں ذرا بھی شائبہ نہ تھا کہ ان کے براعظم کو روئے زمین کے بیشتر حصے پر برتری حاصل ہو جائے گی۔ آج ہم عصروں کو مشرق کی عظیم تہذیب کے متعلق جو معلومات حاصل ہیں' وہ قبل ازیں نامکمل بھی تھیں اور غیر مصدقہ بھی!۔ ان کا انحصار تمام تر سیاحوں کی بیان کردہ کہانیوں پر ہوا کرتا تھا۔ تاہم مشرق کی وسیع سلطنتوں' ان کی کثیر افواج اور بے پناہ دولت کا جو تصور پایا جاتا تھا وہ "سنا" صحیح تھا۔ اس واقفیت کے باوجود مشرقی علاقے مغربی یورپ اور وہاں کے عوام کی نسبت یقیناً" دور دراز واقع ہوئے ہوں گے۔ بایں ہمہ' دوسرے مرکزوں کے ثقافتی اور معاشی عوامل کے برعکس' یورپ کی دیگر خامیاں ماسوائے طاقت کے' زیادہ نمایاں تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں اس کا شمار نہ تو بہت زرخیز اور نہ ہی گنجان علاقے کے طور پر ہوتا تھا جبکہ اس کے برعکس ہندوستان اور چین دونوں اس لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ جغرافیائی و سیاسی لحاظ سے براعظم یورپ ناآسودہ ہیئت پر مشتمل تھا۔ شمال اور مغرب میں برف اور پانی کی سرحد تھی۔ مشرق کی سمت اس طرح کھلی تھی کہ اس طرف سے متواتر حملوں کے امکانات روشن تھے۔ اور جنوب فوجی تحفظ کے لحاظ سے خاصا کمزور تھا۔ ۱۵۰۰ء میں' اور اس سے کافی عرصہ قبل اور بعد میں بھی ------ یہ سب ذہنی تصورات قطعاً" نہ تھے۔ یہ محض اس سے آٹھ سال قبل کی بات ہے کہ ہسپانیہ کی اسلامی ریاست غرناطہ فرڈیننڈ اور ازابیلا کی افواج کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔ لیکن یہ محض ایک علاقائی جدوجہد کا اختتام تھا۔ نہ کہ عیسائیوں اور اسلامی افواج کے درمیان طویل معرکہ آرائیوں کا خاتمہ! ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کے زوال کے اثرات ہنوز مغربی دنیا پر قائم ہیں۔ یہ ایک اہم واقعہ تھا اس لیے کہ اس نے عثمانی ترکوں کی پیش قدمی کا کسی طرح بھی انسداد نہیں کیا اور صدی کے اختتام تک انھوں نے یونان' اونین جزائر' بوسینا' البانیہ اور بلقان کے وافر حصے پر قبضہ جما لیا تھا۔ اور ۱۵۰۲ء کی دہائی میں تو صورت حال خاصی زبوں ہو چکی تھی جب جاں نثار ترک سپاہ بوڈاپیسٹ اور ویانا کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی۔ جب جنوب میں عثمانی جہازوں نے اطالوی بندرگاہوں پر حملہ کیا تو پوپ کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ روم کی قسمت بھی قسطنطنیہ جیسی ہو جائے گی۔

یورپ میں پائے جانے والے یہ خدشات دراصل سلطان محمد دوم اور ان کے جانشینوں کی اعلیٰ عسکری صلاحیتوں کا نتیجہ تھے۔ لیکن یورپ اس کا توڑ کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ عثمانی اور چینی سلطنتوں کے برعکس' حتیٰ کہ مستقبل قریب میں مغل ہندوستان میں جو حکومت قائم کرنے والے تھے' اس سے قطع نظر' ایک ایسے متحدہ یورپ کا قطعاً" وجود نہیں تھا جس کا سربراہ کوئی ایک سیکولر یا مذہبی قسم کا رہنما ہوتا۔ اس کی بجائے یورپ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور ریاستوں کا ایک ملغوبہ بنا ہوا تھا۔ اگرچہ مغرب میں بعض طاقتور سلطنتیں ابھر رہی تھیں' خصوصاً" اسپین' فرانس اور انگلینڈ' لیکن کوئی ایک بھی اندرونی خلفشار سے آزاد

نہ تھی۔ اور تو اور ہر ایک سلطنت ایک دوسرے کی مخالف تھی' حتیٰ کہ اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے ان میں اتحاد تک نہ تھا۔

جب ایشیا کی عظیم تہذیب سے یورپ کا مقابلہ کیا جائے گا تو اس بات کا دعویٰ قطعاً" نہیں کیا جا سکے گا کہ آخر الذکر نے ثقافت' ریاضی' انجینئرنگ' جہاز رانی اور دیگر ٹیکنالوجی میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا تھا۔ یورپی تہذیب اور سائنسی ورثے کا وافر حصہ بہرصورت اسلام سے "مستعار" لیا گیا تھا' بالکل ویسے ہی جیسے مسلمان صدیوں تک تجارت' فتح و نصرت اور اپنے قیام کی بدولت چین سے یہ چیزیں حاصل کرتے رہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ پندرھویں صدی کے اواخر میں یورپ تجارتی اور تکنیکی لحاظ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن یہاں یہ وضاحت مناسب ہے کہ ان دنوں دنیا کے تمام تہذیبی مراکز ترقی کی جانب گامزن تھے۔ ہاں' یہ ضرور تھا کہ بعض کسی ایک میدان میں پیش قدمی کر رہے تھے تو دوسرے کسی اور سمت میں!

تکنیکی اور اسی وجہ سے فوجی لحاظ سے سلطنت عثمانیہ اور منگ بادشاہت کے زیر اثر چین کچھ آگے چل کر مغل ہندوستان اور مسکووی شاخوں پر مشتمل یورپ کا ریاستی نظام ـــــ یہ سب افریقہ' امریکہ اور بحرالکاہل اور بحراوقیانوس کی منتشر آبادیوں سے کہیں زیادہ افضل تھے۔ اگرچہ ۱۵۰۰ء میں یورپ ایک اہم اور طاقتور ثقافتی مرکز بن چکا تھا' تاہم اس وقت یہ حقیقت عیاں نہ تھی کہ ایک دن انتہائی اہمیت کا حامل ہو گا۔ لہٰذا اس کی ترقی کے اسباب و عوامل کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہو گا کہ دوسرے مقابلہ کرنے والے ملکوں کے استحکام اور کمزوریوں کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔

منگ چین

جدید دور سے قبل کی تمام تہذیبوں میں چین سے بڑھ کر ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجے کی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اس کی ۱۰۰ تا ۱۳۰ ملین آبادی کے مقابلے میں پندرھویں صدی کے یورپ کی آبادی کل ۵۰ تا ۵۵ ملین تھی۔ اس کی ثقافت شاندار رہی ہے۔ اس کی زمین سرسبز و شاداب اور زرخیز تھی۔ جس میں گیارھویں صدی سے نہروں کا نہایت خوبصورت جال بچھا ہوا تھا۔ اس کی انتظامیہ حد درجہ مربوط اور موروثی تھی۔ اس کا سربراہ اعلیٰ خیالات کا حامل اور نہایت تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔ اس نے چینی معاشرے کو آپس میں مربوط رکھا اور اسے قدرو حرمت عطا کی جو بیرونی سیاحوں کے لیے قابل رشک بات تھی۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ منگول قبائل کی وجہ سے مذکورہ تہذیب زیر و زبر ہوتی رہی اور قبلائی خان کے حملوں کے بعد سرنگوں ہو گئی لیکن چین کی یہ اہم صنعت بھی قابل توجہ ہے کہ اس نے حملہ آوروں کو اپنی تہذیب و ثقافت میں ڈھالا ہے نہ کہ انہوں نے دوسروں کی ہیئت اختیار کی۔ چنانچہ جب ۱۳۶۸ء میں منگ قبیلے کو عروج حاصل ہوا اور اس نے سلطنت چین کو متحد کرنے کے بعد منگولوں کو بالآخر شکست دی تو بہت سی قدیم روایات اور علم و ادب برقرار رہے۔

ان قارئین کے لیے مغربی سائنس کا احترام کرنے کی تربیت دی گئی ہے' یہ بات یقیناً" حیران کن ثابت ہو گی کہ چینی معاشرے میں ان سے بہت پہلے تکنیکی پیش رفت ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی اور وسیع لائبریریاں عرصہ دراز سے قائم تھیں۔ چین میں ٹائپ کے ذریعے طباعت کا آغاز گیارھویں صدی ہی میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہاں بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ تجارت و صنعت نہروں کی تعمیر اور گنجان

آبادی کی بدولت روز افزوں تھی۔ یورپ کے مقابلے میں چین کے شہر کہیں زیادہ وسیع و عریض ہوتے تھے۔ اسی طرح چین کی تجارت بھی وسیع تھی۔ کاغذ کے منافع بخش کاروبار کی وجہ سے تجارت خاصی پھیل چکی تھی اور منڈیاں اپنے عروج پر تھیں۔ گیارھویں صدی کے آخری عشروں میں شمالی چین میں لوہے کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم تھا جو خصوصی طور پر فوجی اور سرکاری استعمال کے لیے سالانہ ۱۲۵۰۰۰ ٹن کے قریب مصنوعات تیار کرتا تھا۔ دس لاکھ سے زائد فوج کی دفاعی ضروریات انہی فولادی مصنوعات سے پوری ہوتی تھیں۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ سات صدی بعد جب صنعتی انقلاب رونما ہوا تو برطانیہ کی فولادی مصنوعات کے مقابلے میں چین کی مذکورہ مصنوعات کہیں زیادہ تھیں۔ بارود ایجاد کرنے کا سرا بھی چینیوں کے سر ہے۔ منگ قبیلے نے منگول حکمرانوں کو مار بھگانے کے لیے چودھویں صدی کے آخر میں توپ کا استعمال بھی کیا تھا۔

مذکورہ ثقافتی اور تکنیکی پیش رفت کے پیش نظر یہ بات بھی حیران کن نہیں ہو گی کہ چینیوں نے سمندری راستے بھی دریافت کیے اور تجارت کو بھی فروغ دیا۔ مقناطیسی قطب نما بھی چینیوں کی ایک ایجاد تھی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جہاز بھی اتنے بڑے ہوتے تھے جتنے بڑے بعد کے ہسپانوی جہاز! ہند اقصیٰ اور بحرالکاہل کے جزائر کے ساتھ ان کی تجارت اتنی ہی منافع بخش تھی جتنی منافع بخش قدیم شاہراہوں کے ذریعے ہونے والی تجارت تھی۔ کئی عشرہ قبل بحری جنگ بھی لڑی جا چکی تھی۔ ۱۲۶۰ء کی دہائی میں منگ چین کے جہازوں کا زور توڑنے کی خاطر قبلائی خان نے اپنا بحری بیڑا تیار کیا تھا جس میں گولا برسانے کی مشینیں نصب تھیں۔ چودھویں صدی کے آغاز میں ساحلی تجارت فروغ پر تھی۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۴۲۰ء میں منگ سلطنت کی بحریہ کے پاس ۱۳۵۰ لڑاکا جہاز موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی ۴۰۰ کے قریب قلعہ نما جہاز تھے اور ۲۵۰ ایسے جہاز موجود تھے جو دور دراز علاقے تک گشت کرتے تھے۔ اگرچہ یہ طاقت ماند پڑ گئی' مگر اس میں نجی طور پر استعمال کیے جانے والے وہ جہاز شامل نہ تھے جو کوریا' جاپان' جنوب مشرقی ایشیا' حتیٰ کہ افریقہ تک کا تجارتی سفر کرتے تھے۔ اس طرح چینی حکومت کے لئے محصول کے وافر ذرائع پیدا ہو گئے تھے۔

سمندری مہم جوئی جو ۱۴۰۵ء اور ۱۴۳۳ء کے درمیان ایڈمرل چنگ ہو کی سرپرستی میں ہوئی تھی' خاصی مشہور و معروف قرار پائی تھی۔ اس نے دور دراز کے علاقوں کے سات پھیرے کیے تھے۔ سینکڑوں جہازوں اور ہزاروں آدمیوں پر مشتمل یہ بیڑا ملاکا اور سیلون کی بندرگاہوں سے ہوتا ہوا بحر احمر کے دہانے اور زنجبار تک جا پہنچا تھا۔ اس نے جہاں مختلف علاقائی حکمرانوں کو تحفے تحائف دیے وہاں پیکنگ کی اہمیت سے بھی انہیں روشناس کرایا۔ اس کے نتیجے میں مشرقی افریقہ سے تحائف سے بھرا ہوا ایک جہاز شہنشاہ چین کی خوش نودی کے حصول کے لیے آیا جبکہ ایک دوسرا جہاز سیلون کے ایک افسر کو لے کر آیا جو اتنا احمق تھا کہ فرزند آسمان کی برتری کا احساس نہ کر سکا۔ (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بحر ہند کے ممالک پر پرتگالی' ولندیزی اور دیگر یورپی حملہ آوروں کے برعکس چینیوں نے نہ تو لوٹ مار کی نہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا) مورخین اور ماہر آثار قدیمہ نے ایڈمرل چنگ ہو کی بحریہ کی وسعت' طاقت اور سمندری صلاحیت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کے مطابق بعض جہاز ۴۰۰ فٹ طویل اور ۱۵۰۰ ٹن وزنی تھے! ان کے خیال میں وہ یقیناً" افریقہ تک جاتے ہوں گے اور انہوں نے یقیناً" ہنری جیسے جہاز راں کی مہم جوئی سے کئی دہائی قبل ہی پرتگال کو دریافت کر لیا ہو گا۔

لیکن چین کی ۱۴۳۳ء کی مہم جوئی اس سلسلے کی آخری کڑی تھی کیونکہ اس کے تین سال بعد ایک شاہی فرمان کے ذریعے سمندری جہازوں کی تعمیر ممنوع قرار دے دی گئی۔ بعد ازاں ایک حکمنامے کے مطابق

دو مستول سے زیادہ کے حامل جہاز بھی ممنوع قرار دے دیے گئے۔ چنانچہ جہاز کا عملہ بڑی نہر میں چلنے والی کشتیوں میں ملازم ہو گیا۔ چنگ ہو کا جنگی جہاز کھڑا کھڑا ٹھپ ہو کر رہ گیا اور سمندری تسخیر کے مواقع حاصل ہونے کے باوجود چین نے بقیہ دنیا کی جانب سے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

اس فیصلے کے پس پردہ فوجی حکمت عملی کا یقیناً" عمل دخل رہا تھا۔ ملک کی شمالی سرحدوں پر منگول پھر سے دباؤ ڈال رہے تھے۔ لہٰذا اس کمزور خطے کی جانب دفاعی مورچہ بندی ضروری ہو گئی۔ ایسی صورت حال میں وسیع و عریض بحری فوج کا قیام محض سرمائے کا ضیاع تھا۔ مزید برآں جنوب کی سمت ویت نام کی تسخیر بھی گھاٹے کا سودا بن گیا تھا۔ تاہم آگے چل کر جب بحریہ کے دوبارہ قیام میں نقصان ہی نقصان نظر آیا تو اس جانب بے توجہی برتی گئی اور ٹھوس اسباب و عوامل پر دوبارہ غور و خوض نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر دریائے یانگ ٹیز کے ساحلی شہروں پر جاپان کے بحری قزاقوں نے حملے شروع کر دیے۔ اس کے باوجود حکومت کی جانب سے بحری فوج کے قیام کا چنداں کوئی منصوبہ نہ بنایا گیا۔ حتیٰ کہ چین کے ساحلوں کے گرد پرتگالی جہازوں کی پیہم نقل و حرکت نے بھی اس جمود کو نہیں توڑا۔☆ البتہ زمینی دفاع کا عمل بقدر ضرورت جاری تھا اور چین کے دقیانوسی لیڈر بس اتنا ہی چاہتے تھے ورنہ چینی باشندوں کے لیے سمندری تجارت ممنوع قرار نہ دی جاتی۔

اگرچہ مذکورہ صورت حال کا سبب مال و زر کا ضیاع اور دیگر عدم دلچسپیاں بھی تھیں' لیکن چین کی پسپائی کی نمایاں وجہ قدامت پرست کینفوسس افسر شاہی بھی تھی۔ منگ کے زمانے میں مغلوں کے حملوں کی وجہ سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں' ان سے بے زاری پیدا ہوئی اور "نیتجتاً" قدامت پرستی فروغ پا گئی۔ اس فضا میں تمام اہم سرکاری افسروں کا بس یہی خیال تھا کہ کسی طرح ماضی اور اس کی روایات کو زندہ و پائندہ رکھا جائے اور ایسے درخشاں مستقبل کی تعمیر غیر ضروری ہے جو سمندری توسیع اور تجارت کے فروغ پر مبنی ہو۔ کینفوسس اصول و نظریے کے مطابق جنگ قابل نفریں عمل تھا۔ البتہ مسلح افواج کی ضرورت محض اس لیے تھی کہ ڈاکوؤں کے حملے کو روکا جا سکے یا اندرونی بغاوت دبائی جا سکے۔ دقیانوسی قسم کے لیڈروں کی بری (اور بحری) فوج سے جو نفرت تھی اس میں تاجروں کی جانب سے شکوک و شبہات بھی شامل تھے۔ نجی دولت کا ارتکاز سستے داموں خریدنے اور مہنگے داموں بیچنے کا رجحان نئے نئے امیر و کبیر بن جانے والے تاجروں کا طمطراق------ ان تمام باتوں نے اشرافیہ اور تعلیم یافتہ نوکر شاہی کو بر افروختہ کر دیا' نیز مزدور/عوام میں بھی بے چینی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دقیانوسی قسم کے افسران یہ تو نہیں چاہتے تھے کہ منڈی کا سارا کاروبار ٹھپ کر دیں' البتہ وہ بعض اوقات اکا دکا تاجروں کی جائیداد ضبط کر لیتے یا ان کی تجارت ممنوع قرار دے دیتے۔ ان دقیانوسی خیال کے افسروں کی نظر میں اہل چین کی بیرونی تجارت اور بھی کھٹکتی تھی' اس لیے کہ اس پر ان کا کنٹرول نہ ہونے کے برابر تھا۔

☆ ۱۵۹۰ء کی دہائی میں چین کے قدرے بہتر بحری بیڑے نے جاپانی حملے کو ناکام بنانے میں کوریا کی مدد کی تھی۔ لیکن منگ دور کی یہ بحریہ بھی زوال پذیر ہو گئی۔

یہ ناپسندیدگی محض تجارت اور نجی دولت لے لیے تھی البتہ سطور بالا میں جن تکنیکی نوعیت کی بے پناہ ترقیوں کا ذکر ہوا ہے' ان سے کوئی عناد نہ تھا۔ منگ حکومت کے دور میں دیوار چین کی تعمیر' نہروں کے ذریعے آبپاشی کا اعلیٰ نظام' فولادی صنعت اور شاہی بحریہ---- یہ سب کچھ ملکی مفاد میں تھا۔ اور اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ افسر شاہی نے شہنشاہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ یہ سب کچھ ضروری ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سارے کام شروع کرنے کے بعد نظر انداز بھی کر دیے گئے۔ نہریں بے توجہی کا شکار ہو کر خشک ہونے لگیں' فوج رفتہ رفتہ نئے اسلحہ سے محروم ہوتی چلی گئی' فلکیاتی گھڑیاں جو ۱۰۹۰ء میں بنی تھیں' ناکارہ ہو کر رہ گئیں اور فولادی صنعت بھی رفتہ رفتہ ٹھپ ہو گئی۔ معاشی ترقی میں محض یہی باتیں ہی حائل نہ تھیں۔ طباعت محض عالمانہ تحریر تک محدود کر دی گئی۔ مشاہدات و تجربات کی عام اشاعت روک دی گئی۔ سماجی تنقید کا فقدان ہو گیا۔ کاغذی سکے کا چلن معدوم ہو گیا۔ چین کے شہروں میں مغربی افراد کی خود مختاری ممنوع قرار دے دی گئی اور ادھر مغرب میں چین کا کوئی شہری بھی نظر نہ آتا تھا۔ جب شہنشاہ کا دربار کہیں اور منتقل ہوتا تو دارالخلافہ بھی نقل مکانی کر لیتا۔ یہ ظاہر ہے کہ سرکاری پشت پناہی نہ ہونے کی صورت میں تاجر اور کاروباری لوگ فلاح نہیں پا سکتے۔ حتیٰ کہ دولت مند لوگ بھی اس صورت حال میں اپنی جمع پونجی زمین اور تعلیم پر صرف کرنے لگے تھے بجائے اس کے کہ صنعتی ترقی میں سرمایہ کاری کرتے۔ اسی طرح سمندر پار تجارت اور ماہی گیری پر بھی پابندی عائد ہونے کی وجہ سے اقتصادی ترقی کا عمل رک گیا۔ اگرچہ پرتگالیوں اور ولندیزی باشندوں کے ساتھ جو تجارت آنے والی صدی میں بحال ہوئی تھی وہ تمام تر سامان تعیش پر مبنی تھی' اور وہ بھی حیلہ جوئی کے ساتھ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس پر سرکاری عملے کا مکمل کنٹرول تھا۔

نسبتاً" منگ چین اتنا خوشحال اور تجارتی لحاظ سے ترقی یافتہ نہیں رہا۔ جتنا کہ چار صدی قبل یہ ملک سنگ خاندان کے دور میں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منگ دور میں زرعی تکنیک خاصی فروغ پا چکی تھی' لیکن جلد ہی چلی گئی اور آخرالذکر صرف مالتھس نظریے کے تحت پلیگ' سیلاب اور جنگ کے ذریعے ہی روکی جا سکتی تھی۔ مگر خود ان عناصر کا مقابلہ کرنا بھی چنداں آسان نہ تھا۔ حتیٰ کہ ۱۶۴۴ء کے بعد جب زور آور منچوس خاندان نے منگ خاندان کی جگہ لی تو اس نے بھی بتدریج ہونے والے زوال کا ازالہ نہیں کیا۔

اس کہانی کو مختصراً" کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ۱۷۳۶ء میں جب ابراہام ڈربی کا فولادی کارخانہ کول بروک ڈیل میں ترقی کر رہا تھا------ ہونان اور ہوپی میں سلگنے والی نرکول بھٹیاں بالکل بجھا دی گئی تھیں جو ہیسٹنگز میں فاتح کی آمد سے قبل یہ سب خاصی بڑی بڑی تھیں۔ اب بیسویں صدی تک یہ کارخانے ایسے ماند پڑے رہیں گے۔

اسلامی دنیا

پہلا یورپی جہاز ران جس نے سولھویں صدی کے آغاز میں چین کا سفر اختیار کیا ہو گا اور جہاں وہ اس کے حدود اربعہ' آبادی اور دولت سے متاثر ہوا ہو گا وہاں اس نے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا ہو گا کہ یہ ملک اپنی صلاحیت سے آگے بڑھا ہے۔ اس کے برعکس اس نے اس رائے کا اظہار سلطنت عثمانیہ کے لیے قطعاً" نہیں کیا ہو گا جبکہ ان دنوں وہ اپنی توسیع کے درمیانے درجے میں تھی اور عیسائیوں سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے ان کے لیے خطرے کی علامت بنی ہوئی تھی۔ تاریخی اور جغرافیائی تناظر میں اگر جائزہ لیا

جائے تو اس بات کا اقرار ضروری ہو گا کہ یہ اسلامی ریاستیں تھیں جنھوں نے سولھویں صدی کے دوران عالمی امور میں نہایت سرعت کے ساتھ اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ نہ صرف عثمانی ترک مغربی سمت میں پیش قدمی کر رہے تھے بلکہ ایران کا صفوی خاندان بھی طاقت' خوشحالی اور اعلیٰ درجے کی تہذیب میں ممتاز تھا' خصوصاً اسمٰعیل اول (۱۵۰۰ء تا ۱۵۲۴ء) اور عباس اول (۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء) کے عہد حکومت میں! طاقتور مسلم خان قبائل قدیم شاہراہ ریشم پر ہنوز تسلط جمائے ہوئے تھے جو کاشغر اور ترفان سے ہوتی ہوئی چین کو جاتی تھی۔ یہ قبائلی سلسلے مغربی افریقہ کی اسلامی ریاستوں بورنو' سوکوٹو اور ٹمبوکٹو کی مانند نہ تھے۔ ادھر جاوا میں ہندو سلطنت سولھویں صدی کے آغاز میں اسلامی فوج کے زیر نگیں آ چکی تھی۔ کابل کے بادشاہ بابر نے فاتحوں کے شمال مغربی راستے سے ہندوستان میں داخل ہو کر ۱۵۲۶ء میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اگرچہ ہندوستان پر یہ قبضہ ابتدا میں اتنا پائیدار نہیں تھا' لیکن بابر کے پوتے اکبر (۱۵۵۶ء -- ۱۶۰۵ء) نے اس سلطنت کو اس درجہ استحکام عطا کیا کہ اس کی سرحد مغرب میں بلوچستان اور مشرق میں بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ سترھویں صدی کے دوران اکبر کے جانشینوں نے جنوب کی جانب پیش قدمی کر کے ہندو مرہٹوں کو زیر کیا۔ اسی زمانے میں ولندیزی' برطانوی اور فرانسیسی باشندے سمندر کے راستے جزیرۃ الہند میں داخل ہو رہے تھے' لیکن ان کی تعداد قدرے کم تھی۔ مسلمانوں کی اس شاندار فتح مندی میں افریقہ اور ہند اقصیٰ میں مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی روز افزوں تعداد کو بھی شامل کرنا ہو گا جس کے مقابلے میں عیسائی مشنری کی تبلیغ ماند پڑ گئی تھی۔

موجودہ دور کی ابتدا میں یورپ کو فی الحقیقت مسلمانوں کے بہت بڑے چیلنج' یعنی عثمانی ترکوں کا سامنا تھا۔ یا یوں کہیے کہ ان کے جان نثار سپاہیوں اور نہایت اعلیٰ درجے کی "تیغ زنی" سے مقابلہ تھا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں ترکوں کی حکومت کریمیا (جہاں انہوں نے جنیوا کے تجارتی مراکز کو تہس نہس کر دیا تھا) اور بحیرہ ایجہ (جہاں وہ سلطنت وینس کی بیخ کنی کر رہے تھے) سے بحیرہ روم کے ساحلی ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۵۱۶ء میں عثمانی فوج نے دمشق پر قبضہ کر لیا تھا اور اسی سال وہ مصر میں داخل ہو کر مملوکی افواج کو ترکی توپوں سے پسپا کر رہی تھی۔ گرم مصالحہ کی تلاش میں ہند اقصیٰ تک جانے والوں کے راستے کو ایک طرح سے بند کر کے ترک دریائے نیل تک بڑھ آئے اور بحر احمر کے راستے بحر ہند میں داخل ہو گئے اور پرتگالیوں کے حملے کا مقابلہ کرنے لگے۔ اگر اس سے آئبیریائی جہازراں پریشان ہوئے تو یہ اس خوف و دہشت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا جو ترکی سپاہ کی وجہ سے مشرقی اور جنوبی یورپ کے شاہزادوں اور عوام کو لاحق تھا۔ بلغاریہ اور سربیا پر ترکوں کا پہلے ہی قبضہ ہو چکا تھا اور اب ولاچیا اور بحر اسود کے ارد گرد ان ہی کا اثر و رسوخ قائم تھا۔ مصر اور عرب کے خلاف پیش قدمی کے بعد' یورپ پر دباؤ ڈالنے کا مرحلہ سلیمان (۱۵۲۰ء-۱۵۶۶ء) کی ماتحتی میں درپیش آیا۔ ہنگری' جو ان دنوں عیسائیت کے لیے نہایت اہم مشرقی فصیل کی حیثیت رکھتا تھا' طاقتور ترکی افواج کا مقابلہ نہ کر سکا اور ۱۵۲۶ء میں جنگ موہک کے موقع پر روند ڈالا گیا۔ حسن اتفاق کہ اسی سال بابر کو پانی پت کے میدان میں فتح حاصل ہوئی اور اس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت وجود میں آئی۔ کیا شمالی ہند کی طرح تمام یورپ کا حال بھی ویسا ہی ہونے والا ہے؟ ۱۵۲۹ء میں جب ترک ویانا کا محاصرہ کیے ہوئے تھے' بعضوں کے خیال میں اس بات کا خاصا امکان تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعد ازاں شمالی ہنگری میں صورت حال بہتر ہو گئی اور سلطنت روم کو تباہی سے بچا لیا گیا۔ لیکن بعد میں ترک مسلسل خطرے کی علامت بن گئے اور فوجی چڑھائی کرنے لگے جسے کبھی بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکا' حتیٰ کہ ۱۶۸۳ء میں بھی

وہ ویانا کا دوبارہ محاصرہ کر چکے تھے۔

طاقتور عثمانی بحریہ کی توسیع اور فروغ بھی کئی صورتوں میں خطرے کا سبب بن چکا تھا۔ چین کے قبلائی خان کی طرح ترکوں نے بھی اپنی بحری فوج کو بے حد منظم کر دیا تھا۔ اس کا مقصد دشمنوں کی بحری طاقت کو کچل دینا تھا' مثلاً" سلطان محمد نے ۱۴۵۳ء میں بڑے بڑے جہازوں اور سیکڑوں جنگی کشتیوں سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر کے اسے تسخیر کر لیا۔ اس کے بعد بحر اسود کے پار فوجی آپریشن کے لیے نہایت طاقتور جہازوں کے فلیٹ استعمال کیے گئے۔ جنوب میں شام اور مصر پر چڑھائی کی گئی۔ نیز آئر جزائر' رہوڈز' کریٹ اور سائپرس پر قبضہ کرنے کے لیے وینس کے ساتھ مسلسل جنگ ہوتی رہی۔ سولھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں وینس' جنیوا اور ہیبسبرگ کے بحری بیڑوں نے سلطنت عثمانیہ کی بحری فوج کو دور رکھا لیکن وسط صدی میں مسلمانوں کی بحری قوت فروغ پا چکی تھی اور شمالی افریقہ کے ساحلی علاقے ان کی زد میں آ چکے تھے۔ وہ اٹلی' ہسپانیہ اور بلقانی بندرگاہوں پر حملہ کر رہے تھے۔ بالآخر ۱۵۷۰ء میں سائپرس پر قابض ہو گئے۔ یہ سب کچھ جنگ لیپانٹو میں ان کا زور ٹوٹنے سے قبل ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ فوجی مشین سے بڑھ کر کوئی شے تھی۔ چین کے منچوس کی طرح عثمانی ترک بھی ایک فاتح قوم تھے۔ انہوں نے سلطنت روم سے کہیں زیادہ وسیع علاقوں کے عوام' رعایا میں ایک جیسا سرکاری نظام' ایک ثقافت اور ایک زبان رائج کر دی تھی۔ ۱۵۰۰ء سے قبل کی صدیوں میں اسلامی دنیا تہذیب و ثقافت اور صنعت و حرفت میں یورپ سے کہیں آگے تھی۔ اس کے شہر نہایت وسیع' روشنی سے معمور اور صاف ستھرے ہوتے تھے۔ کئی شہروں میں یونیورسٹیاں' لائبریریاں اور حیران کن قسم کی خوبصورت مسجدیں ہوا کرتی تھیں۔ ریاضی' نقشہ نویسی' طب' سائنس اور صنعت کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ وہ کارخانے قائم کرنے' بندوق بنانے' روشنی کے مینار تعمیر کرنے اور گھوڑوں کی نسل تیار کرنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بلقان میں عثمانی سلطنت نے عیسائی نوجوانوں کو مستقبل کا جانباز سپاہی بنانے کا جو نظام وضع کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اعلیٰ درجے کی جان نثار فوج تیار ہو گئی تھی دوسری اقوام کے ساتھ رواداری کے برتاؤ نے بہت سے ذہین و طباع یونانی' یہودی اور عیسائی افراد کو سلطان کی ملازمت اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا تھا' مثلاً" قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران ہنگری کا ایک باشندہ سلطان محمد کا خاص توپچی تھا۔ سلیمان اول جیسے کامیاب لیڈر کی ماتحتی میں ایک ایسی نوکر شاہی قائم تھی جو ایک کروڑ چالیس لاکھ باشندوں کی نگرانی کرتی تھی۔ اس تعداد کی اہمیت کا اندازہ اسی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اسی زمانے میں ہسپانوی باشندوں کی کل تعداد پچاس لاکھ اور برطانوی رعایا کی تعداد کل پچیس لاکھ تھی۔ قسطنطنیہ اپنے عروج کے زمانے میں یورپ کے کسی بھی شہر سے بہت زیادہ وسیع و عریض تھا اور ۱۶۰۰ء میں اس کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ تھی۔

مذکورہ حقائق کے باوجود عثمانی ترکوں کو بھی زوال آیا' وہ بھی اپنے خول میں سکڑنے لگے اور دنیا پر حکمرانی کرنے کا موقع گنوا بیٹھے۔ یہ سب کچھ منگ سلطنت کے زوال کے ٹھیک ایک صدی بعد دیکھنے میں آیا۔ یہاں یہ معقول دلیل دی جا سکتی ہے کہ شروع میں ترکوں کو جو شاندار کامرانی حاصل ہوئی اس کا یہ فطری نتیجہ تھا۔ عثمانی فوج اگرچہ نہایت منظم اور وسیع سرحدوں کی حفاظت کے لائق تھی' لیکن نئی افرادی قوت اور اس کے لیے درکار خرچ کی موجودگی کے بغیر اس کی توسیع ممکن نہیں رہی۔ اسی لیے ہسپانیہ' ولندیز اور بعد ازاں

انگلینڈ کے برعکس سلطنت عثمانیہ نے اقتصادی لحاظ سے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ سولھویں صدی کے نصف آخر میں یہ سلطنت پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ وسطی یورپ میں اس کی کثیر فوج تعینات تھی۔ بحیرہ روم میں فوجی مشنوں کی وجہ سے ان کے اخراجات بڑھے ہوئے تھے۔ ادھر شمالی افریقہ' بحیرہ آڑ سائپرس اور بحر احمر میں فوج جنگ و جدال میں معروف تھی۔ پھر روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے کریمیا کو محفوظ کرنے کے لیے فوجی کمک ضروری تھی۔ حتیٰ کہ مشرق قریب میں بھی مذہبی فرقہ بندی وجود میں آ رہی تھی۔ یہ صورت حال اس وقت رونما ہوئی جب عراق اور فارس میں مقیم شیعوں نے سنیوں کے طرز عمل اور تعلیم کو چیلنج کر دیا۔ بسا اوقات یہ صورت حال اس وقت جرمنی میں پائی جانے والی مذہبی چپقلش کی مانند نہیں تھی اور سلطان اپنے مخالف شیعوں کو بزور قوت ختم کر کے ہی بادشاہت برقرار رکھ سکتا تھا۔ تاہم عباس اعظم کی ماتحتی میں ایران کی شیعہ حکومت عثمانیوں کے خلاف یورپی ریاستوں سے اتحاد کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ یہی رویہ فرانس نے مشرک" ترکوں کو ساتھ ملا کر سلطنت روم کے خلاف اختیار کیا تھا۔ ان ناساعد حالات میں سلطنت عثمانیہ کو ایک ایسی قیادت کی ضرورت تھی جو اس کا اقتدار برقرار رکھ سکے۔ لیکن ۱۵۶۶ء کے بعد صورت حال یہ تھی کہ تیرہ نااہل حکمران یکے بعد دیگرے تخت نشین ہو کر حکومت کرتے رہے۔

بیرونی دشمن اور ذاتی کمزوریاں ہی اسباب و عوامل کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے کافی نہیں۔ منگ چین کی طرح سلطنت عثمانیہ کا آوے کا آوا بگڑ چکا تھا۔ مرکزیت' ظلم و جبر اور اختراعات' اظہار رائے اور تجارت کے متعلق قدامت پرستانہ نظریات ایسی باتوں کی موجودگی سے نظام حکومت کو خاصا نقصان پہنچا۔ ایک احمق سلطان پوری سلطنت عثمانیہ کو اس انداز میں جزلزل کر دینے کا مجاز تھا۔ جیسے یورپ یا ہولی رومن ایمپائر کو بھی پورے یورپ کے لیے اختیار کرنے کی سکت نہیں۔ اوپر سے واضح ہدایات نہ ہونے کی وجہ سے افسران حکومت کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ فرسودہ نظام میں تبدیلی آئے اور نئے خیالات و نظریے اپنائے جائیں۔ ۱۵۵۰ء کے بعد نئے علاقے فتح نہ ہونے' مال غنیمت کے مفقا ہو جانے کی وجہ سے جاں نثار سپاہ لوٹ مار کرنے لگی۔ تاجر اور صنعت کار (جو زیادہ تر غیر ملکی تھے) جن کی پہلے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی' اب بہت زیادہ ٹیکس دینے پر مجبور کیے جا رہے تھے اور انہیں اپنی جائیداد بحق سرکار ضبط ہو جانے کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔ بہت زیادہ لگان نے تجارت اور شہروں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ سب سے زیادہ نقصان کسانوں کو اٹھانا پڑا جن کے مال مویشیوں پر فوجی زبردستی قابض ہونے لگے۔ جب ملکی نظام پراگندہ ہو گیا تو سرکاری عمال بھی لوٹ مار میں معروف ہو گئے۔ وہ کھلے عام رشوت لینے لگے اور لوگوں کی مال و متاع ہڑپ کرنے لگے۔ فارس کے ساتھ مسلسل جنگ و جدل ہونے کی وجہ سے جہاں دفاعی اخراجات میں اضافہ ہوا وہاں ایشیائی ممالک کے ساتھ ہونے والی تجارت بھی ماند پڑ گئی۔ چنانچہ حکومت عثمانیہ نئے نئے محصول لگانے کے جواز ڈھونڈنے لگی۔ اس عمل کے نتیجے میں بددیانت قسم کے محصول کاروں کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے۔

شیعہ مذہب کے چیلنج کا نہایت جارحانہ انداز میں مقابلہ کرنے کی وجہ سے سرکاری عمال ہر قسم کی آزاد خیالی کے بھی سخت مخالف ہو گئے۔ چھاپے خانے بند کر دیے گئے تاکہ اس کے ذریعے خطرناک نظریات کا پرچار نہ ہو۔ اقتصادی نظریے حد درجہ فرسودہ تھے' مغربی سامان کی درآمد تو ہوتی تھی البتہ ملکی سامان برآمد کرنے کی اجازت نہ تھی۔ جو ادارے نئے نظریات کی روک تھام میں معروف تھے وہ سرمایہ دارانہ رجحان کے حامل صنعت کاروں کی بیخ کنی کر رہے تھے' ان کی سرکار کی جانب سے پذیرائی ہوتی تھی۔ تاجروں پر مذہبی

تنقید شدت اختیار کر چکی تھی۔ مغربی نظریے اور مشاہدات کے مخالف ہونے کی وجہ سے ترکوں نے پلیگ کی روک تھام کے لیے نئے طریقے اختیار کرنے سے سراسر انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آبادی کا کثیر حصہ اس وبا کا شکار ہو گیا۔ جہل پسندی کی نہایت حیرت ناک مثال اس وقت سامنے آئی جب ۱۵۸۰ء میں جاں نثار فوجیوں نے ایک سرکاری رصدگاہ کو یہ کہہ کر تباہ و برباد کر دیا کہ اسی کی وجہ سے پلیگ کی وبا پھیلی تھی۔ حقیقت میں فوجی ادارے قدامت پرستی کا مظہر بنے ہوئے تھے۔ یورپی افواج نئے نئے اسلحے سے واقفیت رکھنے میں حد درجہ مستعد تھیں جبکہ اس کے برعکس ضرورت پڑنے کے باوجود ترک جاں نثاران وطن جدید ہتھیاروں سے لیس ہونے میں بے حد سست واقع ہوئے تھے۔ اور ابھی تک ان کی ہلکی پھلکی بندوقیں یورپی افواج کی بھاری بھرکم توپوں کی جگہ نہیں لے پائی تھیں۔ لیپانٹو میں شکست کھانے کے بعد انہوں نے یورپی ساخت کے بڑے بڑے جہاز تیار کیے۔ جنوبی علاقے میں تعینات اسلامی بیڑے کو فقط یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ بحر احمر اور خلیج فارس کے پرسکون پانی میں ٹھہرے رہیں۔ گویا انہوں نے پرتگالی ساخت کے سمندری جہاز تیار کرنے کی ضرورت کو چنداں اہمیت ہی نہیں دی۔ ممکن ہے اس فیصلے کی وجوہات تکنیکی نوعیت کی ہوں' لیکن ثقافتی اور تکنیکی قدامت پرستی بھی اس کا ایک اہم سبب بنی تھی۔ (اس کے برعکس بربر بحری قزاق جنگ کے نئے انداز نہایت تیزی سے اپنا رہے تھے)

قدامت پرستی کے متعلق مذکورہ بالا خیالات کا اطلاق اتنا ہی یا اس سے کہیں زیادہ مغلیہ سلطنت پر بھی ہوتا ہے۔ ان کے دور میں اعلیٰ درجے کی وسیع و عریض شہنشاہیت بعض مغل حکمرانوں کی فوجی ذہانت اور درباریوں کی طباعی' سامان تعیش کی صنعت کاری' بینکاری اور قرض کا نہایت منظم سلسلے کی موجودگی کے باوجود حکومتی نظام بنیادی طور پر کمزور تھا۔ ایک مسلمان فاتح ہندو مذہب کے پیروکار اور غربت کے مارے ہوئے کسانوں کے سروں پر مسلط ہوا کرتا تھا۔ شہروں میں لاتعداد تاجر ہوتے تھے۔ بازاروں میں چہل پہل ہوتی تھی۔ کاروباری ہندو گھرانوں میں صنعت' تجارت اور قرض لے لین دین کی طرف عام رجحان تھا۔ وہ ویبر پروٹسٹنٹ کے اصول کے مطابق اعلیٰ مثال قائم کر سکتے تھے۔ برطانوی شہنشاہیت کے شکنجے میں کسے جانے سے قبل جب یہ کاروباری طبقہ اقتصادی میدان میں اہم پیش رفت کرنے والا تھا' ہندوستانی زندگی کے اسی طرح کے اور بہت سے تیرہ و تار پہلو تھے۔ ہندو مذہب کی شدید مذہبی پابندیاں' جدیدیت کے سراسر خلاف تھیں۔ چونکہ اس دور میں کترنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کو ہلاک کرنا ممنوع تھا۔ لہٰذا ان کے باعث خاصی اہم مقدار میں اجناس تلف ہو جاتے تھے۔ فضلات اور گندگی کو ٹھکانہ لگانے سے متعلق سماجی رسم و روایات نہایت دقیانوسی تھیں لہٰذا صفائی ستھرائی کا سرے سے ہی فقدان تھا۔ گویا پلیگ کے جراثیم کی افزائش کے لیے انتہائی موزوں اسباب مہیا ہوئے تھے۔ اچھوت ذات کو اپنے طور پر کچھ کرنے کی اجازت نہ تھی' مذہبی رسوم سے بھی وہ علیحدہ ہی رہتے تھے' حتیٰ کہ بازار جانا بھی ان کے لیے ممنوع تھا۔ برہمن پجاری جس طرح مقامی حکمرانوں پر اثرانداز ہوتے تھے' اس کے نتیجے میں یہ جہل پسندی پورے عروج پر تھی۔ یہاں کسی بھی قسم کی تبدیلی کی کوشش میں سماج شدت کے ساتھ حارج ہوتا تھا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ آگے چل کر اہل برطانیہ نے ہندوستان کو تخت و تاراج کرنے اور پھر افادی اصول کے تحت حکمرانی کرنے کے بعد وہ بالآخر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہ ملک ہنوز ان کے لیے عجوبہ تھا۔

مغلوں کے طرز حکومت کے انڈین سول سروس کی انتظامیہ سے بمشکل ہی موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ دربار کی شان و شوکت پر اتنی کثیر رقم صرف کی جاتی تھی جسے ورسیلز کا بادشاہ "سن" دیکھ لیتا تو اسے یقیناً"

اسراف قرار دیتا۔ ہزاروں خدام اور ہالی موالی نہایت قیمتی ملبوسات اور زیورات' حرم اور سفری چڑیا گھر' پہرہ داروں کا جم غفیر۔۔۔۔ ان تمام چیزوں کا خرچہ لوٹ مار کی خود ساختہ مشینیں ہی پورا کر سکتی تھیں۔ محصول کار جنھیں اپنے مالک کو ایک مخصوص رقم ادا کرنی پڑتی تھی' کسانوں اور تاجروں کے ساتھ نہایت ظالمانہ انداز میں پیش آتے۔ چاہے تجارت میں مندی رہی ہو یا فصل خراب ہوئی ہو بہرطور محصول کی رقم ادا کرنا ضروری تھا۔ چونکہ محصول کے نظام میں کوئی قاعدہ قانون لاگو نہیں تھا۔ لہٰذا اس کی وصولیاں کو "کمانے کمانے" کا ایک دھندا تصور کیا جاتا تھا۔ اس سالانہ جبری پیشکش کے عوض عوام کو کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ مواصلات کے نظام میں بہت معمولی نوعیت کی ترقی ہوئی تھی۔ قحط' سیلاب اور پلیگ پھیلنے کے مواقع پر امدادی اقدامات کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔ واضح رہے کہ یہ حوادث بار بار پیش آتے تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ منگ خاندان کی حکومت اس سے کہیں بہتر اور ترقی یافتہ تھی۔ بہرحال مغلیہ سلطنت کو زوال آنا شروع ہو گیا کیونکہ اس کے لیے جنوب میں مرہٹوں کو قابو میں رکھنا' شمال میں افغانوں کی سرکوبی کرنا اور انجام کار ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثرات کو زائل کرنا مشکل تر ہو گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زوال کا سبب خارجی عوامل نہ تھے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اندرونی حالات تھے۔

دو بیرونی ممالک ــــــــــ جاپان اور روس

سولھویں صدی میں دو ایسے ملک بھی تھے جو اگرچہ منگ' عثمانی اور مغلیہ سلطنتوں کی وسعت اور آبادی کے پاسنگ بھی نہیں تھے' پھر بھی سیاسی استحکام اور اقتصادی ترقی کی وجہ سے نمایاں ہو رہے تھے۔ مشرق بعید میں جاپان اپنا قدم تیزی سے جما رہا تھا جبکہ اس کا وسیع و عریض پڑوسی ملک چین سکڑنے لگا تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے جاپان نہایت فائدے میں تھا جس طرح برطانیہ اس لیے کہ جزیرہ کی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے کسی بھی زمینی حملے سے اسے مکمل تحفظ حاصل تھا۔ یہ خصوصیت چین کو حاصل نہ تھی۔ جاپانی جزائر اور ایشیائی ممالک کے مابین کوئی واضح خلیج بھی حائل نہ تھی۔ چنانچہ جاپانی تمدن و ثقافت اور مذہب اس علاقے کی قدیم تہذیب کا مرہون منت تھا۔ جہاں چین میں حکومت کا نظم و نسق متحدہ نوکرشاہی کے ہاتھوں میں تھا۔ وہاں جاپان میں یہ خصوصیت قبائلی اور جاگیردار شخصیتوں کو حاصل تھی۔ شہنشاہ کو چنداں اہمیت نہ تھی۔ چودھویں صدی میں جس طرح کی مرکزی حکومت قائم تھی اب اس کی جگہ قبائلی جاگیرداری نظام رائج ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ویسی ہی نزاع اور جنگ و جدال کی فضا قائم تھی جیسی ان کے ہم مشرب اسکاٹ لینڈ کے جاگیرداروں میں تھی۔ یہ صورت حال تاجروں اور دکانداروں کے لیے سازگار نہ تھی' نہ ہی اس نے اقتصادی عمل کی فراوانی پر گرفت برقرار رکھی۔ چاہے سمندر ہو یا زمین' کاروباری لوگ جنگجو اور فوجی مہم جو حضرات سے ساز باز کرنے کے لیے دھکم پیل کرنے لگے۔ ہر ایک مشرقی ایشیا کی بحری تجارت سے منافع کمانے کا خوگر تھا۔ جاپان کے بحری قزاقوں نے چین اور کوریا کے ساحلوں پر لوٹ مار مچا رکھی تھی جبکہ دوسری جانب بعض جاپانی باشندے مغرب سے آئے ہوئے پرتگالی اور ولندیزی تاجروں کے ساتھ تجارت کے موقع سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ عیسائی مشنری اور یورپی مصنوعات نے جاپانی معاشرے کو نہایت آسانی سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا جبکہ الگ تھلگ اور خود پسند منگ سلطنت پر وہ اس قدر اثر انداز نہیں ہو سکے تھے۔

یہ پر آشوب منظرنامہ جلد ہی یورپ سے درآمد شدہ اسلحہ جات سے بدلنے والا تھا۔ جیساکہ دنیا کے

بعض علاقوں میں ہو رہا تھا' اقتدار اسی شخص یا جماعت کو میسر تھا جس کے پاس اعلیٰ درجے کی وسیع سپاہ موجود ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ اس کے تصرف میں توپ و تفنگ بھی ہو۔ جاپان میں یہ صورت جنگجو صفت ہادی اوشی کے مستحکم اقتدار کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی خواہشات سے مغلوب ہو کر کوریا کو دو مرتبہ فتح کرنے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکامی ہوئی اور وہ ۱۵۹۸ء میں مر گیا تو جاپان کو آپس کے قبائلی نزاع سے پھر خطرہ لاحق ہو گیا۔ پھر چند ہی سال بعد اقتدار ای یاسو اور اس کے پیروکار شوگنز کے ہاتھوں میں آ گیا جو ٹوکوگاوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس مرتبہ فوجی حکومت کو جو مرکزیت حاصل ہوئی اسے ختم نہیں کیا جا سکا تھا۔

بہت سی باتوں میں ٹوکوگاوا کے جاپان کی نئی شہنشاہیت کو وہی خصوصیات حاصل تھیں جو ایک صدی پہلے مغرب ممالک میں پائی جاتی تھیں۔ البتہ فرق یہ تھا کہ بیرون دنیا سے تمام تر تعلقات کے باوجود شوگنز بیرونی تسلط اور توسیع کے چنداں خواہشمند نہ تھے۔ ۱۶۳۶ء میں بحری جہازوں کی تعمیر روک دی گئی اور جاپانی باشندوں کے لیے دور دراز سمندروں میں سفر کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یورپی اقوام کے ساتھ تجارت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ البتہ ولندیزی تاجروں کے ساتھ اس صورت میں لین دین کی اجازت تھی اگر ان کے جہاز کو ناگاساکی کی بندرگاہ ڈیشیما میں لنگرانداز ہونے کی باقاعدہ منظوری ہوئی ہو۔ دوسرے ملکوں کے جہازوں کو بھگا دیا جاتا تھا۔ قبل ازیں تمام عیسائیوں کو چاہے وہ بیرونی ممالک میں رہے ہوں یا علاقائی شوگنز کے ایما پر بے دردی سے قتل کر دیا جاتا تھا۔ ان سخت اقدامات کے پس پردہ ٹوکوگاوا قبیلے کا یہ رجحان واضح تھا کہ اسے مکمل اقتدار حاصل ہو۔ غیر ملکیوں اور عیسائیوں کو تخریب کار قرار دیا جاتا تھا۔ اسی طرح دیگر جاگیرداروں کو بھی مخرب سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں سال کے چھ مہینے دارالخلافہ میں گزارنے کا حکم تھا اور بقیہ چھ مہینے اپنی ریاست میں رہنے کی اجازت ملتی تھی جبکہ ان کے اہل خانہ کو ایدو (ٹوکیو) میں یرغمال بنا کر رکھا جاتا تھا۔

اس عائد شدہ پابندی سے اقتصادی ترقی کا عمل رکنے نہیں پایا' نہ ہی فنکارانہ پیش رفت میں کوئی کمی واقع ہوئی تاہم ملک میں امن و امان کی صورت تجارت کے فروغ کے لیے سود مند ثابت ہوئی۔ شہروں اور آبادیوں میں معتد بہ اضافہ ہو رہا تھا۔ نقد ادائیگی کے چلن نے کاروباریوں اور بینکاروں کی اہمیت دو چند کر دی۔ البتہ آخرالذکر کو سماجی اور سیاسی لحاظ سے کوئی مقام حاصل کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی جیساکہ ان کے ہم پیشہ حضرات کو نیدرلینڈ' اٹلی اور برطانیہ میں حاصل تھی۔ بایں ہمہ' دنیا میں ہونے والی تکنیکی اور صنعتی ترقی سے جاپانی بالکل نابلد تھے۔ چین کے منگ خاندان کی طرح ٹوکوگاوا قبیلے والوں نے بھی دیدہ و دانستہ دنیا سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دی۔ اس سے جاپان کے اقتصادی عمل کو تو نقصان نہیں پہنچا لیکن جاپانی ریاست کے استحکام میں یقیناً" خلل واقع ہوا۔ بیرونی تجارت کی ممانعت' سفر پر پابندی اور تمواروں کے سوا عام دنوں میں اسلحہ کی نمائش پر قدغن!۔۔۔۔ ان سب باتوں نے سموری نسل کے سپاہیوں کو جو اپنے مالکوں کی خدمت پر مامور تھے' کاہل بنا دیا۔ پوری دو صدی تک فوجی نظام پر جمود طاری رہا۔ یہ ہوا کہ جب ۱۸۵۳ء میں کمانڈر پیری کا مشہور زمانہ "سیاہ جہاز" لنگر انداز ہوا تو جاپانی حکومت مزاحمت تو درکنار' البتہ انھوں نے کوئلہ اور دیگر سامان فراہم کر کے امریکیوں کی ضروریات پوری کر دیں۔

اپنے سیاسی استحکام اور عروج کے ابتدائی زمانے میں روس میں بھی بعض باتیں جاپان کے مماثل

رہے ہیں۔

مزید برآں ازمنہ وسطیٰ کے آخری اور جدید یورپ کے ابتدائی دور میں لنون جنگ کی نئی تکنیک بار بار آزمائی جاتی رہی تھی' لہٰذا یہ بات معقول نظر نہیں آتی کہ ایسی عسکری پیش رفت کی وجہ سے کوئی ملک اپنے دشمنوں پر باآسانی غالب آ گیا ہو گا۔ ویسے بھی آثار یہ بتاتے ہیں کہ اس وقت عسکری قوت کو فروغ دینے کی جانب خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ اٹلی میں تیر اندازوں جن کی ضرورت پڑنے پر نیزہ برداروں کے ذریعے حفاظت کی جاتی تھی' کے استعمال سے گھڑ سوار نائٹ اور اس کے دیہاتی رنگروٹ کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ وینس اور میلان جیسی ریاستیں ہی کرائے کے فوجیوں کا خرچہ برداشت کر سکتی تھیں۔ ۱۵۰۰ء کے لگ بھگ فرانس اور انگلینڈ کے بادشاہوں نے اچھی خاصی اسلحہ بردار فوج تیار کر لی تھی۔ اس طرح ضرورت پڑنے پر وہ اپنی طاقتور رعایا کو قابو میں رکھ سکتے تھے چاہے وہ قلعہ میں محصور ہی کیوں نہ ہو جاتیں۔ لیکن کیا یہ رجحان بالآخر یورپ کی سرحد سے نکل کر باہر پاؤں جمانے کی غمازی تو نہیں کر رہا تھا؟ یہ سوال ۱۵۵۰ء کے لگ بھگ ایسے بہت سے لوگوں کے ذہن میں آیا ہو گا جنہوں نے شہنشاہ چارلس پنجم کے عہد حکومت میں زمینوں اور فوجیوں کی جانب خصوصی توجہ دیکھی ہو گی۔

یورپ پر تسلط قائم کرنے کے لیے ہیبسبرگ خاندان نے جو خصوصی جدوجہد کی اور اسے اس میں جو ناکامی ہوئی۔ اس کا مفصل تذکرہ اگلے باب میں کیا جائے گا۔ لیکن یہاں یہ استدلال کہ بیرون براعظم اتحاد کا قیام کیوں کر نا ممکن تھا' مختصراً" یہاں پیش کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات پھر دہرائی جائے گی کہ متنوع اقتصادی اور فوجی قوتوں کے مراکز کا قیام ناگزیر تھا۔ کوئی بھی اطالوی شہری ریاست اپنے بل بوتے پر ترقی نہیں کر سکتی تھی جب تک کہ دوسری ریاستیں بھی توازن برقرار رکھنے میں تعاون نہ کرتیں۔ کوئی بھی نئی شہنشاہیت دشمنوں سے خراج وصول کیے بغیر حدود سلطنت کو وسعت نہیں دے سکتی تھی جن دنوں اصلاحی تحریک ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی' ان دنوں حریفوں کے مابین طاقت کے روایتی توازن میں مذہبی چپقلش بھی شامل کر دی گئی۔ اس امر کی وضاحت ذرا گمبھیر ہے۔ پھر بھی مقابلہ کاروں کا وجود اور جنگجو قبائل کے مابین پائے جانے والا تلخ احساس جاپان' ہندوستان اور کسی بھی دیگر علاقے میں نمایاں تھا۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود اتحاد کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکا تھا۔ یورپ میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ وہاں ہر فریق نئی نئی دفاعی تکنیک تک بہ آسانی رسائی حاصل کر لیتا تھا۔ لہٰذا کسی بھی ایک طاقتور ملک کو فیصلہ کن برتری حاصل نہ تھی' مثلاً" سوئزرلینڈ یا کہیں اور کے کرائے کے سپاہیوں کی خدمات کوئی بھی اجرت ادا کر کے حاصل کر سکتا تھا۔ تیر کمان کسی ایک جگہ نہیں بنائے جاتے تھے نہ ہی توپ کسی مرکزی مقام پر ڈھالی جاتی تھی۔ یہی صورت حال تانبے کی بندوق اور ڈھلے ہوئے لوہے کے اوزاروں کی تھی۔ اس قسم کے اسلحے وسطی یورپ میں ویلڈ کی دھات والی کانوں کے قریب' ملاکا میں' میلان میں' لیگ میں اور بعد ازاں سویڈن میں بنائے جانے لگے۔ اسی طرح بحیرہ بالٹک سے بحر اسود تک مختلف بندرگاہوں میں پائے جانے والے جہاز تیار کرنے کے وافر ہنر نے کسی ایک مخصوص ملک کے لیے کسی بھی بحری راستے پر اجارہ داری قائم کرنا دشوار بنا دیا۔ اس طرح سمندر پار اسلحہ تیار کرنے والے مراکز کو باآسانی فتح کر کے نیست و نابود کر دینا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

یہ کہنا کہ یورپ کا غیر مرکزی ریاستی نظام مرکزیت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی' اسے تکرار لفظی قرار نہیں دیا جا سکتا' کیونکہ متحارب سیاسی شخصیات کی بڑی تعداد موجود تھی وہ اپنی آزادی کو برقرار

یورپی معجزہ

وسیع و عریض یوریشیائی سرزمین کی مغربی جانب رہنے والے منتشر اور غیر مہذب لوگ آخر کیوں کر اقتصادی ترقی اور تکنیکی ایجاد میں اس درجہ سرگرم ہو گئے کہ رفتہ رفتہ انھیں عالمی امور میں معاشی اور فوجی لحاظ سے افضل ترین مقام حاصل ہو گیا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو صدیوں سے دانشوروں اور مبصروں کے پیش نظر رہا ہے۔ آئندہ سطروں میں اسی کے متعلق معلومات کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ نامکمل ہونے کے باوجود اس تلخیص میں تمام مباحث کا لب لباب موجود ہو گا۔ یعنی مذکورہ عمل ایک ایسا ہیجان خیز عمل تھا جس کے پس پردہ اقتصادی اور تکنیکی ترقی اپنا کام کر رہی تھی۔ مزید برآں دوسرے عوامل بھی کار فرما تھے' مثلاً" سماجی عناصر' جغرافیہ اور گاہے بہ گاہے رونما ہونے والے حادثات۔ یہاں یہ واضح کر دیا جائے کہ عالمی سیاست کی رفتار کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ شخصی کارنامے اور روزمرہ کی سفارت کاری و سیاست کے برعکس ٹھوس حقائق اور طویل المیعاد عناصر پر توجہ مبذول کی جائے۔ یہ بھی واضح ہو کہ طاقت ایک ایسی متعلقہ شے ہے جس کا انحصار مختلف ملکوں اور معاشروں کے پیہم موازنے سے ہی ممکن ہے۔ جب ہم سولھویں صدی کے مراکز اقتدار کے نقشے پر نظر ڈالتے ہیں تو یورپ کی ایک اہم خصوصیت جو ہمیں فوراً" چونکاتی ہے وہ اس کی سیاسی ناہمواری ہے۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر۱ اور نمبر۲ ملاحظہ ہو) یہ کوئی حادثاتی یا قلیل المیعاد قسم کے حالات نہ تھے جیساکہ چین میں ایک سلطنت کے خاتمے اور پیش رو خاندان کے مرکزی طاقت کو یکجا کرنے کے عمل سے پہلے مختصر طور پر رونما ہوئے تھے۔ رومنوں کی کوشش کے باوجود' جنہوں نے دریائے رائن اور ڈینیوب سے آگے کے علاقے فتح نہیں کیے تھے' یورپ سیاسی طور پر ہمیشہ بے ربط اور منتشر رہا۔ زوال روم کے ہزاروں سال بعد تک سیاست کا طاقتی یونٹ بنیادی طور پر چھوٹا اور مقامی ہوا کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں عیسائی مذہب اور کلچر میں مسلسل توسیع ہوتی رہی تھی۔ کبھی کبھی اقتدار کو جو مرکزیت حاصل ہوتی تھی' مثلاً" مغرب میں چارلیمن یا مشرق میں روسی کیوان' یہ سب عارضی امور تھے جو عموماً" حکمران کی تبدیلی' اندرونی بغاوت یا بیرونی حملے سے ختم ہو جاتے تھے۔

اس سیاسی تنوع کے لئے یورپ اپنی جغرافیائی حدود کا مرہون منت تھا۔ وہاں ایسا کوئی ایسا وسیع میدان نہ تھا جہاں گھڑ سوار فن سپہ گری کا مظاہرہ کر کے اپنی حکمرانی قائم کر سکتے۔ نہ وہاں دریائے گنگا' دریائے نیل' دریائے فرات' دریائے دجلہ' دریائے زرد اور دریائے یانگ سی کے وسیع و عریض اور زرخیز میدانی علاقے تھے جو محنت کشوں اور آسانی سے زیر تسلط آ جانے والے کسانوں کو روزی فراہم کرتے۔۔۔۔۔ یورپ کے قدرتی مناظر میں کوہساروں کے سلسلے اور وادیوں میں آباد بستیوں کو علیحدہ کرنے والے جنگلات کی وجہ سے بہت زیادہ رخنے نظر آتے تھے۔ پھر اس کی آب و ہوا شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق کے علاقوں میں متبدل رہتی تھی جس کے دور رس اثرات رونما ہوئے۔ اس سے جہاں ایک طرف طاقتور جنگجو افراد کے مرکزی کنٹرول کے امکانات ختم ہو گئے وہاں مغل گھڑسوار جیسے بیرونی حملہ آوروں سے براعظم کے پسپا ہونے کے مواقع بھی ناپید ہو گئے۔ چنانچہ اس نوع بہ نوع منظر ہائے کی وجہ سے لامرکزی طاقت کو فروغ و استحکام حاصل ہوا۔ مقامی سلطنتوں' فاتح سرداروں' بلندیوں پر آباد قبائلیوں اور نشیب میں واقع شہروں کی وجہ سے رومن سلطنت کے زوال کے بعد یورپ کا جو سیاسی نقشہ ابھرا وہ بارہ روزی کام والے لحاف سے کچھ کم نہ تھا۔ لحاف کا بارہ روزی کام میں سال" بعد نسل فرق پیدا ہو سکتا تھا لیکن کوئی ایک رنگ

بھی کسی متحد سلطنت کی غمازی کرنے سے قاصر تھا۔

یورپ کی متنوع آب و ہوا کی وجہ سے پیداوار بھی مختلف قسم کی ہوئی تھی جو لین دین کے لئے بہت موزوں تھی۔ بعد ازاں جب منڈیوں کو فروغ حاصل ہوا تو وہ چیزیں دریا کے راستے یا پگ ڈنڈیوں کے ذریعے ایک آبادی سے دوسری آبادی کو بھیجی جانے لگیں۔ اس تجارت کی نہایت اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شامل چیزیں بھاری مقدار میں ہوتی تھیں' مثلاً "نمبر' غلہ' شراب' اون' ہیرنگ مچھلی وغیرہ۔ ان اشیاء سے پندرھویں صدی کے یورپ کی روز افزوں آبادی کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس' تعیش کا سامان قدیم شاہراہوں کے ذریعے ہی بھیجا جاتا تھا۔ یہاں جغرافیائی صورت حال میں خاصا اہم رول ادا کیا کیونکہ بحری راستے سے مذکورہ اشیاء کی ترسیل قدرے سست تھی اور سوئے اتفاق کہ یورپ میں جہاز رانی کے لائق بے شمار دریا موجود تھے۔ یورپ کا سمندروں سے گھرا ہونا بھی فائدے سے خالی نہ تھا۔ اس طرح صنعت جہاز رانی کو فروغ حاصل ہوا۔ "زمانہ وسطیٰ" کے اواخر میں بحری تجارت بحیرہ بالٹک' بحیرہ شمالی' بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کے ذریعے عروج پر تھی۔ اس نوع کی تجارت میں بسااوقات جنگ چھڑ جانے اور مقامی حادثات' مثلاً۔ فصل کی خرابی یا پلیگ پھیل جانے سے رکاوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ لیکن ان عوامل کے باوجود عموماً اس قسم کی تجارت کو فروغ حاصل ہوتا رہا جس کے نتیجے میں یورپ میں خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوا' کھانے پینے کے وافر سامان مہیا ہوئے اور ہنسا اور اطالوی شہر جیسے دولت کے مراکز وجود میں آئے۔ دور دراز کے علاقوں میں مال کے تبادلے کے نتیجے میں مبادلہ ہنڈی کے کاروبار کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ کریڈٹ سسٹم اور بین الاقوامی نوعیت کی بینکاری عمدہ مثال تھی۔ تجارتی قسم کے قرضے کا چلن' پھر بیمہ ہنڈی' یہ سب کچھ آئندہ کی اقتصادی حالت کی بنیادی صورت تھی جس سے دنیا میں ہر جگہ تاجروں نے استفادہ کیا۔

چونکہ زیادہ تر تجارت بحر شمالی اور خلیج بسکے کے ناہموار راستے سے ہوا کرتی تھی نیز دور تک مچھلی کا شکار غذا اور دولت کے حصول کا اہم ذریعہ بن گیا تھا لہٰذا جہاز راں ایسے مضبوط قسم کے جہاز تیار کرنے پر مجبور ہوئے جو زیادہ سے زیادہ سامان اٹھا سکیں اور طوفان باد و باراں کے دوران اپنی رفتار برقرار رکھ سکیں۔ بہتر قسم کے بادبان' مستول اور چپوار بنائے گئے اور اس طرح جہاز رانی اعلیٰ پیمانے پر ہونے لگی۔ اگرچہ اس نوع کے جہاز اتنے متاثر کن نہیں تھے جتنے بعد کے ہلکے پھلکے جہاز جو بحیرہ روم کے مشرقی ساحلوں کے کنارے اور بحر ہند میں چلا کرتے تھے لیکن جیساکہ ہم ذیل کی سطور میں دیکھیں گے' آگے چل کر یہی جہاز حد درجہ خوبیوں کے حامل قرار پائے۔

عدم مرکزیت اور نگرانی نہ ہونے کی صورت میں بھی تجارت کی ترقی' تاجروں کا عروج' بندرگاہوں کا استحکام اور منڈیوں کا فروغ بڑی قدرومنزلت کا حامل تھا۔ اول یہ کہ ایسی کوئی بات نہ تھی جو اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی۔ ہاں البتہ یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ منڈیوں کے فروغ سے حکمراں طبقہ پریشانی سے دوچار نہیں ہوا۔ جاگیرداروں کو یہ شبہ تھا کہ شہرخانہ زاد غلاموں کی من مانی اور آزاد روی کا مرکز بن چکا ہے۔ لہٰذا وہ ان کے حقوق پامال کرنے لگے۔ بایں ہمہ تاجر بھی ظلم کا نشانہ بننے لگے۔ ان کا سامنا چوری کر لیا جاتا اور ان کی جائیدادیں چھین لی جاتیں۔ یورپ کے اعلانات میں عموماً" چین کے کیفیوسس کا یہ نظریہ عیاں ہوتا کہ منافع خور اور ساہوکار قابل نفرت ہیں۔ لیکن بنیادی حقیقت یہ تھی کہ یورپ میں ایسی کوئی مثال حاکمیت نہ تھی جو کسی بھی نوع کی اقتصادی ترقی پر قدغن لگاتی۔ ایسی کوئی مرکزی حکومت بھی نہ تھی جس کی

ترجیحات مخصوص صنعت کے عروج و زوال پر اثر انداز ہوتیں۔ تاجروں اور صنعت کاروں سے ٹیکس وصول کرنے کا وہ اصولی نظام بھی نہ تھا جس کی عدم موجودگی کے باعث مغل ہندوستان کی اقتصادی ترقی سست پڑ گئی تھی۔ یہاں ایک ٹھوس اور واضح مثال ملاحظہ ہو۔ اصلاحات یورپ کے مجوزہ سیاسی حالات میں یہ بات ناقابل تصور تھی کہ پوپ نے ۱۴۹۳ء میں سمندر پار دنیا کو ہسپانوی اور پرتگالی خطے میں جس طرح تقسیم کیا تھا اسے ہر شخص بے چون و چرا تسلیم کر لیتا۔ اور یہ بات تو اور بھی قابل فہم نہ تھی کہ سمندر پار کی تجارت پر (منگ چین اور ٹوکوگاوا جاپان کی طرح) قدغن لگانے سے کوئی اثرات رونما نہیں ہوئے ہوں گے۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ یورپ کے بعض شاہزادے اور مقامی لارڈ تاجروں کے وجود اور ان کے طور طریقوں کو برداشت کرنے کے عادی تھے جبکہ دوسرے افراد انہیں لوٹنے اور ان کو مار بھگاتے تھے۔ چنانچہ ریکارڈ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مشہور یہودی تاجروں نے فلیمش ٹیکسٹائل مل کے محنت کشوں کو تباہ و برباد کر دیا' ہوگونوٹس کو ایذا پہنچائیں اور آگے بڑھ کر ان کے سارے ہنر اپنا لیے۔ دریائے رائن کے علاقے کا ایک جاگیردار کاروباری مسافروں پر حد سے زیادہ ٹیکس لگایا کرتا تھا بعد میں اسے یہ پتہ چلا کہ تجارت کا راستہ بدل کر کہیں اور چلا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اسی طرح ایک بادشاہ لیے ہوئے قرض سے ہی منحرف ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت مشکلات سے دوچار ہو گیا جب جنگ کے بادل منڈلائے اور وہ اپنی فوج اور بحری بیڑے کو مضبوط کرنے کے لیے مطلوبہ رقم بطور قرض حاصل نہ کر سکا۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ بینکار' اسلحہ کے بیوپاری اور صناع کسی بھی معاشرے کے اہم رکن ہوا کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یورپ کے بہت سے علاقے بازار معیشت پر چھا گئے' اس کے لیے ایک علاقائی نظام وضع کیا' غیر آمرانہ قسم کا قانونی سسٹم رائج کیا (جو غیر ملکیوں پر بھی لاگو ہوتا تھا) اور تجارتی منافع سے ایک حصہ بطور محصول وصول کرتے رہے۔

آدم اسمتھ کے اصطلاح وضع کرنے سے بہت قبل' مغربی یورپ کے چند زیرک حکمرانوں نے یہ بات واضح طور پر تسلیم کر لی تھی کہ "کسی بھی ملک کو وحشت و بربریت کے ادنیٰ درجے سے اٹھا کر دولت مندی کے اعلیٰ مقام تک پہنچانے کے لیے محض چند باتیں درکار ہیں یعنی امن و امان' آسانی سے ادا کیے جانے والے ٹیکس اور قابل قبول منصفانہ نظام!" مختلف وقتوں میں بے حس قسم کے لیڈران ------' مثلاً" کیسل کا ہسپانوی حکمراں یا فرانس کا بوربن بادشاہ ------ فی الواقع سونے کے انڈے والی بطخوں کو ہلاک کرتے رہیں گے۔ چنانچہ دولت اور پھر فوجی طاقت کا زوال سوائے کوربینوں کے سب کے لیے جلد ہی بصیرت آموز بن گیا۔

اقتدار کو مرکزی حیثیت دینے کی وجہ غالباً" یہ رہی ہو گی کہ کسی نہ کسی ملک نے اسلحہ کی ٹیکنالوجی میں ایسی مہارت حاصل کر لی ہو گی جس سے اپنے تمام دشمنوں کو برباد کر دیا ہو گا یا ان پر غالب آ گیا ہو گا۔ جب پندرھویں صدی کے یورپی باشندوں نے کالی موت سے نجات پانے کے بعد اور اطالوی نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے زیر اثر اقتصادی اور تکنیکی میدان میں ترقی کی تو مذکورہ بات کسی طور بھی ناممکن نہ رہی ہو گی۔ جیساکہ قبل ازیں یہ بات تحریر کی جا چکی ہے' ۱۴۵۰ء سے ۱۶۰۰ء تک کے عرصے میں "بارودی نوعیت کی سلطنتیں" دنیا میں ہر جگہ قائم تھیں۔ مسکووی' ٹوکوگاوا جاپان اور مغل ہندوستان اس امر کی عمدہ مثالیں ہیں کہ کس طرح ان کے حکمراں اسلحہ اور توپ کے ذریعے اپنے تمام دشمنوں کو اطاعت گزار بننے پر مجبور کرتے

رہے ہیں۔

مزید برآں ازمنہ وسطیٰ کے آخری اور جدید یورپ کے ابتدائی دور میں فنون جنگ کی نئی تکنیک بار بار آزمائی جاتی رہی تھی' لہٰذا یہ بات معقول نظر نہیں آتی کہ ایسی عسکری پیش رفت کی وجہ سے کوئی ملک اپنے دشمنوں پر باآسانی غالب آگیا ہو گا۔ ویسے بھی آثار یہ بتاتے ہیں کہ اس وقت عسکری قوت کو فروغ دینے کی جانب خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ اٹلی میں تیر اندازوں جن کی ضرورت پڑنے پر نیزہ برداروں کے ذریعے حفاظت کی جاتی تھی' کے استعمال سے گھڑ سوار نائٹ اور اس کے دیہاتی رنگروٹ کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ وینس اور میلان جیسی ریاستیں ہی کرائے کے فوجیوں کا خرچہ برداشت کر سکتی تھیں۔ ۱۵۰۰ء کے لگ بھگ فرانس اور انگلینڈ کے بادشاہوں نے اچھی خاصی اسلحہ بردار فوج تیار کر لی تھی۔ اس طرح ضرورت پڑنے پر وہ اپنی طاقتور رعایا کو قابو میں رکھ سکتے تھے چاہے وہ قلعہ میں محصور ہی کیوں نہ ہو جاتیں۔ لیکن کیا یہ رجحان بالآخر یورپ کی سرحد سے نکل کر باہر پاؤں جمانے کی غمازی تو نہیں کر رہا تھا؟ یہ سوال ۱۵۵۰ء کے لگ بھگ ایسے بہت سے لوگوں کے ذہن میں آیا ہو گا جنہوں نے شہنشاہ چارلس پنجم کے عہد حکومت میں زمینوں اور فوجیوں کی جانب خصوصی توجہ دیکھی ہو گی۔

یورپ پر تسلط قائم کرنے کے لیے ہیبسبرگ خاندان نے جو خصوصی جدوجہد کی اور اسے اس میں جو ناکامی ہوئی۔ اس کا مفصل تذکرہ اگلے باب میں کیا جائے گا۔ لیکن یہاں یہ استدلال کہ یورپ براعظم اتحاد کا قیام کیوں کرنا ممکن تھا' مختصراً" یہاں پیش کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات پھر دہرائی جائے گی کہ متنوع اقتصادی اور فوجی قوتوں کے مراکز کا قیام ناگزیر تھا۔ کوئی بھی اطالوی شہری ریاست اپنے بل بوتے پر ترقی نہیں کر سکتی تھی جب تک کہ دوسری ریاستیں بھی توازن برقرار رکھنے میں تعاون نہ کرتیں۔ کوئی بھی نئی شہنشاہیت دشمنوں سے خراج وصول کیے بغیر حدود سلطنت کو وسعت نہیں دے سکتی تھی جن دنوں اصلاحی تحریک ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی' ان دنوں حریفوں کے مابین طاقت کے روایتی توازن میں مذہبی چپقلش بھی شامل کر دی گئی۔ اس امر کی وضاحت ذرا گھمبیر ہے۔ پھر بھی مقابلہ کاروں کا وجود اور جنگجو قبائل کے مابین پائے جانے والا تلخ احساس جاپان' ہندوستان اور کسی بھی دیگر علاقے میں نمایاں تھا۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود اتحاد کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکا تھا۔ یورپ میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ وہاں ہر فریق نئی نئی دفاعی تکنیک تک بہ آسانی رسائی حاصل کر لیتا تھا۔ لہٰذا کسی بھی ایک طاقتور ملک کو فیصلہ کن برتری حاصل نہ تھی' مثلاً" سوئٹزرلینڈ یا کسی اور کے کرائے کے سپاہیوں کی خدمات کوئی بھی اجرت ادا کر کے حاصل کر سکتا تھا۔ تیر کمان کسی ایک جگہ نہیں بنائے جاتے تھے نہ ہی توپ کسی مرکزی مقام پر ڈھالی جاتی تھی۔ یہی صورت حال تانبے کی بندوق اور ڈھلے ہوئے لوہے کے اوزاروں کی تھی۔ اس قسم کے اسلحے وسطی یورپ میں ویلڈ کی دھات والی کانوں کے قریب' ملاکا میں' میلان میں' لیگ میں اور بعد ازاں سویڈن میں بنائے جانے لگے۔ اسی طرح بحیرہ بالٹک سے بحر اسود تک مختلف بندرگاہوں میں پائے جانے والے جہاز تیار کرنے کے وافر ہنر نے کسی ایک مخصوص ملک کے لیے کسی بھی بحری راستے پر اجارہ داری قائم کرنا دشوار بنا دیا۔ اس طرح سمندر پار اسلحہ تیار کرنے والے مراکز کو باآسانی فتح کر کے نیست و نابود کر دینا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

یہ کہنا کہ یورپ کا غیر مرکزی ریاستی نظام مرکزیت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی' اسے تکرار لفظی قرار نہیں دیا جا سکتا' کیونکہ متحارب سیاسی شخصیات کی بڑی تعداد موجود تھی وہ اپنی آزادی کو برقرار

رکھنے کے لیے اسلحہ رکھتی تھیں یا خریدنے کے قابل تھیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی براعظم پر تسلط قائم کرنے کی اہل نہ تھی۔

یورپی ریاستوں کے مابین تقابلی رد عمل سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ وہاں "بارودی شہنشاہیت" کا وجود نہیں تھا۔ بادی النظر میں اس سے قطعاً" یہ دلیل سامنے نہیں آتی کہ عالمی قیادت کے حصول کی جانب یورپ کی پیش قدمی کی یہی مخصوص وجہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا کہ ۱۵۰۰ء میں نئی نئی شہنشاہیت کے پاس جو فوجیں تھیں انہیں سلطان کی کثیر افواج اور منگ سلطنت کے وسیع لشکر کے مقابلے میں کھڑا کیا جاتا تو وہ حد درجہ ادنیٰ و حقیر نظر نہ آتیں۔ ہاں' مذکورہ بات سولھویں صدی کے آغاز اور بعض صورتوں میں سترھویں صدی میں مبنی بر حقیقت تھی۔ لیکن آخرالذکر صدی کے بعد فوجی طاقت کا توازن نہایت تیزی سے یورپ کی جانب جھکتا جا رہا تھا۔ اس تبدیلی کی وضاحت کے لیے مجھے یورپ میں طاقت کی عدم مرکزیت کی جانب پھر اشارہ کرنا پڑے گا یعنی اس کی وجہ سے شہری ریاستوں اور بعد ازاں بڑی سلطنتوں کے درمیان پرانے انداز پر مبنی فوجی ریس ہونے لگی تھی۔ کسی نہ کسی حد تک اس میں سماجی اور اقتصادی عوامل کو بھی دخل تھا۔ جب اٹلی کی فوج میں جاگیردار نائٹ کا وجود باقی نہ رہا اور ان کی جگہ نیزہ برداروں' تیر اندازوں اور پیدل سواروں نے لے لی جن کو اجرت بیوپاری لوگ ادا کرتے اور علاقائی مجسٹریٹ ان کی نگرانی کیا کرتے تو یہ ناگزیر ہو گیا کہ آخرالذکر مالی منفعت کا تقاضا کرتے۔ شہروں کو اس قسم کے ہتھیاروں اور فنون جنگ کی ضرورت لاحق ہوتی تھی جن کے ذریعے جلد سے جلد فتح حاصل کی جا سکے تاکہ لڑائی کے اخراجات کم کیے جا سکیں۔ پندرھویں صدی کے آخر میں فرانسیسی بادشاہوں کے پاس قومی سطح کی افواج ہوا کرتی تھیں جن پر ان کا براہ راست کنٹرول ہوتا اور وہ انہیں باقاعدہ تنخواہ بھی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان بادشاہوں کو یہ بھرپور توقع رہتی تھی کہ یہ سپاہی ان کے لئے خاطرخواہ کارنامہ بھی انجام دیں گے۔

بایں ہمہ اس آزاد منڈی کے نظام نے جہاں کرائے کے متعدد سپاہیوں کو نئی بھرتی کے لیے تگ و دو کرنے پر مجبور کیا وہاں صناعوں اور موجدوں کو بھی اس بات پر اکسایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نئے آرڈر حاصل کرنے کے لیے اپنی مصنوعات کو فروغ دیں۔ اگرچہ پندرھویں صدی میں اسلحہ سازی کے میدان میں صرف تیروں اور ڈھالوں کے بنانے کی طرف توجہ مرکوز تھی لیکن پچاس سال بعد بارودی انداز کے اسلحے کے تجربے ہونے لگے تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جب پہلے پہل توپ کا استعمال عمل میں آیا تو ساخت اور کارکردگی کے لحاظ مغربی ملکوں اور ایشیا کی توپوں میں معمولی سا فرق ہی تھا۔ بھاری بھرکم فولادی توپ جو پتھر کی گیند پھینکا کرتی اور زور دار آواز پیدا کرتی' دیکھنے میں موثر معلوم ہوتی تھی۔ بسااوقات اس کے نتائج بھی بہت اچھے ہوتے تھے۔ یہ وہی توپیں تھیں جنہیں ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی دیواروں کو مسمار کرنے کے لیے استعمال کیا تھا لیکن یہ بات صرف یورپ میں دیکھنے میں آئی کہ اسلحہ سازی کو مسلسل فروغ دیا جاتا تھا' مثلاً" بارود کے ذرات کو بہتر بنانے اور ٹن سے ہلکی پھلکی اور مضبوط قسم کی توپ تیار کرنے' بیل اور میزائل کی ساخت عمدہ کرنے اور بندوق بردار سواری تعمیر کرنے کی جانب خصوصی توجہ مبذول رہی۔ اس طرح طاقت میں خاصا اضافہ ہوا اور اسلحہ کی ترسیل آسان ہو گئی اس طرح بہتر سامان حرب رکھنے والے کو قلعہ مسمار کرنا مشکل نہیں رہا جیسا کہ ۱۴۹۴ء میں دیکھنے میں آیا' جب تانبے کی بنی ہوئی بندوقوں سے لیس فرانسیسی فوج نے اٹلی پر حملہ کر دیا اور وہاں کی علاقائی ریاست خطرات کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ گئی۔ یہ نہایت حیران کن بات ہے کہ موجدوں اور اہل قلم حضرات پر زور دیا گیا کہ وہ ان توپوں کا توڑ وضع

کریں۔ (یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ لیونارڈو کے نوٹ بکس میں اس زمانے کی مشین گن، قدیم ساخت کی توپ اور بھاپ کی مدد سے استعمال کی جانے والی توپ کے خاکے بنے ہوئے تھے)۔

میرا یہ مدعا نہیں ہے کہ دوسری تہذیب و ثقافت نے قدیم طرز کے بے ڈھب اور بد ہیئت اسلحہ کو بہتر بنانے کی چنداں فکر نہیں کی۔ بعضوں نے اس ضمن میں پیش رفت کی تھی، خصوصاً" یورپ کے بنے ہوئے اسلحہ کے نمونوں کی نقل کرنے میں یا یورپی سیاحوں، مثلاً" چین میں آنے والے جیسوٹ کے ذریعے فن حرب معلوم کرنے میں۔ چونکہ منگ حکومت توپ کے معاملے میں اپنی اجارہ داری رکھتی تھی، پھر روس، جاپان اور مغل ہندوستان کے شہہ زور قائدین نے بھی اس معاملے میں برتری حاصل کر لی تھی، لہٰذا ان حکومتوں کے مستحکم ہو جانے کے بعد اس اسلحہ کو فروغ دینے کا رجحان خاصا کم ہو گیا۔ چین اور جاپان نے اسلحہ سازی کو فروغ دینے کی جانب توجہ نہیں دی۔ اسلام کے جاں باز سپاہی اپنے روایتی طریقہ جنگ پر انحصار کیے رہے اور دفاعی سازوسامان میں دلچسپی لیتے رہے۔ تاہم اس میدان میں یورپ سے ہمسری کرنا ان کے لیے آسان نہیں رہا۔ روسی اور مغل افواج کا مقابلہ چونکہ غیر ترقی یافتہ اقوام سے تھا، لہٰذا انھیں اپنے دفاعی سازو سامان کو فروغ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے پاس جس قسم کا بھی اسلحہ تھا، وہ مخالفوں کو زیر کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس طرح یورپ کو اقتصادی میدان کے ساتھ عسکری ٹیکنالوجی کے شعبے میں بھی دوسری اقوام پر برتری حاصل ہو گئی۔

یہاں حصول اسلحہ کی دوڑ کے دو مزید نتائج کا ذکر کرنا ضروری ہے جس میں سے ایک کی بدولت یورپ کو سیاسی استحکام حاصل ہوا جبکہ دوسرے کی وجہ سے بحری راستوں پر اسے برتری میسر ہوئی۔ اول الذکر کی داستان بے حد مختصر ہے اور اجمالاً" اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۴۹۴ء میں فرانس کے حملے کے ربع صدی تک کے عرصے اور بعض صورتوں میں تو اس سے بھی پہلے چند اطالوی باشندوں نے یہ حقیقت دریافت کر لی تھی کہ شہر پناہ کی اندرونی جانب مٹی کی دیوار کھڑی کر دی جائے تو گولا باری کے اثرات کافی حد تک کم ہو سکتے ہیں۔ جب توپ کے گولے بیرونی دیواروں سے جا لگیں گے تو مٹی کے تودوں کی وجہ سے ان کا پھٹنا محال ہو جائے گا۔ اگر مٹی کے تودوں کے سامنے گہری خندقیں کھدی ہوئی ہوں (بعد میں محفوظ قسم کی مورچہ گاہیں وجود میں آئیں جہاں سے بندوق اور توپ کے ذریعے جوابی حملے کئے جاتے) تو اس طرح محاصرہ کرنے والی فوج کی راہ میں شدید قسم کی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس طرح اٹلی کی شہری حکومت کو تحفظ حاصل ہوا، خصوصاً" ایسی ریاستوں کو جو کسی بیرونی فاتح کے زیر اثر نہیں آئی تھیں اور جن کے پاس اتنی افرادی قوت موجود تھی جو اس قسم کی تعمیر قلعہ بندی کے لیے ضروری تھی۔ اس طریقے سے ان افواج کو بھی خاصا فائدہ پہنچا جو ترک فوج کو پرے رکھے ہوئے تھیں جیسا کہ بعد میں مالٹا کے عیسائی دستوں اور شمالی ہنگری کے مورچہ بند سپاہیوں نے یہ کام انجام دیا تھا۔ مزید برآں، اس دفاعی طریقے نے یورپ میں باغیوں اور دشمنوں کو آسانی سے فتح کرنے کی راہ مسدود کر دیں۔ اس کا ثبوت نیدر لینڈ کی بغاوت ہے۔ اگر کسی کو میدان میں اگر فتح حاصل ہو گئی جیسا کہ ہسپانوی پیدل فوج کو حاصل ہوتی رہی ہے جس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا تھا، تو بھی یہ فیصلہ کن فتح نہیں ہوتی تھی کیونکہ حزب مخالف کے پاس محفوظ قسم کے قلعے ہوتے اور وہ قلعہ بند ہو کر جوابی حملہ کرتی تھی۔ جس طرح (جاپان) کے ٹوکوگاوا خاندان یا ہندوستان کے اکبر نے بارود کے ذریعے اقتدار حاصل کیا تھا، اس روایت کو مغرب میں نہیں دہرایا گیا تھا۔ بلکہ وہاں تو سیاسی کثرت کی ہماہمی تھی اور اسلحہ کی دوڑ کا جنونی انداز کارفرما تھا۔

"بارودی انقلاب" کے اثرات سمندروں میں کہیں زیادہ وسعتوں کے حامل تھے۔ ازمنہ وسطیٰ کے آخری زمانے میں شمال مغربی یورپ، ممالک اسلامیہ اور مشرق بعید میں جہاز سازی اور بحری طاقت میں جو مماثلت پائی جاتی تھی اس سے کوئی بھی شخص پہلے کی طرح ضرور چونکے گا۔ کچھ بھی ہو، چنگ ہو کے طویل بحری سفر اور بحر اسود اور مشرقی بحیرہ روم میں ترکی بیڑوں کے فروغ کو دیکھ کر ۱۴۰۰ء اور ۱۴۵۰ء کے لگ بھگ مبصروں نے ضرور یہ رائے قائم کی ہو گی کہ بحری سیاحت کا مستقبل بس انہی دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہو گا۔ گمان غالب ہے کہ مذکورہ تینوں خطوں میں نقشہ نویسی، علم نجوم اور قطب نما، اصطرلاب اور زاویہ پیما جیسے آلات کے استعمال میں تھوڑا بہت فرق رہا ہو گا۔ البتہ ان سب کے مستقل نظم و نسق میں فرق رہا ہو گا، یا پھر پروفیسر جونز کے خیال کے مطابق "بحری سیاحوں، مثلاً" پولینشائی جہاز رانوں نے جتنی مسافت طے کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایبرین بحری جہاز اتنے موثر نہیں ہیں جتنے یورپ کے۔ اس لیے کہ موخرالذکر نے اس کی معقول تنظیم کی ہے اور اپنی بساط کے مطابق وسائل کو ترقی دی ہے"۔ پرتگالیوں کا جغرافیائی کوائف جمع کرنے کا با اصول طریقہ، بحر اوقیانوس کے مہم جو افراد کی مالی امداد کے سلسلے میں جینوا کے کاروباری مراکز کی مسلسل رضا مندی ---- جو بالآخر بحر اسود میں ان کے تجارتی نقصان کے ازالے کا سبب قرار پائی ---- اور دور شمال میں نیوفاؤنڈ لینڈ کی ماہی گیری کا ترقی یافتہ طریقہ کار ---- یہ تمام عناصر آگے کی سمت پیش قدمی کی واضح علامت تھے۔ یہ باتیں اس دور کے دوسرے معاشروں میں ناپید تھیں۔

معقول نوعیت کے تنظیمی عمل کا نہایت اہم پہلو یہ تھا کہ جہازوں کو آہستہ آہستہ مختلف قسم کے اسلحہ سے لیس کیا جانے لگا۔ بحری جہازوں میں توپیں نصب کرنے کا عمل ایک ایسے وقت میں بھی نہایت اہمیت کا حامل تھا جبکہ میدانوں کی طرح سمندروں میں بھی جنگ ہونے لگی تھی۔ جس طرح ازمنہ وسطیٰ میں قلعہ کی دیواروں اور برجوں میں تیر انداز تعینات کیے جاتے تھے تاکہ وہ حصار کرنے والوں کو بھگا سکیں، اسی طرح جینوا، وینس اور آراگون کے بڑے بڑے بحری جہازوں کے اگلے اور عقبی حصے میں بھی تیر انداز بٹھائے جاتے تھے تاکہ وہ بحیرہ روم کے مسلمان قزاقوں سے اس کی حفاظت کر سکیں۔ اس سے بحری جہاز کے عملے کو نقصان بھی پہنچتا تھا اور اگر حملہ آور لوٹنے کا تہیہ کیے ہوتے تو کاروباری لوگوں کی حفاظت ممکن نہیں رہتی تھی۔ بہرحال جب جہاز رانوں نے زمینی جنگ میں استعمال کی جانے والی بندوقوں میں نت نئی ترقی دیکھی ---- یعنی تانبے کی بنی ہوئی توپ ہلکی، مضبوط اور جہاز کے بندوق بردار عملے کے لیے کم خطرناک تھی، لہٰذا یہ بات ذہن میں آئی کہ ایسے اسلحہ سے جہاز کو لیس کیا جائے۔ چین اور مغرب میں جنگی جہازوں کو میزائل پھینکنے والے اسلحہ سے لیس کیا جا چکا تھا۔ اگرچہ توپوں کے نصب ہونے سے جہاز کے عملے کو پہلے جیسا خطرہ نہیں رہا، پھر بھی ان کی وجہ سے توپ کو سخت قسم کا دھکا لگتا اور وہ پیچھے کی جانب لڑھک جاتی۔ پھر یہ بھاری بھرکم بھی ہوتی تھیں۔ اور اگر قلعہ نما جہاز میں کئی کئی توپیں رکھ دی جاتیں تو ان کا توازن برقرار نہیں رہتا تھا۔ اس زمانے میں مضبوط قسم کے تین مستول والے بحری جہاز ان چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے اور چپو والے جہازوں پر فوقیت رکھتے تھے جو بحیرہ روم، بحیرہ بالٹک اور بحر اسود میں چلتے تھے۔ نیز انھیں عرب اور چین کے بحری جہازوں پر بھی فوقیت تھی۔ ان جہازوں سے دور تک مار کرنے والے گولے پھینکے جاتے اور یہ اپنی جگہ صحیح سالم رہتے تھے۔ البتہ انھیں بھی بسا اوقات تباہی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب یہ محسوس کر لیا گیا کہ بحری جہازوں کو اس قسم کے اسلحہ سے لیس کرنا بہت زیادہ تحفظ کا باعث ہو گا تو "نیتجتاً" کرول اور گیلون (بادبانی) جہازوں کی "امکانی طاقت" خوفناک حد تک بڑھ گئی۔ اگر موازنہ کیا جائے تو ہلکے پھلکے جہازوں میں دو قسم کی

خرابیاں تھیں۔ ایک تو ان میں بندوقوں اور توپوں سے لیس ہونے کی گنجائش کم تھی دوسرے توپ کے گولوں کے سامنے یہ نہایت بے وقعت ثابت ہوتے تھے۔

میں یہاں "امکانی قوت" پر زور دینا چاہوں گا' اس لیے کہ بندوق سے لیس اور دور دراز کا سفر کرنے والے جہازوں کی رفتار عموماً" سست ہوتی تھی اور وہ اتنے معیاری بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت مختلف النوع قسم کے بحری جہاز تیار کیے جاتے تھے۔ بعض میں کئی کئی مستول ہوتے' بندوقیں نصب ہوتیں اور چپوؤں کی قطاریں لگی ہوتیں۔ گیلی قسم کے جہاز سولھویں صدی کے دوران انگلش چینل میں دیکھے جا سکتے تھے۔ بحیرہ روم اور بحر اسود میں بھی اس قسم کے جہاز استعمال کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ تیز رفتار ہوتے تھے' ساحل کے قریب کم پانی میں ٹھہر سکتے تھے اور اس طرح ان کے لیے زمین سے رابطہ رکھنا ممکن ہو جاتا تھا۔

ہمیں اس طرح ہرگز نہیں سوچنا چاہیے کہ جونہی پرتگالی جہاز راس امید میں لنگر انداز ہوئے مغرب کی ناقابل چیلنج برتری کا دور شروع ہو گیا۔ مورخین واسکوڈی گاما کے عہد اور کولمبس کے دور کا جس طرح ذکر کرتے ہیں' یعنی ۱۵۰۰ء کے بعد تین صدیوں تک یورپ کو جو قیادت حاصل رہی ---- وہ ایک بتدریج عمل تھا۔ پرتگالی مہم جو ۱۴۹۰ء کی دہائی میں ہندوستان کے ساحل تک یقیناً" پہنچ گئے ہوں گے' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے جہاز بہت چھوٹے ہوتے تھے' بعض اوقات تو فقط تین سو ٹن وزنی پھر یہ پوری طرح مسلح بھی نہیں ہوتے تھے۔ لٰہذا ان کا مقابلہ ولندیزیوں کے ان طاقتور تجارتی جہازوں سے ہرگز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے ایک صدی بعد انہی سمندروں میں جہاز رانی کی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ بحر احمر تک پرتگالیوں کی رسائی ایک طویل مدت تک نہیں ہو سکی تھی نہ ہی وہ چین کے ساحل پر قدم رکھ سکے تھے۔ پھر سولھویں صدی کے اواخر میں مشرقی ایشیا کی بعض بندرگاہیں ان کے ہاتھوں سے نکل کر عربوں کے پاس چلی گئی تھیں۔

یہ تسلیم کر لینا بھی غلط ہو گا کہ جونہی مغرب کی توسیع پسندی کے آثار نمایاں ہوئے' غیر یورپی طاقتیں تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہی صورت حال میکسیکو' پیرو اور نئی دنیا کے دیگر ترقی یافتہ معاشرے میں بھی اس وقت پیدا ہوئیں جب ہسپانوی مہم جو وہاں در آئے۔ لیکن اگر ایک دوسرے پہلو سے دیکھیں تو حقیقت بالکل ہی مختلف دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ چینی حکومت نے سمندری تجارت سے رضاکارانہ انداز میں رخ موڑ لیا تھا' لٰہذا اسے اس بات کی بالکل پروا نہ تھی کہ دنیا کی تجارت وحشیوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ حتیٰ کہ وہ نیم سرکاری تجارتی اڈا جسے پرتگالیوں نے ۱۵۵۷ء میں مکاؤ کے مقام پر قائم کیا تھا اور جو ملک کے مقامی تاجروں اور چشم پوش انتظامیہ کے لیے خاصا نفع بخش بن چکا تھا' پیکنگ کے سکون کو ذرہ برابر بھی درہم برہم نہ کر سکا۔ جاپانی تو اور بھی زیادہ گردن تھے' جب پرتگالیوں نے ۱۶۴۰ء میں ایک وفد اس غرض سے بھیجا کہ وہ غیر ملکیوں کے انخلاء پر احتجاج کرے تو اس کے تقریباً" تمام ارکان قتل کر دیے گئے۔ اس سلسلے میں لسبن نے کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔ ادھر سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت حتمی طور پر مشرقی بحیرہ روم میں جڑ پکڑ رہی تھی۔ پھر اس کی زمینی قوت بھی وسطی یورپ کے لیے خطرہ بن چکی تھی۔ بہت سے سیاستدانوں کے خیال میں' سولھویں صدی میں سقوط ہنگری' مشرقی ملکوں میں فیکٹریاں قائم کرنے سے کہیں زیادہ اہم معاملہ تھا۔ اسی طرح عدن' گوا اور ملاکا میں ان کے چیلنجوں کے مقابلے میں ویانا

کو درپیش خطرہ کہیں زیادہ اہم تھا۔ بحر اوقیانوس کی سرحدوں سے ملنے والی حکومتیں ہی اپنے مورخین کی طرح اس حقیقت سے اغماز برت سکتی تھیں۔

ان مشاہدات کے بعد اس امر میں شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ دور دراز کا سفر اختیار کرنے والے اور اسلحہ بردار بحری جہاز دنیا میں یورپ کا بلند مقام متعین کرنے میں پیش پیش تھے۔ ان جہازوں کی بدولت مغرب کی بحری طاقت اس درجہ فزوں ہو گئی کہ وہ سمندری راستے کے ذریعے ہونے والی تجارت پر کنٹرول کرنے لگا اور بحری طاقت سے معدوم' کمزور اور ادنیٰ معاشرے ان کے زیر تسلط ہو گئے حتیٰ کہ بحر ہند میں پرتگالیوں اور ان کے دشمن' مسلمانوں کے درمیان ہونے والی پہلی اور خاصی گھمبیر جھڑپ نے اس معاملے کو بخوبی واضح کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے گذشتہ کارناموں کے اظہار میں مبالغہ آرائی کرتے رہے ہیں' لیکن واسکوڈی گاما اور البوقرق کے روزنامچے اور رپورٹس کا مطالعہ کیجئے تو بات کچھ اور نظر آتی ہے۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مالا بار کے ساحلوں پر اور ارمز اور ملاکا کے راستے میں جھڑپ کے دوران ان کے جنگی جہازوں کو عربوں کے مستول والے بحری بیڑوں نے بارود کا نشانہ بنایا۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ان کے مخالفین پر کوئی ماورا قوت غالب تھی۔ اسلحہ بردار جہاز کے ذریعے لڑنے کی نئی تکنیک استعمال کرنے کے بعد پرتگالیوں کا عملہ سمندروں میں فی الواقع ایک ناقابل تسخیر قوت بن گیا' لیکن میدانوں میں صورت حال مختلف تھی۔ عدن' جدہ' گوا اور دوسرے علاقوں میں ہونے والی خونریز جنگیں (جن میں انہیں اکثر و بیشتر شکست کا سامنا کرنا پڑا) اس کی واضح مثال ہے۔ تاہم یہ مغربی حملہ آور اس درجہ حوصلہ مند اور وحشی تھے کہ انہوں نے سولھویں صدی کے وسط میں جینوا کی خلیج سے جنوبی بحر چین تک اپنے قلعے تعمیر کر لئے تھے۔ اگرچہ ہند اقصیٰ میں گرم مصالحہ کی تجارت پر ان کی اجارہ داری کبھی بھی قائم نہ ہو سکی' حالانکہ قدیم راستے ہی سے وینس تک ان کی ترسیل ہوتی تھی' پھر بھی وہ اس تجارتی شئے کا سارا ذخیرہ خرید کر من مانی قیمت پر فروخت کرتے تھے۔

نفع اندوزی کے مواقع اس وسیع سلطنت میں بہت زیادہ تھے جسے مغربی خطے میں فاتحین نے قائم کیا تھا۔ ہسپولیا اور کیوبا میں اپنی پہلی نو آبادی قائم کرنے کے بعد ہسپانوی مہم جو اندرون ملک دندناتے ہوئے بڑھے اور ۱۵۲۰ء کی دہائی میں میکسیکو پر قبضہ کیا۔ پھر انہوں نے ۱۵۳۰ء کے عشرے میں پیرو بھی فتح کر لیا۔ چند ہی عشروں میں یہ سلطنت جنوب کی دریائی خطے سے بڑھتے بڑھتے شمال میں ریو گرانڈ تک پھیل گئی۔ مغربی ساحلوں پر ہسپانوی جہاز رواں دواں رہتے اور ان کے جلو میں فلپائن سے آنے والے تجارتی بیڑے ہوتے جو چین سے ریشمی کپڑے لایا کرتے اور اس کے عوض پیرو کی چاندی ساتھ لے جایا کرتے۔ ہسپانوی باشندوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی دریافت شدہ "نئی دنیا" میں ہی بود و باش اختیار کریں گے۔ وہاں ایک شاہی نظام کی بنیاد ڈالیں گے' گرجا تعمیر کریں گے' مویشی پالیں گے اور کانوں کی کھدائی کریں گے۔ ان فتح کرنے والوں نے اس علاقے کے قدرتی وسائل کو اپنے قبضے میں لیا اور وہاں کے مقامی مزدوروں سے محنت و مشقت کا خوب کام لیا۔ پھر چینی' قرمز' چمڑے اور دیگر سامان خاصی مقدار میں اپنے وطن روانہ کیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے پوٹوسی کی کان سے نکلنے والی چاندی بھی اپنے وطن روانہ کی۔ واضح رہے کہ ایک صدی تک یہ دنیا سے بڑی کان شمار ہوتی رہی۔ اس طرح ماورائے اوقیانوس تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۵۱۰ء سے ۱۵۵۰ء کے درمیان ہونے والی اس تجارت میں آٹھ گنا اضافہ ہوا جبکہ ۱۵۵۰ء سے ۱۶۱۰ء کے دوران اس میں تین گنا اضافہ دیکھنے میں آیا۔

یہ تمام علامات اس امر کی دلیل تھیں کہ قائم ہونے والی یہ سلطنت مستقل رہنے کے لیے ہے۔
چنگ ہو کے بحری سفر کے برعکس' پرتگال اور ہسپانیہ کے مہم جو افراد کا عمل اس بات کا غماز تھا کہ وہ دنیا کی سیاسی اور اقتصادی حالت کو بدلنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے توپ سے لیس جہازوں اور بندوق بردار سپاہیوں کے ذریعے واقعتاً" ایسا کر دکھایا۔ پچھلے واقعات کا جائزہ لینے کے بعد بسا اوقات یہ تسلیم کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے کہ پرتگال جیسا کم آبادی اور محدود وسائل کا ملک تنے دور دراز علاقے میں پہنچ کر اس طرح مالا مال بھی ہو سکتا ہے۔ جب کہ سطور بالا میں یورپ کی فوجی اور بحری برتری کے مخصوص حالات بیان کیے گئے ہیں' ایسی باتوں کا عمل میں آنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اور جب ایسا ہو گیا تو سلطنت کے فوائد اور زیادہ کی ہوس نے ترقی کی رفتار کو مہمیز کر دیا۔

یورپ کی توسیع کی اس داستان میں کچھ ایسے عوامل ہیں جنھیں یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے' یا پھر ان کا نہایت سرسری طور پر تذکرہ ہوتا ہے۔ ان داستانوں میں ذاتی کیفیت کا کبھی تجزیہ نہیں کیا گیا حالانکہ تمام بڑی بڑی مہمات کی طرح اس میں بھی اس کی فراوانی ہے ---- مثلاً" ہنری جیسے جہازوں کی حوصلہ افزائی کے واقعات ہیں' جہاز کے کاریگروں' اسلحہ برداروں اور ادیبوں کے کارناموں میں' تاجروں کی کاراندازی میں' اور سب سے بڑھ کر ان افراد کے حوصلہ و عزم میں جنھوں نے سمندری سفر اختیار کیا' اور اپنے راستے میں حائل تمام مخالف قوتوں ---- بحر دخار' تند و تیز آب و ہوا اور وحشت ناک مناظر کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ذاتی خواہش' قومی وقار' مذہبی جوش و خروش اور پھر مہم جوئی کا ذوق ---- ایسے تمام متنوع جذبات کے سینے میں سمیٹے وہ لوگ ہر چیز کو داؤ پر لگا دینا چاہتے تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے ایسا کر دکھایا۔ یورپی فاتحین نے افریقہ' ایشیا اور امریکہ کے باشندوں پر جو اذیت ناک مظالم ڈھائے ان کا تذکرہ بھی خال خال ہوا ہے۔ اگر ان واقعات کا کہیں بمشکل ذکر بھی ہوا ہے تو اس لیے کہ اس زمانے کے بہت سے معاشروں نے ایسے لوگوں اور جماعتوں کو اکھاڑ پھینکا جو دنیا کو لقمہ لذیذ بنانے کے درپے تھے۔ البتہ یورپ کے کپتانوں' جہازی عملوں اور مہم جوؤں کو جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ تھی کہ ان کے پاس جہاز اور گولہ بارود کی موجودگی جس کی بدولت وہ اپنی خواہشات کو بروئے کار لا سکتے تھے۔ پھر وہ ایسے سیاسی ماحول سے تعلق رکھتے تھے جہاں مقابلہ' خطرہ اور کار اندازی کا دور دورہ تھا۔

یورپ کی توسیع سے جو اقتصادی فوائد حاصل ہو رہے تھے وہ بہت کافی بھی تھے اور پائیدار بھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ پہلے سے موجود حرکت و عمل میں ان کی بدولت مزید اضافہ ہوا۔ سونا' چاندی' قیمتی دھات اور گرم مصالحہ اگرچہ بہت قیمتی اور اہم چیزیں تھیں' لیکن ان کی وجہ سے کم بھڑکیلی چیزوں کی وقعت ماند نہیں پڑی جو یورپ کے سیاحوں کی بدولت بندرگاہوں تک پہنچ رہی تھیں۔ نیوفونڈ لینڈ کی مچھلیوں تک رسائی کی وجہ سے یورپ کو وافر مقدار میں غذا حاصل ہونے لگی۔ پھر بحر اوقیانوس سے وہیل مچھلی اور سگ ماہی کے روغن حاصل ہونے لگے جو روشنی کرنے' پہیا چلانے اور دیگر بہت سے کاموں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ شکر' رنگ' تمباکو' چاول' پر' نمبر' نماز اور مکئی جیسی نئی پیداوار برعظیم کی دولت اور خوشحالی میں اضافے کا باعث ہوئیں تاہم بعد میں غلہ' گوشت اور روئی بھی آنے لگی۔ لیکن میں یہاں انیسویں صدی کے

اواخر میں دنیا کی شہری اقتصادیات کی پیش گوئی کرنا اس خیال سے ضروری نہیں سمجھتا کہ پرتگالی اور ہسپانوی باشندوں کی دریافت حد درجہ اہم تھی' جن نے چند عشروں کے اندر اندر براعظم کے مغربی حصوں کو خوشحالی اور استحکام بخشا۔ ماہی گیری جیسی وسیع تجارت کی بدولت بہت سے لوگوں کو مچھلی پکڑنے اور اس کی تقسیم کاری کا روزگار میسر ہوا۔ اس سے منڈی کی معیشت کو فروغ حاصل ہوا۔ ان تمام باتوں کے نتیجے میں یورپ میں جہاز سازی کی صنعت کو خاصا عروج حاصل ہوا اور لندن' برسٹل' انٹورپ' ایمسٹرڈم اور دیگر بندرگاہوں میں کاریگروں' رسد کنندوں' بیوپاریوں اور بیمہ کاروں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ مغربی یورپ کی آبادی کا وافر حصہ سمندر پار پھلوں کی تجارت میں بھرپور دلچسپی لینے لگا۔

ان اشیاء کی فہرست میں جب کوئی ان چیزوں کو بھی شامل کرتا ہے جن کی تجارت سرزمین روس میں فروغ پر تھی' مثلاً" سمور' چمڑا' لکڑی' سن' نمک اور غلہ وغیرہ (یہ سب سامان وہاں سے مغربی یورپ درآمد ہوتے تھے۔) تب دانشور اسے "جدید عالمی نظام" کا آغاز قرار دیتے تھے۔ انفرادی طور پر جو بھی توسیع عمل میں آ رہی تھی' وہ رفتہ رفتہ باہم مربوط ہو رہی تھی۔ جنیوا کے ساحل کا سونا اور پیرو کی چاندی پرتگالی' ہسپانوی اور اطالوی باشندے استعمال کرتے تھے۔ اور وہ ان اشیاء کے تبادلے میں مشرقی ممالک کے مصالحے اور ریشمی کپڑے دیا کرتے تھے۔ روس سے حاصل کردہ چمڑا اور نمبر کے عوض انگلستان سے فولادی بندوقیں خریدی جاتی تھیں۔ بالٹک کے علاقے کے غلے بحیرہ روم کے راستے ایمسٹرڈم بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح مسلسل باہمی ربط پیدا ہوا' یورپ کو وسعت حاصل ہوئی' نئی نئی دریافتیں عمل میں آئیں' تجارت کی وجہ سے توسیع کا سلسلہ مزید پھیل گیا۔ ضروری نہیں کہ ترقی کا یہ عمل یکساں رہا ہو۔ یورپ کی عظیم جنگ اور معاشرتی بے اطمینانی کی وجہ سے سمندر پار کی کاروائیوں میں یقیناً" رکاوٹیں پیدا ہوئی ہوں گی۔ اگرچہ اپنی نوآبادیات قائم کرنے والی طاقتوں نے وقتی طور پر ہی سہی اس مہم جوئی سے دست برداری اختیار کر لی ہو گی' لیکن جلد ہی توسیع اور نئی دریافت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو گا۔ اگر مستحکم سلطنتیں ایسے اقدامات نہ کرتیں تو ان کی جگہ کوئی اور یہ کام بہ رضا و رغبت کرنے لگتا۔

تمام قوتوں کے متحرک رہنے کی وجہ دراصل یہی تھی۔ یورپی ریاستوں کے دشمن سمندر پار کے علاقوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ انھوں نے کیسی ہی کوشش کی ہو' یہ حقیقت ہے کہ اسپین اور پرتگال نے بیرونی دنیا میں اپنی اجارہ داری کی خاطر خواہ مدافعت نہیں کی' خاص طور پر ایسی صورت حال میں جب یہ معلوم تھا کہ یورپ سے کیتھے (چین) تک پہنچنے کا شمال مشرقی یا شمال مغربی راستہ موجود نہ تھا۔ ۱۵۶۰ء کے عشرے میں ولندیزی' فرانسیسی اور برطانوی جہاز بحر اوقیانوس سے آگے تک پہنچ رہے تھے۔ بعد ازاں یہ بحر ہند اور بحرالکاہل میں بھی داخل ہو گئے۔ اس عمل میں تیزی دراصل برطانیہ کی کپڑے کی تجارت میں نقصان اور نیدر لینڈ کی بغاوت کے نتیجے میں آئی تھی۔ شاہی سرپرستی' ایمسٹرڈم اور لندن کے بڑے بڑے تاجروں کا مالی تعاون' اصلاحات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مذہبی اور قومی جذبے' تجارت اور لوٹ کھسوٹ کی نئی مہم جوئی یہ سارے عناصر شمال مغربی یورپ سے چل کر مال غنیمت بٹورنے والوں کو متحرک کیے ہوئے تھے۔ اس وقت ان باتوں کے امکانات تھے کہ شان و شکوہ اور دولت حاصل کی جائے' دشمنوں پر کاری ضرب لگا کر اپنے

ملک کے وسائل کو دو چند کیا جائے' اور نئی سرزمین کے باشندوں کو اپنے مذہب کے مطابق ڈھالا جائے۔ ایسی مہمات کی مخالفت میں کوئی دلیل دینا کیوں کر ممکن ہے؟

تجارت اور نوآبادیات کے سلسلے میں پیدا ہونے والی روز افزوں دشمنی کا ایک روشن پہلو یہ بھی تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے بہت سے کارناموں کے پس پردہ ہتھیاروں کی دوڑ اور سمندر پار تجارت' پر قبضہ جمانے کا رجحان کارفرما تھا' لیکن اس کے نتیجے میں بے شمار فوائد بھی حاصل ہوئے۔ اعلیٰ درجے کی نقشہ نویسی' جہاز رانی کے جدول' ٹیلی سکوپ' بیرومیٹر' بیک اسٹاف اور قطب نما جیسے اوزار اور جہاز رانی کی بہتر صنعت نے بحری سفر کو آسان تر بنا دیا۔ نئی نئی اقسام کی کاشت اور پودوں کی درآمد سے نہ صرف اچھی غذا کا حصول ممکن ہوا بلکہ علم نباتات اور زرعی سائنس میں بھی ان کی بدولت ترقی ہوئی۔ دھات کے استعمال کے ہنر اور فولادی صنعت نے خاصی ترقی کی۔ کانوں کی گہری کھدائی کرنے کے فن میں بھی اضافہ ہوا۔ روزافزوں اقتصادی ترقی اور سائنسی علوم کے فروغ سے علم نجوم' طب' طبیعات اور انجنیرنگ کو بہت فائدے پہنچے۔ انسانی دماغ زیادہ سے زیادہ مشاہدات و تجربات میں مصروف تھا۔ چھاپے خانے جہاں مقامی زبانوں میں بائبل اور سیاسی نوعیت کی کتابیں شائع کر رہے تھے' وہاں ایجادات و مشاہدات کو بھی منظر عام پر لا رہے تھے۔ علم و دانش کی توسیع کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کو تکنیک اور فوجی قیادت میں مزید برتری حاصل ہوگئی۔ حتیٰ کہ عثمانی سلطنت کے نہایت مستحکم اراکین اور ان کے صف اول کے فوجی اور جہازراں سولھویں صدی کے اواخر میں ان امور کے نتائج کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ دوسری طرف غیر فعال معاشرے کے لیے یہ حقائق سوہان روح بنتے جا رہے تھے۔ کیا ایشیا کے بعض ممالک جو اپنے طور پر تجارت و صنعت میں انقلابی اقدامات کر چکے تھے' وہ ان اثرات سے بالکل بے نیاز تھے' یہ شک و شبہ کی بات ہے لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت تھی کہ ایسی صورت میں جب عالمی طاقت کی سیڑھی کے بالائی ڈنڈوں پر یورپ کی ترقی یافتہ ریاستوں کا قدم جم چکا تھا' دوسرے ملکوں کے لیے وہاں تک رسائی نہایت مشکل تھی۔

یہ مشکل اس لیے مزید گمبیر ہو گئی تھی کہ اس سیڑھی پر قدم جمانے کے لیے نہ صرف یورپی سازوسامان اور تکنیک کی ضرورت تھی بلکہ وہ اوصاف و خصائل بھی مطلوب تھے جن کی بدولت یورپ کے معاشرے دیگر تمام معاشروں میں ممتاز و منفرد تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسی معیشت بازار کا قیام عمل میں آئے جو آدم اسمتھ کی تجویز کے مطابق نہ سہی' ـــ کم از کم اتنی تو ہو کہ تاجر اور کار انداز ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنیں اور ان کے کام میں رکاوٹ نہ پیدا کی جائے۔ اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ مجموعی طاقتوں کے مراکز قائم ہوں اور ہر ایک مرکز اپنی اقتصادی بنیاد پر استوار ہو تاکہ مشرقی طرز حکومت کی طرح اس پر آمرانہ مرکزیت کا تسلط نہ رہے۔ نیز' مسابقت کے ترقی یافتہ عوامل کار فرما ہوں۔ وسیع معنوں میں یوں کہیے کہ اقتصادی اور سیاسی ناہمواری کے نتیجے میں ثقافتی اور نظریاتی خلا بھی جنم لیتا ہے' یعنی اس صورت حال میں تلاش و تحقیق کی آزادی نہیں رہتی' آپس میں مسابقت کی اجازت نہیں ہوتی اور تجربے کا پروانہ نہیں ملتا۔ نیز' ترقی کے امکانات پر کامل یقین نہ ہو' عمل پر توہمات کا غلبہ ہو اور عالموں' مذہبی رہنماؤں اور روایتی

کہانیوں پر حقیقت کا ذرا بھی پرتو نہ ہو۔ بہت سی باتوں میں مثبت پہلو نمایاں نہ تھا اور اقتصادی ترقی اور سیاسی تنوع کے مابین توازن قائم کرنے کے عوامل ناپید تھے پھر بھی یورپ کو دیگر ملکوں کے مقابلے میں مساعد حالات کا سامنا نہ تھا۔

اگرچہ اس کو ثابت کرنا مشکل ہے' پھر بھی شک پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ سارے عوامل عملی طور پر ایک دوسرے سے مربوط نہ رہے ہوں اور ایسا ہونا ناگزیر بھی رہا ہو۔ یہ دراصل اقتصادی عدم مداخلت' کثیر سیاسی و فوجی مفادات اور انفرادی آزادی کی مجموعی کیفیت تھی جو اگرچہ نامکمل اور ابتدائی صورت میں تھی' پھر بھی "یورپی معجزہ" پیش کرنے کی محرک بنی۔ چونکہ یہ معجزہ تاریخی لحاظ سے عدیم المثال تھا' لہٰذا یہ قیاس آرائی معقول نظر آتی ہے کہ اس کے جملہ عوامل نے مل کر ہی کوئی پیش رفت کی ہوگی۔ چونکہ یہ اہم عناصر نہ تو منگ چین میں موجود تھے اور نہ ہی مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے مسلم ممالک میں ان کا وجود تھا اور نہ ہی ان ممالک میں ان کا سراغ ملتا تھا جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے' لہٰذا جب یورپ عالمی اسٹیج پر نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو یہ یقیناً" وہاں موجود تھے۔

۔۲۔

حصول اقتدار کے لیے ہیبسبرگ خاندان کی کوشش

۱۵۱۹ء - ۱۶۵۹ء

سولھویں صدی کے دوران یورپ میں حصول اقتدار کے لیے ہونے والی جنگ نے اس ملک کو اقتصادی اور فوجی لحاظ سے دنیا کے دیگر ملکوں کے مقابلے میں ترقی کرنے کے مواقع بھی فراہم کیے۔ البتہ یہ بات طے نہیں تھی کہ آیا متحارب ریاستوں میں سے کوئی ایک ریاست دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لا سکے گی اور اس طرح سب کی حکمران بن جائے گی۔ ۱۵۰۰ء کے بعد تقریباً" ڈیڑھ صدی تک ہیبسبرگ خاندان کے ہسپانوی اور آسٹرین اراکین پورے براعظم پر مشتمل سلطنت' ریاست اور صوبوں کے حکمران تھے اور اس طرح تمام یورپ میں سیاسی اور مذہبی لحاظ سے اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ہیبسبرگ خاندان کی طویل جدوجہد اور دیگر یورپی ریاستوں کے اتحاد کے کے نتیجے میں بالآخر اس کی شکست و ریخت ایک ایسی داستان ہے جو زیر نظر باب کا بنیادی موضوع ہے۔ جب ۱۶۵۹ء میں اسپین نے صلح پیرینز کے موقع پر بالآخر اپنی شکست تسلیم کر لی تو ان دنوں یورپ کی سیاسی وحدت جو پانچ چھ بڑی بڑی ریاستوں اور مختلف چھوٹی چھوٹی جاگیروں پر مشتمل تھی' ایک ناقابل تردید حقیقت بن چکی تھی۔ ان اہم ریاستوں میں کون اس عظیم طاقتی نظام کے اندر ہونے والی تبدیلی سے زیادہ فائدہ اٹھانے والی تھی' اس کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ ویسے سترھویں صدی کے وسط تک یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ کوئی بھی فوجی طاقت کا حامل خاندان پورے یورپ کا تنہا حکمران بننے کا اب اہل نہیں رہا تھا جیسا کہ گزشتہ کئی عشروں سے یہ بات ممکن بنتی رہی تھی۔

رواں صدی اور اس سے قبل کے پچاس برسوں میں یورپی اقتدار کے حصول کے لیے جو مشترکہ جدوجہد جاری رہی ہے وہ ۱۵۰۰ء سے قبل کی جنگوں سے بلا لحاظ ہیئت و اقدار بالکل مختلف ہے۔ گزشتہ ایک سو سال میں وقوع پذیر ہونے والی جن معرکہ آرائیوں نے یورپ کے امن و امان کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا' وہ مقامی نوعیت کی تھیں ------ یعنی متعدد اطالوی ریاستوں کے مابین ہونے والی جھڑپیں' برطانوی اور فرانسیسی تاج و تخت کا باہمی تنازع' جرمانی نائٹس کی اہل لیتھونیا اور پولستان کے خلاف ہونے والی جنگیں' یہ سب عجیب و غریب مثالیں تھیں۔ سولھویں صدی کے اختتام کے ساتھ ہی یورپ کی یہ روایتی اور علاقائی لڑائیاں آہستہ آہستہ ماند پڑ گئیں۔ گویا اب پورے براعظم کی حکمرانی کے لیے مقابلتاً" عظیم جنگ کی تیاری

متوقع تھی۔

جدوجہد کا مفہوم اور تقویم

کسی ریاست کی توسیع میں جہاں مخصوص اسباب و عوامل کار فرما تھے وہاں دو عام وجوہات بھی یورپی جنگوں کی شدت اور جغرافیائی تناظر کی ہمہ گیری کی ذمہ دار تھیں۔ پہلی وجہ تو تحریک اصلاحات تھی جو ۱۵۱۷ء میں پاپائیت کے خلاف مارٹن لوتھر کی بغاوت کے نتیجے میں رونما ہوئی۔ اس نے براعظم میں خاندانوں کی روایتی چپقلش کو نیا رنگ دے دیا۔ مخصوص نوعیت کے سماجی و اقتصادی اسباب کی بناء پر جو پروٹسٹنٹ اصلاحات کی تحریک اور اس کے جواب میں کیتھولک اصلاحات کی تحریک رونما ہوئی اس نے جنوبی یورپ کے نصف حصے کو شمال سے جدا کر دیا اور شہر کے متوسط طبقے کو جاگیرداروں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ واضح رہے کہ اس خط بندی میں دیگر اسباب و عوامل بھی کار فرما تھے لیکن بنیادی نقطہ یہ تھا کہ "عیسائیت" کو دھچکا لگا تھا اور اب براعظم میں ایسی متعدد ہستیاں نمودار ہو گئی تھیں جو مذہبی عقائد پر باہم دست و گریبان ہو گئیں۔ جب سترھویں صدی کے وسط میں لوگ مذہبی جنگوں کی کثرت سے تنگ آ گئے تو یورپ کی مذہبی عقیدے پر مبنی تقسیم ناگزیر ہو گئی۔

۱۵۰۰ء کے بعد ہونے والی وسیع نوعیت کی اس مربوط جنگ کی دوسری وجہ ہیبسبرگ خاندان تھا جس نے نئے نئے مقبوضات کا ایسا جال پھیلا رکھا تھا جو جبرالٹر سے ہنگری اور سسلی سے ایمسٹرڈم تک محیط تھا۔ یہ ایسی وسیع سلطنت تھی جو سات سو سال قبل چارلی میگن کے زمانے سے اب تک یورپ میں دیکھی نہیں گئی تھی۔ ہیبسبرگ خاندان کے حکمران اصلاً" آسٹرین تھے۔ انھوں نے کچھ ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ ہر بار ہولی رومن شہنشاہ کے تخت پر جلوہ افروز ہو جاتے تھے۔ اگرچہ قرون وسطی سے تخت شاہی کی طاقت میں کمی آ گئی تھی' لیکن شاہزادگان ہنوز اس بات کے خواہش مند تھے کہ انھیں مکمل اقتدار حاصل ہو تاکہ وہ جرمنی اور یورپ کے عمومی امور میں اہم کردار ادا کر سکیں۔

ہیبسبرگ خاندان شادی' بیاہ اور وراثت کے ذریعے اپنے علاقوں کی توسیع کرنے میں کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی مثال آسٹریا کا میکسی میلن اول (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء - نیز ہولی رومن شہنشاہ ۱۵۰۸ء تا ۱۵۱۹ء) تھا جسے ورثے میں برگنڈی کے نہایت زرخیز علاقے اور ۱۴۷۷ء نیدرلینڈ میں وراثت میں ملا تھا۔ دوسری مثال ۱۵۱۵ء میں ہونے والی شادی تھی جس کے نتیجے میں ہنگری اور بوہیمیا کے علاقے اس کے تصرف میں آ گئے۔ اگرچہ اول الذکر ہولی رومن سلطنت کے دائرے میں نہیں آتا تھا اور اسے بہت سی مراعات حاصل تھیں' تاہم اس کے حصول سے ہیبسبرگ خاندان کو وسطی یورپ سے آگے بہت سی زمینیں میسر ہو گئیں۔ لیکن میکسی میلن کے خاندانی روابط کا سب سے بڑا فائدہ اس وقت پہنچا جب اس کے بیٹے فلپ کی اسپین کے فرڈیننڈ اور ازا بیلا کی بیٹی جون سے شادی ہوئی۔ واضح رہے کہ خود فرڈیننڈ اور ازا بیلا کی شادی کے نتیجے میں اسے کیسل اور آراگون کا قبضہ ملا تھا (اس میں نیپلز اور سسلی بھی شامل تھا)۔ شادی کے ان تمام بندھنوں کا "باقی ماندہ وصیتی" فلپ اور جون کا بیٹا چارلس تھا۔ جو ۱۵۰۰ء میں پیدا ہوا۔ پندرہ سال بعد اسپین کا چارلس

اول متعین ہوا۔ ۱۵۱۹ء میں اپنے دادا میکسی میلن اول کے انتقال کے بعد یہ ہولی رومن شہنشاہ بھی قرار پایا۔
آسٹریا میں ہیبسبرگ خاندان کی موروثی جائیداد کا حکمران بھی بن گیا۔ بعد ازاں شہنشاہ چارلس پنجم کی حیثیت
میں اس نے دیگر چاروں ورثے یکجا کر دیے تاآنکہ ۵۶-۱۵۵۵ء میں اسے اقتدار سے دست بردار ہونا پڑا۔
(ملاحظہ کیجیے نقشہ ۳) چند ہی سال بعد جب ۱۵۲۶ء میں ہنگری کا لاولد شاہ لوئیس موہیکس کی جنگ میں ترکوں
کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تو چارلس نے ہنگری اور بوہیمیا کے تخت پر قبضہ جما لیا۔

ان علاقوں کی واضح تفاوت اور پھیلاؤ سے جس کا ذیل میں مزید تجزیہ کیا جائے گا یہ حقیقت سامنے
آتی ہے کہ ہیبسبرگ شہنشاہیت ایشیا کی واحد اور مرکزی سلطنتوں کے مماثل نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ ۱۵۲۰ء کی
دہائی میں بھی جب چارلس نے اپنے چھوٹے بھائی فرڈیننڈ کو آسٹریا کی موروثی جائیداد کا نگران بنایا تھا اور ہنگری
اور بوہیمیا جیسے نئے علاقے بھی اس کی تحویل میں دے دیے تھے۔ چارلس کی دست برداری سے قبل یہ
بات واضح ہو چکی تھی کہ ایک ہی شخص موثر اور بہتر انداز میں ہسپانیہ اور آسٹریا کی موروثی سلطنتوں کی دیکھ
بھال نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کے باوجود دوسرے شاہزادے اور ریاستیں ہیبسبرگ خاندان کی اس روز
افزوں جاہ و حشمت کو کسی اور انداز میں دیکھ رہے تھے۔ فرانس کے ویلوئس شہنشاہ جو اندرونی طور پر اپنے
اقتدار کو مستحکم کر رہے تھے اور اطالیہ کے زرخیز علاقوں تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے خواہاں تھے،
انھیں چارلس پنجم کے بڑھتے ہوئے مقبوضات فرانس کے لیے خطرے کا باعث نظر آئے۔ چنانچہ اس امر کے
اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگلی دو صدیوں تک فرانس کی یہی کوشش رہی ہو گی کہ وہ ہیبسبرگ خاندان کے
اثرات کو زائل کرے۔ اسی طرح جرمنی کے شاہزادوں اور نمائندگان، جنھوں نے شہنشاہ کے اقتدار کے
خلاف طویل عرصے تک جدوجہد کی تھی، چارلس پنجم کی بڑھتے ہوئے مقبوضات اور اس کے مستحکم اقتدار سے
یقیناً فکر مند ہوئے ہوں گے۔ بہت سارے پاپاؤں نے بھی ہیبسبرگ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ناپسند کیا تھا
حالانکہ ترکوں اور دیگر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں اس خاندان کی ضرورت بھی تھی۔

یورپ کے ریاستی نظام میں پائی جانے والی دشمنیوں کے پیش نظر یہ امر محال تھا کہ ہیبسبرگ خاندان
ہر طرح کے چیلنج سے بے نیاز رہا ہو گا۔ ان کے درمیان جھگڑے اور عناد کی صورت حال، اصلاحات کے نتیجے
میں پیدا ہونے والی مذہبی چپقلش کے باعث مزید خراب ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈیڑھ صدی
کے دوران ہیبسبرگ کے مشہور و معروف اور نہایت طاقت ور شہنشاہوں --- شاہ چارلس پنجم، اس کے
جانشین فرڈیننڈ دوم (۱۶۱۹ء - ۱۶۳۷ء) ہسپانوی بادشاہ فلپ دوم (۱۵۵۶ء - ۱۵۹۸ء) اور فلپ چہارم (۱۶۲۱ء -
۱۶۶۵ء) نے کیتھولک عقیدے کی نہایت دلیرانہ انداز میں مدافعت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی طاقت کو
مذہب سے علیحدہ کرنا مشکل ہو گیا۔ اگر چارلس پنجم ۱۵۴۰ء کے عشرے میں جرمنی کے پروٹسٹنٹ شاہزادوں کی
بیخ کنی کر دیتا تو اس دور کا ہر شخص یقیناً اس بات کو سراہتا۔ یہ نہ صرف کیتھولک عقیدے کی فتح ہوتی بلکہ
ہیبسبرگ خاندان کا دبدبہ بھی مزید بڑھ جاتا اور یہی بات فلپ دوم پر بھی صادق آتی، اگر وہ ۱۵۶۶ء کے بعد
نیدرلینڈ میں ابھرنے والی مذہبی شورش کو کچل دیتا اور ۱۵۸۸ء میں برطانیہ پر حملے کے لیے ہسپانوی بحریہ کی
روانگی بھی صحیح قرار دی جاتی۔ مختصر یہ کہ قومی اور خاندانی دشمنیوں میں مذہبی جوش و خروش کچھ اس طرح

حلول کر گیا تھا کہ پہلے جہاں آپس میں سمجھوتہ کر لینے کی خواہش ابھرتی تھی، اب وہاں ایک دوسرے سے
دست و گریبان ہونے کا منظر نظر آنے لگا۔

۱۵۱۹ء میں چارلس پنجم کی بحیثیت/بطور مقدس رومن شہنشاہ تاجپوشی سے لے کر ۱۶۵۹ء میں پرینیز کی
صلح کے موقع پر اسپین کی شکست کا اعتراف تک کے تمام عرصے کی وضاحت کے لیے "حصول اقتدار کے لیے
ہیبسبرگ خاندان کی کوشش" کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہیبسبرگ
شہنشاہوں کے تمام دشمنوں کو پختہ یقین تھا کہ یہ لوگ مکمل حکمرانی کے رسیا تھے۔ آخر کار الزبتھ دور کے
ادیب فرانسس بیکن کو ۱۵۹۵ء میں اسپین کے اقتدار کی ہوس اور وہاں کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم کی گرم
بازاری کی کچھ اس انداز میں وضاحت کرنی پڑی:

> "فرانس کو زیر کر لیا گیا ہے ......پرتگال پر قبضہ جما لیا گیا ہے......چھوٹے چھوٹے
> ملکوں پر جنگ مسلط کر دی گئی ہے...... آراگون کے ساتھ بھی آج یہی کچھ ہوا
> ہے......غریب اور آزاد ہندوستانیوں کو غلام بنا کر لایا جا رہا ہے"۔

ہیبسبرگ حکومت کے چند وزراء "عالمی حکومت" قائم کرنے کا زبانی دعویٰ تو کرتے تھے لیکن اس
کے باوجود وہ یورپ پر تسلط جمانے کے لیے نپولین یا ہٹلر جیسا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں رکھتے تھے۔ ہیبسبرگ
خاندان میں ہونے والی بعض شادیاں اور جانشینیاں محض وقتی جوش و خروش پر مبنی تھیں اور علاقائی سالمیت
کے لیے طویل المیعاد قسم کا کوئی منصوبہ روبہ کار نہ تھا۔ بعض صورتوں میں ----- مثلاً" شمالی اٹلی پر فرانس
کا مسلسل حملہ ---- ہیبسبرگ شہنشاہ جذبات میں تو آ جاتے تھے، لیکن دوسروں کے جذبات کو برانگیختہ نہیں
کر پاتے تھے۔ ۱۵۴۰ء کے عشرے کے بعد بحیرہ روم میں ہسپانوی اور شاہی افواج اسلامی حملوں کے دفاع کے
لیے بار بار متعین ہوتی رہیں۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اگر ہیبسبرگ حکمرانوں کے جملہ مقاصد حاصل ہو جاتے اور
دفاعی منصوبہ بھی پورا ہو جاتا تو کیا پورے یورپ پر ان کی حکمرانی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جاتا؟ کیا سلطنت
عثمانیہ شمالی افریقہ کے ساحلوں اور مشرقی بحیرہ روم کے پانی سے پیچھے دھکیل دی جاتی؟ کیا مذہبی عقائد جرمنی
میں ختم کر دیے جاتے؟ کیا نیدرلینڈ کی بغاوت کچل دی جاتی؟ کیا فرانس اور انگلینڈ کی دوستانہ حکومتیں برقرار
رہتیں؟ کیا صرف اسکینڈی نیویا، پولینڈ، ماسکووی اور سلطنت عثمانیہ کے زیر تسلط علاقے ہی ہیبسبرگ حکومت
کے زیر نگیں نہیں رہتے؟ منگ چین میں اتحاد کا جو نظام تھا اگرچہ اب تک یورپ کی رسائی وہاں تک نہیں
ہو سکی تھی، لیکن ہیبسبرگ کے دو مراکز، میڈرڈ اور ویانا جس سیاسی اور مذہبی اصول کی حمایت کرتے تھے اس
نے تو براعظم کی اجتماعیت کو ہی یکسر ختم کر دیا ہو گا۔

ڈیڑھ صدی کے دوران ہونے والی جنگوں کے واقعات اس تجزیے میں مختصراً" ہی بیان کیے جا سکتے

ہیں۔ موجودہ دور کے قاری کے لیے جو بات مختلف جنگوں (پاویا، لوزن وغیرہ) کے نام اور نتائج سے کہیں زیادہ دلچسپی کا باعث ہے وہ ان لڑائیوں کا دورانیہ ہے، مثلاً" ترکوں کے خلاف محاذ آرائی کئی عشروں تک جاری رہی۔ اسپین نیدر لینڈ کی بغاوت کو ۱۵۶۰ء کی دہائی سے لے کر ۱۶۴۸ء تک دبانے میں مصروف رہا، (البتہ درمیان میں تھوڑا وقفہ ہوا تھا) اور اسی لیے بعض کتابوں میں اسے اسی سالہ جنگ کہا گیا ہے۔ اسی طرح آسٹریا اور ہسپانیہ کے ہیبسبرگ خاندان والوں نے ۱۶۱۸ء میں دشمن ریاستوں کے خلاف جس گھمبیر جنگ کا آغاز کیا تھا وہ ۱۶۴۸ء میں صلح ویسٹ فالیا پر منتج ہوئی اور یوں "تیس سالہ جنگ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس طرح گویا مختلف ریاستوں کو سال بہ سال اور عشرہ بہ عشرہ جنگ کے اخراجات برداشت کرنے پڑے۔ پھر جنگ کے لوازمات اور بھی پیچیدہ ہو گئے کیونکہ اسی دور میں ایک "فوجی انقلاب" رونما ہوا جس نے لڑنے کے طریقے کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور اسے پہلے سے کہیں زیادہ مہنگا بنا دیا۔ اس ہونے والی تبدیلی اور اس کے اسباب و عوامل پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ بایں ہمہ، واقعات کے تسلسل کا جائزہ لینے سے قبل، یہ جاننا ضروری ہے کہ ۱۵۲۰ء کے عشرے میں افرادی اور مالی لحاظ سے فوجی جھڑپیں نہایت مختصر پیمانے پر ہوا کرتی تھیں جب کہ ان کے مقابلے میں ۱۶۳۰ء کی دہائی کے معرکے حد درجہ وسیع ہوتے تھے۔

ان اہم جنگوں کا پہلا سلسلہ اٹلی سے شروع ہوا جب وہاں کی دولت مند مگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے شہنشاہ فرانس کو ۱۴۹۴ء کے اوائل میں حملہ کرنے پر اکسایا لیکن اس حملے کے نتیجے میں دشمن قوتوں (اسپین، آسٹریا، ہیبسبرگ حتیٰ کہ انگلینڈ) کا اتحاد بھی قائم ہوگیا اور سب نے مل کر فرانس کو فوج کی واپسی پر مجبور کیا۔ جبکہ ۱۵۱۹ء میں اسپین اور فرانس کی آپس میں لڑائی ہنوز جاری تھی۔ اس کی بڑی وجہ آخرالذکر کا میلان پر دعویٰ تھا۔ اسی دوران یہ خبر موصول ہوئی کہ چارلس پنجم کو بطور بحیثیت مقدس رومن شہنشاہ منتخب کر لیا گیا ہے اور اس طرح وہ ہیبسبرگ خاندان کے ہسپانوی اور آسٹرین علاقے کا وارث بن چکا تھا۔ اپنے سب سے بڑے دشمن کے ان اعزازات و خطابات نے فرانس کے بادشاہ، فرانس اول (۱۵۱۵ء - ۱۵۴۷ء) کو معرکہ آرائی کا ایک ایسا سلسلہ قائم کرنے پر اکسایا جو صرف اٹلی تک محدود نہیں تھا بلکہ برگنڈی، جنوبی نیدر لینڈ اور اسپین کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ فرانس اول کا اٹلی پر حملہ بالآخر جنگ پاویا (۱۵۲۵ء) میں اس کی شکست پر منتج ہوا۔ لیکن چار سال کے بعد فرانس کا حکمران اٹلی پر فوج کشی کے لیے پھر بڑھ رہا تھا۔ تاہم ہیبسبرگ کی فوجوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ اگرچہ فرانس ۱۵۲۹ء میں صلح کیمبرائی کے موقع پر اٹلی پر اپنے دعوے سے ایک بار پھر دست بردار ہوگیا تھا، لیکن وہ ۱۵۳۰ء اور ۱۵۴۰ء کے عشروں میں چارلس پنجم کے مقبوضات پر قبضہ جمانے کے لیے جنگ کرتا رہا۔

اس زمانے میں فرانس اور ہیبسبرگ کی طاقتوں کے عدم توازن کے پیش نظر چارلس پنجم کے لیے یہ چنداں مشکل نہیں رہا ہو گا کہ وہ فرانس کے توسیع پسندانہ عزائم کی روک تھام کرے۔ لیکن یہ کام خاصا دشوار بھی تھا۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ مقدس رومن شہنشاہ بن جانے کے بعد اس کے بہت سارے دشمن پیدا ہوگئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک / خطرناک ترک تھے۔ انھوں نے ۱۵۲۰ء کے عشرے میں نہ صرف ہنگری کے علاقے تک اپنی سلطنت کی توسیع کر لی تھی (جبکہ ۱۵۲۹ء میں ویانا کا محاصرہ کر رکھا تھا)

بلکہ اٹلی پر ان کے بحری حملے کا خطرہ بھی منڈلا رہا تھا۔ پھر انھوں نے شمالی افریقہ کے بربر قزاقوں کی معیت میں اسپین کے ساحلوں پر دھاوا بول دیا۔ جس نے صورت حال کو مزید سنگین بنا دیا اس عرصے میں عثمانی سلطان اور فرانس اول کے مابین ہیبسبرگ خاندان کے خلاف ایک خاموش معاہدہ طے پا چکا تھا۔ چنانچہ ۱۵۴۲ء میں فرانسیسی اور عثمانی بحری بیڑے نے مل کر نائس پر حملہ کر دیا۔

چارلس پنجم کو جرمنی میں بھی مشکلات کا سامنا تھا۔ مذہبی اصلاحات کی وجہ سے جرمنی کئی حصوں میں بٹ چکا تھا۔ لوتھر نے پرانے عقائد کے خلاف جو مہم چلائی تھی اسے پروٹسٹنٹ ریاستوں کی حمایت حاصل ہو چکی تھی۔ چارلس پنجم کے دیگر مسائل کے پیش نظر یہ بات اتنی تعجب خیز نہیں کہ وہ ۱۵۴۰ء کی دہائی کے وسط تک لوتھر کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی جانب بھرپور توجہ نہیں دے سکا۔ لیکن جب اس نے اس سمت قدم اٹھایا تو پہلے ہی مرحلے میں اسے کامیابی ہوئی اور اس نے ۱۵۴۷ء میں مولبرگ کے میدان میں پروٹسٹنٹ شاہزادوں کو شکست دے دی۔ لیکن ہیبسبرگ خاندان اور اس کی سلطنت میں معمولی سی بھی علاقائی توسیع چارلس پنجم کے دشمنوں کو اس قدر ہوشیار کر دیتی کہ شمالی جرمنی کے شاہزادے، ترک، فرانس کا ہنری دوم (۱۵۴۷ء - ۱۵۵۹ء)، حتیٰ کہ پاپائیت اس کے اقتدار کو زک پہنچانے کے درپے ہو جاتے۔ ۱۵۵۲ء کے لگ بھگ فرانسیسی افواج ان پروٹسٹنٹ ریاستوں کی حمایت کے لیے جرمنی کی جانب پیش قدمی کر گئیں جو شہنشاہ کے مرکزیت کے رجحانات کے خلاف نبرد آزما تھیں۔ ۱۵۵۵ء میں ہونے والی آگسبرگ کی صلح اس اقدام کا واضح اعتراف تھا۔ اس کی بدولت جرمنی میں مذہبی جنگ عارضی طور پر بند ہو گئی۔ پھر ۱۵۵۹ء میں ہونے والی کیٹو کمبریسس صلح کے نتیجے میں فرانسیسی - ہسپانوی جھگڑا بھی ختم ہو گیا۔ اس تبدیلی کا اعتراف چارلس پنجم نے بھی اپنی دست برداری کے ذریعے کیا تھا جب ۱۵۵۵ء میں وہ اپنے بھائی فرڈیننڈ اول (جو ۱۵۵۵ء سے ۱۵۶۴ء تک بادشاہ رہا) کے حق میں مقدس رومن شہنشاہ کے تخت سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ پھر ۱۵۵۶ء میں اپنے لڑکے فلپ دوم (۱۵۵۶ء - ۱۵۹۸ء) کے حق میں اسپین کی بادشاہت بھی چھوڑ دی۔ اگر اس واقعہ کے بعد بھی آسٹرین اور ہسپانوی شاخیں باہم مربوط رہیں تو مورخ میمیٹی کے الفاظ میں اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ جس طرح فوجی وردی کے اوپر سیاہ رنگ کا دو سروالا عقاب بنا ہوتا تھا، اسی طرح ہیبسبرگ کے بھی دو سر تھے، ایک ویانا میں، دوسرا میڈرڈ میں۔ ان میں ایک مشرق کو دیکھتا تھا تو دوسرا مغرب کو!

مشرقی شاخ جب تک فرڈیننڈ اول اور اس کے جانشین میکسی میلن (جو ۱۵۶۴ء سے ۱۵۷۶ء تک بادشاہ بنا رہا) کے زیر نگیں رہی، وہاں امن و امان قائم رہا۔ البتہ (۶۷-۱۵۶۶ء کے دوران ترکوں کے حملے کی وجہ سے بدامنی پھیل گئی تھی)، لیکن اسپین کی مغربی شاخ فلپ دوم کی ماتحتی میں اتنی خوش نصیب نہیں رہی تھی۔ بربر قزاق پرتگال اور کیسٹل کے ساحلوں پر مسلسل حملہ کر رہے تھے۔ ان کی پشت پناہی میں ترک بحیرہ روم پر دوبارہ تسلط قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ چنانچہ اسپین کو نہایت طاقتور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ بارہا نئی نئی جنگیں کرنی پڑیں۔ مثلاً" ۱۵۶۰ء میں ضربہ کی مہم، ۱۵۶۵ء میں مالٹا کا قبضہ، ۱۵۷۱ء میں لیپانٹو کا جھگڑا پھر تیونس کی کبھی جیت کبھی ہار والی جنگ تاآنکہ ۱۵۸۱ء میں صلح کی نوبت آئی۔ اسی دوران فلپ کی مذہب کے متعلق ناقابل برداشت پالیسیاں اور ٹیکس میں اضافے نے ہیبسبرگ کے اپنے علاقے نیدر لینڈ

میں بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کردی جو بالآخر بغاوت پر منتج ہوئی۔ وہاں ۱۵۶۰ء کی دہائی کے وسط میں اسپین کے خلاف پیدا ہونے والی شورش کو دبانے کے لیے ڈیوک آف البا کے زیر کمان فوج روانہ کی گئی اور فوجی راج قائم کر دیا گیا۔ اس اقدام کے نتیجے میں ہولینڈ اور زی لینڈ کے ڈچ والے صوبوں میں زبردست شورش پھیل گئی اور اسپین کے جارحانہ عزائم کو دیکھ کر انگلینڈ' فرانس اور شمالی جرمنی بھی ہوشیار ہو گئے۔ جب فلپ دوم نے ۱۵۸۰ء میں اپنے پڑوسی ملک پرتگال کو اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لیا اور اس کی نو آبادیوں اور بحری بیڑے پر قبضہ جما لیا تو اہل برطانیہ میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہیبسبرگ خاندان نے جب بھی اپنے اقتدار کو وسیع کرنا چاہا تو اس کے نتیجے میں اس کے حریف متحد ہونے کے لیے آگے بڑھنے پر مجبور ہو گئے تھے تاکہ طاقت کے بگڑنے والے توازن کو سنبھالا دے سکیں۔ چنانچہ ولندیزی پروسسوں نے ہسپانوی سلطنت کے خلاف مقامی نوعیت کی جو بغاوت کی تھی' وہ ۱۵۸۰ء کے عشرے میں بڑھ کر بین الاقوامی جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی اور خود نیدر لینڈ میں محاصرہ برقرار رہا اور اس دو طرفہ جنگ آزمائی کا کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ادھر انگلینڈ میں الزبتھ اول نے ہر اندرونی شورش کو چاہے وہ ہسپانوی حمایت پر مبنی ہو یا پاپائیت کی محرک کی ہوئی ہو' کچل کر رکھ دیا اور ساتھ ہی ساتھ ولندیزی باغیوں کی فوج اس کی مدد بھی کرنے لگی۔ فرانس میں شہنشاہیت کے کمزور پڑ جانے کی وجہ سے سخت قسم کی مذہبی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ کیتھولک لیگ (جسے اسپین کی حمایت حاصل تھی)' اور اس کے خلاف ہیوگو نوٹس (جسے الزبتھ اور ڈچ کی حمایت حاصل تھی)' اپنی بالادستی کے لیے باہم دست و گریبان تھے۔ ادھر سمندروں میں ولندیزی اور انگلستان کے غیر سرکاری مسلح جہازوں نے نیدر لینڈ تک جانے والے ہسپانیہ کے رسدی راستوں میں مداخلت پیدا کی اور اس طرح جنگ کے شعلوں کو بھڑکایا کہ وہ مغربی افریقہ اور کریبین تک پہنچ گئے۔

لڑائی کے دوران خصوصاً" ۱۵۸۰ء کے عشرے کے اواخر اور ۱۵۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں' یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہسپانیہ کو فتح حاصل ہو جائے گی' مثلاً" ستمبر ۱۵۹۰ء میں ہسپانوی افواج لینگیوڈوک اور بریٹنی پر چڑھائی کیے ہوئے تھیں اور دوسری فوج معروف کمانڈر ڈیوک آف پارما کے زیر کمان شمالی جانب سے پیرس کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ تاہم اسپین کی مخالف قوتیں بھی اس دباؤ کے باوجود سرگرم عمل تھیں۔ فرانسیسی تخت کا کرشمہ ساز دعویدار ہنری آف نواری اس درجہ لچک دار ثابت ہوا کہ اس نے اپنے دعوے کو مستحکم کرنے کے لیے پروٹسٹنٹ عقیدے کو چھوڑ کر کیتھولک اصول اپنا لیا۔ پھر ہسپانوی حملہ آوروں کے خلاف فرانسیسی قوم کو پوری طرح منظم کر دیا' حتیٰ کہ ۱۵۹۸ء میں جب اسپین کا فلپ دوم وفات گیا' صلح نامہ وروزی کی رو سے میڈرڈ فرانس میں ہر قسم کی مداخلت سے دست بردار ہو گیا۔ اس وقت الزبتھ کی ماتحتی میں انگلینڈ بھی ہر طرح سے محفوظ تھا۔ اس نے ۱۵۸۸ء میں ایک بہت بڑے بحری حملے اور بعد ازاں دو ہسپانوی حملوں کو ناکام بنا دیا تھا۔ اسی طرح آئرلینڈ میں الزبتھ کی فوجیں کیتھولک بغاوت کو رفتہ رفتہ دبا رہی تھیں۔ جب ۱۶۰۳ء میں فلپ دوم اور الزبتھ دونوں فوت ہو گئے تو اسپین اور انگلینڈ کے مابین امن بحال کرنے کا سمجھوتہ ہو گیا۔ ۱۶۰۹ء کے صلح نامے میں چار سال لگ گئے جب میڈرڈ نے ڈچ باغیوں سے امن کی بحالی کی بات چیت کی۔ بہرحال اس واقعہ سے پہلے ہی یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ اب اسپین اس قابل نہیں رہا کہ

وہ نیدر لینڈ کے باغیوں کو کچل سکے۔ فرانس' انگلینڈ اور نیدرلینڈ کے متحدہ صوبے ----- یہ تینوں ممالک ہنوز مستحکم پوزیشن میں تھے اور مستقبل میں ہیبسبرگ خاندان کے عزائم کی بیخ کنی کی صلاحیت کے حامل تھے۔ ان ریاستوں نے یہ حقیقت پھر واضح کر دی تھی کہ ۱۶۱۰ء کا یورپ اگرچہ بہت سی اقوام پر مشتمل ہو گا' مگر قیادت کسی ایک کی بھی نہیں ہو گی۔

جنگ کا تیسرا بڑا دور' جس نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا ۱۶۱۸ء کے بعد شروع ہوا۔ جرمنی بری طرح اس کی لپیٹ میں آیا' یہ ملک سولھویں صدی کے اواخر میں ایک میدان کار زار بنا دیا گیا تھا۔ اس کی تمام تر وجہ مقدس رومن شہنشاہ (۱۵۷۶ تا ۱۶۱۲ء) کی کمزور حکومت اور دریائے ڈینوب کے ساحل پر ترکوں کا از سر نو منڈلاتا ہوا خطرہ تھا (۱۵۹۳ تا ۱۶۰۶ء)۔ تاہم جرمن اتحاد کے پس پردہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں معروف تھیں۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ایوانجیلیکل یونین (قائم شدہ ۱۶۰۸ء) اور کیتھولک لیگ (۱۶۰۹ء) کے مابین دشمنی شدت اختیار کر گئی۔ علاوہ ازیں' چونکہ ہسپانوی ہیبسبرگ اپنے آسٹرین عم زاد کی حمایت کرتے تھے اور ادھر ایوانجیلیکل یونین کا سربراہ اور منتخب رئیس فریڈرک چہارم انگلستان اور نیدر لینڈ سے تعلقات قائم کیے ہوئے تھا' لہٰذا یوں لگتا تھا جیسے یورپ کی متعدد ریاستیں اپنے سیاسی اور مذہبی چپقلش کا حتمی فیصلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہو رہی تھیں۔

۱۶۱۸ء میں بوہیمیا کی پروٹسٹنٹ ریاستوں نے اپنے نئے کیتھولک حکمران فرڈیننڈ دوم (بادشاہت ۱۶۱۹ء تا ۳۷) کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے خوفناک قسم کی مذہبی جنگ کے دوبارہ آغاز کے لیے چنگاری کا کام کیا۔ ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک جاری رہنے والی یہ لڑائی تاریخ میں تیس سالہ جنگ کے نام سے مشہور ہوئی۔ لڑائی کے آغاز میں شاہی فوج جسے جنرل اسپی نولا کے زیر کمان ہسپانوی ہیبسبرگ دستے کا تعاون بھی حاصل تھا' اچھی کارگزاری دکھا رہی تھی۔ لیکن مختلف الخصائل فوجیوں نے توازن برقرار رکھنے کے لیے مخالفوں پر دباؤ ڈالا۔ ڈچ جنھوں نے ۱۶۰۹ء میں اسپین کے ساتھ ہونے والی صلح کو ۱۶۲۱ء میں ختم کر دیا تھا' اسپینولیا کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے رائن لینڈ کی جانب بڑھ گئے۔ ۱۶۲۶ء میں ڈنمارک کی فوج نے شہنشاہ کرسچین چہارم کی قیادت میں شمال کی جانب سے جرمنی پر حملہ کر دیا۔ اس تناظر میں' فرانس کا با اثر سیاست دان کارڈینل رچے لیو ہیبسبرگ خاندان کے لیے ایک نئی مصیبت پیدا کرنے کی فکر میں تھا۔ تاہم یہ ساری عسکری اور سفارتی کوششیں کامیاب ثابت نہیں ہوئیں۔ پھر ۱۶۲۰ء کی آخری دہائی میں شہنشاہ فرڈیننڈ کا طاقتور لیفٹیننٹ والسین نے جرمنی کو ایک مرکزی اقتدار کے ماتحت کر کے سبھی کو حیران کر دیا۔ اس دائرہ کار میں بحر بالٹک کے ساحل تک سارے شمالی علاقے آ گئے تھے۔

شاہی طاقت کی اس روز افزوں وسعت نے ہیبسبرگ خاندان کے بہت سے دشمنوں کو سخت جارحانہ اقدام کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۶۳۰ء کے ابتدائی عشرے میں ان مخالفین میں ایک سویڈن کا با اثر اور ہر دلعزیز بادشاہ گستاؤس اڈولفس دوم (۱۶۱۱ء - ۱۶۳۲ء) بھی تھا جو جارحانہ عزم لے کر آگے بڑھا۔ اس کی نہایت تربیت یافتہ فوج ۱۶۳۰ء میں شمالی جرمنی میں داخل ہو گئی۔ پھر اسی سال جنوب میں رائن لینڈ اور بواریا کی سمت بڑھ گئی۔ اگرچہ گستاؤس ۱۶۳۲ء میں لوزن کی جنگ میں مارا گیا' تاہم اس سے جرمنی میں سویڈن کے خاطر خواہ

قرار رہی۔ اس کے برعکس حکومت اسپین نے فلپ کردار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جنگ پوری شد و مد سے بر چہارم (۱۶۲۱ء - ۱۶۶۵ء) اور وزیر اول کاؤنٹ' ڈیوک آف اولیویرس کی ماتحتی میں یہ فیصلہ کیا کہ اپنے آسٹرین عم زادوں کی پہلے سے کہیں زیادہ مدد کی جائے۔ چنانچہ جنرل کارڈینال' انفانٹی کی ماتحتی میں ایک زبردست ہسپانوی سپاہ رائن لینڈ روانہ کی گئی۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ فرانس کے مدبر رچے لیو نے اپنے ملک کو براہ راست ملوث کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۶۳۵ء مین مختلف سرحدوں پر فوجیں روانہ کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس سے قبل' فرانس ہیسبرگ خاندان کے دشمنوں کی در پردہ قیادت کرتا رہا تھا اور ان سبھوں کی مالی معاونت بھی خاموشی سے کیا کرتا تھا۔ اب لڑائی میں شمولیت ایک کھلا راز بن گیا۔ چنانچہ ہیسبرگ کا ہر مخالف "رائے ورے نخے" حصہ لینے لگا۔ اس وقت جذبات کا لہجہ کچھ زیادہ ہی سخت تھا۔ "سب کچھ ختم ہو جائے گا یا پھر کیسل دنیا کا سرتاج ہو گا" ---- یہ باتیں ہسپانوی وزیر اولیویرس نے ۱۶۳۵ء میں اس وقت لکھی تھیں جب وہ اسی سال تین اطراف سے فرانس پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ فرانس جیسے وسیع و عریض خطے کی فتح ہیسبرگ افواج کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ پیرس پہنچ تو گئیں لیکن جلد ہی انھیں یورپ سے باہر دھکیل دیا گیا۔ ادھر شمال میں سویڈن اور جرمنی کی فوجیں شاہی عساکر پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔ ڈچ اور فران ہسپانوی نیدرلینڈ کو شکنجے میں کس رہے تھے۔ علاوہ ازیں' ۱۶۴۰ء میں پرتگالیوں کی بغاوت نے ہسپانوی افواج کو نہایت تیزی سے شمال یورپ سے واپسی پر مجبور کر دیا۔ وہ دوبارہ جزیرہ نمائے اسپین و پرتگال کا باہمی ارتباط قائم نہ کر سکیں۔ اسی زمانے میں برپا ہونے والی کیٹلان بغاوت' جس کی فرانس نے خوشی خوشی معاونت کی تھی' کے ساتھ ساتھ چند ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جنھوں نے ۱۶۴۰ء کے ابتدائی عشرے میں اسپین کے اہم مراکز کے باہمی اتحاد کو معرض خطر میں ڈال دیا۔ ادھر سمندر پار کے علاقوں میں ولندیزیوں کے بحری جہازوں نے مہم جوئی شروع کر دی اور برازیل' انگولا اور سیلون کو نشانہ بنایا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں یہ جھڑپ بعض مورخین کے الفاظ میں "پہلی عالمی جنگ" میں تبدیل ہو گئی۔ اگرچہ موخرالذکر اقدام سے نیدرلینڈ کو فوائد حاصل ہوئے' تاہم دیگر شرکائے جنگ طویل فوجی اقدامات کی وجہ سے بے حد خسارے میں رہے۔ نیز' ۱۶۴۰ء کی دہائی کی سپاہ ۱۶۳۰ء کے عشرے کی افواج کے مقابلے میں مختصر ہو چکی تھی' حکومتوں کو مالی بحران کا سامنا تھا' اب لوگوں میں جنگ کے لیے پہلے جیسے جذبات نہیں رہے تھے اور ان کے اعتراضات شدید تر ہوتے جا رہے تھے۔ تاہم جنگ میں شرکت کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی کہ ہر شریک کار کا علیحدہ ہونا دشوار تھا۔ بہت سے پروٹسٹنٹ جرمنوں نے ایسا کر بھی لیا ہوتا اگر انھیں یہ یقین ہوتا کہ سویڈن کی افواج جنگ بندی کر کے واپس اپنے گھر چلی جائیں گی۔ اولیویرس اور دیگر ہسپانوی سیاست دان فرانس کے ساتھ صلح کی بات ضرور کرتے' لیکن آخرالذکر ڈچ کو تباہ و برباد کرنے پر راضی نہ تھا۔ مختلف محاذوں پر فوجی جھڑپوں کے ساتھ ساتھ امن کی خفیہ بات چیت بھی متعدد سطحوں پر ہوتی رہی' لیکن ہر محارب یہ سوچ کر اپنی تسلی کرتا رہا کہ اگلی بار اسے ہی فتح حاصل ہو گی اور اس کے سارے دعوے بروئے کار آ جائیں گے۔

تیس سالہ جنگ کا خاتمہ نہایت بے ڈھنگی صورت حال پر منتج ہوا۔ اسپین نے ۱۶۴۸ء کے وائل میں

ڈچ کے ساتھ اچانک امن کا معاہدہ کر لیا اور اس طرح اس کی مکمل آزادی کو تسلیم کر لیا۔ لیکن اس طرح فرانس اپنے ایک اتحادی سے محروم ہو گیا۔ چنانچہ فرانس' ہیسبرگ چپقلش جاری رہی۔ پھر اسی سال یہ منافقت فرانس اور ہسپانیہ کے درمیان مخصوص ہو کر رہ گئی جب ویسٹ فالیا کی صلح کے نتیجے میں جرمنی میں سکون کی فضا قائم ہو گئی اور آسٹریا کے ہیسبرگ والوں کو جھگڑے فساد سے علیحدگی اختیار کر لینے کا پروانہ مل گیا۔ صلح نامہ ویسٹ فالیا سے جہاں بعض ریاستوں اور حکمرانوں کو فواید حاصل ہوئے اور کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑا' وہاں اس کا اہم مقصد مقدس رومن شہنشاہیت کی حدود میں مذہب و سیاست کے مابین توازن قائم رکھنا تھا۔ اور اس طرح شاہی اختیارات پر قدغن بھی لگانا مقصود تھا۔ بہرحال فرانس اور اسپین کے درمیان جنگ برقرار رہی جو "کلیتاً" ملکی عناد پر مبنی تھی نہ کہ مذہب پر! بعد ازاں رچے لیو کے جانشین اور فرانسیسی وزیر مزارن نے ۱۶۵۵ء میں کروم ویل کے پروٹسٹنٹ انگلینڈ سے اتحاد قائم کر کے ہسپانیہ کو ایسی زک پہنچائی کہ بالآخر اسے صلح پر راضی ہونا پڑا۔ اگرچہ پائیرے۔نیز کی صلح (۱۶۵۹ء) کی شرائط اتنی سخت نہ تھیں' تاہم اسپین کو اس کے سب سے بڑے دشمن کے ساتھ صلح پر مجبور کرنا دراصل اس حقیقت کو واضح کرتا تھا کہ اب یورپ پر ہیسبرگ خاندان کا اقتدار باقی نہیں رہا ہے۔ اب فلپ چہارم کی سلطنت کا مقصد بس اتنا رہا کہ آئبرین اتحاد کو کسی طرح برقرار رکھا جائے۔ لیکن ۱۶۶۸ء میں اس خیال کا بھی خاتمہ ہو گیا جب پرتگال کی آزادی کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ گویا براعظم کا سیاسی انتشار ویسا ہی تھا' جیسا ۱۵۱۹ء میں چارلس پنجم کی تخت نشینی کے وقت تھا اور جوں جوں سترھویں صدی اختتام کو پہنچنے لگی' اسپین کو مزید بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا اور مقبوضات اس کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئیں (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۳)۔ اس طرح اسپین کو اپنی حد سے زیادہ توسیع پسندی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

ہیسبرگ بلاک کی طاقت اور کمزوری

ہیسبرگ خاندان کو ناکامی کیوں نصیب ہوئی؟ یہ موضوع خاصا ہمہ گیر ہے اور اس کی وجوہات بھی بے حد طویل ہیں۔ یہاں ذاتی اسباب کا جائزہ لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا' یعنی شہنشاہ ریوڈ ولف دوم کا پاگل پن یا اسپین کے فلپ سوم کی نااہلی! اس کلیے سے بحث کرنا بھی خاصا مشکل امر ہے کہ ہیسبرگ خاندان اور اس کے اعلی افسران میں کچھ مخصوص برائیاں تھیں جبکہ اس دور کے فرانسیسی اور برطانوی بادشاہوں کی کوتاہیوں اور بعض جرمن شاہزادوں کی ضمیر فروشی اور بد عقلی بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ اس ضمن میں ہماری حیرانی اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب ہم ہیسبرگ خاندان کی مادی طاقتوں کے اجتماع پر نظر ڈالتے ہیں۔

> "چارلس پنجم کو ورثے میں چار نہایت اہم سلطنتیں ملی تھیں' یعنی کیسل' آراگون' برگنڈی اور آسٹریا۔ بعد میں بوہیمیا' ہنگری' پرتگال اور مختصر مدت کے لیے انگلینڈ کے تاج و تخت بھی اس کے زیر نگیں آئے۔ پھر اس خاندانی جاہ و حشم کے واقعات کے ساتھ ہسپانوی فتح و نصرت اور نئی

دنیا کی استعماریت کا سلسلہ ---- ان تمام اسباب و عوامل نے ہیسبرگ
خاندان کو مال و متال کے وسائل سے فیض یاب کر دیا۔ یورپ کی کوئی
بھی سلطنت اس معاملے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی"۔

اس زمانے کی آبادی کے پیش کردہ اعداد و شمار کے تضادات اور غلط بیانی کے پیش نظر کوئی بھی اس پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ قیاس کرنا نا مناسب نہ ہو گا کہ موجودہ یورپ کے ابتدائی دور میں اس کی ایک چوتھائی آبادی ان علاقوں میں رہتی تھی جہاں ہیسبرگ خاندان کا راج تھا۔ تاہم یہ اعداد و شمار☆ علاقے کی دولت کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اور یہاں خاندانی میراث دولت و حشمت سے سراسر معمور تھی۔

ہیسبرگ خاندان کے پانچ اہم مالی ذرائع تھے جب کہ چھوٹے چھوٹے ذرائع کی تعداد بے شمار تھی۔ ان میں سب سے وقیع کیسل کا ہسپانوی ورثہ تھا۔ اس لیے کہ اس پر براہ راست حکومت کی جاتی تھی اور مختلف قسم کے ٹیکس (مثلاً "سیلز ٹیکس' مذہبی جائیداد پر "صلیبی" ٹیکس تھے جنہیں مجلس قانون ساز اور چرچ حکومت کو ادا کرنے کے لیے منظور کرتے تھے۔ علاوہ ازیں' یورپ کے دو نہایت ہی مال دار تجارتی علاقے ---- اطالوی ریاستوں اور بلجیم اور ہالینڈ ---- بھی اس کے زیر نگیں تھے جو اپنے تجارتی منافع سے خاصی بڑی رقم فراہم کرتے تھے۔ چوتھا ذریعہ جو وقت گزرنے کے ساتھ اہمیت اختیار کرتا گیا' وہ سلطنت امریکہ سے حاصل شدہ محصول تھا۔ وہاں کی چاندی اور سونے کی کانوں سے نکلنے والی قیمتی دھاتوں میں "پانچواں حصہ" شہنشاہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ سیلز ٹیکس' چنگی اور چرچ محصول بھی نئی دنیا سے حاصل ہوتے تھے۔ اسپین کے بادشاہوں کے لیے یہ سب کچھ ایک وسیع بونس کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ مال و متال براہ راست بھی حاصل ہوتے اور بالواسطہ بھی! امریکی خزانے جن نجی ہاتھوں میں گئے' چاہے یہ ہسپانوی ہوں' فلانڈرزی ہوں یا اطالوی' انھیں اپنے اوپر عائد شدہ وافر ٹیکس ادا کرنا آسان ہو گیا۔ نیز ایمرجنسی کی صورت میں بادشاہ بنکاروں سے خاصی بڑی رقمیں اس امید میں بطور قرض لے لیتا تھا کہ جب چاندی سے لدا پھدا جہاز آئے گا تو یہ بیباق کر دیا جائے گا۔ یہ حقیقت تھی کہ ہیسبرگ سلطنت کے وسیع علاقوں میں مالی اور تجارتی مراکز قائم تھے۔ خصوصاً" جنوبی جرمنی' بعض اطالوی شہروں اور انٹورپ میں! یہ سب منفعت بخش اور آمدنی کا پانچواں اہم ذریعہ تھے۔ یہاں سے تمام محصولات کا حاصل ہونا جرمنی کی نسبت آسان تھا جہاں جاگیردار اور آزاد شہر شہنشاہ کو اسی وقت رقم ادا کرتے تھے جب ترکوں کا خطرہ دروازے پر منڈلانے لگتا تھا۔

☆ عام اندازے کے مطابق ۱۶۰۰ء میں یورپ کی ۱۰۵ ملین مجموعی آبادی میں ۲۵ ملین کے قریب۔

جاگیردارانہ دور کے آغاز میں جب بعض ملکوں میں نائٹ انفرادی طور پر عسکری خدمات انجام نہیں دیتے تھے اور ساحلی شہر بھی جہاز فراہم نہیں کیا کرتے تھے' اس صورت میں ایسی ریاست کو جو جنگ میں ملوث ہوتی' نقد رقم اور معقول قسم کی ہنڈی کا بندوبست کرنا بہت ضروری تھا۔ براہ راست ادائیگی (یا ادائیگی کے معقول وعدے) کے بعد ہی بحری جہاز' بحری سازو سامان' اسلحے اور اشیائے خورد و نوش بازار میں پہنچائی جا سکتی تھیں تاکہ لڑائی کے لیے ایک جنگی جہاز تیا کیا جا سکے۔ اسی طرح اشیائے ضرورت کی فراہمی اور تنخواہ کی ادائیگی کے بعد ہی کوئی شخص اپنی ذاتی فوج بحال رکھ سکتا تھا تاکہ وہ بغاوت کے برعکس دشمنوں کا قلع قمع کرنے میں اپنی طاقت صرف کر سکے۔ علاوہ ازیں' اگرچہ اس دور میں مغربی یورپ میں "قومی ریاست" وجود میں آ چکی تھی' اس کے باوجود تمام حکومتیں اپنی فوج کو بہتر بنانے کے لیے کرائے کے بیرونی سپاہیوں پر بھروسہ کیا کرتی تھیں۔ یہاں ہیسبرگ خاندان والوں نے یہ کار خیر بھی انجام دیا کہ وہ اٹلی' بلجیم' ہالینڈ' اسپین اور جرمنی میں براہ راست فوجیوں کو بھرتی کرتے تھے مثلاً" مشہور و معروف افواج فلینڈرز چھ اہم قومیتوں پر مشتمل تھیں اور کیتھولک نظریے کی طرف دار تھیں' لیکن باقاعدہ تنخواہ نہ ملنے پر شاکی بھی تھیں۔ بحری اصطلاح میں یہ کہا جائے گا کہ ہیسبرگ خاندان اس قابل تھا کہ وہ جنگی جہازوں کا ڈھیر لگا لیتا اس ضمن میں یہ ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ فلپ دوم کے آخری سالوں میں بحیرہ روم کے جہازوں' جینوا اور ییلپز کے بڑے بڑے کیریکس پاور پرتگال کے وسیع بیڑے نے کیسل اور آراگون کی بحریہ کو از سر نو مستحکم کر دیا۔

۱۵۰ سال کے عرصے میں ہیسبرگ خاندان کو جو سب سے بڑی عسکری قوت حاصل تھی' وہ ہسپانیہ کی تربیت یافتہ پیدل فوج تھی۔ سماجی ڈھانچے اور آب و ہوا کے اثرات کے نتیجے میں شہر کیسل رنگروٹوں کی بھرتی کا اہم مرکز بن گیا۔ جب کہ لیچ رقمطراز ہے' "سپہ گری صرف جیالوں کے لیے ہی پر کشش اور منافع بخش روزگار نہیں تھا بلکہ تمام آبادی اس طرف رغبت رکھتی تھی"۔ علاوہ ازیں' "عظیم کپتان" گونزالوڈی کورڈوبا نے سولھویں صدی کے اوائل میں پیدل فوج کی نئے سرے سے تنظیم کی تھی۔ تب سے تیس سالہ جنگ کے وسطی عرصے تک ہسپانوی "ٹرکیو" یورپ کے میدان جنگ میں نہایت موثر یونٹ ثابت ہوا۔ تین ہزار نیزہ برداروں' شمشیر زنوں اور توڑے دار بندوق والوں پر مشتمل نہایت تربیت یافتہ دستوں کی مدد سے ہسپانوی افواج نے اپنے بے شمار دشمنوں کو پیچھے دھکیلا اور فرانسیسی پیدل فوج اور سوئٹزر لینڈ کے نیزہ برداروں کی شہرت اور کارگزاری کو مدھم کر کے رکھ دیا۔ بہت بعد میں' یعنی ۱۶۳۴ء میں جنگ نورڈ لنگن کے موقع پر کارڈینال' انفانٹی کی پیدل فوج نے سویڈن کی جانباز سپاہ کے پندرہ سخت ترین حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ولنگٹن کے واٹر لو والے دستوں کی مانند دندناتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور دشمنوں کو پسپا کر دیا۔ ۱۶۴۳ء میں روکروئی کے مقام پر اگرچہ ہسپانوی سپاہ کو فرانسیسی فوج نے گھیرے میں لے لیا تھا' اس کے باوجود اول الذکر زندگی کی آخری سانس تک لڑتی رہی۔ یہ ہیسبرگ کے جاہ و حشم کا ایک ارفع و اعلیٰ نمونہ تھا اور یہ نہایت اہم بات ہے کہ ہسپانوی طاقت کو سترھویں صدی کے وسط میں اس وقت زوال آیا جب اس کی فوج میں جرمنی' اٹلی' آئرلینڈ کے کرائے کے سپاہی بھرتی ہو گئے اور کیسل کے جان باز فوجی بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔

تاہم' ان تمام حقائق کے باوجود ہسپانیہ اور آسٹریا کی حکومتوں کے مابین اتحاد برقرار نہ رہ سکا۔ اگرچہ ہم عصر ملکوں کے نزدیک ان کے مالی اور عسکری وسائل نہایت فزوں تھے' اس کے باوجود تمام ضروریات کی تکمیل کے لیے یہ سب کچھ ناکافی تھا۔ اس شدید نوعیت کے خسارے کی تین وجوہات تھیں جو اس تمام عرصے میں باہم مربوط رہیں۔ فوجی جھڑپوں کے مطالعہ کے لیے ان سے ہمیں اہم سبق حاصل ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر مختصر ذکر کیا جا چکا ہے' پہلی وجہ وہ "فوجی انقلاب" تھا جو جدید یورپ کے ابتدائی دور میں رونما ہوا۔ یوں کہہ لیجیے کہ ۱۵۲۰ء کی دہائی کے بعد ۱۵۰ برس تک ہونے والی جنگوں کے پیمانے' اخراجات اور نظم و ضبط میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی' جو دراصل فنی' سیاسی اور علم شماریات جیسے باہم مربوط عوامل کا نتیجہ تھی۔ ان جنگوں میں میدان جنگ میں گھڑ سواروں کو جو فوقیت حاصل تھی' اس میں کئی اسباب کی بنا پر کمی آئی۔ پہلی وجہ تو سوئٹزر لینڈ کے نیزہ بردار تھے' علاوہ ازیں پھر ایسی ملی جلی سپاہ جو نیزہ' تلوار' تیر اور توڑے دار بندوق سے لیس تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت عسکری قوت کا بہت بڑا اور اہم حصہ پیدل فوج ہوا کرتی تھی۔ اس کو مزید تقویت شہر میں قلعوں اور فصیلوں کی تعمیر سے پہنچی' جس کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ اس نوع کے دفاعی نظام کے لیے خاصا بڑا دستہ درکار ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کسی بڑی مہم میں نہایت تجربہ کار کمانڈر گھڑ سواروں اور توپچیوں کی اچھی خاصی تعداد تعینات کرتا ہوگا' لیکن پیدل سواروں کے مقابلے میں یہ دونوں ہر جگہ حاضر نہیں ہو سکتے تھے۔ مختلف ملکوں میں گھڑ سواروں میں کمی کی یہ وجہ قطعاً" نہیں تھی بلکہ فوج کو مسلح کرنا آسانی اور ان کے خورد و نوش کا سامان بہت سستا ہوتا تھا' لہٰذا انھیں بہت بڑی تعداد میں بھرتی کیا جاتا تھا' خصوصاً" ایسے وقت میں جبکہ یورپ کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ فطری طور پر اس قسم کے نظم و ضبط کی بحالی سے حکومت پر خاصا دباؤ بڑھا' لیکن یہ اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ مغرب کی "مثنی شہنشاہیت" پر نوکر شاہی کا غلبہ ہو جائے۔ اسی طرح فوج کی وسعت و کثرت سے جنرل کی ذمہ داری اتنی گمبھیر نہیں بنی کیونکہ اسے اطاعت گزار ہونے اور نظم و ضبط کی پابندی کرنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔

سلطنت ہسپانیہ کی فوج "عسکری انقلاب" کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ جیسا کہ مورخ لکھتا ہے'
"۱۵۲۹ء سے قبل اٹلی کے خلاف ہسپانیہ و فرانس کی لڑائی میں جو تیس جری فوجی نبرد آزما ہوئے تھے' اس کی مثال کوئی اور ریاست پیش نہیں کر سکتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

"۳۷-۱۵۳۶ء کے دوران شہنشاہ چارلس پنجم نے اپنے مفتوحہ علاقے میلان کے دفاع کے لیے ۶۰ ہزار فوجیوں کو لمبارڈی میں اتارا تھا۔ اسی کثیر فوج سے اس نے فرانسیسی صوبے پر بھی حملہ کیا تھا۔ ۱۵۵۲ء میں وہ تمام محاذوں کی جانب پیش قدمی کر گیا ـــــ یعنی اٹلی' جرمنی' نیدر لینڈ' اسپین' بحر اوقیانوس اور بحیرہ روم۔ چارلس نے جرمنی اور نیدر لینڈ

میں ۱۰۹٬۰۰۰ فوجی جوان اتار دیے جبکہ لمبارڈی میں مزید ۲۴٬۰۰۰ فوجیوں کی کمک روانہ کی۔ اور اسی طرح سسلی' نیپلز اور اسپین میں بھی مزید فوج روانہ کی۔ گویا کہ شہنشاہ کی ماتحتی میں اس وقت ۱۵۰٬۰۰۰ سپاہی تھے جن کی وہ کفالت بھی کرتا تھا۔ فوج کی اس تعداد میں وقتاً" فوقتاً" اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ۱۵۷۴ء میں فلینڈر کی ہسپانوی فوج ۸۶٬۰۰۰ ہزار نفری پر مشتمل تھی۔ اس کے پچاس سال بعد فلپ چہارم نے نہایت فخر سے اعلان کیا تھا کہ اب ۱۶۲۵ء میں اس کے زیر کمان فوجیوں کی تعداد ۳۰۰٬۰۰۰ سے کم نہیں ہے۔ ان تمام افواج میں پیدل سوار اور خصوصاً" نیزہ بردار خاصی بڑی تعداد میں ہوتے تھے"۔

جو کچھ میدانوں میں ہو رہا تھا' وہی صورت حال سمندروں میں بھی تھی۔ بحری تجارت کی توسیع' چپقلش' بحر ہند اور جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل میں چلنے والے بحری جہازوں کی آپس کی دشمنیاں' بحری قزاق اور عثمانی جہازوں کے حملے کے خطرات ـــــ ان تمام اسباب و عوامل نے صنعت جہاز رانی کو فروغ دیا اور اب سمندروں میں چلنے والے بڑے بڑے سائز کے جہاز بننے لگے اور انھیں پوری طرح مسلح بھی رکھا جانے لگا۔ اس زمانے میں جنگی جہاز اور تجارتی جہاز میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا۔ تمام تجارتی جہازوں میں بندوقیں نصب ہوتی تھیں تاکہ حملہ آور قزاقوں کو مار بھگایا جا سکے۔ البتہ شاہی بحریہ قائم کرنے کا رجحان موجود تھا تاکہ بادشاہ کی دسترس میں ایسے جہاز وافر مقدار میں ہوں جو جنگ کے موقع پر استعمال میں آ سکیں۔ انگلینڈ کے ہنری ہشتم نے اس اسکیم کو بہت سراہا جبکہ چارلس پنجم نے اپنی اسپین اور اٹلی کی عملداری میں نجی طور پر چلنے والے جہازوں کو ہی جنگی استعمال میں لانا پسند کیا کیونکہ وہ شاہی بحریہ کے حق میں نہیں تھا۔ فلپ دوم کو چونکہ بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس میں شدید دباؤ کا سامنا تھا' لہٰذا وہ اس جانب توجہ نہ دے سکا۔ تاہم اس نے بریلونا' نیپلز اور سسلی میں جہاز بنانے کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور اس کی دیکھ بھال اور اخراجات کی جانب بھرپور توجہ دی۔ ۱۵۷۴ء تک آتے آتے اس کی نگرانی میں ۱۴۶ جہاز تیار ہو چکے تھے۔ جہازوں کی یہ تعداد بارہ سال قبل جہازوں سے تین گنا زیادہ تھے۔ بعد ازاں بحر اوقیانوس میں جنگ کے جو دھماکے ہونے لگے ان کے پیش نظر جنگی جہازوں کی زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ویسٹ انڈیز اور (۱۵۸۰ء میں پرتگال کے شامل ہو جانے کے بعد) مشرق کی طرف جانے والے بحری راستوں کی حفاظت کے لیے جنگی جہازوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تاکہ ہسپانوی ساحلوں کو برطانوی حملہ آوروں سے بچایا جا سکے اور برطانیہ کے جزائر پر حملے کے لیے بحری بیڑے روانہ کیے جا سکیں۔ ۱۶۰۴ء میں برطانیہ اور اسپین میں صلح ہو جانے کے باوجود آخرالذکر کو سمندروں میں ڈچ افواج کے حملوں کا تدارک کرنے کے لیے بہت بڑے بحری بیڑے کی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں اسے فلینڈرز کے ساتھ مواصلاتی نظام بھی برقرار رکھنا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ ایسے جنگی جہاز زیادہ سے زیادہ مسلح اور وزنی ہوتے چلے گئے' اور ان پر اخراجات بھی زیادہ اٹھنے لگے۔

جنگ کے ان ہمہ گیر اخراجات نے ہیسبرگ حکومت کی مالی کمزوریوں کو طشت ازبام کر دیا اور ۱۵۰۰ء تا ۱۶۳۰ء کے درمیان افراط زر کی وجہ سے غذائی اجناس کی قیمتیں پانچ گنا اور صنعتی اشیاء کی قیمتیں تین گنا بڑھ گئیں۔ اس سے حکومت کے مالیاتی نظام کو سخت دھچکا لگا جسے افواج اور بحریہ کی روز افزوں اضافے نے اسے مزید دھچکا پہنچایا۔ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ ہیسبرگ خاندان ادائے قرض کے چکر میں بری طرح جکڑا گیا۔ ۱۵۴۰ء کی دہائی کے دوران الجیئرز' فرانس اور جرمن پروٹسٹنٹوں کے خلاف جو مہمات اختیار کی گئیں ان کے نتیجے میں چارلس پنجم پر یہ انکشاف ہو کہ اس کے وسائل اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے اور حکومت کے محاصل بنکاروں کے پاس بہت پہلے ہی سے گروی رکھے جا چکے ہیں۔ چنانچہ پروٹسٹنٹ امراء کے خلاف اسی صورت میں لڑائی جاری رہ سکتی تھی اگر مزید مالی وسائل میسر ہوں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کسی طرح ہند الغربی کے خزانے اور اسپین کی ساری نقدی رقم قبضے میں کی جائے۔ ۱۵۵۲ء میں صرف مٹز کے خلاف مہم میں چارلس کو ۲۰۵ ملین سکوں کا خرچہ برداشت کرنا پڑا۔ اس وقت شہنشاہ کو امریکہ سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی' یہ رقم اس سے دس گنا زیادہ تھی۔ یہ بات تعجب انگیز نہیں کہ وہ بار بار قرض لینے پر مجبور تھا' بلکہ تعجب انگیز بات یہ تھی کہ وہ قرض ناقص شرائط پر لینے پر مجبور تھا! جب سلطنت کی ساکھ گرنے لگی' تو بنکاروں نے سود کی شرح خاصی بڑھا دی۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی معمول کی آمدنی بھی پچھلے قرضوں پر عائد شدہ سودی رقم چکانے میں صرف ہونے لگی۔ جب چارلس تخت سے دست بردار ہوا تو اس موقع پر اس نے فلپ دوم کے کاندھوں پر ۲۰ ملین سکے کے سرکاری قرض کا بوجھ ڈال دیا۔

فلپ کو فرانس کے ساتھ ہونے والی جنگ بھی ورثے میں ملی تھی جو اتنی مہنگی ثابت ہوئی کہ ۱۵۵۷ء میں شاہ برطانیہ کو اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی فگرز بڑے بڑے بنکوں کو بھی زمیں بوس ہونا پڑا۔ یہ محض اتفاق سوئی تھی کہ اسی سال فرانس کو بھی اپنے دیوالیہ پن کا اقرار کرنا پڑا۔ بہرحال ۱۵۵۹ء میں دونوں فریق کو کیٹو۔ کیمبریسس میں سمجھوتے پر رضامند ہونا پڑا جس کا اہم سبب فلپ کا فوری طور پر نہایت طاقتور ترک دشمنوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ بحیرہ روم کی بیس سالہ جنگ' غرناطہ کے مور سکوس کے خلاف مہم اور پھر نیدر لینڈ' شمالی فرانس اور انگلش چینل میں معرکہ آرائیں ـــــ ان تمام عوامل نے بادشاہ کو آمدنی کے نئے وسائل تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ چارلس پنجم کے عہد حکومت میں آمدنی تین گنا بڑھ گئی فلپ دوم کے دور میں (۷۳-۱۵۵۶ء) یہ دو گنا ہو گئی اور سلطنت کے اختتام تک دوگنے سے بھی زیادہ ہو گئی۔

تاہم اس کے مصارف بھی بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ لیپانٹو کی مہم (۱۵۷۱ء) میں عیسائی بحری بیڑے کی دیکھ بھال اور سپاہیوں کی تنخواہ وغیرہ پر سالانہ ۴ ملین سکوں سے بھی زیادہ خرچ کا اندازہ لگایا گیا تھا' حالانکہ اس کا بڑا حصہ وینس اور پاپائیت بھی ادا کرتی تھی۔ ۱۵۷۰ء کی دہائی میں فلینڈرز کے سپاہیوں کی تنخواہیں بہت زیادہ تھیں جس کے باعث اس کی بروقت ادائیگی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں افواج میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگے خصوصاً ۱۵۷۵ء کے بعد جب فلپ نے جینوا کے بنکاروں کو سود کی رقم کی ادائیگی منسوخ کر دی تھی۔ امریکی کانوں سے کثیر مقدار میں آمدنی حاصل ہو رہی تھی۔ ۱۵۸۰ء کے عشرے

میں یہ سالانہ دو ملین سکہ تھی جو گزشتہ چار دہائیوں کے مقابلے میں ۱/۱۰ حصہ تھی۔ اس نے عارضی طور پر مالی بحران کو ختم کیا اور بادشاہ کا اعتبار قائم کیا۔ لیکن چند ہی سال بعد ۱۵۸۸ء میں بحری بیڑے کی تیاری پر دس ملین سکے کی لاگت آئی۔ اور اس کی افسوسناک تباہی سلطنت کی مالی حیثیت اور بحری طاقت دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ ۱۵۹۶ء کے لگ بھگ ہوش ربا قرض کے باعث فلپ کو دوبارہ دھچکا لگا۔ دو سال بعد' اس کی موت کے وقت قرض کی مجموعی رقم ایک سو ملین ہو چکی تھی۔ اس پر عائد سودی رقم حکومت کی کل آمدنی کا تیسرا حصہ تھا۔ اگرچہ فرانس اور انگلستان کے ساتھ جلد ہی امن کا سمجھوتہ ہو گیا' لیکن ڈچ کے ساتھ جنگ ۱۶۰۹ء میں ہونے والی صلح تک جاری رہی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہسپانوی فوج کی بغاوت نے اور بھی خلفشار مچایا۔ پھر ۱۶۰۷ء میں مزید دیوالیہ پن نے حالات ابتر کر دیے۔

بعد ازاں امن و امان کی جو فضا چند سالوں کے لیے قائم ہوئی' اس دوران ہسپانوی حکومت کے اخراجات میں خاطر خواہ کمی نہیں آئی۔ سود کی خطیر رقم ادا کرنے کے علاوہ' بحیرہ روم میں خاصے بحران کا سامنا تھا جس کے نتیجے میں ساحلی قلعوں کی تعمیر ناگزیر ہو گئی۔ پھر ہسپانوی حکومت کے دور دراز علاقوں' مثلاً "فلپائن' کریبین اور سمندروں میں چلنے والے جہازوں کا تحفظ بھی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ۱۶۱۰ء کے بعد یورپ میں قائم ہونے والے عسکری سمجھوتے نے ہسپانیہ کے بزعم خود ہشیار دانشوروں کو یہ مطلق باور نہیں کرایا کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کر دیں۔ ۱۶۱۸ء میں چھڑنے والی تیس سالہ جنگ کا ثمر یہ تھا کہ اس نے ایک سرد جنگ کو خوفناک جنگ میں تبدیل کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ہسپانیہ کو اپنی افواج اور رقم کا بڑا حصہ فلینڈر اور جرمنی کے لیے مخصوص کرنا پڑا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ یورپ میں ہیسبرگ خاندان کی ابتدائی فتوحات اور موجودہ دور میں امریکی علاقوں کا کامیاب تحفظ ان دونوں باتوں میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مزید برآں ان دونوں کو نئی دنیاؤں سے بے پناہ وسائل بھی میسر ہوئے۔ بایں ہمہ' ۱۶۲۶ء کے بعد محصولات میں کمی اور اسی سال دیوالیہ پن کا اعلان اور ۱۶۲۸ء میں چاندی سے لدے ہوئے جہاز پر ڈچ افواج کا قبضہ (جس سے اسپین اور وہاں کے باشندوں کو کم از کم دس ملین کا خسارہ ہوا) ـــــ ان اسباب کی بناء پر وقتی طور پر جنگ بندی ہو گئی۔ شہنشاہ سے اتحاد کے باوجود جرمنی کے محصولات اسپین کے مالی خسارے کو کم کرنے میں کسی طور پر بھی کام نہیں آ سکتے تھے۔ (البتہ یہ صورت و یلیسٹن کے نقدرت کے اقتدار کے کنٹرول میں بروئے کار آئی تھی)۔

جنگ کے اگلے تیس برسوں کے دوران اسپین کی یہی کیفیت برقرار رہی ـــــ یعنی اس نے نئے نئے قرض حاصل کر کے اور نئے نئے ٹیکس لگا کر اور امریکہ سے ملنے والی نعمت غیر مترقبہ کو استعمال کر کے ہی ۱۶۳۴ء - ۱۶۳۵ء کے دوران کارڈینال - انفینٹی جیسی بڑی معرکہ آرائی کو جرمنی میں جاری رکھا۔ جنگ کے ان ہوشربا اخراجات کے سامنے قلیل المیعاد ذرائع سے حاصل ہونے والے ذرائع آمدن بے جان ثابت ہوئے تھے اور نتیجتاً" چند برسوں میں اسپین کی مالی حالت پہلے سے زیادہ بدتر ہو گئی۔ ۱۶۴۰ء کے عشرے میں' کتلان اور پرتگالیوں کی ہونے والی بغاوت اور امریکہ سے آنے والے خزانے میں کمی کے باعث ہیسبرگ خاندان کا زوال ناگزیر تھا۔ اگرچہ یہ ملک جانباز سپاہی فراہم کرتا تھا' اس کے باوجود بدنصیبی کی نمایاں وجہ یہ بھی تھی

کہ اس پر ایک ایسی حکومت مسلط تھی جو حاصل ہونے والی آمدنی سے دو سے تین گنی زیادہ رقم خرچ کرتی تھی۔

اسپین اور آسٹریا کی ناکامی کی دوسری اہم وجہ سطور بالا سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ہیبسبرگ خاندان کو بہت کچھ کرنا تھا' بہت سی حکومتوں سے لڑائی لڑنی تھی' بہت سے محاذوں کا دفاع کرنا تھا۔ میدان جنگ میں ہسپانوی سپاہ کی صرف شجاعت اس حقیقت کی تلافی نہیں کر سکتی اسی وجہ سے اسے اپنے شہرپناہ میں شمالی افریقہ میں' سسلی اور اٹلی میں' نئی دنیا میں' حتیٰ کہ نیدرلینڈ میں بھی پسپا ہونا پڑا۔ تین صدی بعد وجود میں آنے والی برطانوی سلطنت کی طرح ہیبسبرگ سلطنت بھی خاصے پھیلے ہوئے اور وسیع علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس سیاسی خاندان کو اپنے استحکام کے لیے مادی وسائل کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ تاریخ میں وسیع حربی حکمت عملیوں کی یہ ایک نادر مثال ہے۔ اتنی ساری مقبوضات کی موجودگی کا لازمی نتیجہ دشمنوں کی کثیر تعداد میں پیدا ہوتا تھا۔ اس دور میں سلطنت عثمانیہ کو بھی یہی الجھن در پیش تھی۔

ہیبسبرگ سلطنت کی جنگوں کے واقعات بھی ایک اہم موضوع ہے۔ اس دور میں' سرزمین یورپ میں متعدد جھگڑے لڑائیاں ہوئیں جن پر اٹھنے والے اخراجات بعد ازاں تمام معاشرے پر اچھے خاصے بوجھ بن گئے۔ لیکن دوسرے ممالک' یعنی فرانس' انگلینڈ' سویڈن' حتیٰ کہ سلطنت عثمانیہ ---- میں خاصی مدت تک امن و امان رہا اور وہ ترقی کرتے رہے۔ یہ ہیبسبرگ اور خصوصاً" اسپین کی بدقسمتی تھی کہ اسے ایک دشمن سے جنگ کرنے کے بعد دوسرے سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ فرانس سے صلح ترکوں کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں کامیاب ہوئی۔ بحیرہ روم کے سمجھوتے کے نتیجے میں بحراوقیانوس میں جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور پھر اسی سلسلے کی ایک کڑی شمال مغربی یورپ کے لیے جھگڑا تھا۔ کچھ ایسے پرآشوب زمانے بھی تھے جب سلطنت اسپین کو ایک ہی وقت میں تین تین محاذوں پر لڑنا پڑتا رہا تھا جب کہ اس کے دشمن ایک دوسرے کی مسلسل مدد کر رہے تھے' چاہے یہ امداد عسکری نوعیت کی نہ بھی ہو لیکن سفارتی اور اقتصادی ضرور ہوتی تھی۔ اس دور کے تذکرے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسپین کی حیثیت غار کے ایک ریچھ جیسی تھی جو تمام حملہ آور کتوں سے کہیں زیادہ طاقتور اور توانا تو تھا لیکن اپنے مخالفین سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت اس میں کبھی نہیں رہی بلکہ یہ آہستہ آہستہ زبوں حال ہی ہوتا چلا گیا۔

آخر ہیبسبرگ خاندان کو اس خونیں چکر سے کیوں کر نجات مل سکتی تھی؟ مورخین نے توانائی کے بری طرح بکھر جانے کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چارلس پنجم اور اس کے جانشینوں کو واضح قسم کی دفاعی ترجیحات وضع کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کلیے کے معنی یہ ہوئے کہ بعض باتیں مصارف طلب تھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کون سی؟

بہرحال' یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسٹرین ہیبسبرگ اور خصوصاً" فرڈیننڈ دوم کو جرمنی میں اصلاحات کے خلاف اقدام کرنے سے اجتناب برتنا چاہیے تھا' کیونکہ اس سے فائدہ تو بہت کم' لیکن نقصان بہت زیادہ ہوا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ شہنشاہ کے لیے جرمنی میں اپنی ایک معقول فوج رکھنا ضروری بھی تھی اور مجبوری بھی تاکہ جاگیرداروں کے رویے' فرانس کی سازشوں اور سویڈن کی خواہشات پر قابو پایا جا سکے۔ پھر ہیبسبرگ

کی مسلح فوجوں میں اس وقت تک کوئی کمی بھی نہیں کی جا سکتی تھی اور جب ترک ویانا سے صرف ۱۵۰ میل دور' ہنگری کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ہسپانوی حکومت کسی طور پر بھی اپنے آسٹرین بھائیوں کا خاتمہ نہ تو فرانس اور لوتھران کے ہاتھوں چاہتی تھی نہ ہی ترکوں کے ہاتھ! کیونکہ خود یورپ میں اسپین کا وجود معرض خطرے میں پڑ جاتا۔ تاہم اس جائزے کے دوسرے رخ کو نہیں دیکھا گیا ہے۔ ۱۵۵۶ء میں چارلس پنجم کی دست برداری کے بعد اس کی سلطنت اس امر کی قطعاً" پابند نہ تھی کہ وہ مغربی یورپ اور سمندر پار ملکوں میں میڈرڈ کی طرف سے لڑی جانے والی جنگوں میں مالی تعاون کرتی لیکن اسپین نے اپنے اصول معاہدوں کے پیش نظر حکومت کے ساتھ وفاداری برتی۔ اس احساس وفاداری کے طویل المیعاد نتائج خاصے دلچسپ ہیں سترھویں صدی کے وسط میں ہسپانوی ہیبسبرگ کو اپنے یورپی مقاصد میں جو ناکامی ہوئی اس کی تمام تر وجہ ملکی مسائل اور اقتصادی زوال تھا۔ ہر سو ہاتھ پاؤں پھیلا لینے کے باوجود یہ مرکزی طور پر کمزور تھا۔ اگر دوسری جانب آسٹرین ہیبسبرگ کا جائزہ لیں تو یہ دیکھیں گے کہ گو جرمنی میں پروسیوں کو دبانے میں یہ سراسر ناکام رہا لیکن آسٹریا' بوہیمیا جیسے خاندانی ممالک میں اس قدر محکم اقتدار حاصل کر لیا کہ اس وسیع خطے کی بنیاد پر اور تجربہ کار فوج کی مدد سے ہیبسبرگ شہنشاہیت سترھویں صدی کی آخری دہائیوں میں یورپ کی عظیم طاقت کے طور پر نمایاں ہوگئی جبکہ اسپین زوال سے دو چار ہو رہا تھا۔ اس وقت میڈرڈ کے سیاست دان آسٹریا کے دوبارہ طاقت پکڑنے سے کوئی سبق تو حاصل نہ کر سکے' البتہ ادھر ادھر کسی اور اتحادی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔

اس امر کا جائزہ لینا آسان ہے کہ نئی دنیا کی مقبوضات کیوں اس قدر اہمیت کی حامل تھیں۔ تقریباً" ایک صدی تک یہ اسپین کو مسلسل دولت بھی فراہم کرتی رہیں اور دفاعی قوت بھی۔ ان کے بغیر ہیبسبرگ خاندان اپنے قدم مضبوطی سے نہیں جما سکتا تھا۔ حتیٰ کہ جب انگلستان اور ولندیزیوں نے ہسپانیہ اور پرتگال کی نوآبادیات پر حملے کیے تو اس کے نتیجے میں بحری جہازوں اور سمندر پار قلعوں کی دیکھ بھال کے لیے کثیر رقم کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن ان مقبوضات سے بالواسطہ اور بلا واسطہ حاصل ہونے والی آمدنی ہی ہسپانوی حکومت کے کام آئی۔ ایسے منفعت بخش مراکز کو گنوا دینا بظاہر سمجھ سے بالاتر ہے۔

ہیبسبرگ خاندان کی اٹلی اور فلینڈر میں جو دو اہم مقبوضات تھیں وہ قابل غور ہیں۔ اٹلی والا علاقہ ہاتھ سے جاتا رہا جو بذات خود نقصان کا باعث ہوا۔ سولھویں صدی کے نصف اول میں فرانس اٹلی کی دولت کو مصرف میں لا کر بڑی طاقت بن گیا اور اس طرح ہیبسبرگ خاندان کو خاصی زک پہنچی۔ پھر یہی اٹلی مذکورہ صدی کے دوران اسپین کے لیے ایک فصیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ ہسپانیہ کے وقار اور عیسائی مذہب کو جو دھچکا لگا اور جس کی وجہ سے سسلی' نیپلز اور روم پر ترکوں کی چڑھائی کا مداوا نہ ہو سکا' اٹلی جیسے شہرپناہ کا ہاتھ سے نکل جانا حربی لحاظ سے بے حد نقصان دہ ثابت ہوا۔ اس زمانے میں اسپین کو ساحلی علاقوں پر قلعے تعمیر کرنے اور بحری بیڑے کی تیاری میں خاصی رقم خرچ کرنی پڑی۔ اور اس کے نتیجے میں فلپ دوم کے عہد کے ابتدائی عشروں میں دفاعی بجٹ خاصا بڑھ گیا تھا۔ لہٰذا فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یہ نہایت مناسب تھا کہ وسطی بحیرہ روم کا تحفظ موجود افواج کے ذریعے کیا جائے۔ اس طرح ترک دشمنوں کو

فاصلے پر رکھا گیا۔ یہ بات بھی خوش آئند تھی کہ ان مہمات پر اٹھنے والے اخراجات کی ادائیگی ہیسبرگ کی اٹلی والی مقبوضات' پاپائیت اور اکثر و بیشتر وینس کرتا تھا۔ اس محاذ سے واپسی فائدہ مند ثابت نہیں ہوئی بلکہ بت سے خطرات کا سبب بن گئی۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو نیدر لینڈ ہی وہ واحد علاقہ تھا جہاں سے ہیسبرگ خاندان کے نقصانات کی تلافی ہو سکتی تھی۔ پھر' ڈچ کے ساتھ جو اسی سالہ جنگ برپا ہوئی اس میں فلینڈر کی فوج پر اٹھنے والے اخراجات نہ صرف ہوش ربا تھے بلکہ ہر لحاظ کے مصارف سے کہیں زیادہ تھے۔ حتیٰ کہ تیس سالہ جنگ کے نقطہ عروج کے وقت فلینڈر کے قلعے پر اتنی رقم خرچ کی گئی جتنی جرمنی پر خرچ کی گئی تھی۔ ایک ہسپانوی کونسلر کے مشاہدے کے مطابق "نیدر لینڈ کی جنگ اس سلطنت کی مکمل تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی"۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۵۶۶ء اور ۱۶۵۴ء کے دوران اسپین نے ۲۱۸ ملین کی رقم فوجی اخراجات پورے کرنے کے لیے نیدر لینڈ روانہ کی۔ واضح رہے کہ حکومت کو ہند اقصیٰ سے جو مجموعی آمدنی (۱۲۱ ملین) حاصل ہوتی تھی' یہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ پھر حربی نقطہ نظر سے بھی فلینڈر کا دفاع خاصا مشکل تھا۔ بحری راستوں پر فرانس' انگلستان اور ڈچ کا قبضہ تھا۔ چنانچہ ۱۶۳۹ء میں جب ہسپانوی جہاز فوج کی نئی کمک لے جا رہا تھا' ڈچ کے ایڈمرل ٹروپ نے اسے تباہ کر دیا۔ لیکن ہسپانوی شاہراہ بھی جو لومبارڈی سے براستہ سوئزر لینڈ' سوائے اور فرانس کے مشرقی محاذ سے ہوتی ہوئی دریائے رائن کے نشیبی علاقے تک جاتی تھی' اس میں بھی کئی خطرناک موڑ آتے تھے۔ کیا یہ بات مناسب تھی کہ نیدر لینڈ کے دو ملین باشندوں کو زیردام کرنے کے لیے اتنے دور دراز مقام کا سفر طے کیا جائے اور وہ بھی اس قدر اخراجات کے بعد؟ کیسل کی بھاری ٹیکس ادا کرنے والی مجلس قانون ساز کے ممبروں نے اس پر صدائے احتجاج کیوں بلند نہیں کیا؟ آفاقی سزا ان کا مقدر بن چکی تھی اور اسپین ان تمام اخراجات اور مسائل کا تدریہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اسٹیج سے شاہی پسپائی کی جو وجوہات بیان کی جاتی ہیں وہ ان لوگوں کو بالکل مطمئن نہیں کر سکتیں جو وسائل کو بے طرح برباد کرنے کی شکایت کرتے ہیں۔ تاہم ان میں کچھ معقول اسباب بھی ہیں۔ اول یہ کہ اگر فلینڈر پر اسپین کا قبضہ نہ رہتا تو اس صورت میں یہ فرانس یا متحدہ صوبوں کی گرفت میں آجاتا۔ اس طرح ہیسبرگ خاندان کے ان دونوں دشمنوں میں کسی ایک کا اقتدار بھی مستحکم ہو جاتا اور وقار بھی بڑھ جاتا۔ یہی تصور اسپین کے منصوبہ سازوں کے پیش نظر رہا تھا جو اعزاز و وقار کو ہر شئے پر ترجیح دیتے تھے۔ دوسرے فلپ چہارم اور اس کے مشیروں کا یہ خیال تھا کہ اس علاقے میں معمول کی جھڑپ برقرار رہنے کا اہم فائدہ یہ ہو گا کہ خونخوار فوجیں حساس علاقوں سے دور رہیں گی۔ بقول پارکر۔

> "اگرچہ نیدر لینڈ کی جنگ نے ہمیں مالی طور پر دیوالیہ بنا دیا ہے اور ہم قرض میں جکڑے ہوئے ہیں' بایں ہمہ اس نے ہمارے دشمنوں کو بھی ادھر ہی مجتمع کر دیا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو یہ یقینی امر تھا کہ جنگ یا تو اسپین کی سرزمین میں ہو رہی ہوتی یا کہیں آس پاس"۔

آخری بات یہ کہ اس میں دو مینو کھیل کا تصور پنہاں تھا ۔۔۔۔۔ یعنی نیدر لینڈ ہاتھ سے جاتا ہے تو

جرمنی میں ہیسبرگ حکومت کے مقاصد بھی ختم ہو جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی مقبوضات' حتیٰ کہ اٹلی بھی دسترس میں نہیں رہتا۔ یہ یقیناً" مفروضہ دلائل تھے' لیکن جو بات دلچسپی کا باعث ہے وہ یہ کہ میڈرڈ کے سیاست دان اور برسیل میں مقیم ان کے فوجی کمانڈر مذکورہ تمام باتوں کا باہم مربوط تصور کرتے تھے کہ اگر ان میں ایک حصہ بھی گر گیا تو ساری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

> "اولین اور اہم خطرات (جن کے اسباب ۱۶۳۵ء کے پر آشوب سال میں پیدا ہوئے) کی زد میں لومبارڈے' نیدر لینڈ اور جرمنی تھے۔ اگر ان تین ملکوں میں سے کسی ایک کو شکست ہوتی تو یہ شہنشاہیت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ اور اگر کسی ایک کو بھی شکست فاش کا سامنا کرنا پڑتا تو اس کے نتیجے میں پوری شہنشاہیت کا وجود ختم ہو جاتا۔ یعنی جرمنی کے اثرات اٹلی اور نیدر لینڈ پر مرتب ہوتے اور آخرالذکر کے اثرات سے امریکہ متاثر ہوتا۔ پھر لومبارڈے کا اثرات نیپلز اور سسلی پر پڑتے اور کوئی بھی ایک دوسرے کے دفاع کی پوزیشن میں نہ ہوتا"۔

اس منطق کے تحت شاہ ہسپانیہ نے خود کو جنگ کے ایک ایسے لامتناہی سلسلے میں ملوث کر لیا تھا جو اس وقت تک جاری رہتا جب کہ یا تو فتح نصیب ہوتی یا صلح ہو جاتی یا پھر سارا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا۔

ان حقائق سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جاری رہنے والی جنگ کے کثیر اخراجات اور چاروں اہم محاذوں سے پیچھے نہ ہٹنے کے عزائم سے ہسپانوی شہنشاہیت کو بہر صورت نقصان ہونا تھا۔ واقعات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ایک تیسری وجہ بھی موجود تھی۔ وہ یہ کہ حکومت ہسپانیہ اپنے وسائل کو موثر انداز میں بروئے کار نہیں لا سکی۔ پھر اقتصادی غلطیاں کر کے اس نے اپنا وقار بھی کھو دیا۔

اگرچہ غیر ملکی افراد چارلس پنجم اور فلپ دوم کی حکومت کو نہایت ہمہ گیر اور منظم قرار دیتے ہیں' تاہم یہ مقبوضات کا انبوہ کثیر تھی۔ لطف یہ کہ ہر مقبوضہ علاقے کی اپنی خصوصیات اور اپنے امتیازات تھے وہاں کوئی مرکزی انتظامیہ نہ تھی۔ (مقننہ اور عدلیہ کا تو ذکر ہی کیا)' اور تنہا بادشاہ ہی ان تمام ذمہ داریوں کا محور تھا۔ ایسا کوئی ادارہ نہ تھا جو آپس میں اتحاد کا شعور پیدا کرتا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ بادشاہ ملک کا کبھی دورہ بھی نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا اس کے لیے یہ بات نہایت مشکل ہو گئی کہ وہ اپنی سلطنت کے کسی ایک حصے میں جنگ کرنے کے لیے کسی دوسرے علاقے سے چندہ وصول کرتا۔ سسلی اور نیپلز کے ٹیکس گزار ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے جنگی جہاز کی تیاری میں بہ رضا و رغبت رقم مہیا کر دیتے تھے لیکن نیدر لینڈ میں ہسپانوی جنگ میں امداد دینے پر سخت معترض ہوتے تھے۔ پرتگال کے باشندے نئی دنیا کے دفاع کی حمایت کرتے تھے لیکن جرمنی میں ہونے والی جنگ سے انھیں کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ چنانچہ اس شدید علاقائیت نے مالی حقوق غصب ہونے پر حسد کے جذبے کو ہوا دی' مثلاً" سسلی میں جب ہیسبرگ حکومت نے ٹیکس میں اضافے کی کوشش کی تو جاگیرداروں/ نوابوں نے اس کی سخت مخالفت کی یہی نہیں بلکہ ۱۵۱۶ء اور ۱۵۱۷ء میں

وہ لوگ ہسپانوی وائسرائے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ سسلی طوائف الملوکی کا شکار غریب ملک تھا' اور وہاں پارلیمنٹ بھی تھی' لہٰذا وہ ہیبسبرگ خاندان کے عام مفادات کے تحفظ کے لیے مزید رقم دینے پر رضا مند نہ تھا۔ سلطنت نیپلز اور نئے مفتوحہ علاقے میلان میں ہسپانوی انتظامیہ کی راہ میں چند ہی قانونی رکاوٹیں حائل تھیں۔ پھر اس پر حصول رقم کے نئے ذرائع تلاش کرنے کے لیے میڈرڈ کا مسلسل دباؤ بھی تھا۔ چنانچہ ان دونوں ممالک نے چارلس پنجم کے عہد حکومت میں ہسپانیہ کو خاصی رقم مہیا کی لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو میلان کو قبضے میں رکھنے کی جدوجہد میں اور ترکوں کے خلاف جنگ ان دونوں باتوں کے معنی یہ تھے کہ رقم کی یہ ترسیل آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ بحیرہ روم میں اپنا مورچہ مضبوط رکھنے کی خاطر اسپین کو لاکھوں کی رقم اٹلی بھیجنی پڑی۔ وہاں سے جو رقم وصول کی گئی وہ اس کے علاوہ ہے۔ تیس سالہ جنگ کے دوران گذشتہ طریقہ پھر لوٹ آیا' یعنی اٹلی سے حاصل ہونے والے ٹیکس جرمنی اور نیدر لینڈ کی جنگ میں استعمال ہوئے۔ لیکن اس پورے دور (۱۵۱۹ء - ۱۶۵۹ء) کا جائزہ لینے کے بعد یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ہیبسبرگ نے اٹلی میں اپنے مقبوضہ علاقوں کے خزانے میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع کی ہو گی نہ کہ اپنے دفاعی مقاصد کی خاطر اس میں سے نکالی ہو گی۔

نیدر لینڈ شاہی خزانے کے لیے بالآخر ایک بوجھ بن گیا۔ چارلس پنجم کے عہد حکومت کے ابتدائی حصے میں وہاں کے عام جاگیرداروں نے ٹیکس کی اچھی خاصی رقم فراہم کی تھی' لیکن ہمیشہ بول تول بھی کرتے رہے اور اپنے حقوق تسلیم کیے جانے پر زور بھی دیتے رہے۔ بادشاہ نے آخری دنوں میں' جب اٹلی اور جرمنی سے جنگ کے لیے زیادہ سے زیادہ مالی امانت طلب کی گئی تو اس پر عوام میں غصے کی لہر دوڑ گئی جس میں مذہبی بے اطمینانی اور اقتصادی مسائل سے اور بھی اضافہ ہو گیا۔ بالآخر ہسپانوی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔ ۱۵۶۵ء کے قریب بلجیم اور ہالینڈ کا سرکاری قرضہ ۱۰ ملین فلورن تک پہنچ گیا۔ علاوہ ازیں' ادائیگی قرض کی رقم اور انتظامی امور کے اخراجات آمدنی سے بڑھ گئے۔ چنانچہ اسپین کو یہ کمی پوری کرنی پڑی۔ جب ایک صدی تک میڈرڈ غلط طریقے سے پیش آتا رہا تو نتیجتاً" یہ مقامی شورش کھلی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی اور نیدر لینڈ شاہی خزانے پر اس قدر بوجھ بن گیا کہ فلینڈرز کی فوج ہسپانوی حکومت کے مجموعی اخراجات کا ایک چوتھائی حصہ ہڑپ کرتی رہی۔ اور یہ سلسلہ عشروں چلتا رہا۔

اسپین اپنے وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔ مزید برآں' وہاں بادشاہ کے مالی حقوق کافی محدود تھے۔ آراگون کے تین قلمرو (آراگون' کیٹالونیا اور ویلنسیا) میں ان کا اپنا قانون اور ٹیکس کا نظام نافذ تھا۔ اس طرح انھیں ایک مثالی خود مختاری حاصل تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان علاقوں میں شہنشاہ کو جو بھی محصول ملتا وہ شاہی جائیداد سے ہی ملتا تھا۔ اضافی گرانٹ شاذونادر ہی حاصل ہوتی تھی۔ اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ جب ۱۶۴۰ء میں فلپ چہارم نے کیٹالونیا پر دباؤ ڈالا کہ جو فوج ہسپانوی سرحد کی حفاظت کے لیے وہاں بھیجی گئی ہے اس کا خرچہ برداشت کریں تو اس کے نتیجے میں بغاوت پھیل گئی جو طویل عرصے تک جاری رہی۔ پرتگال ۱۵۸۰ء سے ۱۶۴۰ء کی شورش تک ہسپانیہ کے زیر تسلط رہا۔ اس کے باوجود مالی معاملات میں وہ بالکل خود مختار تھا اور ہیبسبرگ خاندان کے کسی بھی مقصد کے

لیے اس نے باضابطہ کوئی فنڈ مہیا نہیں کیا۔ ایسی صورت میں کیسل ہی ہسپانیہ کے محصولاتی نظام میں دودھ دینے والی گائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاہم یہاں بھی باسک صوبے اس بوجھ سے مستثنیٰ تھے۔ مقامی شرفا' جنھیں کیسل کی مجلس قانون ساز میں بھرپور نمائندگی حاصل تھی' آئے دن ٹیکس لاگو کرتے رہتے جن سے وہ خود بری الذمہ تھے۔ علاوہ ازیں' متعدد قسم کے ٹیکس نافذ تھے' مثلاً' الکبالا (دس فیصد سیلز ٹیکس) اور کسٹم ڈیوٹی جو عام قسم کے محصول تھے' سروی سی اوس (اس کی منظوری مجلس قانون ساز دیا کرتی)' میلون (کھانے پینے کی چیزوں پر ٹیکس جسے مجلس قانون ساز عائد کیا کرتی)' چرچ کے عائد کردہ بہت سے غیر معمولی ٹیکس ---- ان کا تمام تر مقصد تجارت' اشیا کے تبادلے اور غریب عوام کو زک پہنچانا تھا۔ اس طرح بے چینی پھیل رہی تھی اور لوگ ترک وطن پر مجبور ہو رہے تھے۔

جب تک امریکہ کی چاندی سے حکومت ہسپانیہ کو کثیر مقدار میں محصولات میسر نہیں ہوئے تھے (اندازاً" یہ سلسلہ ۱۵۶۰ء کی دہائی سے لے کر ۱۶۳۰ء کے عشرے تک رہا)' ہیبسبرگ خاندان کی جنگ کا تمام تر بوجھ کیسل کے کسانوں اور تاجروں کا کاندھوں پر رہا۔ نیز' سلطنت کے عروج کے زمانے میں نئی دنیا کے وسائل سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی وہ کیسل اور اس کے چھ ملین باشندوں سے حاصل ہونے والے مجموعی ٹیکس کی ایک چوتھائی یا ایک تہائی ہوتی تھی۔ جب تک سلطنت ہیبسبرگ اور اس کے تمام مقبوضہ علاقوں میں ٹیکس مساوی طور پر لاگو نہ کیا جاتا' بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات کی تکمیل کے لیے مروج طریقہ کار بالکل لایعنی تھا۔

اس ناآسودگی کی بین وجہ ناقص اقتصادی نظام تھا۔ کیسل کے ٹیکس گزار بری طرح اس کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ سلطنت ہسپانیہ کی سماجی اقدار ایسی نہ تھیں جو تجارت کے لیے نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوتیں۔ البتہ سولھویں صدی کے آغاز میں یہ ملک خاصا خوشحال تھا' بڑھتی ہوئی آبادی آسودہ حال تھی اور اہم صنعتیں فروغ پا رہی تھیں۔ پھر ہوا یہ کہ اصلاحات کے رد عمل کی تحریک اور بہت سی جنگوں میں ہیبسبرگ خاندان کی شمولیت نے ہسپانوی معاشرے میں مذہبی اور فوجی عناصر کو در آنے کے موقع دیا۔ اس طرح تجارت کو نقصان پہنچا اور معاشرے میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے جو محرکات تھے وہ بس اتنے تھے کہ چرچ کا وظیفہ مل جائے یا ادنیٰ درجے کا کوئی اعزاز حاصل کیا جائے۔ وہاں ہنر مند صناعوں کی بے حد کمی تھی' خصوصاً" اسلحہ سازی کے کارخانوں میں۔ پھر مختلف اداروں نے مزدوروں کی نقل و حرکت پر پابندی بھی عائد کر دی تھی۔ حتیٰ کہ بھیڑوں کے مالکان کی مشہور و معروف انجمن "میٹا" کو حاصل شدہ مراعات کی وجہ سے زراعت کا عمومی شعبہ ترقی سے محروم تھا' اس لیے کہ اس تنظیم سے وابستہ افراد کو اجازت تھی کہ وہ اپنے گلے کو سلطنت میں جہاں چاہیں' چرایا کریں۔ سولھویں صدی کے نصف اول میں اسپین کی آبادی جس تیزی سے بڑھی تھی' اس کے نتیجے میں غلے کی درآمد کی زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ چونکہ "میٹا" کی تنظیم جانور چرانے سے حاصل ہونے والی آمدنی براہ راست شاہی خزانے میں جمع کراتی تھی اور اس طریقے کو کالعدم قرار دیے جانے سے تاج و تخت کے بااثر حمایتوں کے ناراض ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا' لہٰذا یہ نظام جوں کا توں برقرار رہا۔ آخری بات یہ کہ بعض استثناء کے باوصف' کاروباری طبقہ اون کی تجارت کیا کرتا تھا

اور کیسٹا کی معیشت بحیثیت مجموعی بیرونی اشیاء کی درآمد پر منحصر تھی۔ اس اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں غیر ہسپانوی، خصوصاً" جینوا، پرتگال اور فلانڈرس کے تاجر پیش پیش تھے۔ ڈچوں کا تعاون بھی شامل تھا، خصوصاً" جنگ و فساد کے حالات میں بھی! ۱۶۴۰ء میں ہسپانوی بندرگاہوں پر جو سامان اتارا گیا اس کا تین چوتھائی حصہ ڈچ جہازوں میں بھر کر آیا تھا۔ گویا اس طرح بہت بڑا سرمایہ ملک کے سب سے بڑے دشمن کے ہاتھ لگا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ تجارت میں عدم توازن کی وجہ سے اسپین کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کا تدارک امریکہ سے حاصل ہونے والے سونے اور چاندی کی برآمد سے ہی ممکن تھا۔

۸۰ سالہ جنگ کے ہوش ربا اخراجات کا بوجھ ایک ایسے معاشرے پر ڈال دیا گیا تھا جو اقتصادی لحاظ سے زبوں حال تھا اور وہ اس بوجھ کا کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہیسبرگ شہنشاہوں نے ٹیکسوں کی وصولی کے لیے کوئی مفید طریقہ اپنانے سے انحراف کیا اور ایسے انداز میں ٹیکس وصول کرنے کی پالیسی وضع کی جو قلیل المیعاد صورت میں تو آسان نظر آتی تھی لیکن طویل المیعاد صورت میں ملک کے لیے تباہ کن تھی۔ ٹیکس میں اضافے کے لیے ہر طریقہ اپنایا گیا۔ لیکن اس کا بوجھ ایسے افراد پر شاذ و نادر ہی ڈالا گیا جو باسانی اسے ادا کر سکتے تھے۔ گویا بار بار ٹیکس عائد کر کے تجارت کو نقصان پہنچایا گیا۔ نقد رقم کے حصول کے لیے مالی طور پر پریشان حکومت نے مختلف حقوق، اجارہ داریاں اور اعزازات فروخت کر دیے۔ مالی خسارہ پورا کرنے کے لیے نہایت بے ڈھبے طریقے اپنائے گئے۔ کبھی تو اس وعدے پر بنکاروں سے قرض لیا گیا کہ یہ قرض کیسل سے حاصل شدہ ٹیکس یا امریکہ سے آنے والے خزانے سے بیباق کر دیا جائے گا۔ کبھی سرکاری سودی بانڈ (جورس) فروخت کر کے رقم حاصل کی گئی جو بصورت دیگر تجارت و صنعت میں لگائی جا سکتی تھی۔ قرض کے متعلق سرکار کی وضع کردہ پالیسی روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے کے مترادف تھی۔ نہ اس کی کوئی حد تھی اور نہ ایسا کنٹرول جو مرکزی بنک عموماً" قائم رکھتا ہے۔ چارلس پنجم کے عہد حکومت کے آخری دنوں میں تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ مالگزاری کو آئندہ کئی سالوں کے لیے رہن رکھ دیا گیا۔ ۱۶۴۳ء میں محاصل کا ۶۵ فیصد حصہ فروخت شدہ سرکاری بانڈ (جورس) کے سود کی ادائیگی میں صرف ہو گیا تھا۔ بادشاہ کی آمدنی جیسے جیسے محدود ہوتی گئی، غیر معمولی قسم کی مالگزاری اور نئے نئے ٹیکس کے ذرائع تلاش کیے گئے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ امریکہ سے آنے والی چاندی جو نجی ملکیت ہوتی اس پر حکومت زبردستی قبضہ کر لیتی اور مالکان کو مجبور کرتی کہ اس کے عوض "جورس" قبول کر لیں۔ اکثر مواقع پر ہسپانوی شہنشاہوں نے سود کی ادائیگی منسوخ کر دی اور یہ اعلان کر دیا کہ وہ دیوالیہ ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس اقدام نے مالیاتی اداروں کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا لیکن میڈرڈ کی حکومت کی ساکھ ضرور کمزور کر دی۔

اگرچہ ان برسوں میں کیسل کی اقتصادی ابتری میں انسانی ہاتھ کو کوئی دخل نہیں تھا، لیکن انسان کی عاقبت نا اندیشی کی وجہ سے اس کے مضمرات بے حد و حساب تھے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں پلیگ پھیل جانے کی وجہ سے نواحی علاقوں کی آبادی گھٹ کر رہ گئی۔ یہ ایک حادثہ تھا لیکن ان نے بہت سے مضمرات پیدا ہوئے، مثلاً مکانوں کے کرائے میں اضافہ، جا تنظیم کی بد اعمالیاں، فوجی ملازمت، یہ سب زراعت کو پہلے ہی نقصان پہنچا رہے تھے۔ امریکہ سے آنے والی چاندی نے ایسے معاشی مسائل پیدا کیے (خصوصاً" قیمت کی

افراط زر) جنہیں حل کرنے کا طریقہ اس زمانے میں موجود نہ تھا۔ اسپین میں جو حالات تھے ان سے واضح ہوتا تھا کہ پیداواری طبقے کو غیر پیداواری طبقے کے مقابلے میں زیادہ نقصان پہنچا۔ چاندی نہایت سرعت سے بنکوں اور فوجی سازوسامان مہیا کرنے والے تاجروں کے ہاتھوں میں پہنچ رہی تھی۔ دولت کے نئے وسائل کو بادشاہ الللے تللوں پر خرچ کر رہا تھا اور مالی حالت کو مستحکم کرنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ہند اقصیٰ سے جو قیمتی دھاتیں وافر مقدار میں آئی تھیں وہ اسپین کے لیے چھت کے پانی کے مترادف تھیں جو ٹپکنے کے بعد خشک ہو جاتا تھا۔

ہسپانوی زوال کی درمیانی مدت میں اس خیال کا وجود سرے سے ناپید تھا کہ طاقت ور فوجی نظام کے لیے اقتصادی سہارا نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ بار بار غلط اقدامات کیے جاتے رہے، مثلاً" یہودیوں کا انخلاء، بعد ازاں شمالی افریقہ کے عربوں کا دیس نکالا، بیرونی جامعات سے تعلقات کا انقطاع، لسبکیا کے شپ یارڈ کو حکومت کی یہ واضح ہدایت کہ وہ بڑے بڑے جنگی جہازوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے اور زیادہ کارآمد تجارتی بیڑے بنانے پر توجہ دے، اجارہ داری کی فروخت جس سے تجارت کو نقصان پہنچا، اونی برآمدات پر بھاری ٹیکس کا نفاذ جس سے بیرونی منڈی میں ان کی مسابقت نہ رہی، ہسپانیہ کی مختلف سلطنتوں کے مابین اندرونی محصول کا نفاذ جس سے تجارت کو نقصان پہنچا اور قیمت میں انتشار پیدا ہوا۔ عاقبت نا اندیشی پر مبنی یہ چند فیصلے تھے جنہوں نے بالآخر اسپین کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ اپنے اس فوجی کردار کو جاری رکھ سکے جسے اس نے ازخود یورپی اور غیر یورپی معاملے میں اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا۔ اگرچہ ۱۶۴۰ء کے عشرے تک اسپین کا زوال پوری طرح واضح نہیں ہوا تھا، تاہم اس کے اسباب برسوں پہلے سے موجود تھے۔

بین الاقوامی تقابل

یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہیسبرگ خاندان کی ناکامی بے جواز نہ تھی۔ دیگر یورپی طاقتوں کے تجربات کا جائزہ لیے بغیر یہاں داستان کو نامکمل چھوڑ دینا ادھورے تجزیے کے مترادف ہو گا۔ جیسا کہ ایک مورخ کا کہنا ہے کہ "سولھویں صدی کے حالات کے لیے جنگ ایک سخت ترین آزمائش تھی"۔ فن حرب میں تبدیلی کے باعث فوجیوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا اور ساتھ ہی ساتھ وسیع پیمانے پر بحری جھگڑے نے مغرب کے منظم معاشرے پر بے حد دباؤ ڈالا۔ ہر متحارب طاقت کو یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ کس طرح تسلی بخش انتظامی ڈھانچہ تیار کیا جائے تاکہ "فوجی انقلاب" کا ساتھ دیا جا سکے۔ اور اس کے لیے یہ بات بھی اہمیت کی حامل تھی کہ جنگ کے خطیر اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ افواج کے سالہا سال تک جنگ میں ملوث رہنے کے باعث ہیسبرگ کے حکمرانوں اور ان کی رعایا پر جو دباؤ پڑا تھا وہ غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ لیکن جدول نمبر ا کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق عظیم فوج کی نگرانی اور اخراجات کا مسئلہ ہر ریاست کو درپیش تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسی تھیں جنہیں سلطنت اسپین کے مقابلے میں بہت کم وسائل میسر تھے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب اس آزمائش میں کس طرح پوری اتریں؟

جدول نمبر۱

فوج کی افرادی قوت میں اضافہ

۱۴۷۰ء - ۱۶۶۰ء

تاریخ	اسپین	متحدہ صوبہ جات	فرانس	انگلستان	سویڈن
۱۴۷۰ء کا عشرہ	۲۰۰۰۰	-	۴۰۰۰۰	۲۵۰۰۰	-
۱۵۵۰ء "	۱۵۰۰۰۰	-	۵۰۰۰۰	۲۰۰۰۰	-
۱۵۹۰ء "	۲۰۰۰۰۰	۲۰۰۰۰	۸۰۰۰۰	۳۰۰۰۰	۱۵۰۰۰
۱۶۳۰ء "	۳۰۰۰۰۰	۵۰۰۰۰	۱۵۰۰۰۰	-	۴۵۰۰۰
۱۶۵۰ء "	۱۰۰۰۰۰	-	۱۰۰۰۰۰	۷۰۰۰۰	۷۰۰۰۰

اس مختصر جائزے میں ہیبسبرگ کے سب سے بڑے دشمن سلطنت عثمانیہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ اس کی قوت اور کمزوری کا تذکرہ گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ البتہ یہاں اس حقیقت کا اعادہ ضروری ہے کہ بہت سے مسائل اور کوتاہیاں جن سے ترک انتظامیہ کو سابقہ تھا ـــــ یعنی فوجی نقطہ نظر سے حد سے زیادہ توسیع' وسائل کے موثر انداز میں استعمال کا فقدان' مذہبی راسخ العقیدہ کی یا فوجی جاہ و حشت کی خاطر تجارتی ساکھ کی تباہی ـــــ وہ سب باتیں فلپ دوم اور اس کے جانشینوں کا بھی مقدر بن چکی تھیں۔ اس جائزے میں روس اور پروشیا کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ وہ یورپی سیاست میں بڑی طاقتوں کے طور پر نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ مزید برآں' پولینڈ اور لیتھونیا وسیع' علاقے کے حامل ہونے کے باوجود فرقہ واریت اور جاگیردارانہ نظام کی خرابی (مثلاً" غلامی' اقتصادی بدحالی' منتخب شدہ بادشاہت اور امراء کی بد نظمی) کی وجہ سے جدید ریاست کا مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کے برعکس یہاں جن ممالک کا جائزہ لینا مقصود ہے ان میں فرانس' انگلستان' اور سویڈن کی نئی بادشاہت اور پانچ متحدہ صوبہ جات کی متوسط طبقے پر مبنی جمہوریت شامل ہے۔

چونکہ فرانس نے ایک اہم فوجی طاقت کی حیثیت سے اسپین کی جگہ لے لی تھی' لہٰذا مورخین فطری طور پر اول الذکر کے خصائص و مفادات کا تذکرہ کرنے لگے۔ تاہم فرانس کے عہد اقتدار کی معین تاریخ مقرر کرنا غلط ہوگا۔ اس باب میں جس دور کا ذکر کیا گیا ہے' اس میں فرانس اپنے جنوبی پڑوسی کے مقابلے میں خاصا کمزور رہا ہے۔ چند عشروں کے دوران اور سو سالہ جنگ کے آغاز سے قبل انگلستان' برگنڈی اور برٹانی جیسی شاہی مقبوضات' ریاستی حاکم کی منظوری کے بغیر براہ راست ٹیکس (خصوصاً "ٹیلی" یعنی نی کس محصول) کا نفاذ' ریاست کے منتظموں کی بہتر انتظامی کارکردگی اور توپوں سے مسلح شاہی فوج ـــــ ان سب نے فرانس کو ایک کامیاب اور متحد سلطنت کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ تاہم اس نظام کا بودا پن جلد ظاہر ہونے والا تھا۔ اطالوی جنگ کے دوران فرانس کی یہ جدو جہد کہ وہ جزیرہ نما اسپین و پرتگال میں (حتیٰ کہ وینس اور ترکوں سے

اتحاد کر لینے کے بعد بھی) اپنا اثر و رسوخ قائم کر لے' نہ صرف ناکام ثابت ہوئی بلکہ خاصی مہنگی بھی پڑی۔ یہ صرف ہیبسبرگ کی سلطنت نہ تھی بلکہ فرانس کی بادشاہت بھی تھی جس نے ۱۵۵۷ء کے منحوس سال میں اپنے دیوالیہ پن کا اعلان کیا۔ اس حادثے سے قبل' "ٹیلی" ' "گیبل" جیسے براہ راست عائد کیے جانے والے ٹیکس اور چنگی میں اضافے کے باوجود سلطنت فرانس ساہوکاروں سے ۱۰ سے ۱۶ فیصد شرح سود کے حساب سے قرض لے رہی تھی اور دفاتر تک فروخت کر رہی تھی۔ سب سے بدترین واقعہ جو نہ تو اسپین میں نہ انگلستان میں' بلکہ فرانس میں رونما ہوا' وہ اعلیٰ خاندانوں میں مذہبی دشمنی کی لہر تھی جس کے نتیجے میں خونیں اور طویل خانہ جنگی ظہور میں آئی۔ بین الاقوامی معاملات میں موثر حیثیت حاصل نہ ہونے کے باوجود فرانس نے ۱۵۶۰ء میں یورپ میں ایک نئی جنگ کی دھمکی دے دی۔ شاید وہ مذہبی لحاظ سے منقسم ہو جانا چاہتا تھا اور یہی صورت حال نیدرلینڈ اور جرمنی میں بھی پیدا ہوئی۔

صورت حال میں بہتری اس وقت پیدا ہوئی جب ہنری آف نواری کو فرانس کا تاج و تخت ورثے میں ملا اور وہ ہنری چہارم (۱۵۸۹ء تا ۱۶۱۰ء) کے نام سے وہاں کا بادشاہ بنا۔ اس نے اندرونی طور پر سبھی سے سمجھوتہ کر لینے اور بیرونی طور پر اسپین کے خلاف فوجی محاذ آرائی کی پالیسیاں وضع کیں۔ پھر ۱۵۹۸ء میں اس نے میڈرڈ کے ساتھ جن شرائط پر صلح کی تھی' اس کے نتیجے میں فرانس ایک آزاد طاقت کے طور پر نمایاں ہوا لیکن یہ ایک ایسا ملک تھا جو بار بار کی خانہ جنگی' ڈکیتی' گرانی' تجارت اور زراعت میں بے جا دخل اندازی کی وجہ سے حد درجہ کمزور ہو گیا تھا۔ اس کا مالیاتی نظام بھی غیر متوازن تھا۔ ۱۵۹۶ء میں سرکاری قرض ۳۰۰ ملین لیور کے لگ بھگ تھا۔ اور اس سال کے ۳۱ ملین لیور کے محاصل کا چوتھائی / پانچواں حصہ پہلے ہی منتقل اور بیچ کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں' فرانس آہستہ آہستہ اپنا قدم جمانے لگا تھا۔ اس کے قدرتی وسائل بھی بے انتہا تھے۔ تقریباً" سولہ ملین باشندوں پر مشتمل اس کی آبادی اسپین سے دوگنی اور انگلستان سے چار گنی زیادہ تھی۔ اگرچہ وہ نیدرلینڈ' شمالی اٹلی اور لندن کے علاقے کی طرح شہرت' تجارت اور مالیات میں اتنا ترقی یافتہ نہ تھا' تاہم اس کی زراعت متنوع اور منافع بخش تھی۔ چنانچہ ملک میں غلہ کی بہتات تھی۔ سترھویں صدی کے اوائل میں فرانس کی مخفی دولت اس وقت ظاہر ہوئی جب ہنری چہارم کا عظیم وزیر سلی خود ہی اقتصادیات اور سرکاری مالیات کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے پولیٹ (خاندانی دفاتر کی فروخت اور اس پر عائد شدہ ٹیکس) کے سوا کوئی اور محصول نہیں لگایا۔ البتہ اس نے ٹیکس وصول کرنے کے نظام کی از سرنو تشکیل کر ڈالی۔ اس نے ایسے ہزاروں افراد کا سراغ لگایا جو غیر قانونی طور پر چھوٹ کے دعوے دار تھے۔ اس نے شاہی قرضے پر عائد شرح زمینیں اور ان کی آمدنی قبضہ میں لیں۔ سلی نے شاہی قرضے پر عائد شرح سود کا معاملہ از سرنو طے کیا۔ چنانچہ ۱۶۰۰ء کے بعد چند ہی برسوں کے اندر سرکاری بجٹ متوازن ہو گیا۔ مزید برآں' سلی نے لوئس چہارم دہم کے ہونے والے وزیر کولبرٹ سے قبل ہی درج ذیل مختلف ذرائع سے صنعت و تجارت کو فروغ دیا۔ ٹیلی کی شرح کم کر دی۔ مال کی ترسیل کو آسان بنانے کے لیے پل' سڑک اور نہریں تعمیر کیں' کپڑے کی صنعت کی حوصلہ افزائی کی۔ تعیش کا سامان بنانے کے لیے سرکاری فیکٹریاں قائم کیں تاکہ یہ درآمدات کا نعم البدل ثابت ہوں۔ ان تمام اقدامات کے ذکر کا مقصد فلپ سوم کے اسپین سے موازنہ نہ

تھا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر ۱۶۱۰ء میں ہنری چہارم قتل نہ کر دیا گیا ہوتا تو کیا وصولیابی کے یہ اقدامات جاری رہتے۔ البتہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ نئے بادشاہوں میں کوئی ایک بھی صحیح قیادت کے بغیر مناسب عملی اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ ہنری چہارم کی وفات اور ۱۶۳۰ء کے عشرے میں رچے لیو کے شاہی اقتدار کو مرکزی حیثیت دینے کے دوران فرانس کی اندرونی سیاست' ہیوگنوٹ کی بداعمالی اور امراء کی سازشیں ---- ان سب عناصر نے ملک کو اس درجہ کمزور کر دیا کہ وہ یورپ کی عظیم طاقت بننے کے قابل ہی نہیں رہا۔ مزید برآں' جب فرانس تیس سالہ جنگ میں اعلانیہ طور پر شامل ہوگیا تو اس کی حیثیت بعض مورخین کے کہنے کے برعکس ایک متحد اور خوشحال ملک کی نہ تھی بلکہ ایک ایسی ریاست کی تھی جو بہت ساری دیرینہ کمزوریوں میں مبتلا تھی۔ امراء کی سازشیں گرمی ہوتی جا رہی تھیں جو ۱۶۴۸ء اور ۱۶۵۳ء کے دوران انتہا کو پہنچ گئیں تھیں۔ کسانوں کی شورشیں' بے روزگار شہری مزدوروں کے ہنگامے' ہیوگنوٹ کے شور و غوغے اور مقامی افسروں کی مزاحمت ---- ان تمام باتوں سے انتظامی امور میں خلل واقع ہوا۔ اقتصادی حالت بھی آبادی کی کم شرح' غیر موافق آب و ہوا' زرعی پیداوار کی قلت اور پلیگ کی وباء (جو سارے یورپ میں پھیلی ہوئی تھی) سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور اس قابل ہرگز نہ تھی کہ ایک عظیم جنگ کے اخراجات برداشت کر سکے۔

چنانچہ ۱۶۳۵ء کے بعد کے دور میں فرانس میں ٹیکس وصول کرنے کی نئی نئی صورتوں میں اضافے ہوئے۔ دفتروں کی فروخت میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ ٹیلی کی شرح میں جو کمی پہلے کی گئی تھی' اس کے برعکس اس میں اس قدر اضافہ کیا گیا کہ ۱۶۴۳ء کے لگ بھگ اس سے حاصل شدہ سالانہ آمدنی دوگنی ہو گئی۔ اس کے باوجود ہیبسبرگ خاندان کے ساتھ ہونے والی جنگ کے اخراجات پورے نہ ہو سکے ---- یعنی ڈیڑھ لاکھ فوج کی کفالت اور اتحادیوں کی اعانت! ۱۶۴۳ء میں جب فرانس کو روکوری کے مقام پر ہسپانیہ کی افواج پر فتح حاصل ہوئی' تو اس وقت حکومت کے اخراجات آمدنی سے تقریباً" دوگنا تھے۔ پھر رچے لیو کا جانشین' مزارین بے حد دل برداشتہ تھا کیونکہ دفاتر کی فروخت اور ٹیلی پر سخت کنٹرول ہونے کے باعث یہ دونوں چیزیں عوام میں غیر مقبول ہو چکی تھیں۔ یہ محض حسن اتفاق نہیں تھا کہ مزارین کے نئے مالیاتی اقدامات کے خلاف "جو ٹیکس ہڑتال" شروع ہوئی وہ ۱۶۴۸ء کی بغاوت پر منتج ہوئی۔ اس سے حکومت کا رہا سہا مالی اعتبار بھی جاتا رہا اور اسے بادل ناخواستہ اپنے دیوالیہ پن کا اعلان کرنا پڑا۔

فرانس اور ہسپانیہ کی گیارہ سالہ جنگ جو ۱۶۴۸ء کی صلح ویسٹ فالیا کے بعد بھی جاری رہی' ایسے دو مکا بازوں کی جنگ کے مشابہ تھی جو بازی ختم کرنے کے جنون میں مکے کی ہوائی گیندیں پھینکنے لگتے ہیں۔ دونوں ممالک اندرونی بغاوتوں' بے پناہ غربت اور جنگ سے عوامی نفرت کے شکار تھے اور اس طرح مالی تباہی کے دہانے پر کھڑے تھے۔ یہ بات درست ہے کہ ڈی اینگین اور ٹورین جیسے جرنیلوں اور لی ٹیلیر جیسی فوجی اصلاحات کی وجہ سے فرانسیسی فوج آہستہ آہستہ یورپ کی اعلیٰ سپاہ کے طور پر نمایاں ہو رہی تھی لیکن رچے لیو نے اس کی بحریہ کو جو استحکام بخشا تھا وہ زمینی جنگ کی وجہ سے بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔ نیز ملک کو

اقتصادی استحکام کی سخت ضرورت در پیش تھی۔ یہ فرانس کی خوش قسمتی تھی کہ کرومویل کی ماتحتی میں انگلستان نے بحریہ اور بری فوج میں نمایاں ترقی کی تھی' وہ لڑائی میں شرکت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اس طرح اسپین کے خلاف جو معرکہ آرائی ہو رہی تھی' اس کا بوجھ فرانس پر نسبتاً" کم ہوا۔ بعد ازاں' پیریز کی صلح سے اگرچہ فرانس کی عظمت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا' لیکن اس کا جنوبی پڑوسی جس نے اپنی سلطنت کو بے اندازہ پھیلا دیا تھا اور بے جگری سے لڑتا رہا تھا' بالاخر رو بہ زوال ہوا۔

دوسرے لفظوں میں' یورپ کی ہر ایک ریاست قوت و کمزوری کا مجموعہ تھی۔ اصل ضرورت اس بات کی تھی کہ آخرالذکر کو اول الذکر پر غالب ہونے سے روکا جاتا۔ یہ بات مغرب اور شمال کی فوجی طاقتوں' انگلینڈ اور سویڈن پر بھی صادق آتی ہے جنھوں نے متعدد کڑے موقعوں پر مداخلت کر کے ہیبسبرگ خاندان کے عزائم کو نکیل دی لیکن یہ بھی صحیح نہیں کہ ۱۳۰ سالہ جنگ کے دوران انگلینڈ پوری طرح مستعد اور تیار تھا۔ وار آف روزز یعنی امراء کی خانہ جنگیوں کے فوراً" بعد انگلستان کے سنبھلنے کی اہم وجہ یہ تھی کہ ہنری ہفتم ملکی استحکام اور مالی انضباط کی جانب متوجہ تھا' خصوصاً" ۱۴۹۲ء میں صلح فرانس کے بعد! پہلے ٹوڈر بادشاہ نے خانہ جنگی اور بے اطمینانی کے شکار ملک کو سمبھالا دینے کے لیے متعدد اصلاحی اقدامات کیے' مثلاً" اپنے ذاتی اخراجات میں کمی' قرض کی ادائیگی' اون اور مچھلی کی تجارت کی حوصلہ افزائی اور عام اقتصادی نظام کی بہتری!۔ پھر زراعت کی قدرتی پیداوار' بلجیم اور ہالینڈ کے ساتھ کپڑے کی نفع بخش تجارت' مچھلی پکڑنے کے لیے ساحلی علاقوں کا کثرت سے استعمال اور بحری تجارت کا فروغ ---- ان سب باتوں نے بقیہ کام خود انجام دے دیا۔ ملکی مالیات کے ضمن میں کیے جانے والے اقدامات مثلاً" شاہی زمینیں جو دوسروں اور خصوصاً" باغیوں اور تاج و تخت کے دعویداروں کے پاس تھیں' ان کا حصول' بڑھتی ہوئی تجارت پر عائد شدہ چنگی اور "اسٹار چیمبر" اور دیگر عدالتوں سے ملنے والے منافع ---- ان سب نے مل کر ایک صحت مند توازن قائم کر دیا۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ سیاسی اور مالی استحکام طاقت کے فروغ کا باعث بھی ہو۔ فرانس اور اسپین کی کثیر آبادی کے مقابلے میں انگلینڈ کے تین چار ملین باشندے بہت زیادہ نہ تھے۔ ملک کے مالیاتی ادارے اور تجارتی بنیادوں کی تعمیر اٹلی' جنوبی جرمنی' بلجیم اور ہالینڈ کے مقابلے میں ابھی خام تھی' اگرچہ ٹوڈر عہد میں صنعتی ترقی ہونے والی تھی لیکن فوجی لحاظ سے خلا خاصا وسیع تھا۔ ہنری ہفتم نے جونہی تاج و تخت پر اپنی گرفت مضبوط دیکھی' اس نے اپنی فوج کا کثیر حصہ تحلیل کر دیا اور چند ایک کے سوا نجی سپاہ رکھنا ممنوع قرار دے دیا۔ جن دنوں اٹلی میں فرانس اور ہیبسبرگ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی' انگلینڈ میں لندن ٹاور کے نگران سپاہی اور قلعے کے محافظ دستے کے علاوہ باقاعدہ کوئی فوج نہ تھی۔ واضح ہو کہ اٹلی کی مذکورہ جنگ فوجی تصادم کے جملہ طور طریقے تبدیل کر رہی تھی۔ لیکن ادھر ٹوڈر عہد کے ابتدائی دنوں میں انگلستان کے یہ سپاہی روایتی ہتھیار' یعنی تیر و کمان اور بل سے مسلح ہوتے تھے اور روایتی طور پر منظم تھے' یعنی کاؤنٹی ملیشیا'

والنسینر کمپنی وغیرہ! تاہم اس زبوں صورت حال نے بادشاہ کے جانشین ہنری ہشتم کو نہ تو اسکاٹ لینڈ کے خلاف محاذ آرائی سے باز رکھا نہ ہی فرانس کے خلاف ۱۵۱۳ء اور ۲۳-۱۵۲۲ء میں اقدامات کرنے سے روکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگستان کے اس بادشاہ نے خاصی بڑی تعداد میں جدید قسم کے فوجی دستے بلوا کر ملازم رکھ لیے تھے۔ ان میں نیزہ بردار' بندوقچی اور گھڑ سوار شامل تھے۔

اگر فرانس کے خلاف انگستان کی یہ اولین مہم اور بعد کے دو حملے (۱۵۲۸ء اور ۱۵۴۳ء) ناکام ثابت نہ ہوتے تو یہ فساد برپا کرنے والے انگریز حملہ آور فرانس کے بادشاہ کو مجبور کرتے رہتے کہ وہ کچھ دے دلا کر ان سے گلو خلاصی کرائے جس کے نتائج مالی لحاظ سے بہت برے ہوتے۔ ۱۵۱۳ء میں چیمبر کے خزانے نے ۷۰۰،۰۰۰ پونڈ کی جو مجموعی رقم خرچ کی تھی' اس میں ۶۳۲،۰۰۰ پونڈ فوجیوں کی تنخواہ' اسلحہ' جنگی جہازوں اور دیگر عسکری معاملات میں صرف ہوئے۔ ہنری ہفتم کے جمع شدہ سب خزانے اس کے پر عزم جانشین نے خرچ کر ڈالے۔ ہنری ہشتم کے وزیر اعلیٰ وولسے نے زبردستی قرض لینے کی جو کوشش کی' اس سے ہر طرف شکایات کا دفتر کھل گیا اور ۱۵۳۰ء کے عشرے میں تھامس کرومیل نے چرچ کی زمینوں پر دھاوا بول دیا' تب کہیں مالی پوزیشن بہتر ہوئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "انگستان کی اصلاحات" سے شاہی محاصل دو گنے ہو گئے۔ علاوہ ازیں' فوجی دفاع کے منصوبوں پر وسیع پیانے پر اخراجات کی اجازت بھی مل گئی ----- یعنی چینل کے ساحلی علاقے اور سکاٹ لینڈ کی سرحد پر قلعے کی تعمیر' شاہی بحریہ کے لیے نئے اور طاقتور جنگی جہازوں کی تیاری اور آئرلینڈ میں بغاوت کا قلع قمع! لیکن ۱۵۴۰ء کی دہائی میں فرانس اور اسکاٹ لینڈ کے خلاف تباہ کن جنگ پر ۱۳۵،۰۰۰ پونڈ کی لاگت آئی جو سلطنت کی آمدنی سے دس گنا زیادہ تھی۔ چنانچہ بادشاہ کے وزراء نہایت خطرناک قسم کی حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے' یعنی مذہبی جائیدادوں کی اونے پونے فروخت' امراء کی ریاستوں پر قبضہ' زبردستی قرض کا حصول' کھوٹے سکے کا چلن اور فگرز اور دوسرے بینکوں کی جانب رجوع! جب ۱۵۵۰ء میں فرانس کے ساتھ انگستان کے اختلافات ختم ہو گئے تو یہ دیوالیہ ہونے والی (برطانوی حکومت) کے لیے ایک نیک فال تھا!

مذکورہ تمام باتوں سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ سولھویں صدی کے نصف اول میں انگستان کی طاقت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ مرکزیت اور یک رنگی پر مشتمل ملک ضرور تھا' تاہم سرحدی علاقوں اور آئرلینڈ میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں شاہی وسائل اور توجہ دونوں کو اپنی جانب مبذول لیے رہنے کا رجحان ہمیشہ کار فرما رہتا تھا۔ ہنری ہشتم شکریے کا مستحق ہے جس نے یہاں خصوصی دلچسپی لی اور اسے جدید قلعوں' توپوں' ڈاک یارڈ' اسلحہ ساز فیکٹری اور پوری طرح مسلح بحریہ سے مزین کر دیا۔ لیکن فوجی لحاظ سے یہ ملک پس ماندہ تھا اور اس کے سپاہی اعلیٰ درجے کے نہ تھے۔ اس کی مالی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ وسیع پیانے پر کسی جنگ کا خرچہ برداشت کر سکے۔ جب ۱۵۵۸ء میں الزبتھ اول تخت پر جلوہ افروز ہوئی تو اس نے اپنی دانائی سے ان محدود طاقتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں منہمک ہو گئی۔ ۱۵۷۰ء کے بعد کے پر آشوب زمانے میں' جبکہ اصلاحات کے خلاف رد عمل کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور ہسپانوی فوج نیدر لینڈ میں پوری طرح سرگرم عمل تھی' ان مقاصد کو بروئے کار لانا خاصا مشکل کام تھا۔ چونکہ اس کا ملک یورپ کی

کسی اعلیٰ طاقت کے مساوی نہ تھا' الزبتھ نے سفارت کاری کے ذریعے انگلینڈ کی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کی اور جب انگستان اور اسپین کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تو اس نے فلپ دوم کے خلاف "سرد جنگ" شروع کر دی جو تمام تر سمندروں میں ہوئی۔ یہ کفایتی بھی ثابت ہوئی اور بسا اوقات نفع بخش بھی رہی۔ اگرچہ الزبتھ کو ۱۵۷۰ء کے آخری عشرے میں اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں تعینات فوجی میسو اور نمنہ کے تحفظ اور ولندیزی باغیوں کی مالی امداد کے لیے رقم کی ضرورت تھی' اس کے باوجود ملکہ اور اس کے وزراء پہلے پچیس سالہ عہد میں بچت کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ ضروری بھی تھا کیونکہ ملکہ ایک "جنگی بساط" کی متلاشی تھی تاکہ جونہی ۱۵۸۵ء میں فیصلہ ہو' لیسٹر کے زیر کمان نیدر لینڈ فوج روانہ کی جائے۔

۱۵۸۵ء کے بعد زمانے میں اسپین کے ساتھ ہونے والے جھگڑے نے الزبتھ کی حکومت کو مناسب فوجی حکمت عملی اور مزید مالی وسائل کی ضرورت سے دو چار کر دیا۔ اس وقت انگستان کو جس قسم کی فوجی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت تھی' اس کے پیش نظر بحریہ کے افسروں' مثلاً" ہاکنز' ریلے' ڈریک اور دوسروں نے ملکہ پر زور دیا کہ وہ اس نوع کی پالیسی اپنائیں کہ ہسپانیہ کی چاندی کی تجارت میں مداخلت کی جائے' دشمن کے ساحلی علاقوں اور نوآبادیوں پر حملے کیے جائیں' خصوصاً" اس کی بحری طاقت کو تخت و تاراج کر کے جنگ کا آغاز کر دیا جائے۔ یہ نظریہ تو خاصا اثر انگیز تھا مگر اس پر عمل درآمد اتنا آسان نہ تھا۔ کیونکہ نیدر لینڈ اور شمالی فرانس میں جو دستے ہسپانوی فوج سے نبرد آزما تھے' ان کی مدد کے لیے کمک روانہ کرنا بھی از بس ضروری تھا ----- اس حکمت عملی کے اپنانے کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ اسے ڈچ باغیوں کے ساتھ بڑی محبت تھی یا فرانس کے پروٹسٹنٹوں کے ساتھ لگاؤ تھا بلکہ اس کے اپنانے کی بڑی وجہ بقول الزبتھ یہ تھی کہ "جب کبھی فرانس کا آخری دن آئے گا' وہ انگستان کی تباہی کا موقع ہو گا"۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ یورپی توازن برقرار رکھا جائے چاہے اس کے لیے عملی طور پر مداخلت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ یہ "براعظمی عہد و پیمان" کی صورت ہی لیں سہی لیکن سترھویں صدی کے آغاز تک برقرار رہا۔ چنانچہ جب ۱۵۹۴ء میں مہم جو سپاہ پانچ متحدہ صوبہ جات کی فوج میں ضم ہو گئی تو بہت سے انگریزی دستے علیحدہ کھڑے رہے۔

انگریزوں نے فلپ دوم کی زمینی کاروائیوں کا تدارک کر کے اور سمندروں میں اس کی حکومت کو زک پہنچا کر یورپ کی سیاسی کثرت کو برقرار رکھنے میں اپنا رول ادا کر دیا لیکن بیرون ملک تعینات ۸۰۰۰ افراد کی کفالت کا بوجھ خاصا شدید تھا۔ اسی مقصد کے لیے ۱۵۸۶ء میں نیدر لینڈ میں جو رقم بھجوائی گئی وہ ۱۰۰،۰۰۰ لاک پونڈ سے بھی زیادہ تھی۔ اسی طرح ۱۵۸۷ء میں ۱۷۵،۰۰۰ پونڈ روانہ کیے گئے۔ یہ رقم مملکت کے تمام سال کے مجموعی اخراجات کا تقریباً" نصف حصہ تھی۔ جب آرمیڈا کے ذریعے مشہور بحری جنگ ہوئی تو اس موقع پر بیڑے پر خرچ کی گئی رقم ۱۵۰،۰۰۰ پونڈ تھی۔ نتیجتاً" الزبتھ حکومت کے اخراجات ۱۵۸۰ء کی آخری دہائی میں اس عشرے کے ابتدائی دنوں کے مقابلے میں دو اور تین گنا زیادہ ہو گئے۔ اگلی دہائی میں سلطنت نے سالانہ ۳۵۰،۰۰۰ پونڈ خرچ کیے۔ اور آئرلینڈ کی مہم کی وجہ سے ملکہ کے آخری چار سال کے دوران یہ رقم بڑھ کر ۵ لاکھ پونڈ سالانہ ہو گئی۔ حکومت نے شاہی زمینیں اور اجارہ داریاں فروخت کر کے رقم حاصل کرنے کی کوئی کوشش تو نہیں کی' البتہ اسے بار بار دارالعوام (ہاؤس آف کامنز) کا اجلاس طلب کرنا پڑا اور اس

☆ میرے رفیق کار پروفیسر رابرٹ ایسٹن نے مجھے متنبہ کیا ہے کہ اس پورے دور میں انگستان (اور شاید دیگر ملک) کے محاصل اور اخراجات کے گوشوارے کو برائے نام تصور کیا جائے۔ دفتر والوں کی منہا شدہ رقم' رشوت' لوٹ کھسوٹ اور ناقص سیاق نویسی نے فوج اور بحریہ کو ملنے والی رقوم میں بے حد کٹوتی کر دی تھی۔ اسی طرح سلطنت کی آمدنی کا محض ایک حصہ ہی بادشاہ تک پہنچتا تھا۔ لہٰذا یہاں جو گوشوارہ درج کیا گیا ہے وہ علامتی ہے نہ کہ حتمی!

کے سامنے مزید گرانٹ کی درخواست پیش کرنی پڑی۔ چنانچہ حکومت کو یہ امدادی رقم (تقریباً ۲ ملین پونڈ) مل گئی اور اس نے نہ تو اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کیا نہ ہی فوج کی تنخواہیں روکیں۔ یہ دراصل ملکہ اور اس کے مشیروں کی ذہانت اور لیاقت تھی۔ لیکن کئی سال تک جنگ جاری رہنے کی وجہ سے سارا نظام متاثر ہوا تھا۔ پہلے اسٹوارٹ بادشاہ کو ورثے میں قرض کا انبار میسر ہوا۔ نتیجتاً اسے اور اس کے جانشینوں کو ناقابل اعتبار ہاؤس آف کامنز اور لندن کے ساہوکاروں کا دست نگر ہونا پڑا۔

یہاں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کا تجزیہ کیا جائے جنھوں نے ۱۶۰۳ء کے بعد چار عشروں تک انگلستان کی سیاست کو متاثر کیا تھا۔ ۱۶۲۰ء کی دہائی کے دوران انگریزی افواج نے یورپ کی بڑی جنگوں میں کبھی کبھار جو مداخلت کی اور جس پر اخراجات بھی اچھے خاصے آئے، اس کا تیس سالہ جنگ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اس عرصے میں انگلستان کی آبادی، تجارت، سمندر پار نوآبادیات اور دولت میں خاصا اضافہ ہوا، لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز اندرونی اتحاد کے بغیر ملکی طاقت کو مستحکم کرنے کے قابل نہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ "جہازی رقم" جیسے معمولی معمولی ٹیکس ---- جس کے نفاذ سے عسکری قوت میں یقیناً اضافہ ہوتا ---- بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان خانہ جنگی کا سبب بن گیا اور اس طرح ۱۶۳۰ء کے تمام تر عشرے میں انگلستان یورپی سیاست میں کسی کردار کا حامل نہیں رہا۔ جب انگلستان دوبارہ سنبھلا تو ۵۴-۱۶۵۲ء کے دوران ڈچوں کے ساتھ تجارتی نوعیت کی جنگ میں الجھ گیا۔ دونوں متحارب قوتوں کے جو بھی مقاصد رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یورپ کا عمومی توازن قائم رکھنے میں اس جھگڑے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

بہر حال، ۱۶۵۰ء کے عشرے میں کرومویل کی قیادت میں انگلستان نے ایک بڑی طاقت ہونے کا کردار گزشتہ حکومت کی بہ نسبت زیادہ کامیابی سے ادا کیا۔ اس کی نئے ماڈل کی فوج جو خانہ جنگی کے بعد وجود میں آئی تھی، نے کم از کم اس خلا کو پر کر دیا جو روایتی طور پر انگریزی دستے اور اس کی ہم عصر یورپی فوج کے درمیان موجود تھا۔ موریس آف ناساؤ اور گستاوورس اوولفس نے فوج کی تربیت کے لیے جو نئے طریقے وضع کیے تھے، انھیں حاصل کر کے، سالہا سال کے جھگڑوں کی سختی سہہ کر نہایت نظم و ضبط کی حامل اور باقاعدہ تنخواہ پانے والی انگریزی فوج یورپ کے توازن کو کسی حد تک برقرار رکھنے کے قابل بن چکی تھی۔ اس کا اظہار ۱۶۵۸ء میں جنگ ڈیونز کے موقع پر ہو گیا تھا جب برطانوی سپاہ نے ہسپانوی فوج کو شکست دے دی تھی۔ علاوہ ازیں، دولت مشترکہ کی بحریہ اس وقت کے لحاظ سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اسے دارالعوام کے ارکان کی حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ خانہ جنگی کے دوران یہ چارلس اول کی مخالف ہو گئی تھی۔ یہ بحری بیڑا ۱۶۴۰ء کے عشرے میں ترقی سے ہمکنار ہوا تھا اور اس کا سائز ۱۶۴۹ء کے انتالیس چھوٹے جہازوں کی نسبت دو گنا تھا اور یہ ۱۶۵۱ء کے اسی جہازوں سے بھی یہ بڑا تھا۔ اجرت اور نوکری کی شرائط کو بہتر بنایا گیا۔ ڈاکیارڈ اور فوج کی نقل و حرکت کے ضمن میں مناسب اقدامات کیے گئے۔ ان تمام اخراجات کی منظوری دارالعوام سے حاصل ہو جاتی تھی، جسے اس بات کا یقین تھا کہ منافع اور طاقت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ صورت حال بہتر ثابت ہوئی اس لیے کہ ڈچوں سے جو پہلی جنگ ہوئی اس میں انگریزی بحریہ کا

مقابلہ اس خوفناک فوج سے ہوا جس کی قیادت ٹرومپ اور ڈی روئیٹر کر رہے تھے جو بلیک اور مونک ہی کی طرح باصلاحیت اور تجربہ کار تھے۔ جب ۱۶۵۵ء کے بعد ان کا ہسپانوی سلطنت سے ٹکراؤ ہوا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ان کی بحری فوج کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اکاڈیا اور جمائیکا پر قبضہ ہوا، ۱۶۵۶ء میں اسپین کے خزانے سے لدے پھندے جہاز کا ایک حصہ لوٹ لیا گیا، کیڈز کی ناکہ بندی کر دی گئی اور ۱۶۵۷ء میں سانتا کروز کے مقام پر "فلوٹا" کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

انگلستان کے ان اقدامات سے توازن بحال ہوا اور اس نے ۱۶۵۹ء میں اسپین پر دباؤ ڈال کر فرانس کے ساتھ جنگ بندی کرا دی، لیکن ساتھ ساتھ انھیں اندرون ملک بحران کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ۱۶۵۵ء کے بعد سے ہی اسپین کے ساتھ ہونے والی منافع بخش تجارت ڈچوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ دشمن کے نجی اداروں نے بحراوقیانوس اور بحیرہ روم کے راستوں پر انگلستان کے تجارتی جہازوں سے خوب نفع کمایا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ستر ہزار نفری پر مشتمل فوج رکھنے اور بہت بڑی بحریہ کے انتظام و انصرام پر اچھی خاصی رقم خرچ ہو رہی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۶۵۷ء میں حکومت کے مجموعی اخراجات مبلغ ۲،۸۷۸،۰۰۰ پونڈ میں سے ۱،۹۰۰،۰۰۰ پونڈ کی رقم بری فوج پر خرچ ہوئی اور ۷۴۲،۰۰۰ پونڈ بحریہ پر صرف ہوئے۔ مختلف قسم کے ٹیکس عائد کر کے خسارے کو کم کیا گیا۔ تاہم یہ اقدامات ایک ایسی حکومت کے لیے بالکل ناکافی تھے جو اس وصول ہونے والی رقم سے چار گنا زیادہ خرچ کر رہی تھی۔ یہ رقم انقلاب انگلستان سے قبل چارلس اول کے عہد تک خرچ کی جاتی رہی اور جسے اس وقت بھی ناقابل برداشت سمجھا جاتا تھا۔ قرض آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سپاہیوں اور ملاحوں کی تنخواہیں بھی ادا نہ ہو سکیں۔ ہسپانیہ کے ساتھ ہونے والی ان طویل جنگوں سے عوام میں کرومویل کی حکومت کے خلاف ناراضگی پھیل گئی اور تاجر طبقہ امن و امان کی دہائی مانگنے لگا۔ تاہم ایسا بھی نہیں کہ انگلستان اس جھگڑے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ البتہ یہ اس صورت میں ہو سکتا تھا جب وہ بھی اسپین کی طرح بڑی طاقتوں کی معرکہ آرائیوں میں ایک طویل مدت تک الجھا رہتا۔ اندرون ملک اور سمندر پار ملکوں میں انگلستان کی تجارت فروغ پا رہی تھی۔ نو آبادیوں اور جہاز رانی سے اسے جو آمدنی حاصل ہو رہی تھی، اس کے باعث اس کی اقتصادی بنیاد اس درجہ مستحکم ہو چکی تھی کہ لندن کی حکومت آئندہ کسی بھی جنگ کی متحمل ہو سکتی تھی۔ چونکہ انگلستان نے نیدرلینڈ کے پانچوں صوبوں کے ساتھ مل کر بازار معیشت کو بڑی حد تک فروغ دیا تھا، لہٰذا آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ معیار زندگی بھی بہتر ہو رہا تھا۔ تاہم یہ اہم بات بھی مشاہدہ میں آئی کہ ان دنوں حکومت کی دفاعی کوشش اور قومی دولت کی حوصلہ افزائی میں کس قدر توازن برقرار تھا۔ لیکن اولیور کرامویل کے آخری عہد میں یہ توازن خطرناک حد تک بگڑ چکا تھا۔

اگر انگلستان کی ترقی کا مقابلہ سویڈن جیسی طاقت سے کیا جائے تو نظام حکومت چلانے کا گمبھیر معاملہ بخوبی واضح ہو جائے گا۔ سولھویں صدی کے تمام عرصے میں اس شمالی سلطنت پر ایک طرح سے غربت کا سایہ

رہا۔ درمیان میں ڈنمارک کے حائل ہونے کی وجہ سے مغربی یورپ تک اس کی رسائی ناممکن رہی۔ مشرق میں روس کے ساتھ بھی اس کے تعلقات بار ہا کشیدہ رہے ہیں۔ گویا سویڈن کو اپنی بقا کے لئے خاصی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ ۱۳-۱۶۱۱ء کے دوران ڈنمارک کے ساتھ ہونے والی جنگ میں اس کی شکست فاش نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس ملک کے توسیع پسندی کے عزائم تو پورے نہیں ہوں گے' البتہ یہ زوال سے ضرور دو چار ہو گا۔ مزید بر آں' یہ ملک اندرونی خلفشار سے بھی ہمکنار ہوا جو مذہبی نوعیت کا نہ تھا بلکہ سراسر قانونی تھا۔ اس کے نتیجے میں امراء کو بے شمار مراعات حاصل ہو گئیں۔ سویڈن کی سب سے بڑی کمزوری اس کا اقتصادی نظام تھا۔ اس کا زیادہ تر علاقہ منجمد اور برفانی ہونے کی وجہ سے بے آب و گیاہ تھا یا پھر جنگلات سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں کی زراعت منتشر مگر خود کفیل تھی یہاں کی ۹ لاکھ کی آبادی اطالوی ملکوں کی نسبت بہت کم تھی البتہ فن لینڈ یہاں کے ۹۵ فی صد باشندے زراعت پیشہ تھے۔ شہر بہت کم تھے اور کارخانے بھی خال خال تھے۔ وہاں متوسط طبقے کا تو نام و نشان نہ تھا۔ وہاں بدل بیوپار کا اب تک چلن تھا۔ بہرحال ۱۶۱۱ء میں جب نوجوان گستاورس اوڈلفس نے تاج و تخت پر قبضہ کیا' اس وقت سویڈن فوجی طاقت اور اقتصادی حالت کے لحاظ سے نہایت بودا ملک تھا۔

ایسے نا مساعد حالات میں اندرونی اور بیرونی دو عناصر نے سویڈن کی روز افزوں ترقی میں مدد دی۔ ان میں ایک غیر ملکی کار انداز تھے جو خصوصاً" ڈچ تھے جبکہ بعض جرمنی اور والونی بھی تھے۔ ان کی نظر میں سویڈن ایک ایسا غیر ترقی یافتہ ملک تھا جس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ کیونکہ یہ ٹمبر' لوہا اور تانبے جیسے قدرتی وسائل سے مالا مال تھا۔ ان کار اندازوں میں سب سے مشہور لوئس ڈی گیر تھا۔ وہ سویڈن والوں کے ہاتھ مصنوعات فروخت کیا کرتا اور ان سے خام دھاتیں خریدتا۔ اس نے وہاں ٹمبر کے کارخانے لگائے' فاؤنڈریاں قائم کیں' فیکٹریاں بنائیں' بادشاہ کو قرضے دیے اور سویڈن کو تجارت کے عالمی نظام سے روشناش کرایا۔ اس تمام تجارتی حرکت و عمل کا مرکز ایمسٹرڈم تھا۔ یہ ملک جلد ہی یورپ میں لوہے اور تانبے کا سب سے بڑا پیدا کرنے والا ملک بن گیا۔ ان بر آمدات کے نتیجے میں بیرونی کرنسی حاصل ہوئی جس سے فوج کے اخراجات پورے کرنے ممکن ہو گئے۔ مزید بر آں' سویڈن اسلحے کے معاملے میں بھی خود کفیل ہو گیا۔ یہ آمدن کا ایک عمدہ ذریعہ ثابت ہوا۔ یہ سب کچھ بیرونی سرمایہ کاری اور کار اندازی کا مرہون منت تھا۔

اندرون ملک ہونے والی سب سے اہم بات یہ تھی کہ گستاورس اڈولفس اور اس کے ساتھیوں نے اصلاحات کا مشہور زمانہ سلسلہ شروع کیا۔ اس دور میں عدالتیں' خزانے' ٹیکس کا نظام' چانسلری کی مرکزی انتظامیہ' تعلیم ۔۔۔۔۔ ان تمام شعبوں میں موثر پیش رفت ہوئی۔ طبقہ امراء کو دھڑے بازی سے نکال کر سرکاری خدمت گزاری میں لگا دیا گیا۔ مذہبی یکجہتی کی فضا قائم کی گئی۔ علاقائی اور مرکزی حکومت کام کرتی تھی۔ ان مستحکم بنیادوں پر ہی گستاورس اس قابل ہو سکا کہ ایک سویڈش بحریہ تیار کر سکے جو ڈنمارک اور پولینڈ جیسے دشمنوں سے اس کے ساحلوں کی حفاظت کرے اور سویڈن کی فوج کے بحر بالٹک کے پار اترنے کے مراحل کو یقینی بنائے۔ تاہم بادشاہ کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ اس کی فوجی اصلاحات تھیں۔ نیز باقاعدہ فوج کا قیام میدان جنگ کی نئی تکنیک میں فوجیوں کی تربیت سازی' گھڑ سواروں کی اصلاح اور ترقی' ہلکی پھلکی

اور نقل پذیر توپوں کی تیاری اور افواج میں اولوالعزمی کا فروغ ۔۔۔۔۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے گستاورس کی فوج دنیا کی نہایت اعلیٰ فوج شمار ہونے لگی۔ اور اسی تربیت یافتہ فوج کی کمان کرتا ہوا سویڈن کا یہ بادشاہ ۱۶۳۰ء کے موسم گرما میں پروسسوں کی حمایت کے لیے شمالی جرمنی کے جانب کوچ کر گیا۔

یہ اقدامات نہایت ضروری تھے' کیونکہ اس وقت یورپی معرکوں کا دائرہ خاصا وسیع ہو چکا تھا اور جنگی اخراجات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ یہ تمام تجربے سویڈن کے اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ مقامی نوعیت کی جھڑپوں میں کبھی سامنے نہیں آئے تھے۔ چنانچہ ۱۶۳۰ء کے اختتام تک ۴۲ ہزار فوجی گستاورس کے زیر کمان تھے۔ پھر بارہ مہینے بعد ان کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ اور لوزن کی فیصلہ کن جنگ سے پہلے پہلے اس کی فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہو چکی تھی۔ اگرچہ سویڈن کی افواج نے تمام اہم جنگوں میں اپنی برتری ثابت کی تھی اور پر خطر محاذوں پر مضبوط مورچہ بندی کرتے رہے تھے۔ تاہم ان کی مجموعی تعداد ایسی نہ تھی کہ باقاعدہ ایک لشکر کا درجہ حاصل کرتے۔ حقیقت یہ تھی کہ سویڈن کی اس ڈیڑھ لاکھ فوج میں زیادہ تر کرائے کے سپاہی تھے جن کا تعلق اسکاٹ لینڈ' انگلستان اور جرمنی سے تھا۔ ان پر حد سے زیادہ اخراجات ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ ۱۶۲۰ء کے عشرے میں پولینڈ کے ساتھ ہونے والی جنگ میں سویڈن کے عوام کو مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا لیکن جرمنی کے ساتھ ہونے والی جنگ بہت زیادہ مہنگی پڑی۔ تاہم' سویڈن کی حکومت نے نہایت ہوشمندی سے دوسروں کو اخراجات برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ فرانس سے جو خاص اعانت حاصل ہو رہی تھی' اس سے محض اشک شوئی ہوئی تھی۔ ویسے ادائیگی کا اصل ذریعہ خود جرمنی تھا' یعنی بہت سے جاگیرداروں اور آزاد شہروں کا کہا گیا کہ اگر وہ دوست رہنا پسند کرتے ہیں تو اس مد میں اعانت کریں' بصورت دیگر لوٹ مار سے بچنے کے لیے انھیں ہرجانے کی رقم ادا کرنی ہو گی۔ علاوہ ازیں سویڈن کے زیر کمان یہ کثیر فوج جس علاقے میں بھی خیمہ زن ہوتی وہاں کے لوگوں سے اپنا دانہ پانی اور گھوڑوں کے لیے چارہ حاصل کر لیتی۔ یہ بات مصدقہ طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شہنشاہ کے لیفٹیننٹ ولسٹن نے اس استحصالی طریقے کو پہلے ہی رائج کر دیا تھا اور اپنی ایک لاکھ سے زائد فوج کے لیے جبری رقم حاصل کی تھی۔ لیکن یہاں یہ نقطہ ملحوظ رہے کہ ۱۶۳۰ء سے ۱۶۴۰ء تک کے عرصے میں جس عظیم فوج نے ہیبسبرگ حکومت کے خلاف مورچہ بندی کی' اس کی اعانت میں سویڈن کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ جس مہینے میں ویسٹ فالیا کی صلح ہوئی' انہی دنوں سویڈن کی فوج بوہیمیا میں غارت گری اور لوٹ مار کر رہی تھی۔ اور وہاں سے اسی وقت واپس ہوئی جب ہرجانے کی کثیر رقم حاصل کر لی۔

اگرچہ یہ سب سویڈن کے عظیم کارنامے تھے' لیکن ان سے یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یورپ میں اس کا کوئی مقام نہ تھا۔ اس کی خوفناک جنگی مشین تمام تر طفیلی تھی۔ سویڈن کی فوج اپنی بقا کے لیے جرمنی کو لوٹتی رہی ورنہ بصورت دیگر اس میں بغاوت پھیل جاتی۔ اہل سویڈن کو اپنی بحریہ' اپنے ملکی دفاع اور دیگر علاقوں میں تعینات فوجوں کے سارے اخراجات خود ہی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ گویا دوسری ریاستوں کی طرح یہاں بھی حکومت کو مالی بحران کا سامنا تھا اور اس کے نتیجے میں شاہی زمینیں اور محاصل امراء کے ہاتھوں فروخت کرنے پڑے۔ اس طرح طویل المیعاد آمدنی گھٹ کر رہ گئی۔ عوام پر تیس سالہ جنگ کے گہرے

اثرات مرتب ہوئے اور کسانوں کو حد سے زیادہ محاصل ادا کرنے پڑے۔ علاوہ ازیں' سویڈن کو فوجی کامیابیوں کے نتیجے میں اسٹونیا' لیووین' بریمن اور پومیرانیا کے زیادہ تر حصے پر تسلط حاصل ہو گیا۔ اس سے تجارتی اور مالی فوائد تو حاصل ہوئے لیکن زمانہ امن میں ان کے نظم و نسق اور زمانہ جنگ میں ان کے تحفظ پر خاصی رقم صرف ہوئی جو ۱۶۳۰ء اور ۱۶۴۰ء کے عشروں میں جرمنی کے خلاف مہم میں صرف ہونے والی رقم سے بہت زیادہ تھی۔

۱۶۴۸ء کے بعد سویڈن بھی اگرچہ ایک اہم طاقت کے طور پر نمایاں رہا' لیکن اس کی حیثیت تمام تر علاقائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چارلس دہم (۶۰-۱۶۵۴ء) اور چارلس یازدہم (۹۷-۱۶۶۰ء) کے دور حکومت میں یہ ملک بالٹک خطے میں نہایت عروج پر تھا۔ اس نے نہ صرف ڈنمارک والوں کو قابو میں رکھا بلکہ پولینڈ' روس اور ابھرتے ہوئے پروشیا کے خلاف تنہا نبرد آزما بھی رہا۔ چارلس یازدہم کے دور حکومت میں جب مطلق العنانی کا دور دورہ تھا' شاہی خزانے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا جس سے زمانہ امن میں فوجوں کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ چنانچہ زوال پذیر سویڈن کو ان باتوں سے استحکام حاصل ہوا۔ پروفیسر رابرٹ کے بقول:۔

> "سویڈن ایک زمانے تک فتوحات کے نشے سے سرشار رہا اور مال غنیمت اس کے قدموں میں جمع ہوتا رہا۔ چارلس یازدہم نے اس از سر نو زندگی عطا کی اور اس نے ملکی وسائل اور عوام کی دلچسپیوں کے مطابق پالیسیاں وضع کیں اور ان پر عمل درآمد بھی کرایا۔ اس نے اپنے ملک کو درجہ دوم کی ایک طاقت کے طور پر کھڑا کر دیا"۔

ملکی سطح پر یہ کوئی معمولی کارنامے نہ تھے' لیکن یورپ کے وسیع تناظر میں ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ خطہ بالٹک میں طاقت کا توازن جس پر سویڈن' ڈنمارک' پولینڈ اور برینڈنبرگ کا انحصار تھا ـــــ سترھویں صدی کے نصف آخر میں فران' ڈچ اور انگلستان کے دائرہ اثر میں آ گیا۔ ان ملکوں نے اپنے مفاد کی خاطر اس کا استحصال کیا' اور ۱۶۴۴ء اور ۱۶۵۹ء میں ڈچوں کے بحری بیڑے کے ذریعے سفارتی مداخلت بھی کی۔ نیز اس سفارتی کھیل میں سویڈن کسی طرح بھی کٹھ پتلی حکومت کا رول ادا نہیں کر رہا تھا' لیکن مغربی یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایک اقتصادی بونے کی سی تھی۔ چنانچہ وہ ان سے حاصل کی ہوئی مراعات کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے تھے۔ ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ اس کی بیرونی تجارت پانچوں متحدہ صوبہ جات یا انگلستان کے مقابلے میں بہت کمتر درجے کی تھی۔ اس کے سرکاری اخراجات فرانس کے کل اخراجات کا پانچواں حصہ تھے۔ اس ناکافی سازو سامان اور سمندر پار نو آبادیات تک رسائی نہ ہونے کے سبب سویڈن اپنی تمام تر سماجی اور انتظامی خوبیوں کے باوجود اپنی وہ پوزیشن بحال کرنے میں ناکام ہو چکا تھا جو اسے مختصر مدت کے لیے گستاورس اڈولفس کے دور میں حاصل ہوئی تھی۔ آنے والے عشروں میں وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر جنوب میں پروشیا اور شمال میں روس کی پیش قدمی کو روکنے ہی میں معروف رہا۔

اس زمانے میں سویڈن کے برعکس ڈچوں (ہالینڈ) کی حالت زیادہ بہتر تھی۔ یہ قوم انقلاب کے سائے میں پلی تھی۔ سات بجوبہ صوبوں میں منقسم یہ ملک ہیسبرگ کے زیر تسلط نیدر لینڈ سے ناہموار سرحدوں کی وجہ سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ ایک وسیع اور موروثی سلطنت کا محض چھوٹا سا حصہ تھا۔ اس کی آبادی بھی مختصر اور علاقے بھی محدود تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ ملک اندرون اور بیرون یورپ نہایت تیزی سے ایک عظیم طاقت بن کر ابھرا تھا۔ اسے یہ حیثیت پوری ایک صدی تک حاصل رہی۔ یہ ملک اپنے پیشوا وینس کے سوا باقی تمام ریاستوں سے اس معنی میں مختلف تھا کہ یہاں جمہوری حکومت قائم تھی۔ لیکن اس ملک کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ اسے تجارتی' صنعتی اور مالیاتی طور پر استحکام حاصل تھا۔ یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اپنے دفاع کے لیے اس کے پاس اعلیٰ درجے کی فوج تھی۔ سترھویں صدی کے اختتام تک اسے بحریہ میں بھی موثر پوزیشن حاصل رہی تھی۔ یہ فوجی طاقت ہی دراصل ہالینڈ کے استحکام اور اثر و رسوخ کا منبع تھا۔

ایسی قطعاً کوئی بات نہ تھی کہ اپنی بغاوت کے ابتدائی دنوں میں ستر ہزار ولندیزی باقی یورپ کے معاملات میں دخل انداز ہو رہے تھے۔ وہ تو مدتوں خود کو ایک الگ تھلگ اور سب سے جدا قوم تصور کرتے تھے۔ ان کی سرحدوں کا تعین بھی سترھویں، صدی کے آغاز ہی میں ہوا تھا۔ نیدر لینڈ کی نام نہاد بغاوت ابتدائی دنوں میں خال خال تھی۔ اس دوران مختلف سماجی گروپ اور علاقائی لوگ ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ وہ اپنے ہیسبرگ حکمران کی کبھی مخالفت کرتے اور کبھی اس سے سمجھوتہ کر لیتے۔ پھر ۱۵۸۰ء کے عشرے میں بارہا ایسا ہوا کہ ڈیوک آف پارما نے اسپین کے علاقے حاصل کرنے کے جو منصوبے بنائے ان میں کامیابی کے کچھ آثار بھی نظر آئے۔ پھر یہ ہوا کہ انگلستان اور دیگر پروٹسٹنٹ ممالک سے مراعات اور فوجی امداد حاصل ہوئی۔ انگریزی بندوقیں بھی بڑی تعداد میں درآمد ہوئیں۔ نیز' ہسپانوی افواج فرانس میں مختلف سمت پھیل گئیں۔ اس طرح بغاوت کا خاتمہ یقینی ہو گیا۔ لیکن نیدر لینڈ کی بندرگاہوں اور شپ یارڈز پر باغیوں کا ہنوز قبضہ ہو گیا تھا اور اسپین کو سمندروں پر اپنا کنٹرول قائم کرنے میں دشواری کا سامنا تھا۔ ایسی صورت حال میں پارما نے آہستہ آہستہ محاصرہ کر کے باغیوں کے حوصلے پست کر دیے۔

۱۵۹۰ء کے عشرے میں پانچوں متحدہ صوبہ جات قائم و دائم رہے۔ مشرق کے جو علاقے ہاتھ سے نکل گئے تھے انھیں دوبارہ حاصل کیا گیا۔ اس وقت ان کی فوج نہایت تربیت یافتہ تھی۔ ان کا سپہ سالار مورس آف ناساؤ تھا۔ اس نے جو فنون جنگ اختیار کیے اور بحری راستوں پر حملے کی جو صورت اختیار کی ان سب باتوں نے ناساؤ کو اپنے وقت کا عظیم جرنیل ثابت کر دیا۔ اس فوج کو محض ولندیزی کہنا غلط ہو گا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ۱۶۰۰ء میں یہ تینتالیس انگریزی' بتیس فرانسیسی' بیس اسکاٹ لینڈی' گیارہ والونی اور نو جرمن دستوں پر مشتمل تھی۔ جبکہ اس میں صرف سترہ ولندیزی دستے شامل تھے۔ سپاہیوں کے مختلف النسل ہونے کے باوجود مورس نے اپنی فوج کو نہایت اعلیٰ خطوط پر منظم کیا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ ولندیزی حکومت کے مالی تعاون سے ہی ممکن ہو سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کے دیگر ملکوں کے برعکس ولندیزی فوج کو باقاعدہ تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔ اسی طرح وہاں بحریہ کے عملے کو بھی تنخواہ ملا کرتی تھی۔

ولندیزی جمہوریت' دولت کی فراوانی اور مالی استحکام کے متعلق مبالغہ آرائی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ رائے قائم کرنا بھی مناسب نہیں کہ اس نے طویل جنگ کے اخراجات باآسانی برداشت کر لیے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ متحدہ صوبوں کے شرقی اور جنوبی حصوں میں لڑائی کی وجہ سے خاصا نقصان ہوا تھا اور اس تجارت کو بھی دھچکا لگنے کے ساتھ ساتھ اس کی آبادی کی شرح میں بھی کمی واقع ہوئی۔ ہالینڈ جیسے خوشحال ملک کے لیے بھی ٹیکس کا بوجھ ناقابل برداشت بن گیا تھا۔ ۱۵۷۹ء میں یہ رقم بڑھ کر ۵ء۵ ملین ہو گئی۔ سترھویں صدی کے اوائل میں اسپین کے ساتھ ہونے والی جنگ کے سالانہ اخراجات ۱۰ ملین فلورن تھے۔ لوگ اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ مالی دباؤ کے باوجود یہ جنگ اتنے طویل عرصے تک کس طرح لڑی گئی۔ یہ دراصل ہالینڈ کی خوش قسمتی تھی کہ اسپین کی اقتصادی حالت بہتر نہ تھی جو فلینڈرز کی باغی افواج کی تنخواہیں ادا کرنے کی وجہ سے اور بھی ابتر ہو گئی جس کے باعث آخر کار اسے ۱۶۰۹ء میں صلح کرنی پڑی۔

اگر اس جنگ کی زد میں ولندیزی وسائل آ جاتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ حقیقت تھی کہ ۱۵۹۰ء کی دہائی کے بعد کے دنوں میں ہالینڈ کی اقتصادی حالت بہت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ اور جب کہ دیگر ملکوں میں دستور تھا' قرض لینے کے لیے یہاں کی حکومت کو ٹھوس بنیاد میسر تھی۔ اس خوشحالی کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ ہیبسبرگ حکومت کے خاتمے کے بعد بڑھتی ہوئی آبادی نے نہایت شد و مد سے کاراندازی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہاں کی آبادی قدرتی طور پر تو بڑھ ہی رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ جنوبی علاقے اور یورپ کے مختلف مقامات سے لاکھوں کی تعداد میں مہاجر آ گئے۔ یہ سب کاریگر' استاد' صناع اور دولت مند تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس ملک کو بہت فائدے پہنچائے۔ ۱۵۷۶ء میں ہسپانوی افواج نے اینٹورپ کو نکال باہر کر دیا۔ اس سے ایمسٹرڈم کو بین الاقوامی تجارت میں شمولیت کا سنہرا موقع مل گیا۔ نیز' یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہالینڈ نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ہیرنگ مچھلی کی تجارت میں یہ ملک سر فہرست تھا۔ علاوہ ازیں پشتوں کی مدد سے سمندر کو پیچھے دھکیل دھکیل کر اس نے بہت سی زمینیں زراعت کے قابل بنائی تھیں۔ جس کے باعث اسے دولت کے مزید وسائل میسر ہو گئے۔ ان کے تجارتی جہازوں نے ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ یورپ کا زیادہ تر تجارتی سامان کی نقل و حمل کا فریضہ ادا کیا۔ ان میں لکڑی' غلہ' کپڑا' نمک' ہیرنگ مچھلی جیسی اشیاء تھیں جنھیں ولندیزی بحری جہاز پانی کے راستے ہر جگہ پہنچایا کرتے تھے۔ اپنے برطانوی اتحادیوں اور ہالینڈ کے کالونی مشرب کے معتقدوں کی ناراضگی کے باوجود ایمسٹرڈم کے تاجر اپنے ازلی دشمن اسپین تک کو سامان پہنچانے کے لیے راضی ہو جاتے تھے اور منافع کی خاطر وہ خطرات کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اندرون ملک خام مال نہایت وافر مقدار میں درآمد کی جاتی تھیں اور ایمسٹرڈم' ڈیلفٹ' لیڈن جیسے شہروں میں اس سے مصنوعات تیار کی جاتی تھیں۔ لیکن یہ بات بھی نہایت حیرت انگیز ہے کہ شکر سازی' دھات سازی' کشیدہ کاری' شراب سازی' تمباکو کی صنعت' ریشم کی صنعت' برتن سازی' شیشے کا سامان بنانے کی صنعت' اسلحہ سازی' طباعت' کاغذ سازی جیسی اہم صنعتوں کے باوجود ۱۶۲۲ء میں ہالینڈ کی ۶۷۰،۰۰۰ آبادی کا ۶۵ فی صد حصہ درمیانے درجے کے شہروں میں رہتا تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت دنیا کا ہر خطہ اس ملک کے مقابلے میں اقتصادی طور پر پسماندہ تھا۔

ہالینڈ کے مزید دو اقتصادی پہلوؤں نے اس کی فوجی طاقت کو مستحکم کیا تھا۔ اول' سمندر پار توسیع

پسندی تھی۔ یورپی سمندروں میں اس کی وسیع تجارت اس جمہوری ملک کے لیے بہت سود مند ثابت ہوئی۔ ۱۵۹۸ء اور ۱۶۰۵ء کے دوران ہالینڈ کے اوسطاً" ۲۵ بحری جہاز مغربی افریقہ' ۲۰ برازیل' ۱۰ شرق اوسط اور ۱۵۰ کیریبین کے علاقے میں ہر سال جایا کرتے تھے۔ ہالینڈ نے ۱۶۰۵ء میں اموائنا میں اور ۱۶۰۷ء میں ٹرنیٹ میں اپنی اعلیٰ درجے کی نو آبادیاں قائم کر لی تھیں۔ بحر ہند کے ارد گرد دریائے آمیزن کے دہانے پر اور (۱۶۰۹ء میں) جاپان میں فیکٹریاں اور تجارتی مراکز قائم کیے گئے۔ اس کے باعث اقتصادیات کا توازن آہستہ آہستہ بحیرہ روم سے بحر اوقیانوس کی جانب تبدیل ہو رہا تھا اور ۱۵۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک کے دوران یہ سیکولر رجحانات کا ہی حصہ تھا۔ چنانچہ انگلستان کی طرح متحدہ صوبہ جات نے بھی اس تبدیلی سے استفادہ کیا۔ ابتداء میں تو اس سے پرتگال اور اسپین کے فائدے حاصل ہوتے رہے تھے لیکن بعد میں دیگر ملکوں کو بھی عالمی تجارت سے بہتر طور پر مستفیض ہونے کی تحریک پیدا ہوئی۔

دوسرا پہلو یہ تھا کہ ایمسٹرڈم بین الاقوامی مالیاتی نظام میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ اس طرح ہالینڈ یورپ میں جہاز سازی' تبادلہ زر اور اشیاء فروش کرنے والے کے طور پر جو خدمات انجام دے رہا تھا' اس کے نتیجے میں اسے یہ مالی فوائد حاصل ہو رہے تھے۔ اس ملک کے مہاجن اور مالیاتی ادارے جو خدمات انجام دے رہے تھے (مثلاً" جمع کی ہوئی رقم پر سود کی ادائیگی' رقم کا تبادلہ' ہنڈی کی وصولی اور ادائیگی' قرضے میں رقم کی پیشکش)' وہ وینس اور جینوا میں پہلے سے رائج طریقوں سے بالکل مختلف نہ تھیں۔ متحدہ صوبوں کو تجارت کے ذریعے جو رقم حاصل ہوتی تھی وہ کثیر تھی اور اس کا استعمال پورے اعتماد کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رقم لگانے والے حکومت ہی کے کرتا دھرتا تھے اور وہ چاہتے تھے کہ رقم محفوظ رہے' کریڈٹ پر اعتماد ہو اور قرض کی بروقت ادائیگی ہوتی رہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو قرض کی رقم باآسانی مل جاتی تھی۔ اس طرح ولندیزی جمہوریہ کو اپنے مخالفین پر زبردست فوقیت حاصل تھی۔ چونکہ اس حکومت کی مقرر کردہ کریڈٹ کی شرح قابل اعتماد تھی جس کی تمام تر وجہ رقم کی بروقت واپسی تھی' لہٰذا اسے دیگر حکومتوں کے برعکس کم سود پر قرض مل جایا کرتا تھا ـــــ یہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کا مفاد تھا جو صرف سترھویں صدی ہی نہیں بلکہ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے اپنی مثال آپ تھا۔

جب ہالینڈ کی ۱۶۲۱ء میں اسپین کے ساتھ دوبارہ جھڑپیں شروع ہوئیں تو قرض لینے کی یہ سہولت خاصی اہمیت اختیار کر گئی۔ کیونکہ اس وقت (۱۶۴۰ء) جنگ کے اخراجات ۱۳ء۴ ملین فلورین (۱۶۲۲ء) سے بڑھ کر ۱۸ء۸ ملین فلورین ہو چکے تھے۔ ولندیزی عوام کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی خصوصاً" ایسے وقت میں جب سمندر پار کی تجارت جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ لہٰذا سیاسی لحاظ سے یہ آسان تھا کہ جہاں تک ممکن ہو عوام کے قرض سے جنگ کے اخراجات پورے کیے جائیں۔ اگرچہ سرکاری قرض بہت بڑھ گیا تھا ـــــ مثلاً" پروونس آف ہالینڈ کا قرض ۱۶۵۱ء میں ۱۵۳ ملین فلورین تھا ـــــ ملک کی اقتصادی حالت بہتر تھی۔ لہٰذا کریڈٹ کا نظام کبھی بھی معرض خطر میں نہیں رہا۔ ان حقائق سے جہاں یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فوجی اخراجات پر امیر ترین ممالک کو بھی جھرجھری سی آ جاتی ہے وہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اور ملکوں کو تو جنگ کے اخراجات تنہا برداشت کرنے پڑے' لیکن ولندیزی حکومت نے دوسروں کو بھی اس میں شریک کر لیا۔

جنگ، دولت اور قومی ریاست

آیئے، اب ہم اس باب کے اہم نتائج کی تلخیص خلاصہ پیش کریں۔ ۱۳۵۰ء کے بعد جنگ کا سلسلہ "ایک قومی ریاست" کے عالم وجود میں آنے سے جا ملتا ہے۔ پندرھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کے آخری برسوں کے دوران بہت سے یورپی ممالک میں سیاسی اور فوجی لحاظ سے ایک مرکزیت قائم تھی۔ یہ عموماً" بادشاہ کے زیر سایہ ہوا کرتی تھی۔ (بعض جگہ یہ کسی مقامی جاگیردار یا تجارتی چند سری حکومت کے تحت بھی قائم تھی۔) اسے بہت زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ ان ممالک میں سرکاری ٹیکس عائد کرنے کا طریقہ بھی یہی وضع کرتی تھی۔ اسے نوکر شاہی برقرار رکھتی تھی جبکہ بادشاہ کے اپنے اختیارات الگ ہوتے تھے۔ قومی افواج بحال کرنا جاگیرداروں کا کام تھا۔

یورپ کی قومی ریاست کی تشکیل کی متعدد وجوہات تھیں۔ اقتصادی تبدیلی نے پرانے جاگیردارانہ نظام کی وقعت کم کر دی تھی۔ مختلف سماجی انجمنیں/ادارے تعلقات باہمی اور احسان مندی کے نئے طریقوں سے ایک دوسرے سے قریب آ رہے تھے۔ اس نظریے نے کہ حکمران کے مذہب کو دوسروں کے مذہب پر فوقیت حاصل ہے، افسر شاہی اور مذہبی رہنماؤں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ اس طرح سیکولرازم کو قومی بنیاد پر فروغ دیا گیا تھا۔ اس دور میں لاطینی زبان زوال پذیر ہو چکی تھی۔ تمام سیاست دان، قانون دان، سرکاری افسران اور شعراء دیسی زبان انگریزی استعمال کرنے لگے تھے۔ اس طرح سیکولرازم کا رجحان جڑ پکڑنے لگا۔ ابلاغ کے بہتر ذرائع مال کا وسیع پیمانے پر تبادلہ چھاپے کی ایجاد اور سمندری دریافت سے انسان نہ صرف دوسرے لوگوں سے واقف ہونے لگا بلکہ مختلف زبانوں، مزاج تہذیبی اقدار اور مذہب کے فرق سے بھی روشناس ہوا۔ اندریں حالات، یہ تعجب خیز امر نہ تھا کہ اس وقت کے بہت سے دانشوروں اور مصنفوں نے قومی ریاست کو حق بجانب سمجھا اور معاشرے کے لیے بہتر قرار دیا ---- یعنی اس کے اختیارات کو وسعت دی جائے، اس کے مفادات کا تحفظ کیا جائے اور حاکم و محکوم باہم مل کر عوام اور ملک کی بھلائی کا کام سر انجام دیں، چاہے حکومت کا طریقہ کار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔

اس جنگ کے نتائج نے ہی فلسفیانہ خیالات کی نسبت کہیں زیادہ قومیت کی تشکیل پر زور دیا اور معاشرے کے رجحان کو اس جانب مبذول کیا۔ فوجی اقتدار نے بہت سے یورپی خاندانوں کو اپنی اپنی زمینیں بحال رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ (اکثر و بیشتر امراء کو مراعات دے کر ہی ایسا ہوتا تھا۔) فوجی اور جغرافیائی اسباب و عوامل نے نئی نئی قومی ریاستوں کو حد بندی میں خاصی مدد دی جبکہ مسلسل جنگ و جدال نے قومی شعور کو اجاگر کیا ----- مگر اہل انگلستان اسپین والوں سے منفی انداز میں نفرت کرنے لگے اسی طرح سویڈن کے لوگ ڈنمارک کے عوام سے کدورت رکھنے لگے۔ یہاں تک کہ ولندیزی باغی اپنے سابق حکمران ہیبسبرگ سے متنفر ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنگ اور اس کی نئی تکنیک کی وجہ سے پیدل فوج میں اضافہ ہوا اور خاصی رقم خرچ کر کے قلعے اور بحری بیڑے تیار کیے گئے۔ ان باتوں نے متحارب قوتوں کو مجبور کیا کہ وہ بھی دفاعی ضروریات پر پہلے سے کہیں زیادہ رقم خرچ کریں اور اس کے حصول کے لیے ٹیکس عائد کریں۔ یہ سب حقائق یعنی حکومت کے اخراجات بڑھ چکے تھے، محاصل وصول کرنے کے لیے نئے طریقے وضع کیے جا رہے تھے اور بادشاہ اور ریاست کے تعلقات میں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی محض خیالی تصور کیے

جائیں گے تاوقتیکہ فوجی محاذ آرائی کا ذکر نہ کیا جائے۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ کے آخری برسوں میں یا اسپین کے فلپ دوم کے عہد میں سرکاری اخراجات کا تین چوتھائی حصہ یا تو جنگ میں صرف ہوتا تھا یا پچھلی جنگوں کے موقع پر لیے ہوئے قرض کی ادائیگی میں چلا جاتا تھا، بری اور بحری فوج کی کاروائیاں نئی قومی ریاستوں کی ملت ثانی ہمیشہ نہیں رہی ہیں، پھر بھی یہ سب ان کے نہایت مہنگے اور موثر اقدامات تھے۔

تاہم یہ رائے قائم کرنا غلط ہو گا کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں اضافہ شدہ ٹیکس، امدادی افواج، مسلح بحری جہاز، بھیجی جانے والی ہدایات اور فوجی محاذ آرائی ---- یہ سب ۱۶۴۴ء میں نار منڈی پر حملے کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ جیسا کہ پہلے جائزہ لیا جا چکا ہے، جدید یورپ کے ابتدائی دنوں میں فوج کوئی اعلیٰ درجے کی نہ تھی۔ اس دور میں فوج میں اضافہ اور اس پر کنٹرول کوئی آسان کام بھی نہ تھا۔ کینے قسم کے فوجی، کرائے کے بے وفا سپاہی، رسد کی کمی، راہداری کا مسئلہ، غیر معیاری اسلحہ ---- یہ سب عناصر بہت سے سپہ سالاروں کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ جب فوجی ضروریات کے لیے کافی رقم مخصوص کی گئی تو بھی لوٹ کھسوٹ اور الٹے تلے خرچوں کا بازار گرم ہو گیا۔

مسلح افواج ریاست کے لیے کبھی قابل اعتماد نہیں رہی تھیں۔ بارہا یہ بھی ہوا کہ سپاہیوں کا خاصا بڑا دستہ رسد کی عدم دستیابی یا تنخواہ کی کمی کے باعث کنٹرول سے باہر ہو جاتا۔ فلینڈر کی فوج نے ۱۵۷۲ء سے ۱۶۰۷ء کے دوران کم و بیش چھیالیس مرتبہ بغاوت کی تھی۔ اسی طرح سویڈن کی فوج نے جرمنی میں بغاوت کی تھی اور کرومویل کی نئی موڈل آرمی نے بھی علم احتجاج بلند کیا تھا۔ رچلیو نے اپنے سیاسی عہد نامے میں اس بات کا ذکر نہایت تلخ انداز میں کیا ہے:۔

> "تاریخ ایسے بے شمار فوجیوں کے ذکر سے بھر پڑی ہے جو دشمنوں سے نہیں بلکہ اپنی ہوس پرستی اور بد نظمی کے باعث تباہ و برباد ہوئے۔ اور میں اس بات کا عینی گواہ ہوں کہ ایسی بہت سی مہمیں جو میرے دور میں شروع ہوئیں، مذکورہ وجوہات کی بناء پر ہی ناکارہ ہو گئیں۔"

تنخواہ کی ادائیگی اور رسد کی فراہمی کے مسئلے نے فوجی کارگزاری کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا تھا۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ جرمنی میں گستاورس اوڈلفس کی حیرت ناک مہم جوئی کے دوران ضروری حربی تکنیک اور فوجی منصوبہ بندی اختیار کرنے کے بجائے سپاہیوں کے کھانے اور جانوروں کے چارے کی تلاش تھی۔ نپولین کی یہ مشہور کہاوت کہ فوج پیٹ کے بل بوتے پر ہی آگے بڑھتی ہے، سپہ سالاروں کو بہت پہلے سے معلوم تھی۔

یہ فطری پابندیاں قومی سطح پر بھی عائد ہوتی تھیں، خصوصاً" جنگ کے لیے چندہ اکٹھا کرنے پر! اس دور میں کوئی بھی خوشحال ریاست طویل محاذ آرائی کے لیے فوری طور پر رقم مہیا کرنے سے قاصر تھی۔ نئے نئے ٹیکس لگانے کے باوجود حکومت کی آمدنی اور اخراجات میں ہمیشہ ایک خلا سا رہا۔ اسے یا تو فگرز جیسے نجی بینکوں سے رقم قرض لے کر پر کیا جاتا تھا یا بعد ازاں یہ مسئلہ ساہوکاروں کے ذریعے حل کیا جانے لگا جو سرکاری بونڈ کا لین دین کرتے تھے۔ جنگ کے ہوشربا اخراجات نے بارہا بادشاہوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ قرض کی رقم ادا کرنے سے پہلو تہی اختیار کریں، سکے کی قیمت کم کر دیں یا کوئی اور مایوس کن اقدامات

کریں۔ اس سے وقتی طور پر تو مسئلہ حل ہو گیا لیکن طویل المیعاد قسم کے نقصانات سے بھی دو چار ہونا پڑا۔ جس طرح جدید دور کے آغاز میں سپہ سالار اپنی فوج کے لیے کھانا اور گھوڑے کے لیے چارہ مہیا کرنے کی فکر میں پریشان رہتے تھے' ٹھیک اسی طرح اس زمانے کی حکومتیں بھی غربت و افلاس کا شکار تھیں۔ چنانچہ پچھلی پچھڑنے والی ریاستیں غیر معمولی ٹیکس نافذ کر رہی تھیں۔ امراء اور گرجاؤں کو مراعات مہیا کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ بینکوں اور اسلحہ سپلائی کرنے والوں سے قیمت کے معاملے میں تکرار ہوتی رہتی تھی۔ خزانے سے لدے ہوئے بیرونی جہازوں پر قبضہ کر لیا جاتا تھا۔ قرض دینے والوں سے دور رہا جاتا تھا۔ یہی سب باتیں اس زمانے کے حکمرانوں اور سرکاری افسروں کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

زیر نظر باب میں قطعاً" یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ ہیبسبرگ خاندان وہ سب کچھ انجام دینے میں ناکام رہا جسے دیگر طاقتوں نے بہ حسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اور نہ ہی اس ضمن کوئی حیران کن قسم کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا موازنہ نہایت ہی محدود فرق سے ہی کیا جاتا ہے۔ تمام ریاستیں' حتیٰ کہ متحدہ صوبہ جات بھی بری اور بحری مہم جوئی کے لیے وسائل کی عدم دستیابی سے پریشان تھے۔ جملہ ریاستوں کی مالی مشکلات' فوجیوں کی بغاوت' ناکافی رسد اور بھاری ٹیکس نافذ کرنے کے عمل میں اندرونی شورشوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

پہلی عالمی جنگ کی طرح اس زمانے میں بھی صبر و تحمل کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور متحارب قوتوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا عمل بھی جاری رہا۔ تیس سالہ جنگ کے اختتامی دور میں یہ بات مشاہدے میں آئی کہ نہ تو اتحادیوں نے اور نہ ہی مدمقابل گستاورس اور ولسٹن نے زیادہ سے زیادہ فوجیں میدان جنگ میں اتاریں۔ اس کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ فریقین کے پاس سپاہیوں کی بھی کمی تھی اور رقم کی بھی۔

ہیبسبرگ کی مخالف قوتوں کی کامیابی بھی ایک مختصر اور اضافی عمل تھا۔ انھوں نے اپنے مالی ذرائع اور فوجی طاقت کے مابین توازن ہیبسبرگ کے مخالفین سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے برقرار رکھا۔ کم از کم بعض فاتح ملکوں نے یہ بات محسوس کر لی ہو گی کہ طویل محاذ آرائی کے دوران ملکی دولت کے وسائل کو بے پروائی سے نہیں بلکہ محتاط طریقے سے استعمال میں لانا چاہیے۔ انھوں نے یہ بات بھی بادل ناخواستہ تسلیم کر لی ہو گی کہ تاجر' صنعت کار اور کسان بھی اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنی اہمیت پیدل سوار فوجیوں' فوج کے افسروں اور نیزہ برداروں کو حاصل ہے۔ لیکن ان باتوں کی قدر و اہمیت ان کے دلوں میں کم ہی تھی اور اقتصادی امور کو نمٹانے کا جذبہ بھی محدود تھا۔ ڈیوک آف ولنگٹن کے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں:-

"یہ ایک لعنتی چیز تھی"

عظیم محاذ آرائی بھی ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔

۳

مالیہ' جغرافیہ اور جنگی فتوحات

۱۶۶۰ء - ۱۸۱۵ء

پائیرینیز کی صلح سے نہ تو یورپ کی بڑی طاقتوں کی آپس کی دشمنیاں ختم ہوئیں اور نہ ہی ان کی ایک دوسرے سے محاذ آرائی کی عادت کا خاتمہ ہوا۔ لیکن ۱۶۶۰ء کے بعد شروع ہونے والی بین الاقوامی جدوجہد بعض معنوں میں بالکل مختلف تھی۔ ڈیڑھ صدی تک جاری رہنے والی یہ کوشش بسیار اس سے مختلف تھی جو بعد کے سو سال کے دوران دیکھنے میں آئی۔ بہرحال ان تبدیلیوں سے بین الاقوامی سیاست پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

۱۶۶۰ء کے بعد' نمایاں ہونے والے بڑی طاقتوں کے اس منظر نامے کی سب سے اہم خصوصیات یہ تھی کہ یورپی ریاستوں کا کثیر المحورائی نظام مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ ہر ایک ملک جنگ اور امن کا فیصلہ مذہبی تقاضوں کے بجائے قومی مفاد کے پیش نظر کرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن یہ کوئی حتمی تبدیلی نہ تھی۔ کیونکہ ۱۶۶۰ء سے قبل بھی یورپی ملکوں نے اپنے سیکولر نظریے کے تحت ہی جدوجہد کی تھی۔ تاہم مذہبی تعصب نے بھی اٹھارویں صدی میں متعدد عالمی جنگوں کے شعلوں کو ہوا دی تھی۔ البتہ ۱۵۱۹ء تا ۱۶۵۹ء کے دور کی چند اہم خصوصیات بھی تھیں۔ آسٹریلیا اور اسپین کے محور پر قائم ہیبسبرگ طاقت پروٹسٹنٹ نظریے کے تابع ملکوں اور فرانس کے ساتھ جو محاذ آرائی جاری رکھے ہوئے تھی' اب اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اب اس کی جگہ ایسا باہمی اتحاد قائم تھا جو کمزور' قلیل المیعاد اور بہت جلد تبدیل ہو جانے والا تھا۔ چنانچہ کوئی ملک اگر ایک جنگ میں کسی ایک طاقت کا حریف ہوتا تھا تو دوسرے میں اس کا حلیف بن جاتا تھا۔ اس طرح کوئی فیصلہ کرنے کے لیے مذہبی رواداری کے برعکس ---- سیاسی پہلو کو مد نظر رکھا جانے لگا۔

سفارت کاری اور جنگ دونوں میں جو اتار چڑھاؤ کی کیفیت اس کا فوری صفت (عارضی) کثیر المحورائی نظام کا خاصہ تھا۔ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ یہ ہر زمانے میں موجود رہی ہے---- یعنی کسی ملک کا زوال اور کسی کا عروج! ڈیڑھ صدی پر مشتمل اس دور میں کئی نقشے ابھر کر سامنے آئے' مثلاً" ا-۱۶۶۰ء میں لوئس چہارم دہم نے فرانس میں مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ ۱۸۰۵ء میں نپولین نے واٹرلو کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ ماضی کی عظیم سلطنتیں (سلطنت عثمانیہ' ہسپانیہ' نیدر لینڈ' سویڈن) گھٹ کر دوسرے درجے کی طاقتیں بن گئیں۔ پولینڈ بری طرح گھٹ کر رہ گیا۔ آسٹریوی ہیبسبرگ سلطنت اپنی موروثی جائیداد میں اچھا خاصا اضافہ کر کے اول مقام پر ہی فائز رہی۔ جرمنی کے شمال میں' برینڈ ۔برگ پروشیا نے بھی توسیع کر لی۔ ۱۶۶۰ء کے بعد مغرب میں' فرانس نے اپنی فوجی طاقت کو بہت وسعت دی اور اس طرح یورپی ملکوں میں وہ ایک طاقتور ریاست کے طور پر نمایاں ہو گیا۔ بہت سے مبصروں کے خیال میں فرانس کی یہ طاقت اتنی ہی ہمہ گیر تھی جتنی پچاس سال قبل ہیبسبرگ کی تھی۔ مغربی وسطی یورپ پر فرانس کے اقتدار قائم رکھنے کی خواہش کو اس کے پڑوسی ملک

طویل جنگ کے ذریعے لگام دیتے رہے (۱۶۸۹ء تا ۱۶۹۷ء' ۱۷۰۲ء تا ۱۷۰۳ء' ۱۷۳۹ء تا ۱۷۴۸ء' ۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۳ء)۔ نپولین کے عہد میں یہ ایک رسم بن گئی کہ شاہانہ فتوحات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جائے اور یہ روایت اسی وقت ختم ہوئی جب چار بڑی طاقتوں کا آپس میں گٹھ جوڑ ہوا۔ ۱۸۱۵ء میں شکست کھانے کے باوجود فرانس مقتدر ممالک میں شمار کیا جاتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام پر مغرب اور مشرق کے درمیان واقع پروشیا اور سلطنت ہیبسبرگ کے مابین توازن کی کیفیت ابھرنے لگی۔

مذکورہ صدی میں بڑی طاقتوں کے نظام میں اہم تبدیلی نے یورپ کی کوکھ سے جنم لیا اور وہ بھی بہت دور دراز علاقے میں! مغربی یورپ کے بعض ممالک نے اپنی چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں کو ایک وسیع سلطنت میں تبدیل کر لیا۔ یہ کام انھوں نے خصوصی طور پر ہندوستان میں انجام دیا' لیکن شرق الہند' جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا جیسے دور دراز علاقوں میں بھی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ نو آبادیات قائم کرنے والے ان ممالک میں برطانیہ خاصا کامیاب رہا۔ جیمز دوم کے بعد جب ۱۶۸۸ء میں ولیم اور میری کو حکومت ملی تو یہ ملک اندرونی طور پر بہت مستحکم ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ برطانیہ یورپ کی ان سلطنتوں کی صف میں شامل ہو گیا جو بحری طاقت میں جواب نہیں رکھتی تھیں۔ اگرچہ ۱۷۷۰ء کے عشرے میں شمالی امریکہ کی نو آبادیات پر اس کا کنٹرول باقی نہیں رہا۔ وہاں متحدہ آزاد ریاستوں کی بنیاد پڑ گئی جن کی دفاعی قوت اور اقتصادی حالت اعلیٰ درجے کی تھی ـــــ لیکن برطانیہ کے بڑھتے ہوئے عالمی اثر و رسوخ پر اس واقعہ کا اثر عارضی تھا۔ اسی طرح اس ضمن میں روس کے اقدامات بھی قابل ذکر تھے۔ اس نے اٹھارھویں صدی میں مشرق اور جنوب کی جانب توسیع کر لی اور ایشیا کے وسیع و عریض میدانوں تک پہنچ گیا۔ علاوہ ازیں' برطانیہ اور روس چونکہ یورپ کی مغربی اور مشرقی پٹی پر بالترتیب واقع تھے' لہٰذا دونوں دنیا کے مرکزی حصے پر نگاہ گاڑے ہوئے تھے۔ برطانیہ کو اس میں اس لیے دلچسپی تھی کہ ہنوور سے خاندانی تعلق کی بنا پر وہ جرمنی کے معاملات میں دخل انداز ہوتا تھا۔ اور روس اپنے پڑوسی ملک پولینڈ کے معاملات میں آواز بلند کرتا رہتا تھا۔ نیز لندن اور سینٹ پیٹر برگ کی حکومتیں براعظم یورپ میں طاقت کا توازن قائم رکھنا چاہتی تھیں' لہٰذا اپنے مفاد کے پیش نظر دخل در معقولات کیا کرتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کا ریاستی نظام پانچ بڑی طاقتوں میں سے ایک کی حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ یہ پانچ بڑی طاقتیں ـــــ فرانس' ہیبسبرگ سلطنت' پروشیا' برطانیہ اور روس تھیں! ان کے علاوہ کم تر درجے کے ملک مثلاً" ساوے اور زوال پذیر ریاستیں جیسے اسپین شامل تھیں۔

ایسا کیوں کر ہوا کہ مذکورہ پانچوں طاقتیں' اگرچہ ایک جیسی قوت کی حامل نہ تھیں لیکن یہ پھر بھی "اہم ریاستی انجمن" میں شامل ہو گئیں؟ اس کا جواب ان کی فوجی کاروائیاں ہیں۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اس عہد میں بڑی طاقتوں کے عروج و زوال کی بین وجہ بری اور بحری فوج میں تکنیکی قسم کی تبدیلیاں تھیں یا کچھ اور۔ اس سے ایک ملک کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ پہنچا ہو گا۔ بلا شبہ' اسلحہ سازی میں معمولی نوعیت کی ترقی ہوئی تھی۔ چقماقی گھوڑے والی اور سنگینیں لگی ہوئی رائفلوں نے نیزہ برداروں کو میدان جنگ سے معدوم کر دیا تھا۔ توپ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی منتقل ہونے لگی خصوصاً" ۱۷۶۰ء کی دہائی کے دوران جب گری بیوویل نے اس کے نئے نمونے تیار کیے۔ جب ۱۷۷۰ء کے آخری عشرے میں اسکاٹ لینڈ کی کیرون کمپنی نے کیرونیڈ کے نام سے نزدیک مار کرنے والی بحری بندوق تیار کی تو جنگی

جہاز کی تباہ کن قوت خاصی بڑھ گئی اور اس سے فنی تصورات کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ آبادی اور اس کے ساتھ زرعی پیداوار میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں بڑے بڑے فوجی یونٹوں کو ضرورتوں کے لیے کمیت بہ آسانی میسر ہوئے۔ بہرحال' یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۱۸۱۵ء میں ولنگٹن کی فوج ۱۷۱۰ء کی مارل بورو کی فوج سے بہت مختلف نہ تھی اور نہ ہی نیلسن کا بحری بیڑا تکنیکی لحاظ سے اس جہاز سے زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا جس کو لوئس چہارم دہم کے جنگی جہازوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے دوران بری اور بحری فوج میں تنظیمی نوعیت کی تبدیلی نما ہوئی تھی۔ اس کی تمام تر وجہ حکومت کی حس سے بڑھی ہوئی فعالیت تھی۔ اس تبدیلی کی واضح مثال لوئس چہار دہم (۱۷۱۵ء-۱۶۶۱ء) کا فرانس تھا۔ کولبرٹ' لی ٹیلیر اور دیگر وزراء اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ اندرون ملک بادشاہ کو استحکام حاصل ہو اور بیرون ملک اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اسی مقصد کے لیے فرانس میں جنگ کی وزارت قائم کی گئی جو فوج کی مالی ضرورت' رسد کی فراہمی اور فوج کے نظم و ضبط کی نگران تھی۔ مارٹی نیٹ اس وزارت کا انسپکٹر جنرل تھا جس نے تربیت اور نظم و ضبط کا نیا معیار قائم کیا تھا۔ بادشاہ کی کثیر التعداد فوج کی بحالی کے لیے بیرک' ہسپتال' پریڈ گراؤنڈ اور ہر شے کے لیے گودام تعمیر کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ نہایت منظم قسم کا بحری بیڑا بھی تیار کیا گیا تھا۔ ان تمام باتوں نے دوسری طاقتوں کو بھی مجبور کیا کہ وہ روبہ زوال ہونے سے بچنے کے لیے ایسے ہی اقدامات کریں۔ حکومت نے فوجی طاقت پر اجارہ داری قائم کرنے اور اس میں ضابطہ پرستی پیدا کرنے کی جس مہم کا آغاز کیا' اس سے دراصل قومی تعمیر کے رجحان کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ ایک معکوسی عمل تھا۔ حکومت کے وسائل اور وسیع اختیارات کے بل بوتے پر افواج کو مستقل ملازمت کا پروانہ دیا گیا تھا جو ایک صدی پہلے تک کہیں بھی مروج نہ تھا۔ اس زمانے میں صرف "پیشہ ور" "حاضر جوکری" فوجی اور شاہی بحریہ ہی کا وجود نہ تھا بلکہ نہایت اعلیٰ درجے کی جنگی اکیڈمی' بیرک' جہاز کی مرمت کا یارڈ اور اسی قسم کے ادارے موجود تھے جن کی نگرانی منصرم کیا کرتا تھا۔

اب طاقت سے مراد قومی طاقت تھی چاہے اس کا انحصار مشرقی یورپ کی روشن خیال مطلق العنانی سے' برطانیہ کے پارلیمانی کنٹرول سے یا انقلابی فرانس کی جذباتی فوج سے ہوتا ہو۔ دوسری طرف ایسی تنظیمی ترقی کی نقل دوسرے ممالک نہایت سرعت سے کر لیا کرتے تھے۔ (اس کی بین مثال پیٹروی گریٹ کی ہے جس نے ۱۶۹۸ء کے بعد محض دو عشروں کے دوران روس کی فوج کو ان خطوط پر ڈھال دیا تھا۔) لیکن وہ بذات خود ملک کو عظیم طاقت بنانے سے قاصر رہا۔

۱۶۶۰ء سے ۱۸۱۵ء کے دوران بڑی طاقتوں کو جو اہمیت حاصل رہی اس کا کماحقہ انحصار مذکورہ فنی ترقی سے کہیں زیادہ درج ذیل دو اہم عناصر سے ہوتا ہے' یعنی مالیہ اور جغرافیہ! یہ دونوں لازم و ملزوم بھی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں! ان کے ذریعے اس دور میں لڑی جانے والی جنگوں کی فتوحات اور شکستوں کا بآسانی احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

مالیاتی انقلاب

جیساکہ گذشتہ باب میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے خالقوں کی نظر میں مالیاتی اہمیت، اقتصادیاتی پیداوار کی بنیادیں اور ان سے حاصل شدہ محاصل کا نقشہ واضح تھا تاہم اٹھارھویں صدی میں قدیم نظام حکومت پر استوار سلطنتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ اپنے بہت سے وسیع و عریض فوجی اڈوں اور جنگی جہازوں کے مصارف کے باعث ہر حکومت کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنی معاشیات کو بہتر بنائے اور ایسے مالیاتی ادارے قائم کرے جو مطلوبہ رقم مہیا کرنے کی تدابیر اختیار کر سکیں۔ علاوہ ازیں' پہلی عالمی جنگ کی طرح انگلستان اور فرانس کے مابین ۱۶۸۹ء اور ۱۸۱۵ء کے دوران جو سات اہم جنگیں لڑی گئیں' وہ درحقیقت مفاہمت کی کوشش تھیں۔ چونکہ برطانیہ اور فرانس دونوں کے اپنے اپنے اتحادی دوست تھے' لہٰذا بڑی طاقت کے باہمی اختلاط کو ہی فتح حاصل ہوئی۔ اور اس طرح کریڈٹ بحال رکھنے اور رسد میں اضافہ کرنے کا امکانات پیدا ہوئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ساری جنگیں مختلف گٹھ جوڑوں کے نتیجے میں شروع ہوئیں اور اسی بنا پر یہ طویل بھی ہو گئیں۔ جب کسی ایک متحارب قوت کے وسائل معدوم ہونے لگتے تو وہ لا محالہ اپنے سے طاقتور اتحادی کی طرف رجوع کرتا تاکہ اس سے اسے قرض اور نئی کمک حاصل ہو اور پھر اس سے وہ جنگ جاری رکھتا۔ جنگوں کے ہوش ربا اخراجات کے پیش نظر ہر فریق کی صرف اور صرف پیسہ ہی ضرورت ہوتی تھی' اسی ضرورت نے سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارھویں صدی کے اوائل میں "مالیاتی انقلاب" کے اسباب پیدا کیے۔ تب' بعض مغربی یورپ کی ریاستوں نے بینک کاری اور قرض دہی کا ایک اعلیٰ نظام قائم کیا تاکہ جنگ کے اخراجات پورے کرنے کی سبیل نکلے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس زمانے میں مالیاتی نظام میں تبدیلی کی دوسری اور غیر فوجی وجہ گرم مصالحے کی شدید کمی بھی تھی!۔ یہ صورت حال خصوصی طور پر پرتگالی برازیل میں ۱۶۹۳ء میں سونے کی دریافت سے قبل پیدا ہوئی تھی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مشرق کے ساتھ یورپ کی تجارت کو جیسے جیسے فروغ حاصل ہوا' لین دین کے خلا کو پر کرنے کے لیے اسی قدر چاندی استعمال میں آتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاجر اور کاروباری لوگ سکوں کی عدم دستیابی کی شکایت کرنے لگے۔ ادھر ضروری صنعت' مثلاً" کپڑا اور بحری جہازوں کے سامان پر مبنی یورپ کی تجارت رفتہ رفتہ فروغ پانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ قدیم یورپ کو تجارتی لین دین کا مستقل مرکز بنانے کا رجحان بھی پیدا ہونے لگا۔ اس طرح مالی معاملات باقاعدگی سے حل ہونے لگے۔ ان باتوں کے نتیجے میں مبادلہ ہنڈی اور نوٹس آف کریڈٹ کا استعمال خاصی حد تک بڑھ گیا۔ ایمسٹرڈم میں خصوصاً" اور دیگر شہروں مثلاً" لندن' لینن' فرینکفرٹ میں بھی ساہوکاروں' بیوپاریوں' سناروں (جو قرض کا بیوپار کیا کرتے تھے)' ہنڈی فروشوں اور ملازموں کا ایک مجمع سا لگ گیا۔ یہ سب مشترکہ سرمایہ کمپنیوں سے اپنا اپنا حصہ وصول کرنے لگے۔ مذکورہ انفرادی شخصیتوں اور مالیاتی اداروں نے نشاۃ الثانیہ کے حامل اٹلی کی طرح بنک کاری کا نظام اپنا کر قومی اور بین الاقوامی سطح پر اعتباری ڈھانچے کو تعمیر کر دیا اور اس طرح موجودہ اقتصادی نظام کو بنیاد استوار کر دی۔

تاہم' یورپ میں "مالیاتی انقلاب" کو جنگ کے ذریعے ہی تحریک ملی۔ اگر فلپ دوم اور نپولین کے زمانے کے مالی بحران کے درمیان ایک ڈگری کا فرق تھا تو یہ بھی عدیم المثال بات تھی۔ سولھویں صدی میں

ہونے والی جنگوں کے اخراجات کا تخمینہ لاکھوں پونڈ میں لگایا جا سکتا ہے جبکہ سترھویں صدی کے اواخر میں یہ اخراجات کروڑوں پونڈ تک پہنچ چکے تھے۔ نپولین کی جنگ کے اختتام پر متحارب ملکوں کے اخراجات کئی گنی بلین پونڈ سالانہ تک پہنچ چکے تھے۔ جب بڑی طاقتوں کے درمیان ہونے والی طویل اور مسلسل جنگوں کا محاکمہ اقتصادی نظریے سے کیا جاتا ہے تو یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہو پاتا کہ اس سے یورپ کو تجارتی اور صنعتی طور پر فائدہ پہنچا یا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کا جواب بڑی حد تک اس بات پر بھی منحصر ہے کہ آیا کسی ملک کی مجموعی ترقی کا جائزہ طویل محاذ آرائی سے قبل اور بعد کی خوشحالی اور استحکام کے تناظر میں لیا جا رہا ہے یا نہیں! بہرحال' جو بات واضح ہے وہ یہ کہ اٹھارھویں صدی کی نہایت موثر جدید اور ترقی یافتہ ریاستیں اپنے محدود وسائل کی بنا پر جنگ میں لیے ہوئے قرضے فوری طور پر واپس نہ کر سکیں۔ علاوہ ازیں ان قرضوں کے سبب ان ملکوں میں ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ بھی ہوتا رہا اور اگرچہ انھیں وصول کرنے کے طریقے بھی مروج تھے' لیکن اس کے باوجود ان اضافوں کی وجہ سے اندرون ملک شورش بھی پھیلتی رہی جس سے حکومتیں ہمیشہ خائف رہیں خصوصاً" اس وقت جب انھیں بیرونی دشمنوں کا بھی سامنا ہوتا تھا۔

اندریں حالات ان ممالک کے لیے جنگ کے اخراجات پورے کرنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ حکومت قرض لے' بانڈ اور وفاتر فروخت کرے یا پھر ایسے تمام افراد کو طویل المیعاد بنیاد پر منافع ادا کرے جو فوری طور پر رقم مہیا کردیں۔ رقم مہیا ہو جانے کی یقین دہانی کی صورت میں سرکاری افسران فوجی ٹھیکہ داروں' اشیائے خوردونوش کے تاجروں' جہاز سازوں اور خود افواج کو منافع ادا کرنے کا پروانہ جاری کر دیتے تھے۔ رقم اکٹھا کرنے اور پھر وسیع پیمانے پر خرچ کرنے کا یہ دو طرفہ طریقہ کار ایک دھونکنی کی مانند تھا جو مغربی سرمایہ کاری اور قومی ریاست دونوں کو مرتعش کر رہی تھی۔

بعد کے تاریخ دانوں کو یہ سب کچھ خواہ کیسا ہی فطری معلوم ہو' لیکن اس حقیقت کا اقرار بھی ضروری ہے کہ اس نظام کی کامیابی دو نہایت ہی اہم عناصر پر منحصر تھی۔ ایک تو قرض حاصل کرنے کا موثر طریقہ' دوسرے' مالیاتی منڈی میں حکومت کی "ساکھ" کی برقراری!۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ متحدہ صوبوں نے اس سمت پیش قدمی کی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ وہاں کا تاجر طبقہ حکومت کا ہی ایک حصہ ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سرکاری معاملات اسی طرح انجام پائیں جس طرح مشترکہ سرمایہ کی کمپنی میں انجام پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نیدرلینڈ کے حکومتی جنرل نے نہایت مناسب طریقے سے ٹیکسوں میں اضافہ کیا تاکہ حکومت کے اخراجات پورے کیے جا سکیں۔ اس نے سود کی شرح نہایت کم رکھی تاکہ قرض کی باز ادائیگی ممکن ہو۔ ایمسٹرڈم شہر میں یہ نظام بہت سی مالیاتی کارگزاریوں کے سبب عمدہ طریقے سے نافذ ہوا۔ چنانچہ متحدہ صوبوں کی حکومتوں کو جلد ہی اس بات کی بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی کہ وہاں بندی بے باق ہو جاتی ہے' سکے کا لین دین ہوتا ہے اور "اعتبار" فراہم کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا جہاں طویل المیعاد قسم کے سرکاری قرض کو بھی عام قرض سمجھا گیا۔ چنانچہ ایمسٹرڈم جلد ہی ہالینڈ کے "زائد سرمایہ" کا مرکز بن گیا اور پھر یہ بیرونی کمپنیوں کے سرمایے میں اپنی رقم لگانے کے قابل ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ بیرونی حکومتیں جو بھی قرضے جاری کرتیں خصوصاً" جنگ کے زمانے میں' تو اسے پورا کا پورا خرید لیا جاتا۔

ان اقدامات سے متحدہ صوبوں کی اقتصادیات پر جو اثرات مرتب ہوئے' یہاں ان کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ اگر ایمسٹرڈم کو اقتصادی اور پیداواری بنیاد فراہم نہ ہوتی تو وہ براعظم کا مالیاتی مرکز نہیں بن سکتا تھا۔

طویل المیعاد قسم کے نتائج عموماً" مفید ثابت نہیں ہوتے تھے۔ چونکہ سرکاری قرض کی واپسی بہت سست رفتاری سے ہوا کرتی تھی' لہٰذا متحدہ صوبے کار آمد اقتصادیات سے دور ہوتے چلے گئے اور ان کی خود معاشیات راہ پانے لگی۔ اس کے باعث اٹھارھویں صدی کے اواخر میں بینکار طویل المیعاد قسم کے منفعتی کاموں میں سرمایہ لگانے سے گریز کرنے لگے۔ چنانچہ ولندیزی حکومت کو بآسانی قرض ملنے بند ہو گئے۔ اس پر سابقہ قرضوں کا ویسے ہی کافی بوجھ تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے چنگیوں کی رقم سے قرضوں کی ادائیگی کی گئی۔ اس کے نتیجے میں اجرت میں بھی اضافہ ہوا اور قیمتیں بھی سطح مسابقت سے بلند ہو گئیں۔

سب سے اہم اور قابل توجہ بات یہ تھی کہ ولندیزی حکومت جب کسی بیرونی ملک سے قرض کا سودا کرتی تھی تو وہ اپنے گاہکوں کے مذہب یا نظریے سے قطع نظر ان کے مالی استحکام اور اعتماد کو دیکھتی تھی۔ اسی طرح روس' اسپین' آسٹریا' پولینڈ اور سویڈن جیسے یورپی ممالک میں قرض کے معاملے میں جو شرائط وضع کی گئی تھیں' ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اقتصادی حالت بدرجہا بہتر تھی' وہ بینکوں کو جائیداد کنٹرول فراہم کرتے تھے' ان کے سودی رقم اور پریمیم جمع کرنے کا ریکارڈ ٹھیک ٹھاک تھا اور اس طرح بڑی طاقت بننے کی جدوجہد میں ان کے کامیاب ہونے کے امکانات روشن تھے۔ سولھویں صدی کے اواخر میں پولینڈ کی حکومت کے مجموعی اسٹاک اور آسٹریا کے محکم کریڈٹ کو دیکھ کر ان ملکوں کی پائیداری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مالی استحکام اور طاقت کی سیاست کے درمیان جس قسم کا اہم تعلق قائم تھا' اس کی مثال اس دور کے دو سب سے بڑے مخالف ----- انگلستان اور فرانس سے ملتی ہے۔ چونکہ ان کی محاذ آرائی کے اثرات پورے یورپ کے توازن پر پڑتے تھے' لہٰذا یہاں اس کا مفصل جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ یہ ایک پرانی کہاوت ہے تھی کہ اٹھارھویں صدی کے عظیم برطانیہ نے تجارتی اور صنعتی لحاظ سے عدیم المثال ترقی کی تھی۔ اس کا مالیاتی اعتبار ناقابل تذلزل تھا۔ اس کا معاشرتی نظام روبہ ترقی تھا۔ اس کے برعکس فرانس میں قدیم نظام حکومت رائج تھا جو "کلیتاً" فوج کے ریت کے تودے پر استوار تھا۔ اقتصادی طور پر یہ ملک خاصا پس ماندہ تھا۔ وہاں طبقہ واریت کی فضا قائم تھی۔ چنانچہ بظاہر یہ ملک مستحکم نظر آتا تھا تاہم بعض صورتوں میں برطانیہ کے مقابلے میں فرانس کا ٹیکس کا نظام جارحانہ نہیں تھا۔ علاوہ ازیں' اٹھارھویں صدی میں اس بات کے قرائن نظر آنے لگے تھے کہ فرانس اقتصادی لحاظ سے پیش قدمی کر رہا ہے' اور اگرچہ اس کے پاس کوئلے جیسی ضروری شے کا ذخیرہ بھی بے حد محدود تھا لیکن اس کے باوجود وہ صنعتی انقلاب کی طرف گامزن ہو چلا تھا۔ اس کی فوجی مصنوعات معقول تھیں اور اس شعبے سے ہنرمند کاریگر وابستہ تھے۔ اعلیٰ درجے کے پیدا کار بھی اس صنعت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنی کثیر آبادی اور خاصی وسیع زراعت کی بدولت فرانس اپنے جزیرائی پڑوسیوں کی نسبت زیادہ دولت مند تھا۔ اس کے محاصل اور فوجیوں کی تعداد کے مقابلے میں دیگر یورپی مخالف بہت چھوٹے نظر آتے تھے۔ اگر اس کا ویسٹ منسٹر کی پارٹی کی بنیاد پر قائم سیاست سے مقابلہ کیا جائے تو فرانس کی نو حد کناں حکومت زیادہ مربوط اور مستقبل کے لیے خوش آئند نظر آتی تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ اٹھارھویں صدی میں اہل برطانیہ جب چینل کے پار نظر دوڑاتے تھے تو انھیں یہ احساس جاگزیں ہو جاتا کہ ان کا ملک طاقتور ہونے کی بجائے کمزور واقع ہوا ہے۔

ان حقائق کے باوجود برطانیہ کے سسٹم کو مالیاتی شعبے میں دوسروں پر نمایت اہم سبقت حاصل تھی۔ جس کے باعث جہاں برطانیہ کو زمانہ جنگ میں قوت میسر ہوئی وہاں دور امن میں بھی سیاسی استحکام اور اقتصادی فروغ حاصل ہوا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ فرانس کے مقابلے میں یہاں ٹیکس کا نمایت جارحانہ نظام رائج تھا ----- (یعنی براہ راست ٹیکس نافذ کرنے کی بجائے بالواسطہ محصول عائد کیے جاتے تھے) ----- بقیہ خصوصیات اس نوع کی تھیں کہ عوام کا اعتراض خال خال ہی ہوا کرتا تھا' مثلاً" برطانیہ میں فرانس کی طرح نہ ٹیکس گزار مزارع کی لمبی قطار ہوتی تھی' نہ ہی محصل تھے اور نہ ہی کوئی درمیانی آدمی! بہت سارے برطانوی محصول "غیر مرئی" ہوتے تھے۔ چند خاص مصنوعات پر محصول آبکاری عائد تھا۔ غیر ملکیوں کو کسٹم کے معاملے میں تکلیف ضرور ہوا کرتی تھی۔ تاہم اندرون ملک کسی قسم کی چنگی وصول نہیں کی جاتی تھی۔ واضح رہے کہ اسی بات نے فرانس کے تاجروں میں اشتعال پیدا کیا تھا اور اسی کے باعث وہاں کی اندرونی تجارت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ برطانیہ کا زمینی ٹیکس جو اٹھارھویں صدی کا کسی مزاحمت کے بغیر راست محصول تھا' معاشرے کے بیشتر طبقات کے لیے اس کی "غیر مرئی" حیثیت تھی۔ ایسے تمام متنوع ٹیکسوں پر منتخب اسمبلی میں بحث ہوا کرتی تھی اور پھر ان کی منظوری دی جاتی۔ غرض اپنے تمام تر پیچیدگیوں کے باوجود برطانیہ کے ٹیکس کو عوامی نمائندوں کی حمایت حاصل ہوتی تھی جبکہ فرانس کے قدیم نظام حکومت میں ایسا نہیں تھا۔ جب اس اہم خصوصیت میں اس بات کا اضافہ کیا جاتا ہے کہ ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ برطانیہ میں فی کس آمدنی فرانس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی تو اس میں کوئی تعجب کی بات محسوس نہیں ہوتی کہ اس ریاست کی آبادی عائد شدہ بھاری ٹیکس بہ رضا و رغبت ادا کرتی تھی۔ اعداد و شمار سے ثابت نہ کر سکنے کا باوجود یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ برطانیہ میں "سستا" کم ٹیکس نافذ تھا اور اس کے باعث خوشحال طبقے میں بحث کا رجحان پیدا ہوا۔ اس سے جہاں زمانہ امن میں سرمایہ کاری کو فروغ حاصل ہوا' وہاں جنگ کے زمانے میں بھی قابل ٹیکس دولت میں فراوانی ہوئی خصوصاً" قومی ضرورت کے تحت زمینی ٹیکس اور ۱۷۹۹ء میں براہ راست انکم ٹیکس کے نفاذ سے۔ چنانچہ جنگ نپولین کے زمانے سے برطانیہ' فرانس کے مقابلے میں کم آبادی کے باوجود پہلی مرتبہ ٹیکس کے ذریعے ہر سال زیادہ سے زیادہ محصول حاصل کر رہا تھا۔

مذکورہ بالا کارنامے کتنے ہی شاندار کیوں نہ ہوں' لیکن جب برطانیہ اور فرانس میں رائج عوامی قرضے کے درمیان نمایت اہم فرق سامنے آتا ہے تو یہ تمام کارنامے گہنا جاتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ دراصل اٹھارھویں صدی کے دوران ہونے والی تمام محاذ آرائیاں تھیں جن کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تین چوتھائی رقم قرض سے حاصل کی گئی تھی واضح رہے کہ دیگر ملکوں کے برعکس برطانیہ کو حاصل ہونے والے فوائد حتمی تھے۔ اول تو اداراتی ڈھانچے کی تشکیل تھی۔ اس کے ذریعے طویل المیعاد قسم کے قرض کا چلن موثر انداز میں ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرض پر لی ہوئی رقم پر باقاعدگی سے سود بھی ادا کیا جانے لگا۔ ۱۶۹۴ء میں بنک آف انگلینڈ کا قیام عمل میں آیا۔ پہلے پہل اس کا آغاز جنگ کی مناسبت سے ہوا تھا پھر آہستہ آہستہ قومی قرض کو مستقل حیثیت دے دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ "اسٹاک بدل کا" کو فروغ دیا گیا اور قومی بنک کھولے گئے۔ اس طرح ایک ایسے عہد میں جبکہ سکوں کا فقدان تھا حکومت اور کاروباریوں کو رقم

دستیاب ہونے لگی۔ مختلف صورتوں میں اس "کاغذی رقم" کے استعمال سے بہت فوائد حاصل ہوئے۔ اس سے نہ تو افراط زر پیدا ہوا نہ ہی "ساکھ" کمزور ہوئی۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر برطانیہ کی پارلیمنٹ اپنے اختیارات کے تحت حکومت کو مزید ٹیکس لگانے کی منظوری نہ دیتی تو "مالیاتی انقلاب" بمشکل کامیابی سے ہمکنار ہوتا۔ اگر وال پول سے لے کر نوجوان وزیر پٹ بنکوں کو خصوصاً" اور عوام کو عموماً" یہ قائل کرنے کی جدوجہد نہ کرتے کہ وہ بھی اقتصادی عمل میں حکومت کے ساتھ ہیں تو یہ مالیاتی تبدیلی نہ آتی۔ اور اگر تجارت' اقتصادیات اور صنعت و حرفت میں ترقی کے باعث خاطر خواہ محصول حاصل نہ ہوتا تو مالی نظام میں یہ انقلاب رونما نہ ہوتا۔ نیز' شاہی بحریہ دشمنوں سے معرکہ آرائی کے دوران قوم کی سمندر پار تجارت کی حفاظت نہ کرپاتی اور اس مالیاتی فروغ کو جنگ سے نقصان پہنچتا۔ یہی ٹھوس بنیادیں تھیں جن پر برطانیہ کی "مالی ساکھ" برقرار رہی اور اس میں سابقہ بے یقینی کی کیفیت' سیاسی مخالفت اور ۱۷۲۰ء کے "ساؤتھ سی ببل" جیسے مالیاتی خسارے مزاحم نہیں ہوئے۔ انگلستان میں حکومت کے مالیاتی نظام میں تمام نقائص کے باوجود وہاں کے مورخین نے یہ لکھا کہ "مذکورہ صدی کے بقیہ حصے میں یہاں کا مالیاتی نظام یورپ کے دیگر ملکوں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا اور موثر رہا ہے"۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف سود کی شرح آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔ بلکہ برطانوی اسٹاک مارکیٹ غیر ملکی خصوصاً" ولندیزی سرمایہ کاروں کے لیے پرکشش بن گئی۔ ایمسٹرڈم کی منڈی میں ان تمسکات کا مسلسل لین دین ہونے لگا۔ اس سے برطانوی اور ولندیزی عوام کے درمیان تجارتی اور مالیاتی تعلقات استوار ہوئے۔ اس کا لامحالہ اثر دونوں ملکوں کے اقتصادی نظام پر پڑا۔ اقتدار اور سیاست کی اصطلاح میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اہمیت اس بات میں مضمر تھی کہ متحدہ صوبوں کے وسائل برطانوی جنگ میں کام آتے رہے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب فرانس کے خلاف جنگ میں ہالینڈ اتحادی ہونے کا باوجود غیر جانب رہا تھا۔ جب امریکی انقلاب کی جنگ چھڑی تو اس موقع پر برطانیہ کی بری' بحری' سفارتی اور تجارتی کمزوریاں کھل کر سامنے آگئیں۔ چنانچہ نیتجاً" اس کی "مالیاتی ساکھ" گر گئی۔ اگرچہ لندن کی حکومت زیادہ سے زیادہ سود ادا کرنے کو تیار تھی' لیکن اس کے باوجود یوں لگتا تھا جیسے ولندیزی سرمایہ کی ترسیل رک گئی ہو۔ جب ۱۷۸۰ء کے لگ بھگ ہالینڈ جنگ میں فرانس کا حلیف بن گیا' اس وقت برطانوی حکومت کا احساس ہوا کہ اس کی اقتصادی حالت مستحکم ہے اور نجی سرمایہ کا حصول بھی ممکن العمل ہے۔ لہٰذا نجی سرمایہ کار قرض میں سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں۔

☆ آسٹریا میں جانشینی کی جنگ (۱۷۳۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے موقع پر حکومت ۳ یا ۴ فی صد سود کے عوض زیادہ سے زیادہ رقم بطور قرض لینے کی سکت رکھتی تھی۔ یہ شرح اس سے نصف تھی۔ جو مارلبورو کے زمانے میں مقرر تھی۔

جنگ کے موقع پر قرض حاصل کرنے میں برطانیہ کو جو کامیابی ہوتی رہی' اس کا اندازہ جدول نمبر ۲ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ حربی نقطہ نظر سے ان اعداد و شمار کی حقیقت یہ تھی کہ حکومت ٹیکس سے حاصل شدہ اپنی تمام آمدنی جنگ پر خرچ کرنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ اسے فرانس اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں محتاط طریقے سے جہاز اور فوجی بھیجے پڑتے تھے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو میسر وسائل جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہو سکتے تھے۔

جدول نمبر ۲

دوران جنگ برطانیہ کے اخراجات اور محاصل

۱۶۸۸ء - ۱۸۱۵ء

(پونڈ)

سال	مجموعی اخراجات	مجموعی آمدنی	قرض سے توازن پورا کیا گیا	قرض اور فیصد اخراجات
۱۶۸۸-۱۶۹۷ء	۴۹۳۲۰۱۴۵	۳۲۷۶۶۷۵۴	۱۶۵۵۳۳۹۱	۳۳٫۶
۱۷۰۲-۱۷۱۳ء	۹۳۶۴۴۵۶۰	۶۴۲۳۹۴۷۷	۲۹۴۰۵۰۸۳	۳۱٫۴
۱۷۳۹-۱۷۴۸ء	۹۵۶۲۸۱۵۹	۶۵۹۰۳۹۶۴	۲۹۷۲۴۱۹۵	۳۱٫۱
۱۷۵۶-۱۷۶۳ء	۱۶۰۵۷۳۳۶۶	۱۰۰۵۵۵۱۲۳	۶۰۰۱۸۲۴۳	۳۷٫۴
۱۷۷۶-۱۷۸۳ء	۲۳۶۴۶۲۶۸۹	۱۴۱۹۰۲۶۲۰	۹۴۵۶۰۰۶۹	۳۹٫۹
۱۷۹۳-۱۸۱۵ء	۱۶۵۷۸۵۴۵۱۸	۱۲۱۷۵۵۶۴۳۹	۴۴۰۲۹۸۰۷۹	۲۶٫۶
کل	۲۲۹۳۳۴۳۴۳۷	۱۶۲۲۹۲۴۳۷۷	۶۷۰۵۵۹۰۶۰	۳۳٫۳

اگرچہ بہت سے برطانوی مبصرین اٹھارھویں صدی کے تمام عرصے میں بے انتہا قومی قرض اور اس کے متوقع نتائج سے لرزہ براندام رہے' لیکن بشپ برکلے کے الفاظ میں "حقیقت تو یہ تھی کہ یہی قرض ایک ایسے مفاد کا باعث تھا جس میں برطانیہ کو فرانس پر فوقیت حاصل تھی۔ مزید برآں' سرکاری اخراجات میں شدید اضافہ اور بحریہ کی لوہے' لکڑی' کپڑے اور دیگر سامان کی روز افزوں طلب نے ایک ایسا موثر ذریعہ پیدا کر دیا جس سے برطانوی صنعت کو فروغ حاصل ہوا اور ٹیکنالوجی کے فروغ اور ترقی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس طرح برطانیہ کو فرانس کے مقابلے میں مزید ایک فائدہ میسر ہوا۔

برطانیہ کے مذکورہ رویے کی ہمسری کرنے میں فرانس کے ناکام ہونے کی وجوہات معلوم کرنا اب آسان ہے۔ ابتدا ہی میں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ فرانس میں سرکاری خزانے کے انتظام و انصرام کا کوئی مناسب نظام موجود نہ تھا۔ قرون وسطیٰ سے فرانس میں شاہی خزانے کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری متعدد افراد پر تھی۔ ان میں میونسپلٹی' کلیسا' صوبائی ریاستیں اور ٹیکس لگانے والے کاشتکار ہوتے تھے۔ یہی محصول بھی وصول کرتے اور بادشاہ کی ان جاگیروں کی دیکھ بھال بھی کیا کرتے جن سے آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ اس طرح حکومت کو متوقع آمدنی کے تحت سود پر قرض مل جایا کرتا تھا۔ اس نظام کی وجہ سے انتظام و انصرام کے

ذمہ دار افراد میں ضمیر فروشی عام ہو گئی تھی۔ ان میں کاشتکار بھی شامل تھے۔ جو تمباکو اور نمک کے معاملے میں محصول وصول کرتے تھے۔ علاوہ ازیں کلیسائی وصول کنندہ' ضلعی محصل اور علاقائی محصل عام طور پر راست محصول وصول کرنے کے مجاز تھے' مثلاً "ٹیلی" ان سب پر ایک وصول شدہ رقم افسران اعلیٰ کی خدمت میں پیش کرنے سے قبل اپنا حصہ وصول کر لیتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک دفتر کے لیے ادا شدہ رقم پر ۵ فی صد سود بھی وصول کر لیتا تھا۔ بہت سے اعلیٰ افسران پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ وصول شدہ رقم سرکاری خزانے میں جمع کرانے سے پہلے حکومتی ٹھیکہ داروں کو ان کا معاوضہ ادا کر دیا کرتے یا کسی کی مزدوری بے باک کر دیتے۔ یہ لوگ خود بھی بھاری سود پر بادشاہ کو قرض دیا کرتے تھے۔

ایسا ڈھیلا ڈھالا نظام اور انگل پچو ادارہ رشوت خوری کا گڑھ تھا۔ اس نظام کے باعث زیادہ تر ٹیکس گزاروں کی رقم نجی ہاتھوں میں چلی جاتی تھی۔ جنگ کے بعد' متعدد موقعوں پر مالیات سے وابستہ لوگوں کے خلاف تحقیق ہوا کرتی تھی۔ بعض کو نقصان کی تلافی کرنے کا حکم دیا جاتا اور بعض کو سود کی شرح کم کرنے پر مجبور کیا جاتا لیکن یہ سب گورکھ دھندا تھا۔ ایک مورخ کے مطابق "سارے فساد کی جڑ وہاں موجود نظام تھا" اس بد نظمی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ۱۷۷۰ء کی دہائی میں نیکر کی اصلاحات تک قومی سطح پر حساب کتاب رکھنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ سالانہ آمدنی' اخراجات اور خسارے کا مسئلہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اگر بادشاہ جنگی اور عدالتی ضرورت کے پیش نظر ٹیکس عائد کرتا' اس وقت لوگوں کو قومی قرض کے اضافے کا احساس ہوتا' بصورت دیگر کسی کو کوئی پروا نہ تھی۔

اگرچہ شروع شروع میں برطانیہ میں بھی اسٹوارٹ سے اسی طرح کی کوتاہیاں سرزد ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اٹھارھویں صدی میں ہی برطانیہ نے سرکاری خزانے پر کنٹرول قائم رکھنے کے لیے پارلیمانی طریقہ کار وضع کر لیا تھا۔ حصول اقتدار کی جدوجہد میں اس سے خاطر خواہ فائدہ پہنچا تھا۔ یہ بات بھی کم اہمیت کی حامل نہیں کہ سرکاری اخراجات اور قومی قرض میں اضافے سے تجارت و صنعت میں سرمایہ کاری کے رجحان میں کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اور بھی زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کے برعکس فرانس میں یہ صورت حال تھی کہ حکومت ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی جو اپنا فاضل سرمایہ کاروبار میں لگانے کی بجائے دفتر خریدنے اور سالیانہ میں رقم لگایا کرتے تھے۔ فرانس میں اکثر مواقع پر قومی بینک قائم کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ قرض کا معاملہ حسن خوبی سے انجام پا سکے اور کم شرح سود پر رقم مل سکے لیکن ان لوگوں نے ایسے منصوبوں کی ہمیشہ مخالفت کی جو مروجہ نظام میں دلچسپی رکھتے تھے۔ فرانسیسی حکومت کی مالیاتی پالیسی ہمیشہ ایسی رہی کہ اسے افلاس کا شکار ہونا پڑا۔

فرانس میں تجارت کے فروغ و ارتقاء میں بھی رکاوٹیں حائل رہیں۔ مثلاً" یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہاں لاروچیل جیسی مشہور و معروف بندرگاہ بھی خسارے میں رہتی تھی لیکن اس کا موازنہ لیور پول اور گلاسکو سے کیا جاتا تھا۔ یہ تینوں اٹھارھویں صدی میں بحراوقیانوس کی بڑھتی ہوئی اقتصادیات کا استحصال کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور لاروچیل کی بندرگاہ خصوصی طور پر مغربی افریقہ اور ویسٹ انڈیز کے ساتھ مثلث نما تجارت کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ افسوس کہ ایسے تجارتی مفادات کے باوجود

فرانس کی یہ بندرگاہ حکومت کی بار بار کی تباہی سالانہ مطالبہ پورا نہ ہونے اور آمدنی کے بہتر ذرائع کی عدم دستیابی کے باعث ترقی نہیں کر سکی۔ پھر تجارت پر بھاری غیر مساوی اور جارحانہ قسم کے بالواسطہ اور بلا واسطہ ٹیکس عائد کر کے معاشی ترقی کو روک دیا گیا۔ دفتروں کی خرید و فروخت کی وجہ سے مقامی لوگ اپنا سرمایہ تجارت میں لگانے کی بجائے اس خرید و فروخت پر صرف کرنے لگے۔ ضمیر فروش قسم کے افسروں کی عائد کردہ فیس کی وجہ سے بھی اس رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ کمپنیاں بھی آزاد کار اندازی سے گریز کرنے لگیں۔ نیز بادشاہ نے اگرچہ روچیلاس والوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ ۱۷۶۰ء کے عشرے میں ایک بڑے سائز کا اسلحہ خانہ تعمیر کریں بصورت دیگر تمام محصولات ضبط کر لئے جائیں گے' لیکن جب جنگ چھڑی تو اس نے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا۔ کیونکہ حکومت فرانس نے عموماً" بحریہ کے برعکس بری فوج کی جانب توجہ دی تھی' لہٰذا برطانیہ کی اعلیٰ رائل نیوی سے مسلسل معرکہ آرائی لاروچیلی کی تباہی کا سبب بن گئی۔ اس کے تجارتی جہازوں کو چھین لیا گیا' غلاموں کی منافع بخش تجارت میں دخل اندازی کی گئی اور کینیڈا اور لوئیز سیانا میں اس کی سمندر پار منڈیوں کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہوا جبکہ بحری جہازوں کے انشورنس کی شرح ہوشربا تھی اور ایمرجنسی ٹیکس بھی نافذ کئے گئے تھے۔ اس صورت حال کو ایک آخری دھچکا یہ بھی لگا کہ فرانس کی حکومت نے اپنی سمندر پار نوآبادیوں کو اجازت دے دی کہ وہ دوران جنگ غیر جانبدار جہازوں سے لین دین کر لیا کریں۔ لیکن اس چیز سے منڈیوں کو صلح ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو بحال کرنے یا دوبارہ منوانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کے برعکس' بحراوقیانوس کے علاقے میں برطانوی اقتصادیات اٹھارھویں صدی کے تمام عرصے میں فروغ پاتی رہی۔ اور اگر حکومت کی پالیسی کے نتیجے میں دوران جنگ کوئی فائدہ حاصل ہوا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ منافع اور طاقت' تجارت اور سلطنت باہم لازم و ملزوم ہیں اور انہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

فرانس کی مالی کمزوریوں کا نہایت خراب نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دوران جنگ اس کی بری اور بحری فوج کی ہر کوشش غت ربود ہو جاتی اس کے متعدد اسباب تھے۔ غیر موثر اور ناقص طریق کار کی وجہ سے بحریہ کے ذخیرے کی ترسیل نہیں ہو پاتی تھی لیکن اس کے باوجود ٹھیکہ دار اپنا حصہ زیادہ سے زیادہ وصول کر لیا کرتے تھے۔ حالانکہ برطانوی اور ولندیزی بحریہ میں ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ دوران جنگ زیادہ سے زیادہ نقد حاصل کرنا فرانسیسی سلطنت کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ بنا رہتا' خصوصاً" ۱۷۷۰ء اور ۱۷۸۰ء کے عشرے میں جب اس نے ولندیزی حکومت سے بے شمار رقم وصول کی۔ فرانس کی باز قدر اندازی' تردید قرض اور قلیل المعیاد اور طویل المعیاد ہنڈی رکھنے والوں کے خلاف جارحانہ اقدام کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ان عوامل نے وہاں کے بنکوں کو سود کی شرح میں حد سے زیادہ اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا جو برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں مروج نہ تھا۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ فرانس کی زبوں حال حکومت اس بات پر راضی بھی ہو جاتی۔☆ اس رضامندی کے باوجود بوربون بادشاہ سرمایہ کو تحفظ فراہم نہ کر سکے جو دوران جنگ فوجی طاقت کی بحالی کے لیے لازمی تھا۔

☆ لوئس چہارم کے عہد میں فرانس اس قابل تھا کہ وہ اسٹوارٹ یا ولیم سوم کے مقابلے میں ادنیٰ شرح سود پر قرض لیا کرتا۔

فرانس کی ان کمزوریوں کا واضح اظہار امریکہ کی انقلابی جنگ سے ذرا پہلے ہوا۔ یہ جنگ برطانیہ کو بڑی مہنگی پڑی تھی۔ اس جنگ کے باعث اس کی سب سے بڑی نو آبادی اس کے ہاتھ سے جاتی رہی اور حکومتی قرضہ ۲۲۰ ملین پونڈ تک پہنچ گیا۔ لیکن چونکہ یہ رقم محض ۳ فی صد سود پر حاصل کی گئی تھی۔ لہٰذا اس طرح اسے صرف ۷،۳۳ ملین پونڈ ہی اضافی ادا کرنے پڑے۔ اس جنگ میں فرانس کے اخراجات "نسبتاً" کم تھے۔ کیونکہ وہ جنگ میں آخری وقت میں شامل ہوا تھا۔ اس کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس دوران نیکر بجٹ کو متوازن کرنے میں مصروف تھا علاوہ ازیں وہ اپنی فوج کو میدان جنگ میں اتارنے کے حق میں بھی نہ تھا۔ تاہم اس جنگ میں فرانس کے مصارف کم از کم ایک بلین لیور تھے۔☆ یہ ساری رقم قرض کے ذریعے حاصل کی گئی تھی لیکن اس پر سود کی شرح برطانیہ کے مقابلے میں دوگنا تھی۔ ان دونوں ممالک میں قرض سے حکومت کے سالانہ اخراجات کا نصف حصہ پورا ہوتا تھا لیکن ۱۷۸۳ء کے بعد برطانیہ نے کئی ایسے اقدامات کیے (مثلاً" ذخیرہ ادائی جو ایک طرح کا شمولہ محصول فنڈ تھا) جس سے سرکاری گوشوارہ حساب بہتر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ نوجوان پٹ کے کارناموں میں یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ اس کے برعکس فرانس میں ہر سال خاصی مقدار میں مزید قرض لیے جاتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ معمول کی آمدنی سے [illegible] کی ادائیگی تو کجا زمانہ امن کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔ نیز ہر سال مزید قرضوں کے باعث بجٹ خسارہ بڑھنے کی وجہ سے حکومت کا اعتبار بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔

سب سے زیادہ حیران کن شماریاتی نتیجہ یہ تھا کہ ۱۷۸۰ء کی آخری دہائی میں سرکاری قرض برطانیہ کے قرض کے مساوی تھا' یعنی تقریباً" ۲۱۵ ملین پونڈ۔ لیکن فرانس کے قرض پر برطانیہ کے مقابلے میں سود کی سالانہ رقم ہر سال دوگنی ہو جاتی تھی۔ اس معاملہ میں اس سے بھی بڑی خرابی یہ تھی کہ اس بحران پر قابو پانے کے لئے وزرائے مالیات نے جب بھی کوئی نیا ٹیکس عائد کرنا چاہا تو فرانسیسی عوام نے اس کی شدید مخالفت کی۔ بعد ازاں کیلون کی مجوزہ ٹیکس اصلاحات نے مجلس اکابر کی داغ بیل ڈالی اور پارلیمنٹ کے خلاف رجحان کو فروغ دیا' سرکاری خزانے سے ادائیگی کو ممنوع قرار دے دیا اور پھر (۱۶۱۴ء کے بعد پہلی مرتبہ) ۱۷۸۹ء میں قانون ساز اسمبلیوں کا انعقاد ہوا۔ اس طرح قدیم نظام حکومت کا قلع قمع ہو گیا۔ قومی دیوالیہ پن اور انقلاب کے مابین جو ربط تھا وہ بالکل واضح طور پر سامنے آ گیا۔ بعد میں آنے والے مایوس کن حالات میں حکومت نے پہلے سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں کرنسی نوٹ جاری کیے' مثلاً" ۱۷۸۹ء میں ۱۰۰ ملین لیور کی مالیت کے اور ۱۷۹۰ء میں ۲۰۰ ملین لیور کی مالیت کے نوٹ جاری کیے گئے۔ قانون ساز اسمبلی نے اس کے برعکس یہ طریقہ اپنایا کہ چرچ کی جائیدادیں قبضے میں لے لیں اور ان کی مالیت کے مساوی کاغذ کے نوٹ جاری کیے۔ اس اقدام سے افراط زر میں مزید اضافہ ہوا۔ البتہ ۱۷۹۳ء میں جب جنگ کا فیصلہ ہوا تو اس رجحان میں کمی واقع ہوئی۔ جہاں یہ امر واقعہ ہے کہ بعد ازاں مالیاتی نظام کی درستگی کے لیے ہونے والی اصلاحات اور انقلابی حکومت کے صحیح اقدامات سے باخبری کے عزم نے متحدہ افسرانہ اور مکمل قسم کی حکومتی انداز پیدا کر دیا جو برطانیہ اور دیگر ممالک کے مماثل تھا۔ وہاں اندرونی خلفشار اور بیرونی توسیع پسندی جو ۱۸۱۵ء تک برقرار رہی' نے فرانس کی اقتصادی حالت کو دشمنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خستہ و خراب کر دیا۔

موجودہ اور گزشتہ محاذ آرائیوں کے لیے حاصل کردہ قرضوں کی ادائیگی کی خاطر ٹیکس میں بے پناہ اضافے کا مسئلہ تمام حکومتوں اور ان کے کرتا دھرتاؤں کے لیے سوہان روح بنا رہا۔ حتیٰ کہ زمانہ امن میں بھی حکومت کے مجموعی اخراجات کا ۴۰ سے ۵۰ فیصد حصہ افواج کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا تھا اور جب جنگ چھڑتی تو یہ حصہ ۸۰ سے ۹۰ فی صد بڑھ جاتا تھا۔ بہرحال اندرونی طور پر کیسا ہی قانون کیوں نافذ نہ رہا

☆ پرانا فرانسیسی سکہ

ہو' یورپ کی زیادہ تر استبدادی سلطنتوں' محدود شہنشاہیتوں اور بورژوائی جمہوریتوں کو اسی قسم کی مصیبت کا سامنا رہتا تھا۔ ہر لڑائی کے بعد اور خصوصاً" ۱۷۱۳ء اور ۱۷۶۳ء کے بعد زیادہ تر ممالک بدحال ہو کر کچھ دم لینے کے خوگر نظر آتے۔ وہ اس دوران اقتصادی زبوں حالی کا ازالہ بھی کرتے اور ملک کے اندر جنگ چھڑنے اور مزید ٹیکس عائد ہونے کی وجہ سے عوام میں غم و غصے کی جو لہر اٹھتی اس سے نمٹنے کی کوشش بھی کرتے۔ لیکن یورپ کا ریاستی نظام محاذ آرائی اور انا پرستی سے عبارت تھا' لہٰذا وہاں تادیر امن قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ صلح صفائی کے بعد فوراً" مزید محاذ آرائی کی تیاری شروع ہو جاتی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فرانس' ہالینڈ اور برطانیہ جیسے امیر ترین یورپی ممالک بھی جنگ کے باعث پیدا ہونے والے مالی بحران کا سامنا بمشکل ہی کر پاتے تھے تو غریب ترین ممالک کس طرح اس کا مقابلہ کر پاتے ہوں گے؟

اس سوال کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ وہ ایسا کرنے سے قاصر تھے۔ حتیٰ کہ پروشیا کا فریڈرک اعظم بھی آسٹریا کی تخت نشینی کی جنگ اور سات سالہ لڑائی کے اخراجات پورے نہ کر سکا حالانکہ وسیع سلطنت' شادی بیاہ کے عوض ملنے والی شاہی جاگیر اور اجارہ داریوں سے اسے اچھی خاصی آمدنی حاصل ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود مالی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسے تین غیر معمولی ذرائع استعمال کرنے پڑے۔۔ یعنی سکہ کھوٹا کر کے' اپنے پڑوسی ملک سیکسونی اور میکلن برگ میں لوٹ مار کر کے اور ۱۷۵۷ء کے بعد اپنے امیر ترین اتحادی ملک برطانیہ سے اچھی خاصی مراعات حاصل کر کے ایک معمولی درجے کی غیر مرکزی سلطنت ہیبسبرگ کے لیے جنگ کے اخراجات برداشت کرنا نہایت گمبھیر مسئلہ تھا لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ روس یا اسپین میں اس سے بدرجہا بہتر حالت تھی۔ وہاں ٹیکس کے ذریعے رقم حاصل کرنے کے امکانات اتنے حوصلہ افزاء نہ تھے۔ ہنگری کے شرفاء اور اسپین کے مذہبی پیشوا جیسے متعدد طبقات قدیم نظام حکومت کے تحت ٹیکس سے خود کو مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں بالواسطہ ٹیکس کے نفاذ' کھوٹے سکے اور کاغذی نوٹوں کی چھپائی سے بمشکل زمانہ امن کے فوجی اور عدالتی اخراجات پورے ہوتے تھے۔ لیکن اچانک جنگ چھڑ جانے سے جہاں قومی سطح پر ہنگامی صورت حال پیدا ہو جاتی تھی وہاں انہیں مغربی یورپ کے بازار زر پر بھی بہت حد تک انحصار کرنا پڑتا تھا۔ یا پھر لندن' ایمسٹرڈم اور پیرس سے براہ راست مراعات حاصل کی جاتی تھیں جن سے کرائے کے سپاہی اور سامان جنگ کی فراہمی ممکن ہوتی۔ نشاۃ الثانیہ کے ہیرو کے لیے قومی نغمے کیسے ہی پر اثر ہوتے ہونگے لیکن زندگی کے ناقابل تردید حقائق فریڈرک اور نپولین کے زمانے میں ہنوز موجود تھے۔

تاہم یہ بات ہرگز نہیں کہی جا سکتی کہ اٹھارویں صدی کی ان جنگوں میں مالی عنصر ہی ہمیشہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں ایمسٹرڈم دنیا کا امیر ترین مرکز رہا تھا' اس کے باوجود مال و زر نے متحدہ صوبوں کو اقتدار کے سنگھاسن سے محروم ہونے سے نہیں بچایا۔ اسی طرح روس معاشی لحاظ سے ایک پس ماندہ ملک تھا اور اس کی حکومت مال و زر سے تہی داماں تھی لیکن اس کے باوجود یورپی معاملات میں اس کے اثرات رفتہ رفتہ قائم ہوتے چلے گئے اور اسے استحکام بھی حاصل ہوتا گیا۔ اس اختلاف کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ دوسرے اہم نکتہ یعنی قومی حکمت پر جغرافیہ کے اثرات پر بھی غور کیا جائے۔

ارضی سیاسیات

یورپ کی سیاست جبر کو وراثتاً" محاذ آرائی کی جو صفت ودیعت ہوئی تھی وہ اٹھارویں صدی کے تمام عرصے میں نمایاں رہی لیکن ساتھ ہی ساتھ باہمی اتحاد کی خوشگوار فضا بھی برقرار رہی' لہٰذا دشمن ریاستوں کو متنوع حالات کا سامنا رہا اور بسااوقات تقدیر بھی نت نئے رنگ دکھاتی رہی۔ عموماً" حالت یہ ہوتی کہ ان ممالک کو ایک اہم جنگ سے چھٹکارا ملتا تو دوسری سر پر سوار نظر آتی۔ پوشیدہ معاہدے اور سفارتی انقلاب نے طاقتوں کا ایک بدلتا ہوا ڈھیر لگا دیا۔ اس کے نتیجے میں یورپ کی بری اور بحری افواج کے توازن میں بارہا نشیب و فراز آتے رہے۔ اس سے جہاں ملکوں کو سفارتی تعلقات پر انحصار کرنا پڑا اور حلیف کی افواج سے استفادے کی نوبت بھی آتی وہاں ساتھ ہی ساتھ جغرافیائی حقائق کی اہمیت بھی واضح ہو گئی۔ اس اصطلاح سے مراد محض کسی ملک کی آب و ہوا' خام مال' زراعت کی زرخیزی اور تجارتی راستے ہی نہیں۔ اگرچہ ان تمام باتوں کی اہمیت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ بلکہ ان کثیرالاضلاع قسم کی جنگوں کے دوران کسی مقام کی حربی اہمیت مقصود ہوتی ہے یعنی کیا کوئی ملک اپنی تمام صلاحیتیں کسی ایک محاذ پر استعمال کرنے کا حامل تھا یا اسے مختلف محاذوں پر لڑنا پڑتا تھا۔ کیا اس کی سرحدیں کمزور ریاستوں سے ملحق ہوتی تھیں یا مضبوط ریاستوں سے ملی ہوئی ہوتی تھیں؟ کیا اسے بری فوج میں مہارت حاصل تھی یا بحری فوج میں کمال حاصل تھا یا دونوں ہی با صلاحیت تھیں اور اس سے کیا کیا فوائد اور نقصانات کا احتمال تھا؟ کیا وہ وسطی یورپ کی لڑائی سے اپنی خواہش کے مطابق علیحدگی اختیار کر سکتا تھا؟ کیا اسے سمندر پار کے علاقوں سے اضافی وسائل میسر ہو سکتے تھے؟

مذکورہ زمانے میں متحدہ صوبے سیاست پر جغرافیائی اہمیت برقرار رکھنے کی بہتر مثال تھے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں وہاں ملکی ترقی کے متعدد امکانات روشن تھے۔ یعنی معاشیات ترقی پذیر' سماجی حالت مستحکم' فوج تربیت یافتہ اور بحریہ کافی مضبوط تھی اور یہ سب کچھ جغرافیائی لحاظ سے بہت سود مند تھا۔ ان صوبوں میں دریاؤں کا جال بچھا ہوا تھا جو کسی نہ کسی حد تک ہسپانوی افواج کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھا۔ شمالی سمندر پر قبضے کی وجہ سے ہیرنگ مچھلیوں کا شکار ان کی دسترس میں تھا لیکن ایک صدی بعد' ولندیزی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ انگلستان کے کرومویل اور فرانس کے کولبرٹ نے کچھ اس نوعیت کی تجارتی پالیسیاں وضع کی تھیں۔ جن سے ہالینڈ کی تجارت اور جہاز رانی کو نقصان پہنچا تھا۔ ٹرومپ اور ڈی رویٹر جیسے ذہین کمانڈروں کی حکمت عملی کے باوجود ولندیزی تاجروں کو برطانیہ سے بحری جنگ کے دوران سزا کے طور پر چینل کا راستہ اختیار کرنا پڑتا یا پھر اسکاٹ لینڈ کی طویل اور طوفانی راہ طے کرنی پڑتی تھی۔ شمالی سمندر میں ان کے ہیرنگ مچھلیوں کے شکار کی طرح اس راستے پر بھی حملے

کے خطرات موجود تھے۔ مغربی سمت سے چلنے والی ہوا انگریز کپتانوں کے لیے مفید ثابت ہوتی تھی۔ پھر ہالینڈ کے سمندر کے اتھلے پانیوں نے بار برداری میں بھی رکاوٹ پیدا کی۔ نتیجتاً" ہالینڈ کی جنگ پر اس کے برے اثرات مرتب ہوئے۔ جس طرح امریکہ اور ہند اقصیٰ کے ساتھ اس کی تجارت برطانوی بحری طاقت کی زد میں آ گئی' ٹھیک اسی طرح بحر بالٹک میں اس کی ہونے والی تجارت جس پر اس کی خوشحالی کا انحصار تھا' سویڈن اور دوسرے دشمنوں کے ہاتھوں غارت ہو گئی۔ اگرچہ ولندیزیوں نے خطرناک محاذوں پر بڑے بڑے جنگی بیڑے روانہ کر کے عارضی طور پر خود کو سنبھال تو لیا' لیکن وہ دور دراز علاقوں میں موجود اپنے مفاد کا مستقل طور پر تحفظ نہ کر سکے۔

جب ۱۶۶۰ء کی آخری دہائی میں ولندیزیوں کو اپنی کمزوریوں کے باعث فرانس کے لوئیس چہارم سے خطرہ درپیش ہوا تو صورت حال مزید ابتر ہو گئی۔ چونکہ یہ خطرہ ایک صدی پیشتر ہسپانوی خطرے سے کہیں زیادہ گمبھیر تھا' لہٰذا ولندیزیوں نے اپنی فوج میں خاصا اضافہ کیا (یعنی ۱۶۹۳ء کے آغاز میں یہ ۹۳ ہزار نفری پر مشتمل تھی) اور اپنی جنوبی سرحدوں پر چوکیاں بنانے اور قلعہ تعمیر کرنے میں زیادہ سے زیادہ وسائل صرف کیے۔ ہالینڈ کی ان کاروائیوں کے دو پہلو تھے۔ اول تو اس نے فوجی ضروریات میں اچھی خاصی رقم صرف کی اس کے لئے جنگی قرضوں کا سلسلہ شروع کیا گیا اور ادئیگی پر سود عائد کیا گیا' محصول آبکاری میں اضافہ کیا گیا اور زیادہ سے زیادہ اجرت ادا کی گئی۔ اس طرح طویل المعیاد قسم کی تجارت میں مقابلہ آرائی کا رجحان کم تر ہو گیا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دوران جنگ دو ملین کی آبادی کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا اور اس تمام عرصے میں یہ آبادی سکونی دباؤ کا شکار رہی۔ مزید افتاد یہ ہوئی کہ ہسپانوی تخت نشینی کی خون ریز جنگ (۱۷۰۲ تا ۱۷۱۳ء) کے دوران مارلبورو کی خواہش کے مطابق برطانیہ اور ہالینڈ کی افواج فرانس کے خلاف صف آراء ہو گئیں اور اس طرح انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

ولیم سوم نے ۱۶۸۹ء میں انگریزی اتحاد کو مضبوط کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ جہاں ایک طرف متحدہ صوبوں کو تحفظ فراہم کر رہی تھی وہاں دوسری جانب ان کے آزاد اور بڑی طاقت ہونے کی حیثیت کو روبہ زوال بھی بنا رہی تھی۔ اس کی مثال ایسی ہی تھی جیسے ٹھیک دو سو سال بعد ادھار پٹہ قانون کے تحت امریکہ اور اس کے اتحادیوں میں قائم تعلقات جہاں برطانوی سلطنت کو جو مارلبورو کے دور کے رشتہ دار ونسٹن چرچل کی ماتحتی میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی' امداد بھی فراہم کر رہے تھے اور اسے نقصان پہنچانے کی سازش بھی کر رہے تھے۔ ۱۶۸۸ء اور ۱۷۴۸ء کے دوران ہالینڈ نے فرانس کے خلاف جو متعدد محاذ آرائیاں کیں ان میں اسے وسائل کی کمی کا شدت سے سامنا کرنا پڑا۔ نتیجتاً" اس ملک کو اپنے دفاعی اخراجات کا تین چوتھائی حصہ بری فوج پر صرف کرنا پڑا۔ اس طرح بحریہ کو نظرانداز کر دینا پڑا۔ اس کے برعکس برطانیہ نے بحری طاقت کو بھی بحال رکھا اور نو آبادیات کی تسخیر کی مہم بھی جاری رکھی اور پھر دونوں سے مفادات بھی حاصل کئے۔ گویا اس طرح جہاں لندن اور برسٹل کے تاجر پھلتے پھولتے رہے وہاں ایمسٹرڈم کا کاروباری طبقہ نقصان اٹھاتا رہا۔ اس میں مزید شدت اس وقت پیدا ہوئی جب جنگ کے دنوں میں برطانیہ فرانس کے ساتھ تجارتی تعلقات منقطع کر دیتا جبکہ ہالینڈ ایسے سودمند تعلقات کو برقرار رکھنے کا خواہشمند نظر آتا تھا۔ اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اس تمام عرصے میں متحدہ صوبے بیرونی تجارت اور غیر ملکی مالی امداد پر کس درجہ بھروسہ رکھتے تھے جبکہ برطانیہ کی معاشی حالت ان کے مقابلے میں کہیں بہتر اور اپنی ضروریات کے لیے کافی تھی۔ حتیٰ کہ جب سات سالہ جنگ کا آغاز ہوا تو متحدہ صوبے غیر جانبدار بن گئے۔ وہ شاہی بحریہ کے قیام

سے کم ہی فائدہ اٹھا سکے۔ انہوں نے آزاد بحری جہاز اور آزاد سازوسامان کے نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ فرانس بیرون ملک ہونے والی تجارت آزادانہ طور پر انجام نہ پا سکے۔ ۹-۱۷۵۸ء میں اسی مسئلے پر انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان سفارتی سطح پر جو ناچاقی پیدا ہوئی وہ امریکی انقلاب کی جنگ کے ابتدائی سالوں میں پھر عود کر آئی۔ پھر ۱۷۸۰ء کے بعد اس کی وجہ سے کھلی جارحیت کا منظر بھی سامنے آگیا۔ اس سے نہ تو برطانیہ اور نہ ہی متحدہ صوبوں کی سمندری تجارت کو کوئی فائدہ پہنچا۔ انقلاب فرانس اور نپولین کی جدوجہد کے زمانے میں ولندیزی' برطانیہ اور فرانس کے درمیان پس رہے تھے وہ قرضوں کے بھاری بوجھ سے دبتے چلے جا رہے تھے' اندرون ملک بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اور یہ عالمی مقابلے کے نتیجے میں اپنی نو آبادیاں بھی کھوتے جانے کے ساتھ ساتھ سمندر پار کی تجارت سے بھی محروم ہو رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ بدلتے ہوئے عالمی ماحول سے ولندیزی نہ تو فرار حاصل کر سکتے تھے اور نہ ہی اس سے استفادہ کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ ایسی صورت حال میں نہ تو مالیاتی امور پر دسترس کام آتی ہے نہ ہی "فاضل سرمایہ" پر انحصار ہی کافی ہوتا ہے۔

کچھ اسی انداز میں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرانس کو بھی اٹھارھویں صدی میں دوغلی طاقت ہونے کی حیثیت سے نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی جملہ صلاحیتیں ایک طرف تو براعظمی مقاصد کے حصول میں صرف ہو رہی تھیں جبکہ دوسری جانب بحری برتری حاصل کرنے اور نوآبادی قائم رکھنے کے لیے وقف تھیں۔ لوئیس چہارم کے ابتدائی عہد حکومت میں اس قسم کی دوگرنگی کی صورت مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔ فرانس کی طاقت کا انحصار انہی ملکی مصنوعات پر تھا۔ اس کے وسیع اور ایک جیسے علاقے' زراعت میں خود کفالتی اور اس کی بیس ملین کی آبادی نے لوئیس چہارم کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی فوج میں اضافہ کرے۔ چنانچہ ۱۶۵۹ء میں فوج کی جو تعداد ۳۰۰۰۰ تھی اسے ۱۶۶۶ء میں بڑھا کر ۹۷۰۰۰ ہزار کر دیا گیا اور پھر ۱۷۱۰ء میں اسے مجموعی طور پر ۳۵۰۰۰۰ تک پہنچا دیا گیا۔ بادشاہ سن کی خارجہ پالیسی کے مقاصد بھی ملک ہی سے تعلق رکھتے تھے اور روایتی قسم کے تھے' یعنی ہیبسرگ خاندان کے اقتدار کا مزید خاتمہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسے جنوب میں اسپین کے خلاف پیش قدمی کر کے مشرق اور شمال میں ہسپانوی۔ ہیبسرگ اور جرمنی کے کمزور علاقوں لورین' السیک' لکسمبرگ اور جنوبی نیدر لینڈ پر دھاوا بولنا تھا۔ اسپین کے تھونس جانے' ترکوں سے خطرے کے باعث آسٹریا کے پست ہمت ہو جانے اور انگلستان کے پہلے غیر جانب دار رہنے' پھر دوست بن جانے کی وجہ سے لوئیس کو دو عشروں تک سفارتی سطح پر کامیابی حاصل رہی۔ بعد ازاں فرانسیسی مطالبات کے زعم نے دوسری طاقتوں کو متنبہ کر دیا۔

حربی نقطہ نظر سے فرانس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اگرچہ دفاعی طور پر مضبوط تھا لیکن فتح و نصرت کی مہم کے آغاز کا بہتر طور پر متحمل نہ تھا۔ ہر سمت میں اسے مصائب کا سامنا تھا۔ کہیں جغرافیائی قدغنیں تھیں تو کہیں متعدد بڑی طاقتوں کے مطالبات' دعوے اور دلچسپیاں سد راہ تھیں۔ مثلاً" جنوب کی جانب سے ہیبسرگ کے مقبوضہ نیدر لینڈ پر حملہ کرنے کے معنی ایک ایسے علاقے کے خلاف مہم جوئی تھی جو قلعہ بندی اور آبی راستے سے گھرا ہوا تھا' پھر اس حملے سے ہیبسرگ کی طاقتیں ہی مشتعل نہیں ہو جاتیں بلکہ متحدہ صوبے اور انگلستان بھی مزاحم ہوتے۔ جرمنی میں بھی فرانس کی فوجی کاروائی اس کے لئے مشکلات کا باعث

بن سکتی تھی۔ کیونکہ اس صورت میں سرحد آسانی سے پار کر سکنے کے باوجود مواصلاتی لائن بہت ہی طویل ہوتی۔ پھر وہاں پہنچ کر اتحادیوں سے مڈبھیر ہونا بھی ناگزیر تھا۔۔ یعنی آسٹریا' ہالینڈ' برطانیہ (خصوصاً ۱۷۱۴ء کے بعد ہونوویرین کی جانشینی کی وجہ سے) اور پروشیا وغیرہ! جب اٹھارھویں صدی کے وسط میں فرانس' جرمنی کے کسی نہ کسی مضبوط ساتھی یعنی آسٹریا یا پروشیا میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ ملانے کا آرزومند تھا۔ ایسے اتحاد کا متوقع نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری جرمن دوست طاقت فرانس کی مخالف ہو گئی اور اس نے برطانیہ اور روس کی حمایت حاصل کر کے فرانس کے اس منصوبے کو ناکام بنا دینا چاہا۔

مزید برآں سمندری طاقتوں کے خلاف ہونے والی ہر جنگ فرانس کی توانائی اور توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتی اور اس طرح زمینی جنگ میں کامیابی کے امکانات مدھم پڑ جاتے۔ فرانس ایک طرف تو فلینڈر' جرمنی اور شمالی اٹلی سے معرکہ آرا رہتا تو دوسری جانب چینل' ویسٹ انڈیز' لوئر کینیڈا اور بحر ہند میں محاذ آرائی میں مصروف دکھائی دیتا تھا۔ اس طرح وہاں کی جنگی حکمت عملی دبدبے کا شکار رہتی۔ اگرچہ فرانس کی حکومت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ رائل نیوی کو چیلنج کرنے کے قابل بنانے کے لئے بحریہ کو مالی وسائل مہیا کیے جائیں' لیکن بعد میں آنے والی حکومتوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے بحریہ کے لیے معقول رقم مختص کی۔ اگر فرانس سراسر ایک زمینی طاقت کا درجہ رکھتا تو یہی رقم بری فوج کے استحکام میں صرف ہوتی۔ البتہ ۱۷۷۸ء --- ۱۷۸۳ء کی جنگ میں فرانس نے امریکی باغیوں کی حمایت کی لیکن جرمنی کی جانب پیش قدمی سے گریز کیا۔ اس دوران فرانس نے اپنے برطانوی دشمن کو بھی زک پہنچائی۔ اپنی دیگر جنگوں میں بھی فرانس نے کبھی فوجی حکمت عملی اپنانے کی جانب توجہ نہیں دی۔ اس کے نتیجے میں اسے نقصان اٹھانا پڑا۔

مختصراً" یہ کہ قدیم نظام حکومت پر مبنی فرانس اپنے معدود اربعہ' آبادی اور دولت کی بدولت یورپ کے ممالک میں نہایت ممتاز اور اعلیٰ حیثیت کا حامل رہا تھا لیکن سپرپاور بننے کی اس میں چنداں اہلیت نہ تھی۔ نیز زمینی صورت حال اور سمندری رکاوٹوں کے باعث وہ اپنے دشمن اتحادیوں کے خلاف خواہش کے باوجود صف آرا نہ ہو سکا۔ الغرض' فرانس کے اقدامات سے یورپ میں طاقتوں کی کثرت میں رخنہ تو نہیں پڑا البتہ اس میں استحکام ضرور پیدا ہوا۔ ہاں جب انقلاب کے نتیجے میں اس کی صلاحیتیں بروئے کار آئیں اور نپولین نے انہیں مہمیز کیا تو تب وہ براعظم پر اپنے اثرات مرتب کرنے کے قابل ہو سکا' لیکن یہ صورت بھی محض عارضی تھی۔ فرانس کی یہ کامیابی چند روزہ تھی اور اس کی فوجی صلاحیت روس اور برطانیہ تو درکنار' جرمنی' اٹلی اور اسپین جیسے ممالک پر مستقل کنٹرول قائم کرنے میں کام نہ آ سکی۔

اگر فرانس مسلسل جارحانہ اقدامات اور صحیح رہنمائی کے فقدان کی وجہ سے حالات کو خود ہی دگرگوں نہ بناتا تو جغرافیائی حکمت عملی کا مسئلہ اس کے لیے سوہان روح نہ بنتا اور نہ ہی مختلف محاذوں پر زور آور دشمنوں سے مقابلہ کوئی اہمیت رکھتا۔ اس دور کی دو جرمن طاقتیں یعنی ہیبسرگ سلطنت اور برانڈنبرگ پروشیا بھی ایسے ہی جغرافیائی مسائل سے دوچار تھیں۔ بدترین وضع قطع کے جن علاقوں پر ہیبسرگ خاندان والوں کی حکمرانی تھی' یعنی آسٹریا' بوہیمیا' سلیسیا' موراویا' ہنگری' میلان' نیپلز' سسلی اور ۱۷۱۳ء کے بعد کا جنوبی نیدرلینڈ (دیکھئے نقشہ ۵) اور ان ملکوں کے تعلق سے دیگر طاقتوں کی جو پوزیشن تھی ان سب باتوں کا تقاضا یہ تھا کہ وراثتی اقتدار قائم رکھنے کے لیے سفارتی اور فوجی سطح پر بھیانک قسم کی شعبدہ بازی کی جائے

☆ ۱۶۸۹-۱۶۹۷ء اور ۱۷۰۲ء-۱۷۱۴ء کے دوران ہونے والی جنگوں میں فرانس نے اپنے مجموعی اخراجات کا ۱۰ فیصد بحریہ کے لیے مختص کیا تھا اور ۵۷ سے ۶۵ فی صد بری فوج کے لیے (اس کے برعکس برطانیہ نے انہی دنوں ۳۵ فیصد بحریہ کے لیے اور ۴۰ فی صد بری فوج کے لئے مختص کیا تھا۔ ۱۷۶۰ء میں فوج کے لیے مخصوص کی جانے والی رقم سے فرانسیسی بحریہ کو ایک چوتھائی حصہ ملا تھا۔ حتیٰ کہ جب اس کی آمدنی بڑھ رہی تھی تب بھی فرانس کی جغرافیائی پوزیشن اس قابل نہ تھی کہ بحریہ کو مستحکم رکھا جاتا۔

اور اس کے لیے ذہانت کے ساتھ ساتھ قسمت کی یاوری بھی درکار تھی۔

ترکوں کے خلاف لڑی جانے والی مختلف جنگوں (۱۶۶۳ء-۱۶۶۴ء' ۱۶۸۳ء - ۱۶۹۹ء' ۱۷۱۶ء-۱۷۱۸ء' ۱۷۳۷ء-۱۷۳۹ء' ۱۷۸۸ء-۱۷۹۱ء) کے دوران ہیبسرگ کی افواج عموماً" بلقان میں اپنی پوزیشن مضبوط کرتی رہیں ان مخصوص زمانوں میں روبہ زوال سلطنت عثمانیہ کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں ویانا کی جملہ صلاحیتیں بروئے کار آتی رہیں۔ جب ۱۶۸۳ء میں ترک فوج شاہ لیوپولڈ اول کے دارالسلطنت کے دروازے تک آ پہنچی تو وہ فرانس کے ساتھ غیر جانبدار رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ اسی سال لوئیس چہاردہم نے السالکا اور لکسمبرگ کے درمیان اتحاد کی تحریک چلائی تھی۔ آسٹریا کی یہ دو گرفتگی کی کیفیت نو سالہ جنگ (۱۶۸۹ء-۱۶۹۷ء) اور تخت ہسپانیہ کی جانشینی کی جنگ (۱۷۰۲ء-۱۷۱۳ء) کے موقع پر ذرا کم ہی دکھائی دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان زمانوں میں ویانا فرانس کے خلاف قائم ہونے والے عظیم اتحاد کا رکن تھا۔ اس کے باوجود اس کی یہ کیفیت مکمل طور پر زائل بھی نہیں ہوئی تھی۔ بعد ازاں اٹھارھویں صدی کی متعدد جنگوں کا پس منظر فوری اور غیر متوقع امکانات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ہیبسرگ خاندان کے یورپی مفادات کا تحفظ تھا' دوسرے پروشیا کے عروج کے پیش نظر جرمنی میں اس کے خاص خاص مفادات کی سلامتی تھی۔ جب ۱۷۴۰ء میں پروشیا نے سلیشیا کے صوبے پر قبضہ کر لیا تو ویانا اپنی خارجہ اور فوجی پالیسیاں اس طرح ترتیب دیتا کہ اس کی ایک آنکھ مسلسل برلن پر لگی رہتی۔ اس کے نتیجے میں ہیبسرگ کی سفارت کاری پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو گئی۔۔۔ "یعنی جرمنی میں پروشیا کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنا" اس مقصد کے حصول کے لیے آسٹریا کو اس بات پر آمادہ کرتا کہ وہ مغرب میں فرانس کی مدد طلب کرے اور مشرق میں روس سے مسلسل مدد حاصل کرتا رہے۔ لیکن فرانس اعتبار کے قابل نہ تھا لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ انگلستان اور آسٹریا میں باہمی اتحاد قائم کر کے ان کو قابو میں رکھا جائے' مثلاً" ۱۷۳۳ء-۱۷۳۸ء کے دوران علاوہ ازیں' ہیبسرگ کے لیے روس کا تیزی سے بڑھتا ہوا عروج بھی تشویش کا باعث بنا ہوا تھا خصوصاً" ایسی حالت میں جبکہ زار کی توسیع پسندی نے بلقان کے علاقوں پر ترکوں کے قبضے کو معرض خطر میں ڈال دیا۔ حالانکہ ویانا وہاں دانت گاڑے ہوئے تھا اور جب نپولین کی ملوکیت نے یورپ کی دیگر تمام طاقتوں کی آزادی کو چیلنج کر دیا تو اس صورت میں ہیبسرگ کی سلطنت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہا فرانس کے غلبے کا مقابلہ کرنے کے لیے اس وقت موجود کسی بھی اعلیٰ درجے کے اتحاد میں شمولیت اختیار کر لے۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں لوئیس چہاردہم کے خلاف اور اس صدی کے اختتام پر بوناپارٹ کے خلاف متحدہ طاقتوں کی جو جنگ ہوئی اس سے ہمیں آسٹریا کی کمزوری کا کم ہی اندازہ ہوتا ہے' بلکہ معاملہ برابر ہی برابر دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ۱۷۴۰ء کے بعد پروشیا کے خلاف ہونے والی طویل جنگ بالکل واضح تھی۔ اس سے یہ حقیقت مترشح ہوئی کہ اس عرصے میں ہیبسرگ کی حکومت کے زیرسایہ جو بھی فوجی' مالیاتی اور انتظامی اصلاحات روبہ عمل آئیں' ایسے وقت میں ویانا ایک چھوٹی سی جرمن ریاست کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکا جو اپنی فوجی طاقت' آمدنی کے ذرائع اور افسرشاہی کے لحاظ سے "بہتا" بہتر تھی۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ غیر جرمن طاقتیں یعنی فرانس' برطانیہ اور روس ہرگز یہ نہیں چاہتی تھیں کہ آسٹریا پروشیا سے گلو خلاصی حاصل کر لے اور پروشیا آسٹریا سے چھٹکارا پا لے۔ اگر یورپ کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو ہیبسرگ کی سلطنت اول درجے کی ایک حاشیائی طاقت بن چکی تھی۔ اس کی یہ حیثیت

۱۹۱۸ء تک برقرار رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ اسپین اور سویڈن کی طرح یہ سلطنت اس درجہ روبہ زوال نہیں ہوئی اور پولینڈ جیسی دگرگوں صورت حال سے بھی یہ بچی رہی۔ لیکن عدم مرکزیت' فرقہ وارانہ تقسیم اور اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ایسی ہر کوشش ناکام ہو گئی جو ویانا کی انتظامیہ نے اسے یورپ کی سب سے بڑی سلطنت بنانے کے ضمن میں کی تھی۔ تاہم اس کے زوال کی نشاندہی کرنے میں کچھ خدشات حائل ہیں۔ اولون ہفٹن کے خیال میں "آسٹریا کی سلطنت کی ثابت قدمی ہی دراصل اس بات کی غماز تھی کہ وہ ٹوٹ پھوٹ سے گریزاں رہی" اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس کے اندر قوتیں پنہاں تھیں۔ جب بھی تباہی آئی' اس کے ازالے کے لیے اصلاحات کا نفوذ عمل میں آیا۔ مثلاً" "ریٹا ہمسٹس" اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ حکومت کے وسائل معقول تھے لیکن یہ تلخ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ ان تک ویانا کی رسائی نہیں ہو پاتی تھی۔ سلطنت ہیبسرگ کا زوال رقم کرنے والا ہر مورخ اسے صدی قرار دیتا ہے اور کبھی بھی تو اسے فرانسیسی ملوکیت کا پورے چودہ سال (۱۷۹۳ء-۱۸۱۵ء) نہایت موثر انداز میں مقابلہ کرنے والی طاقت بھی تسلیم کرتا ہے۔

پروشیا کی صورت حال بھی جغرافیائی اور فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے آسٹریا کے مشابہ تھی۔ اگرچہ اندرونی طور پر دونوں مختلف تھے۔ اس ملک کی نہایت تیزی سے ترقی کے مدارج طے کر کے شمالی جرمنی کی ایک طاقتور سلطنت بن جانے کے اسباب سب کو معلوم ہیں۔ یہاں صرف ان کا اجمالی تذکرہ ضروری ہو گا۔ تین لیڈروں الیکٹر اعظم (۱۶۴۰ء-۱۶۸۸ء)' فریڈرک ولیم اول (۱۷۱۳ء-۱۷۴۰ء) اور فریڈرک اعظم (۱۷۴۰ء-۱۷۸۶ء) کی تنظیمی اور فوجی صلاحیتیں' پروشیا کی موثر فوج جس پر سرکاری سلطنت اور تجارت و صنعت کے فروغ پر تھا' بیرونی سپاہیوں اور پیداکاروں سے استفادے کا رجحان اور پروشیا کی مشہور زمانہ افسر شاہی! یہ وہ اسباب تھے جن کی بدولت شمالی جرمنی نے عروج و استحکام حاصل کیا تھا۔ تاہم یہ بات بھی صحیح تھی کہ پروشیا کے عروج کے کئی متعلقہ اسباب بھی تھے۔ مثلاً" سویڈن کی طاقت کا زوال' پولینڈ کی کمزور حکومت کی ٹوٹ پھوٹ اور اٹھارھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ویانا پر بہت سی جنگوں کا تسلط اور ہیبسرگ سلطنت کی بے یقینی کیفیت کے اثرات! اگر پروشیا کے بادشاہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں مواقع فائدہ اٹھانے کے لیے موجود بھی تھے۔ علاوہ ازیں ۱۷۷۰ء کے بعد شمال وسطی یورپ میں طاقت کا جو خلا پیدا ہوا تھا' اس سے پروشیا کی حکومت نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ روس کا عروج سویڈن' پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کے زوال کا سبب بنتا جا رہا تھا اور پھر فرانس مغرب میں اتنی دوری پر واقع تھا کہ اس سے کوئی تخریبی خطرہ لاحق نہیں تھا بلکہ وہ تو بسااوقات آسٹریا کے خلاف قائم ہونے والے اتحاد کا ایک مفید رکن ثابت ہوتا تھا۔ اگر فرانس جارحانہ طور پر جرمنی میں داخل ہو جاتا تو اسے ہیبسرگ افواج' ہنوور' برطانیہ' ہالینڈ اور پروشیا کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا اور اگر یہ اتحاد ناکام ثابت ہوتا تو اس صورت میں پروشیا دوسرے ممالک کے برعکس پیرس سے باآسانی صلح کی بات چیت کر سکتا تھا' لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا۔

مذکورہ کارآمد سفارتی اور جغرافیائی تناظر میں پروشیا کے اولین بادشاہوں نے نہایت بہتر طریقے سے سفارتی کھیل کھیلا تھا۔ سلیسیا جو بعض لوگوں کے خیال میں مشرق کا ایک صنعتی علاقہ تھا' اس پر قبضے سے اس ملک (پروشیا) کی فوجی اور اقتصادی صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن اپنے محدود سائز اور آبادی کے باعث یورپ کے معاملات میں پروشیا کی جو حیثیت تھی وہ سات سالہ جنگ (۱۷۵۶ء-۱۷۶۳ء) کے دوران مکمل طور پر طشت ازبام ہو گئی۔ اس وقت سفارتی حالات پہلے کی طرح سازگار بھی نہیں رہے تھے۔

دوسرے، فریڈرک اعظم کے طاقتور پڑوسی ممالک اسے اس کی بجروی کی سزا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس وقت پروشیا کے فرماں روا فریڈرک کی ذاتی کوششوں اور اس کی تجربہ کار فوجوں نے ایسے ہوشربا حالات میں اسے شکست سے دوچار ہونے سے بچا لیا۔ تاہم جنگ میں اچھا خاصا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ پھر ۱۷۷۰ء کے عشرے کے بعد پروشیا کی فوج جس طرح پیش قدمی کر رہی تھی، اس کے نتیجے میں برلن روس کے سفارتی دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکا تاآنکہ ۱۸۰۶ء میں نپولین کا نہایت جارحانہ حملہ وقوع پذیر ہوا۔ بعد میں شارن ہورسٹ' نیزی نو اور دیگر فوجی مصلح افراد۔۔۔ پروشیا کی اس کمزوری کو نہ چھپا سکے جو ۱۸۱۳ء اور ۱۸۱۵ء کے دوران سامنے آگئی تھی۔ اس وقت اس ملک پر روس کا فوجی دباؤ سایہ فگن تھا۔ ایسے میں پروشیا اپنے اتحادی اجرت گزار برطانیہ کی مالی اعانت پر زندہ تھا۔ اس حالت میں بھی اس نے فرانس کا دست تعاون حاصل نہیں کیا تھا۔ فریڈرک ولیم سوئم (۱۷۹۷ء۔۱۸۴۰ء) کی حکومت آسٹریا کی طرح بڑی طاقتوں میں کم تر حیثیت رکھتی تھی اور اس کی یہ حالت ۱۸۶۰ء کی دہائی تک رہی تاآنکہ اس کے یہاں صنعتی اور فوجی اصلاحات سے حالات تبدیل ہوئے۔

ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر واقع دو اہم طاقتیں روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تھیں۔ اٹھارھویں صدی میں حربی حکمت عملی کی دو گرفتگی کی کیفیت نے مرکزی یورپ کی ریاستوں کو جس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس سے یہ دونوں نسبتاً" محفوظ اور آزاد تھیں۔ مستقبل کی یہ دونوں عظیم طاقتیں بلا شبہ ناہموار اور پیچیدہ سرحدوں کی مالک تھیں جن کی نگرانی کی ضرورت تھی لیکن نہ تو ایلیگھینی اور عظیم میدانی علاقوں سے ماورا امریکہ کی توسیع پسندی کو اور نہ ہی دشت و بیاباں سے پرے روس کے توسیعی عزائم کو ایسے ممالک کا سامان کرنا پڑا جو فوجی لحاظ سے مستحکم تھے اور جن سے کسی قسم کا خطرہ درپیش ہو سکتا تھا۔ مغربی یورپ سے نمٹنے کے لیے ان دونوں کو ایک جیسے محاذ کا سامنا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی یورپ کے جنگی علاقے سے دور رہ کر وہاں کی کسی نہ کسی بڑی طاقت کو چیلنج کر سکتا تھا۔

۱۶۶۰ء سے ۱۸۱۵ء تک کے طویل عرصے کا جائزہ لینے پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہو گا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس اس دور کے آغاز میں تو نہیں البتہ اختتام میں اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے نمایاں ہو گئے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۶۶۰ء اور ۱۶۷۰ء کی دہائیوں میں یورپی امریکہ سب سے الگ تھلگ ساحلی آبادیوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ حتیٰ کہ مسکووی بھی پیٹر اعظم کے عہد حکومت (۱۶۸۹ء۔۱۷۲۵ء) سے قبل دور دراز واقع ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ تجارتی لحاظ سے دونوں غیر ترقی یافتہ تھے۔ وہاں محض تمباکو، پٹ سن اور دیگر خام اشیاء ہی پیدا ہوتی تھیں۔ وہ مصنوعات برطانیہ اور متحدہ صوبوں سے خریدا کرتے تھے۔ اس تمام عرصے میں امریکی براعظم کی حیثیت ایک ایسے علاقے کی تھی جس پر قابض ہونے کے لیے سب آپس میں لڑا کرتے تھے۔ اس وقت اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہاں جو تبدیلی رونما ہوئی وہ دراصل سات سالہ جنگ کے خاتمے (۱۷۶۳ء) پر برطانیہ کی عظیم الشان کامیابی تھی کیونکہ اسی زمانے میں فرانس، کینیڈا اور نووا اسکوشیا سے بے دخل ہو گیا اور اسپین ویسٹ فلوریڈا سے نکال دیا گیا۔ بیرونی خطرات سے آزاد ہونے اور ویسٹ منسٹر کی ماتحتی سے نجات پانے کے بعد امریکی نو آباد کار برطانیہ سے محض رسمی تعلق برقرار رکھے ہوئے تھے اور اگر شاہی حکومت اس ضمن میں سختی برتتی تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے۔ ۱۷۷۶ء کے لگ بھگ شمالی امریکہ کی کالونیاں بے اندازہ پھیل چکی تھیں۔ اس وقت وہاں کی آبادی دو ملین تھی جو ہر تیس سال کے بعد دوگنی ہو جاتی۔ لوگ مغربی سمت میں آباد ہو رہے تھے۔ اقتصادی حالت بہتر تھی کھانے پینے اور دیگر ضروری

اشیاء وافر مقدار میں موجود تھیں۔ برطانیہ نے اگلے سات سال میں یہ حقیقت محسوس کر لی کہ ان باغی ریاستوں کو محض بحری فوج سے قابو میں نہیں لایا جس سکتا اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ تین ہزار میل دور ایک جزیرے سے بری فوج لے جا کر اس بے اندازہ پھیلے ہوئے علاقے پر کنٹرول قائم کیا جائے۔

آزاد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا قیام اس عالمی طاقت کے بدلتے ہوئے نظام کے لیے دو نتائج کا سبب بن سکتا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ۱۷۸۳ء کے بعد آنے والے زمانے میں یورپ کے سوا دولت اور فوجی قوت کا ایک اور اہم مرکز بھی موجود تھا جو چین اور ہندوستان جیسے غیر یورپی اور اقتصادی طور پر زوال پذیر معاشرے کے برعکس عالمی طاقت کے توازن پر اپنے طویل المعیاد اثرات مرتسم کر سکتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں امریکی نو آبادیوں نے بحری تجارت میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور صنعت سازی میں وہ ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھیں۔ بعض دستاویزات کے مطابق اس ابھرتے ہوئے ملک نے ۱۷۷۶ء میں جملہ جزائر برطانیہ سے کہیں زیادہ مقدار میں لوہے کے ڈلے اور سلاخیں تیار کیں۔ بعد ازاں صنعتی پیداوار میں ۵۰ فی صد کے حساب سے اضافہ کیا، یہاں تک کہ ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ یہ ملک صنعتی لحاظ سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں چھٹے نمبر پر شمار ہونے لگا۔ ترقی کی اس رفتار کے پیش نظر یہ بات عجوبہ نہ تھی کہ ۱۷۹۰ء کے عشرے میں ہی بعض مبصرین یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ اگلی صدی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک اہم کردار انجام دے گا۔۔۔۔ دوسرے نتیجے کو نہایت سرعت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ خصوصاً" برطانیہ نے تو اسے کچھ زیادہ ہی محسوس کیا، اس لئے کہ یورپی سیاست میں اس کی "یک طرفہ طاقت" ایک جارح ریاست نے گہنا دی تھی اور وہ بھی اس کے اپنے بحراوقیانوس کے سامنے! نیز وہ برطانیہ کی کینیڈا اور مغربی ہند کی مقبوضات کے لیے بھی خطرے کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ کوئی دائمی مسئلہ نہیں تھا۔ پھر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا اچھا خاصا فاصلہ اور الگ تھلگ حیثیت لندن کو یہ باور کرا رہی تھی کہ اسے امریکیوں کو ایسی تشویشناک نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے جیسا ویانا نے پہلے ترکوں کو اور پھر روسیوں کو دیکھا تھا۔ تاہم ۸۳-۱۷۷۹ء اور ۱۴-۱۸۱۲ء کی محاذ آرائیوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ یورپ کی باہمی لڑائیوں میں برطانیہ کا بھرپور انداز میں شرکت کرنا اس لیے مشکل ہو گیا تھا کہ جارحیت پسند ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس کی پشت پر کھڑا تھا۔

زار روس کے عروج سے بھی بین الاقوامی طاقت کے توازن پر بہت زیادہ اثرات مرتب ہوئے۔ جب روس نے ۱۷۰۹ء میں سویڈن کو بری طرح شکست دے دی تو اُس سے دوسری طاقتیں ہوشیار ہو گئیں۔ انھوں نے یہ باور کر لیا کہ اب تک دور دراز واقع ایک وحشی ریاست یورپ کے معاملات میں دخل اندازی پر تلی ہوئی ہے۔ زار اول، پیٹر اعظم نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ ایک بحریہ تیار کی تاکہ وہ بالٹک کے علاقے (کریلیا، اسٹونیا، لیوونیا) پر اپنے قدم جما سکے تو سویڈن نے فوراً" ہی برطانیہ کی شاہی بحریہ کی امداد طلب کی تاکہ مشرق کے اس عفریت کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچ جائے لیکن حقیقت یہ تھی کہ روس کے عروج سے سب سے زیادہ نقصان پولینڈ اور ترکوں کو اٹھانا پڑا۔ جب ۱۷۹۶ء میں کیتھرین کا انتقال ہوا، اس وقت تک وہ اپنی وسیع سلطنت میں ۲۰۰۰۰۰ لاکھ مربع میل کا اضافہ کر چکی تھی۔ اسی دوران روس کی بری فوج نے جو حملہ مغرب پر کیا تھا، وہ اگرچہ عارضی تھا لیکن اس کے اثرات گہرے تھے۔ روسی لشکر نے سات سالہ جنگ کے دوران، اور پھر ۱۷۶۰ء میں برلن پر عارضی قبضے کے وقت جس بربریت اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا، اس کو دیکھتے ہوئے فریڈرک اعظم کا اپنے پڑوسی ملک کے متعلق پہلے سے قائم نظریہ بالکل تبدیل ہو گیا۔

چار دہائیوں کے بعد دوسری اتحادی جنگ (۱۷۹۸ء۔۱۸۰۲ء) کے دوران روسی افواج جرنیل سرود روف کی سرکردگی میں اٹلی اور آلپائن کے علاقے میں سرگرم عمل تھیں۔ یہ ایک دور دراز کی مہم تھی اور اس امر کی نقیب بھی کہ بے قرار روسی ماسکو سے پیرس تک پیش قدمی کریں گے۔ اور یہ صورت حال ۱۸۱۲ء۔۱۸۱۴ء کے دوران روبہ عمل آ بھی گئی تھی۔

اٹھارھویں صدی میں روس کی سرحدوں کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنا مشکل تھا۔ ویسے اس کی فوج فرانس کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ پارچہ جات اور فولاد جیسی مصنوعات میں بھی یہ خاصی ترقی کر رہا تھا۔ یہ اپنے کسی بھی مخالف قوت کے لیے ناقابل تسخیر تھا۔۔۔ خصوصاً" مغربی سمت سے! پھر "بارودی سلطنت" کی حیثیت سے اس نے مشرق کے گھڑ سوار قبائل کو شکست فاش دے دی۔ اس طرح اسے انسانی وسائل' زرعی زمینیں اور خام اشیاء بڑی وافر مقدار میں حاصل ہو گئیں۔ نتیجتاً" بڑی طاقتوں میں ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا۔ حکومتی منصوبوں کے تحت یہ ملک مختلف انداز میں جدیدیت کو اپنا رہا تھا۔ ویسے اس پالیسی پر عمل درآمد کی رفتار اور کامیابی اکثر و بیشتر مبالغہ آمیز رہی ہے۔ اس لیے کہ وہاں پس ماندگی کی متنوع علامتیں موجود تھیں۔ مثلاً" غربت' ظلم و جبریت' فی کس آمدنی کی نہایت ادنیٰ شرح' مواصلاتی نظام کی زبوں حالی' ناقابل برداشت آب و ہوا اور تکنیکی و تعلیمی ترقی میں حائل رکاوٹیں! پھر بہت سے کاہل قسم کے روسنوف افراد کا ردعمل اس پر مستزاد ہے۔ ویسے اس ملک کی اقتصادی اور مالیاتی صورتحال کے سامنے بارعب کیتھرین بھی بے اثر تھی۔

اٹھارھویں صدی میں یورپ کو فوجی لحاظ سے جو تنظیمی اور تکنیکی صلاحیت حاصل تھی' اس سے روس نے فائدہ اٹھایا۔ وہاں سے ماہرین منگوا کر اس نے اپنی فوجی صلاحیت کو افزوں کیا۔ بعد ازاں کم وسائل والے ملکوں کو مات کر دیا اور یہ صورت حال اس وقت تک قائم رہی جب صنعتی انقلاب کے نتیجے میں آنے والی صدی میں جنگ کے طریق کار بالکل تبدیل نہ ہو گئے۔ ۱۸۴۰ء کی دہائی سے قبل' مذکورہ نقائص کے باوجود روسی فوج نہایت طاقتور اور جارح نظر آتی تھی۔ حکومت کی آمدنی کا وافر حصہ (شاید تین چوتھائی) فوج کے لئے وقف تھا۔ نیز ہر اوسط سپاہی جان جوکھم میں ڈالنے کا اس قدر عادی تھا کہ روس کا فوجی دستہ دور دراز کے علاقوں کی مہم میں بھی دندناتا ہوا بڑھ جاتا۔ یہ خصوصیت اٹھارھویں صدی کی دیگر افواج میں مفقود تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ روسی فوج کی نقل و حرکت اور قیام وغیرہ کا بندوبست اکثر و بیشتر ناکافی ہوتا تھا' مثلاً" کمزور قسم کے گھوڑے رسد کا ناقص نظام اور نااہل فوجی افسران! اس طرح یہ ملک اپنے طور پر وسیع مہم جوئی برقرار رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔۔۔ ۱۸۱۳ء۔۱۴ء میں اس کو فرانس پر چڑھائی کرنے کے لئے دوست ملک کے علاقے سے گزرنا پڑا اور برطانیہ کی کثیر مالی اعانت اس کی زاد راہ بنی! یہ خال خال مہم جوئی روس کو ایک طاقتور ملک کی حیثیت سے شہرت دینے کے لیے کافی تھی۔ نیز اس جنگ/مہم جوئی سے سات سالہ جنگ کے موقع پر یورپی ممالک میں اس ملک کو نمایاں مقام بھی حاصل ہو گیا۔ اعلیٰ درجے کی فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یہاں ایک ایسی طاقت موجود تھی جو توازن برقرار رکھ سکتی تھی اور اس امر کی یقین دہانی بھی کرا سکتی تھی کہ اس دور میں براعظم پر فرانس کے برسراقتدار آنے کی جدوجہد کو بالکل ناکام بنایا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہ فاصلاتی مستقبل تھا جس کے متعلق انیسویں صدی کے اوائل کے مصنفین' مثلاً"

تخت ہسپانیہ کے امیدوار کے طور پر نامزد کر دیا اور وہ غیر متوقع طور پر شہنشاہ بن گیا۔ چنانچہ حلیف جماعتوں نے اسے اسپین کا فرماں روا بنانے کا جذبہ ترک کر دیا۔ برطانیہ نے ۱۷۱۲ء کے اوائل میں جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر ہالینڈ نے بھی اس کی پیروی کی۔ چنانچہ شہنشاہ چارلس جو "کارلوس سوئم" بننے کی تمنا رکھتا تھا' ناکام مہمات کے بعد امن کی بحالی پر راضی ہو گیا۔

جنگ بندی کی شرائط ۱۷۱۳ء میں صلح اٹرچٹ اور ۱۷۱۴ء میں صلح رسٹاڈٹ کے مطابق طے ہوئیں۔ ان کے نتیجے میں ہسپانیہ کی تخت نشینی کی جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سمجھوتے کو مد نظر رکھتے ہوئے بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے برطانیہ ہی بلا شک و شبہ بہت فائدے میں رہا۔ اگرچہ اسے ہسپانیہ کی نئی دنیا میں جبرالٹر' منارکا' نووا اسکاٹیا' نیو فاؤنڈ لینڈ' خلیج ہڈسن اور تجارتی مراعات حاصل ہو گئیں لیکن اس نے یورپ کے توازن کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۷۱۳۔۱۴ء میں ہونے والے گیارہ علیحدہ علیحدہ مگر تھمبیر معاہدے بہتر توازن قائم رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ فرانس اور ہسپانیہ کی سلطنتیں تو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ لیکن برطانیہ میں پروٹسنٹ کی وراثت کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ ہیبسبرگ سلطنت اسپین میں ناکام ہو گئی تھی اسے جنوبی نیدرلینڈ' میلان (جہاں سے وہ فرانس پر نظر رکھ سکے) نیپلز اور سرڈینیا دے دیا گیا۔ ہالینڈ کی آزادی برقرار رہی لیکن متحدہ صوبہ جات اب پہلے جیسے بحری اور اقتصادی قوت کے حامل نہیں رہے۔ اب وہ مجبوراً" اپنی جنوبی سرحدوں پر قلعہ بندی کرنے میں معروف ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ لوئیس چہاردہم کے وراثتی اور علاقائی عزائم کو حتمی طور پر کالعدم قرار دے دیا گیا تھا اور فرانسیسی قوم جنگ کے ان ہوشربا اخراجات کے عذاب سے گزر کر جنگ سے تائب ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں حکومت کا قرض سات گنا بڑھ چکا تھا۔ تاہم اس جنگ سے زمین پر طاقت میں ایک توازن کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی لیکن سمندروں پر تاحال برطانوی برتری ناقابل چیلنج تھی۔ یہ کوئی بہت زیادہ تعجب خیز بات نہیں کہ ۱۷۱۴ء میں جارج اول کی تخت نشینی کے بعد وہگ پارٹی جو اقتدار میں واپس آ گئی تھی' وہ اٹرچٹ کے معاہدے کو برقرار رکھنے کے لئے بے حد فکر مند تھی۔ نیز وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ جونہی لوئس وفات پا جائے تو حکومت فرانس کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر لیا جائے۔

نصف صدی پر مشتمل جنگ کے نتیجے میں مغربی یورپ کی ریاستوں میں طاقت کا جو توازن از سر نو عمل میں آیا' وہ مشرقی حصے میں ہونے والی تبدیلیوں سے ذرا کم ہی ڈرامائی تھا۔ وہاں کی سرحدیں مغرب کے مقابلے میں زیادہ سریع الحرکت تھیں یہاں زمینوں کی حفاظت تربیت یافتہ شاہی افواج کی بجائے جاگیرداروں اور دیگر غیر تجربہ کار افراد کے ذمے تھی۔ حتیٰ کہ جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک دوسرے سے معرکہ آرا ہوتیں تو ان کی مہمیں دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہوتیں۔ ان میں غیر تربیت یافتہ اور بے قاعدہ فوجی دستے اور مسلح سوار شامل ہوتے تاکہ اعلیٰ پیمانے پر ضرب لگائی جا سکے۔ بلجیم اور ہالینڈ کی لڑائیوں کے برعکس یہاں فتح یا شکست کے نتیجے میں زمینوں کا وسیع رقبہ منتقل کر دیا جاتا اور اس طرح طاقتوں کے عروج و زوال کا معیار قائم ہوتا' مثلاً" "گذشتہ چند عشروں کے دوران ترکوں کی کثیر التعداد سپاہ سے ویانا کو خطرہ درپیش ہوا لیکن وہ جلد ہی شکست اور پھر زوال سے دوچار ہو گئے۔ آسٹریا جرمنی اور پولینڈ کی افواج نے بروقت آگے بڑھ کر ۱۶۸۳ء میں ترکوں کے فوجی یلغار سے نہ صرف شاہی شہر کو بچا لیا' بلکہ وسیع تر "ہولی لیگ" کے تحت مزید کارنامے انجام دیے۔ ۱۶۸۷ء میں موہکس کے قریب ایک بڑی جنگ کے نتیجے میں ترکوں

تھی۔ اس کے نتیجے میں برطانیہ کا طویل المیعاد مفاد قائم رہا۔

برطانیہ کے عروج کے متعلق یہ بیان اگر جزوی طور پر صحیح ہے تو کلی طور پر سچ بھی نہیں ہے۔ بہت سے تجارتی مصنفوں کی طرح سوہن نے بھی برطانیہ کی گھریلو مصنوعات کے برعکس اس کی بیرونی تجارت کی اہمیت بیان کی ہے۔ خصوصاً نو آبادیاتی تجارت کی اہمیت واضح کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے تمام عرصے میں زراعت ہی برطانیہ کی دولت کا بنیادی سرچشمہ تھی۔ برآمدات' جس کی شرح ۱۷۸۰ء کی دہائی تک مجموعی قومی آمدنی کے دس فی صد سے بھی کم تھی' اکثر و بیشتر شدید بیرونی مقابلہ اور محصول پر ہی منحصر تھی۔ بحری طاقت کسی صورت میں بھی اس کا نعم البدل ثابت نہیں ہوتی تھی۔ بحری جہازراں کے اس نظریے کو بھی فراموش کر دیا جاتا ہے کہ بالٹک' جرمنی اور بحیرہ روم کے علاقوں کے علاوہ دیگر اشیاء میں تیزی سے کم ہو رہی تھی' اس کے باوجود ہنوز اقتصادی اہمیت کی حامل تھی۔☆ حتیٰ کہ فرانس جو ہمیشہ یورپ پر مسلط رہا' ۱۸۰۶-۱۳ء کے واقعات کے مطابق برطانیہ کی صنعت سازی کو زک پہنچانے کے درپے رہا۔ اندریں حالات یورپ کی سیاسی طاقت سے کنارہ کشی اقتصادی حماقت کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

برطانیہ کی مسم بالشان قومی حکمت عملی کے پیش نظر براعظم کا ایک اور اہم پہلو بھی تھا۔ اسے ان تمام مبصرین نے نظرانداز کر دیا جن کی نگاہیں محض ویسٹ انڈیز' کینیڈا اور ہندوستان پر مرکوز تھیں۔ انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان ۱۶۵۲-۵۴ء' ۱۶۶۵-۶۷ء اور ۱۶۷۲-۷۴ء میں جو بحری جنگیں ہوئیں وہ بالکل منطقی تھیں کیونکہ ان دونوں بحری قوت کے حامل ملکوں کے مابین جو تجارتی رقابت تھی اس کی جڑیں دشمنی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بہرحال ۱۶۸۸ء کے شاندار انقلاب کے بعد جب ولیم آف اورنج انگلستان کے تخت پر قابض ہوا تو فوجی حکمت عملیوں میں یکسر تبدیلی ہو گئی۔ ۱۶۸۹ء اور ۱۸۱۵ء کے دوران جو سات جنگیں لڑی گئیں ان میں برطانیہ کے مفادات کو زمینی طاقت کے حامل ملک فرانس نے چیلنج کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ فرانس نے اس جنگ کو مغربی کرے' بحرہند' مصر اور دیگر ملکوں تک پھیلا دیا تھا' لیکن لندن اور لیورپول کے تاجروں کی تشویش کے باوجود یہ لڑائی برطانیہ کی قومی سلامتی کے لیے کبھی بھی خطرے کا سبب نہیں بنی۔ ایسا اسی وقت ہو سکتا تھا جب فرانسیسی فوج' ہالینڈ' ہنوور اور پروشیا پر فتح حاصل کر لیتی اور اس طرح فرانس مغربی وسطی یورپ میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیتا۔ پھر جہاز سازی کے سارے وسائل ہتھیا کر برطانیہ کے بحری اقتدار کو نیست و نابود کر دیتا۔ لہٰذا یہ محض ولیم سوئم کے متحدہ صوبوں کے ساتھ ذاتی مراسم یا بعد ازاں ہنوور کے ساتھ تعلقات نہیں تھے جنہوں نے برطانیہ کو ان عشروں میں یورپی براعظم میں فوجی مداخلت پر مجبور کیا۔ اس کے حق میں ایک موثر دلیل اور بھی ہے' یعنی الزبتھ اول کا اسپین کے متعلق خوف و ہراس کا واویلا۔۔۔۔۔ اس کی رو سے یہ طے کیا گیا کہ فرانس کے دشمنوں کی اندرون یورپ مدد کی جائے تاکہ بوربن اور نپولین کے عزائم برقرار رہیں۔ اس طرح برطانیہ کے طویل المیعاد مفادات قابل حصول تھے۔ "بحری" اور "براعظمی" حکمت عملی تو مبنی نقطہ نظر کے مطابق تھی نہ کہ بربنائے دشمنی!

ڈیوک آف نیو کیسل نے ۱۷۴۲ء کی مذکورہ حکمت عملی کا لب لباب نہایت خوبصورتی سے بیان کیا تھا۔

☆ یہاں بالٹک کے بحری گوداموں کی فوجی اہمیت کا ذکر نہیں کیا جا رہا جن پر شاہی بحری بیڑا اور تجارتی جہاز دونوں انحصار کرتے تھے۔ اس حقیقت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ برطانوی بحری بیڑے یہاں مسلسل روانہ کیے جاتے تاکہ طاقت کا توازن برقرار رہے اور نمبر اور مستول کی ترسیل آزادانہ طور پر ممکن ہو سکے۔

"وہ براعظمی اتحاد کو تحفظ فراہم کرے اور اس طرح فرانس کے اخراجات کا رخ موڑ کر ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم سمندروں پر اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں"

وہ ممالک جو فرانس کے اخراجات کا رخ موڑ دینے کے متمنی تھے' انہیں برطانیہ کی دو خاص صورتوں سے حمایت میسر ہوئی۔ پہلی براہ راست فوجی کاروائی تھی۔ اس کے تحت فرانسیسی فوج کو تتر بتر کرنا تھا یا پھر برطانیہ کے اتحادیوں کے دوش بدوش لڑنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کمک روانہ کرنی تھی۔ حملے کی پالیسی قدرے سستی کم خرچ تھی جسے بعض وزراء نے بے حد سراہا۔ لیکن اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے اور بسااوقات یہ تباہی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی (مثلاً ۱۸۰۹ء میں والچرن کی فوجی کاروائی) پھر ایک براعظمی فوج کی فراہمی افرادی قوت اور مال و زر کے لحاظ سے بہت زیادہ مہنگی تھی۔ لیکن جیسا کہ مارلبورو اور ویلنگٹن کی مہمات سے واضح ہوا' اس نوع کا لشکر یورپی توازن برقرار رکھنے میں ممد و معاون بھی ثابت ہوتا تھا۔

برطانوی تعاون کی دوسری صورت مالی امداد تھی۔ اس کے لئے ہیسین اور دیگر کرائے کے سپاہی فرانس کے خلاف لڑنے کے لئے خریدے جاتے یا پھر اتحادیوں کو مراعات فراہم کی جاتیں مثلاً" فریڈرک اعظم نے ۱۷۵۷ء سے ۱۷۶۰ء تک سالانہ ۶۷۵۰۰۰ پونڈ برطانیہ سے حاصل کیے اور نپولین کی جنگ کے انتہائی دور میں تو برطانوی امداد عروج کو پہنچ گئی تھی' یعنی ۱۸۱۳ء میں مختلف اتحادیوں کو ۱۱ ملین پونڈ کی رقم فراہم کی گئی جبکہ جنگ کے مجموعی اخراجات برداشت کے لیے ۶۵ ملین پونڈ ادا کیے گئے۔ سب کچھ محض اس وجہ سے ہوا کہ برطانیہ کی تجارت اور کاروبار خاصا پھیلا ہوا تھا۔ خصوصاً" سمندر پار منافع جن منڈیوں تک اس کی رسائی تھی ان مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت نے قرض بھی حاصل کیے اور ٹیکس کے ذریعے بھی معقول رقم سمیٹی۔ لطف یہ کہ اسے اندرون ملک کسی قسم کے دیوالیہ پن کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔

اندرون یورپ کسی اور رخ موڑ دینا' ایک مہنگا سودا تھا۔ تاہم اس سے یہ بات یقینی ہو گی کہ فرانس نہ تو بحری تجارت کے خلاف کوئی مہم جاری رکھ سکتا ہے اور نہ ہی براعظم یورپ پر تسلط جما کر دوسروں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لندن کو اپنی جنگوں میں سرمایہ لگانے اور اپنے اتحادیوں کو مراعات فراہم کرنے کا موقع مل گیا۔ جغرافیائی برتری اور اقتصادی فوائد نے برطانیہ کو اس قابل کر دیا کہ وہ دو چہرے والے دیوتا "جینس" کی طرح دو رخی حکمت عملی اختیار کرے' یعنی ایک چہرہ براعظم کی جانب ہو تاکہ اس سے طاقت کے توازن کو اپنی جانب جھکایا جا سکے اور دوسرا سمندروں کی طرف رہے تاکہ بحری طاقت کو مزید مستحکم کیا جا سکے۔

مذکورہ بالا جغرافیائی اور مالیاتی عوامل کی اہمیت کو بخوبی سمجھنے کے بعد ہی اس زمانے کی بڑھتی ہوئی آبادی اور بری و بحری طاقت کے اعداد و شمار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (دیکھئے جدول ۳ تا ۵)

جو قارئین اعداد و شمار سے شغف رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرح کے گوشوارے کا جائزہ نہایت احتیاط سے لیا جاتا ہے۔ آبادی کا مجموعی گوشوارہ خصوصاً" جو ابتدائی زمانے سے متعلق ہے' محض قیاس پر مبنی ہے (اور روس کے ضمن میں غلطی کی مقدار کئی ملین میں ہو سکتی ہے)

جدول نمبر۳۔ بڑی طاقتوں کی آبادی

١٧٠٠ء تا ١٨٠٠ء

(ملین)

	١٧٠٠ء	١٧٥٠ء	١٨٠٠ء
جزائر برطانیہ	٩٫٠	١٠٫٥	١٦٫٠
فرانس	١٩٫٠	٢١٫٥	٢٨٫٠
ہیبس برگ سلطنت	٨٫٠	١٨٫٠	٢٨٫٠
پروشیا	٢٫٠	٦٫٠	٩٫٥
روس	١٧٫٥	٢٠٫٠	٣٧٫٠
اسپین	٦٫٠	٩٫٠	١١٫٠
سویڈن		١٫٧	٢٫٣
متحدہ صوبہ جات	١٫٨	١٫٩	٢٫٠
ریاست ہائے متحدہ امریکہ		٢٫٠	٤٫٠

جدول نمبر۴۔ افواج کی جسامت : ١٦٩٠ء ۔ ١٨١٣ء

(نفری)

	١٦٩٠ء	١٧١٠ء	١٧٥٦/٦٠ء	١٧٧٨ء	١٧٨٩ء	١٨١٢/١٣ء
برطانیہ	٧٠٠٠٠	٧٥٠٠٠	٢٠٠٠٠٠		٤٠٠٠٠	٢٥٠٠٠٠
فرانس	٤٠٠٠٠٠	٣٥٠٠٠٠	٣٣٠٠٠٠	١٧٠٠٠٠	١٨٠٠٠٠	٦٠٠٠٠٠
ہیبس برگ سلطنت	٥٠٠٠٠	١٠٠٠٠٠	٢٠٠٠٠٠	٢٠٠٠٠٠	٣٠٠٠٠٠	٢٥٠٠٠٠
پروشیا	٣٠٠٠٠	٣٩٠٠٠	١٩٥٠٠٠	١٦٠٠٠٠	١٩٠٠٠٠	٢٧٠٠٠٠
روس	١٧٠٠٠٠	٢٢٠٠٠٠	٣٣٠٠٠٠		٣٠٠٠٠٠	٥٠٠٠٠٠
اسپین		٣٠٠٠			٥٠٠٠٠٠	
سویڈن		١١٠٠٠٠				
متحدہ صوبہ جات	٧٣٠٠٠	١٣٠٠٠٠	٤٠٠٠٠			
ریاست ہائے متحدہ امریکہ					٣٥٠٠٠	

جدول نمبر۵ ۔ بحریہ کا سائز: ١٦٨٩ء ۔ ١٨١٥ء

(جہازوں کے حساب سے)

	١٦٨٩ء	١٧٣٩ء	١٧٥٦ء	١٧٧٩ء	١٧٩٠ء	١٨١٥ء
برطانیہ	١٠٠	١٢٤	١٠٥	٩٠	١٩٥	٢١٤
ڈنمارک	٢٩	-	-	-	٣٨	-
فرانس	١٢٠	٥٠	٧٠	٦٣	٨١	٨٠
روس	-	٣٠	-	٤٠	٦٧	٤٠
اسپین	-	٣٤	-	٤٨	٧٢	٢٥
سویڈن	٤٠	-	-	-	٢٧	-
متحدہ صوبہ جات	٦٦	٤٩	-	٢٠	٤٤	-

افواج کی تعداد میں وسیع پیمانے پر کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ اس کا انحصار مندرج تاریخوں کے مطابق ہوتا رہا ہے' یعنی جنگ کی ابتدا درمیانی عرصہ یا اختتامی عرصہ ان مجموعی اعداد و شمار میں کرائے کے سپاہی بھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ نپولین کے معاملے میں اتحادیوں کے دل برداشتہ ہونے والے فوجیوں کو بھی ان اعداد و شمار میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جہازوں کی تعداد سے نہ تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑائی کے لیے تیار کھڑے تھے اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ کار عملہ انھیں چلانے کے لیے موجود بھی تھا یا نہیں۔ علاوہ ازیں ان اعداد و شمار سے ان ممالک کی نہ تو سپہ سالاری اور نہ ہی امیرالبحری کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ فوجی قائدین لائق تھے یا اناڑی' قومی جذبے سے مملو تھے یا بودے واقع ہوئے تھے۔ تاہم مذکورہ اعداد و شمار سے اس دور کی طاقت و سیاست کے رجحانات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق اس دور میں فرانس اور خاص طور پر روس آبادی اور فوجی لحاظ سے پیش پیش ہیں۔ برطانیہ کو سمندروں پر فوقیت حاصل ہے۔ پروشیا' اسپین' سویڈن اور متحدہ صوبہ جات پر سبقت لے جا رہا ہے۔ فرانس لوئیس چاردہم اور نپولین کی جم غفیر فوج کی وجہ سے یورپ پر چھاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں بڑی طاقتوں کی محاذ آرائی کے جغرافیائی اور مالیاتی تناظر کے.
پیش نظر یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ ان تینوں گوشواروں میں جو تصویر پیش کی گئی ہے ان میں مزید رنگ بھرنے کی ضرورت ہے' مثلاً" دوسرے ملکوں کی نسبت متحدہ صوبوں کی فوجی جسامت میں تیزی سے روبہ زوال ہونے کی کیفیت جنگ کے مالیاتی شعبے میں دکھائی نہیں دیتی حالانکہ اس معاملے میں اس کا کردار خاصا گمبھیر رہا ہے۔ متحدہ صوبہ جات کا غیر عسکری کردار اس حقیقت کو چھپاتا رہا ہے کہ وہ فوجی نوعیت کی کوئی کاروائی انجام دے سکتا ہے۔ ان اعداد و شمار سے برطانیہ کی اس فوجی امداد کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو وہ اپنے اتحادیوں کی ایک لاکھ فوج کے لیے فراہم کرتا رہا ہے جن کی تعداد ١٣۔١٨١٢ء میں ١٣٠٠٠٠ تھی۔ پروشیا اور ہیبس برگ کی سلطنتوں کی صحیح طاقت جو زیادہ تر جنگوں میں دوسروں کی مراعات کی مرہون منت ہوتی تھی' مبالغہ آمیز معلوم ہو گی اگر ہم محض ان کے دشمنوں کی طاقت کو مد نظر رکھیں۔ جیساکہ سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ فرانس کے وسیع فوجی اڈے مالیاتی بحران اور جغرافیائی حالات کے سبب بے اثر ہو کر رہ گئے جبکہ روس کے عسکری مراکز اقتصادی بدحالی اور درمیانی فاصلے کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ اب چونکہ ہم خود محاذ آرائیوں کا بھرپور جائزہ لینے جا رہے ہیں' ایسی صورت میں ان طاقتوں کے استحکام اور کمزوریوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

فیصلہ کن جنگیں ۔ ۱۶۶۰ء ۔۔ ۱۷۶۳ء

جب لوئیس چہاردہم نے مارچ ۱۶۶۱ء میں فرانس کا اقتدار پوری طرح سنبھال لیا تو اس وقت پورے یورپ کا منظر نامہ ایک ایسے فرماں روا کے لیے نہایت موزوں اور مناسب تھا جو اس براعظم پر اپنا نظریہ مسلط کرنے کا آرزومند ہو۔ جنوب میں واقع اسپین پرتگال کو حاصل کرنے کے لیے بے نام سی کوشش میں نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ ادھر چینل کے اس پار چارلس دوئم کی ماتحتی میں شاہی حکومت اپنے قدم جمانے کی سعی میں معروف تھی پھر' انگلستان کے کاروباری طبقے میں ولندیزیوں کے خلاف حد درجہ آگ بھڑک رہی تھی۔ شمال کی جانب دیکھیے تو حالیہ جنگ سے ڈنمارک اور سویڈن نڈھال ہو چکے تھے۔ جرمنی میں پروٹسٹنٹ نظریے کے جاگیردار ہیبسبرگ خاندان کے اس تازہ اقدام کو شک بھری نظر سے دیکھ رہے تھے جو اقتدار کے استحکام کے لیے کیا جا رہا تھا۔ ویانا کی شاہی حکومت کو ہنگری اور ٹرانسلوانیا میں متعدد مسائل کا سامنا تھا۔ پھر کچھ ہی دن بعد سلطنت عثمانیہ کے دوبارہ عروج پانے کا خطرہ بھی درپیش ہو گیا۔ پولینڈ ویسے ہی سویڈن اور روس کے غارت گروں سے مدافعت کی کوششوں میں دگرگوں ہو رہا تھا۔ لہٰذا فرانس رچ لیو کی پیروی کرتے ہوئے ان حالات سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ اپنی سفارتی مہارت کو کام میں لاتے ہوئے اس نے پرتگال کو اسپین سے لڑا دیا۔ ہنگیار' ترک اور جرمن جاگیرداروں کو آسٹریا کے خلاف صف آرا کر دیا اور انگریزوں کو ولندیزیوں سے بھڑا دیا۔۔۔۔ اور ادھر جمہوریہ سوئس کی ریاستوں سے ۱۶۶۳ء میں ایک اہم معاہدہ کر کے وہ اپنی سرحدوں کو مضبوط بھی کر رہا تھا اور فوجیوں کی تعداد بھی بڑھا رہا تھا۔ اس طرح لوئس چہاردہم کو اپنی بادشاہت مستحکم کرنے کا اچھا خاصا موقع مل گیا۔ پھر وہ ایسے اندرونی انتشار سے بھی "کلیتاً" محفوظ تھا جس نے گذشتہ صدی کے دوران فرانسیسی حکومت کو ضیق ڈال دیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ کولبرٹ' لی ٹیلیئر اور دوسرے معروف وزراء کو یہ موقع مل گیا کہ وہ انتظامی امور کی اصلاح کر لیں اور بری و بحری افواج پر دارو وہش کی پرانی روش کو یکسر بدل کر رکھ دیں۔

بہرحال لوئیس کے لیے یہ بات آسان ہو گی کہ وہ اپنے عہد حکومت کی ابتدا میں فرانس کی سرحدوں کو مستحکم کر لے خصوصاً" ایسی صورت میں جبکہ انگلستان اور ہالینڈ کے تعلقات ۱۶۶۵ء کے لگ بھگ یعنی دوسری انگریزی۔ ولندیزی جنگ کے موقع پر خاصے کشیدہ ہو گئے تھے۔ اگرچہ فرانس معاہدے کی رو سے متحدہ صوبہ جات کی حمایت کرنے کا پابند تھا' لیکن اس نے سمندری محاذ آرائیوں میں برائے نام ہی حصہ لیا۔ اس کے برعکس وہ جنوبی نیدرلینڈ پر حملے کی تیاری کرنے لگا جو کمزور اسپین کی ماتحتی میں تھا۔ جب فرانس نے مئی ۱۶۶۷ء میں حملے کا باقاعدہ آغاز کیا تو شہر در شہر اس کے قبضے میں آتے چلے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس دور میں تیزی سے بدلتے ہوئے فن سفارت کی ابتدائی مثال تھی۔ انگریز اور ولندیزی دونوں نے غیر منافع بخش باہمی جنگ سے تھک کر اور فرانسیسی منصوبوں کو تاڑتے ہوئے جولائی میں بریڈا کے مقام پر صلح کر لی۔ پھر سویڈن کے ساتھ مل کر فرانس اور اسپین کے باہمی جھگڑے میں مصالحت کرانے کی کوشش کی تاکہ اس طرح لوئس کے فوائد محدود کیے جا سکیں۔ ۱۶۶۸ء کے ایکسلا شیپل کی صلح سے یہ مقصد تو پورا ہو گیا لیکن اس کے نتیجے میں شاہ فرانس مشتعل ہو گیا۔ اس نے بالآخر یہ طے کر لیا کہ وہ متحدہ صوبہ جات سے بدلہ لے گا جو اس کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اگلے چند برسوں میں کولبرٹ ولندیزیوں سے قانون محاصل کے قصیے چکانے میں معروف رہا اس دوران فرانس کی بری اور بحری فوج بھی مزید مستحکم ہو گئی۔ مخفی سفارت کاری کے ذریعے انگلستان اور سویڈن کو متحدہ صوبوں کے ساتھ اتحاد سے منحرف کر دیا گیا' ساتھ ہی

ساتھ آسٹریا اور جرمنی کے خوف کے ہوے کو کالعدم کر دیا گیا۔ ۱۶۷۲ء کے آتے آتے فرانس برطانوی بحریہ کے تعاون سے معرکہ آرا ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

اگرچہ لندن نے متحدہ صوبوں کے ساتھ جنگ کرنے کا اعلان سب سے پہلے کیا تھا' لیکن ۷۴۔۱۶۷۲ء کی تیسری انگریزی ۔ ولندیزی لڑائی میں انگلستان کی مایوس کن کاروائی یہاں قدرے وضاحت کی متقاضی ہے۔ سمندروں میں ڈی رپوئٹر کی ماہرانہ کوششوں کے نتیجے میں ناکامی کا سامنا کرنے اور زمینی جنگ میں بھی کوئی کارنامہ انجام نہ دینے کی وجہ سے چارلس دوم کی حکومت کو اندرون ملک تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ سیاسی دوغلے پن' مالیاتی بد نظمی اور فرانس جیسی کیتھولک حکومت سے بے پناہ نفرت ہونے کے باعث یہ جنگ بدنامی کا شکار ہو گئی۔ چنانچہ عوام کے دباؤ کے نتیجے میں حکومت کو ۱۶۷۴ء میں اپنی افواج واپس بلا لینی پڑی۔ پچھلے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ انگلستان کے بعد کے بادشاہوں کی ماتحتی میں وہاں کے سیاسی' مالیاتی اور انتظامی حالات کس درجہ زبوں حال اور دگرگوں ہو گئے تھے۔ بہرحال لندن کے منصوبے میں جو تبدیلی آئی وہ بین الاقوامی اہمیت کی حامل تھی۔ اس سے جزوی طور پر ہی سہی' لوئس چہاردہم کے مقاصد کی چونکا دینے والی آواز پورے یورپ میں سنائی دینے لگی۔ ایک سال کے اندر اندر ولندیزیوں کی سفارت اور مراعات کی پیشکش کی بدولت اسے ایسے اتحادی میسر ہو گئے جو فرانس کے خلاف سینہ سپر ہونے کو تیار تھے۔ جرمنی کی ریاستیں' برینڈنبرگ (جس نے فرانس کے باقی رہ جانے والے ساتھی سویڈن کو ۱۶۷۵ء میں فربیلن کے مقام پر شکست دی تھی) ڈنمارک' اسپین اور ہیبسبرگ سلطنت سبھی اس معاملے میں شریک ہو گئے۔ یہ بات نہ تھی کہ ریاستوں کا یہ اتحاد اتنا مضبوط تھا کہ وہ فرانس پر فوقیت حاصل کر لیتا۔ بعض کی فوجیں بہت مختصر تھیں اور پھر ان کے اپنے لشکروں میں افراتفری بھی تھی۔ فرانس کی مخالف اتحادی قوتوں کا اہم سرغنہ یعنی متحدہ صوبہ جات اپنے نئے لیڈر ولیم آف اورنج کی ماتحتی میں ہی رہا لیکن شمال کی آبی رکاوٹ اور رھائن کے علاقے میں مختلف دشمنوں کے مقابلے میں فرانسیسی سپاہ کی کمزور صف بندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود لوئس کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکا۔ یہی صورت حال سمندروں پر بھی تھی۔ فرانسیسی بحریہ بحیرۂ روم پر کنٹرول سنبھالے ہوئے تھی' ولندیزی اور اہل ڈنمارک کے جہاز بالٹک پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ویسٹ انڈیز پر قدم نہیں جما سکا۔ اس جنگ کے نتیجے میں فرانس اور ہالینڈ کی معیشت بری طرح تباہ ہوئی لیکن اس جنگ کے بالواسطہ فوائد انہیں حاصل ہوئے جو غیر جانب دار تھے۔ مثلاً" برطانیہ! بالآخر ۱۶۷۸ء میں ایمسٹرڈم کے کاروباری طبقے نے اپنی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ فرانس سے علیحدہ طور پر صلح کر لے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جرمنی کی ریاستیں جو ہالینڈ کی مراعات پر تکیہ کیے ہوئے تھیں' اب اپنے بل بوتے پر جنگ جاری رکھنے سے قاصر تھیں۔

اگرچہ ۹۔۱۶۷۸ء کی نیمیگن صلح کے مطابق جنگ بندی ہو چکی تھی لیکن لوئس چہاردہم فرانس کی شمالی سرحدوں کو مستحکم کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس کا یہ اقدام اس کے یورپ کا "مختار کل" بن جانے کا غماز تھا۔ پھر اس کے پاس زمانہ امن میں دو لاکھ کی تعداد میں جو فوج تھی وہ بھی خطرے کی علامت تھی۔ چنانچہ اہل جرمنی' ولندیزی' اہل ہسپانیہ اور انگریز خاموش تماشائی بن کر نہ رہ سکے۔ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ یہ لوگ فوراً" جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ ولندیزی تاجروں نے تجارت کے فروغ کے لیے قیام امن کو ترجیح دی۔ جرمنی کا جاگیر دار طبقہ انگلستان کے چارلس دوم کی طرح پیرس کی مالی اعانت کرتے کرتے تنگ آ چکا تھا۔ ادھر ہیبسبرگ کی حکومت ترکوں کے ساتھ تھکا دینے والی جنگ میں معروف تھی۔ لہٰذا

جب اسپین نے ۱۶۸۳ء میں اپنے لکسمبرگ کے علاقے کو فرانس کے تسلط سے بچانے کی جدوجہد کی تو اسے اکیلا ہی لڑنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں اسے شکست فاش ہوئی۔

بہرحال ۱۶۸۵ء سے فرانس کے لیے حالات ناسازگار ہوتے جا رہے تھے۔ ہگونوٹس کے ظلم و ستم نے یورپ کے پروٹسٹنٹ طبقے کو خاصا صدمہ پہنچایا۔ اگلے دو سال میں ترکوں کو بری طرح شکست دی گئی اور انہیں ویانا سے بھگا دیا گیا۔ شہنشاہ لیوپولڈ جس نے کچھ نیک نامی حاصل کر لی تھی' اپنی اضافہ شدہ فوجی طاقت کے بل بوتے پر مغرب کی سمت تھوڑی بہت توجہ مبذول کرنے لگا۔ ستمبر ۱۶۸۸ء میں اس اعصاب زدہ فرانسیسی بادشاہ نے جرمنی پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس طرح اس نے یورپ کی اس "سرد جنگ" کو گھمسان کی جنگ میں تبدیل کر دیا۔ فرانس کے اس رویے نے اس کے دشمنوں کو جارحیت پر اکسایا اور ولیم آف اورینج کو اس کا موقع دیا کہ وہ چینل پار کرلے اور انگلستان جا کر معزول بادشاہ جیمز دوم کو تخت پر بٹھا دے۔

۱۶۸۹ء کے اواخر میں فرانس متحدہ صوبہ جات' انگلینڈ' سلطنت ہیبسرگ' اسپین' ساوائے اور جرمنی کی اہم ریاستوں کے مقابلے میں تنہا کھڑا تھا۔ یہ اتحاد اتنا خطرناک نہ تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ البتہ اس کا اہم حصہ انگلستان اور ہالینڈ کی افواج اور جرمن ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اگرچہ بعض باتوں کی وجہ سے یہ گروپ مایوس نظر آتا تھا پھر بھی اس کے پاس جذبہ و عزم کی کمی نہ تھی۔ نیز مالی وسائل' فوجیں اور بحری بیڑے اتنے وسیع تھے کہ سن کنگ کے فرانس کا توازن برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ اگرچہ دس سال قبل' لوئس نے فرانس کا وقار برقرار رکھا تھا لیکن اب کولبرٹ کے مرنے کے بعد اس ملک کی مالی اور تجارتی حیثیت تسلی بخش نہیں رہی تھی۔ اب فرانس کی نہ تو بری اور نہ ہی بحری فوج مسلسل اور دور دراز علاقوں میں ہونے والی جنگ کے قابل رہی تھی۔ کسی اہم اتحادی کی شکست سے تعطل دور ہو سکتا تھا' لیکن یہ کاروائی کس طرح انجام دی جا سکتی تھی؟ پھر لوئس کے پاس اتنا حوصلہ تھا کہ وہ ایسے اقدام کا حکم نافذ کرتا؟ وہ تین سال تک گو مگو کے عالم میں رہا۔ پھر ۱۶۹۲ء میں اس نے حتمی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ۲۴۰۰۰ فوج چینل کے اس پار جا کر حملہ کرے۔ اس کی بحری طاقت خاصی وسیع تھی۔ اس نے فرانس کے جنگی جہازوں اور کشتیوں کو بار فلوئرلاہوگی کے مقام پر غارت کر دیا۔

۱۶۹۳ء کے بعد سمندری جنگ تجارت کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ تجارت پر قدغن کی حکمت عملی اپناتے ہوئے فرانسیسی حکومت نے غیر سرکاری مسلح جہازوں کو اس امر پر اکسایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ انگریزی/ولندیزی جہازوں کو نشانہ بنائیں جبکہ اس نے اپنے بحری بیڑے کی تعداد میں اچھی خاصی کمی کر دی۔ اتحادیوں کی بحریہ نے اپنے طور پر تجارتی قوت پیدا کر کے فرانس کی معیشت پر مسلسل دباؤ ڈالا' گویا انھوں نے دشمن کے ساتھ تجارت کرنے کی ولندیزی حکمت عملی کو اختیار کر لیا تھا لیکن اس طرز عمل سے اپنے مخالف کو جھکایا نہیں جا سکا۔ چنانچہ اقتصادیات پر جنگ کے برے اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے جہاں تاجروں میں بدنظمی پیدا ہوئی وہاں کسان بھی جو خرابی فصل سے پہلے ہی گھاٹے میں تھے' نالاں ہو گئے۔ اس دوران اسے میدانی مہم جوئی بھی گراں ثابت ہو رہی تھی۔ قلعہ بندیوں کے خلاف براہ راست اور طویل معرکے اور آبی راستے کو پار کرنے کا مسئلہ اس کی نمایاں وجہ تھیں۔ واؤبن کے قلعے نے فرانس کو ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسی قلعہ بندی نے ہالینڈ اور دیگر خود مختار ریاستوں میں فرانس کا داخلہ ناممکن بنا دیا تھا۔ ہر فریق نے میدان جنگ میں دو لاکھ پچاس ہزار فوجی اتار دیئے تھے۔ اس طرح

اخراجات ان پر نہایت ہوشربا ثابت ہوئے۔ اگرچہ اس زمانے میں یورپ کے علاوہ بھی دیگر ملکوں میں محاذ آرائی جاری تھی' مثلاً" ویسٹ انڈیز' نیوفاؤنڈ لینڈ' اکاڈیا' پانڈیچری میں لیکن ان میں کوئی ایک بھی اتنا اہم نہ تھا کہ براعظمی اور بحری توازن قائم رکھ سکے۔ چنانچہ ۱۶۹۶ء کے آغاز میں ٹوری جماعت کا جاگیردار طبقہ اور ایمسٹرڈم کے شہری زائد ٹیکسوں کا شکوہ کرنے لگے۔ پھر فرانس قحط سالی کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ نتیجتاً" ولیم اور لوئس دونوں سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۶۹۷ء میں رسوک کی صلح عمل میں آئی۔ اس کے نتیجے میں لوئس کو کچھ سرحدی علاقے واپس مل گئے۔ لیکن جنگ سے پہلے کی حالت پھر لوٹ آئی۔ ۱۶۸۹-۹۷ء کی نو سالہ جنگ کے نتائج اتنے غیر اہم نہ تھے جیساکہ اس زمانے کے مبصرین کی رائے تھی۔ فرانس کے میدان مارنے کا جذبہ سرد پڑ چکا تھا اور اس کی بحری طاقت زائل ہو گئی تھی۔ ۱۶۸۸ء کا شاندار انقلاب ہنوز برقرار تھا۔ انگلستان نے آئرلینڈ کا علاقہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے اپنے مالیاتی اداروں کو مستحکم بھی کر لیا تھا اور بری و بحری فوج کی از سر نو تنظیم کی تھی۔ پھر انگلستان' ہالینڈ اور جرمنی کی وہ روایت ثلاثہ پھر زندہ ہو گئی تھی جس کے تحت فرانس کو فلینڈر اور رہائن کے علاقے سے دور رکھنا تھا۔ یورپ کی سیاسی اجتماعیت گراں قیمت پر ہی سہی دوبارہ پھر مستحکم ہو گئی تھی۔

مختلف ملکوں کے دارالخلافوں میں جنگ سے ذہنوں پر جو مذموم اثرات پڑے تھے ان کے پیش نظر دوبارہ محاذ آرائی کا آغاز ممکن نہ تھا۔ تاہم ۱۷۰۰ء میں لوئس کے پوتے کو جب ہسپانیہ کا تخت ملا تو سن کنگ نے فرانس کی طاقت کو فروغ دینے کے لئے یہ موقع غنیمت جانا۔ اس نے اپنے باوقار دشمنوں سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے اپنے پوتے کی جانب سے جنوبی نیدرلینڈ پر نہایت سرعت سے قبضہ کر لیا۔ نیز فرانس کے تاجروں کے لیے سلطنت ہسپانیہ کے مغربی حصہ میں وسیع کاروباری مراعات بھی حاصل کر لیں۔ اپنے مذکورہ اور دیگر اقدامات سے اس نے برطانیہ اور ہالینڈ کو خاطر خواہ طور پر چوکنا کر دیا۔ چنانچہ ۱۷۰۱ء میں انہوں نے ایک اور اتحاد قائم کر کے آسٹریا کو اپنے ساتھ ملا لیا اور لوئس کے عزائم کی بیخ کنی کرنے لگے۔۔۔ یعنی سلطنت ہسپانیہ کی وراثت کا جھگڑا۔

طاقت کے عام توازن اور آمدنی کے وسائل نے یہ بات واضح کر دی کہ ہر ایک حلیف دوسرے کو نقصان تو پہنچا سکتا ہے' لیکن اس پر غالب نہیں آ سکتا۔ بعض صورتوں میں لوئس ۱۶۸۹-۹۷ء کی جنگ کے برعکس اب زیادہ مستحکم پوزیشن میں تھا۔ اہل ہسپانیہ نے اس کے پوتے کو بہ رضا و رغبت قبول کر لیا۔ اب وہ فلپ پنجم کی حیثیت میں ان کا فرماں روا بن چکا تھا۔ "بوربن کی طاقتیں" مختلف محاذ پر آپس میں مل کر کام کرنے لگی تھیں۔ اسپین سے چاندی درآمد ہونے کی وجہ سے فرانس کو بہت زیادہ مالی فائدہ پہنچا۔ علاوہ ازیں فرانس فوجی لحاظ سے اس قدر مستحکم ہو گیا کہ ایک زمانے میں اس کے پاس ۵ لاکھ کے قریب لشکر موجود تھا۔ تاہم آسٹریا جو بلکان کے محاذ پر اتنا پریشان نہ تھا اس جنگ میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اہم کردار انجام دے رہا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ برطانوی حکومت نے خاصی مقدار میں اپنا قومی سرمایہ مراعات کی صورت میں جرمن اتحادیوں کو فراہم کیا۔ اس میں ایک طاقتور بحری بیڑا اور وسیع فوج شامل تھی جس کی کمان مارلبورو جیسا ذہین جرنیل کر رہا تھا۔ چالیس ہزار سے ستر ہزار برطانوی اور کرایہ کے سپاہیوں پر مشتمل یہ دستہ ایک لاکھ سے زیادہ ولندیزی فوج اور اتنا ہی کثیرالتعداد ہیبسرگ لشکر میں شامل ہو کر یورپ پر لوئس کے مسلط ہو جانے کے عزائم کو چکنا چور کرنے لگا۔

اس عظیم اتحاد کا مطلب فرانس یا اسپین پر اپنی برتری قائم کرنا نہیں تھا بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ دو ملکوں سے ماورا حالات اتحادیوں کے لیے سازگار ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۷۰۴ء میں بلن ہیم کے مقام پر مارلبورو کی فیصلہ کن فتح سے فرانسیسی اور بوارئین افواج کو شدید نقصان پہنچا۔ نیز آسٹریا کو فرانس کے حملے کے خوف و خطر سے بچا لیا گیا۔ جب اگلی جنگ ۱۷۰۶ء میں ہوئی تو انگلستان اور ہالینڈ کی افواج کا جنوبی نیدرلینڈ کے وافر علاقوں پر قبضہ ہو گیا اور پھر ۱۷۰۸ء میں اوڈینیرڈ کے مقام پر فرانس کی پیش قدمی کو حتمی طور پر روک کر اس کے وہاں قدم جمانے کے منصوبے کی بیخ کنی کر دی گئی۔

۱۷۰۴ء کی جنگ مالاگا کے بعد سمندروں میں دشمن کے کسی بحری بیڑے کے خطرہ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ برطانوی بحریہ اور اس کے زوال پذیر اتحادی ساتھی ہالینڈ نے مل کر اپنی بحری طاقت کا پر زور مظاہرہ کیا۔ پرتگال جیسے نئے اتحادی کو سمندری جانب سے سہارا دیا جا سکتا تھا۔ لسبن نے ہراول بحری بیڑے کے لیے اڈا فراہم کیا جبکہ برازیل نے سونے کے ذخائر سے مدد کی۔ ان وسائل کے ساتھ اب مغربی خطے کی جانب فوج روانہ کی جا سکتی تھی تاکہ ویسٹ انڈیز اور شمالی امریکہ میں فرانس کے مقبوضات پر حملہ کیا جا سکے۔ ادھر سپاہیوں کا دستہ سونے چاندی سے لدے ہوئے ہسپانیہ کے بحری جہازوں پر قبضہ جماتا رہا۔ پھر جبرالٹر کی فتح سے برطانیہ کی شاہی بحریہ کو ایک ایسا اڈا مل گیا جہاں سے وہ سمندری راستے سے باہر جانے والوں پر کنٹرول قائم کر سکے۔ علاوہ ازیں اس نے فرانس اور اسپین کے بحری اڈوں اور بیڑوں کو بھی تتر بتر کر دیا۔ برطانیہ کے بحری بیڑوں نے میورکا اور سرڈینیا پر قبضے کو ممکن بنا دیا۔ انہوں نے سوائے اور اٹلی کے ساحلی علاقوں کو فرانس کے حملے سے بھی بچائے رکھا۔ جب اتحادیوں نے حملے کا آغاز کیا تو ان برطانوی جہازوں نے اسپین پر دھاوا بولنے والی فوجوں کو تحفظ فراہم کیا اور سامان رسد بھی بہم پہنچایا اور پھر طولون پر یلغار کی مہم میں مدد بھی کی۔

لیکن اتحادیوں کی یہ مشترکہ بحری طاقت فرانس کے اس حملے کا تدارک نہ کر سکی جو اس وقت تجارتی جہازوں پر کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ ۱۷۰۸ء میں برطانیہ کی شاہی بحریہ نے بحری حفاظتی دستے کا انتظام کیا تاکہ تجارتی جہازوں کے نقصانات کو کم سے کم کیا جا سکے۔ جس طرح برطانیہ کے تیس توپوں والے چھوٹے جنگی جہاز فرانس کے بڑے بڑے جنگی جہازوں کو ڈنرک اور گرونڈی میں چپ چاپ داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے سے باز نہ رکھ سکے، اسی طرح وہ تجارتی ناکہ بندی سے بھی قاصر تھے۔ اس لئے کہ اس کام کی خاطر انہیں فرانس اور اسپین کے طویل ساحلی علاقوں کا چکر لگانا پڑتا۔ حتیٰ کہ ۱۷۰۹ء کی سخت سردی میں فرانس کی بندرگاہوں کے قریب غلوں سے بھرے ہوئے جہازوں پر قبضہ بھی لوئس کی خود کفیل سلطنت کو جھکا نہ سکا۔

اتحادیوں میں زخمی کرنے کی صلاحیت تو تھی لیکن مار ڈالنے کی قوت سے محروم تھے۔ اس کا اظہار فرانس اور اسپین کے خلاف مہم سے ہو جاتا ہے۔ ۱۷۰۹ء میں حملہ آور اتحادی فوج میڈرڈ پر مختصر طور پر قابض رہنے کے بعد واپس ہو رہی تھی۔ بڑھتی ہوئی ہسپانوی یلغار کے نتیجے میں وہ اس ملک پر تا دیر قبضہ نہ رکھ سکی۔ شمالی فرانس میں انگریزی اور ولندیزی جنگ امن قائم کر دینے والی خوں ریز اور مہنگی جنگ ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں ۱۷۱۰ء کے آغاز میں ٹوری جماعت نے ویسٹ منسٹر میں عنان وزارت سنبھال لیا جو امن کی خواہشمند تھی۔ چنانچہ برطانیہ کے بحری اور شاہی مفادات کو تحفظ فراہم ہوا اور براعظمی جنگ میں ہونے والے اس کے اخراجات میں کمی واقع ہو گئی۔ آخر میں یہ صورت ہوئی کہ اتحادیوں نے آرک ڈیوک چارلس کو

تخت ہسپانیہ کے امیدوار کے طور پر نامزد کر دیا اور وہ غیر متوقع طور پر شہنشاہ بن گیا۔ چنانچہ حلیف جماعتوں نے اسے اسپین کا فرماں روا بنانے کا جذبہ ترک کر دیا۔ برطانیہ نے ۱۷۱۲ء کے اوائل میں جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر ہالینڈ نے بھی اس کی پیروی کی۔ چنانچہ شہنشاہ چارلس جو "کارلوس سوئم" بننے کی تمنا رکھتا تھا، ناکام مہمات کے بعد امن کی بحالی پر راضی ہو گیا۔

جنگ بندی کی شرائط ۱۷۱۳ء میں صلح اتریخت اور ۱۷۱۴ء میں صلح رستاڈت کے مطابق طے ہوئیں۔ ان کے نتیجے میں ہسپانیہ کی تخت نشینی کی جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سمجھوتے کو مد نظر رکھتے ہوئے با آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے برطانیہ ہی بلا شک و شبہ بہت فائدے میں رہا۔ اگرچہ اسے ہسپانیہ کی نئی دنیا میں جبرالٹر، منارکا، نووا اسکاٹیا، نیو فاؤنڈ لینڈ، خلیج ہڈسن اور تجارتی مراعات حاصل ہو گئیں لیکن اس نے یورپ کے توازن کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۷۱۳-۱۴ء میں ہونے والے گیارہ علیحدہ علیحدہ مگر ضمیمہ معاہدے بہتر توازن قائم رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ فرانس اور ہسپانیہ کی سلطنتیں تو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ لیکن برطانیہ میں پروٹسٹنٹ کی وراثت کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ ہیبسبرگ سلطنت اسپین میں ناکام ہو گئی تھی اسے جنوبی نیدرلینڈ، میلان (جہاں سے وہ فرانس پر نظر رکھ سکے) نیپلز اور سرڈینیا دے دیا گیا۔ ہالینڈ کی آزادی برقرار رہی لیکن متحدہ صوبہ جات اب پہلے جیسے بحری اور اقتصادی قوت کے حامل نہیں رہے۔ اب وہ مجبوراً اپنی جنوبی سرحدوں پر قلعہ بندی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ لوئیس چہاردہم کے وراثتی اور علاقائی عزائم کو حتمی طور پر کالعدم قرار دے دیا گیا تھا اور فرانسیسی قوم جنگ کے ان ہوشربا اخراجات کے عذاب سے گزر کر جنگ سے تائب ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں حکومت کا قرض سات گنا بڑھ چکا تھا۔ تاہم اس جنگ سے زمین پر طاقت میں ایک توازن کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی لیکن سمندروں پر تاحال برطانوی برتری ناقابل چیلنج تھی۔ یہ کوئی بہت زیادہ تعجب خیز بات نہیں کہ ۱۷۱۴ء میں جارج اول کی تخت نشینی کے بعد وگ پارٹی جو اقتدار میں واپس آ گئی تھی، وہ اتریخت کے معاہدے کو برقرار رکھنے کے لئے بے حد فکر مند تھی۔ نیز وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ جونہی لوئس وفات پا جائے تو حکومت فرانس کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر لیا جائے۔

نصف صدی پر مشتمل جنگ کے نتیجے میں مغربی یورپ کی ریاستوں میں طاقت کا جو توازن از سر نو عمل میں آیا، وہ مشرقی حصے میں ہونے والی تبدیلیوں سے ذرا کم ہی ڈرامائی تھا۔ وہاں کی سرحدیں مغرب کے مقابلے میں زیادہ سریع الحرکت تھیں یہاں زمینوں کی حفاظت تربیت یافتہ شاہی افواج کی بجائے جاگیرداروں اور دیگر غیر تجربہ کار افراد کے ذمے تھی۔ حتیٰ کہ جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک دوسرے سے معرکہ آرا ہوتیں تو ان کی مہمیں دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہوتیں۔ ان میں غیر تربیت یافتہ اور بے قاعدہ فوجی دستے اور مسلح سوار شامل ہوتے تاکہ اعلیٰ پیمانے پر ضرب لگائی جا سکے۔ بلجیم اور ہالینڈ کی لڑائیوں کے برعکس یہاں فتح یا شکست کے نتیجے میں زمینوں کا وسیع رقبہ منتقل کر دیا جاتا اور اس طرح طاقتوں کے عروج و زوال کا معیار قائم ہوتا، مثلاً "گزشتہ چند عشروں کے دوران ترکوں کی کثیرالتعداد سپاہ سے ویانا کو خطرہ درپیش ہوا لیکن وہ جلد ہی شکست اور پھر زوال سے دوچار ہو گئے۔ آسٹریا جرمنی اور پولینڈ کی افواج نے بروقت آگے بڑھ کر ۱۶۸۳ء میں ترکوں کے فوجی یلغار سے نہ صرف شاہی شہر کو بچا لیا، بلکہ وسیع تر "ہولی لیگ" کے تحت مزید کارنامے انجام دیے۔ ۱۶۸۷ء میں موہکس کے قریب ایک بڑی جنگ کے نتیجے میں ترکوں

کی طاقت ہیبسرگ کے علاقے سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ ۱۶۸۹ء اور ۱۶۹۷ء کے دوران ہونے والی جنگ میں جہاں جرمنی اور ہیبسرگ کی فوجیں متعدد بار فرانس کے خلاف صف آرا ہوئی تھیں' وہاں ۱۶۹۱ء میں زلنکامین اور ۱۶۹۷ء میں زنٹا کے مقام پر ترکوں کی شکست سے اس وقت کے رجحان کی حقیقت واضح ہو گئی تھی۔ اگر ہیبسرگ سلطنت بلقان کے محاذ پر اپنی ساری طاقت مرکوز رکھی اور پرنس یوگین جیسی صلاحیت کے جرنیل اس کے پاس ہوتے تو وہ ترکوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی مستحکم ہوتی۔ چونکہ اس نے اپنے علاقوں کو مغربی بادشاہوں کی طرح موثر انداز میں منظم نہیں کیا۔ لہٰذا یورپ کی ایک بڑی ریاست کی حیثیت سے اس کا مستقبل تابناک نہ تھا۔

اگر مذکورہ معیار پر رکھ کر دوسرے ممالک کو پرکھا جائے تو سویڈن اور بھی زبوں حال تھا۔ نوجوان چارلس یازدہم جونہی ۱۶۹۷ء میں سویڈن کے تخت پر جلوہ افروز ہوا' پڑوسی ممالک کے سفاکانہ جذبات ابھر آئے۔ ڈنمارک' پولینڈ اور روس تینوں سویڈن کی بالٹک ریاستوں میں حصہ بخرا حاصل کرنے کے آرزومند نظر آنے لگے۔ پھر ۱۶۹۹ء کے موسم خزاں میں انھوں نے اس کام کے لئے آپس میں اتحاد کر لیا تاہم جب لڑائی شروع ہوئی تو سویڈن کی ظاہری کمزوری ایک معقول فوج' بادشاہ کی جنگی صلاحیتوں اور انگریزوں اور ولندیزیوں کی بحری امداد کی وجہ سے زائل ہو گئی اور دشمنوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ مذکورہ تینوں عوامل کی بدولت چارلس میں اتنا دم خم آگیا کہ اس نے کوپن ہیگن کو دھمکی دے دی اور سویڈن کو اس قدر مجبور کیا کہ وہ اگست ۱۷۰۰ء میں اس جنگ سے علیحدہ ہو گیا۔ بعد ازاں اس نے اپنی فوج بالٹک کے اس پار پہنچا دی۔ پھر تین مہینے بعد زاروا کے مقام پر نمایاں فتح حاصل کر کے اس نے روسیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ محاذ آرائی اور فتح و نصرت کے نشے میں سرشار چارلس اسی سال پولینڈ کو روندتا ہوا سیکسونی کی جانب بڑھنے لگا۔

تاریخی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد مورخین کی یہ رائے ہے کہ چارلس یازدہم نے پولینڈ اور سیکسونی پر نامعقول توجہ مبذول کر کے اپنی نظریں ان اصلاحات کی طرف سے ہٹا لی تھیں جنھیں ناروا کی شکست کے بعد پیٹراعظم روس میں نافذ کرنا چاہتا تھا۔ متعدد بیرونی مشیروں کی مدد اور مغرب کے فوجی ماہرین کی اعانت سے پیٹر نے ایک وسیع اور طاقت ور بری اور بحری فوج اسی جذبے کے ساتھ تیار کی تھی جس جذبے کے تحت اس نے دلدلی زمین پر سینٹ پیٹر برگ تعمیر کیا تھا۔ جب چارلس ۱۷۰۸ء میں ۴۰۰۰۰ کا لشکر لے کر پیٹر کے مقابلے پر ایا تو اس کا یہ اقدام خاصی تاخیر سے تھا۔ اگرچہ سویڈن کی فوج نے میدان جنگ میں بہتر کارنامہ انجام دیا تھا۔ پھر بھی اسے خاصا نقصان اٹھانا پڑا کیونکہ وہ روس کی خاص فوج کو کچلنے کے قابل نہ تھی۔ پھر رسد کی کمی نے بھی اس کی راہیں مسدود کر دیں۔ ان تکلیف دہ حالات میں چارلس کی فوج جنوب میں یوکرین کی طرف بڑھ گئی اور ۹-۱۷۰۸ء کی شدید سردی کی لپیٹ میں آ گئی۔ جب جولائی ۱۷۰۹ء میں حتمی طور پر لڑائی شروع ہوئی تو اس وقت روسی فوج تعداد میں بھی بہت زیادہ تھی اور اس کی دفاعی پوزیشن بھی بہت اچھی تھی۔ اس جھڑپ میں نہ صرف سویڈن کی فوج تتر بتر ہو گئی بلکہ چارلس کے ترکی کے علاقے میں بھاگ جانے اور وہاں طویل عرصے تک جلا وطنی کے دن گزارنے کی وجہ سے اس ملک کے آس پاس والے دشمنوں کو اچھا موقع ہاتھ لگ گیا۔ جب چارلس دسمبر ۱۷۱۵ء میں واپس سویڈن آیا تو اس وقت تک بالٹک کے علاقے میں اس کی تمام مقبوضات ہاتھ سے نکل چکی تھیں اور فن لینڈ کے کئی حصوں پر بھی روس کا قبضہ ہو چکا تھا۔

اس وقت سے لے کر مزید کئی سال تک جنگیں ہوتی رہیں۔ ۱۷۱۸ء میں ڈنمارک کے ساتھ

ہونے والی لڑائی میں چارلس یازدہم مارا گیا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ تھکے ہارے اور تن تنہا سویڈن کو ۱۷۲۱ء میں ہونے والی صلح نیستاد میں اپنے متعدد بالٹک صوبے بھی ہاتھ سے دھونے پڑے۔ اب اس کی طاقت گھٹ کے رہ گئی جبکہ روس اپنے عروج پر آ گیا۔ سویڈن پر فتح حاصل کرنے کی یادگار میں پیٹر نے امپر ٹکر کا لقب اختیار کر لیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بعد میں زار روس کا بحری بیڑہ تباہ ہو گیا اور ملک حد درجہ پس ماندگی کا شکار ہو گیا' روس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی فرانس اور برطانیہ کی طرح ایک طاقتور ملک ہے اور آزادانہ طور پر اقدامات کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اب یورپ کے مشرقی اور مغربی حصے میں ڈیہو کے قول کے مطابق صورت حال یہ تھی کہ سارا توازن مرکز کی طرف جھکا ہوا تھا۔

انگلستان اور فرانس کے مابین کشیدگی رفع ہو جانے کے نتیجے میں یورپ کی سیاسی' فوجی اور اقتصادی حالت میں ایک توازن قائم ہو گیا جو ۱۷۱۵ء کے بعد دو عشرے تک برقرار رہا۔ فرانس اس جنگ کے بعد سنبھلنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی بیرونی تجارت تباہ و برباد ہو چکی تھی اور حکومت کا قرض بھی بہت بڑھ چکا تھا' حتیٰ کہ اس پر جو سود ادا کیا جاتا وہ عموماً" فرانس کی کل آمدنی کے برابر ہوتا۔ مزید برآں لندن اور فرانس کے بادشاہ جنھیں اپنے جانشینوں سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا' ایسی ہر کوشش کے خلاف تھے جس سے صورت حال میں تبدیلی پیدا ہو۔ پھر انھوں نے باہمی تعاون ہی میں بھلائی محسوس کی مثلاً" ۱۷۱۹ء میں دونوں قوتوں نے اسپین کو اٹلی میں اس کے توسیع پسند عزائم سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ بہرحال ۱۷۳۰ء کی دہائی میں بین الاقوامی تعلقات کا انداز پھر تبدیل ہو رہا تھا۔ چنانچہ فرانس اب برطانیہ کے ساتھ تعلقات بحال رکھنے میں اتنا کوشاں نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ اپنی پرانی پوزیشن دوبارہ حاصل کرنے کا زیادہ شائق تھا تاکہ یورپ کی سربرآوردہ قوتوں میں اس کا شمار ہو سکے۔ اب فرانس میں جانشینی کا کوئی قضیہ نہ تھا۔ امن قائم ہو جانے کی وجہ سے ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ پھر سمندر پار کی تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح یہ ملک سمندری طاقتوں کے لیے چیلنج بن گیا۔ ایک طرف فرانس اپنے وزیر فلوری کی سربراہی میں اسپین کے ساتھ نہایت تیزی سے تعلقات استوار کر رہا تھا اور مشرقی یورپ میں اپنی سفارتی سرگرمیاں پھیلا رہا تھا' جبکہ دوسری طرف برطانیہ محتاط اور الگ تھلگ رہنے والے والپول کی سرکردگی میں براعظم کے معاملات سے خود کو علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۷۳۳ء میں آسٹریا کے مقبوضات---- لورین اور میلان پر فرانسیسی حملے اور دریائے رھائن کے علاقے میں فرانس کی پیش قدمی پر برطانیہ نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ علیحدگی پسند والپول اور خوف زدہ ولندیزیوں سے کسی قسم کی مدد حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد ویانا مجبور ہو گیا کہ وہ پیرس سے گفت و شنید کرے' جس کے نتیجے میں ۱۷۳۸ء کا سمجھوتہ عمل میں آیا۔ مغربی یورپ میں فوجی اور سفارتی کامیابی اسپین کے ساتھ اتحاد' متعدد صوبوں کا جذبہ خیر سگالی اور سویڈن اور آسٹریا کی فرماں برداری------ ان تمام عوامل کے سبب فرانس کو ایک ایسا امتیازی درجہ حاصل ہو گیا جس کی لوئس چاردہم کے ابتدائی زمانے کے بعد سے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اسی سال اس میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب فرانس کے سفارت کاروں نے سلسلہ جنبانی شروع کر کے آسٹریا اور روس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ جنگ بندی کر لیں (۳۹-۱۷۳۵ء) اس طرح بہت سارے علاقے جن پر ان دونوں مشرقی سلطنتوں نے قبضہ کر رکھا تھا' ترکوں کو واپس مل گئے۔

یورپ میں ہونے والے ان واقعات سے برطانیہ والپول کی سرکردگی میں یکسر چشم پوشی کر رہا تھا

لیکن مغربی خطے میں فرانس کے حلیف ملک اسپین کے ساتھ ہونے والی مسلسل جھڑپوں سے جہاں تجارتی مفاد معرض خطر میں تھا وہاں مخالف سیاست دان حد سے زیادہ فکر مند تھے کیونکہ نو آبادیات کی منافع بخش تجارت اور بسنے والوں کے جھگڑے جنگ کا سبب بن گئے۔ انگلستان اور اسپین کے درمیان ہونے والی یہ نتیجہ خیز جنگ جس کی منظوری والپول نے بادل نخواستہ اکتوبر ۱۷۳۹ء میں دی تھی' چھوٹے پیمانے کی علاقائی محاذ آرائی کے اس سلسلے کی مانند تھی جو ان دونوں ملکوں کے مابین اٹھارھویں صدی میں ہوتی رہی تھی۔ لیکن اس دفعہ فرانس نے اسپین کو ہر قسم کی مدد دینے کا فیصلہ کیا تھا' خصوصاً کیریبین کا علاقہ عبور کر کے۔ اگر اس کا ہسپانوی تخت نشینی کی جنگ (۱۳-۱۷۰۲ء) سے موازنہ کیا جائے تو بوربن کی طاقتیں سمندر پار کے علاقے میں برتری حاصل کرنے کی بہتر پوزیشن میں تھیں۔ اس کے برعکس برطانیہ کی بری اور بحری افواج ہسپانوی نو آبادیات پر قبضہ کرنے کی اہل نہ تھیں جیساکہ اس ملک کے سیاسی پنڈت یقین کر رہے تھے۔

شہنشاہ چارلس ششم کی وفات' ماریا تھریسا کی تخت نشینی اور ۴۱-۱۷۴۰ء کے موسم سرما میں فریڈرک اعظم کا موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلیسیا پر قبضہ کرنے کا فیصلہ ------- ان تمام باتوں نے صورت حال کو یکسر بدل کر رکھ دیا کیونکہ اس وقت سب کی توجہ ایک بار پھر براعظم کی طرف مبذول ہو گئی۔ فرانس میں موجود آسٹریا کے مخالف حلقوں نے پروشیا اور بویریا کی کھل کر حمایت کی جب انہوں نے ہیبزبرگ کی وراثت پر اپنا حق حاصل کرنے کے لئے حملہ کیا۔ اس کے نتیجے میں انگلستان اور آسٹریا کے مابین پرانا اتحاد پھر قائم ہو گیا۔ اس سے محصور ماریا تھریسا کو اچھی خاصی مراعات حاصل ہو گئیں۔ برطانوی حکومت نے قیمت ادا کر کے پروشیا اور سیکسونی کو جنگ سے الگ رکھنے کی بات چیت کر کے اور ۱۷۴۳ء میں ڈیٹنگن پر لشکر کشی کر کے آسٹریا کو امن و سکون فراہم کیا' ہنوور کو تحفظ دیا اور جرمنی سے فرانس کے اثرات ختم کر دیئے۔ جب ۱۷۴۴ء میں انگلستان اور فرانس کی آپس کی دشمنی باقاعدہ خون ریزی میں تبدیل ہو گئی تو پھر یہ جنگ بڑے پیمانے پر پھیل گئی۔ فرانسیسی فوج شمال کی جانب پیش قدمی کر گئی۔ پھر آسٹریا کے زیر حکومت نیدرلینڈ کے سرحدی قلعوں کو مجبور کر کے چھروں میں محفوظ ولندیزیوں کے علاقے کی طرف بڑھ گئی۔ چونکہ سمندروں میں بوربن کے بحری بیڑوں کا کوئی اہم مقابلہ نہ تھا' لہٰذا برطانیہ کی رائل نیوی نے فرانس کی تجارت کی سخت ناکہ بندی کر دی۔ سمندر پار علاقوں میں حملے اور جوابی حملے تواتر کے ساتھ ویسٹ انڈیز' سینٹ لارنس کے دریائی علاقے' مدراس کے قریب اور لیونٹ کے تجارتی راستے پر ہوتے رہے۔ پروشیا جو ۱۷۴۴ء میں دوبارہ آسٹریا کے مقابلے پر اتر آیا' اسے دو سال بعد مجبور کر کے جنگ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ برطانیہ سے حاصل ہونے والی مالی امداد آسٹریا کو منظم کیے ہوئے تھی۔ اسی سے ہنوور کو بچانے کے لیے کرائے کے سپاہی بھی بھرتی کیے جاتے اور نیدرلینڈ کے دفاع کے لیے روسی سپاہیوں کی خدمات بھی حاصل کی جاتیں۔ اٹھارھویں صدی کے معیار کے مطابق جنگ لڑنے کا یہ طریقہ بہت ہی مہنگا تھا۔ چنانچہ بہت سے برطانوی باشندوں نے ٹیکس میں اضافے اور ملک کے مقروض ہونے پر شور مچایا۔ تاہم یہ تمام حالات زبوں حال فرانس کو آہستہ آہستہ صلح کی جانب بڑھنے پر مجبور کر رہے تھے۔

مذکورہ بالا دو اہم جغرافیائی اور مالیاتی عناصر نے بالآخر برطانیہ اور فرانس کو مجبور کیا کہ وہ ایکس لا چپل کے صلح نامے (۱۷۴۸ء) کے ذریعے آپس کے اختلافات طے کر لیں۔ اس وقت ولندیزی فرانس کی فوج کے رحم و کرم پر تھے۔ لیکن کیا اس سے فرانس کی شکنجے میں کسی ہوئی بحری تجارت یا اس کی اہم نو آبادیات کے چھن جانے کی تلافی ہو سکتی تھی؟ برسبیل تذکرہ سینٹ لارنس میں لوئس برگ پر برطانیہ کا

قبضہ اور آسن اور ہاک کی بحری فتح آخر کس کام کی جب کہ فرانس نے بلجیم اور ہالینڈ کو اپنی دسترس میں لے لیا؟ بالآخر حالات سابقہ کے لیے مفارتی سطح پر گفت و شنید ہوئی۔ البتہ سلیسیا پر فریڈرک کی فتح کا موضوع اس سے مستثنیٰ تھا۔ اس زمانے میں اور بعد کے تاریخی پس منظر میں ایکس لا چپل کا صلح نامہ محض ایک صلح کی حیثیت ہی رکھتا تھا نہ کہ یہ تصفیہ کا مظہر تھا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ماریا تھریسا پروشیا سے بدلہ لینے کی مشتاق تھی' فرانس سمندروں اور میدانوں میں فتح حاصل کرنے کا آرزومند تھا اور برطانیہ اس فکر میں غلطاں تھا کہ اس کا سب سے بڑا دشمن اس بار براعظم کی جنگ میں کس طرح شکست سے دوچار ہو گا۔

شمالی امریکہ کی نو آبادیوں میں بسنے والے برطانوی اور فرانسیسی افراد جنہیں انڈین اور مقامی سپاہیوں کی اعانت حاصل تھی' ۱۷۵۰ء کے ابتدائی عشرے میں آپس میں مسلسل لڑتے رہے تھے۔ ان حالات میں لفظ "صلح" بے معنی سا لگتا تھا۔ ان جھگڑنے والوں پر مقامی حکومت کا کنٹرول نا ممکن ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ملک کا محب وطن طبقہ اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ اپنے نو آبادکاروں کی حمایت کی جائے۔ اس کا یہ نظریہ تھا کہ ایک بنیادی جنگ نہ صرف اوہیو اور مسی سپی کے علاقے کے لیے بلکہ کینیڈا' کریبین' انڈیا' بلکہ ساری غیر یورپی دنیا کے لیے لڑی جانے والی ہے۔ ۱۷۵۵ء کے آتے آتے ہر فریق اپنی فوجی کمک روانہ کرتا رہا اور بحریہ کو جنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ دوسرے ملکوں نے انگلستان اور فرانس کے درمیان متوقع لڑائی کے پیش نظر خود کو حالات کے مطابق چلنے کی پالیسی اپنائی۔ اسپین اور متحدہ صوبے اب اقتدار کے درمیانی درجے میں تھے۔ انہیں دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ مغرب کی ان دو وسیع و عریض سلطنتوں کے درمیان پس کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ غیر جانب دار رہنے میں ہی ان کی عافیت تھی۔ البتہ اس صورت حال میں ولندیزی تاجروں کو ماضی کی طرح اب بھی مشکلات کا سامنا تھا۔

آسٹریا' پروشیا اور روس جیسی مشرقی سلطنتوں کے لیے ۱۷۵۰ء کے وسطی عشرے میں انگلستان اور فرانس کے درمیان ہونے والی جنگ سے گریز ممکن نہ تھا اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ بعض فرانسیسیوں کی اس رائے کے باوجود کہ یہ جنگ سمندروں اور نو آبادیاتی علاقوں میں لڑی جائے' عام رجحان یہی تھا کہ ہنوور کے راستے برطانیہ پر حملہ کیا جائے۔ یعنی اہل جزائر کے نہایت اہم فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنا کر اس فیصلے سے جہاں جرمنی کی ریاستیں ہوشیار ہو گئیں وہاں برطانیہ بھی ایسے اتحادیوں کو تلاش کرنے لگا جو فوجی اعانت کے ذریعے براعظم پر فرانس کے تسلط کو روکیں۔ دوسری وجہ اس سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ اہل آسٹریا' پروشیا سے اپنا علاقہ سلیشیا دوبارہ حاصل کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ ادھر روس بھی زارینہ الزابتھ کی سرکردگی میں بے عزت اور لالچی فریڈرک کو سزا دینے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔ ان تمام طاقتوں نے اپنے اپنے طور پر معقول قسم کی فوج تیار کر لی تھی۔ پروشیا کے پاس ۱۵۰۰۰۰ سے زائد فوجی تھے۔ آسٹریا کے پاس تقریباً ۲ لاکھ فوج تھی۔ روس کی فوج ۳۳۰۰۰۰ افراد پر مشتمل تھی۔ یہ سب لوگ حملہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان سبھی کو مغربی ممالک کی امداد کی ضرورت بھی تھی تاکہ اپنی افواج کو اعلیٰ معیار کے مطابق رکھ سکیں۔ بہرحال یہ بات بھی منطقی تھی کہ ان مشرقی دشمنوں میں سے کسی کو پیرس یا لندن میں کوئی "ساتھی" مل جاتا تو وہ اپنے دیگر حلیفوں کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کرتا۔

بہرحال ۱۷۵۶ء کا یہ "سفارتی انقلاب" فوجی حکمت عملی کے پیش نظر محض تاش کے پتوں کا

ان پھیر تھا۔ فرانس نے ہیبسبرگ سلطنت کے ساتھ اپنے تمام پرانے اختلافات ختم کر دیئے اور پروشیا کے خلاف آسٹریا و روس کی جنگ میں ان دونوں ملکوں کا ساتھ دیا۔ برلن ویانا کی بجائے لندن کا براعظمی ساتھی بن گیا۔ پہلی نظر میں فرانس' آسٹریا اور روس کا یہ اتحاد خوش آئند نظر آتا تھا۔ فوجی نقطہ نظر سے یہ فی الواقع بہت بہت بڑا اتحاد تھا۔ ۱۷۵۷ء میں فریڈرک اپنی ساری مقبوضات سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ڈیوک آف کمبرلینڈ کی انگریز۔ جرمن فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے اس عمل سے ہنوور اور پروشیا کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ منارکا فرانس کے قبضے میں آگیا۔ دور دراز کے محاذوں پر بھی فرانس اور اس کے اتحادی فتح حاصل کر رہے تھے۔ اب اینرپخٹ کی صلح اور آسٹریا کے تعلق سے ایکس لا چپیل کے معاہدے کو کالعدم دینا ممکن ہو گیا۔

لیکن مذکورہ خدشات کے روبہ عمل نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انگلستان اور پروشیا کا اتحاد ان تین باتوں کی وجہ سے نہایت مستحکم تھا: قیادت' مالی استحکام اور بری و بحری افواج کی مہارت۔ اس امر میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا کہ فریڈرک نے حصول فتح کے لیے جہاں پروشیا کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا وہاں میدان جنگ میں اس کی اپنی سپہ سالاری بھی قابل ستائش تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کا اعزاز تو پٹ ہی کو جاتا ہے۔ وہ سلطنت کا کرتا دھرتا ہی نہ تھا' بلکہ ایک ممتاز سیاست دان بھی تھا جو حساس اور حاسد قسم کے رفیق کاروں سے نمٹتا بھی تھا' متلون مزاج عوام کا بھی سامنا کرتا' ایک نئے بادشاہ کا بھی خیال رکھتا اور ان تمام الجھنوں کے ساتھ ساتھ موثر قسم کی حکمت عملی بھی اختیار کرتا تھا۔ ان موثر اقدامات کو اتنی آسانی سے نہ ختم کیا جا سکتا تھا نہ فرانس کی حمایت یافتہ نوابوں کو توڑا جا سکتا تھا۔ یہ نوآبادیاتی مفادات کیسے ہی اعلیٰ کیوں نہ رہے ہوں' ان کی حیثیت عارضی ہوتی اگر دشمن ہنوور پر قبضہ کر لیتے اور پروشیا کو تہس نہس کر دیتے۔ پٹ مسلسل یہ محسوس کر رہا تھا کہ حتمی فتح حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ براعظم کو پیش نظر رکھتے ہوئے بحری جنگ کی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ یعنی فریڈرک کی اپنی فوج کو وسیع پیمانے پر مالی امداد فراہم کی جائے اور جرمنی میں "مشاہداتی فوج" کو اجرت ادا کی جائے تاکہ اس طرح ہنوور کو بچایا جائے اور فرانس کو برقرار رکھنے میں مدد دی جا سکے۔

لیکن اس پالیسی کا انحصار ایسے معقول اور مناسب وسائل کی فراہمی پر تھا جنھیں سال بہ سال کے جنگی اثرات سے محفوظ بھی رکھنا تھا۔ فریڈرک اور اس کے افسران محصول نے پروشیا سے رقم حاصل کرنے کے لیے ہر جتن آزمایا' لیکن برطانیہ کے مقابلے میں اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ جب جنگ اپنے عروج پر تھی تو اس وقت انگلستان کے ۱۲۰ بحری بیڑے مستعد کھڑے تھے اور اس کے پاس دو لاکھ سے زائد سپاہی تھے جن میں کرائے کے جرمن فوجی بھی تھے۔ ان سب کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ یہ ملک پروشیا کی مالی اعانت بھی کر رہا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سات سالہ جنگ کے دوران سرکاری خزانے سے ۱۶۰ ملین پونڈ کی رقم خرچ کی گئی جس میں ۶۰ ملین پونڈ (یعنی ۳۷ فی صد) کی وہ رقم بھی شامل تھی جو بازار زر سے حاصل کی گئی تھی۔ اس بڑھتے ہوئے قومی قرض سے پٹ کے رفقاء فکر مند ہو گئے اور ان کی یہ تشویش اکتوبر ۱۷۶۱ء میں اس کے زوال پر منتج ہوئی۔ تاہم سمندر پار ملکوں میں ملکی تجارت سال بہ سال ترقی کر رہی تھی' ان کی محصول سے آمدنی میں اضافہ بھی ہو رہا تھا اور خوشحالی بھی آ رہی تھی۔ یہ ایک عدیم المثال بات تھی کہ حاصل شدہ منافع "طاقت" میں تبدیل ہو رہی تھی (یعنی ویسٹ انڈیز میں) پروشیا میں برطانوی سفیر کو یہ پیغام دیا گیا تھا۔ "ہمیں سپاہی سے پہلے تاجر ہونا چاہئے...... تجارت اور بحری فوج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں...... دولت جو کسی ملک کے وجود کا اصلی وسیلہ ہوتا ہے' تمام تر تجارت کا مرہون منت ہے" اگر موازنہ کیا جائے تو اس جنگ کے دیگر شرکاء کی اقتصادی حالت بھی خاصی بدتر ہو گئی تھی۔ خود فرانس کی جو صورت حال ہوئی اس کا اظہار نہایت تاسف کے ساتھ وزیر چوسئیل نے یوں کیا تھا:

> "یورپ کی موجودہ صورت حال میں یہ نو آبادی' تجارت اور بحری قوت ہے جو براعظم میں طاقت کے توازن کا تعین کرے گی۔ آسٹریا اور روس کی پارلیمنٹ اور پروشیا کا بادشاہ ---- یہ سب دوسرے درجے کی طاقت ہیں جو اقتصادی سہارے کے بغیر جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے"

ابتدائی ناکامیوں کے بعد انگلستان اور پروشیا کے اتحاد سے جس قسم کی بری اور بحری صلاحیت پیدا ہوئی وہ کچھ اس انداز سے بروئے کار آئی۔ برطانیہ کی شاہی بحری نے آسن کی قیادت میں بحراوقیانوس میں واقع فرانس کی بندرگاہوں کی ناکہ بندی کر دی۔ نیز اس نے اپنی فوج کے بیشتر حصے کی مدد سے طولون کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوئے بحیرہ روم میں اپنی طاقت پھر سے بحال کر لی۔ جب بحری بیڑوں نے حرکت شروع کی تو کارنا گونا' لاگوس کے اس پار اور دیگر علاقوں میں برطانیہ کے فن جہاز رانی کی اکثر و بیشتر دھاک بیٹھتی رہی۔ مزید برآں ناکہ بندی کی اس پالیسی پر ہر موسم میں عمل کیا جاتا تھا اور حفاظتی دستے کو تمام سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ اس طرح فرانس کی بحری طاقت کو خاصا نقصان پہنچایا گیا' لیکن اس کے برعکس برطانیہ کی تجارت اور علاقے کی پوری پوری حفاظت کی گئی۔ علاوہ ازیں فرانس کی فوجی کمک جو ویسٹ انڈیز' کینیڈا اور ہندوستان روانہ کی جا رہی تھی' اس میں مزاحمت کی گئی۔ ۱۷۵۹ء میں فرانس کی دنیا بھر میں ہر طرف پھیلی ہوئی نو آبادیات بتدریج برطانیہ کے تسلط میں آنے لگیں۔ پھر منڈین میں انگلستان اور جرمنی کی مشترکہ فوجوں کو فرانس کے دو عسکری دستوں پر فتح حاصل ہو گئی۔ جب اسپین نے ۱۷۶۲ء میں اس جنگ میں شریک ہونے کی حماقت کی تو کر-لیبین اور فلپائن میں واقع اس کی نو آبادیات کا بھی یہی حشر ہوا۔

اسی دوران برنیڈنبرگ کی پارلیمنٹ کو معجزاتی کامیابیاں حاصل ہو چکی تھیں۔ رو سیچ اور لیوتھن کی جنگوں میں فریڈرک نے فرانس اور آسٹریا کی فوجوں کو یکے بعد دیگرے شکست دے دی اور انھیں شمالی جرمنی سے روابط بڑھانے میں ناکام بنا دیا۔ جب فریڈرک نے ۱۷۶۰ء میں آسٹریا والوں کو لیگنز اور تورگاؤ کے مقام پر گرفتار کیا اس وقت ویانا بری طرح دیوالیہ ہو چکا تھا۔ غرض ان محاذ آرائیوں کے اخراجات نے پروشیا کی طاقت کو آہستہ آہستہ گھٹا کر رکھ دیا۔ صرف ۱۷۵۹ء میں اس کے ساٹھ ہزار سپاہی ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے برعکس روسی فوج زیادہ با اثر اور مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو فریڈرک سے زارینہ الزابتھ کی نفرت تھی دوسرے روسی فوج سے معرکہ آرائی گویا خون میں نہانے کے مترادف تھی۔ جہاں دوسرے لڑنے والے اپنی رفتار آہستہ کرنے کے متمنی نظر آتے تھے وہاں فرانس بھی برطانوی حکومت سے روابط بڑھانا چاہتا تھا جبکہ موخرالذکر خود بھی صلح کی آرزو مند تھی۔ اس کے برعکس پروشیا اس زعم میں مبتلا تھا کہ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر آسٹریا اور روس کو خلیج کے پار روکے رکھے گا۔ لیکن ۱۷۶۲ء میں الزابتھ کی وفات سے انھیں بچنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد روس کے نئے حکمران زار پیٹر نے نہایت جلد جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس صورت حال میں آسٹریا اور فرانس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اس شرط کے ساتھ صلح کر لیں کہ جنگ سے پہلے یورپ میں انھیں جو مقام و مرتبہ حاصل تھا وہ مل جائے۔ یہ دراصل ان لوگوں کی شکست و ناکامی کا سبب بن گیا جو پروشیا کو گرانے کے درپے تھے۔

۳۔ ۱۷۶۳ء کے معاہدے کا جزائر برطانیہ کو ہی سب سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ اگرچہ اس ملک کو اپنے بہت سے مقبوضہ علاقے فرانس اور اسپین کو واپس کرنے پڑے لیکن اس کے باوجود اس نے ویسٹ انڈیز اور مغربی افریقہ میں اپنے قدم جما لیے اور اس نے ہندوستان سے فرانس کے تمام اثر و رسوخ بھی ختم کر دیے اور سب سے اہم بات یہ کہ براعظم شمالی امریکہ کے مقابلے میں یہ ملک سب سے اعلیٰ مقام کا حامل بن چکا تھا۔ اب برطانیہ لورین' سلیسیا اور دیگر علاقائی ملکوں سے جن کے لیے براعظم کی ریاستوں نے شدید جنگیں لڑیں' مقبوضات اور دولت میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے اندرون یورپ' فرانس کے سفارتی اور فوجی عزائم کی بیخ کنی بھی کی تھی۔ اس طرح طاقت کا عمومی توازن برقرار رکھا تھا۔ اگر موازنہ کیا جائے تو فرانس نہ صرف سمندر پار ملکوں میں سب کچھ کھو چکا تھا بلکہ ۱۷۴۸ء کے برعکس اب یورپ میں بھی ناکام ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی ناکام فوجی کاروائیوں کے پیش نظر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اب پرکشش محور یورپ کے مغرب سے مشرق کی سمت منتقل ہو گیا ہے۔ فرانس کے ان حتمی جذبات کا اظہار ۱۷۴۸ء میں ہی ہو گیا تھا جب پہلی مرتبہ پولینڈ کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔ لیکن یہی سارے عوامل برطانیہ کے لیے سازگار ثابت ہوئے۔ وہ یورپ سے باہر حاصل ہونے والی برتری سے مطمئن تھا۔ اب وہ اس براعظم کے کسی بکھیڑے میں ملوث ہونے کا خواہشمند نہیں رہا تھا۔

فیصلہ کن جنگیں۔ ۱۷۶۳ء۔ ۱۸۱۵ء

انگلستان اور فرانس کے درمیان ہونے والی جنگ کے دوسرے دور سے قبل ایک عشرے تک سکون کی جو فضا قائم رہی اس نے برطانیہ کی قسمت کے پلٹا کھانے کی جانب چند اشارے کیے تھے۔ سات سالہ جنگ کے نتیجے میں بڑی طاقتوں پر ٹیکس اور سماجی عناصر کا جو بے پناہ دباؤ پڑا تھا اس کے پیش نظر بہت سے لیڈر خارجہ پالیسی سے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں باطنی تطہیر اور اصلاحات کا عام رواج ہو گیا تھا۔ پروشیا کے لیے یہ جنگ گراں ثابت ہوئی تھی کیونکہ اس جنگ میں اس کے ۵ لاکھ شہری اور ایک لاکھ اسی ہزار سپاہی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس سے فریڈرک کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اب اس نے گوشہ تنہائی اختیار کر لی تھی۔ اگرچہ سلطنت ہیبسبرگ کے تین لاکھ افراد لڑائی میں ہلاک ہوئے تھے' پھر بھی اس کی فوج کی کارکردگی اتنی خراب نہ تھی تاہم حکومت کے انتظامی امور میں تبدیلی کی ضرورت تھی لیکن خدشہ تھا کہ مقامی طور پر اس بات سے ناراضگی پھیلے گی خصوصاً" ہنگری کے لوگوں میں اس بات کا بھی دھڑکا لگا تھا کہ ماریا تھریسا کے وزیروں کی توجہ اس جانب مبذول ہو جائے گی۔ روس میں کیتھرین دوم قانونی اور انتظامی اصلاحات میں الجھی ہوئی تھی۔ پھر اسے پوگا چیف کی بغاوت (۷۵۔۱۷۷۳ء) کو بھی کچلنا پڑا۔ لیکن اس سے روس کے توسیعی عزائم میں کچھ فرق نہیں پڑا نہ ہی پولینڈ کی آزادی کو کم کرنے کی کوششیں ماند پڑیں۔ لیکن یہ سب سراسر مقامی معاملات تھے۔ ان کا یورپ کے اس عظیم اتحاد سے کوئی میل نہ تھا جس نے سات سالہ جنگ کے دوران اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ مغربی سلطنتوں سے روابط کی اب چنداں اہمیت نہ تھی۔

برطانیہ اور فرانس میں بھی ملکی معاملات خاصی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ دونوں ملکوں میں قومی قرض میں شدید اضافہ ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں آمدنی کے نئے نئے ذرائع تلاش کیے جانے لگے اور انتظامی امور میں اصلاحات ناگزیر ہو گئیں۔ اس سے ایک تنازع کھڑا ہو گیا۔ جارج سوم اور حزب اختلاف کے درمیان جو چپقلش تھی وہ اور بھی افزوں ہو گئی۔ ادھر فرانس میں بھی بادشاہ اور پارلیمنٹ کے مابین کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ان اقدامات نے یورپ کے ضمن میں برطانیہ کی خارجہ پالیسی کو پٹ کے دور کے برعکس خاصا الگل بچو بنا دیا۔ اس رجحان کی وجہ دراصل امریکی نوآبادکاروں سے آئے دن ٹیکس کے معاملے میں لڑائی تھی۔ پھر تجارت اور جہاز رانی کے قانون کا نفاذ بھی اس کا شاخسانہ تھا۔ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے اس کی خارجہ پالیسی پر اندرونی معاملات مطلق اثر انداز نہیں ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۷۶۳ء کی شکست کے بعد چوشیل اور اس کے جانشین بہت سنبھل گئے تھے۔ اب وہ مستقبل میں فرانس کی پوزیشن مضبوط کرنے کے سلسلے میں ضروری اقدامات کر رہے تھے۔ اقتصادی کفالت اپنانے کی ضرورت کے باوجود فرانسیسی بحریہ کو مستحکم کیا جا رہا تھا۔ اسپین کے ساتھ "خاندانی روابط" کو مزید پائیدار بنایا جا رہا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۷۷۰ء میں جب فاکلینڈ جزائر کے سلسلے میں اسپین اور برطانیہ میں جھڑپ ہوئی تو اول الذکر کی حوصلہ افزائی کرنے پر

چوشیل کو شاہ لوئس پنج دہم کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس خفگی کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت بڑی طاقت کی یہ جنگ اقتصادی طور پر تباہی کا باعث بن سکتی تھی۔ بہرحال فرانس کی برطانیہ کے خلاف رقیبانہ پالیسی جوں کی توں برقرار رہی اور اول الذکر کی یہی کوشش رہی کہ برطانوی حکومت کو سمندر پار جس مسئلے سے بھی دوچار ہونا پڑے' اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب امریکی نو آبادکاروں کے ساتھ لندن والوں کا قضیہ کھلی جارحیت میں تبدیل ہو گیا تو برطانیہ ۱۷۳۹ء یا ۱۷۵۶ء کے برعکس اس وقت بہت سی وجوہات کی بناء پر خاصی کمزور پوزیشن میں تھا۔ اس کی زمہ ار چند شخصیات تھیں۔ اس دور میں نہ تو نارتھ نہ ہی شیلبرن نہ کسی اور سیاست دان نے قومی قیادت کا نمونہ پیش کیا اور منضبط قسم کی شاندار حکمت عملی اختیار کی۔ بلکہ سیاست میں دھڑے بازی پیدا ہو گئی جو شاہ جارج سوم کی مداخلت اور امریکی نو آبادکاروں کے معاملے میں تیز و تند تقریروں سے اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو گئی۔ اس رویے نے قوم کو مختلف نظریاتی طبقات میں تقسیم کر دیا۔ مزید برآں برطانوی طاقت کے دو محور۔۔۔۔ یعنی اقتصادیات اور بحریہ۔۔۔ انہی دنوں خاصے گہنا گئے۔ سات سالہ جنگ کے نتیجے میں برآمدات میں جو ترقی ہوئی تھی' اس میں ۱۷۷۰ء کے تمام عشرے کے دوران کمی آتی چلی گئی۔ اس کی ایک وجہ تو نو آبادکاروں کا بائیکاٹ تھا جبکہ دوسری فرانس' اسپین اور نیدرلینڈ کے ساتھ محاذ آرائی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ پندرہ سالہ امن کے دوران برطانیہ کا شاہی بیڑا ضعف کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے بعض فلیگ آفیسر انتہائی ناموزوں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۷۷۸ء میں فرانس نے جنگ کا آغاز کیا تو اس موقع پر ناکہ بندی کی حکمت عملی سے انحراف کرنے کا فیصلہ عارضی طور پر برطانیہ کے جہازوں کے لیے تو مفید ثابت ہوا ہو گا لیکن عملاً" یہ سمندری قیادت سے دست برداری کے مترادف تھا۔ جبرالٹر' ویسٹ انڈیز اور شمالی امریکہ کے ساحلی علاقوں کو بھیجے جانے والے امدادی دستے یوں بے معنی تھے کہ فرانس کے ساحلوں کے آس پاس مغربی طاقتوں کا موثر کنٹرول تھا۔ لہٰذا دور دراز علاقوں میں جانے والے دشمنوں کے بحری بیڑوں کی راہ میں مزاحمت پیدا کی جاتی تھی۔ جبکہ شاہی بحریہ کی طاقت دوبارہ بحال ہو گئی اور اس کی برتری قائم کر دی گئی' سینٹ پر رودنی کو فتح حاصل ہو گئی اور ۱۷۸۲ء میں جبرالٹر کو ہووکی امدادی کھیپ بھیجی گئی' اس وقت امریکہ میں جنگ حقیقی معنوں میں بند ہو چکی تھی۔

اس حقیقت کے باوجود کہ بحریہ پوری طرح مسلح تھی اور ملک کو صحیح قیادت بھی نصیب ہو چکی تھی' ۸۳-۱۷۷۶ء کی جنگ میں دو فنی قباحتیں ایسی تھیں جو اٹھارھویں صدی کے دوران لڑی جانے والی برطانیہ کی کسی بھی لڑائی میں نہیں پائی گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ جیسے ہی امریکیوں کی بغاوت پھیلی' اس کو کچلنے کے لیے ۳۰۰۰ میل دور جو برطانوی فوج روانہ کی گئی اس کے نتیجے میں اس براعظم میں وسیع پیمانے پر جنگ کا آغاز ہو گیا۔ لندن کی امید کے برعکس بحری طاقت نو آبادکاروں کو جھکنے پر مجبور نہ کر سکی۔ (اگرچہ اس کی بدولت یورپ سے فوجی کمک پہنچنے میں کمی ضرور ہوئی) امریکہ کے تمام مشرقی علاقوں کے قبضے میں لے کر وہاں تسلط قائم کرنا نپولین جیسے شخص کی عظیم فوج کے لیے خاصا مشکل کام تھا تو ۱۷۷۰ء کے عشرے کی برطانوی فوج کا کیا ذکر! خاصی دوری حائل ہونے اور مواصلات میں شدید تاخیر پیدا ہونے کی وجہ سے نہ صرف لندن اور نیویارک سے دی جانے والی جنگی ہدایت میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں بلکہ رسد کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ امریکہ میں تعینات برطانوی فوج کے لیے بسکٹ' نفری اور بولٹ تین ہزار میل دور سمندر پار سے بھیجا جاتا تھا۔ انگلستان کی وزارت جنگ کی بہتر کارکردگی کے باوصف ہونے کے باوجود جہازوں کی کمی اور پھر ان کا

حصول مشکلات کا سبب بن گیا تھا۔ علاوہ ازیں نو آبادیاتی معاشرہ اس درجہ منتشر تھا کہ کسی ایک علاقے کو زیر کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ جب تک کسی علاقے میں برطانوی دستہ موجود رہتا وہاں انگلستان کا سکہ چلتا۔ پھر جونہی یہ فوجی لوگ وہاں سے واپس آ جاتے باغی لوگ حکومت کے حمایتوں کو اپنا ہم نوا بنا لیتے۔ جب دو عشرہ پہلے فرانسیسی کینیڈا پر قبضہ کرنے کے لیے ۵۰ ہزار برطانوی سپاہیوں اور نو آبادیاتی آبادیوں کی حمایت کی ضرورت پڑی تھی تو اب شاہی تسلط کو قائم رکھنے کے لیے کتنے سپاہیوں کی ضرورت تھی۔۔ ۱۵۰۰۰ لاکھ یا شاید ۲۰۰۰۰۰ لاکھ! ایک مورخ کے بقول "امریکہ میں برطانوی تسلط از سرنو قائم کرنا ایک ایسا مسئلہ تھا جسے فوجی ذرائع مطلق حل نہیں کر سکتے تھے' چاہے کتنے ہی منظم طریقے سے انہیں استعمال کیا جاتا۔"

اس فوجی حکمت عملی کا دوسرا نقص یہ تھا کہ برطانیہ نے تنہا جنگ لڑی تھی۔ اس کے یورپی اتحادیوں نے فرانس کو بے بس کرنے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ فوجی نوعیت کا نہیں بلکہ سفارتی سطح کا تھا۔۔۔۔ یعنی ۱۷۶۳ء کے بعد سے برطانیہ پروشیا سے علیحدگی اختیار کرنے کی قیمت ادا کر رہا تھا' اسپین کے ساتھ اس کا رویہ سراسر متکبرانہ تھا۔ ڈنمارک اور متحدہ صوبہ جات جیسی غیر جانب دار ریاستوں کے جہاز رانوں کے ساتھ اس کا لین دین نہایت سخت اور درشت تھا جبکہ یہ روس کی حمایت حاصل کرنے میں بھی ناکام رہا تھا۔ اس طرح لندن کا پورے یورپ میں کوئی دوست نہیں رہا تھا۔ ۱۷۸۰ء کے قریب اسے غیر جانب دار مسلح لیگ (روس' ڈنمارک' پرتگال) اور جارحیت پسند متحدہ صوبوں کا بھی سامنا تھا۔ پھر امریکی باغیوں اور فرانس و ہسپانوی بحری بیڑوں سے مسلسل نمٹنے کی وجہ سے بھی وہ دباؤ کا شکار تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے' ۱۷۶۰ء اور ۱۷۷۰ء کے عشرے کے دوران مشرقی سلطنتوں کی دلچسپیاں مغربی سلطنتوں کے برعکس بدل چکی تھیں۔ اب وہ اپنی تمام تر توجہ پولینڈ کے مستقبل' بوارین کی جانشینی کے مسئلے اور ترکوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے پر مبذول کیے ہوئے تھیں۔ اگر فرانس لوئس چہاردہم کے عہد کی طرح یورپ کا "حاکم کل" بننے کا ارادہ کر لیتا تو حالات یقیناً" دگرگوں ہو جاتے۔ لیکن سات سالہ جنگ کے بعد اس کی فوج کا زوال اور مشرق میں اس کی سیاسی مصروفیات کی کمی کا مطلب یہ تھا کہ ۱۷۷۹ء کے بعد لندن فرانس کے منصوبے کے متعلق جن خدشات کا شکار تھا ان سے اس کے سابق اتحادی کوئی اثر نہیں لے رہے تھے۔ البتہ اہل روس کیتھرین دوم کی فرماں روائی کے دوران ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ لیکن اس وقت تک اقدام کرنے سے گریزاں تھے جب تک یہ خطرہ کہ برطانیہ کو بالکل ہی ختم کر دیا جائے گا پوری طرح سامنے نہ آ جائے۔

یہ ایک اہم حقیقت تھی کہ ایک دفعہ تو فرانس نے چوشیل کی سابقہ رائے کو اختیار کیا اور اب ہنوور پر حملہ کرنے یا ہالینڈ کی گوشمالی کرنے سے کتراتا رہا تھا۔ چونکہ اب برطانیہ کے خلاف جنگ سمندر پار ملکوں میں لڑی جانے والی تھی' لہٰذا برطانوی بحریہ کی جنگی حکمت عملی جو روایتی بھی تھی' براعظم یورپ میں مروج حربی اصول میں تبدیلی کا باعث بن رہی تھی۔ ادھر فرانس پہلی مرتبہ بحریہ اور نو آبادیاتی جنگ پر توجہ مبذول کر رہا تھا۔

اس کے نتائج اچھے نکلے۔ پھر برطانیہ کے تنہائی پسندوں کی اس رائے کا ابطال بھی ہو گیا کہ اس قسم کی محاذ آرائی کسی جزیرائی حکومت کے لیے مفید تھی۔ سات سالہ جنگ کے دوران فرانسیسی بحریہ کے لیے صرف ۳۰ ملین لیور سالانہ مختص کیے گئے تھے۔ یہ رقم فرانس کے دفاع پر خرچ کی جانے والی رقم کا چوتھائی حصہ تھی اور برطانوی شاہی بحریہ پر صرف کی جانے والی رقم کا پانچواں حصہ تھا۔ لیکن ۱۷۷۰ء کی دہائی

کے بعد فرانسیسی بحریہ کے لیے مختص رقم میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ۱۷۸۰ء میں یہ رقم ۱۵۰ ملین لیور تک پہنچ گئی جبکہ ۱۷۸۲ء میں یہی رقم بڑھ کر ۲۰۰ ملین ہو گئی۔ جب فرانس میدان جنگ میں اترا تو اس وقت اس کے پاس ۵۲ جہاز تھے جو پوری طرح مسلح اور چوکس تھے۔ ان میں سے کئی جہاز برطانیہ کے جہازوں سے زیادہ بڑے بھی تھے۔ جلد ہی فرانسیسی جہازوں کی یہ تعداد بڑھ کر ۶۶ ہو گئی۔ اس میں انھاون ہسپانوی جہازوں کا بیڑا اور پھر ۱۷۸۰ء میں بیس کار آمد جہازوں کا ولندیزی بیڑا بھی اس جھرمٹ میں شامل ہو گیا۔ واضح رہے کہ برطانیہ کی شاہی بحریہ دشمنوں کے ہر جنگی جہاز سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ تھی۔ (مثلاً" ۱۷۷۸ء میں اس کے ۶۶ جہاز تیار کھڑے تھے ۱۷۷۹ء میں ان کی تعداد ۹۹ ہو گئی) لیکن اب اس ملک کے جنگی جہازوں کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگی۔ ۱۷۷۹ء میں چینل پر بھی اس کا کنٹرول باقی نہیں رہا۔ لہٰذا فرانس اور ہسپانیہ کے حملے کا خطرہ نظر آنے لگا۔ ۱۷۸۱ء میں گریو اور ڈی گراس کے بیڑے جب چیسا پیک کے قریب آپس میں متصادم ہوئے تو اس وقت فرانس کی عددی برتری نے برطانوی سپاہ کو خلیج کے پار روکے رکھا۔ پھر اس صورت حال سے مجبور ہو کر کورنویلس نے یارک ٹاؤن کے مقام پر ہتھیار ڈال دیئے۔ نتیجتاً" امریکی مہم اپنے اختتام کو پہنچی۔ جب برطانیہ کی شاہی بحریہ وسعت میں دشمنوں کے بحری جہازوں سے کہیں زیادہ بڑی تھی (یعنی ۱۷۸۲ء میں اس کے ۹۴ جہاز تیار کھڑے تھے جبکہ فرانس کے ۷۳' اسپین کے ۵۴ اور متحدہ صوبوں کے ۱۹ جہاز لڑائی کے لئے مستعد تھے) اس کے باوجود اس میں تمام ضروری فرائض انجام دینے کی کماحقہ اہلیت نہ تھی۔۔۔ یعنی شمالی بحراوقیانوس میں جنگی جہازوں کے بدرقہ کی حفاظت' جبرالٹر کی گاہے بہ گاہے امداد' بالٹک کے نکاسی کے راستے کی کڑی نگرانی' بحر ہند میں فوجی دستوں کی روانگی اور کیریبین کے علاقے میں فوجی آپریشن کی حمایت الغرض برطانیہ کی بحری طاقت محض عارضی اور علاقائی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں پہلا جیسا دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ ویسے یہ بات جزائر والوں کے دگرگوں حالت کے پیش نظر بہتر تھی کہ فرانس اس وقت یورپ میں کوئی جنگ نہیں کر رہا تھا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۷۸۲ء میں بہت بڑی بحریہ کے اخراجات کی وجہ سے فرانس کی اقتصادی حالت خاصی بگڑ چکی تھی' لہٰذا چھانٹی کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اسے اپنی بحریہ کے سازو سامان رکھنے کے لئے گوداموں کا حصول خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر جہاز رانوں کی کمیابی بھی ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں فرانس کے وزراء کو اس بات کی تشویش تھی کہ اس جنگ کی وجہ سے ساری توجہ اور وسائل بیرون یورپ مرکوز ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے خود براعظم میں کوئی کردار ادا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس سیاسی تجزیئے کے پیش نظر اور ساتھ ہی اس خیال سے کہ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان جلد ہی کوئی تصفیہ ہو جائے گا' پیرس' فتنہ و فساد کے خاتمے کی امید کرنے لگا۔ برطانیہ اور امریکہ کے ولندیزی اور ہسپانوی اتحادی دونوں معاشی لحاظ سے زبوں حال تھے۔ خود برطانیہ کی پہلے جیسی وہ حالت نہیں رہی تھی۔ اب وہ شکست کے خطرات کو کالعدم نہیں کر سکتا تھا' نہ ہی اندرون ملک سیاسی جماعتوں کو قائل کر سکتا تھا کہ امریکہ کی شکست و زوال کے آثار دیکھ کر جنگ لڑنے کی حمایت کریں۔ اگرچہ ۱۷۸۳ء کی صلح و رسیلز (منارکا' فلوریڈا' ٹوباگو) کے مطابق برطانیہ کو جو مراعات حاصل ہوئی تھیں وہ ۱۷۶۳ء کے حاصل شدہ شاہی فوائد کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھیں' پھر بھی فرانس آزاد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قیام پر پوری طرح مطمئن تھا۔ اور اس سے برطانیہ کے عالمی وقار کو جو دھچکا لگا تھا' اس پر مسرور بھی! پیرس کے نقطہ نظر سے وہ فوجی توازن جو سات سالہ جنگ کے نتیجے میں بگڑ گیا تھا اب دوبارہ مکمل طور پر بحال ہو چکا ہے' اگرچہ اسے

اس کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

۱۷۶۳ء کے بعد کے تین عشروں کے دوران مشرقی یورپ میں فوجی توازن تین بڑی سلطنتوں کی باہمی لڑائیوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی نمایاں وجہ ان کے تعلقات کی مثلث نما کیفیت تھی۔ نہ برلن' نہ ویانا اور نہ ہی سینٹ برگ یہ چاہتے تھے کہ ان کے درمیان تھوڑا بہت اتحاد پیدا ہو جائے یا وہ سات سالہ جنگ کی سطح کی لڑائی میں ملوث ہو جائیں۔ بواریہ کی تخت نشینی کی مختصر مگر حد سے زیادہ محتاط جنگ (۱۷۷۸-۷۹ء) جبکہ پروشیا نے آسٹریا کے توسیعی عزائم کی مخالفت کی تھی' نے اس وسیع جذبے کو پوری طرح واضح کر دیا کہ بڑی طاقتوں کی محاذ آرائی اور اس کے اخراجات سے گریز اختیار کرنا چاہئے۔ مزید علاقوں پر قبضہ سفارتی معاملات کی بدولت ہی کیا جا سکتا تھا اور وہ بھی کمزور ممالک کو نقصان پہنچا کر۔۔۔۔۔ خصوصاً" پولینڈ کو جسے ۱۷۷۲-۳ء' ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء میں نہایت کامیابی سے قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔ آخری انقلاب کے دنوں میں انقلاب فرانس کا گہرا اثر پولینڈ پر پڑا تھا۔۔۔۔۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کیتھرین دوم نے وارسا کے "جیکوبین" کو نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوسرے پروشیا اور آسٹریا مغرب میں فرانس سے مات کھانے کے بعد مشرقی حصے میں مراعات کے طلبگار تھے لیکن انقلاب فرانس کے ان عوامل نے بھی باہمی دشمنی اور بے دلی سے ہونے والے سمجھوتے کے ان بنیادی اور بے دلی سے ہونے والے سمجھوتے کے ان بنیادی رجحانات کو ختم نہیں کیا تھا جن کا مظاہرہ مشرق کی یہ تینوں سلطنتیں اس زمانے میں ایک دوسرے کے خلاف کیا کرتی تھیں۔

ان مثلث نما تعلقات کی جغرافیائی اور سفارتی حدود کے پیش نظر اس امر میں ذرا بھی تعجب نہیں ہو گا کہ اس دوران روس کی حالت آسٹریا اور پروشیا کی نسبت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی پس ماندگی کے باوجود روس اپنے مغربی پڑوسیوں کے مقابلے میں اتنا ہیانہ تھا یہ پڑوسی ممالک طاقتور کیتھرین کو نیچا دکھانے کے درپے تھے۔ اس حقیقت اور پولینڈ پر روس کے روایتی اثرات کے دعوے کے نتیجے میں تقسیم کے وقت اس بدقسمت ریاست کا سب سے بڑا حصہ سینٹ پیٹر برگ کے قبضے میں چلا گیا۔ علاوہ ازیں جنوب میں روس کی سرحد کھلی ہوئی اور ٹیڑھی میڑھی تھی۔ اسی وجہ سے ۱۷۷۰ء کے ابتدائی عشرے میں بہت وسیع پیمانے پر پیش قدمی کے باعث ترکی کو نقصان پہنچا اور ۱۷۸۳ء میں کریمیا کا باقاعدہ الحاق روس سے ہو گیا۔ ۱۷۹۲ء میں روس کو بحر اسود کے جنوبی ساحلوں پر مزید مراعات حاصل ہوئیں۔ ان تمام باتوں سے یہ حقیقت طے ہو گئی کہ سلطنت عثمانیہ میں اب لڑنے کا دم خم باقی نہیں رہا۔ پھر اندر ہی اندر آسٹریا اور پروشیا ان ہی ملکوں کی طرح فکر مند تھے جنہوں نے روس کے توسیع پسند عزائم کی بیخ کنی کا فیصلہ کیا تھا' مثلاً" ۱۷۸۸ء میں سویڈن نے اور ۱۷۹۱ء میں نوجوان پٹ کی فرمانروائی میں برطانیہ نے چونکہ ویانا اور برلن سینٹ پیٹر برگ کی خیر خواہی چاہتے تھے اور مغربی طاقتیں مشرقی یورپ میں موثر اقدام کرنے سے گریزاں تھیں' لہٰذا اس وجہ سے زار کی سلطنت کو فروغ حاصل ہوتا چلا گیا۔

۱۷۹۲ء سے قبل کے عشرے میں بین الاقوامی تعلقات کی جو نوعیت تھی اس نے تبدیلی کا ذرہ برابر بھی اشارہ نہیں دیا۔ اہم طاقتوں کے مابین گاہے بہ گاہے جو محاذ آرائی ہوتی رہی اس کا علاقائی معاملات سے چنداں تعلق نہ تھا لہٰذا طاقت کے عمومی توازن کے بگڑنے کا نہ کوئی امکان تھا اور نہ کسی قسم کا خطرہ!

جہاں پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کے مستقبل نے مشرق کے بڑے بڑے ملکوں کی جگہ لے لی وہاں بلجیم اور ہالینڈ
کی قسمت سے کھیلنے کی روایتی جدوجہد اور مخالف تجارتی سلطنتوں کو زیر کرنے کی کوشش مغربی طاقتوں کی توجہ
کا مرکز بن گئی۔ ۱۷۹۰ء میں نوٹکا ساؤنڈ کے معاملے میں انگلستان اور اسپین کے درمیان کھڑے ہونے والے
جھگڑے نے دونوں ملکوں کو جنگ کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔ حتیٰ کہ اسپین نے بادل نخواستہ لڑائی کا آغاز بھی کر
دیا۔ ۱۷۸۳ء کے بعد برطانیہ اور فرانس لڑ کر اس درجہ تھک چکے تھے کہ ان کے درمیان کشیدگی کے تعلقات
خاصے کم ہو گئے تھے' لیکن تجارتی معاملے میں ان کی عداوت برقرار رہی۔ ۸-۱۷۸۷ء کے دوران نیدرلینڈ
کے ایک اندرونی تصیے کی وجہ سے ان کی آپس کی رقابت پھر عود کر آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس کی
حمایتی ایک حب الوطن جماعت کو پروشیا کی فوجوں نے اقتدار پر قابض ہونے سے زبردستی باز رکھا تھا۔ اس
تحریک کو مہمیز کرنے والا نوجوان پٹ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

پٹ کی حد سے زیادہ فعال سفارت کاری سے نہ صرف اس کی شخصیت کا اظہار ہوتا تھا بلکہ
اس امر کا اندازہ بھی ہو جاتا تھا کہ ۱۷۸۳ء کے بحران کے بعد برطانیہ نے بڑی طاقتوں کی صف میں کھویا ہوا
مقام حاصل کر لیا تھا۔ امریکہ کے ہاتھ سے نکل جانے سے اس ملک کی تجارت کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا
تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ملک سے امریکہ کو برآمد کی جانے والی اشیاء میں اضافہ ہو رہا تھا۔ علاوہ
ازیں ہندوستان کی منڈیاں اس کے سامان کی کھپت کے لیے ان منڈیوں سے کہیں زیادہ موزوں اور مناسب
تھیں جہاں فرانس چھایا ہوا تھا۔ ۱۷۸۲ء سے ۱۷۸۸ء تک کے چھ سالہ عرصے میں برطانیہ کے تجارتی جہازوں
کی تعداد دوگنی ہو گئی تھی۔ صنعتی انقلاب کی آمد آمد تھی۔ صارفین کی طلب اندرون ملک اور بیرون ملک
بڑھتی جا رہی تھی۔ نئی نئی ایجادات سے ان میں اور بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ برطانیہ کی زراعت ملک کی روز
افزوں آبادی کی غذائی ضروریات پوری کر رہی تھی۔ پٹ کی مالیاتی اصلاحات سے حکومت کا مالی نظام بہتر ہوا
اور اس کی ساکھ دوبارہ بحال ہو گئی۔ چونکہ بحریہ پر اچھی خاصی رقم صرف کی جا رہی تھی' لہٰذا وہ مستحکم بھی
تھی اور منظم بھی! ان ٹھوس بنیادوں کے پیش نظر برطانوی حکومت نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ بیرون ملک ایک
اہم کردار انجام دے سکتی ہے اور پھر ملکی مفادات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ لیکن وائٹ ہال اور ویسٹ منسٹر کے
سیاسی لیڈران مستقبل قریب میں بڑی طاقت کی متوقع جنگ کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے۔

ایک عمومی نوعیت کی جنگ میں یورپ کو نہ گھسیٹنے کی نمایاں وجہ فرانس کے بگڑتے ہوئے
حالات تھے۔ ویسے ۱۷۸۳ء کی فتح کے بعد کے چند برسوں تک اس کی سفارت کاری پہلے کی طرح کامیاب
تھی۔ ملکی معیشت اور ویسٹ انڈیز اور لیونٹ کے ساتھ ہونے والی تجارت نہایت تیزی سے فروغ پا رہی
تھی۔ تاہم ۸۳-۱۷۷۷ء کی جنگ کے ہوشربا اخراجات جو فرانس کی سابقہ تین جنگوں سے بھی کہیں زیادہ تھے'
قومی مالیات میں اصلاحات کی ناکامی' بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی' اقتصادی بحران اور سماجی بدنظمی نے قدیم
نظام حکومت کو ختم کرنے میں موثر کردار ادا کیا۔ ۱۷۸۷ء کے بعد جب ملک میں شدید بحران پیدا ہو گیا تو
فرانس بیرونی معاملات میں فیصلہ کن کردار انجام دینے سے بالکل قاصر رہا۔ نیدرلینڈ میں سفارتی سطح پر شکست
فرانس کی حکومت کی اپنی غلطی کے باعث تھی۔ یعنی اس نے علی الاعلان یہ کہہ دیا کہ وہ برطانیہ اور پروشیا
کے خلاف ہونے والی جنگ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ ادھر نوٹکا ساؤنڈ والی سازش میں اسپین کی
حمایت سے دست برداری کی وجہ دراصل لوئس چہاردہم کے اعلان جنگ کے حق کو فرانس کی اسمبلی کا چیلنج
تھا۔ ان شواہد سے قطعاً" یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ فرانس جلد ہی یورپ کے قدیم نظام کو تبدیل کر دینے کا

خواہاں تھا۔
وہ جنگ جس نے دو دہائیوں تک براعظم کی توانائی سلب کیے رکھی' وہ اب تیزی سے دھیمی
تھی۔ بیسل کے سقوط سے قبل کے عرصے میں اہل فرانس زیادہ تر اندرونی
اور غیر مساوی ہوتی جا رہی
چپقلشوں میں مبتلا رہے۔ اگرچہ فرانس کی سیاست میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی بعض بیرونی ممالک کے لیے
باعث تشویش بنی ہوئی تھی لیکن پیرس اور ملک کے دیگر صوبوں میں جو اتھل پتھل مچی ہوئی تھی اس کے نتیجے
میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ یورپ کی طاقتی سیاست میں فرانس کا کوئی خاص مقام نہیں! اسی بنا پر پٹ فروری
۱۷۹۲ء میں برطانوی فوج کے اخراجات میں کمی کرنے کا خواہش مند تھا۔ ادھر مشرقی خطے کی تین بڑی سلطنتیں
پولینڈ کے حصے بخرے کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ جب فرانسیسی مہاجرین کے متعلق یہ افواہ عام ہوئی کہ وہ
بادشاہت کو بحال کرنے کی سازش میں مصروف ہیں اور خود فرانس کے انقلابیوں کے بارے میں یہ خبر گرم
ہوئی کہ وہ سرحدوں پر سخت اقدام کرنے کی پالیسی اختیار کر چکے ہیں تو اس طرح کے اندرونی اور بیرونی
واقعات نے جنگ کے امکانات کو ہوا دی۔ جب فرانس کے اتحادیوں کو فوجیں سرحد پار کر کے پولینڈ میں
داخل ہوئیں تو ان کی سست رفتار معرکہ آرائی سے یہ بالکل واضح ہو رہا تھا کہ وہ اس کام کے لئے باقاعدہ تیار
نہ تھیں۔ چنانچہ انقلابیوں کو ستمبر ۱۷۹۲ء میں والمے کے مقام پر معمولی سی محاذ آرائی کے بعد فتح حاصل ہو
گئی۔ پھر اسی سال فرانسیسی افواج کو جو فتوحات حاصل ہوئیں' ان سے رھائن کے علاقوں بلجیم و ہالینڈ اور
اٹلی کو خطرہ محسوس ہوا۔ پھر لوئس چہاردہم کی پھانسی کے نتیجے میں پیرس کی نئی حکومت میں جمہوریت کے آثار
پیدا ہوئے۔ ان تمام عوامل نے فوجی حکمت عملی اور نظریاتی سطح پر جنگ کے دوبارہ آغاز کے امکانات پیدا کر
دیئے۔ پروشیا اور سلطنت ہیبسبرگ محاصل محارب قوتیں تھیں' ان کا مختلف ملکوں نے ساتھ دیا' حتیٰ کہ فرانس
کے دیگر پڑوسی ممالک نے بھی! ان سب کا سرغنہ برطانیہ اور روس تھے۔

اگر ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ۵-۱۷۹۳ء میں فرانس کے خلاف قائم ہونے والے اتحاد کی
ناکامی با آسانی سمجھ میں آ جائے گی۔ لیکن اس وقت یہی باعث حیرت اور حزن و محن کا سبب بنی ہوئی تھی۔
بہرحال اس کے نتائج سابقہ جنگ سے کہیں زیادہ گمبھیر تھے۔ اس وقت انقلاب فرانس کی جو رفتار تھی اس
کے باعث غیر مناسب اقدامات کئے گئے اور ملکی وسائل کو دشمنوں کے ساتھ محاذ آرائی میں استعمال کیا گیا۔
جیسا کہ بہت سے مصنفوں نے لکھا ہے کہ ۱۷۸۹ء سے قبل کے دو یا تین عشروں کے دوران فرانسیسی فوج میں
کئی عنوانات کے تحت نہایت اہم نوعیت کی اصلاحات عمل میں آئی تھیں' مثلاً" تنظیم' دفتری منصوبہ بندی'
توپخانہ اور فنون جنگ کے معاملے میں! انقلاب نے ان نئے خیالات کی راہ میں حائل طبقہ امراء کی ساری
رکاوٹیں دور کر دیں اور سیاسی اصلاحات کے حامیوں کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ اپنے تصورات کو عملی جامہ
پہنائیں۔ اسی دوران جنگ چھڑ گئی۔ اندرون ملک "مجموعی جنگ" کے جو طریقے اپنائے گئے اور میدان جنگ
میں جو نئی نئی تکنیک استعمال کی گئیں ان سب سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرانس نئے جذبہ عمل سے سرشار ہے اور
اپنے اتحادیوں کے بے دلی کے معرکے اور پرانے نظام جدال سے متنفر بھی! جولائی ۱۷۹۳ء میں فرانس اپنی
۶۵۰۰۰۰ لاکھ فوج کو لے کر آگے بڑھا جو نہ صرف جوش و خروش سے مملو تھی بلکہ طویل مارچ کے ہر خطرے
سے نمٹنے اور جارحانہ رویہ اختیار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ پھر فرانس نہایت تیزی سے اپنے پڑوسی ملکوں کے
علاقوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس وقعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اب اور آنے والے زمانے
میں اتنی بڑی فوج کے اخرجات کا بوجھ تمام تر فرانس کی سرحدوں سے باہر رہنے والی آبادی پر ہو گا۔ اس کے

عوض اسے فرانس کی اقتصادیات سے تھوڑا بہت متمتع ہونے کا حق بھی حاصل ہو گا۔

اگر اس وقت کوئی طاقت اس بات کی خواہاں تھی کہ ان توسیع پسند عزائم کی بیخ کنی کرے تو اس کے لیے اسے ایک معقول طریقہ اختیار کرنا پڑا ہو گا تاکہ وہ فوجی لحاظ سے برتری حاصل کر لے اور نئے فنون جنگ سے بہرہ مند ہو۔ یہ کوئی ناممکن کام نہیں تھا۔ فرانسیسی فوج نے اپنے سابقہ قائد ڈیو موریز کی زیر نگرانی جو کاروائیاں انجام دی تھیں اور نپولین کی خاصی وسیع مہمیں ان باتوں کا پتہ دیتی ہیں کہ فوج کے نظم و ضبط اور تربیت میں نقائص اور رسد و مواصلات کا نظام کمزور تھا۔ یہ وہ عوامل تھے جن سے ایک تجربہ کار دشمن خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن ایسا تجربہ کار مخالف کہیں موجود بھی تھا؟ محض یہی بات نہ تھی کہ فرانس کے چھپ چھپ کر حملہ کرنے اور زبردست ضربیں لگانے والے دستوں کے سامنے اتحادیوں کو بوڑھے جرنیل اور سست رفتار اور سامان سے لدے پھندے فوجی فنی طور پر ناکارہ ثابت ہوئے۔ اصل بات یہ تھی کہ فرانس کے دشمنوں کو نہ سیاسی حمایت حاصل تھی اور نہ ہی ان کی فوجی حکمت عملی واضح اور روشن تھی۔ حتیٰ کہ قدیم طرز حکومت کے سپاہیوں اور شہریوں کو حملے کا نشانہ بنانے کے معاملے میں سیاسی نظریہ بھی مفقا ہوتا تھا۔ تاہم بہت سے لوگ انقلاب کے سرور افروز تصور سے متاثر ہوتے دکھائی دیتے۔ یہ تو بہت بعد میں ہوا کہ نپولین کی فوجوں نے "آزادی" کو فتح اور لوٹ کھسوٹ میں تبدیل کر دیا اور فرانس کے محب وطن عوام کو ملک کی قیادت کو ختم کرنے کے لیے آلۂ کار بنا دیا۔

علاوہ ازیں ابتدائی دنوں میں بعض اتحادیوں نے فرانس کے خطرے کو نہایت تشویش سے دیکھا۔ پھر اتحادیوں کی آپس میں مقاصد اور حکمت عملی سے متعلق کوئی باقاعدہ مفاہمت بھی نہیں تھی۔ بس ان سب کا مجموعی مطالبہ یہی تھا کہ برطانیہ سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کی جائیں۔ اس دوران سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ سقوط پولینڈ کے باعث انقلاب کی جنگ کھٹائی میں پڑ گئی۔ انقلاب فرانس سے کبیدہ خاطر ہونے کے باوجود کیتھرین دوم کو پولینڈ کی آزادی ختم کرنے کی زیادہ فکر تھی۔ وہ دریائے رھائن کے علاقے میں لشکر روانہ کرنے پر بھی تیار نہ تھی۔ پروشیا کی حکومت جو مغرب میں مہم جوئی سے پہلے ہی دل برداشتہ تھی، مذکورہ صورت حال کے پیش نظر اپنی زیادہ سے زیادہ فوج رھائن سے دستولا منتقل کرنے پر مجبور ہو گئی۔ نتیجتاً آسٹریا نے اپنے ساٹھ ہزار فوجی شمالی سرحدوں پر تعینات کر دیئے تاکہ روس اور پروشیا پولینڈ کے بچے کھچے علاقے پر نہ چڑھ دوڑیں۔ جب ۱۷۹۵ء میں پولینڈ کی تیسری اور حتمی تقسیم عمل میں آئی تو اس وقت یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ ملک اپنی زندہ اور متحرک ریاستی حیثیت کے برعکس عدم وجود کے عالم میں فرانس کا زیادہ موثر اتحادی ثابت ہوا۔ اس وقت تک پروشیا نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دیا تھا، نیز دریائے رھائن کا بایاں کنارہ فرانس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس طرح جرمنی روح فرسا جانب داری کی حالت کا شکار ہو گیا۔ فرانس کو اس کا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ وہ اپنی توجہ کسی جانب بھی مبذول کر سکتا تھا۔ جرمنی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے پروشیا کی پیروی کی۔ نیدرلینڈ پر قبضہ ہو گیا اور اسے جمہوریہ بٹاویہ کی شکل دے دی گئی۔ اسپین نے بھی اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور پہلے کی طرح برطانیہ کی مخالفت میں فرانس کے ساتھ مل گیا۔

صرف سرڈینیا۔ پیڈ مونٹ باقی بچ رہا تھا۔ اسے بھی ۱۷۹۶ء کے اوائل میں نپولین نے شکست فاش دے دی۔ ہیبسبرگ کی بد نصیب سلطنت اٹلی کے بہت سے علاقوں سے بے دخل کر دی گئی تھی۔ پھر اسے اکتوبر ۱۷۹۷ء میں مجبور ہو کر کیمپو فورمیو کی صلح کرنی پڑی اور برطانیہ؟ اگرچہ نوجوان پٹ کی یہ خواہش

تھی کہ وہ فرانس کے توسیع پسند عزائم کو روکنے کے سلسلے میں اپنے والد کی پیروی کرے۔ اس کے باوجود برطانوی حکومت نے اس ضمن میں نہ تو جنگ کے لیے مناسب حکمت عملی اختیار کی اور نہ ہی محاذ آرائی کا پر عزم فیصلہ کیا۔ ۹۵-۱۷۹۳ء کے دوران ڈیوک آف یارک کی ماتحتی میں جو حملہ آور دستہ فلینڈرز اور پولینڈ روانہ کیا گیا اس میں نہ تو اتنا دم خم تھا اور نہ ہی مہارت کہ وہ فرانس کی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ بچے کھچے فوجی جوان بریمن کے راستے اپنے گھر واپس آ گئے۔ جیساکہ پہلے بھی ہوتا رہا تھا اور بعد میں بھی ہوا، انگلستان کے وزراء مثلاً "ڈنڈس اور پٹ اپنے براعظم میں وسیع پیمانے پر محاذ آرائی اختیار کرنے کی بجائے جنگ کے دوسرے طریقے کو ترجیح دیتے تھے۔ یعنی نوآبادیوں کی تسخیر، بحری راستے کی ناکہ بندی اور دشمنوں کے ساحلی علاقے پر حملہ! برطانیہ کی قد آور شاہی بحریہ کی برتری اور اس کے مقابل فرانسیسی بحریہ کی بے ربطگی کے پیش نظر مذکورہ بات مستحسن معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ۹۶-۱۷۹۳ء کے دوران جب ویسٹ انڈیز پر چڑھائی کی گئی تو وبائی بیماریوں کے باعث بہت سے برطانوی سپاہی لقمہ اجل بن گئے اور اس طرح فوج کو بہت نقصان پہنچا۔ گویا لندن کو اس نوع کے فوجی حکمت عملی کا شدید خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس نقصان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس لڑائی میں بیماری کے باعث چالیس ہزار فوجی ہلاک اور اتنے ہی معذور ہو گئے۔ برطانیہ کو یہ سودا جنگ ہسپانیہ کے جملہ نقصانات سے کہیں زیادہ مہنگا پڑا۔ پھر اس فوجی مہم پر کم از کم ۱۶ ملین پونڈ کی رقم بھی صرف ہوئی تھی۔ تاہم اس بات میں شک ہے کہ آیا برطانیہ کو غیر یورپی علاقوں میں آہستہ آہستہ برتری حاصل ہو رہی تھی یا ڈنکرک اور طولون کے خلاف وہ جو محدود انداز میں اقدامات کر رہا تھا، اس سے فرانس کو اندرون یورپ اپنی طاقت مستحکم کرنے میں مدد ملی۔ بہرحال پروشیا اور آسٹریا نے میدان جنگ میں اپنی اپنی افواج تعینات کرنے کا جو معاوضہ طلب کیا اس نے ہلچل مچا دی۔ اس مطالبے کا پورا کیے جانے کا امکان نہ تھا۔ بادی النظر میں برطانیہ کی حکمت عملی سراسر غیر موثر اور مہنگی تھی۔ پھر ۱۷۹۷ء میں سارے نظام کی بنیادیں عارضی طور پر ہی سہی، اس وقت متزلزل ہو گئیں جب بینک آف انگلینڈ نے نقد رقم دینے سے انکار کر دیا اور ادھر اسپٹ ہڈ اور نور میں بحری جوانوں نے بغاوت کر دی۔ ایسے پر آشوب وقت میں زبوں حال آسٹریا نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کیا اور ایسی تمام طاقتوں سے اتحاد کر لیا جو مغربی یورپ میں فرانس کی برتری تسلیم کرتی تھیں۔

اگر برطانیہ فرانس کو شکست نہیں دے سکا تو آخرالذکر کی انقلابی حکومت اپنے دشمن کی بحری برتری کو تباہ و برباد بھی تو نہیں کر سکی۔ آئرلینڈ اور انگلستان کے مغربی ساحلوں پر حملے کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔ اس کی وجہ موسم بھی تھا اور مقامی دفاع بھی! ۱۷۹۷ء کی نقد ادائیگی کے تعطل کے باوجود برطانیہ میں قرض کے لین دین کا نظام مستحکم تھا اس نے جنگ میں اسپین اور نیدرلینڈ کا جو ساتھ دیا، اس کے نتیجے میں فروری ۱۷۹۷ء میں کیپ سینٹ ونسنٹ کے آس پاس ہسپانوی بیڑا تباہ کر دیا گیا۔ پھر اسی سال اکتوبر میں کیمپر ڈاؤن میں ولندیزیوں پر تشدد کیا گیا۔ فرانس کے نئے اتحادیوں کو بھی ایسٹ انڈیز، ویسٹ انڈیز، کولمبو، ملاکا اور کیپ آف گڈ ہوپ کے مقام پر موجود اپنی کالونیوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ چنانچہ ان تمام مقامات پر برطانیہ کو اپنی تجارت کے لیے نئی نئی منڈیاں دستیاب ہو گئیں اور بحری بیڑوں کے لیے اڈے بھی فراہم ہو گئے۔ فرانسیسی حکومت نے قیام امن کے لیے جس کثیر رقم کا مطالبہ کیا تھا، اسے پٹ اور اس کے جانشیں وزراء ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے انکم ٹیکس لاگو کیا، ساتھ ہی ساتھ نئے نئے قرض حاصل کیے۔ ادھر فرانسیسی فوج چینل کے ساحلوں

پر جمع ہو رہی تھی۔ اب لڑائی قومی سالمیت اور شہنشاہیت کے تحفظ دونوں کے لیے خطرے کا سبب بن گئی۔

بعد ازاں بنیادی نوعیت کے حکمت عملی کا ایک ایسا المیہ شروع ہوا جس کے باعث فرانس اور برطانیہ دونوں دو عشروں تک لڑی جانے والی لڑائی سے دو چار ہوئے۔ یہ دونوں قد آور سلطنتیں وہیل اور ہاتھی کی طرح تھیں۔ لیکن سمندری راستوں پر برطانیہ کے کنٹرول نے یورپ میں فرانسیسی قیادت کو ختم نہیں کیا اور نہ ہی نپولین کی فوجی قوت نے جزائر والوں کو اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ علاوہ ازیں' فرانسیسی مقبوضات اور پڑوسی ممالک کی سیاسی دھمکیوں نے اچھی خاصی بے چینی پیدا کر دی۔ چنانچہ پیرس کی حکومت کو اس امر کا قطعاً" یقین نہ تھا کہ دوسرے براعظموں کی طاقتیں ایسی صورت میں اس کی خود مختاری ہمیشہ کے لیے تسلیم کر لیں گی جبکہ برطانیہ انھیں مراعات' اسلحہ اور فوجی دستے فراہم کر رہا تھا۔ نپولین کا بھی ہو بہو یہی نظریہ تھا۔ اس نے ۱۷۹۷ء میں دلیل دیتے ہوئے کہا تھا۔ "ہمیں اپنی تمام کوششیں بحری بیڑے تیار کرنے اور انگلستان کو تباہ و برباد کر دینے میں صرف کر دینی چاہئیں۔ جونہی یہ کام سرانجام پا گیا' یورپ ہمارے قدموں میں ہو گا" فرانس کا یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب وہ برطانیہ کے خلاف نہایت کامیاب قسم کی بحری اور اقتصادی حکمت عملی اختیار کرے۔ محض میدانوں میں فتوحات کا حصول کافی نہیں تھا۔ اسی طرح برطانیہ کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ براعظم میں نپولین کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو چیلنج کرے۔ اس کے لیے براہ راست اقدام یا اتحادیوں کی مدد درکار تھی۔ محض سمندروں پر شاہی بیڑے کی برتری کافی نہیں تھی۔ جب تک ایک متحارب کو میدان میں فوقیت حاصل تھی اور دوسرے کو سمندروں پر برتری میسر تھی' ایسی صورت میں دونوں ہی کو خطرہ تھا۔ لہٰذا ہر فریق ادھر ادھر نظریں دوڑا کر اتحادیوں سے مدد کا طلب گار ہوتا تاکہ توازن کو صحیح رکھ سکے۔

نپولین نے مذکورہ توازن کو نہایت جرات مندانہ طریقے سے بگاڑنے کی کوشش کی۔ یہ خطرناک اقدام بھی تھا۔ بحیرہ روم میں برطانیہ کی کمزور پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ۱۷۹۸ء کے موسم گرما میں ۳۱ ہزار فوجیوں کو لے کر مصر پر حملہ کر دیا۔ اس طرح اس نے لیونٹ' سلطنت عثمانیہ اور ہندوستان کو جانے والے راستے پر اپنی برتری قائم کر لی۔ ٹھیک اسی زمانے میں فرانس نے برطانیہ کو آئرلینڈ میں بھی بے بس کر دیا تھا۔ مذکورہ حملہ اگر کامیابی سے ہم کنار ہوتا تو برطانیہ کی ڈگمگاتی ہوئی پوزیشن کو بڑا سخت دھچکا لگتا لیکن آئرلینڈ کا حملہ معمولی نوعیت کا تھا۔ یہ ستمبر کے مہینے میں ہوا تھا جبکہ اہل یورپ کو علم ہو گیا تھا کہ ابوکر کے مقام پر فرانسیسی بیڑے کو شکست ہو چکی تھی اور مصر میں نپولین گھر چکا تھا۔ جیساکہ پیرس کو گمان ہوا اس مزاحمت سے ان ملکوں کو بڑی تقویت پہنچی جو فرانس کے اس رویے سے نالاں تھے کہ وہ ان کی غیر جانب داری اور دوسری اتحادی جنگ (۱۷۹۸ء۔۱۸۰۰ء) میں شرکت کے درپے تھا۔ پرتگال اور نیپلز کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے علاوہ روس' آسٹریا اور ترکی برطانیہ کی طرفداری کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی اپنی فوجیں بھی اکٹھی کر رہے تھے اور مراعات کے لیے سلسلہ جنبانی بھی شروع کیے ہوئے تھے۔ فرانس اس وقت نہایت مشکل میں پھنس گیا تھا۔ منارکا اور مالٹا اس کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں اسے آسٹریا اور روس کی مشترکہ فوجوں سے شکست ہو چکی تھی۔ اور خود نپولین لیونٹ میں کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

یہ دوسرا اتحاد بھی پہلے کی مانند کمزور قسم کی سیاسی اور فوجی حکمت عملی پر استوار تھا۔ پروشیا منظر سے غائب تھا۔ چنانچہ جرمنی کی شمالی سرحد استعمال میں نہیں آ سکتی تھی۔ نیپلز کے بادشاہ نے جو قبل از

وقت لڑائی کا آغاز کیا وہ تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی پھر انگلستان اور روس نے ہولینڈ کی طرف پیش قدمی کی پوری تیاری بھی نہیں کی تھی۔ چنانچہ اسے مقامی لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہو سکا اور لامحالہ واپس ہونا پڑا۔ برطانیہ نے اس بات کا قطعی اندازہ نہیں لگایا تھا کہ براعظم میں فوجی کارروائی نہایت وسیع پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اسے یہ ادراک بھی نہ تھا کہ کثیر فوج تیار کرنے میں مالیاتی اور سیاسی دشواریاں بھی حائل ہوتی ہیں۔ ان تمام حقائق سے بے نیاز اس نے اپنی روایتی پالیسی پر عمل کیا' یعنی دشمنوں کے ساحلوں پر یلغار! لیکن جزیرہ بیلی' فیرول' کیڈز اور دیگر علاقوں پر اس کے چھوٹے پیمانے پر کیے ہوئے حملوں سے کسی قسم کا فوجی مقصد حاصل نہیں ہوا۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ سوئٹزرلینڈ کا دفاع کرنے میں آسٹریا اور روس ناکام ثابت ہوئے۔ حد یہ کہ روسیوں کو پہاڑوں کے راستے مشرقی سمت بھاگنا پڑا۔ انہی باتوں سے بد دل ہو کر زار نہ صرف اتحادیوں سے بدظن ہو گیا بلکہ برطانوی پالیسی سے بھی مشکوک ہو گیا۔ چنانچہ وہ نپولین سے جو مصر سے بھاگ کر واپس فرانس آ گیا تھا' بات چیت کرنے کا خواہشمند تھا۔ روس نے آسٹریا سے اپنی فوج واپس بلا لی۔ اس سے فرانس کو اپنا غصہ اتارنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ اس نے جون ۱۸۰۰ء میں آسٹریا کے علاقے مرینگو اور ہوزوت دونوں پر لشکر کشی کی' پھر چھ ماہ بعد ہوہنلنڈن پر دھاوا بول دیا۔ اس طرح مجبور ہو کر ویانا صلح کی بات کرنے لگا۔ جہاں پروشیا اور ڈنمارک نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر ہنوور پر چڑھائی کا ارادہ کر لیا اور اسپین' پرتگال پر حملہ کی تیاری میں مصروف ہو گیا وہاں برطانیہ تین سال پہلے کی طرح ۱۸۰۱ء میں حقیقی معنوں میں یکہ و تنہا کھڑا تھا۔ ادھر شمالی یورپ میں روس' ڈنمارک' سویڈن اور پروشیا مسلح غیر جانب دار لیگ کے تحت آپس میں اتحادی بن گئے۔

دوسری جانب برطانیہ یورپ کے بیرونی علاقوں کے سوا بحری جنگ میں ایک بار پھر کامیاب و سرفراز رہا تھا۔ اس نے اس دوران مالٹا کو فرانس کے قبضے سے چھڑا لیا تھا جس کے نتیجے میں برطانیہ کے شاہی بیڑے کو ایک نہایت ہی اہم فوجی اڈا میسر آ گیا تھا۔ "مسلح غیر جانب دار لیگ" نے فیصلہ کیا تھا کہ بالٹک کے علاقے سے برطانوی تجارت کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ڈنمارک کا بحری بیڑہ ہراول دستے کے طور پر آگے بڑھا لیکن اسے کوپن ہیگن کے قریب ہی تباہ کر دیا گیا۔ (حالانکہ چند دن پہلے زار پال کے قتل کے نتیجے میں لیگ کے خاتمے کا گمان اغلب نہ تھا۔) مارچ ۱۸۰۱ء کے مہینے میں ہی برطانوی دستے نے اسکندریہ کے مقام پر فرانسیسی فوج کو شکست دے دی۔ اس کے نتیجے میں فرانس کو مکمل طور پر مصر سے بے دخل ہو جانا پڑا۔ پھر بہت دور ہندوستان میں فرانس کے حمایت یافتہ ٹیپو (سلطان) کو برطانوی فوج نے میسور کے مقام پر ختم کر دیا اور شمال میں مزید مفادات حاصل کرنے میں منہمک ہو گئی۔ ادھر ویسٹ انڈیز میں فرانس' ہالینڈ' ڈنمارک اور سویڈن کے مقبوضات بھی برطانیہ کے تصرف میں آ گئے۔

تاہم ۱۸۰۱ء تک براعظم میں کسی مستحکم اتحادی کے نہ ہونے اور انگلستان و فرانس کے مابین بے نتیجہ معرکہ آرائیوں کے سبب بہت سے برطانوی سیاست دان صلح کے جویا نظر آنے لگے۔ مذکورہ خیالات کو کاروباریوں کے مطالبات سے بھی تقویت پہنچی۔ یہ طبقہ بحیرہ روم اور بالٹک کے علاقے میں اپنے تجارتی نقصانات سے متفکر تھا۔ کیتھولک طبقے کی آزادی کے معاملے میں جب پٹ نے استعفیٰ دے دیا تو مذکورہ خیالات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صلح کی بات چل نکلی۔ نپولین کے اپنے خیال کے مطابق صلح کے نتیجے میں نقصان کا امکان کم تھا۔ یعنی اس صورت سے طفیلی ریاستوں میں فرانس کے اثرات جوں کے توں برقرار رہیں گے۔ ان علاقوں میں برطانیہ کو پہلی جیسی تجارتی اور سفارتی سہولتیں حاصل نہیں ہوں گی۔ فرانس

کی بحریہ جو مختلف بندرگاہوں میں پھیلی ہوئی تھی' یکجا کر دی جائے گی اور اس کی از سر نو تعمیر ہو گی۔ اگلی جنگ ہونے سے قبل اقتصادی نظام کو مستحکم کر لیا جائے گا۔ مارچ ۱۸۰۲ء کے اس صلح امینز پر برطانوی عوام نے بہت زیادہ تنقید نہیں کی لیکن جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ فرانس دوسرے طریقے سے جنگ جاری رکھے ہوئے ہے تو لامحالہ ان کی توجہ اور ہی جانب مبذول ہو گئی۔ یورپ کے بیشتر علاقوں میں برطانیہ کی تجارت ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ لندن کو واضح لفظوں میں کہہ دیا گیا تھا کہ وہ ہالینڈ' سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائے۔ ادھر فرانس کی سازشوں اور جارحیت کی اطلاعات مسقط سے لے کر ویسٹ انڈیز اور ترکی سے لے کر پڈمونٹ کے علاقوں تک سے موصول ہو رہی تھیں۔ ان خبروں اور فرانس کے وسیع پیمانے پر جنگی جہاز سازی کے پروگرام کی اطلاع نے اڈنگٹن کی فرمانروائی میں برطانوی حکومت کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مالٹا واپس نہیں کیا جائے گا۔ پھر مئی ۱۸۰۳ء میں سرد جنگ کو باقاعدہ محاذ آرائی میں تبدیل کر دیا گیا۔

انگلستان اور فرانس کے درمیان جو سات لڑائیاں ۱۶۸۹ء اور ۱۸۱۵ء کے درمیان وقوع پذیر ہوئی تھیں' ان کا آخری دور بارہ سال تک جاری رہا' یہ ان دونوں کے لیے نہایت آزمائشی دور تھا۔ پہلے کی طرح ہر فریق میں مختلف برتریاں اور کمزوریاں تھیں۔ جب محاذ آرائی شروع ہوئی تو برطانیہ کا شاہی بیڑا ملے کی چھانٹی کے باوجود اب بھی بہتر پوزیشن میں تھا۔ جب برطانیہ کے طاقتور بحری دستے نے فرانس کے ساحل کی ناکہ بندی کی تو سمندر پار فرانس اور اس کے طفیلی ملکوں کے مقبوضات پر خود بخود اس کا تسلط قائم ہو گیا۔ سینٹ پیئری میکویلن' سینٹ لوسیا' ٹوباگو اور ڈچ گائنا پر لڑائی سے پہلے ہی قبضہ ہو گیا اور ہندوستان میں مزید پیش قدمی جاری رہی۔ راس امید ۱۸۰۶ء میں فتح ہو گیا تھا۔ ۱۸۰۷ء میں کوراکاؤ اور ڈنمارک کے ویسٹ انڈیز پر قبضہ ہوا۔ ۱۸۰۸ء میں ملوکا کے بہت سے حصے قبضے میں آئے۔ کینن' فرنچ گائنا' سین ڈومنگو' سینیگال اور مارٹینیق ۱۸۰۹ء میں فتح ہوئے۔ گواڈلوپ' مار۔طس' امبوآئنا اور بانڈا پر قبضہ ۱۸۱۰ء میں ہوا۔ جاوا ۱۸۱۱ء میں قبضے میں آیا۔ واضح رہے کہ اس کا یورپ کے توازن پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑا۔ البتہ سمندر پار ملکوں میں برطانیہ کے تسلط میں اضافہ ہوا اور برآمدات کے نئے مواقع دستیاب ہوئے جن سے فرانس کی روایتی منڈیوں تک رسائی ناممکن بنا دی گئی تھی۔ یہ صورت حال جاری تھی کہ نپولین نے جنوبی انگلستان پر پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے حملے کا فیصلہ کر لیا۔ بولون کے سامنے لشکر جرار جمع ہونے لگا اور نیم حوصلہ مند پٹ ۱۸۰۴ء میں واپس اپنے دفتر آیا تو ہر فریق فیصلہ کن جنگ کا انتظار کرنے لگا۔

یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۰۸ء کے عرصے پر محیط یہ بحری اور بری جنگ' مشہور جھڑپوں کے باوجود' فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے نقائص سے پر تھی۔ اپنے حریف برطانیہ کے مقابلے میں فرانسیسی فوج تین گنا زیادہ اور نہایت تجربہ کار تھی لیکن انگلستان کی سرزمین پر اترنے سے پہلے سمندروں پر کنٹرول حاصل کرنا اس کے لیے ضروری تھا۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے فرانس کی بحریہ بہتر تھی' یعنی اس کے ستر جہاز رواں دواں تھے۔ پھر حوصلے کی بات یہ تھی کہ خود نپولین کے ہاتھوں میں فوج کی کمان تھی۔ نیز ہسپانوی بحریہ نے بھی بیس سے کچھ زیادہ جہازوں کے ساتھ فوجی مدد کی تھی۔ اس صورت حال میں فرانس ۱۸۰۴ء کے اواخر میں میدان جنگ میں اترا۔ بہرحال فرانس اور ہسپانیہ کے جہاز نصف درجن بندرگاہوں سے

مار بھگائے گئے۔ جنگی تجربے کی حامل شاہی بحریہ کے سامنے دشمنوں کے جہاز اپنی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔ اکتوبر ۱۸۰۵ء میں انہی جہازوں کی ترافلگر کے مقام پر تباہ کن شکست سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دونوں کی بحریہ کے معیار کارکردگی میں خاصا فرق تھا۔ بہرحال اس ڈرامائی فتح سے اگر جزائر برطانیہ کا تحفظ قائم ہو گیا تو نپولین کی زمینی پوزیشن بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی خطرے کے پیش نظر پٹ نے روس اور آسٹریا کو ایک تیسرے اتحاد میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ نیز یہ پیشکش بھی کی کہ اگر وہ فرانس کے مقابلے میں اپنی فوج میدان میں اتاریں گے تو ہر ایک لاکھ فوجی جمعیت کے لیے ۱.۷۵ ملین پونڈ ادا کیے جائیں گے۔ اس سے قبل ہی نپولین اپنی فوج بولون سے ڈینوب کے بالائی حصے کی جانب منتقل کر چکا تھا۔ راستے میں اس نے الم کے مقام پر آسٹریا کے لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ پھر دسمبر میں مشرق کی جانب پیش قدمی کی تاکہ آسٹرلز کے مقام پر آسٹریا اور روس کے ۸۵۰۰۰ ہزار سپاہیوں کو کچل کر رکھ دے۔ ویانا نے مایوس و مضمحل ہو کر تیسری مرتبہ صلح کر لینے کی درخواست کی۔ ادھر فرانس نے جزیرہ نمائے اطالیہ میں ایک بار پھر اپنا کنٹرول قائم کر لیا اور برطانوی و روسی فوجوں کو وہاں سے فوری بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔

آیا ۱۸۰۶ء کے اوائل میں پٹ کی موت ان شدید ناکامیوں کی خبروں کے باعث واقع ہوئی تھی یا نہیں' لیکن ان سے یہ حقیقت ضرور واشگاف ہوئی کہ نپولین جیسے فوجی نابغہ روزگار کو جھکانا بہت مشکل ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آنے والے برسوں میں فرانس کا ستارہ عروج پر آگیا اور اسے یورپ میں برتری حاصل ہو گئی۔ (دیکھیے نقشہ نمبر ۷) پروشیا جس کی عدم موجودگی سے اتحاد کو ضعف پہنچا تھا' نے اکتوبر ۱۸۰۶ء میں نہایت عجلت میں فرانس کے ساتھ اعلان جنگ کر دیا۔ پھر مہینے بھر میں اسے کچل دیا گیا۔ روس کی کثیر اور سرکش فوج کی بات کچھ اور تھی۔ لیکن کئی لڑائیوں کے بعد اسے بھی جون ۱۸۰۷ء میں فریڈ لینڈ کی جنگ میں بری طرح شکست ہوئی۔ ٹلسٹ کی صلح کے مطابق پروشیا فرانس کی طفیلی ریاست بن گیا جبکہ روس نے برطانیہ کی تجارت پر پابندی عائد کرنے کی حامی بھر لی اور فرانسیسی اتحاد میں شامل ہونا قبول کر لیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ جرمنی کا جنوبی اور زیادہ تر مغربی علاقہ رھائن کنفیڈریشن میں ضم ہو گیا۔ پولینڈ وارسا کی ایک بڑی ریاست میں تبدیل ہو گیا۔ اسپین' اٹلی' ہالینڈ اور بلجیم نے ماتحتی قبول کر لی۔ ہولی رومن سلطنت اختتام کے قریب تھی۔ اب پرتگال اور سویڈن کے درمیان نہ تو کوئی آزاد ریاست تھی اور نہ ہی برطانیہ کا کوئی اتحادی تھا۔ ان عوامل نے نپولین کو اس بات کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ "بنیا قوم" کو تباہ و برباد کر دے۔ چنانچہ اس نے تمام یورپ میں برطانوی برآمدات پر پابندی عائد کر کے اس کی معیشت کو زک پہنچایا۔ پھر جہاز سازی کے جملہ سامان یعنی تمبر' مستول وغیرہ برطانوی شاہی بیڑے کے لیے ممنوع قرار دے کر خود اپنے تصرف میں لایا۔ مطلب یہ تھا کہ اگلے حملے سے پہلے پہلے برطانیہ کو کمزور کر دیا جائے۔ برطانیہ کو اپنے صنعتی سامان کی برآمدات کے لیے یورپی منڈیوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا اور بحری جہازوں کے لیے بالٹک کے علاقے سے مستول اور ڈالمیٹ سے اوک کی لکڑی منگوانی پڑتی تھی۔ اس صورت حال میں نپولین کی دھمکی نہایت شدید تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برآمدات کی آمدنی گھٹ کر رہ گئی۔ چنانچہ لندن کی حکومت اس قابل نہ رہی کہ اپنے کسی اتحادی کی مالی معاونت کر سکے' نیز اپنی فوج کے لیے ضروری سامان خرید سکے۔

مذکورہ جنگ کے نتیجے میں اقتصادی عوامل حربی حکمت عملی میں پہلے سے کہیں زیادہ مدغم ہو گئے۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان حصول اقتدار کی معرکہ آرائی جاری رہی' اس کے دوران نپولین نے

۷-۱۸۰۶ء میں فیصلہ برلن کے تحت برطانیہ سے تجارت پر پابندی عائد کر دی جبکہ ۱۸۱۲ء میں فرانس کو ماسکو سے پسپا ہونا پڑا--- یہ تمام متعلقہ امور مزید تجزیے کے متقاضی ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ ہر فریق ایک دوسرے کو معاشی طور پر برباد کرنے کے درپے ہو تو ایسی صورت میں جلد یا بدیر نقصان ضرور اٹھانا پڑتا ہے اور اس کے سیاسی نتائج نہایت دور رس ہوا کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نپولین نے "براعظمی نظام" کے تحت برطانیہ کی تجارت پر جو پابندی عائد کر دی تھی' اس کے نتیجے میں اسے بیرونی تجارت سے محروم ہونا پڑا اور وہ تہی دست و بے سروساماں ہو کر رہ گیا۔ ۱۸۰۸ء اور پھر ۱۲-۱۸۱۱ء میں فرانس نے اپنی طفیلی ریاستوں (مثلاً" ڈنمارک) کے ساتھ مل کر جو اقتصادی جنگ شروع کی تھی' اس سے برطانیہ کی برآمدات کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ گوداموں میں مصنوعات کا ڈھیر لگ گئے۔ لندن کے ڈاکیارڈ میں نوآبادیات کے بنے ہوئے سامان کی ریل پیل ہو گئی۔ شہروں میں بے روزگاری پھیل گئی اور کاؤنٹیوں میں بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر کاروباری طبقہ متفکر ہو گیا اور بہت سے اقتصادی ماہرین امن کی دہائی دینے لگے۔ اسی طرح سرکاری قرضہ بھی بڑھتا چلا گیا اور جب برطانیہ کے تعلقات ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے کشیدہ ہو گئے اور اس کے باعث ۱۸۱۱ء کے بعد وہاں کی منڈیوں میں تجارتی سامان کی ترسیل رک گئی تو اس سے برطانیہ کا اقتصادی بحران ناقابل برداشت ہو گیا۔

تاہم اس بحران کو برداشت کر لیا گیا۔ ادھر فرانس کی قیادت کے خلاف اسپین میں جو انقلاب رونما ہوا' اس کے نتیجے میں برطانیہ کا ۱۸۰۸ء والا اقتصادی بحران قدرے کم ہو گیا۔ اسی طرح نپولین کے ساتھ روسی تعلقات ختم ہو جانے کی وجہ سے ۱۲-۱۸۱۱ء برطانیہ کی تجارت والی سرد بازاری کافور ہو گئی۔ چنانچہ برطانیہ کو بالٹک کے علاقے اور شمالی یورپ میں اپنی مصنوعات برآمد کرنے کا موقع مل گیا۔ علاوہ ازیں اس تما عرصے میں برطانیہ کی مصنوعات اور نوآبادیوں سے آئے ہوئے سامان کی پورے براعظم یورپ میں اسمگلنگ کی گئی اور اس سے بڑے پیمانے پر منافع کمایا گیا اور سرکاری عمال بھی رشوت سے فیضیاب ہوئے۔ ممنوع تجارتی سامان چکر دار راستے سے ہوتا ہوا ہیلی گولینڈ سے سلونیکا پہنچتا اور شائقین کے ہاتھ لگتا بعد میں یہی ممنوعہ سامان ۱۸۱۲ء کی انگلستان و امریکہ والی جنگ کے دوران کینیڈا اور نیو انگلینڈ کا سفر کرتا رہا۔ مزید برآں برطانیہ کی برآمدات کو ایسے علاقوں کے ساتھ تجارت سے بھی فروغ حاصل ہوا جن پر "براعظمی نظام" یا امریکہ سے "عدم تعلق" کی پالیسی کا اطلاق ہوتا تھا--- مثلاً" ایشیاء' افریقہ' ویسٹ انڈیز' لاطینی امریکہ (وہاں کے مقامی ہسپانوی گورنروں کی کوششوں کے باوجود) اور مشرق قریب! ان تمام وجوہات کی بناء پر اور بعض مواقع پر مختلف منڈیوں میں برطانوی تجارت میں مداخلت کے باوجود کاروباری انداز خوشگوار تھا۔ برطانوی مصنوعات کی برآمدات سے جو آمدنی ۹۶-۱۷۹۳ء میں حاصل ہوئی تھی وہ ۲۱٫۷ ملین پونڈ تھی۔ یہ آمدن ۶-۱۸۰۳ء میں بڑھ کر ۳۷٫۵ ملین پونڈ ہو گئی اور پھر ۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۶ء کے دوران ۴۴٫۴ ملین پونڈ تک پہنچ گئی۔

بیرونی دباؤ کے باوجود برطانیہ کی اقتصادی حالت متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نمایاں وجہ وہاں کا صنعتی انقلاب تھا یہی چیز نپولین کی بدقسمتی کا سبب بنی۔ مندرجہ ذیل دو اہم اور تاریخی واقعات جس طرح ایک دوسرے سے مربوط تھے' وہ بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے یعنی اسلحے کی سرکاری فرمائش ضروریات سے فولاد' لوہا' کوئلہ اور لکڑی کی تجارت کو خاصا فروغ حاصل ہوا' حکومت کے بہت زیادہ اخراجات نے مالیاتی

معمولات کو متاثر کیا تاہم برآمدات کی نئی نئی منڈیوں کی دریافت کی وجہ سے وہ فیکٹریاں جو فرانس کی عائد شدہ ممانعت کی وجہ سے ٹھپ پڑی ہوئی تھیں' مصنوعات کی تیاری میں لگ گئیں۔ یہ مسئلہ نہایت گمبھیر اور متنازعہ بنا رہا کہ انقلاب اور نپولین کی جنگ دونوں برطانیہ کی اقتصادی ترقی پر آخر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ مورخین ہنوز اس کی تحقیق میں سرگرداں ہیں۔ ان میں کئی اس خیال کے حامی ہیں کہ ان دہائیوں میں برطانیہ کے صنعتی انقلاب کی شدت کا جو نظریہ پیش کیا جاتا رہا ہے وہ مبالغہ آمیز ہے۔ بہرحال جو بات واضح ہے وہ یہ کہ اس تمام عرصے میں وہاں کی اقتصادی حالت بہتر ہوتی رہی تھی۔ لوہے کے مستطیل ٹکڑوں کی پیداوار ۱۷۸۸ء میں فقط ۶۸ ہزار ٹن تھی۔ لیکن ۱۸۰۶ء میں یہ بڑھ کر ۲ لاکھ ۴۴ ہزار ٹن ہو گئی۔ پھر ۱۸۱۱ء میں یہ پیداوار ۳ لاکھ ۲۵ ہزار ٹن تک پہنچ گئی۔ روئی جو ایک نئی صنعت کے طور پر جنگ سے ذرا پہلے روشناس ہوئی تھی' اسے دو عشروں کے دوران خاصا فروغ حاصل ہوا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ مشینیں' ایندھن' کوئلہ اور مزدور کام آنے لگے۔ ۱۸۱۵ء کے لگ بھگ روئی کی مصنوعات برطانیہ کی برآمدات میں سرفہرست تھیں۔ نئے ڈاکیارڈز کی تعمیر نئی نہروں کی کھدائی اور ریلوے لائنوں کی تنصیب سے مواصلاتی نظام میں ترقی ہوئی۔ اس کے نتیجے میں پیداوار میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس بات سے قطع نظر کہ فرانس کے ساتھ بری اور بحری جنگ نہ ہونے کی صورت میں یہ طمطراق کہیں اور زیادہ ہوتا' یہ امر واقعہ ہے برطانیہ کی پیداواری صلاحیت اور دولت میں نہایت تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ پٹ اور اس کے جانشینوں نے جنگ کے اخراجات کا جو بوجھ ڈال رکھا تھا وہ اسے کماحقہ برداشت کرنے کا اہل تھا۔ یہ مثال بھی دی جا سکتی ہے کہ محصول اور آبکاری کی وصولی ۱۷۹۳ء میں ۱۳٫۵ ملین پونڈ تھی جو ۱۸۱۳ء میں ۴۴٫۸ ملین پونڈ تک پہنچ گئی۔ بایں ہمہ نئے نئے ذرائع اور جائیداد پر عائد شدہ ٹیکس کی آمدنی جو ۱۷۹۹ء میں ۱٫۶۷ ملین پونڈ تھی وہ جنگ کے انتہائی دور میں ۱۴٫۶ ملین پونڈ تک پہنچ گئی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۷۹۳ء اور ۱۸۱۵ء کے دوران برطانوی حکومت کو بلاواسطہ اور بالواسطہ محصولات کے ذریعے ۱۲۱۷ ملین پونڈ کی خطیر رقم حاصل ہوئی۔ نیز بازار زر سے ۴۴۰ پونڈ کی مزید رقم بطور قرض اس طرح حاصل کی کہ اس کا اعتبار برقرار رہا۔ یہ بات مالیاتی لحاظ سے نہایت قدامت پرست نپولین کے لیے تعجب انگیز تھی۔ جنگ کے انتہائی اور ہوشربا دور میں حکومت برطانیہ ۲۵ ملین سے زیادہ سالانہ قرض حاصل کر رہی تھی اور اسے مزید گنجائش منافع بھی دستیاب تھی۔ اس میں کلام نہیں کہ اٹھارھویں صدی کی افسر شاہی نے عوام پر ان کی بساط سے بڑھ کر ٹیکس نافذ کیا ہوا تھا اور قومی قرض بھی افزوں ہوتا جا رہا تھا لیکن دولت کے نئے ذرائع نے اس بوجھ کو برداشت کرنا ممکن بنا دیا۔ مزید برآں انہیں اپنے مختصر حدود اربعہ اور محدود آبادی کے باوجود اس قابل کر دیا کہ وہ نپولین کی سلطنت کے مقابلے میں جنگ کے اخراجات کہیں بہتر طور پر برداشت کر سکیں۔

۱۷۸۹ء اور ۱۸۱۵ء کے دوران فرانس کی جو اقتصادی کیفیت رہی اور وسیع پیمانے پر جنگ کرنے کی جس صلاحیت سے وہ بہرہ مند رہا وہ سب کچھ ایسی پیچیدہ گتھی ہے جس کا سلجھانا مورخوں کے لیے مشکل ہے۔ قدیم طرز حکومت کے خاتمے سے جو خلفشار پیدا ہوا اس سے فرانس کی اقتصادی حالت جزوقتی طور پر متاثر ہوئی تھی۔ دوسری جانب عوام میں انقلاب کا جو جذبہ تھا اور بیرونی دشمنوں سے نمٹنے کے لیے قومی دولت جس طرح بروئے کار لائی جا رہی تھی اس کے نتیجے میں توپ چھوٹے چھوٹے اسلحے اور دیگر فوجی سازوسامان کی بہتات ہو گئی۔ اس کی وجہ سے سے فولاد اور پارچہ بافی کی تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ علاوہ

ازیں پرانے نظام کی بعض اقتصادی رکاوٹیں (مثلاً محصولات کے زرختانے) دور ہو گئیں۔ پھر نپولین کی قانونی اور انتظامی اصلاحات نے تبدیلی کے امکانات پیدا کر دیے تھے۔ اگرچہ کونسولیٹ اور سلطنت کی بازیابی سے شاہی دور کی بہت سی خصوصیات واپس آ گئیں (مثلاً "نجی بینکوں پر انحصار) لیکن اس سے اقتصادی ترقی میں رکاوٹ نہیں پڑی جو بڑھتی ہوئی آبادی کی ریل پیل' جذبہ و آہنگ سے مملو' سرکاری اخراجات' محصولات کے زرختانے میں اضافے کا تحفظ اور نئی ٹیکنالوجی کی دریافت کی وجہ سے روبہ کار ہو رہی تھی۔

تاہم اس امر میں ذرا بھی شک نہیں کہ برطانیہ کے مقابلے میں فرانس کی اقتصادی ترقی خاصی سست رفتار تھی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ وہاں کی زراعت میں بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ محض کسانوں کا جاگیرداروں کو بے دخل کر دینا ہی زراعتی انقلاب نہیں تھا۔ پھر چقندر کی کاشت کو بہتر بنانے کا تشہیر شدہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا۔ (برطانوی نو آبادیات میں اس کا نعم البدل گنا تھا) مواصلاتی نظام نہایت ناقص تھا۔ اس کی وجہ سے کسان اپنی پیداوار کو مقامی منڈیوں میں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ پھر بنیادی تبدیلی کا جذبہ بھی مفقود تھا۔ یہ قدامت پرستی ابھرتی ہوئی صنعت سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔ ویسے نئی مشینوں کا استعمال اور فولادی صنعت عام ڈگر سے استثنیٰ تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس ضمن میں کچھ اہم پیش رفت بھی ہوئی لیکن جنگ اور برطانوی بحریہ کی ناکہ بندی سے اس پر مضر اثرات مرتب ہوئے۔ البتہ پارچہ بافی کی صنعت نے براعظم میں رائج طریقے سے اس حد تک استفادہ کیا کہ برطانیہ کی اعلیٰ مصنوعات کے مقابلے سے یہ محفوظ رہی۔ (یہاں غیر جانب دار یا طفیلی ریاستوں کے مقابلے کا ذکر مقصود نہیں جن کی مصنوعات فرانس کے اعلیٰ محصولاتی زرختانے کی وجہ سے درآمد نہیں ہوتی تھیں) پھر اس صنعت کو وسیع انداز کی مقامی منڈیوں سے بھی فائدہ پہنچا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ نپولین کے سرحدی علاقے فتح کرنے کے نتیجے میں فرانسیسیوں کی تعداد جو ۱۷۸۹ء میں ۲۵ ملین تھی' وہ ۱۸۱۰ء میں ۴۴ تک پہنچ گئی لیکن روئی کی کمی اور اس کی زیادہ قیمت سے پارچہ بافی کی صنعت میں رخنہ پڑا۔ نیز انگلستان کی نئی تکنیک کے استعمال میں تاخیر سے بھی اس پر زد پڑی۔ بحیثیت مجموعی فرانسیسی صنعت دوران جنگ نمو پذیر ہوئی۔ پھر اس میں مسابقت کا ماحول بھی قدرے مفقا تھا۔ گویا اس طرح بیرونی دشمنوں نے اسے تحفظ فراہم کیا۔

بحری ناکہ بندی کی وجہ سے فرانس کا اقتصادی نظام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بحر اوقیانوس کا علاقہ جو اٹھارھویں صدی میں نہایت تیزی سے ترقی کر رہا تھا اور (جیساکہ برطانیہ کا معاملہ تھا) صنعت و حرفت کا اہم منبع بھی تھا' شاہی بیڑے کی وجہ سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ خصوصی طور پر سانتو ڈومنگو کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث فرانس کی اوقیانوسی تجارت بری طرح زد میں آ گئی۔ سمندر پار کی دیگر نو آبادیاں اور سرمایہ کاری بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔ حتیٰ کہ ۱۸۰۶ء کے بعد غیر جانب دار بحری راستوں کے ذریعے ہونے والی تجارت پر بھی قدغن لگ گئی۔ بورڈیک کو شدید نقصان پہنچا۔ بیسز میں فرانسیسی غلاموں کی تجارت کا سلسلہ رک گیا۔ حتیٰ کہ مرسلز جو ساحلی علاقے اور شمالی اٹلی میں مشترکہ تجارت میں حصہ لے رہا تھا' کی صنعتی پیداوار ۱۷۸۹ء اور ۱۸۱۳ء کے دوران گھٹ کر ایک تہائی رہ گئی۔ البتہ فرانس کے شمالی اور مشرقی علاقوں' مثلاً" السیک میں زمین کے راستے ہونے والی تجارت نسبتاً" محفوظ تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس علاقے کے لوگ جو شراب کشید کرنے اور پارچہ جات بنانے میں معروف تھے اور پر سکون اور خطرات سے محفوظ ماحول میں خاصا منافع کما رہے تھے تاہم فرانس کی مجموعی معاشی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ بحر اوقیانوس کے علاقے میں صنعتی کاروبار بند ہو جانے اور زیادہ تر بیرونی دنیا سے کٹ کر رہ جانے کی وجہ سے

فرانس نے اپنے کسانوں' قصباتی تجارت اور مقامی غیر مسابقتی اور چھوٹی چھوٹی صنعت کی جانب توجہ دینی شروع کی۔

مذکورہ اقتصادی قدامت پرستی اور بعض صورتوں میں حائل رکاوٹوں کے باوجود کئی دہائیوں پر مشتمل بڑی طاقتوں کی جنگ میں فرانس جس طرح رقم لگاتا رہا' وہ عدیم المثال ہے۔ ۱۷۹۰ء کی ابتدائی اور درمیانی دہائی میں جو "مقبول عام تحریک" تھی وہ اس نتیجے کا نمایاں سبب تو ہے ہی لیکن یہ نپولین کے دور کی اس بات کی مناسب طریقے سے وضاحت کرنے کے قابل نہیں جس میں ۵۰۰۰۰۰ سے زیادہ کثیرالتعداد فوج (جس میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ نفری کا اضافہ ناگزیر تھا) کو باقاعدہ تنخواہ ادا کی جا رہی تھی۔ فرانس کے فوجی اخراجات ۱۸۰۷ء میں ۴۶۲ ملین فرانک تھے جو ۱۸۱۳ء میں بڑھ کر ملین فرانک ہو گئے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ عام محصولات ان اخراجات کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر' راست محصول بھی عوام میں ناپسند کیے جاتے تھے' لہٰذا ان کا نفاذ بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ نپولین کو قدیم طرز حکومت کے جاری کردہ بالواسطہ ٹیکس عائد کرنے پڑے اور تمباکو اور نمک پر بھی محصول لگانا پڑا۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ نہ ان اقدامات کی مدد سے اور نہ ہی دستاویزی محصولات اور کرگیری کی فیس سے جنگی اخراجات کے باعث ہونے والے سینکڑوں ملین فرانک کے سالانہ خسارے کا تدارک کیا جا سکا۔ یہ حقیقت ہے کہ فرانس کو بینک آف فرانس کے قیام' دیگر متنوع مالیاتی اداروں اور اقدامات کے نتیجے میں کاغذی زر کی فراہمی کی پالیسی اختیار کرنی پڑی۔ اس طرح حکومت کا مالی اعتبار برقرار رہا' حالانکہ بادشاہ نے قبل ازیں زبردستی قرض لینے کا اعلان کر رکھا تھا۔ پھر بھی یہ سب کچھ ناکافی تھا۔ بہرحال اس خلا کو کسی نہ کسی طرح تو پر ہونا تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ نپولین کی شہنشاہیت کا انحصار تمام تر لوٹ کھسوٹ پر ہی تھا۔ اس عمل کا آغاز اندرون ملک اس طرح کیا گیا کہ جو انقلاب کے مخالف تھے ان کی جائیدادیں ضبط کر کے فروخت کر دی گئیں۔ جب انقلاب کے تحفظ کے لیے فوجی مہم شروع کی گئی اور فرانسیسی افواج پڑوسی ملکوں میں داخل ہوئیں تو ضرورت کا تقاضا یہ تھا کہ غیر ملکی افراد عسکری اخراجات برداشت کریں بالفاظ دیگر یہی کہا جا سکتا ہے کہ جنگ ہی جنگ کا سہارا بنتی ہے۔ نپولین نے شکست خوردہ ملکوں کے تاج و تخت اور جاگیرداروں کی ملکیت پر قبضہ کر کے دشمنوں کے فوجیوں' قلعے اور شہر کے محافظوں' عجائب گھروں اور خزانوں کو لوٹ کر' تاوان جنگ نقد یا جنس کی صورت میں وصول کر کے طفیلی ریاستوں پر فرانسیسی لشکر مسلط کر کے اور اول الذکر کو امدادی سامان مہیا کرنے پر مجبور کر کے نہ صرف بے پناہ فوجی اخراجات پورے کیے بلکہ فرانس اور خود اپنی ذات کے لیے خاطر خواہ فوائد حاصل کیے۔ اس طرح جو دولت فرانس کے دور عروج میں اس غیر معمولی حکومت کے کرتا دھرتاؤں نے حاصل کی تھی وہ بے نظیر تھی۔ اس کے مقابلے میں دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنی نے اپنی طفیلی ریاستوں اور مفتوحہ علاقوں میں لوٹ کھسوٹ سے جو دولت حاصل کی تھی وہ کم تر تھی۔ مثال کے طور پر جینا کے واقعہ کے بعد پروشیا کو ہرجانے میں ۳۱۱ ملین فرانک ادا کرنے پڑے تھے جو حکومت فرانس کی معمول کی آمدنی کے نصف کے مساوی تھے۔ ہیبسبرگ سلطنت کو ہر شکست کے بعد مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنے علاقے فرانس کے قبضے میں دے اور ساتھ ہی تاوان میں بڑی رقم بھی ادا کرے۔ اٹلی میں ۱۸۰۵ء اور ۱۸۱۲ء کے دوران جو محصول وصول ہوئے ان کا نصف فرانس کی حکومت نے لے لیا تھا۔ ان تمام باتوں کے دو فائدے تھے۔ ایک تو فرانسیسی سپاہ وطن سے باہر رہتی تھی۔ دوسرے ٹیکس دینے والوں پر جنگ کے اخراجات کا بوجھ کم ہی پڑتا تھا۔ اگر فوج اپنے ذہین کمانڈر کی ماتحتی میں کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے تو پھر

بھلا نظام سلطنت کیوں کر ناقص ہو گا۔ اگر فرماں روا اس قسم کے بیانات دے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں:

> "میری شان و شوکت ہی میری طاقت کا راز ہے اور میری عظمت کا سبب میری فتوحات ہیں۔ اگر میری شان و شوکت اور فتوحات برقرار نہیں رہیں تو میری طاقت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ میں جو کچھ بھی ہوں یہ فتوحات ہی کا نتیجہ ہے اور صرف فتح ہی کے ذریعے میں اپنی یہ پوزیشن برقرار رکھ سکتا ہوں۔"

پھر نپولین کو کس طرح شکست دی جا سکتی تھی؟ برطانیہ جس کے پاس فوج کی کمی تھی' یہ کام تنہا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ دوسرے براعظم میں فرانس کے کسی بھی دشمن کا اس ملک پر حملہ ہمیشہ ناکام رہا۔ ۱۸۰۶ء میں پروشیا نے قبل از وقت جو جنگ چھیڑی تھی وہ اس خیال کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اگرچہ اس نے ۱۸۰۹ء کے اوائل میں آسٹریا کی بد دل اور مایوس حکومت کو فرانس کے ساتھ دوبارہ تشدد آمیز رویہ اختیار کرنے سے باز بھی نہیں رکھا تھا۔ بہرحال جب آسٹریا اکمول اور ا۔سپرن کے میدان جنگ میں نہایت اولوالعزمی سے لڑا تھا' اس موقع پر واگرام کی شکست نے ویانا کو صلح کی بات چیت کرنے اور فرانس اور اس کے اتحادیوں کو مزید علاقے دینے پر مجبور کر دیا۔ آسٹریا کی فتح کے فوراً" بعد نپولین اسپین میں ہونے والی بغاوت کو کچلنے کے لیے بڑھا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاں کہیں بھی شہنشاہ کے ارادے کی مخالفت ہوئی' اسے نہایت سرعت سے دبا دیا گیا۔ ادھر برطانیہ نے بھی سمندروں میں اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا ہی جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ مثلاً" اگست ۱۸۰۷ء میں کوپن ہیگن پر اس کا حملہ! وہ چھوٹے پیمانے پر حملہ کر کے دشمنوں کے فوجی وسائل کو غارت کر دینے کا خوگر تھا۔ جیساکہ جنوبی اٹلی' یونس آئرس اور ۱۸۰۹ء کے موسم گرما میں وال چیرن پر تباہ کن حملے کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔

ٹھیک اس وقت جبکہ نپولین کا نظام سلطنت ناقابل شکست دکھائی دیتا تھا' شہنشاہیت کے ڈھانچے میں پہلی بار شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ مسلسل فتوحات کے باوجود ان لڑائیوں میں فرانس کا جانی نقصان اچھا خاصا ہوا تھا۔ ترتیب کچھ یوں ہے:

ایلاؤ میں ۱۵ ہزار سپاہی مارے گئے جبکہ فرڈ لینڈ میں بارہ ہزار! بیلن میں ۲۳ ہزار مارے گئے یا انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ا۔سپرن میں ۴۴ ہزار اور واگرام میں ۳۰ ہزار سپاہیوں کی ہلاکت کے باعث اس کا بے پناہ جانی نقصان ہوا۔ تجربہ کار فوجی دستے مفقا ہوتے جا رہے تھے' خصوصاً" گارڈ رجمنٹ کے بیرونی حصے میں! مثال کے طور پر خصوصی گارڈ میں ۳۸۰۰۰ سپاہی ۱۸۰۹ء میں تعینات تھے۔ ان میں ۴۷۰۰۰ کم عمر رنگروٹ تھے۔ اگرچہ نپولین کی فوج میں ہٹلر کی طرح بہت سے فوجی جوان مفتوحہ علاقوں یا طفیلی ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے' اس کے باوجود فرانس کی سپاہ میں نفری کی شدید قلت تھی۔ اس کے برعکس زار کے پاس خاصی تعداد میں سپاہی موجود تھے۔ حتیٰ کہ واگرام کی شکست کے بعد بھی زخم خوردہ آسٹریا کے پاس کثیر فوج تھی۔ ان سب کی اہمیت مستقبل قریب کی جنگوں کے لیے بڑی اہم تھی۔

علاوہ ازیں ۱۸۰۸ء کے اواخر میں اسپین پر نپولین کی چڑھائی اس کی خواہش کے برعکس بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اسپین کی قدیم افواج کو تتر بتر کرنے کے دوران اس نے مقامی آبادی کو گوریلا جنگ اختیار

کرنے کی ترغیب دی۔ بعد میں اس کے لیے اس چیز کو قابو میں کرنا بے حد مشکل ہو گیا۔ پھر اس کی وجہ سے فرانسیسی سپاہیوں کو نقل و حمل کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ مقامی آبادی نے کھانے پینے کا سامان فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ فرانسیسی سپاہ کو اپنے ہی رسد کے ذرائع پر انحصار کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں' اسپین یا پرتگال کی سرزمین میں میدان جنگ کا انتخاب نپولین نے بغیر سوچے سمجھے کیا تھا۔ اس نے ایسے علاقے منتخب کیے جہاں برطانیہ اپنی کارکردگی دکھا سکتا تھا۔ ابتدا میں تو وہ (برطانیہ) محتاط رہا لیکن بعد میں جرات رندانہ کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ ولنگٹن نے مقامی لوگوں کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ جزیرہ نما کے جغرافیہ سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ پھر سمندر پر اسے بالادستی حاصل تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی تجربہ کار فوج فرانس کے لشکر کا صفایا کرنے کے لیے کافی تھی۔ ۱۱-۱۸۱۰ء میں لسبن کی جانب پیش قدمی میں مسیا کی فوج کا ۲۵۰۰۰ افراد کا جانی نقصان ہوا۔ یہ اس امر کی جانب ابتدائی اشارہ تھا کہ ہسپانوی ناسور پر نشتر زنی ممکن نہ تھی اس کے باوجود فرانس کی تین لاکھ فوج پائر۔نیز کی جنوبی سمت روانہ کی جا چکی تھی۔

اسپین نے جہاں فرانس کی طاقت کو ضعف پہنچایا وہاں ہسپانوی تاجروں نے برطانیہ کے فوجی اور اقتصادی وقار کو کم بھی کیا۔ آخر گذشتہ انگریزی۔ فرانسیسی جنگوں میں اسپین نے فرانس کا ہی ساتھ دیا تھا۔ اس سے نہ صرف خشکی کے راستے جبرالٹر کو خطرہ درپیش ہوا تھا بلکہ فرانس اور ہسپانیہ کے مشترکہ بحری بیڑے کی صورت میں برطانیہ کی بحری برتری کو بھی تشویش کا سامنا تھا۔ علاوہ ازیں' جزیرہ نما' لاطینی امریکا اور بحیرہ روم میں برآمدات کی منڈیاں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ اب یہی اسپین جیسا دوست ملک جارحیت پر اتر آیا تھا اور پچھلے تمام دباؤ کو غت ربود کر دینے کا درپے تھا۔ براعظم کے مروجہ نظام کے تحت برطانوی تجارت کو جو نقصان پہنچا تھا اب اس میں خاصی بہتری پیدا ہو گئی تھی۔ لنکا شائر اور مڈلینڈ کی مصنوعات اب پرانی منڈیوں میں پہنچنے لگی تھیں۔ ۱۸۱۰ء تک برطانیہ کی مجموعی برآمدات ۴۸ ملین پونڈ تک پہنچ چکی تھی (۱۸۰۸ء میں یہ ۳۷ ملین پونڈ تھیں) اگرچہ یہ سہولت عارضی تھی اور بحر بالٹک کے راستے کی ناکہ بندی اور انگلستان و امریکہ کے درمیان قضیے سے گہنا رہی تھی پھر بھی کافی تھی۔ اس سے نپولین کے ایک بڑے دشمن کو استحکام حاصل ہوا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب براعظم یورپ میں بغاوت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

بادی النظر میں یورپ میں نپولین کا رائج کردہ نظام تضادات پر مبنی تھا۔ فرانس میں انقلاب کی جو بھی حیثیت رہی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک ایسی قوم جو آزادی' اخوت اور مساوات کا پرچار کیا کرتی تھی۔ اب اپنے شہنشاہ کی ہدایت پر غیر فرانسیسی آبادیوں کو اپنے زیردام کر رہی تھی' ان پر اپنے سپاہی تعینات کر رہی تھی ان کے سازوسامان کو قبضے میں لے رہی تھی' ان کی تجارت کا ستیاناس کر رہی تھی' ان پر بے طرح ٹیکس عائد کر رہی تھی' ان سے نہایت درجے کا تاوان وصول رہی تھی اور ان کے جوانوں کو جبراً" بھرتی کر رہی تھی۔ اس "براعظمی نظام" کے تحت جس طرح کا کنٹرول قائم کیا جا رہا تھا اس کے خلاف شورش کی لہر صاف محسوس کی جا رہی تھی۔ برطانیہ کے خلاف نپولین جس قسم کی اقتصادی جنگ لڑ رہا تھا' اس سے صرف سیز اور بورڈیوکس کو ہی نہیں' ایمسٹرڈم' ہیمبرگ اور ٹریسٹ کو بھی نقصان پہنچ رہا تھا۔ بعض تو کھلم کھلا اس نظام کی مخالفت پر اتر آئے تھے خصوصاً" اسپین والے بعض نے اس تباہ کن نظام سے علیحدہ ہو جانا ہی مناسب سمجھا جیساکہ دسمبر ۱۸۱۰ء میں روسیوں نے کیا تھا۔ بہرحال نپولین کی عظیم فوج جونہی ماسکو کی مہم میں ہزیمت سے دوچار ہوئی اور اس کا شان و شوکت والا لشکر پائر۔نیز کی جانب دھکیل دیا گیا تو فرانس کی

قیادت ختم ہونے کی امید بندھ گئی۔ اب اہالیان پروسیا روس سویڈن' آسٹریا اور دیگر علاقے کے لوگ بس اتنا چاہتے تھے کہ انھیں رائفل بوٹ اور وردی مہیا کی جاتی رہے۔۔۔۔ روپے پیسے نہیں! اور یہ سب کچھ برطانیہ اپنے پرتگالی اور ہسپانوی اتحادیوں کو پہلے ہی فراہم کر رہا تھا۔ دریں صورت' جزائر برطانیہ اور اس کی خوشحالی جہاں ایک طرف قائم رہی وہاں فرانس کی دوسروں پر مسلط ہو جانے اور لوٹ کھسوٹ کی فطرت بھی دوسری جانب اپنا دام بچھاتی رہی۔ بالآخر ان عوامل کے نتیجے میں نپولین کی شہنشاہیت کا زوال شروع ہو گیا۔

اقتصادی' جغرافیائی اور سیاسی عوامل کا یہ سرسری سا جائزہ اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کہانی کی تہ میں اتر کر دیکھا جائے۔ خصوصاً" نپولین کی غفلت شعاری اور خود فریبی کو جانچا جائے۔ نیز اس طرح جنگ کے اختتامی دور تک فوجی توازن کا جو انداز رہا ہے وہ بھی واضح ہو جائے گا۔ اس صورت حال میں بھی فرانس کو ایک اعلیٰ قسم کی بحری فوج تیار کرنے کے وسائل میسر تھے۔ پھر کیا ایسا ممکن ہوا۔ برطانیہ کو برآمدات کی تجارت میں محض ۱۸۱۲ء میں ایک شدید دھچکا لگا تھا۔ جب اکتوبر ۱۸۱۳ء میں لیپزگ کی جنگ ہوئی تھی' اس وقت اس بات کے آثار خاصے نمایاں تھے کہ نپولین اپنے ایک مشرقی دشمن کا صفایا کر دے گا اور اس طرح اپنے خلاف قائم اتحاد کو پاش پاش کر دے گا۔

تاہم اس وقت تک فرانس کی توسیع میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایسے میں کسی اہم خرابی کے واقع ہو جانے سے نظام مملکت کے دوسرے حصے یقیناً" متاثر ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فوج کی کمزور صفوں کو مستحکم کر کے مستعمل کرنے سے ان حصوں کے غیر محفوظ ہو جانے کے خطرات تھے۔ ۱۸۱۱ء کے لگ بھگ اسپین میں فرانس کی کوئی ۳۵۳۰۰۰ فوج موجود تھی۔ جیساکہ ولنگٹن نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی مجاز نہ تھیں۔ ان کی زیادہ تر کوشش یہی تھی کہ فاصلاتی نظام محفوظ رہے۔ اس طرح وہ انگلستان' پرتگال اور اسپین کی پیش قدمی کے سامنے بے بس نظر آتی تھیں۔ جب اگلے سال نپولین نے روس کی آزادی کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تو اسپین سے ۲۷۰۰۰ فوجی واپس بلا لیے تاکہ ماسکو کی جانب پیش قدمی میں وہ شامل ہو جائیں۔ ۶۰۰۰۰۰ کی اس عظیم فوج میں محض ۲۷۰۰۰۰ فرانسیسی افراد تھے۔ اتنی ہی تعداد جزیرہ نما میں تعین لشکر کی تھی۔ علاوہ ازیں چونکہ فرانسیسی باشندوں کے ساتھ ساتھ بلجیم' ہالینڈ اور اٹلی کے لوگ بھی ملحقہ علاقوں میں بس رہے تھے' لہٰذا فوج کے لیے جوان ۱۷۸۹ء کے قبل کے سرحدی علاقوں سے منتخب کیے گئے۔ اس طرح روس کی فوجی مہم میں ان سب کی حیثیت اقلیت کی تھی۔ ان باتوں سے فتح و نصرت کے ابتدائی ایام میں تو کوئی فرق نہیں پڑا' لیکن جب پسپائی کے بعد واپسی شروع ہوئی' تو شدید موسم کے ڈر سے فوجی مایوسی کے عالم میں بھاگنے لگے۔ اور جب وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے اس وقت اس صورت حال نے گل کھلائے۔

روس کے خلاف مہم جوئی میں فرانس کی عظیم فوج کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ کچھ نہیں تو ۲۷۰۰۰۰ سپاہی ہلاک ہوئے اور ۲۰۰۰۰۰ گرفتار کر لیے گئے۔ اسی طرح ایک ہزار بندوقیں برباد ہوئیں اور ۲ لاکھ گھوڑے مر گئے۔ مشرقی محاذ نے فرانسیسی فوج کا حوصلہ بری طرح پست کر دیا۔ یہاں اس حقیقت کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ ۱۸۱۳ء کے بعد کے عرصے میں مشرقی یورپ اور جزائر کی فوجی مہمیں آخر کس طرح زوال کا سبب بنیں جبکہ روس کی فوج بھی محدود تھی اور اس کے جرنیلوں میں جوش و جذبے کی بھی کمی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود اہل روس فرانس کو جرمنی کے اس پار دھکیلتے رہے۔ ادھر اہل برطانیہ امریکہ کی جنگ سے کسی حد تک منحرف نظر آ رہے تھے۔ انہی دنوں' یعنی ۱۸۱۳ء کے موسم گرما کے آغاز میں نپولین نے ایک لاکھ

پینتالیس ہزار نئی فوج تیار کر لی تھی۔ چنانچہ اس کے بل بوتے پر اس نے سیکسونی میں اپنے قدم جمائے رکھے اور التوائے جنگ کے لیے گفت و شنید کرنے لگا۔ اگرچہ اس وقت تک پروشیا روس کا حمایتی بن گیا تھا اور میٹرنخ نے آسٹریا کی ڈھائی لاکھ فوج کو لے کر یلغار کرنے کی دھمکی دے دی تھی' اس کے باوجود مشرقی علاقے کی طاقتیں نہ آپس میں متحد تھیں اور نہ ہی ان میں یقین کا جذبہ تھا۔ تب یہ خبر عام ہوئی کہ ولنگٹن کے لشکر نے جوزف بوناپارٹ کی فوج کو وکٹوریہ کے مقام پر شکست فاش دی (جون ۱۸۱۳ء) اور اسے پائیرینیز کی جانب بھاگنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس اہم اطلاع نے اہل آسٹریا کو حوصلہ مند بنا دیا۔ انھوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ ساتھ ہی روس' سویڈن اور پروشیا کی فوج کے ہم رکاب ہو کر فرانس کو جرمنی سے بے دخل کرنے پر تل گئے۔ اکتوبر میں لیپزگ کے مقام پر ایسی گھمسان کی جنگ ہوئی جس سے برطانوی فوج آشنا نہ تھی۔ چار دن کی لڑائی میں فرانس کے ایک لاکھ پچانوے ہزار سپاہیوں کو اتحادیوں کی تین لاکھ پینسٹھ ہزار فوج نے بے دست و پا کر دیا۔ واضح رہے کہ آخر الذکر فریق کو برطانیہ کی مراعات سے تقویت پہنچ رہی تھی۔ نیز سوا لاکھ دستی بندوقیں' ۲۱۸ توپیں اور بہت سے دیگر سامان بھی جزائر برطانیہ سے آئے تھے۔

لیپزگ کے مقام پر فرانس کی شکست سے ولنگٹن کا حوصلہ بلند ہوا۔ وہ اس وقت پائرینیز کے شمال میں تھا۔ اب وہ بے اون اور تولوز کی جانب پیش قدمی کرنے لگا۔ پروشیا اور آسٹریا کی فوجیں جیسے ہی دریائے رھائن کے اس پار وارد ہوئیں اور تاتاری قزاقوں نے پولینڈ پر حملہ کر دیا' نپولین نے ۱۸۱۳ء کے اوائل میں شمال مشرقی فرانس کے دفاع کے لیے نہایت ہوشمندانہ قدم اٹھایا۔ لیکن اس کے لشکر میں قوت کی کمی تھی' دوسرے اس میں بے شمار رنگروٹ شامل تھے۔ علاوہ ازیں یہ جنگ فرانس کی سرزمین پر ہو رہی تھی لہٰذا وہاں کے عوام زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ (ولنگٹن نے اس بات کا پہلے ہی اظہار کر دیا تھا) چونکہ برطانیہ نے اپنے اتحادیوں پر یہ دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح فرانس کو اس کے سابقہ مقام پر لے آئیں' دوسرے ۹ مارچ کے معاہدے کی رو سے مزید ۵ ملین پونڈ کی رقم انھیں بطور امداد برطانوی حکومت سے ملنے والی تھی لہٰذا سارے حلیف اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں لگے ہوئے تھے حتیٰ کہ ۳۰ مارچ ۱۸۱۴ء تک نپولین کے جرنیلوں کو بھی بہت کچھ حاصل ہو گیا تھا اور اس کے ایک ہفتے کے اندر اندر شہنشاہ دست بردار ہو گیا۔

مذکورہ رزمیہ واقعات سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو انگلستان اور امریکہ کی جنگ جو ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۴ء کے دوران ہوئی' محض ایک حربی تماشا تھی۔ اگر "براعظمی نظام" کے زوال سے اس کا تعلق نہ ہوتا اور اگر نیو انگلینڈ کی ریاستیں جن کا زیادہ تر انحصار انگریزی و امریکی تجارت پر تھا' اس جھگڑے کے دوران سرد مہر اور غیر جانب دار نہ ہوتیں تو اقتصادی نقطہ نظر سے یہ جنگ برطانیہ کے مفاد کے لیے بہت اہم ہوتی۔ امریکی افواج کا کینیڈا کی جانب پیش قدمی کا اعلان خود بخود دم توڑ گیا۔ یارک (ٹورنٹو) اور واشنگٹن پر حملے اور بحری جہازوں کے بعض موثر اقدامات کے باوجود فریقین نے یہ باور کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کو میدان جنگ میں یا سمندروں میں نقصان تو پہنچا سکتے ہیں' شکست نہیں دے سکتے۔ بہرحال برطانیہ پر امریکی تجارت کی اہمیت واضح ہو گئی۔ دوسرے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ سمندر پار کے علاقے میں بڑی تعداد میں بری اور بحری فوجی اڈے قائم رکھنا خاصا مشکل ہے' پھر ایسی صورت میں جبکہ یورپ میں افواج کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ جہاں تک ہندوستان کا معاملہ تھا تو وہاں کی مقبوضات اور تجارت دونوں برطانیہ کی قوت کو مستحکم کر رہی تھیں اور جنگی حکمت عملی سے توجہ بھی ہٹی ہوئی تھی۔

نپولین نے مارچ سے جون ۱۸۱۵ء تک جو آخری معرکہ سرانجام دیا وہ یقیناً "ایک تماشا نہیں تھا بلکہ یورپ کی عظیم جنگ کا آغاز ضرور تھا۔ اس کی جلا وطنی سے اچانک فرانس میں واپسی نے پولینڈ، سکسونی اور دیگر علاقوں کے مستقبل کے قضیے پر فاتحین کو بوکھلا دیا۔ لیکن اس سے اتحاد میں رخنہ نہیں پڑا۔ اگر نہایت جلدی میں اکٹھی کی جانے والی فرانسیسی فوج واٹرلو کے مقام پر ولنگٹن اور بلوشر سے شکست نہ بھی کھاتی تو اس امر کا جائزہ لینا خاصا مشکل ہے کہ بلجیم کی جانب پیش قدمی کرنے والے لشکر جرار کا یہ کیونکر مقابلہ کرتی۔ پھر یہ طے کرنا اور بھی دشوار ہے کہ ایسا کر لینے کے باوجود فرانس اقتصادی طور پر اس طویل جنگ کا کس طرح متحمل ہو سکتا تھا۔ بہرحال نپولین کی یہ آخری احمقانہ جسارت سیاسی لحاظ سے اہمیت کی حامل تھی کیونکہ اس نے یورپ میں برطانیہ کی پوزیشن کو دوبارہ مستحکم کر دیا۔ پھر اس سے اس خیال کو بھی تقویت ملی کہ مستقبل میں فرانس کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ اس کے چاروں جانب مضبوط قسم کی بفر ریاستوں کا حصار قائم ہو۔ اس نے جینا کے بعد پروشیا کی فوجی قوت کو بحال کرنے کی راہ آسان کی۔ اس طرح مشرقی یورپ میں کسی حد تک توازن قائم ہو گیا۔ اس واقعہ نے تمام طاقتوں کو ویانا میں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ آپس کے اختلافات ختم کر دیں تاکہ امن کی فضا قائم ہو۔ اس طرح طاقت کے توازن کا اصول وضع ہو جائے گا۔ دو دہائیوں کی مسلسل محاذ آرائیوں اور ایک صدی پر مشتمل بڑی طاقتوں کے باہمی جھگڑے اور بحران کے بعد بالآخر یورپ کا ریاستی نظام قائم ہوا جس نے نامکمل ہی سہی مگر ایک توازن کی راہ استوار کی۔

۱۸۱۵ء کے معاہدہ ویانا کے مطابق فرانس کی اس طرح تقسیم نہیں ہو سکی جس طرح پروشیا نے چاہا تھا۔ بہرحال لوئس ہشت دہم کی مملکت کے علاقائی یونٹوں سے کچھ اس طرح حلقہ بندی کی گئی تھی کہ شمال میں نیدر لینڈ کی سلطنت تھی جبکہ جنوب مشرق میں سرڈینیا (پیڈ مونٹ) کی وسیع مملکت واقع تھی۔ دریائے رھائن کے علاقے میں پروشیا تھا۔ اسپین اگرچہ بوربن کے حوالے کر دیا گیا تھا لیکن بڑی طاقتوں نے اس کی سالمیت کی ضمانت دے رکھی تھی۔ دور دراز مشرق میں بھی طاقت کے توازن کو برقرار رکھا گیا تھا' اگرچہ اس معاملے میں فاتحین کے مابین خاصی کج بحثی بھی ہوئی تھی۔ چونکہ آسٹریا نے اس پر اعتراض کیا تھا' لہٰذا پروشیا کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی تھی کہ وہ سیکسونی پر قبضہ کر لے۔ البتہ اس نے پوسن اور رھائن لینڈ کی صورت میں تلافی قبول کر لی تھی۔ اسی طرح آسٹریا کو اٹلی اور جرمنی کے جنوب مشرق میں کچھ حصے دے کر تلافی کر دی گئی تھی۔ اس کی وجہ درحقیقت یہ تھی کہ اس نے پولینڈ کا صرف گیلیشن علاقہ اپنے پاس رکھا تھا۔ حتیٰ کہ روس نے پولینڈ کے علاقے میں اپنا وافر حصہ طلب کیا تھا جسے بالآخر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ویسے وہ ۱۸۱۵ء کے آغاز میں انگلستان' فرانس اور آسٹریا کے باہمی اتحاد قائم ہونے سے خوف زدہ تھا۔ سیکسونی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اس نے جو حق حاصل کر رکھا تھا' اس پر اتحادی جبیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ چنانچہ روس نے محاذ آرائی سے توبہ کر لی۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی طاقت یورپ پر نپولین کی طرح اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔ ۱۷۹۳ء سے لے کر ۱۸۱۵ء تک ہونے والے واقعات کے نتیجے میں بھی قیادت کرنے والی ریاستوں کی انا ختم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ "قابو میں رکھنے اور تلافی کرتے رہے" کی پالیسی کے سبب اب یورپ پر تسلط قائم کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ حتیٰ کہ معمولی نوعیت کی علاقائی تبدیلی کے لیے بھی اتحادی ممبران کی اکثریت کی منظوری لازمی تھی۔

بہرکیف یورپی "پنچایت" کے ذکر کے سلسلے میں اس حقیقت کا بھی اظہار ضروری ہے کہ پانچوں بڑی طاقتوں کے مابین ویسے تعلقات نہیں رہے تھے جیسا کہ ۱۷۵۰ء یا ۱۷۸۹ء میں تھے۔ روس کے مستحکم

ہونے کے باوجود یہ کہا جا سکتا تھا کہ نپولین کے زوال کے بعد خشکی پر ایک نامکمل سا طاقت کا توازن قائم ہو گیا تھا۔ دوسری طرف سمندروں میں ایسی کوئی مثال نہ تھی۔ بحری طاقت میں برطانیہ کو اجارہ داری حاصل تھی اس کی بدولت جہاں ایک طرف تسلط قائم کیا جا رہا تھا تو دوسری جانب اسے اقتصادی برتری کی بدولت مزید مستحکم بھی کیا جا رہا تھا۔ بعض صورتوں میں "جیساکہ ہندوستان کے ضمن میں" یہ توسیع پسندانہ فوجی کاروائی اور لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے اختتام تک محاذ آرائی اور منافع کے حصول نے برصغیر کو برطانیہ کا محور بنا دیا تھا۔ سانتو ڈومنگو کی مثال بھی ایسی ہی تھی۔ انقلاب سے پہلے فرانس کی نوآبادیاتی تجارت کا تین چوتھائی حصہ اسی کا مرہون منت تھا۔ لیکن برطانیہ کے قبضے کے بعد ۱۷۹۰ء کی آخری دہائی میں یہ انگلستان کی مصنوعات، کی اہم منڈی اور وہاں کی برآمدات کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا۔ علاوہ ازیں شمالی امریکہ' ویسٹ انڈیز' لاطینی امریکہ' ہندوستان اور مشرقی ممالک کی منڈیاں یورپ کے مقابلے میں نہایت تیزی سے فروغ پا رہی تھیں۔ دور دراز علاقوں سے تجارتیں منافع بخش بھی تھیں اور جہاز رانی' لین دین' بحری جہازوں کے انشورنس' ہنڈی کے بے باقی اور بنکاری کو ترقی سے ہمکنار بھی کر رہی تھیں۔ ان باتوں کی وجہ سے لندن کی پوزیشن مضبوط ہوئی اور وہ دنیا کا اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ حال میں کچھ ایسے مضمون شائع ہوئے ہیں جن میں اٹھارھویں صدی میں برطانوی معیشت کی ترقی اور اس میں بیرونی تجارت کے عمل دخل پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ سمندر پار کی مقبوضات سے مذکورہ ملک کو دولت کے نئے اور بے پناہ انبار تک رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ یہ بات اس کے دشمنوں کے نصیب میں نہ تھی۔ ۱۸۱۵ء کے قریب یورپ کی زیادہ تر نوآبادیوں پر کنٹرول کرنے' بحری راستوں پر چھا جانے' برآمداتی تجارت سے منافع حاصل ہونے اور صنعت میں دوسرے ملکوں سے سبقت لے جانے کی وجہ سے اہل برطانیہ فی کس آمدنی کے لحاظ سے اب امیر ترین قوم بن چکے تھے۔ جیساکہ آئندہ باب کے مطالعہ سے ظاہر ہو گا۔ اگلی نصف صدی کے دوران وہ اور بھی امیر ترین ہو جائیں گے۔ اس کی وجہ دنیا کے تجارتی نظام میں برطانیہ کی حد سے بڑھی ہوئی اقتصادی برتری تھی۔ توازن برقرار رکھنے کا وہ اصول جسے پٹ اور کیسلریگ خاصی اہمیت دیتے تھے' محض یورپ کے علاقائی نظام تک ہی محدود تھا۔ اس کا نوآبادیات اور کاروباری دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔

ان باتوں سے انیسویں صدی کے اوائل کے ذہین مبصروں کو ذرا کم ہی حیرت ہو سکتی ہے۔ اپنی خود ساختہ شان و شکوہ کے باوجود نپولین اکثر و بیشتر موقعوں پر برطانیہ سے خائف نظر آتا تھا۔ اس ملک کے استحکام' بحری قیادت' بینک اور قرض کے نظام کو دیکھ کر وہ پیچ و تاب کھاتا اور سب کچھ خاک میں ملا دینے کے درپے نظر آتا۔ بلا شبہ' عداوت اور ناپسندیدگی کا یہ احساس ہسپانوی' ولندیزی اور دیگر ملکوں کے باشندوں میں بھی تھا جو اہل برطانیہ کو اپنے ملک سے باہر اجارہ داری قائم کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب ۱۸۱۲ء میں نپولین کی "عظیم فوج" مار بھگا دی گئی تو اس موقع پر روسی جرنیل کسوف نے اپنی فوج کی مغربی جانب پیش قدمی روک دی اور نپولین کو بالکل ہی تباہ و برباد کر دینے کے خیال کے آتے ہی وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "اس کی جانشینی نہ تو روس کو ملے گی نہ ہی براعظم کی کسی اور طاقت کو! بلکہ یہ اس کو ملے گی جو سمندروں پر حکمرانی کرتا ہے اور جس کی قیادت ہمارے ناقابل برداشت ہو گی" بالآخر ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ نپولین کا گھمنڈ اور لڑائی ختم کرنے سمجھوتے سے اس کا انکار نہ صرف اس کے زوال کا سبب بنا بلکہ اس کے سب سے بڑے دشمن کی فتح مندی کا پیش خیمہ بھی بن گیا۔ ایک دوسرے جرنیل لیسی ناؤ نے جسے اہم اور

وسیع معاملات کا بخوبی ادراک تھا' طنزیہ لہجے میں یہ کہا تھا:

"برطانیہ سب سے زیادہ اسی بدمعاش (نپولین) کا احسان مند ہے۔ اس نے جو بھی کارنامہ انجام دیا' اسی کی بدولت انگلستان کی عظمت' خوشحالی اور دولت میں اضافہ ہوا۔ وہ سمندر کا فرماں روا ہے۔ اقلیم بحر اور عالمی تجارت میں ایک بھی ایسا مد مقابل نہیں جس سے وہ خائف ہو۔"

صنعتی دور میں فوجی حکمت عملی اور اقتصادیات

۴

صنعتی نظام اور بدلتا ہوا عالمی توازن

۱۸۱۵ء۔۔۔۱۸۸۵ء

بین الاقوامی نظام جو نپولین کے زوال کے بعد نصف صدی تک ترقی کے جس عمل سے گزرا وہ چند غیر معمولی خصوصیات کا حامل ہے۔ ان میں کچھ تو عارضی نوعیت کی تھیں جبکہ دوسری موجودہ دور کا اہم عنصر قرار پا گئیں۔

پہلی خصوصیت مربوط عالمی معیشت کی مسلسل اور پھر ۱۸۳۰ء کی دہائی کے بعد فریب نظر ترقی تھی جس نے بہت سے علاقوں کو سمندر پار کی' نیز بین البراعظمی تجارت اور مالیاتی کاروبار میں ملوث کر لیا۔ اس کا محور یورپ اور خصوصاً" برطانیہ عظمیٰ تھا یہ تمام عشرے برطانیہ کی اقتصادی قیادت پر مشتمل تھے۔ اس دوران مواصلاتی نظام میں وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی۔ ایک خطے سے دوسرے خطے تک صنعتی تکنیکس نہایت سرعت سے پھیلتی رہی۔ اس دوران مختلف مصنوعات بہت بڑی مقدار میں تیار ہوئیں۔ نیتجتاً" زراعت کو فروغ حاصل ہوا اور خام مال میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ نرخنامے کی قباحتوں اور دیگر تجارتی طریق کار کے ازالے' آزاد تجارت اور بین الاقوامی ارتباط کے نظریے کی وسیع تشہیر سے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک نیا عالمی نظام وجود میں آ گیا ہے جو اٹھارھویں صدی کی اس دنیا سے بالکل مختلف ہے جس میں بڑی طاقتوں کے درمیان مسلسل محاذ آرائی ہوا کرتی تھی۔ ۱۷۹۳ء سے ۱۸۱۵ء تک جو لڑائیاں ہوتی رہیں اور بحرانی کیفیت کا جو سماں چھایا رہا اسے انیسویں صدی میں جنگ عظیم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔۔ اس سے قدامت پرست اور آزاد خیال دونوں ہی نالاں تھے۔ وہ ایسی صلح اور استحکام کے حامی تھے جو ایسے طریق کار پر استوار ہو جس میں اتحاد یورپ یا آزاد تجارت کے معاہدے جیسی وسعت ہو۔ ان واقعات نے طویل المیعاد تجارت اور صنعت میں سرمایہ کاری کے رجحان کو فروغ دیا۔ اس سے عالمی معیشت کی ترقی کے امکانات روشن ہوئے۔

دوسرے بڑی طاقتوں کے مابین طویل عرصے تک جنگ نہ ہونے کے یہ معنی نہیں تھے کہ تمام ممالک کی آپس کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ غیر ترقی یافتہ اقوام کو زیر پا کرنے کی یورپی اور شمالی امریکی جدوجہد ہنوز وسیع پیمانے پر جاری تھی۔ ان کے فوجی اقدامات کا سمندر پار کے ملکوں کی اقتصادی حالت پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ حتیٰ کہ مصنوعات کی پیداوار میں زوال آ گیا تھا۔ علاوہ ازیں' یورپی طاقتوں کے درمیان علاقائی اور نچلی سطح کی جنگیں ہنوز جاری تھیں۔ ایسے تنازع کی بنیاد عموماً" قومیت اور علاقائی سرحدیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر بھی جیسا کہ ہم دیکھیں گے میدانی جنگ دورانیے اور حدود اربعہ کے لحاظ سے محدود ہو چکی تھی۔ اس کی واضح مثال ۱۸۵۹ء کی فرانس اور آسٹریا کی جنگ یا ۱۸۶۰ء کے عشرے میں جرمنی کے اتحاد کی جنگوں سے دی جا سکتی ہے۔ جنگ کریمیا کو بھی باقاعدہ جنگ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ امریکہ کی خانہ جنگی اس سے مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا اس کا تجزیہ ضروری ہے۔

تیسرے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جو تکنیک مروج ہو رہی تھی' اس کے اثرات بری اور

بحری جنگ پر بھی مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن یہ تبدیلی قدرے سست تھی اور ویسی نہیں تھی جس کا بسااوقات اظہار کیا جاتا تھا۔ یہ تو مذکورہ صدی کے نصف آخر میں ہوا کہ ریل' ٹیلیگرام' جلد مار کرنے والی بندوق' دخانی قوت اور مسلح جنگی جہاز فوجی قوت کا آلہ کار بن گئے۔ اگرچہ نئی ٹیکنالوجی سے دخانی قوت اور نقل و حمل کی کارکردگی بہت بہتر ہو گئی تھی اور بڑی طاقتیں سمندر پار ملکوں میں اسے استعمال میں لا رہی تھیں' پھر بھی وہ دن ابھی بہت دور تھے جب بری اور بحری فوج کے سپہ سالار یورپ میں جنگ لڑنے کا نیا طریق کار وضع کرنے والے تھے۔ تاہم تکنیکی تبدیلی اور صنعتی ترقی کے دو اہم عوامل زمینی اور بحری محاذوں پر مسلسل اپنے اثرات قائم کر رہے تھے نیز یہ ملکوں کے استحکام کو بھی متاثر کر رہے تھے۔

اگرچہ اس کا تعین کرنا مشکل ہے' پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ صنعت اور ٹیکنالوجی کی ناہموار تبدیلی سے بڑی طاقتوں کے توازن میں بھی تغیر رونما ہوا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں لڑی جانے والی جنگوں کے نتائج پر اس تبدیلی کے اثرات مالیات اور قرض کے لین دین سے کہیں زیادہ مرتب ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی میں بینکاری کا نظام ملکی اور بین الاقوامی سطح پر خاصا فروغ پا چکا تھا۔ پھر افسر شاہی کے سلسلے (مثلاً" خزانہ' انسپکٹر' محصل) نے زیادہ تر حکومتوں کے لیے بازار زر سے قرض کی فراہمی آسان بنا دی تھی بشرطیکہ ان کی ساکھ خراب نہ ہوئی ہو یا بینکاری کے عالمی نظام میں عارضی طور پر سیالیت کا بحران نہ پیدا ہوا ہو۔ ان حقائق کا ہی نتیجہ تھا کہ زیادہ تر جنگیں قلیل المیعاد قسم کی تھیں۔ اس کی وجہ فوجی طاقت کے بل بوتے پر میدان جنگ میں جلد از جلد فتح حاصل کرنے کا رجحان تھا۔ پہلے جیسا قومی وسائل کے بروئے کار لانے کا طویل المیعاد سلسلہ اور نئے نئے محصول لگانے کا طریقہ مروج نہیں رہا تھا۔ مثلاً" حاصل شدہ کثیر رقم آسٹریا کو اس کی ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۶ء کی شکست سے نہ بچا سکی۔ نہ ہی فرانس کی دولت اس وقت کام آئی جب ۱۸۷۰ء کی جنگ میں اس کی افواج بری طرح پسپا ہو گئیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہتر مالی حالات کے سبب ہی خانہ جنگی کے دوران شمال کو جنوب پر فتح حاصل ہوئی اور برطانیہ و فرانس کنگال روس کے مقابلے میں جنگ کریمیا کے اخراجات بطریق احسن برداشت کر گئے۔ ان باتوں سے مذکورہ ممالک کی بہتر اقتصادی حالت کا پتہ تو چلتا ہے لیکن قرض کے لین دین اور مالیات میں انہیں جو برتری حاصل تھی اس کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں جنگ کے مالی کردار کا ذکر کم ہی ہوتا ہے بہ نسبت گذشتہ دور کے!

وہ متعدد حقائق جن سے بڑی طاقتوں کو فوائد حاصل ہوئے۔ درج ذیل تھے۔ عالمی معیشت کی ترقی' صنعتی انقلاب کے نتیجے میں رونما ہونے والی پیداواری صلاحیت' یورپ کا استحکام' بری اور بحری افواج کی جدید ٹیکنالوجی اور مقامی سطح کی قلیل المیعاد جنگیں! یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۱۵ء کے بعد کے اقتصادی' سیاسی اور جغرافیائی عوامل سے ان ممالک میں سب سے زیادہ فائدہ برطانیہ نے ہی حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اوروں کے مقابلے میں خصوصی طاقت کا حامل ملک بن گیا تھا۔ ویسے دیگر ممالک بھی ان عوامل سے اپنے اپنے طور پر متاثر ہوئے تھے۔ بہرحال ۱۸۶۰ء کے عشرے سے صنعت میں جو پیش رفت ہو رہی تھی اس نے عالمی طاقتوں کے توازن کو پھر سے تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

مذکورہ زمانے کی ایک اہم خصوصیت کا ذکر ناگزیر ہے۔ وہ یہ کہ انیسویں صدی کے اوائل سے تاریخی اعداد و شمار (خصوصاً" اقتصادی گوشوارے) نے طاقت کے بدلتے ہوئے توازن کا سراغ لگانے میں خاصی مدد فراہم کی تھی اور نظام کے محرکات کا صحیح جائزہ لینے میں ممد و معاون ثابت ہوئے تھے۔ تاہم یہ بات

ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ بہت سے گوشوارے قیاس و گمان پر مبنی ہیں' خصوصاً" ان ملکوں کے اعداد و شمار جہاں سرکاری نظام ناقص رہا ہے۔ یہ بات بھی زیر غور رہے کہ کئی ایسے حسابات (مثلاً" عالمی پیداوار میں حصص) بھی ہیں جنہیں ماہر شماریات نے برسوں بعد محض اندازے سے مرتب کیا تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ اقتصادیات سے حاصل ہونے والی دولت نہ تو فی الفور اور نہ ہی تسلسل کے ساتھ فوجی طاقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شماریات کا علم بس ہمیں کسی ملک کی مادی صلاحیتوں کے بارے میں ایک ادھورا سا خاکہ پیش کر دیتا ہے اور ممتاز ریاستوں کے مقابلے میں اس کے مقام و مرتبے کا تعین کر دیتا ہے۔

جیساکہ علم اقتصادیات کے ماہرین کا اصرار ہے "صنعتی انقلاب" راتوں رات رونما نہیں ہوا۔ اس کا مقابلہ ۱۷۷۶ء' ۱۷۸۹ء اور ۱۹۱۷ء کے ان سیاسی "انقلابات" سے کیا جاتا رہا ہے جو بتدریج اور آہستگی کے ساتھ روبہ عمل آئے تھے۔ اس انقلاب سے بعض صنعت کار اور بعض پیداواری ذرائع ہی متاثر ہوئے تھے۔ پھر یہ خطہ در خطہ رونما ہوا نہ کہ اس نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تاہم یہ تمام عذر ہائے اس حقیقت کو رد نہیں کر سکتے کہ انسان کے اقتصادی حالات میں بنیادی اور اہم تبدیلی ۱۷۸۰ء کے لگ بھگ عمل میں آئی تھی۔ ایک طبقے کے خیال میں یہ اس تبدیلی سے کسی طرح بھی غیر اہم نہیں ہے جو قدیم حجری عہد کے غیر مہذب اور شکاری انسان میں آئی تھی۔ جب وہ عہد متاخر حجری میں ایک گھریلو اور کاشتکار انسان بن گیا تھا' صنعت سازی' خصوصاً" بھاپ سے چلنے والے انجن نے جو کارنامہ انجام دیا وہ یہ تھا کہ طاقت کے بے جان ذرائع کو جان دار بنا دیا۔ یعنی مشین کے ذریعے "حرارت" کو "فعال" بنا ڈالا۔ یہ تیز چلنے والی' مسلسل چلنے والی' ٹھیک ٹھیک کام کرنے والی اور نہ تھکنے والی مشینیں۔۔۔ جن کی بدولت انسان بے پناہ طاقت کو اپنے تصرف میں لانے لگا۔ اس افضل ترین مشین کی ایجاد کے نتائج نہایت عظیم الشان تھے۔ ۱۸۲۰ء کی دہائی میں کپڑے تیار کرنے والی کئی کئی مشینوں کو چلانے والے شخص کی کارگزاری ہاتھ سے کام کرنے والے کے مقابلے میں بیس گنا زیادہ ہوتی تھی۔ اسی طرح کاتنے والی مشین کی پیداواری صلاحیت ہاتھ کے مقابلے میں دو سو گنا زیادہ ہوتی تھی۔ جن سامانوں کے نقل و حمل کے لیے سینکڑوں گھوڑوں کی ضرورت پڑتی انہیں ریل کا تنہا انجن نہایت تیزی سے دوسری جگہ پہنچا دیتا۔ یہ بات یقینی ہے کہ صنعتی انقلاب کے کئی اہم پہلو بھی تھے۔۔۔ مثلاً" فیکٹری کا نظام یا تقسیم محنت! لیکن ہمارے نقطہ نظر سے اہم بات یہ تھی کہ اس کی بدولت پیداوار خصوصاً" کپڑے کی صنعت میں متعدد بہ اضافہ ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ مشینوں کی مانگ ہونے لگی پھر خام مال یعنی روئی' لوہا' جہاز رانی' بہتر مواصلات وغیرہ کی طلب بڑھتی چلی گئی۔

جیساکہ پروفیسر لینڈیز کا خیال ہے' انسان کے پیداواری عمل میں یہ بے نظیر اضافہ اس کی ذاتی کوشش کا ہی نتیجہ تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> "ماضی میں زندگی گزارنے کے بہتر حالات اور اقتصادی استحکام میں فروغ کے باعث آبادی میں اضافہ ہوا کرتا اور یہی لوگ حاصل شدہ فوائد سے استفادہ بھی کرتے۔ لیکن اب' تاریخ میں پہلی مرتبہ معیشت اور علم میں بے پناہ ترقی کے نتیجے میں سرمایہ کاری بڑھ رہی تھی اور نئی نئی تکنیکی دریافت روشناس کرائی جا رہی تھی۔ آبادی کا یہ ایک ایسا اضافہ تھا جس نے مالتھس کے مثبت انداز کی پابندی پر حائل پردے کو اٹھا دیا تھا"

اقتباس کا آخری فقرہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اٹھارھویں صدی سے دنیا کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یورپ کی آبادی ۱۷۵۰ء میں ۱۳۰ ملین تھی، ۱۸۰۰ء میں ۱۸۷ ملین اور ۱۸۵۰ء میں ۲۶۶ ملین تک پہنچ گئی۔ ایشیاء کی آبادی جو ۱۷۵۰ء میں ۴۰۰ ملین تھی، ایک صدی بعد ہوشربا حد تک بڑھ کر ۷۰۰ ملین ہو گئی۔ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں۔۔۔ مثلاً" سازگار آب و ہوا، اعلیٰ درجے کی بار آوری، امراض میں کمی وغیرہ! لیکن افزائش نسل کی یہ شرح خاصی خطرناک تھی۔ اگرچہ اٹھارھویں صدی میں زرعی پیداوار یورپ اور ایشیاء میں بہت اچھی تھی اور افزائش آبادی کی یہ بھی ایک نمایاں وجہ قرار دی جاتی ہے، لیکن انسانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور شکم سیری کے تقاضے نے زرعی پیداوار کے ہر اضافے کو بے مایہ بنا دیا۔ مختصر اراضی پر دباؤ، دیہی بیروزگاری اور اٹھارھویں صدی کے اواخر میں یورپ کے پہلے ہی سے گنجان شہروں میں خاندانوں کی منتقلی۔۔۔۔ یہ سب عوامل بھی امنڈتی ہوئی آبادی کا شاخسانہ تھے۔

اقتصادی خردبین سے اگر دیکھا جائے تو صنعتی انقلاب سے برطانیہ میں پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے نتیجے میں قومی دولت اور قوت خرید میں توسیع ہوئی اور یہ اضافہ آبادی سے کہیں زیادہ تھا۔ مثلاً" ملک کی آبادی ۱۸۰۱ء سے ۱۹۱۱ء کے دوران ۱۰٫۵ ملین سے ۴۱٫۸ ملین ہو گئی۔ یعنی ۱٫۲۶ فی صد سالانہ اضافہ ہوا۔ لیکن اس کی قومی پیداوار میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔۔۔ یعنی انیسویں صدی کے دوران چودہ گنا زیادہ ان شماریات کی رو سے سروے کیے جانے والے علاقے میں مجموعی قومی پیداوار میں ۲ سے ۲٫۵ فی صد سالانہ اضافہ ہوتا تھا۔☆ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں فی کس پیداوار اڑھائی گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ ان اعداد و شمار کا ۱۹۴۵ء کے بعد بہت سے ملکوں کی پیداواری شرح کے اعداد و شمار سے مقابلہ کیا جائے تو مذکورہ اعداد و شمار چونکا دینے والے معلوم نہیں ہوتے۔ جیسا کہ سماجی مورخین ہمیں باور کراتے ہیں، صنعتی انقلاب سے اس ادنیٰ ترین طبقے پر گرانی کا خاصا بوجھ پڑا جو فیکٹریوں اور کانوں میں مزدوری کرتا تھا اور غیر صحت مند، گنجان اور ناپختہ مکانوں والے قصبات میں رہتا تھا۔ تاہم اس بنیادی نکتے کا ذکر نہیں کیا گیا کہ مشینی عہد میں پیداوار کی بڑھتی ہوئی شرح کے نتیجے میں وسیع تر سہولتیں میسر ہوئیں۔ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۵۰ء کے دوران برطانیہ میں اجرت کی اوسط شرح ۱۵ سے ۲۵ فی صد بڑھ گئی تھی۔ پھر اگلی نصف صدی کے دوران اس میں ۸۰ فی صد کا متحیر کر دینے والا اضافہ ہوا تھا۔ جن ناقدوں نے صنعت سازی کو تباہی کا موجب ٹھہرایا ہے۔ انھیں ایشٹن نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے "اس عہد کا سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ پہلے سے کہیں زیادہ بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کس طرح کھلایا پلایا جائے۔ کیوں کر ان کی ستر پوشی کی جائے اور انھیں ملازمت دی جائے" نئی مشینوں کی ایجاد نے بڑھتی ہوئی آبادی کے کثیر حصے کو نہ صرف ملازمت فراہم کی بلکہ فی کس آمدنی میں بھی معتدبہ اضافہ کیا۔ پھر قصبات میں محنت مزدوری

☆ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض تاریخی شماریات میں جزائر برطانیہ کا حوالہ دیا گیا ہے (اس میں آئرلینڈ شامل نہیں) بعض میں برطانیہ عظمیٰ کا ذکر ہے جس میں آئرلینڈ شامل ہے۔ بعض میں شمالی آئرلینڈ کا ذکر تو ہے لیکن جنوبی آئرلینڈ کا نہیں

کرنے والے عوام کے کھانے پینے کے سامان اور دیگر ضرورتوں کو بھاپ سے چلنے والی گاڑیوں نے پورا کر دیا۔۔ یعنی ریل اور چھوٹے بڑے بحری جہازوں کے ذریعے "نئی دنیا" کی فالتو اجناس "قدیم دنیا" کے باسیوں تک پہنچنے لگیں۔

ہم اس نکتے کو پروفیسر لینڈس کے اعداد و شمار کی روشنی میں پرکھیں گے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں، ۱۸۷۰ء میں برطانیہ عظمیٰ میں ۱۰۰ ملین ٹن کوئلہ سالانہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہ توانائی کے ۸۰۰ ملین حرارے کے مساوی تھا۔ یہ اتنا کافی تھا کہ ۸۵۰ ملین افراد ایک سال تک بطور غذا استعمال کر سکتے تھے۔ (اس وقت کی آبادی ۳۱ ملین کے قریب تھی) نیز ۱۸۷۰ء ہی میں برطانیہ میں بھاپ سے چلنے والے انجنوں کی طاقت ۴ ملین گھوڑوں کی طاقت کے برابر تھی۔ بادی النظر میں ۴۰ ملین انسان مل کر یہ توانائی پیدا کر سکتے تھے لیکن اس کے لیے انھیں سال بھر ۳۲۰ ملین بشل گندم کھانی پڑتی اور یہ مقدار ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۱ء تک برطانیہ عظمیٰ کی مجموعی پیداوار سے تین گنا زیادہ ہوتی۔ طاقت کے بے جان وسائل کے استعمال سے انسان نے حیاتیات کے محدود دائرے کو پھیلا کر رکھ دیا اور بے پناہ دولت پیدا کر لی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی بھی اس معاملے میں سد راہ نہ ہو سکی۔ ان حقائق کا موازنہ کرتے ہوئے ایشٹن نے ۱۹۴۷ء میں یہ بات کہی تھی:

> "آج ہندوستان اور چین کی سرزمین میں ایسے مرد اور عورتیں رہ رہی ہیں جو پلیگ زدہ اور بھوکی ہیں۔ یہ سب لوگ نہایت ادنیٰ درجے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ظاہراً" ان سے بہتر تو وہ مویشی ہیں جو دن میں ان کے ساتھ محنت کرتے ہیں اور رات کو تھان پر سو جاتے ہیں۔ ایشیا کا یہ معیار زندگی اور غیر میکانکی خوف و دہشت ان لوگوں کا مقدر بن چکا ہے جو صنعتی انقلاب سے گزرے بغیر اپنی آبادی میں اضافہ کیے چلے جا رہے ہیں"

غیر یورپی دنیا۔۔۔۔۔۔۔۔ عالم کسوف میں

بڑی طاقتوں کے نظام پر صنعتی انقلاب کے اثرات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہو گا کہ چین، ہندوستان اور دیگر غیر یورپی ملکوں پر اس صنعتی انقلاب کے مرتب ہونے والے اثرات کو بھی سمجھ لیا جائے۔ انھیں دو طرفہ نقصانات کا سامنا کرنا پڑا جو ایک دوسرے سے مربوط بھی تھے اور جامع بھی۔ اس قصے کی کوئی حقیقت نہ تھی کہ مغربی عنفص کے اثرات سے پہلے ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے لوگ خوشحال زندگی گزارتے تھے۔ "یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہئے کہ کسی بھی ملک میں صنعتی انقلاب اور جدیدیت کے رونما ہونے سے پہلے غربت کا ماحول کارفرما ہوتا ہے۔ پیداوار قلیل ہوتی ہے، فی کس آمدنی کم ہوتی ہے، زراعت کا نظام فرسودہ ہوا کرتا ہے اور پیداوار بس ضرورت پوری کرنے کے لائق ہوا کرتی ہے" دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ۱۸۰۰ء میں زراعت ہی یورپی اور غیر یورپی ممالک کی بنیادی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں ہندوستان اور چین جیسے ممالک میں بھی بہت سے تاجر، کپڑے کے صنعت کار اور ہنر مند لوگ بستے تھے۔ ان تمام ممالک میں فی کس آمدنی میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ مثلاً" صنعتی انقلاب سے پہلے یورپ کا پارچہ باف جتنا کما لیتا تھا، ہندوستان میں کرگھے پر کپڑا بننے والا عام جولاہا زیادہ نہیں تو اس کا نصف ضرور کما لیا کرتا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ ایشیا اپنے کثیر التعداد کسانوں اور کاریگروں کی

بدولت عالمی پیداوار میں اپنا وافر حصہ ڈال رہا تھا جبکہ کم آبادی والا یورپ بہت کم حصہ پیدا کر رہا تھا۔ وہاں تبدیلی تو اس وقت آئی جب بھاپ والا انجن اور کپڑا تیار کرنے والی مشین نے عالمی توازن کو یکسر تبدیل کر دیا۔

یورپ کی صنعت و حرفت کی ترقی کے نتیجے میں یہ توازن کس ڈرامائی انداز میں تبدیل ہوا۔ اس کا اندازہ بیروچ کے پیش کردہ دو گوشواروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ (دیکھئے جدول ٦ اور ٧)

جدول نمبر٦: عالمی صنعتی پیداوار میں متعلقہ حصہ

۱۷۵۰ء تا ۱۹۰۰ء

	۱۷۵۰ء	۱۸۰۰ء	۱۸۳۰ء	۱۸۶۰ء	۱۸۸۰ء	۱۹۰۰ء
یورپ (بحیثیت مجموعی)	۲۳٫۲	۲۸٫۱	۳۴٫۲	۵۳٫۲	۶۱٫۳	۶۲٫۰
برطانیہ عظمیٰ	۱٫۹	۴٫۳	۹٫۵	۱۹٫۹	۲۲٫۹	۱۸٫۵
سلطنت ہیسبرگ	۲٫۹	۳٫۲	۳٫۲	۴٫۲	۴٫۴	۴٫۷
فرانس	۴٫۰	۴٫۲	۵٫۲	۷٫۹	۷٫۸	۶٫۸
جرمن ریاستیں/جرمنی	۲٫۹	۳٫۵	۳٫۵	۴٫۹	۸٫۵	۱۳٫۲
اطالوی ریاستیں/اٹلی	۲٫۴	۲٫۵	۲٫۳	۲٫۵	۲٫۵	۲٫۵
روس	۵٫۰	۵٫۶	۵٫۶	۷٫۰	۷٫۶	۸٫۸
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۰٫۱	۰٫۸	۲٫۴	۷٫۲	۱۴٫۷	۲۳٫۶
جاپان	۳٫۸	۳٫۵	۲٫۸	۲٫۶	۲٫۴	۲٫۴
تیسری دنیا	۷۳٫۰	۶۷٫۷	۶۰٫۵	۳۶٫۶	۲۰٫۹	۱۱٫۰
چین	۳۲٫۸	۳۳٫۳	۲۹٫۸	۱۹٫۷	۱۲٫۵	۶٫۲
ہندوستان/پاکستان	۲۴٫۵	۱۹٫۷	۱۷٫۶	۸٫۶	۲٫۸	۱٫۷

جدول نمبر٧: صنعت سازی میں فی کس آمدنی کی سطح

۱۷۵۰ء تا ۱۹۰۰ء

(برطانیہ عظمیٰ میں ۱۹۰۰ء میں یہ شرح تھی = ۱۰۰)

	۱۷۵۰ء	۱۹۰۰ء	۱۸۳۰ء	۱۸۶۰ء	۱۸۸۰ء	۱۹۰۰ء
یورپ (بحیثیت مجموعی)	۸	۸	۱۱	۱۶	۲۴	۳۵
برطانیہ عظمیٰ	۱۰	۱۶	۲۵	۶۴	۸۷	(۱۰۰)
سلطنت ہیسبرگ	۷	۷	۸	۱۱	۱۵	۲۳
فرانس	۹	۹	۱۲	۲۰	۲۸	۳۹
جرمن ریاستیں/جرمنی	۸	۸	۹	۱۵	۲۵	۵۲
اطالوی ریاستیں/اٹلی	۸	۸	۸	۱۰	۱۲	۱۷
روس	۶	۶	۷	۸	۱۰	۱۵
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۴	۹	۱۴	۲۱	۳۸	۶۹
جاپان	۷	۷	۷	۷	۹	۱۲
تیسری دنیا	۷	۶	۶	۴	۳	۲
چین	۸	۶	۶	۴	۴	۳
ہندوستان	۷	۶	۶	۳	۲	۱

ان تبدیلیوں کی نمایاں وجہ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیداوار میں اضافہ تھا۔ ۱۷۵۰ء اور ۱۸۳۰ء کے عشرے کے دوران برطانیہ میں پارچہ بافی کی صنعت سے پیداوار میں ۳۰۰ سے ۴۰۰ فی صد تک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ عالمی پیداوار میں برطانیہ کا حصہ ڈرامائی انداز میں بڑھ گیا تھا۔۔۔۔ اور جوں جوں یہ ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک بنتا گیا' اس کا دنیا کی مجموعی پیداوار میں حصہ بڑھتا ہی رہا۔ جب یورپ کی دیگر ریاستوں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے صنعت سازی کو اپنایا تو ان کا بھی عالمی پیداوار میں حصہ مسلسل بڑھتا رہا۔ اسی طرح فی کس صنعت گری کے کام سے آمدنی اور اس کے نتیجے میں قومی دولت میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن چین اور ہندوستان کی کہانی کچھ اور تھی۔ دنیا کی مجموعی پیداوار میں ان کا حصہ نہ صرف کم ہوتا رہا (اور اس کی نمایاں وجہ مغرب کی پیداوار میں بڑھتا ہوا اضافہ تھا) بلکہ بعض حالات میں ان کی معیشت بھی ڈانواڈول تھی۔۔ یعنی وہ صنعت سازی سے بہت دور تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی منڈیاں لنکا شائر کے بہتر اور سستے کپڑوں سے اٹی پڑی تھیں اور جب ۱۸۱۳ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم ہو گئی تو ہندوستان میں سوتی کپڑے کی درآمد بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۱۳ء میں یہ درآمد ایک ملین گز کپڑے پر مشتمل تھی جب کہ ۱۸۳۰ء میں ۵۱ ملین اور ۱۸۷۰ء میں ۹۹۵ ملین گز ہو گئی۔ اس ریل پیل کے نتیجے میں بہت ساری گھریلو صنعتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ بالآخر ہمیں ا۔ شٹن کے اس نقطہ نظر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے یعنی "ان لوگوں کی چکی میں پیس دینے والی غربت جو صنعتی انقلاب سے گزرے بغیر آبادی میں اضافہ کیے چلے جاتے ہیں" چنانچہ چین' ہندوستان اور تیسری دنیا کے دیگر ملکوں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی نے فی کس آمدنی کو نسل در نسل گھٹا کر رکھ دیا۔ بہرحال' بیروچ کا یہ اہم اور تشویشناک خیال ہے کہ ۱۷۵۰ء میں یورپ اور تیسری دنیا میں صنعت سازی سے حاصل ہونے والی فی کس آمدنی دونوں ملکوں میں ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف تھی۔ تاہم ۱۹۰۰ء میں آخرالذکر کی آمدنی اول الذکر کی آمدنی کا اٹھارھواں حصہ تھی (۲ سے ۳۵ فی صد)اور برطانیہ عظمیٰ کی آمدنی کا پچاسواں حصہ تھی (۲ فی صد سے ۱۰۰ فی صد)

انیسویں صدی میں "مغربی آدمی کا تاثر" عالمی طاقت کے لیے ایک محرک کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اقتصادی میدانوں میں اپنی کارکردگی کا باقاعدہ مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے اثرات ساحلی تاجروں' جہاز رانوں اور کار پردازوں سے لے کر فصل اگانے والوں' ریل بنانے والوں اور کان کنی کی کمپنیوں پر براہ راست پڑ رہے تھے۔ علاوہ ازیں موجدوں' مہم جوؤں اور مبلغوں کے روپ میں بھی یہ آدمی جلوہ گر تھا جو مغرب کی بیماریوں سے متعارف بھی کرا رہا تھا اور مغرب کے ایمان و ایقان کی تبلیغ بھی کر رہا تھا۔ کئی براعظم اس کی تحریک کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس کا دائرہ کار ایک طرف سوری سے مغربی سمت اور ارل سمندر سے جنوب کی جانب پھیلا ہوا تھا تو دوسری طرف افریقی دریاؤں کے دہانوں اور بحرالکاہل کے ساحلوں پر محیط تھا۔ اس مذکورہ شخص کے مثالی کارنامے سڑکوں' ریلوے لائنوں' ٹیلیگراموں' بندرگاہوں اور عوامی عمارتوں کی شکل میں ظاہر تھے' مثلاً" برطانیہ کے کارنامے جو اس نے ہندوستان میں انجام دیئے۔ بایں ہمہ اس کا ظالمانہ پہلو

بھی ہے۔ یہ وہی ہے جس نے خون خرابہ کیا' غارت گری کی' لوٹ مار مچائی اور مذکورہ زمانے میں نو آبادیات میں محاذ آرائیوں میں مبتلا رہا۔ یہ بات یقینی ہے کہ کورٹز کے عہد سے اس ظلم و تشدد اور فتح کا رواج رہا ہے۔ لیکن اب اس کام میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ۱۸۰۰ء میں دنیا کی زمین کے ۳۵ فی صد حصے پر یورپ والوں کا قبضہ بھی تھا اور کنٹرول بھی! ۱۸۷۸ء میں یہ اعداد و شمار ۶۷ فی صد تک جا پہنچے پھر ۱۹۱۴ء میں یہ حد بڑھ کر ۸۴ فی صد ہو گئی۔

بھاپ سے چلنے والے انجنوں اور مشینی کل پرزوں کی ترقی سے یورپ کو اقتصادی اور فوجی لحاظ سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ منہ بھرنی بندوق میں ترقی (آتشیں ٹوپی یا رائفلنگ وغیرہ) اس کی واضح مثال ہے۔ پھر توڑے دار بندوق کی ایجاد اور حملے کی شدت میں اضافہ ترقی کی نمایاں مثال ہے۔ پھر گیٹلنگ بندوق' میکسم مشین گن اور ہلکی پھلکی توپ کی ایجاد سے آتشیں انقلاب کو ایک نیا رخ ملا۔ ان عسکری ایجادات نے دیسی باشندوں کو پرانے طرز کے اسلحوں سے مدافعت کرنے میں سراسر ناکام بنا دیا۔ علاوہ ازیں' بھاپ سے چلنے والی گن بوٹ کی ایجاد سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ یورپ جسے کھلے سمندروں میں پہلے ہی بالادستی حاصل تھی اب اس کے ذریعے اندرون ملک بہنے والے دریاؤں مثلاً" نائجر انڈس اور یا نگسی پر بھی دسترس حاصل کر لے گا۔ گویا فولادی زرہ میں ملبوس انتقام کی دیوی اپنے حرکت و عمل اور آتشیں طاقت کو لے کر ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء کی جنگ افیون میں نمودار ہوئی تو چین کے محافظتی لشکر کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دشوار گزار گھاٹیوں (مثلاً" افغانستان) میں مغرب کی فوجی شہنشاہیت کے قدم نہ جم سکے۔ پھر جن غیر یورپی فوجیوں مثلاً" سکھوں اور نائجیریا کے باشندوں نے نئے اسلحوں کے استعمال اور جدید طرز جنگ سے واقفیت حاصل کی' وہ ۱۸۴۰ء کے عشرے میں بھرپور انداز میں یورپ والوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ بایں ہمہ جب کھلے عام جنگ ہوئی اور مغربی اقوام نے مشین گنوں اور دیگر موثر اسلحوں کا استعمال کیا تو پھر ان کی فتح یقینی ہو گئی۔ سب سے زیادہ تباہ کن جنگ اس صدی کے اواخر یعنی ۱۸۹۸ء میں اومڈرمین کے مقام پر ہوئی جب صبح ہوتے ہوتے کچنر کی فوج نے میکسم اور لی این فیلڈ رائفل کی مدد سے ۱۱۰۰۰ درویشوں کو ہلاک کر ڈالا جبکہ اس کے اپنے مرنے والے فوجیوں کی تعداد محض ۴۸ تھی۔ بہرحال' اس آتشیں اسلحے کا نتیجہ تھا کہ دنیا کی قیادت کرنے والی قومیں نچلی سطح کی قوموں کے مقابلے میں پچاس سے سو گنا زائد طاقتی وسائل کی حامل تھیں' اور یہ صنعتی ترقی کا ہی ثمر تھا کہ دنیا پر مغربی اقوام کے مسلط ہو جانے کا جو سلسلہ واسکوڈے گاما کے زمانے سے شروع ہوا تھا۔ اب اس کی کوئی حد نہیں رہی تھی۔

برطانیہ کی برتری

ایرک ہوبسوام کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں توسیع کے نتیجے میں اگر پنجابیوں' اٹامیوں' سوڈن اور یانٹوؤں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو بلا شک و شبہ اہل برطانیہ کو فتح نصیب ہوئی۔ جیساکہ گذشتہ باب میں ذکر کیا جا چکا ہے' ۱۸۱۵ء تک انہوں نے عالمگیر شہرت و عظمت حاصل کر لی تھی۔ اس کی تمام تر وجہ ان کی بحری طاقت' مالی استحکام' تجارتی سلیقہ اور اتحادی سفارت کاری تھی۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں اس ملک کو مزید استحکام نصیب ہوا جو اس عہد سے پہلے ہی کامیاب و کامران تھا۔ جسے بالادستی حاصل تھی' جس نے اٹھارھویں صدی میں تجارت کو فروغ دینے میں جدوجہد کی تھی اور اس طرح زبردست طاقت کا حامل بن چکا تھا۔ اگر یہ بات دہرائی جائے کہ تبدیلی کی رفتار انقلابی نہیں' تدریجی تھی تو اس کے نتائج بھی نہایت موثر تھے۔ ۱۷۶۰ء اور ۱۸۳۰ء کے دوران یورپ میں ہونے والی صنعتی پیداوار کا دو تہائی حصہ برطانیہ عظمیٰ کا مرہون منت تھا۔ اسی طرح دنیا کی صنعتی مصنوعات میں اس کا حصہ ۱.۹ سے ۹.۵ فی صد بڑھ چکا تھا۔ اگلے تیس سال میں برطانیہ کی صنعت میں جو ترقی و توسیع ہوئی اس کے نتیجے میں یہ شرح ۱۹.۹ فی صد تک پہنچ گئی حالانکہ دیگر مغربی ممالک میں بھی نئی ٹیکنالوجی رائج ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ جب ملک کو عروج حاصل ہو چکا تھا' برطانیہ عظمیٰ نے دنیا کے مجموعی لوہے کا ۵۳ فی صد حصہ اور کوئلے اور جلانے کی لکڑی کا ۵۰ فی صد حصہ پیدا کیا تھا۔ پھر دنیا میں روئی کی کل پیداوار کا نصف حصہ بطور خام مال استعمال میں لایا تھا۔ برطانیہ کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا ۲ فی صد اور یورپ کی آبادی کا محض دس فی صد تھی۔ اپنی اس قلیل آبادی کے باوجود یہ ملک دنیا کی مجموعی صنعت سازی کی ۴۰ سے ۴۵ فی صد صلاحیتوں کا مالک تھا اور یورپ کے مقابلے میں ۵۵ سے ۶۰ فی صد صنعتی کارکردگی کا حامل تھا۔ ۱۸۶۰ء میں ایندھن کے جدید وسائل (کوئلہ' لکڑی' تیل) سے توانائی حاصل کر کے استعمال میں لانے کی برطانوی صلاحیت ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا پروشیا سے پانچ گنا' فرانس سے چھ گنا اور روس سے ۱۵۵ گنا زیادہ تھا۔ دنیا کی تجارت میں تنہا برطانیہ کا پانچواں حصہ تھا جبکہ مصنوعات کی مجموعی تجارت میں اس کی ۲/۵ پوزیشن تھی۔ دنیا کے تجارتی جہازوں میں سے ایک تہائی پر برطانیہ کا جھنڈا لہراتا تھا۔ پھر ایسے جہازوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں حیرت کی بات نہیں کہ وکٹوریہ کے وسطی عہد میں اہل برطانیہ کو بے مثال عروج حاصل ہوا۔ جیساکہ ماہر اقتصادیات جیونز نے ۱۸۶۵ء میں لکھا تھا' برطانیہ پورے عالم کا تجارتی مرکز بن چکا تھا۔ اس کے اپنے الفاظ میں:

> "شمالی امریکہ اور روس کے میدان ہمارے کھیت ہیں۔ شکاگو اور اوڈیسا میں ہمارے اناج کے گودام ہیں۔ کینیڈا اور بالٹک کے علاقے میں نمبر کے جنگلات ہمارے ہیں۔ ہماری بھیڑوں کے باڑے آسٹریلیا میں واقع ہیں۔ ارجنٹائن اور شمالی امریکہ کے گیاستان میں ہمارے بیلوں کے ریوڑ چلتے ہیں۔ پیرو سے ہمارے لیے چاندی آتی ہے۔ جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا سے لندن کے لیے سونا موصول ہوتا ہے۔ ہندوستانی اور چینی لوگ ہمارے لیے چائے کی کاشت کرتے ہیں۔ ہمارے لیے کافی' شکر اور گرم مصالحے وغیرہ ہند اقصیٰ میں تیار کیے جاتے ہیں۔ ہمارے انگور کے باغات اسپین

> اور فرانس میں ہیں۔ بحیرہ روم کے علاقے میں پھلوں کے باغ ہمارے ہیں۔ ہمارے روئی کے کھیت جو ایک مدت تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقے میں واقع تھے' اب دنیا کے تمام گرم خطے تک پھیل گئے ہیں۔"

خود اعتمادی کے اس رویے اور صنعت و تجارت کے اعداد و شمار سے برطانیہ کی اس بالادستی کا اظہار ہوتا ہے جس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تاہم ان حقائق کی بہتر طور پر وضاحت کے لیے دیگر امور کا جائزہ لینا بھی مناسب ہو گا۔ اول یہ کہ تمام تر فضیلت کے باوجود برطانیہ کی مجموعی قومی پیداوار ۱۸۱۵ء کے بعد کے عشرے میں کوئی بہت زیادہ نہیں تھی۔ چین کی بہت بڑی آبادی کے پیش نظر (اور اس میں بعد ازاں روس بھی شامل ہو گیا) اور اس واضح حقیقت کے مد نظر کہ زرعی پیداوار اور اس کی تقسیم ہی دراصل ہر ملک کی قومی دولت کی اساس تھی' برطانیہ میں ۱۸۵۰ء سے قبل کے عرصے میں مجموعی قومی پیداوار فی کس پیداوار کے مقابلے میں کبھی بھی پر کشش نظر نہیں آئی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ "مجموعی قومی پیداوار بذات خود اہمیت کی حامل نہیں" سینکڑوں ملین کسانوں کی جسمانی پیداواری صلاحیت کے آگے فیکٹری کے پانچ ملین مزدوروں کی محنت کم مایہ نظر آتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ساری پیداوار فوراً" ہی استعمال میں آ جاتی تھی' لہٰذا فالتو اثاثہ یا فوجی صلاحیت کو ترقی دینے کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا تھا۔ البتہ وہ شعبہ جس میں ۱۸۵۰ء میں برطانیہ کو برتری حاصل تھی اور اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا' وہ جدید صنعت سازی تھی جو حصول زر کا ذریعہ بھی تھی اور بے شمار فوائد کا منبع بھی!

دوسری جانب ہمیں جو حقیقت نظر آتی ہے وہ دلفریب نہ تھی۔ ۱۸۱۵ء کے بعد کے عرصے میں برطانیہ کی صنعتی ترقی اتنی مستحکم نہ تھی کہ وہ ریاست کو فوجی ساز و سامان اور افرادی قوت سے بہرہ مند کر دیتی' جیساکہ ۱۶۳۰ء کی دہائی میں ولنسٹین کے دور حکومت یا بعد میں نازی عہد کی معیشت نے یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ اس کے برعکس تجارت میں سرکاری عدم مداخلت کا نظریہ جو "پولیٹیکل اکانومی" کے نام سے مشہور ہوا' صنعت سازی کی تحریک کے ساتھ ساتھ نشوونما پا رہا تھا۔ اس کے تحت یہ اصرار کیا گیا کہ دائمی امن قائم ہو' حکومت کے اخراجات خصوصاً" دفاعی خرچ میں کمی کی جائے اور معیشت اور افراد پر سرکاری کنٹرول اتنا شدید نہ رہے۔ جیساکہ آدم اسمتھ نے اپنی تصنیف "دی ویلتھ آف نیشنز" (۱۷۷۶ء) میں تسلیم کیا ہے۔ "برطانوی معاشرے کو دیگر آزاد قوموں کے حملے اور تشدد سے بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بری اور بحری فوج کے اخراجات برداشت کیے جائیں اور انہیں مستحکم رکھا جائے۔" لیکن چونکہ مسلح افواج بذات خود "غیر پیداواری" تھیں اور قومی دولت میں اس طرح کوئی اضافہ نہیں کرتی تھیں جس طرح فیکٹری یا کھیت یہ کام انجام دیتے تھے' لہٰذا اسے اس سطح تک محدود کر دیا جائے کہ وہ قومی دفاع کے مطابق ہو۔ اسمتھ کے شاگردوں اور ان سے کہیں زیادہ رچرڈ کوبڈن کا یہ خیال تھا یا کم از کم اسے امید تھی کہ جنگ ایک آخری جتن ہے اور مستقبل میں اس کے ہونے کی کوئی امید نہیں' ذرا دھمکا کر لڑائی کی تحریک پیدا کرنے سے باز رکھا۔ چنانچہ برطانیہ کی صنعت اور مواصلات میں ہونے والی "جدت" کا مقابلہ فوج میں ہونے والی ترقی نہ کر سکی اور ۱۸۱۵ء کے بعد کے عشروں میں تو دفاعی ترقی ماند پڑ گئی۔

عہد وکٹوریہ کے درمیانی عرصے میں برطانیہ کی معیشت کیسی ہی مقبول رہی ہو تاہم مسابقت

کے لیے اسے متحرک نہیں کیا گیا تھا جیساکہ اسٹوارٹ کے ابتدائی دور سے ایسا کیا جاتا رہا تھا۔ تاجروں نے قومی دولت کے تحفظ کے لیے جو اقدامات کیے تھے انہیں آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا۔ مکئی نرخنامے کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی (مثلاً" کپڑا بننے کی مشین) پر عائد شدہ برآمدی پابندی اٹھا لی گئی۔ جنگ کے پیش نظر برطانیہ کے تجارتی جہازوں اور جہاز رانوں کے وافر اسٹاک کو تحویل میں رکھنے کا "قانون جہاز رانی" حذف کر دیا گیا۔ بادشاہ کی ترجیحات بھی تحت ربود کر دی گئیں۔ گویا دفاعی اخراجات کو خاصی حد تک کم کر دیا گیا۔ دفاعی اخراجات ۱۸۳۰ء کے عشرے میں اوسطاً" ۱۵ ملین پونڈ سالانہ تھے جو ۱۸۶۰ء کے آزمائشی عشرے میں بھی ۲۷ ملین پونڈ سے تجاوز نہیں کر پائے۔ تاہم بعد کے عرصے میں برطانیہ کی مجموعی قومی پیداوار ایک بلین پونڈ کے قریب تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۸۱۵ء کے بعد کے پچاس برسوں تک افواج برطانیہ پر مجموعی قومی پیداوار کا کل ۲ء۳ فی صد حصہ خرچ ہوتا تھا۔ اسی طرح مرکزی حکومت کے کل اخراجات ۱۰ فی صد سے بھی کم تھے۔ اٹھارھویں اور پھر بیسویں صدی کے مقابلے میں مذکورہ تناسب نہایت ہی کم تھا۔ ادنیٰ ذرائع کے حامل اور امنگوں سے عاری ملکوں کے لیے یہ اعداد و شمار یقیناً" موثر رہے ہوں گے۔ ایک ایسی ریاست جو غلاموں پر حکمرانی کرتی تھی' جس کی حکومت دور دور تک پھیلی ہوئی وہ عظیم المرتبت بھی تھی اور جو یورپ میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ہنوز کوشاں تھی۔۔۔۔۔ اس کے یہ قلیل دفاعی اخراجات یقیناً" قابل رشک تھے۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جو اقتصادی حالت تھی اسی کی طرح برطانوی معیشت کی عالمی حیثیت کا اندازہ ملک کی جنگی صلاحیت سے قطعاً" نہیں ہوتا تھا۔ وہاں کے حکومتی نظام اور اس کی افسر شاہی جسے تجارت اور صنعت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا' نے برطانوی وسائل کو بھرپور جنگ کے لیے استعمال نہیں کیا تھا اور انہوں نے نہ ہی خانہ جنگی کے تدارک کی کوشش کی تھی۔ جیساکہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے' محدود قسم کی جنگ کریمیا نے بھی مذکورہ نظام کو درہم برہم کر دیا۔ تاہم اس بارے میں تشویش جلد ہی ختم ہو گئی۔ عہد وکٹوریہ کے وسطی عرصے میں یورپی جنگ میں شمولیت کا جذبہ خاصا کم تھا۔ اس لیے کہ شرکت مہنگی بھی پڑتی اور اخلاق کے منافی بھی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۸۱۵ء کے بعد کے چھ عشروں کے دوران براعظم کی بڑی طاقتوں کے درمیان طاقت کا جو توازن قائم تھا اس میں برطانیہ کو غیر ضروری گردانا گیا تھا۔ تاہم برطانیہ نے سفارت کاری اور بحری بیڑوں کی حرکت و عمل کے ذریعے یورپ کے اہم خطوں میں (پرتگال' بلجیم' ڈارڈنیل) اپنا اثر قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی اس میں کسی جگہ بھی فوجی مداخلت کا جذبہ شامل نہ تھا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۰ء کی آخری دہائی اور ۱۸۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں جو کریمیا کی جنگ لڑی گئی' اسے عوام الناس نے بہت بڑی غلطی قرار دیا۔ اسی جذبے کے تحت برطانیہ نے ۱۸۵۹ء کے بحرانی دور میں پڈمونٹ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔ اس نے ۱۸۶۳ء میں شلیسوگ اور ہولسٹن کے معاملات میں پامرسٹن اور رسل کی بے جا دخل اندازی کو بھی ناپسند کیا تھا اور جب پروشیا نے ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کو اور چار سال بعد فرانس کو شکست دے دی تو اس نے دور رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اس عہد میں برطانیہ کی فوجی صلاحیت ادنیٰ درجے کی تھی۔ (دیکھیے جدول ۸) اتنی قلیل عسکری قوت کے بل بوتے پر یورپ جیسے وسیع میدان میں اترنا برطانیہ کے بس میں نہ تھا۔

جدول نمبر۸۔ بڑی طاقتوں کے فوجیوں کی تعداد

۱۸۱۶ء ––– ۱۸۸۰ء

	۱۸۱۶ء	۱۸۳۰ء	۱۸۶۰ء	۱۸۸۰ء
برطانیہ عظمیٰ	۲۵۵٬۰۰۰	۳۰٬۰۰۰	۳۴۷٬۰۰۰	۲۴۸٬۰۰۰
فرانس	۳۲٬۰۰۰	۲۵۹٬۰۰۰	۶۰۸٬۰۰۰	۵۴۴٬۰۰۰
روس	۸۰۰٬۰۰۰	۸۲۶٬۰۰۰	۸۶۲٬۰۰۰	۹۰۹٬۰۰۰
پروشیا/جرمنی	۳۰٬۰۰۰	۳۰٬۰۰۰	۲۰٬۰۰۰	۴۳۰٬۰۰۰
سلطنت ہیبسبرگ	۲۲۰٬۰۰۰	۲۷۳٬۰۰۰	۳۰۶٬۰۰۰	۲۷۳٬۰۰۰
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۶٬۰۰۰	۶٬۰۰۰	۲۶٬۰۰۰	۳۶٬۰۰۰

یورپ کے علاوہ ان ملکوں میں جہاں برطانیہ اپنی رجمنٹس، فوجی اور سیاسی افسر تعینات کرتا ضروری سمجھتا تھا، مثلاً ہندوستان، وہاں یہ عمال فوج کی کمی کی شکایت کرتے تھے اس لیے کہ انھیں ایک وسیع تر علاقے کی نگرانی اور کنٹرول قائم کرنا پڑتا تھا۔ دنیا کے نقشے پر خواہ یہ کیسی ہی وسیع سلطنت نظر آتی ہو لیکن ضلع کے حاکم یہ بخوبی جانتے تھے کہ بہت ہی معمولی رقم سے حکومت چلائی جا رہی تھی۔ بہرحال ان تمام باتوں کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر وسطی عرصے تک برطانیہ عجیب و غریب نوعیت کی بڑی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ فوجی قیادت کے قدیم معیار سے لگانا ممکن نہ تھا۔ البتہ یہ بعض شعبوں میں خاصا مستحکم نظر آتا تھا۔ اہل برطانیہ ان شعبوں کو کثیرالتعداد اور مہنگی افواج سے کہیں زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

ان شعبوں میں پہلے نمبر پر بحریہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۱۵ء سے پہلے پوری ایک صدی تک برطانیہ کی شاہی بحریہ تمام دنیا میں ایک عظیم بحریہ کا درجہ رکھتی تھی۔ لیکن اس شعبے میں اس کی بارہا مسابقت بھی ہوتی رہی، خصوصاً بوربن طاقت نے اس کا مقابلہ کیا تھا۔ بہرحال اسی سالہ اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ کسی بھی ملک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر سمندروں پر برطانیہ کے کنٹرول کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ برطانیہ کو فرانس کا کبھی کبھار دھڑکا بھی لگا رہتا تھا۔ نیز، اس کے امیرالبحر کو روس کی جہاز سازی کے منصوبے پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی اور امریکہ میں بڑے سائز کے بننے والے جہازوں کے پروگرام سے بھی چوکس رہنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ سارے خطرات آن واحد ہی میں ٹل گئے اور پروفیسر لائیڈ کے الفاظ میں "برطانیہ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنی اس بحری طاقت کی دھاک بٹھائے جس کی نظیر بحریہ کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی" اس حقیقت کے باوجود کہ اس نے ۱۸۱۵ء کے بعد اپنے جہازوں کی تعداد میں خاصی کمی کر دی تھی، اس کی شاہی بحریہ لڑنے میں تین چار جہازوں سے کہیں بڑھ کر طاقتور تھی۔ پھر اس کے اہم بحری جہاز یورپ کی سیاست اور خصوصاً اس خطے میں خاصا عمل دخل رکھتے تھے۔ اس کا بحری دستہ ٹاگوس میں لنگر انداز تھا تاکہ اندرونی یا بیرونی خطرات سے پرتگال کی شہنشاہیت کو محفوظ کر سکے۔ اس کی بحری فوج نے بحیرہ روم میں بھی فیصلہ کن اقدامات کیے، مثلاً ۱۸۱۶ء میں الجیئرز کے بحری قزاقوں کا زور توڑا، ۱۸۲۷ء میں نوارینو کے مقام پر ترکی بحری بیڑے کو تباہ کیا اور ۱۸۴۰ء میں ایکر کے مقام پر محمد علی کی سرزنش کی اور جب کبھی مشرقی مسئلہ سنگین ہو جاتا تو مناسب بحری دستہ روانہ کیا جاتا کہ وہ ڈارڈ-نیلیز کے سامنے لنگر انداز ہو جائے

یہ سب برطانیہ کی بحری طاقت کے مظاہر تھے۔ اگرچہ یہ طاقت جغرافیائی لحاظ سے محدود تھی لیکن یورپی حکمرانوں کے ذہنوں میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ یورپ سے باہر شاہی بحریہ کے چھوٹے چھوٹے بیڑے اور نچی جنگی جہاز متعدد کارکردگی میں مصروف تھے۔ مثلاً بحری ڈاکوؤں کو کچلنا، غلاموں سے بھرے جہازوں کا سراغ لگانا، دوسرے جہازوں کا سامان قبضے میں کرنا اور مقامی حکمرانوں کو مرعوب کرنا۔ یہ سلسلہ کینٹن سے زنجبار تک قائم تھا۔ اس کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔

برطانیہ کا دوسرا اہم اور موثر شعبہ نو آبادیوں تک اپنی سلطنت کو وسیع کرنا تھا۔ پچھلی دو صدیوں کے برعکس یہاں بھی اسے مقابلہ آرائی کی نوبت کم ہی آئی۔ قبل ازیں، اسے اپنی سلطنت کے تحفظ کے لیے فرانس، اسپین اور دیگر یورپی ریاستوں سے پیہم جنگ کرنی پڑی تھی۔ اب صورتحال یہ تھی کہ کبھی کبھی بحرالکاہل میں فرانسیسیوں کا سامنا ہوتا یا ترکستان میں روسی مزاحم ہوتے بصورت دیگر کسی دوسرے اہم دشمن کا دور دور نام و نشان نہ تھا۔ لہٰذا یہ کہنے میں ہرگز مبالغہ نہ ہو گا کہ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۸۰ء کے دوران برطانیہ کی سلطنت طاقت و سیاست کے وسیع خلا میں قائم تھی اور اسی وجہ سے نو آبادیوں میں اس کی فوج نہایت قلیل تعداد میں تعینات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانوی سلطنت محدود تھی اور اسے کئی طرح کے مسائل کا سامنا بھی تھا، مثلاً مغربی کرے میں امریکی جسورت فروغ پا رہی تھی۔ اسی طرح مشرقی علاقے میں فرانس اور روس مدمقابل تھا لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ منطقہ حارہ کے اکثر حصوں میں طویل مدت تک برطانوی مفادات (تجارت، کاشتکاری، مہم جوئی، تبلیغ و اشاعت) کو غیر ملکیوں سے کوئی زک نہیں پہنچی البتہ اسے مقامی لوگوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

بیرونی دباؤ کے فقدان اور وطن میں حکومت کی حریت پسندی کے پیش نظر بہت سے مبصرین کی رائے ہے کہ نو آبادیوں پر قبضہ سراسر غیر ضروری تھا۔ یہ محض ٹیکس کے بوجھ سے لدے ہوئے اہل برطانیہ کی گردن میں بندھی ہوئی چکی کے مترادف تھا۔ بہرحال اندرون برطانیہ سلطنت کے خلاف جو بھی نعرہ لگ رہا ہو لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ سلطنت ترقی کر رہی تھی اور اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۸۱۵ء اور ۱۸۶۵ء کے دوران ایک لاکھ مربع میل سالانہ کی اوسط رفتار سے یہ پھیل رہی تھی۔ بعض مقبوضات فوجی اور تجارتی نوعیت کی تھیں، مثلاً سنگاپور، عدن، جزائر فاکلینڈ، ہانگ کانگ، لاگوس وغیرہ بعض مقبوضات محض سفید فام اور زمین پر قبضہ کرنے والوں کا نتیجہ تھیں۔ یہ لوگ جنوبی افریقہ، کینیڈا اور آسٹریلیا میں جا کر آباد ہو رہے تھے۔ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے نتیجے میں عموماً دیسی لوگوں کی سخت مزاحمت ہوتی جسے دبانے کے لیے برطانیہ یا برطانوی ہندوستان سے فوجی دستے منگوانے پڑتے اور جب کبھی ان مقبوضات کے خلاف اور بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے پیش نظر ملکی حکومت احتجاج کرتی تو اس کے ردعمل میں یوروگائے سے لیوانٹ اور کانگو سے یا نگسی تک آباد برطانوی باشندوں کی آواز گونج اٹھتی۔ اگر فرانس کی کبھی کبھار رکی نو آبادیات پر قبضہ کی کوشش اور امریکنوں اور روسیوں کی اندرونی سطح کی نو آبادیاں قائم کرنے کے عمل سے برطانیہ کی کارگزاری کا مقابلہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ انیسویں صدی کے تمام عرصے میں اس معاملے میں اہل برطانیہ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

تیسرا شعبہ جس میں برطانیہ کو امتیاز اور استحکام حاصل تھا، وہ مالیات کا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شعبہ کو ملک کی صنعتی اور تجارتی ترقی سے الگ تھلگ نہیں کیا جا سکتا۔ صنعتی انقلاب کو متحرک کرنے کے لیے رقم ناگزیر تھی اور اسی کے طفیل اس رقم کی ریل پیل بھی ہوئی جو سرمایہ کاری کے

منافع کی صورت میں حاصل ہوئی۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں عرض کیا جاچکا ہے' حکومت برطانیہ کو بینکوں اور اسٹاک بازار سے قرض لینے کا علم بہت پہلے سے تھا لیکن انیسویں صدی کے وسط میں مالیاتی شعبے میں جو ترقی ہوئی' اس کے نتیجے میں صورت حال پہلے کے مقابلے میں کیفیتی اور کمیتی دونوں لحاظ سے یکسر تبدیل ہو گئی۔ پہلی نظر میں کمیتی فرق توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں طویل عرصے تک امن و امان قائم رہنے اور ملک میں مالیاتی ادارے کے فروغ کے نتیجے میں اہل برطانیہ میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ بیرون ملک سرمایہ کاری کریں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ واٹرلو کے واقعہ کے بعد کے عشرے میں تقریباً" ۶ ملین پونڈ کی رقم بطور سرمایہ کاری بیرون ملک بھیجی جاتی تھی لیکن مذکورہ عشرے کے وسط میں یہ رقم ۳۰ ملین پونڈ سالانہ ہو گئی۔ پھر ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۵ء کے دوران یہ بڑھ کر ۷۵ ملین پونڈ سالانہ ہو گئی۔ اس سرمایہ کاری کے نتیجے میں اہل برطانیہ کو سود اور منافع منقسمہ کی صورت میں جو رقم ملتی تھی وہ ۱۸۳۰ء کی آخری دہائی میں ۸ ملین پونڈ سالانہ تھی۔ پھر ۱۸۷۰ء کے عشرے میں یہی رقم ۵۰ ملین پونڈ سالانہ تک جا پہنچی لیکن زیادہ تر صورتوں میں یہی رقم بیرون ملک باز سرمایہ کاری میں لگا دی جاتی۔ اس طرح منافع در منافع کا چکر چلتا رہتا۔ اس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف اہل برطانیہ امیر ترین ہوتے چلے گئے وہاں دوسری جانب عالمی تجارت کو بھی فروغ ملتا رہا اور مواصلات کے نظام میں ترقی ہوتی چلی گئی۔

بیرون ملک وسیع سرمایہ کاری کے نتائج متعدد صورتوں میں ظاہر ہوئے جو اپنی جگہ خاصی اہمیت کے حامل ہیں اول یہ کہ سمندر پار ملکوں میں سرمایہ کاری سے جو حاصلات میسر ہوتیں ان سے وہ سالانہ تجارتی خلا پر ہو جاتا جو برطانیہ کو خرید و فروخت کے سلسلے میں بارہا درپیش ہوتا۔ دریں حالات' سرمایہ کاری کے ذریعے حاصل شدہ آمدنی سے اس غیر مرئی کمائی میں اضافہ ہو گیا جو جہاز رانی' انشورنس' بینکاری کی فیس' سامان کی خرید و فروخت وغیرہ سے میسر ہوتی تھی۔ بایں ہمہ یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ توازن ادائیگی کا بھی کوئی بحران پیدا نہیں ہوا اور یہ کہ اہل برطانیہ اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ امیر ہوتے چلے گئے۔ دوسرا قابل غور نقطہ یہ ہے کہ برطانوی معیشت نے دھونکنی کی طرح کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے خام مال اور غذائی اشیاء کی اہم مقدار سمیٹ کر اور اس کے عوض زیادہ سے زیادہ پارچہ جات' لوہے کے سامان اور دیگر مصنوعات بنا بنا کر بیرون ملک بھیجنا شروع کر دیئے' اس مرئی تجارت کے ساتھ ساتھ تجارتی جہاز' بیمہ کی سہولتیں اور بینکاری کی خدمات بھی میسر تھیں۔ یہ سب ----- سلسلہ لندن' لیورپول' گلاسکو اور دیگر شہروں سے بیرونی دنیا تک پھیلا ہوا تھا اور وہ بھی انیسویں صدی میں!

اندرون ملک کھلی منڈیوں اور حکومت برطانیہ کے اس فیصلے کے پیش نظر کہ سمندر پار کی حاصل شدہ آمدنی ریلوے' بندرگاہ' افادی امور اور زرعی کار اندازی میں لگائی جائے۔ یہ بات یقینی تھی کہ مرئی تجارت کی ترقی اور سرمایہ کاری کے انداز میں مکمل ہم آہنگی تھی۔☆ نیز معیار طلا کو تسلیم کرنے کا رجحان

☆ مثال کے طور پر ارجنٹائن کو باآسانی برطانیہ عظمیٰ میں بیف اور غلے کی برآمدات کے لئے منڈی دستیاب تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے برطانیہ کی درآمدی مصنوعات کی قیمت اور دیگر خدمات کا معاوضہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ بایں ہمہ لندن سے طویل المیعاد شرائط پر حاصل کردہ قرض بھی ادا کرنا پڑتا تھا اور آئندہ قرض لینے کے لئے اپنی ساکھ برقرار رکھنی پڑتی تھی۔ اس کے برعکس بیسویں صدی میں لاطینی امریکہ کو دیئے جانے والا امریکی قرض تعجب خیز ہے یعنی قلیل لمیعاد قرض اور زرعی پیداوار کی برآمدات پر پابندی

بڑھتا جا رہا تھا اور بین الاقوامی مبادلہ اور ادائیگی کے طریق کار میں ترقی ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ ایسی منڈیوں پر مشتمل تھا جس کی اجرائی لندن میں ہوتی تھی۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ عہد وکٹوریہ کے وسطی عرصے میں اہل برطانیہ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ قدیم سیاسی معیشت کے اصول اپنا کر انھوں نے خوشحالی اور عالمی ہم آہنگی کا راز معلوم کر لیا ہے۔ اگرچہ بہت سے افراد جن میں توری جماعت کے حامی' قدیم آمرانہ طرز حکومت کے شیدائی' جدت پسند سوشلسٹ شامل تھے' اس تصور کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھے۔ تاہم زیادہ تر لوگ سرکاری معیشت کی بنیادی اہمیت اور حکومت کی کارکردگی کے معترف تھے۔

ان تمام باتوں کے نتیجے میں اہل برطانیہ بہت مختصر مدت میں امیر ترین بن گئے تھے لیکن کیا اس میں فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے ایسے دور رس مضمرات نہیں چھپے تھے؟ ماضی کے تجزیئے کے تحت ان اقتصادی تبدیلیوں کے ایسے دو نتائج کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو آنے والے دنوں میں برطانیہ کے عالمی اقتدار پر اثر انداز ہونے والے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ برطانیہ طویل المیعاد منصوبے کے تحت دوسرے ممالک کو اپنی نو آبادی بنا رہا تھا۔ اس سکیم کے تحت وہاں صنعتیں لگا رہا تھا اور انہیں ترقی بھی دے رہا تھا۔ بایں ہمہ زراعت کو بھی فروغ دے رہا تھا۔ اس منصوبے کے تحت وہ مسلسل سرمایہ بھی لگا رہا تھا' ساتھ ہی ساتھ ریلوے اور بندرگاہیں بھی تعمیر کر رہا تھا اور جہاز رانی کو بھی ترقی دے رہا تھا۔ ان تمام عوامل کی بدولت سمندر پار ممالک کے دیسی پیداکار مستقبل میں خود برطانیہ کے حریف بن گئے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ بھاپ کی طاقت' فیکٹری کے نظام' ریلوے' بجلی وغیرہ نے برطانیہ کو اس قابل کر دیا کہ وہ اعلیٰ پیمانے کی پیداکاری میں حائل جملہ قدرتی اور جسمانی مشکلات پر قابو پا لے۔ اس طرح ملک کی دولت اور استحکام میں اضافہ ہوا۔ ان ایجادات نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ' روس اور وسطی یورپ کو کہیں زیادہ فائدے پہنچائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زمینی استعداد کی ترقی میں حائل قدرتی اور جسمانی مشکلات کہیں زیادہ تھیں۔ نہایت واضح انداز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صنعت کاری نے بس یہی کیا اپنے ہی ملکی وسائل کے مواقع عام کر دیئے۔ پھر چند فوائد کو چھوٹی چھوٹی علاقائی آبی اور تجارتی ریاستوں سے لے کر بڑے بڑے خشکی والے ملکوں کو دے دیا۔

دوسری فنی اور استعدادی خامی یہ تھی کہ برطانوی معیشت بین الاقوامی تجارت اور مالیات پر منحصر تھی۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں برآمدات سے حاصل ہونے والی آمدنی قومی آمدنی کا پانچواں حصہ تھی۔ یہ والپول یا پٹ کے عہد حکومت کے مقابلے میں نہایت ہی اعلیٰ تناسب تھا۔ خاص طور پر کپڑے کی مصنوعات کے لیے سمندر پار ممالک میں زبردست منڈیاں دستیاب تھیں۔ خام مال اور غذائی اشیاء کی غیر ملکی برآمدات برطانیہ کے لیے ضروری ہو گئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ملک جو کبھی زراعتی رہا تھا۔ اب تیزی سے صنعتی بنتا جا رہا تھا۔ دریں حالات بینکاری' انشورنس' اشیاء کی معالجت' سمندر پار سرمایہ کاری وغیرہ کا نظام تیزی سے فروغ پا رہا تھا۔ ایسی صورت میں عالمی منڈی پر انحصار کا معاملہ مزید پیچیدہ ہو گیا تھا۔ دنیا لندن شہر کے لیے کستورا مچھلی کے مصداق تھی اور امن و امان کی حالت میں یہ یقیناً" بہت لذیذ رہی ہو گی۔ لیکن اس وقت کیا صورت حال ہوتی جب برطانیہ بڑی طاقت کی جنگ میں پھر شریک ہو جاتا؟ کیا برطانیہ کی برآمدات کی منڈیاں ۱۸۰۹ء اور ۱۸۱۱-۱۲ء سے کہیں زیادہ متاثر نہ ہوتیں؟ کیا ملک کی مجموعی معیشت اور گھریلو آبادی کا تمام تر انحصار درآمدی اشیاء پر نہیں تھا؟ کیا جنگ و جدال کی حالت میں ان کی ترسیل کا سلسلہ منقطع نہیں ہو سکتا تھا؟ کیا مالی، جنگ چھڑ جانے کے نتیجے میں بازار بند نہ ہو جاتے' بیمہ کا کام معطل نہ ہو

جاتا' بین الاقوامی سطح پر رقم کا تبادلہ نا ممکن نہ ہو جاتا اور قرض کا لین دین رک نہ جاتا؟ کیا ایسی صورت حال میں برطانوی بینک کاری کا عالمی نظام اور مالیاتی سسٹم درہم برہم نہ ہو جاتا؟ باعث تشویش بات یہ ہے کہ اندریں حالات برطانیہ کی ترقی یافتہ معیشت کسی ایسے غیر ترقی یافتہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ تباہ و برباد ہو جاتی جو بین الاقوامی تجارت اور مالیات پر کم ہی انحصار کرتا ہے۔

ملکوں کی باہمی ہم آہنگی اور مسلسل بڑھتی ہوئی خوشحالی کے پیش نظر مذکورہ بالا اندیشے محض خام خیالی ہیں۔ اصل میں ضرورت اس امر کی تھی کہ سیاست دان تدبر سے کام لیتے اور دوسرے لوگوں سے لڑتے رہنے کی سابقہ روایت سے انحراف کرتے۔ جیساکہ آزاد خیال سرکاری افسروں کی رائے تھی کہ برطانوی صنعت و تجارت عالمی سطح پر جس قدر وسیع ہوتی جائے گی اور بین الاقوامی معیشت پر اس کا جتنا انحصار ہو گا' جھگڑے پیدا کرنے والے منصوبوں پر زور نہ دینے کی تحریک اتنی ہی افزوں ہو گی۔ اسی طرح مالیاتی شعبے کی ترقی کو سراہا جائے گا کیونکہ اس سے درمیانی صدی کی گرم بازاری تیز ہونے کی توقع ہو گی۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار بھی ہو گا کہ برطانیہ کتنا ترقی یافتہ ہو گیا ہے۔ اگر دوسرے ممالک انگلستان کی پیروی کرتے ہوئے صنعت سازی کرتے تو یہ یقیناً" اس معاملے میں ان کی مدد کرتا اور اس طرح مزید منافع کماتا۔ برنارڈ پورٹر کے بقول "یہ مینڈکوں کے انڈوں میں پہلا تھا جس نے پیر نکالے۔ یہ پہلا بچہ تھا جو جلد مینڈک بن گیا۔ یہ پہلا مینڈک تھا جس نے تالاب سے باہر چھلانگ لگا دی۔ یہ ملک اقتصادی لحاظ سے دوسرے ممالک سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ یہ سب سے بہت آگے تھا" ان خوش آئند حالات کے پیش نظر فنی اور استعدادی خامی بے بنیاد دکھائی دیتی ہے۔ جیساکہ عہد وکٹوریہ کے وسطی عرصے کے لوگوں نے خیال ظاہر کیا تھا اور خود کنگسلے نے ۱۸۵۱ء میں کرسٹل پیلس میں منعقدہ نمائش کے موقع پر خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے اعلان کیا تھا ان تمام حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ یقین کیا جا رہا تھا کہ مقدر کا ستارہ عنقریب چمکنے والا ہے۔

> "یہ مشینی جن اور یہ ریلوے لائن' یہ بحری جہاز اور یہ برقی ٹیلیگرام' یہ سب کچھ میری نظر میں اس بات کی علامت ہیں کہ ہم کیا ہیں---- ہم کائنات سے ہم آہنگ ہیں۔ ہمارے اندر ایک طاقتور روح کام کر رہی ہے---- یہ حکم نافذ کرنے اور ہر شے کی تخلیق کرنے والی خدا کی ذات ہے"

دیگر تمام ترقی یافتہ تہذیبوں کی طرح اہل برطانیہ کا بھی یہ یقین تھا کہ ان کی یہ پوزیشن قدرتی ہے اور برقرار رہے گی اور دیگر تمام تہذیبوں کی طرح انھیں بھی آزمائش سے گزرنا تھا۔ لیکن ایسا مستقبل میں ہونا تھا خصوصاً" پامرسٹن اور میکاؤلے کے دور میں۔ بہرحال یہ برطانیہ کی کمزوری نہیں' قوت تھی جو مسلسل منظر عام پر آتی رہی۔"

درمیانی درجے کی طاقتیں

۱۸۱۵ء کے بعد تقریباً" نصف صدی تک براعظم یورپ کی بڑی طاقتوں پر تبدیل ہوتی ہوئی اقتصادی اور ٹیکنالوجی کے اثرات بہت کم مرتب ہوئے۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے برعکس ان

ملکوں میں صنعت سازی کا آغاز نہایت معمولی انداز میں ہوا۔ اگر کوئی مشرق میں دور دور چلا جاتا تو اسے ہر جگہ جاگیر داری اور زراعت پر مبنی معیشت نظر آتی۔ حتیٰ کہ مغربی یورپ میں جو برطانیہ سے قریب تر تھا اور ۱۷۹۰ء سے قبل وہاں کی تجارتی اور صنعتی ترقی سے متاثر بھی ہوا تھا۔ وہاں پر دو عشروں تک لڑی جانے والی جنگ نے بڑی تباہی پھیلائی تھی۔ ان دو عشروں پر پھیلی جنگ کے باعث جانی نقصانات' کسٹم کی بدلی ہوئی شکل' حد سے زیادہ محصولات' اوقیانوس کے علاقے کی چراگاہ میں تبدیلی' سمندر پار کی تجارت میں مندی اور وہاں سے آنے والے خام مال کی عدم دستیابی' برطانیہ کی نئی ایجادات تک عدم رسائی جیسے عوامل اقتصادی حالت کی بہتری میں سد راہ بنے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ جب نپولین کی جنگ کے دوران بعض تجارت اور اس کی وجہ سے مخصوص علاقے ترقی سے ہمکنار ہوئے تو بھی برطانیہ سے مستفیض ہونے کے مواقع دستیاب نہ تھے۔ اگرچہ امن قائم ہو جانے کے بعد تجارت کا سلسلہ دوبارہ قائم ہو جاتا تھا اور براعظم کے کار اندازوں کو اس بات کا جائزہ لینے کا موقع مل جاتا تھا کہ وہ برطانیہ عظمیٰ سے کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں' اس کے باوجود وہاں جدید رجحانات کو اپنانے کا جذبہ پیدا' نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہاں سرمائے کی خاصی کمی تھی' مقامی نوعیت کی مانگ بھی نہیں تھی' عمال میں جوش و جذبہ ناپید تھا۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں تبدیلی کس طرح آتی۔ پھر یورپ کے سوداگر صناع اور کرگھے پر کام کرنے والے جولاہے برطانوی تکنیک کو اپنانے کے سراسر خلاف تھے۔ انھیں یہ احساس تھا (جو صحیح بھی تھا) کہ انگلستان کے صنعتی فن کا استعمال ان کے قدیم طرز زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو گا۔ تاہم بھاپ سے چلنے والا انجن' کپڑا بنانے کی مشین اور ریل نے کسی نہ کسی حد تک براعظم یورپ میں رسائی پا لی تھی۔

> "۱۸۱۵ء اور ۱۸۴۸ء کے دوران معیشت کی روایتی خصوصیات قائل ترین تھیں۔ زراعت کو صنعتی پیداوار پر فوقیت حاصل تھی۔ مواصلات کے سستے اور تیز رفتار ذرائع ناپید تھے۔ اشیائے صرف کو بھاری صنعتوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔"

جیساکہ اوپر دیے گئے جدول نمبر۲ سے مترشح ہوتا ہے ۱۷۵۰ء کے بعد کی صدی میں صنعت سازی کے نتیجے میں فی کس آمدنی کی سطح بہت زیادہ موثر نہیں تھی۔ البتہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کے عشرے کے دوران یہ صورت حال تبدیل ہونے لگی تھی۔ احیائے یورپ کے دور کی سیاسی اور سفارتی صورت حال نے بین الاقوامی حالت سابقہ کو برقرار رکھا یا زیادہ سے زیادہ اس بات کی اجازت دی کہ بہت معمولی سی تبدیلی لائی جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انقلاب فرانس سے یورپ کے اندرونی سماجی ڈھانچے اور روایتی نظام حکومت کو خطرات لاحق ہو چکے تھے۔ لہٰذا میٹرنخ اور دیگر قدامت پرستوں نے ہر تبدیلی کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ مہم جو سفارت کاری جو عمومی جنگ کے خطرات پیدا کر رہی تھی' قومی خود مختاری یا قانونی اصلاحات کی ہر تحریک کی مخالفت کرتی نظر آتی تھی۔ بحیثیت مجموعی تمام سیاسی لیڈروں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اختیارات کے باوجود وہ محض گھریلو شورشیں اور متنوع مفادات سے پیدا شدہ ہنگامے کو بھگتانے میں ہی معروف ہیں۔ ان میں سے بعض نئی مشینوں کے آ جانے' شہروں کی ترقی اور جماعتوں' ہنرمندوں اور صنعت سازی سے مکمل کے معاشرے کو لاحق خطرات سے خوفزدہ نظر آتے تھے۔ جیساکہ ایک مورخ نے وضاحت کی تھی کہ "ملکی خانہ جنگی جس کے نتیجے میں ۱۸۳۰ء میں بڑے پیمانے پر ہنگامے اور فساد پیدا ہوئے اور چھوٹی موٹی بغاوتوں کے

سلسلے" سے یہ حقیقت واضح ہوتی تھی کہ سیاست دانوں میں نہ حوصلہ تھا اور نہ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ بیرونی جھگڑوں میں ملوث ہوں۔ انھیں خدشہ تھا کہ ان کے اپنے علاقے مزید کمزور ہو جائیں گے۔

اس ضمن میں اس بات کا تذکرہ ناگزیر ہے کہ بہت سے فوجی اقدامات محض سیاسی و سماجی نظام کو انقلاب سے محفوظ رکھنے کے لیے کیے گئے تھے' مثلاً" آسٹریا کی فوج نے ۱۸۲۳ء میں پیڈمونٹ کی بغاوت کو کچل دیا تھا۔ اسی سال فرانس کی فوج اسپین میں داخل ہوئی تاکہ شاہ فرڈینینڈ کے سابقہ اختیارات بحال کرا سکے۔ ان سب واقعات میں نہایت اہم یہ بات تھی کہ ۱۸۴۸ء میں ہنگری میں برپا ہونے والے انقلاب کو دبانے کے لیے روسی فوج استعمال کی گئی تھی۔ رد عمل کے یہ تمام اقدامات اہل برطانیہ کو مطلق پسند نہیں آئے۔ بایں ہمہ اس رجحان سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ یہ ملک حریت پسند طاقتوں کو تشدد سے بچانے کا خواہاں نہ تھا۔ جیساکہ یہ طے ہوا تھا یورپ میں کسی بھی علاقائی تبدیلی کے لیے بڑی طاقتوں کی رضامندی حاصل کرنی ضروری تھی۔ نیز بعض ملکوں کی کسی نہ کسی طرح تلافی کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی تھی۔ نپولین کے عہد یا بسمارک کے زمانے کے برعکس ۱۸۱۵ء اور ۱۸۶۵ء کے عرصے میں بہت سے پیچیدہ مسائل کو بین الاقوامی سطح پر پھیلا دیا گیا (مثلاً" بلجیم اور یونان کے معاملات) اور کسی بھی یک طرفہ کارروائی پر برہمی کا اظہار کیا جاتا رہا۔

۱۸۱۵ء کے بعد کی دہائیوں میں پروشیا کی عالمی پوزیشن مذکورہ سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوئی تھی۔ اگرچہ دریائے رھائن کے علاقے کے قبضے کے بعد اس کے علاقے میں خاصی توسیع ہو گئی تھی' لیکن ہوہنزولرن کی ریاست ویسی با اثر نہیں رہی تھی جیسی فریڈرک اعظم کے عہد میں تھی۔ بہرحال ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کی دہائیوں میں پروشیا میں اقتصادی بہتری یورپ کے دیگر علاقوں کے برعکس نہایت تیزی سے آئی۔ اول نصف صدی میں یہ ملک صنعتی طور پر بونا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ۵۰ ہزار ٹن سالانہ فولادی مصنوعات برطانیہ' فرانس' روس اور سلطنت ہیبسبرگ کے مقابلے میں بے مایہ تھی۔ علاوہ ازیں دریائے رھائن لینڈ کے علاقوں کے تصرف میں آنے کے بعد پروشیا نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا بلکہ اس کے صوبوں میں بھی تقسیم ہو گئی تھی۔ اس کا مغربی صوبہ نہایت حریت پسند تھا جبکہ مشرقی صوبہ جاگیرداری نظام کا حامی تھا۔ اس عہد میں زیادہ تر اندرونی خلفشار سے سیاسی ماحول متاثر ہوتا رہا۔ بایں ہمہ ردعمل کی تحریک بھی جاری رہی۔ ۱۸۱۰ء اور ۱۸۱۹ء کے دوران اصلاحات کے رجحان نے سب کو چونکا دیا۔ پھر ۹-۱۸۴۸ء کے انقلاب نے اچھی خاصی بے چینی پھیلا دی۔ جب فوج نے ایک ظالم حکومت قائم کر دی تو ملک کی اندرونی خلفشار کے پیش نظر پروشیا کے طبقہ امراء نے خارجہ پالیسی میں غلط اقدام کرنے سے پہلو تہی برتی۔ اس کے برعکس قدامت پرستوں کا یہ خیال تھا کہ یورپ کی طاقتوں' خصوصاً" روس اور آسٹریا کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

پروشیا کی اندرونی سیاست اس وقت مزید پیچیدہ ہو گئی جب جرمنی کے معاملے میں ایک بحث چل پڑی کہ اس کی انتالیس ریاستوں کو ایک یونین میں ضم کس طرح کیا جائے۔ پھر اس فیصلے کے تحفظ کے امکانات کیا ہوں گے۔ اس مسئلے پر پروشیا کا آزاد پسند نیشنلسٹ طبقہ قدامت پرستوں سے اختلاف رائے کرنے لگا۔ اس قضیے کے نتیجے میں جرمنی کی وسطی اور جنوبی ریاستوں سے نہایت پیچیدہ قسم کی گفت و شنید

ہوئی۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ سلطنت ہیبسبرگ کے ساتھ وہ دشمنی جو ۱۸۱۴ء میں سیکونی کے قضیے پر وجود میں آئی تھی' پھر سے عود کر آئی۔ اگرچہ پروشیا "جرمن کسٹم یونین" (زولوریرن) کا متفقہ لیڈر تھا جو ۱۸۳۰ء کے عشرے کے بعد مستحکم ہوتی چلی گئی تھی اور جس میں آسٹریا نے اپنے صنعت کاروں کے دباؤ کے تحت شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ تاہم اس تمام عرصے میں ویانا کو ہی سیاسی فوائد حاصل ہوتے رہے۔ چنانچہ فریڈرک ولیم سوم (۱۷۹۷ء - ۱۸۴۰ء) اور فریڈرک ولیم چہارم (۱۸۴۰ء - ۱۸۶۱ء) دونوں اس بات سے فکر مند تھے کہ سلطنت ہیبسبرگ سے جنگ چھڑنے کے نتیجے میں جو ہولناکی پھیلے گی وہ میٹرنخ اور اس کے جانشین ژوارزنبرگ کے اس ظلم و تشدد سے کہیں شدید ہو گی جو انھوں نے اپنے شمالی پڑوسی ملک پر روا رکھا تھا۔ علاوہ ازیں' جرمنی کے فیڈریشن کے سلسلے میں جو اجلاس فرینکفرٹ میں منعقد ہوا اس کی صدارت آسٹریا نے کی۔ اسے جرمنی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی حمایت حاصل تھی۔ پروشیا کے پرانے قدامت پرستوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہاں تو پورے براعظم یورپ کی طاقت مقصود تھی جبکہ پروشیا جرمنی کی ایک ریاست کے مقابلے میں بہت چھوٹا ملک تھا۔ ویانا کے مقتدر ہونے کا اظہار ۱۸۵۰ء میں اولموتز کے معاہدے کے موقع پر ہوا تھا۔ اس سے جرمنی کے معاملے سے فائدہ اٹھانے کا رجحان وقتی طور پر ختم ہو گیا اور پروشیا اپنی فوجی نقل و حرکت بند کرنے اور جرمن کی ریاستوں کے اتحاد کے لیے اپنی پیش کردہ اسکیم سے دستبردار ہونے پر راضی ہو گیا۔ فریڈرک ولیم چہارم کا خیال تھا کہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے فوراً" بعد جنگ کا خطرہ مول لینے سے کہیں بہتر سفارتی اہانت ہے۔ بسمارک جیسے پروشیا کے قوم پرست جو آسٹریا کے مطالبات کے سامنے اکڑفوں دکھا رہے تھے۔ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ جب تک جرمنی کا حاکم کل بننے کا جھگڑا طے نہیں ہوتا اس وقت تک کسی جگہ بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔

فریڈرک ولیم نے اولموتز کے مقام پر جس خیال کا اظہار کیا تھا وہ اس حقیقت پر مبنی تھا کہ زار روس نے جرمنی کے معاملے میں آسٹریا کے حقوق کی حمایت کی تھی۔ امر واقع ہے کہ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۷۱ء تک کے تمام عرصے میں برلن نے عسکری عفریت کو مشرق کی جانب بڑھنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ نظریاتی اور خاندانی اسباب و عوامل نے اس قسم کی غلامانہ اطاعت کا جواز تو پیدا کر دیا تھا' لیکن پروشیا کے احساس کمتری کو مطلقاً" چھپایا نہیں جا سکا جو ۱۸۱۳ء میں کانگریس پولینڈ پر روس کے قبضے کے نتیجے میں پیدا ہوتی تھی۔ جب سینٹ پیٹر برگ نے پروشیا میں تحریک حریت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا' اس موقع پر زار نیکولس اول نے علی الاعلان یہ کہا تھا کہ "جرمن اتحاد" محض ایک یوٹوپیائی خام خیالی ہے۔ (اگر یہ واقعی معرض وجود میں آ جاتا جیساکہ ۱۸۴۸ء میں فرینکفرٹ کے مقام پر کوشش کی گئی تھی اور پروشیا کے بادشاہ کو تاج پیش کیا گیا تھا) پھر' روس نے اولموتز میں آسٹریا کی جو حمایت کی تھی اس کی غرض و غایت بیرونی اثرات کو کم کرنا تھا۔ لہٰذا یہ تعجب خیز بات نہیں کہ جب ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا کا آغاز ہوا تو پروشیا کی حکومت نے بادل نخواستہ غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ روس کے خلاف صف آراء ہونے سے خائف تھا ساتھ ہی اسے اس بات کا دکھ بھی تھا کہ آسٹریا اور مغربی طاقتوں کی نظر میں اس کی کوئی عزت باقی نہیں رہی تھی۔ پروشیا کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اقدام سراسر منطقی تھا لیکن چونکہ برطانیہ اور آسٹریا برلن کے "ڈانواں ڈول" منصوبے کو پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا انھوں نے پروشیا کے سفارت کاروں کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی تھی کہ ۱۸۵۶ء میں "کانگریس آف پیرس" میں دوسرے مندوبین کے ہمراہ شریک ہوں۔ البتہ اجلاس کے دوران انھیں شریک ہونے کو کہا گیا تھا۔ اس رویے کی بناء پر آج

تک یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ گویا پروشیا کے سفارت کار طفیلی شرکاء تھے۔

دیگر معاملوں میں بھی بیرونی طاقتوں نے پروشیا کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ جب ۱۸۴۸ء میں پروشیا کی فوج نے شلیوگ۔ ہولسٹن کی جانب پیش قدمی کی تھی تو پالرسٹن نے اس پر لعنت ملامت کی تھی۔ بہرحال یہ اتنی فکر کی بات نہیں تھی البتہ یہ بات تشویش ناک تھی کہ فرانس نے دریائے رھائن کے علاقے پر حملے کی متواتر دھمکی دی تھی۔ پہلے ۱۸۳۰ء میں پھر ۱۸۴۰ء میں اور حتمی طور پر ۱۸۶۰ء کی دہائی میں! اس تمام بحرانی دور میں ویانا کے ساتھ جو جھڑپیں ہوتی رہیں اور پیٹرسبرگ جس طرح گاہے گاہے غراتا رہا اس سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں: انیسویں صدی کے نصف اول میں پروشیا کو بڑی طاقتوں کے مقابلے میں کم تر درجہ حاصل تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی یہ ملک گھاٹے میں تھا۔ اس کے طاقتور پڑوسی اس پر مسلسل غالب رہتے تھے۔ اپنے اندرونی اور جرمنی کے مسائل کی وجہ سے یہ پریشانی میں مبتلا رہتا تھا۔ یہ بین الاقوامی معاملات میں کوئی اہم کردار ادا کرنے سے سراسر قاصر تھا۔۔ پروشیا کی مختلف خوبیوں کے پیش نظر یہ رائے نہایت سخت معلوم ہوتی ہے: اس کا تعلیمی نظام جو کلیسائی سکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک پھیلا ہوا تھا' یورپ میں اپنی نظیر آپ تھا۔ اس کی انتظامیہ کا معیار نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کی فوج اور اس کا نہایت چاق و چوبند جنرل سٹاف عسکری طریق کار اور حکمت عملی میں ہونے والی اصلاحات کا بہت پہلے ہی مطالعہ کر چکا تھا۔ خصوصاً" ریلوے اور رائفل کے حوالے سے! اصل قابل غور بات یہ ہے کہ جب تک حریت پسندوں اور قدامت پرستوں کے مابین سیاسی چپقلش ختم نہ ہو گئی۔ جب تک فریڈرک ولیم چہارم کی مطلق العنانی کی جگہ صحیح قیادت سامنے نہ آ گئی اور جب تک پروشیا کی صنعتی بنیاد مستحکم نہ ہو گئی' اس وقت تک پروشیا کی جملہ صلاحیتیں بروئے کار نہ آ سکیں۔ بہرحال ۱۸۶۰ء کے بعد ہو ہرولن ریاست اپنی نچلی سطح سے ہی ابھر کر عروج پر پہنچی تھی۔

جیساکہ زندگی کے بہت سے معاملات میں ہوا کرتا ہے کہ کمزوریاں بھی اس کا حصہ ہوتی ہیں۔ جنوب میں واقع سلطنت ہیبرگ کے مقابلے میں پروشیا کے مسائل شاید اتنے گھمبیر نہ تھے۔ ۱۶۴۸ء اور ۱۸۱۵ء کے دوران یہ سلطنت عروج سے ہمکنار ہوتی رہی ہے اور اپنا حق بھی جتاتی رہی ہے لیکن توسیع اور بڑی طاقت کا رول ادا کرنے کی خواہش کے باوجود ان دشواریوں کے ازالے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا جو اس راہ میں حائل تھیں۔ بلکہ ۱۸۱۵ء کے سمجھوتے سے ان دشواریوں میں مزید اضافہ ہو گیا جس کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ مثلاً" آسٹریا کے لوگ نپولین کے خلاف بارہا لڑتے رہے تھے اور انھیں کامیابی بھی حاصل ہوتی رہی تھی۔ ان باتوں کا تقاضا یہ تھا کہ جب ۱۸۱۳ء ۔ ۱۸۱۵ء کے دوران سرحدوں کا معاملہ طے کرنے کے لیے جو گفت و شنید ہوئی اس موقع پر اس ملک کو معاوضہ دیا جانا چاہئے تھا۔ اگرچہ سلطنت ہیبرگ نے جنوبی نیدرلینڈ' جنوب مغربی جرمنی (دورلینڈ) اور پولینڈ کے بعض حصوں سے دست بردار ہونے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے اٹلی میں وسیع پیمانے پر اپنی توسیع بھی کر لی۔ اور تو اور نئے جرمن فیڈریشن میں وہ قائدانہ کردار ادا کرنے کا حق بھی مانگنے لگی۔

یورپ میں توازن قائم کرنے کے عام اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور برطانوی مبصرین اور میٹرنخ کی آراء کو ذہن نشین کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسٹریا کی طاقت کا از سر نو قیام ایک قابل

تحسین اقدام تھا۔ چونکہ سلطنت ہیبرگ یورپ میں شمالی اٹلی کے میدانوں سے لے کر گیلیشیا تک پھیلی ہوتی تھی' مغربی یورپ اور اٹلی میں فرانس کے اقدامات کی نگرانی کر رہی تھی' جرمنی کے وطن پرستوں اور پروشیا کے توسیع پسندوں کے مقابلے میں وہاں "اسٹیٹس کو" برقرار رکھے ہوئے تھی اور بلقان میں روسیوں کو داخل ہونے سے روکے ہوئے تھی۔ لہٰذا توازن قائم رکھنے کے لئے یہ مرکزی کردار ادا کر سکتی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حالات کے پیش نظر دوسری بڑی طاقتیں بھی ان کاموں میں معاونت کر رہی تھیں۔ ان پانچ رخی اور پیچیدہ ذمہ داریوں سے سلطنت ہیبرگ ہی بخوبی عہدہ برا ہو سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ۱۸۱۵ء کے معاہدے کے سرد پڑ جانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھی جبکہ اس کے برعکس فرانس پروشیا اور روس چند تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ ادھر برطانیہ ۱۸۲۰ء کے عشرے کے بعد میٹرنخ کی حمایت کرنے میں کوئی فوجی یا نظریاتی فائدہ محسوس نہیں کرتا تھا' لہٰذا مروجہ نظام کو برقرار رکھنے میں آسٹریا جو کوشش کر رہا تھا اس میں وہ مدد کرنے کا روادار نہ تھا۔ بعض مورخین کی رائے یہ ہے کہ ۱۸۱۵ء کے بعد کئی عشروں تک یورپ میں امن و امان کی جو فضا قائم رہی وہ دراصل سلطنت ہیبرگ کی پوزیشن اور کارکردگی کی مرہون منت ہے۔ لیکن جب اسے دیگر طاقتوں سے ایسی فوجی معاونت نہیں ملی جس سے وہ اٹلی اور جرمنی میں امن کی فضا برقرار رکھ سکے تو وہ نسبتاً" ان دو محاذوں سے الگ ہو گئی۔ پھر ۱۹۰۰ء کے بعد جب اس کا اپنا وجود خطرے میں پڑ گیا کیونکہ اس وقت وہاں جانشینی کی بہت بڑی جنگ چھڑ گئی۔ جس کے یورپ کے توازن پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

جب تک یورپ میں قدامت پرست طاقتیں حالت سابقہ کو برقرار رکھنے کے لیے متحد تھیں اور فرانس کے احیاء اور اس کے انقلاب کے خلاف سینہ سپر رہیں تو اس وقت تک سلطنت ہیبرگ کی خامی ڈھکی چھپی رہی اور "مقدس اتحاد" کی نظریاتی سالمیت کا پرچار کر کے میٹرنخ روس اور پروشیا کا تعاون طلب کرتا رہا۔ اس کے نتیجے میں اسے اس امر کی اجازت مل گئی کہ وہ کسی بھی حریت پسند تحریک سے آزادانہ نمٹ لے' چاہے ۱۸۲۱ء میں آسٹریا کی فوج بھیج کر نیپلز کی تحریک کو کچل دے' چاہے اسپین میں فوجی اقدام کے ذریعے بوربن کی حکومت کی مدد کر دے' چاہے کارلسباڈ فرمان مجریہ ۱۸۱۹ء کو جرمن فیڈریشن کے ارکان پر نافذ کر دے۔ اسی طرح سینٹ پیٹرسبرگ اور برلن کے ساتھ سلطنت ہیبرگ کے تعلقات کی وجہ سے آخرالذکر کو اس وقت فائدہ پہنچا جب دونوں ملکوں نے پولینڈ میں وطن پرستی کی تحریک کو کچل کر رکھ دیا۔ واضح رہے کہ روس کے لیے یہ مسئلہ یونان یا آبنائے جبرالٹر کے قضیے سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ جب گیلیشیا میں پولینڈ کی بغاوت کو متحدہ طور پر دبا دیا گیا اور آسٹریا نے ۱۸۳۶ء میں روس اور پروشیا کی رضا مندی سے کراکوف کے "آزاد شہر" کا اپنے ملک سے الحاق کر لیا تو اس "شاہی اتحاد" سے مستفیض ہونے کے مواقع روشن تھے۔

بہرحال میٹرنخ کی یہ طویل المیعاد حکمت عملی بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔ انیسویں صدی میں یورپ میں رونما ہونے والے سماجی انقلاب کو بہ آسانی روکا جا سکتا تھا اور ایسا جب بھی ہوا (مثلاً" ۱۸۳۰ء' ۱۸۴۸ء' ۱۸۷۱ء میں) خوفزدہ متوسط طبقے نے قانون نافذ کرنے والوں کا ہی ساتھ دیا۔ بہرحال انقلاب فرانس نے قومی خود مختاری کے احساس کو جس طرح فروغ دیا تھا اور آزادی کی مختلف جنگیں ملک میں ہوتی رہی تھیں اسے ہمیشہ کے لیے دبا دینا ممکن نہ تھا اور میٹرنخ نے آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے جو اقدامات کیے تھے' ان کے نتیجے میں سلطنت ہیبرگ رفتہ رفتہ کھوکھلی ہوتی چلی گئی۔ قومی آزادی کی ہر تحریک کو سختی سے کچل دینے کے نتیجے میں آسٹریا کو اپنے قدیم اتحادی یعنی برطانیہ کی ہمدردی سے محروم ہو جانا پڑا۔ اس ملک نے اٹلی میں فوج کے مسلسل استعمال سے جو ظلم و تشدد کیا تھا اس کے نتیجے میں عوام کے سبھی طبقوں میں رد

ردعمل کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا اور انھوں نے ہیبسبرگ کے "جیلروں" کے خلاف آواز بلند کی۔ یہی صورت حال چند عشرے کے بعد اس وقت پیش آئی جب فرانس کے بوالہوس شہنشاہ نپولین سوم نے شمالی اٹلی سے آسٹریا کے لوگوں کو بھگانے میں کیور کی مدد کی تھی۔ اسی طرح سلطنت ہیبسبرگ نے اقتصادی اسباب کی بناء پر زولوریین کا ساتھ نہیں دیا تھا اور اس کی قانونی اور جغرافیائی مجبوری نے "عظیم جرمنی" کا حصہ بننے سے اسے باز رکھا تھا' چنانچہ بہت سے جرمن قوم پرست اس رویے سے مایوس ہو گئے تھے اور قیادت کے لیے پروشیا کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ زار کی حکومت جس نے انقلاب کو کچلنے میں ویانا کی عموماً" حمایت کی تھی' نے قومی معاملات کو آسٹریا سے کہیں زیادہ آسانی سے اور بہتر طور پر حل کیا تھا۔ اس کی مثال الیگزینڈر اول کی وہ پالیسی ہے جب اس نے برطانیہ کے تعاون سے ۱۸۲۰ء کے عشرے میں یونان کی آزادی کی حمایت کی تھی اور میٹرنخ کے اختلاف کی پرواہ نہیں کی تھی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے دور میں سلطنت ہیبسبرگ تاریخی غلطی کا ارتکاب کرتی رہی۔ دیگر تمام بڑی طاقتوں کے مابین اس ملک کی حیثیت کا اظہار کچھ اس طرح کیا جاتا تھا:

> "زیادہ تر شہریوں کی زبان بھی ایک تھی اور مذہب بھی! نوے فی صد فرانسیسی لوگ فرانسیسی زبان بولتے تھے اور اسی تناسب سے کیتھولک چرچ سے وابستہ تھے۔ ہر دس پروشین میں آٹھ جرمن تھے۔ بقیہ زیادہ تر پولینڈ کے باشندے تھے۔ ان جرمن باشندوں میں ۷۰ فی صد پروٹسٹنٹ عقیدے کے حامل تھے۔ زار کی ستر ملین رعایا میں کئی اہم اقلیتی باشندے تھے۔ مثلاً" پانچ ملین لوگ پولینڈ کے تھے' ساڑھے تین ملین فن لینڈ' اسٹونیا' لیتھونیا اور لٹویا کے باشندے تھے اور تین ملین لوگ کو کیسیا کے رہنے والے تھے۔ بقیہ پچاس ملین روسی اور سخت مذہبی عقیدے کے لوگ تھے۔ جزائر برطانیہ کے باشندوں میں ۹۰ فی صد انگریزی زبان بولنے والے تھے جبکہ ۷۰ فی صد پروٹسٹنٹ عقیدے کے حامل تھے۔ ایسے ملکوں کے لیے یہ چھوٹے چھوٹے طبقے غیر ضروری تھے۔ ان سبھوں کی اپنی اپنی وابستگی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو آسٹریا کا بادشاہ بھانت بھانت کے فرقوں پر حکمرانی کرتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچ کر وہ یقیناً" جھنجلا تا رہا ہوگا۔ وہ خود اور اس کی آٹھ ملین رعایا جرمن تھی' باقی بہت سے لوگ سلاتی قوم سے تعلق رکھتے تھے (یعنی چیکوسلوواکیہ' سلوواکیہ' پولینڈ' رو تھیسیا' سلوویا' کروٹس' اور سرب کے لوگ تھے) ۵ ملین ہنگری کے لوگ تھے' ۵ ملین اٹلی اور ۲ ملین رومانیہ کے رہنے والے تھے۔ آخر اس سے کون سی قوم بنتی تھی؟

اس سوال کا کوئی جواب نہیں!

ہیبسبرگ سلطنت کی اہم فوج متنوع فرقے کی عکاسی کرتی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں (یعنی جرمنی کا اقتدار حاصل کرنے کے لیے پروشیا سے فیصلہ کن جنگ کے ایک سال بعد) اس فوج میں جرمنی کے

۱۲۸۲۸۶۔ افراد سلوواکیہ اور چیکوسلوواکیہ کے ۹۹٬۳۰۰' اٹلی کے ۵۲٬۷۰۰ افراد' ۲۲٬۷۰۰۔ افراد سلووانیہ کے' رومانیہ کے ۲۰٬۷۰۰' سربیا کے ۱۹٬۰۰۰' رو تھیسیا کے ۵۰٬۱۰۰' پولینڈ کے ۳٬۷۷۰۰' ۳۲٬۵۰۰ گیار' ۲۷٬۶۰۰ کروٹس اور دیگر نسلوں کے ۵۱۰۰ افراد شامل تھے۔ اس طرح یہ فوج رنگا رنگ اور متنوع تو ہو گئی جیسے انگریزوں کے راج میں گورا اور ہندوستانی فوج تھی۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ فرانس یا پروشیا کی یک جنسی فوج کے مقابلے میں یہ بالکل بے وقعت تھی۔

فوج کی یہ کمزوری رقم کی عدم دستیابی کی وجہ سے مزید پیچیدہ ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سلطنت میں ٹیکس کا حصول مشکل ہو چکا تھا' دوسرے اس حکومت کی تجارتی اور صنعتی ساکھ کمزور تھی۔ اگرچہ آج کے مورخین اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ۱۷۶۰ء سے ۱۹۱۴ء تک سلطنت ہیبسبرگ کی اقتصادی حالت بہت بہتر تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں صنعت سازی مغرب کے صرف چند ہی علاقوں میں ہوئی تھی۔ مثلاً" بوہیمیا' آلپائن کے میدانی علاقے اور خود ویانا کے مضافات میں۔ ویسے سلطنت کا کثیر حصہ اس سے محروم تھا۔ چونکہ آسٹریا بذات خود ترقی کر رہا تھا' لہٰذا پوری سلطنت "بحیثیت مجموعی" برطانیہ' فرانس اور پروشیا کی پیروی کرنے لگی۔ چنانچہ اس کی فی کس صنعت سازی' فولادی پیداوار' دخانی قوتیں وغیرہ مذکورہ ممالک کی ہو بہو نقل تھیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ فرانس کی جنگ پر اٹھنے والے اخراجات کی وجہ سے سلطنت ہیبسبرگ مالی طور پر کمزور ہو چکی تھی۔ یہ عوامی قرض کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اور کاغذی کرنسی بے طرح پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ حکومت نے مجبور ہو کر دفاعی اخراجات میں کمی کر دی۔ ۱۸۳۰ء میں فوج کے لیے مجموعی آمدنی کا محض ۲۳ فی صد حصہ مختص کیا گیا تھا جو ۱۸۱۷ء کے مقابلے میں ۵۰ فی صد کم تھا۔ پھر ۱۸۴۸ء میں یہ گھٹ کر صرف ۲۰ فی صد رہ گیا۔ جب ۹۔۱۸۴۸ء میں' ۵۔۱۸۵۴ء میں' ۶۰۔۱۸۵۹ء میں ۱۸۶۴ء میں جنگ کے بادل منڈلائے تو غیر معمولی طور پر فوج کے اخراجات میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس اقدام کے باوجود فوج کا معیار بلند نہ ہو سکا اور وہ بھرپور قوت کی حامل نہ بن سکی کیونکہ پھر ہوتا یوں تھا کہ بحران کے خاتمے کے بعد مختص شدہ عسکری رقم میں نہایت تیزی سے کٹوتی کر دی جاتی۔ مثلاً" ۱۸۶۰ء میں فوجی بجٹ ۱۷۹ ملین فلورن تھا لیکن ۱۸۶۳ء میں یہ گھٹ کر ۱۱۸ ملین رہ گیا۔ جب ۱۸۶۴ء میں ڈنمارک کے ساتھ محاذ آرائی ہوئی تو یہ بجٹ بڑھ کر ۱۵۵ ملین ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی سال کٹوتی کر کے اسے صرف ۹۶ ملین کر دیا گیا۔ پھر پروشیا کے ساتھ ہونے والی جنگ میں یہ رقم بڑھا دی گئی۔ دفاعی بجٹ کی یہ مجموعی رقم فرانس' برطانیہ' روس (اور آگے چل کر) پروشیا کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ انیسویں صدی کے وسط میں جو معیار قائم تھا اس کے لحاظ سے آسٹریا کی فوجی انتظامیہ کرپٹ اور بداعمال تھی۔ چنانچہ جو بھی رقم دفاع کے لیے مختص کی جاتی وہ پوری کی پوری خرچ بھی نہیں ہوتی۔ مختصراً" یہ کہ ہیبسبرگ سلطنت کی فوجی قوت جنگ کے قابل ہرگز نہ تھی۔

ان تمام باتوں کا مقصد مذکورہ سلطنت کے زوال کی پیش گوئی نہیں کرتی ہے۔ جیسا کہ بہت سے مورخین نے لکھا ہے اسے غیر معمولی استحکام حاصل تھا۔ ہیبسبرگ نے جس طرح تحریک اصلاحات' ترکوں کی مخالفت اور انقلاب فرانس کا مردانہ وار مقابلہ کیا' اسی طرح اس نے ۳۹۔۱۸۳۸ء کے واقعات' ۱۸۶۶ء کی شکست اور بالکل آخری اسٹیج پر پہلی جنگ عظیم کے اثرات کو بھی بخوبی سہ لیا تھا۔ اگرچہ اس میں خرابیاں تھیں' لیکن اوصاف کی بھی کمی نہ تھی۔ نہ صرف جرمن رعایا بادشاہ کی مطیع و فرماں بردار تھی بلکہ

بیرون جرمنی کے علاقے میں رہنے والے بہت سے دانشور اور ملازم پیشہ افراد بھی اس کے اطاعت گزار تھے۔ اس کی حکومت مثلاً" پولینڈ میں روس اور پروشیا کی انتظامیہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ شفیق و مہربان تھی۔ علاوہ ازیں یہ سلطنت ہمہ جہت نسلوں کا ملغوبہ تھی اور اسے طرح طرح کے مقامی دشمنوں کا سامنا بھی تھا۔ لہٰذا مرکز نے تقسیم کر کے حکمرانی کرنے کی پالیسی اختیار کی اور فوج کا استعمال نہایت محتاط طریقے سے کیا۔ چنانچہ ہنگری کا فوجی دستہ خصوصی طور پر اٹلی اور آسٹریا میں تعینات کیا گیا جبکہ اطالوی دستہ ہنگری بھیجا گیا۔ اسی طرح مسلح سواروں کا نصف حصہ بیرون ملک تعینات کیا گیا۔

آخری بات یہ کہ اسے منفی نوعیت کا فائدہ بھی حاصل تھا۔ یعنی دیگر بڑی طاقتیں۔۔۔۔۔ ہیبرگ سلطنت کے ساتھ چپقلش کے دوران بھی۔۔ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آخر اس کی جگہ کون لے گا۔ زار نکولس اول نے بلقان میں آسٹریا کے اقدامات کی مخالفت ضرور کی تھی۔ بایں ہمہ ۱۸۴۸ء میں ہنگری کے انقلاب کو کچلنے کے لیے فوجی مدد بھی کی تھی۔ فرانس نے ہیبرگ والوں کو اٹلی سے بھگانے کی سازش کی تھی، لیکن نپولین کو یہ بھی احساس تھا کہ ویانا مستقبل میں پروشیا یا روس کے خلاف ایک مفید اتحادی ثابت ہو گا۔ اسی طرح بسمارک جہاں جرمنی سے آسٹریا کے تمام اثرات کو ختم کرنے کا خواہاں تھا وہاں سلطنت ہیبرگ کو قائم و دائم بھی رکھنا چاہتا تھا' خصوصاً" ۱۸۶۶ء میں اس کے اطاعت گزار بن جانے کے بعد!

نپولین کی چھیڑی ہوئی جنگوں میں نقصانات اٹھانے کے باوجود فرانس ۱۸۱۵ء کے بعد کی نصف صدی میں پروشیا یا سلطنت ہیبرگ سے کئی لحاظ سے بدرجہا بہتر تھا۔ اس کی قومی آمدنی خاصی وافر تھی۔ سرمایہ آسانی دستیاب تھا۔ اس کی قومی آمدنی خاصی وافر تھی۔ سرمایہ بہ آسانی دستیاب تھا۔ اس کی آبادی پروشیا سے کہیں زیادہ بڑی اور سلطنت ہیبرگ کے مقابلے میں یک رنگ تھی۔ اس میں ایک بڑی فوج رکھنے کی پوری صلاحیت تھی اور وہ ایک معقول بحریہ کے اخراجات بھی برداشت کرنے کا اہل تھا۔ تاہم یہاں اسے ایک "درمیانی درجے کی طاقت" قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ جنگی حکمت عملی' سفارت کاری اور اقتصادی عوامل نے باہم مل کر فرانس کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنے وسائل پر پوری توجہ دے اور کسی خاص میدان میں اپنی مہارت اور بالادستی کا ثبوت دے سکے۔

طاقتی سیاست کی سطح پر ۱۸۱۳ء ۔۔ ۱۸۱۵ء کے دوران جو واقعات سامنے آئے وہ یہ تھے کہ دیگر تمام بڑی ریاستوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ یورپ پر فرانس کی بالادستی قائم نہ ہونے دی جائے۔ علاوہ ازیں' لندن' ویانا' برلن اور سینٹ پیٹرسبرگ نہ صرف دیگر معاملات میں (مثلاً" سیکسونی) اپنے قبضے کو بند کرنے کے خواہاں تھے تاکہ آپس میں مل کر نپولین کی آخری کوشش کو ناکام بنا دیں بلکہ بعد از جنگ کے حالات بھی پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ مستقبل میں فرانس کو اپنے روایتی راستوں کے ذریعہ توسیعی عزائم پورے کرنے سے روکا جا سکے۔ اس فیصلے کے نتیجے میں پروشیا نے دریائے رھائن لینڈ کی بحیثیت نگران دیکھ بھال کی' آسٹریا نے شمالی اٹلی میں اپنی پوزیشن مضبوط کی اور برطانیہ نے انتہائے آئیبرین تک اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ ان سب کے پیچھے روس کی ایک بہت بڑی فوج تیار کھڑی تھی جو ۱۸۱۵ء کے معاہدے کے تحفظ کے لیے یورپ میں داخل ہو جانا چاہتی تھی۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر فرانس کی تمام حکومتیں "بازیافت" کی پالیسی اختیار

کرنے پر زور دے رہے تھے۔ تاہم کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ بہرحال جو کچھ بھی حاصل کیا جا سکا وہ یہ تھا کہ ایک طرف فرانس کو یورپی طائفہ کا ایک اہم رکن تسلیم کر لیا گیا جبکہ دوسری جانب پڑوسی سلطنتوں اور موجود طاقتوں کے علاقوں میں فرانس کی سیاسی ساکھ بحال ہو گئی۔ تاہم جب فرانس نے آبنائے آئیبرین میں برطانیہ کے مساوی درجہ حاصل کر لیا اور لیونٹ میں اہم کردار انجام دینے کے لیے واپس آیا تو ان لوگوں نے اس کے خلاف اتحاد قائم کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ غرض فرانس نے جب بھی ہالینڈ اور بلجیم کے علاقے میں داخل ہونے کا ارادہ کیا جیساکہ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے عشروں کے دوران ہوا تھا تو اس کے رد عمل کے طور پر انگلستان اور پروشیا کا اتحاد وجود میں آ گیا۔ وہ اس قدر مضبوط تھا کہ اس سے کسی کا نبرد آزما ہونا ممکن نہ رہا۔

پیرس کے پاس تاش کا ایک اور پتا بھی تھا۔ یعنی وہ کسی بڑی طاقت کے ساتھ تعلقات قائم کر کے اپنے مقاصد پورے کر سکتا تھا۔ فرانس کی یہ پیشکش یوں امید افزا تھی کہ ریاستیں آپس میں باہم دست و گریباں تھیں اور مذکورہ ملک سے رقم فوجی دستے اور اسلحے کی صورت میں انھیں امداد مل سکتی تھی۔ پھر بھی اس میں تین خرابیاں تھیں۔ پہلی یہ کہ دوسری کوئی بھی طاقت فرانس کا اسی طرح استحصال کر سکتی تھی جیساکہ یہ ملک اس کے ساتھ کرتا۔ اس کی واضح مثال ۱۸۳۰ء کے وسطی عشرے کی تھی جب میٹرنخ نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی محض اس لیے شروع کیا تھا کہ لندن اور پیرس میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ دوسری بات یہ کہ مذکورہ دہائیوں میں فرانس کی حکومتیں جس طرح بدلتی رہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سفارتی تعلقات ایک ایسے دور میں متاثر ہوتے رہے جبکہ نظریات کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ مثلاً" روس کے ساتھ اتحاد سے وابستہ امیدیں ۱۸۳۰ء کے انقلاب فرانس سے مرجھا کر رہ گئیں۔ آخری بات یہ کہ جہاں بہت سی ریاستیں بعض معاملات میں فرانس کے ساتھ تعاون کرنے کی خواہاں تھیں وہاں مذکورہ دور میں کوئی ایک بھی حالت قائمہ کو بدلنے کی روا دار نہیں تھی۔ واضح لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے فرانس کی طرف سفارتی سطح پر دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا' فتوحات کے لیے نہیں! یہ تو جنگ کریمیا کے بعد ہی بیرون فرانس ۱۸۱۵ء کی قائم سرحدوں کو از سر نو متعین کرنے کی لہر پیدا ہوئی تھی۔

اگر فرانس یورپ کے دیگر ممالک کے مقابلے میں اتنا ہی طاقتور ہوتا جیساکہ وہ لوئس چہاردہم کے عروج کے زمانے یا نپولین کے عہد اقتدار میں تھا تو مذکورہ نا مساعد حالات چنداں قابل اعتنا نہ تھے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۸۱۵ء کے بعد فرانس پہلے جیسا عظیم الشان ملک نہیں رہا تھا۔ ۱۷۹۳ء سے ۱۸۱۵ء کے دوران لڑی جانے والی جنگوں میں زیادہ نہیں تو ۱۰۵ ملین فرانسیسی باشندے ہلاک ہوئے تھے۔ دوسری اہم بات یہ کہ انیسویں صدی کے تمام عرصے میں کسی بھی بڑی طاقت کے برعکس فرانس میں آبادی کے اضافے کی شرح قلیل تھی۔ اس کا اثر فرانس کی اقتصادی حالت پر نہایت برا ہوا۔ ان مذموم اثرات کا ذکر گزشتہ صفحوں میں کیا جا چکا ہے۔ پھر قیام امن کے بعد یہ صورت حال فرانس کے سب بڑے دشمن برطانیہ پر منکشف ہو گئی اور اس نے کاروباری نقطہ نظر سے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۱۵ء کے بعد بہت سے فرانسیسی صنعت کاروں کا یہ خیال تھا کہ فرانس کا بالادست قسم کا ایک صنعتی ملک بننا چاہئے جو نہ صرف اپنے پڑوسی ملک کا پاسنگ ہو بلکہ تمام غیر ملکی منڈیوں میں اس کی ساکھ مضبوط ہو اور خود اپنے ملک کے تحفظ شدہ بازار میں بھی اس کی مصنوعات کی ریل پیل ہو۔ فرانس میں عدم مسابقت' عدم تحریص' جدید کاری سے انحراف (مثلاً" زرعی اراضی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل تھی' مواصلات کا نظام انتہائی ناقص تھا' خصوصاً"

منڈیوں تک پہنچنے کے لیے کوئلہ سستا اور آسانی سے دستیاب نہ تھا اور بیرونی منڈیوں میں مقابلہ آرائی کے جذبے کے فقدان) کے نتیجے میں ۱۸۱۵ء سے ۱۸۵۰ء تک صنعتی ترقی کی شرح برطانیہ کے مقابلے میں نہایت قلیل تھی۔ واضح رہے کہ مذکورہ صدی کے آغاز میں آخرالذکر کی صنعتی پیداوار فرانس کے مساوی تھی۔ لیکن ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ فرانس کی پیداوار کے مقابلے میں برطانوی پیداوار کی شرح ۱۸۲ء۵ فی صد تھی لیکن ۱۸۶۰ء تک یہ شرح بڑھ کر ۲۵۱ فی صد ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں' جب انیسویں صدی کے نصف آخر میں فرانس میں ریلوے اور دیگر صنعتوں میں ترقی کی رفتار تیز ہونے لگی تو یہ خبر اس کے لیے باعث تشویش ہوئی کہ جرمنی تو اس سے کہیں زیادہ تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔

مورخین کی نظر میں یہ بات ہنوز واضح نہیں ہے کہ مذکورہ صدی کے دوران فرانس کی معیشت کو "پس ماندہ" یا "مایوس کن" سمجھ کر سرے سے کالعدم قرار دے دیا جائے۔ امرواقعہ ہے کہ اہل فرانس نے قومی خوشحالی کے لیے جو طریقے اپنائے تھے وہ کئی لحاظ سے اسی طرح منطقی اور صائب تھے جس طرح اہل برطانیہ کے مختلف طریق کار! صنعتی انقلاب کی سماجی ہلچل فرانس میں ذرا کم ہی پھیلی۔ تاہم کثیر مقداری پیداوار کی بجائے اعلیٰ معیار کی مصنوعات کی طرف توجہ دی گئی جس کے نتیجے میں ہر صنعت کار کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اگر اہل فرانس نے وسیع پیمانے کی صنعت میں مجموعی طور پر سرمایہ کاری نہیں کی تو اس کی وجہ غربت اور اضمحلال نہ تھی بلکہ محض عیب کی بات تھی یہ حقیقت ہے کہ ملک میں سرمایہ فاضل تھا جس کا معتدبہ حصہ یورپ میں کسی نہ کسی جگہ صنعت میں لگا ہوا تھا۔ فرانس کی حکومتوں کو کبھی بھی نقد کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سرمایہ کاری' اسلحہ سازی اور ایسی کان کنی میں کی جاتی تھی جس کا تعلق فوج سے ہوتا تھا۔ یہ فرانسیسی موجد تھے جنہوں نے مختلف چیزیں ایجاد کیں۔ مثلاً "بم انداز توپ جو جنرل پیکسن کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی "نپولین" اور "لاگولیئر" جیسے جہاز سازی کے خاص نمونے کا عصر آفریں واقعہ اور منی کارتوس اور رائفل کا اجرا!!

تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اقتصادی نقطہ نظر اور دیگر وجوہات کی بنا پر فرانس کی حقیقی طاقت کمزور ہوتی چلی گئی۔ اگرچہ فرانس' پروشیا اور سلطنت ہیسبرگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑا تھا لیکن کسی بھی شعبے میں اسے وہ بالادستی حاصل نہ تھی جو ایک صدی قبل اسے میسر تھی۔ اس کی فوج اگرچہ کثیر تھی لیکن روس کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر تھی۔ اس کا بحری بیڑا جسے حکومت کی متلون حمایت حاصل تھی' سائز میں برطانوی شاہی بیڑے کے بعد دوسرے نمبر پر تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں خاصا فرق موجود تھا۔ مصنوعات اور دیگر قومی پیداوار کے لحاظ سے فرانس اپنے حریف پڑوسی ملک سے پیچھے تھا۔ جب اس نے "لاگولیئر" جہاز کو سمندر میں اتارا تو اس کے مقابلے میں برطانیہ کے شاہی بیڑے نے ایچ ایم ایس لڑاکا بحری جہاز اتار دیا جس سے اول الذکر کی حیثیت ماند پڑ گئی۔ اسی طرح فرانس کی توپ بھی کرپ کے نئے نمونے کے سامنے بے وقعت ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ اس ملک نے یورپ سے باہر کچھ نہ کچھ کارنامہ انجام دیا' لیکن پھر بھی یہی کہا جائے گا کہ برطانیہ کے مقابلے میں اس کی مقبوضات اور اثرورسوخ کم تر درجے کے تھے۔

یہ تمام باتیں ایک اور ہی مسئلے کی نشاندہی کرتی ہیں جس نے فرانس کی غیر مشکوک قوت کے اندازے کو مشکل بنا دیا تھا۔ یہ ایک قدیم اور دوغلی ریاست تھی جو اپنے یورپی اور غیر یورپی مفادات کے درمیان معلق تھی۔ اس بات کا اثر فرانس کے سفارت کاری پر پڑا جو نظریاتی طور پر اور طاقت کے توازن کے پیش نظر پہلے ہی پیچیدہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ ان مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ کیا

قسطنطنیہ کی جانب روس کی پیش قدمی کو روکنا لیونٹ میں برطانیہ کے داخل ہونے کی مزاحمت کرنے سے زیادہ ضروری تھا؟ کیا بیرونی اٹلی' آسٹریا سے مال غنیمت حاصل کرنا زیادہ ضروری تھا یا انگلش چینل میں برطانیہ کے شاہی بیڑے کو چیلنج کرنا اہم تھا؟ کیا جرمن اتحاد کی ابتدائی کارروائیوں کے دوران اسے حمایت کرنی چاہیے تھی یا مخالفت؟ ان تمام پالیسیوں کے مالہ و ماعلیہ کے پیش نظر اس بات میں کوئی تعجب نہیں ہو گا کہ اہل فرانس ہمیشہ تذبذب کا شکار رہے' حتیٰ کہ اس وقت بھی یورپی طائفہ کے نہایت اہم رکن قرار دیئے جاتے تھے۔

دوسری جانب اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان عمومی حالات نے جہاں فرانس کو شکنجے میں کسا وہاں اسے اس قابل بھی بنا دیا کہ وہ دیگر بڑی طاقتوں پر کڑی نگاہ رکھ سکے۔ اگرچہ یہ صورت حال نپولین سوم کے عہد میں ہوئی تھی تو یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۸۲۰ء کی دہائی میں بھی یہی کیفیت برقرار رہی۔ محض اپنے سائز کی وجہ سے فرانس کے لیے ہمسائے آبیرین اور ہمسائے اطالیہ ڈنمارک' بلجیم اور دور دراز کے علاقوں میں اپنی ساکھ بحال کرنے میں دشواریاں حائل تھیں۔ برطانیہ اور روس دونوں نے سلطنت عثمانیہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی تھی اور اس معاملے میں فرانس کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ فرانس تھا جس نے جنگ کریمیا کے دوران سلطنت ہیسبرگ اور برطانیہ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر روس کو فوجی دھمکی دی تھی۔ یہ فرانس تھا جس نے اٹلی میں آسٹریا کی پوزیشن کو بے وقعت بنا دیا تھا۔ یہ فرانس ہی تھا جس نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ افریقہ اور چین کے ساحلی علاقوں میں نہ تو برطانیہ کی مکمل طور پر اجارہ داری ہے اور نہ اثر و رسوخ! آخری بات یہ کہ جب "جرمنی کی حاکمیت" کی جنگ آسٹریا اور پروشیا کے درمیان نہایت عروج پر تھی' اس وقت دونوں فریقین کی نظر اس بات پر تھی کہ نپولین سوم کیا کچھ کرے گا' کیا نہیں کرے گا۔ مختصر یہ کہ جب فرانس نے ۱۸۱۵ء کے بعد اپنی سابقہ پوزیشن بحال کر لی تو بعد کے عشرے میں یہ ایک قابل رشک طاقت کا حامل بنا رہا۔ اس کی سفارت کاری حد درجہ محرک اور فعال تھی۔ یہ فوجی لحاظ سے ہر طرح طاقتور تھا اور اس سے دشمنی مول لینے کی بجائے دوستی رکھنا زیادہ بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کے لیڈر اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ گزشتہ دو صدیوں کے مقابلے میں فرانس اب سابقہ طمطراق کا حامل نہیں رہا تھا۔

جنگ کریمین اور روسی طاقت کا خاتمہ

۱۸۱۵ء کے بعد کے عشروں کے دوران عالمی امن و امان اور صنعت سازی کی جو تحریک چل رہی تھی' اسی زمانے میں روس کی طاقت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔۔۔۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار جنگ کریمین (۱۸۵۴ء - ۱۸۵۶ء) سے بخوبی نہیں ہو پایا تھا۔ ۱۸۱۴ء میں سارا یورپ خوف و دہشت سے لرز گیا جب روسی فوج مغربی سمت پیش قدمی کرنے لگی زار جونہی تاتاری قزاقوں کا دستہ لے کر پیرس میں داخل ہوا وہاں کے عوام نے نہایت دانشمندانہ انداز میں نعرہ لگایا: "شہنشاہ الیگزینڈر اول۔۔ زندہ باد" آٹھ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل روسی فوج جس کا روئے زمین پر اسی طرح کوئی مد مقابل نہ تھا جس طرح سمندروں میں برطانیہ کے شاہی بیڑے کا' نے از خود صلح کا معاہدہ تیار کیا جس میں یہ طے پایا کہ آئندہ نہ تو کسی قسم کی علاقائی تبدیلی ہو گی اور نہ سیاسی! آسٹریا اور پروشیا دونوں اس مشرقی عفریت سے خوف کھانے لگے۔ اگرچہ انھوں نے اس کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا تھا۔ پھر بھی اس کی طاقت سے لرزہ بر اندام رہتے تھے۔ کچھ بھی ہو یورپ کے ایک فوجی سوار کی حیثیت سے روس کے کردار میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب مسیحی عقیدے کے حامل الیگزینڈر اول کا جانشین نیکولس اول (۱۸۲۵ء- ۱۸۵۵ء) قرار پایا جو جابرانہ فطرت کا انسان تھا۔ ۱۸۳۸ء-۱۸۳۹ء کے انقلاب کے نتیجے میں آخرالذکر کی پوزیشن اور بھی مضبوط ہو گئی جیساکہ پالمرسٹن نے لکھا تھا' اس وقت روس اور برطانیہ ہی دو ایسی طاقتیں تھیں جن کا دبدبہ قائم تھا۔ ہیبسبرگ کی حکومت نے نہایت مایوسی کے عالم میں روس سے مدد طلب کی تھی تاکہ ہنگری میں رونما ہونے والی بغاوت کو دبایا جا سکے۔ اس کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا گیا اور تین روسی دستے روانہ کیے گئے۔ اس کے مد مقابل پروشیا کا فریڈرک ولیم چہارم اندرون ملک اصلاحی تحریک اور جرمن فیڈریشن میں تبدیلی کے مشورے سے تذبذب کا شکار تھا۔ اس کے اس رویے سے ناراض ہو کر روس نے اس پر شدید دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ جابرانہ انداز اس وقت تک رہا جب برلن کی عدالت نے اندرون ملک رد عمل کی پالیسی کو منظور کر لیا اور اولموتز سے سفارت کاری کا سلسلہ بند کر دیا۔ ۱۸۳۸ء کے بعد جس طرح تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں' ان کے پیش نظر تمام عناصر چاہے وہ شکست خوردہ پولینڈ اور ہنگری کے قوم پرست ہوں بورژوا اور مایوس حریت پسند ہوں یا مارکسٹ ہوں سب اس بات پر متفق تھے کہ زار کی حکومت ایک طویل عرصے تک یورپ کی ترقی کے سامنے ایک دیوار کی طرح ایستادہ رہے گی۔

تاہم ۱۸۱۵ء اور ۱۸۸۰ء کے دوران روس دوسری طاقتوں کے مقابلے میں اقتصادی اور تکنیکی لحاظ سے بری طرح پس ماندہ ہوتا جا رہا تھا۔ کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں سرے سے کوئی اقتصادی ترقی نہیں ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ نکولس اول کے دور میں بھی نہیں ہوئی تھی جبکہ اس کے بہت سے افسران منڈی کی قوتوں اور جدید کاری کے ہر پہلو سے بدظن تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آبادی میں بہت تیزی سے اضافہ ہوتا رہا تھا۔ ۱۸۱۶ء میں جو آبادی ۵۱ ملین تھی وہ ۱۸۶۰ء میں بڑھ کر ۷۶ ملین ہو گئی اور ۱۸۸۰ء تک یہی تعداد ۱۰۰ ملین تک پہنچ گئی اور شہروں کی آبادی ان اعداد و شمار کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے بڑھتی رہی۔ فولادی صنعت میں اضافہ ہوا اور صنعت پارچہ بافی میں ترقی دوگنی ہو گئی۔ اس بات کا دعویٰ کیا گیا تھا کہ ۱۸۰۴ء اور ۱۸۶۰ء کے دوران فیکٹریوں اور صنعتی کار اندازیوں کی تعداد ۲۴۰۰ سے بڑھ کر ۱۵۰۰۰ ہو گئی تھی۔ بھاپ سے چلنے والے انجن اور جدید مشینیں مغرب سے درآمد کی گئی تھیں۔ پھر ۱۸۳۰ء کی دہائی سے

ریلوے لائن بچھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بہت سے مورخین میں اس بات پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس دور میں جو صنعتی انقلاب روس میں رونما ہوا کیا اس سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ترقی کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں سارا یورپ تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا وہاں روس روبہ زوال تھا۔ اپنی کثیر آبادی کی بدولت انیسویں صدی کے اوائل میں تو اس ملک کی مجموعی قومی پیداوار بہت ہی زیادہ تھی۔ لیکن دو نسلوں کے بعد ہی یہ صورت حال برقرار نہیں رہی۔ اس کا اظہار جدول نمبر۹ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

جدول نمبر۹: یورپ کی بڑی طاقتوں کی مجموعی قومی پیداوار

۱۸۳۰ء لغایتہ ۱۸۹۰ء

(بازاری قیمت اور ۱۹۶۰ء میں امریکی ڈالر اور قیمت کے لحاظ سے: بلین میں)

	۱۸۳۰ء	۱۸۴۰ء	۱۸۵۰ء	۱۸۶۰ء	۱۸۷۰ء	۱۸۸۰ء	۱۸۹۰ء
روس	۱۰٫۵	۱۱٫۲	۱۲٫۷	۱۴٫۴	۲۲٫۹	۲۳٫۲	۲۱٫۱
فرانس	۸٫۵	۱۰٫۳	۱۱٫۸	۱۳٫۳	۱۶٫۸	۱۷٫۳	۱۹٫۷
برطانیہ	۸٫۲	۱۰٫۳	۱۲٫۵	۱۶٫۰	۱۹٫۶	۲۳٫۵	۲۹٫۳
جرمنی	۷٫۲	۸٫۳	۱۰٫۳	۱۲٫۷	۱۶٫۶	۱۹٫۹	۲۶٫۳
سلطنت ہیبسبرگ	۷٫۲	۸٫۳	۹٫۱	۹٫۹	۱۱٫۳	۱۲٫۲	۱۵٫۳
اٹلی	۵٫۵	۵٫۹	۶٫۶	۷٫۳	۷٫۲	۸٫۷	۹٫۳

لیکن یہی اعداد و شمار زیادہ تشویش ناک نظر آئیں گے اگر مجموعی قومی پیداوار کا جائزہ فی کس آمدنی کے لحاظ سے لیا جائے۔ (ملاحظہ کیجئے جدول نمبر۱۰)

جدول نمبر۱۰: یورپ کی بڑی طاقتوں کی مجموعی قومی پیداوار فی کس آمدنی کے لحاظ سے۔

(۱۹۶۰ء کے امریکی ڈالر اور قیمت کے تناسب سے)

	۱۸۳۰ء	۱۸۴۰ء	۱۸۵۰ء	۱۸۶۰ء	۱۸۷۰ء	۱۸۸۰ء	۱۸۹۰ء
برطانیہ	۳۴۶	۳۹۴	۴۵۸	۵۵۸	۶۲۸	۶۸۰	۷۸۵
اٹلی	۲۶۵	۲۷۰	۲۷۷	۳۰۱	۳۱۲	۳۱۱	۳۱۱
فرانس	۲۶۴	۳۰۲	۳۳۳	۳۶۵	۴۳۷	۴۶۴	۵۱۵
جرمنی	۲۴۵	۲۶۷	۳۰۸	۳۵۴	۴۲۶	۴۴۳	۵۳۷
سلطنت ہیبسبرگ	۲۵۰	۲۶۶	۲۸۳	۲۸۸	۳۰۵	۳۱۵	۳۶۱
روس	۱۷۰	۱۷۰	۱۷۵	۱۷۸	۲۵۰	۲۲۴	۱۸۲

مذکورہ اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان برسوں میں روس کی مجموعی قومی پیداوار میں حد سے زیادہ اضافہ ہوا۔ اس کی تمام تر وجہ وہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی تھی۔ یہ افزائش خواہ پیدائش کا نتیجہ

ہو یا ترکستان اور دیگر علاقوں کی فتوحات کا ثمر! لیکن اس کثیر آبادی سے پیداواری صلاحیت خصوصاً صنعت میں کم ہی اضافہ ہوا۔ روس کی قومی پیداوار اور فی کس آمدنی کی شرح مغربی یورپ کے مقابلے میں ہمیشہ کم رہی لیکن اب اس میں شدید کمی آ گئی تھی۔ مثلاً ۱۸۳۰ء میں برطانیہ کی فی کس آمدنی کے مقابلے میں وہاں کی شرح نصف تھی جبکہ ۶۰ سال بعد یہ شرح گھٹ کر ایک چوتھائی ہو گئی۔

اسی طرح انیسویں صدی کے اوائل میں روس کی دوگنی فولادی صنعت کے مقابلے میں برطانیہ کی یہی صنعت تیس گنا زیادہ تھی۔ دو نسلوں کے دوران ہی روس کی یہ حالت ہوئی کہ کہاں وہ یورپ میں فولاد کا سب سے بڑا پیداکار اور برآمد کنندہ تھا اور کہاں یہ صورت ہوئی کہ وہ مغربی مصنوعات کی درآمد پر گزارہ کرنے لگا۔ یہاں یہ ضروری ہے کہ ریل اور دخانی جہاز کی کارکردگی کا بھی جائزہ لے لیا جائے ۱۸۵۰ء کے قریب روس میں ریل کی پٹڑی تقریباً ۵۰۰ میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے مقابلے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ ۸۵۰۰ میل پر محیط تھی۔ اس کے دخانی جہاز جو عموماً بڑے بڑے دریاؤں یا بحر بالٹک یا بحر اسود میں چلتے تھے' وہ زیادہ تر غلہ ڈھونے میں لگے رہتے جو وسیع آبادی کی اہم ضرورت تھی یا پھر درآمد شدہ مصنوعات کی قیمت کے بدلے برطانیہ کو گندم برآمد کرتے۔ وہاں جو کچھ بھی ترقیاتی عمل ظہور میں آیا یہ سب زیادہ تر بیرونی تاجروں اور کاراندازوں کا مرہون منت تھا۔ گویا روس کی حیثیت محض اساسی اشیاء برآمد کرنے والے ملک کی ہو کر رہ گئی جس سے فائدہ اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ریاست کو پہنچتا تھا۔ واقعات کے قریبی جائزے کے بعد یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ زیادہ تر نئی فیکٹریوں اور صنعتی شعبوں میں ۱۶ سے بھی کم افراد ملازم رکھے جاتے تھے اور وہ بھی پوری طرح تجربہ کار بھی نہیں ہوتے تھے۔ سرمایہ کی کمی' طلب صارفین کی قلیل شرح' چھوٹا متوسط طبقہ' طویل فاصلہ' موسم کی شدت' جابرانہ حکومت ـــــ تمام عوامل نے روس میں صنعتی ترقی کو یورپ کے دیگر علاقے کے برعکس خاصا مشکل بنا دیا تھا۔

ایک طویل عرصے تک روس کی ناموزوں اقتصادی کیفیت کے اثر سے وہاں کی فوج محفوظ رہی۔ اس کے برعکس ۱۸۱۵ء کے بعد بڑی طاقتوں نے قدیم طرز حکومت کو جو ترجیح دی تھی' اس کا مظاہرہ بہتر طور پر روس میں ہوا۔ وہاں کی فوج سپاہی' اسلحہ اور فن حرب کے لحاظ سے اعلیٰ تصور کی جاتی تھی۔ اگرچہ انقلاب فرانس کا کچھ نہ کچھ سایہ وہاں پڑ رہا تھا اس کے باوجود روس کی حکومت نے فوجی اصلاحات کی بجائے افواج کے سماجی اور سیاسی عنصر پر زیادہ توجہ مبذول کی۔ وہاں کے جرنیل بھی اطاعت گزار اور محتاط رہتے تھے۔ نکولس اول نے مروجہ پریڈ اور لانگ مارچ کی جس روایت کو دوبارہ بحال کیا تھا اس پر فوجی افسران عمل درآمد کرتے تھے۔ ان اسباب و عوامل اور عددی کثرت کی وجہ سے بیرون ملک روسی فوج کا اچھا خاصا اثر تھا۔ بایں ہمہ فوجی نقل و حمل میں دشواری اور افسران فوج میں عمومی تعلیم کی کمی بھی ایک حقیقت بنی ہوئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ روسی فوج بہت زیادہ چاق و چوبند تھی اور اس نے جب کبھی تاتاری قزاقوں اور ترکستان کے خلاف محاذ آرائی کی تو عموماً فتح سے ہمکنار ہوئی۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر ہندوستان میں برطانوی حکومت خائف رہتی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں روس اور انگلستان کے تعلقات محض واجبی سے تھے۔ لیکن انیسویں صدی میں برطانوی حکومت نے اس تعلق کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح بیرونی دنیا پر روس کے حیران کن اثرات ۱۸۴۸۔۴۹ء میں اس وقت قائم ہوئے تھے جب اس نے ہنگری کی بغاوت کو کچل کر رکھ دیا تھا اور زار نے علی الاعلان کہا تھا کہ وہ پیرس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے چار لاکھ فوج روانہ کرنے والا ہے۔ بہت سے مبصرین اس حقیقت کا جائزہ لینے میں ناکام رہے کہ روسی فوج کا بڑا حصہ زیادہ تر

اندرون ملک گھڑ سوار کے فرائض انجام دینے' پولینڈ اور یوکرائن میں "سپاہی" کی ڈیوٹی پوری کرنے' سرحدوں کی حفاظت کرنے اور فوجی چھاؤنیوں کی نگرانی کرنے پر مامور تھا۔ باقی فوج کا جو حصہ بچ رہا تھا وہ ہنگری کی محاذ آرائی میں ہلاک ہو جانے والے گیارہ ہزار سے بہتر نہ تھا۔ مثال کے طور پر اس تعداد میں پورے ایک ہزار سپاہی، محض اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ نقل و حمل اور طبی امداد کی سہولت کا فقدان تھا۔

۱۸۵۴ء سے ۱۸۵۵ء تک ہونے والی جنگ کریمین میں روس کی فوجی کمزوری پوری طرح عیاں ہو گئی تھی۔ زار کی فوجوں کو مجتمع نہیں کیا جا سکا تھا۔ بالٹک میں اتحادی فوجوں کے حملے (جو اتنے اہم نہیں تھے) اور سویڈن کی جانب سے مداخلت کی دھمکی کے پیش نظر روس کی دو لاکھ فوج شمال میں جمی رہی۔ ڈنوبیا کے علاقوں میں ابتدائی محاذ آرائی اور آسٹریا کی مداخلت کے دھڑکے کی وجہ سے بسارابیا' مغربی یوکرائن اور روسی پولینڈ کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ تاتاری علاقوں میں ترکوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کی وجہ سے نفری اور سامان دونوں کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ یہی صورت حال مشرق بعید میں روسی مقبوضات کے تحفظ کے معاملے میں پیدا ہوئی تھی۔ جب انگلستان اور فرانس نے کریمیا پر شدید حملہ کیا تو اس کے نتیجے میں یہ جنگ روس کے نہایت ہی حساس علاقوں تک پھیل گئی۔ زار کی مسلح افواج اس قسم کے حملے کا جواب دینے سے سراسر قاصر تھیں۔

روس کی بحری فوج متوسط اور مناسب طاقت کی حامل تھی۔ اس کے بحری افسران حد درجہ باصلاحیت تھے۔۔ چنانچہ اس نے نومبر ۱۸۵۳ء میں سی نوپ کے مقام پر ترکی بیڑے کو بالکل تباہ کر دیا۔ لیکن انگلستان اور فرانس کے بحری بیڑے جونہی مقابلے پر آئے' صورت حال بدل کر رہ گئی۔ روس کے بہت سے جہاز صنوبر کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور سمندر کے لیے ناموزوں تھے۔ ان کی توپ داغنے کی صلاحیت بھی ناکافی تھی۔ جہاز کا عملہ بھی ناتجربہ کار تھا۔ اس کے برعکس اتحادیوں کے پاس دخانی جنگی جہاز تھے۔ بعض تیز دھار شیل اور کونگریو نامی راکٹ سے مسلح تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ روس کے دشمن صنعتی قوت کے مالک تھے اور نئے جہاز بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے خصوصاً" دخانی گن بوٹ درجنوں تیار کر سکتے تھے۔ چنانچہ جنگ جتنا طول کھینچتی اس سے انھیں فائدہ پہنچتا تھا۔

روس کی بری فوج بحری فوج سے بھی کم درجہ کی تھی۔ اگرچہ اس کی پیدل فوج اچھی طرح لڑتی تھی اور ایڈمیرل نخیموف اور کرنل ٹوٹلیبان کی ماہرانہ سرکردگی میں روس نے نہایت اولوالعزمی سے سوسٹوپول کی مدافعت خاصے عرصے تک برقرار رکھی' لیکن دیگر اور معاملات میں یہ فوج اتنی باصلاحیت نہ تھی۔ گھڑ سواروں کا دستہ کسی خاص مہم جوئی کے لائق نہ تھا۔ اس کے پریڈ کرنے والے گھوڑے پیچیدہ محاذ آرائی کے لئے ناموزوں تھے۔ (ہاں تاتاری قزاق گھڑ سواری میں بہت بہتر تھے) زیادہ خرابی کی بات یہ تھی کہ روس کے سپاہی اچھی طرح مسلح نہیں تھے۔ ان کی پرانی وضع کی توڑے دار بندوق کی مار ۲۰۰ گز تک محدود تھی جبکہ اتحادی فوجوں کی رائفلیں ایک ہزار گز تک مار کر سکتی تھیں۔ غرض ان وجوہات کی بناء پر روس کو بہت زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑا۔

مزید خرابی کی بات یہ تھی کہ حالات کی سنگینی کا علم ہونے کے باوجود روس کا مجموعی نظام حکومت کوئی موثر اقدام نہ کر سکا۔ فوج کی قیادت نہایت کمزور تھی۔ افسروں میں ذاتی پرخاش رہتی تھی۔ وہ لوگ آپس میں متحد ہو کر کوئی معنی خیز اور موثر حکمت عملی اختیار نہیں کرتے تھے۔ اس بات سے بخوبی علم ہو

جاتا ہے کہ زار کی حکومت کس درجہ بے مقدور تھی۔ درمیانی عہدے کے فوجی افسران میں چند ہی تجربہ کار اور تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے برعکس پروشیا کی فوج میں پڑھے لکھے اور تجربہ کار افسروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگر تعلیمی استعداد بڑھانے کی کوئی کوشش ہوتی تو حکومت کے اعلیٰ افسران اس پر ناک بھوں چڑھاتے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ روس میں محفوظ فوج کی تعداد بھی کم ہی تھی جسے ناسامد حالات میں فوری امداد کے لیے بلایا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فوج میں مختصر مدت کے لیے سپاہی بھرتی کیے جاتے اور مستقل طور پر بیکاری کی صورت برقرار نہیں رہی تھی۔☆ اس نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ روس میں طویل مدت ملازمت والے سپاہی عمر رسیدہ ہوتے تھے۔ دوسری خرابی یہ تھی کہ جنگ کا آغاز ہوتے ہی تقریباً" چار لاکھ سپاہی ہنگامی طور پر بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ یہ سب کے سب بالکل ہی ناتجربہ کار ہوتے تھے۔ ادھر افسران فوج بھی عموماً" نااہلی کا ثبوت دیتے تھے۔ پھر ان بیگاروں کے زمینی محنت و مشقت کے کام سے علیحدگی کے نتیجے میں روس کی معیشت بری طرح متاثر ہوتی تھی۔

آخری بات یہ کہ فوجی نقل و حمل اور اقتصادی حالت میں بھی خرابیاں تھیں۔ چونکہ ماسکو کے جنوب میں ریلوے لائن نہیں تھی لہٰذا گھوڑا گاڑی کو لق و دق صحرا میں سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ جب موسم بہار میں برف پگھلتی اور موسم خزاں میں بارش ہوتی تو یہی میدان کیچڑوں کا ایک وسیع سمندر بن جاتا۔ مزید برآں ان گھوڑوں کو کافی مقدار میں چارے کی ضرورت پڑتی۔ (اس کے لیے علیحدہ سے گھوڑا گاڑی میں چارہ وغیرہ لے جایا جاتا) پھر بھی نقل و حمل کے ذرائع کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس کے نتائج خوش آئند نہ تھے۔ اتحادیوں کی فوجیں اور کمک وغیرہ سمندری راستے کے ذریعے فرانس اور انگلستان سے کریمیا تین ہفتوں میں پہنچ جایا کرتیں جبکہ روسی فوج کو ماسکو سے جنگی محاذ تک پہنچنے میں تین مہینے لگ جاتے تھے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہوئی کہ روسی فوج کے اسلحے کے ذخائر ختم ہو گئے۔ جنگ کے آغاز میں دس لاکھ بندوقوں کا ذخیرہ موجود تھا جو ۱۸۵۵ء کے اختتام تک صرف نوے ہزار رہ گئیں۔ ۱۶۵۶ جنگی توپوں میں صرف ۲۵۳ باقی بچ رہی تھیں۔ بارود اور گولے کے ذخائر کی حالت اور بھی بدتر تھی۔ جیسے جیسے جنگ طویل ہوتی گئی ویسے ویسے اتحادیوں کی بالادستی قائم ہوتی چلی گئی۔ پھر برطانیہ نے جو ناکہ بندی کر دی تھی اس کے نتیجے میں روس میں اسلحے کے نئے ذخیرے کی ترسیل رک گئی تھی۔

اس ناکہ بندی سے اور بھی برے نتائج رونما ہوئے۔ روس کی غلے اور دیگر اشیاء کی برآمدات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ (البتہ زمینی راستے سے پروشیا کو اشیاء برآمد کی جاتی رہیں) ان باتوں کے نتیجے میں روس کی حکومت کے لیے جنگی اخراجات کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اسے بھاری مقدار میں قرض لینا پڑا۔ امن و امان کی حالت میں بھی ملکی آمدنی کا چوتھا یا پانچواں حصہ دفاعی اخراجات پر صرف ہوتا تھا۔ جنگ سے قبل ۱۸۵۳ء میں یہ رقم ۲۲۰ ملین روبل تھی جنگ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۵ء میں یہ بڑھ کر ۵۰۰ ملین ہو گئی۔ حد سے بڑھے ہوئے خسارے کو پورا کرنے کے لیے روس کے محکمہ خزانہ نے برلن اور ایمسٹرڈم سے

☆ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ جو شخص بھی فوج میں دو تین سال کی ملازمت کر لے وہ بیکار نہیں رہے گا۔ پھر یہ کہ طویل مدتی فوج کے لئے معمولی تناسب سے بھرتی زیادہ مناسب تھی۔

قرضے لیے اس وقت روبل کی عالمی قیمت گھٹ گئی تھی۔ اس نے اس خسارے کے ازالے کے لیے کاغذی زر جاری کیے۔ اس طرح وسیع پیمانے پر افراط زر کی صورت پیدا ہو گئی۔ نتیجتاً" کسانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے قبل وزارت خزانہ نے چاندی کا سکہ جاری کر کے اور اقراریہ نوٹ پر پابندی عائد کر کے بہت ہی اہم قدم اٹھایا تھا۔ واضح رہے کہ آخرالذکر کی وجہ سے جنگ نپولین، پروشیا اور ترکی کے خلاف محاذ آرائی اور پولینڈ کی بغاوت کو کچلنے کے دوران مالیاتی استحکام کو نقصان پہنچا تھا۔ اب جنگ کریمین کے نتیجے میں مذکورہ اقدامات کالعدم ہو کر رہ گئے تھے۔ روس کی اس بے ثمر جدوجہد کے نتیجے میں یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ ۱۵۔ جنوری ۱۸۵۶ء کو کروان کونسل کو مطلع کیا گیا کہ ملک دیوالیہ ہو جائے گا۔ چنانچہ تباہی سے بچنے کے لیے بڑی طاقتوں سے گفت و شنید ہی واحد راستہ رہ گیا تھا۔

ان سب باتوں کے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ مذکورہ اتحادیوں کے لیے جنگ کریمین گویا کچھ نہ تھی۔ ان کے لئے بھی یہ محاذ آرائی ناسامد حالات کا سبب بنی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے فرانس کو سب سے کم نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ مخلوط النسل طاقت ہونے کی وجہ سے فائدے میں بھی رہا۔ فرانس صنعتی اور معاشی لحاظ سے روس کے مقابلے میں زیادہ پسماندہ نہیں تھا۔ پھر برطانیہ کے مقابلے میں اتنا غیر فوجی طاقت والا بھی نہیں تھا۔ جنرل سینٹ ارناؤد کی ماتحتی میں مشرقی سمت جو فوج روانہ کی گئی تھی وہ پوری طرح مسلح اور تجربہ کار تھی۔ اسے شمالی افریقہ میں محاذ آرائی کا تجربہ تھا۔ یہ صحیح معنوں میں سمندر پار کی مہم جوئی میں مشاق بھی تھی۔ نیز فرانس کی فوج کے نقل و حمل کے ذرائع اور طبی سہولتیں نہایت مناسب تھیں۔ ان سے بہتر کی مذکورہ صدی میں توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ پھر فرانسیسی افسران بہت زیادہ مسلح نہیں ہوتے تھے جبکہ ان کے مدمقابل برطانوی افسران اسلحہ سے لدے پھندے ہوتے تھے۔ فرانس کی لڑاکا فوج خاصی بڑی تھی اور لڑائی کے دوران زیادہ شدید حملے یہی کرتی تھی۔ بہرحال فرانسیسی قوم نے نپولین کے عہد میں حاصل ہونے والا اعزاز کسی نہ کسی حد تک اس جنگ کے ذریعے حاصل کر لیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ لڑائی کے اختتامی دور میں فرانس دباؤ کا شکار نظر آتا تھا۔ اگرچہ یہ ایک امیر ملک تھا تاہم اس کی حکومت کو فنڈ کے حصول کے لیے ریلوے تعمیر کرنے والوں اور دیگر کمپنیوں کے دوش بدوش قرضہ دینے والوں اور بینکوں کے ساتھ گفت و شنید کرنی پڑی۔ کریمیا اور قسطنطنیہ کو سونا روانہ کیا گیا اور اس کے مساوی قیمت وطن آتی رہی۔ اس معاملے میں غریب کسانوں نے کوئی مدد نہیں کی۔ اس لڑائی میں کتنا جانی نقصان ہو گا (یعنی ایک لاکھ) اس کا پہلے سے علم نہیں تھا۔ چنانچہ اہل فرانس میں جنگ کے ابتدائی دنوں میں جو جوش و خروش تھا وہ آہستہ آہستہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔ کاغذی زر میں غیر معمولی اضافے کی وجہ سے بڑا شور ہوا۔ پھر سیوا سٹوپول کے سقوط کی خبر عام ہوئی۔ اس طرح یہ دلیل صحیح ثابت ہوئی کہ یہ جنگ محض برطانیہ کے خود غرضانہ مقاصد کے لیے لڑی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی نپولین سوم جنگ کو ختم کرنے پر پوری طرح رضامند تھا۔ غرض روس اذیت سے دوچار ہوا اور فرانس کا وقار بلند ہوا۔ (اس میں مزید اضافہ آگے چل کر ہوا جب بڑے پیمانے پر امن کانفرنس کا پیرس میں انعقاد عمل میں آیا) اور اس بات کی اہمیت دو چند ہو گئی کہ بحر اسود کے علاقے میں شدید جنگ کے دوران جرمنی اور اٹلی کے مسائل سے بے توجہی برتنا مناسب نہیں ہو گا۔ اگر نپولین ۱۸۵۶ء میں یورپ کا نقشہ نئے سرے سے ترتیب نہ دیتا تو اسے اس امر کا یقیناً" احساس ہو جاتا کہ واٹرلو کے بعد فرانس کے حالات بہت ہی بہتر ہو چکے ہیں۔ جنگ کریمین کے نتیجے میں یورپی طائفہ میں جو شگاف پیدا ہوا تھا اس کے اثرات بعد کی دہائی میں محسوس کیے جاتے رہے تھے۔

اہل برطانیہ جنگ کریمین سے مطمئن نہیں تھے۔ اصلاحات کی کوشش کے باوجود فوج ہنوز ولنگٹن کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ فوج کا سپہ سالار ریگلن جزیرہ نمائے اسپین و پرتگال کی جنگ کے دوران ولنگٹن کا ملٹری سیکرٹری رہ چکا تھا۔ پیدل فوج کثیر تعداد میں اور با حوصلہ تھی' لیکن اس کی صحیح رہنمائی نہیں کی گئی تھی۔ سواس ٹوپول کے محاصرے کے وقت اسے بہتر طور پر تعینات نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ برطانیہ کے سپاہی سخت جان اور حوصلے کے ساتھ لڑنے والے تھے۔ لیکن کریمیا کی بارش اور سردی میں ان کے لیے گرم پناہ گاہ کا انتظام نہیں تھا۔ دست اور ہیضہ کی بیماری سے حفاظت کے لیے پرانے قسم کا طبی وفد بھی ناکافی تھا۔ پھر نقل و حمل کے لیے سواری کا فقدان تھا۔ ان اسباب و عوامل کی وجہ سے اسے خاصا نقصان بھی ہوا اور ذہنی صدمہ بھی پہنچا۔ چنانچہ اس کے باعث اہل برطانیہ میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ مزید خرابی کی بات یہ کہ روس کی طرح برطانیہ کی فوج بھی طویل المدتی ملازمت پر بحال کی جاتی تھی۔ یہ خصوصی طور پر محافظ دستے کے لیے زیادہ سود مند تھی۔ ویسے وہاں تربیت یافتہ فوج کا وجود نہیں تھا جسے دوران جنگ مدد کے لیے طلب کیا جا سکے۔ روس کی حکومت زبردستی لاکھوں افراد کو فوج میں بھرتی کر سکتی تھی لیکن برطانیہ کی قاعدہ قانون والی حکومت ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ سرکار برطانیہ غیر ملکی کرائے کے سپاہیوں کی فوج میں بھرتی کے لیے اشتہار شائع کراتی۔ اس طرح جنگ کریمیا میں فوج کے جانی نقصان کو پورا کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں' انگریزی فوج فرانسیسی فوج کی جونیئر پارٹنر کا درجہ رکھتی تھی۔ برطانیہ کی بحریہ کو چنداں اس بات کا موقع نہیں ملا کہ وہ دشمن کے خلاف نیلسن جیسی فتح حاصل کر سکے۔ کیونکہ اس کے مد مقابل نے اپنے سارے جنگی جہاز محفوظ بندرگاہوں میں لنگر انداز کر دیے تھے۔

لندن ٹائمز نے یہ انکشاف کیا تھا کہ جنگ کریمیا میں لڑنے والی فوج نااہل تھی۔ اخبار نے بیمار اور زخمی سپاہیوں کے بارے میں بھی خبریں شائع کی تھیں۔ اس افشائے راز سے عوام میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ ان باتوں کا سرسری سا ذکر یہاں کیا جا سکتا ہے۔ اخباری بیان کے نتیجے میں وزارت تبدیل ہو گئی۔ پھر اس بات پر بڑی بحث ہوئی کہ ایک حریت پسند ریاست کو جنگ میں کود کر کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حقائق بھی سامنے آئے کہ برطانیہ جیسے ملک کو ایک بڑے دشمن کے خلاف طویل عرصے تک محاذ آرائی کر کے نہ صرف مالی نقصانات اٹھانا پڑے بلکہ یہ بھی عیاں ہو گیا کہ خاص طرز کی یہ چھوٹی سی مملکت جس کی اپنی مختصر سی فوج تھی' بحری طاقت میں اسے برتری حاصل تھی' جہاں شخصی آزادی پر زور دیا جاتا تھا اور پریس پر پابندی نہ تھی۔ کتنی آسانی سے کمزوریوں کا شکار ہو گئی۔

اس آزمائش پر برطانیہ کے لبیک کہنے کی غرض و غایت (بیسویں صدی میں امریکیوں کے جنگ میں ملوث ہونے کی طرح) یہ تھی کہ مسلح افواج پر کثیر رقم خرچ کی جائے تاکہ ماضی میں ان کے ساتھ کی گئی بے توجہی کی تلافی ہو سکے۔ متحارب قوتوں کے فوجی اخراجات کا یہ ہوشربا گوشوارہ اس بات کی عکاسی کر رہا ہے کہ جنگ کے نتائج کتنے مضمر ہوں گے۔ (دیکھئے جدول نمبر۱۱)

برطانیہ کیسے ہی جوش و جذبے سے بھرا ہوا ہو لیکن اپنی طاقت کی بحالی کے لیے وہ جلد کوئی موثر اقدام نہیں کر سکا۔ اگرچہ اس نے فوری طور پر اپنے فوجی اخراجات دو گنے کر دیئے اور سینکڑوں دخانی جہازوں کی تیاری کا آرڈر دے دیا' لڑنے والے سپاہیوں کے لیے خیمے اور کمبل وافر مقدار میں مہیا کر دیئے اور پالمرسٹن نے روس کی سلطنت کو ختم کرنا ضروری سمجھا' پھر بھی نتائج حوصلہ افزا نہ تھے۔ اگر فرانس صلح کر

لینے پر آمادہ ہو جاتا اور آسٹریا غیر جانب دار رہتا تو اس صورت حال میں برطانیہ کی مختصر فوج کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتی تھی۔ سیواس ٹوپول کے سقوط کے بعد یہی کچھ ہوا۔ اگر برطانوی

جدول نمبر۱۱

جنگ کریمین میں شامل طاقتوں کے فوجی اخراجات

(ملین پونڈ میں)

	۱۸۵۲ء	۱۸۵۳ء	۱۸۵۴ء	۱۸۵۵ء	۱۸۵۶ء
روس	۱۵٫۶	۱۹٫۹	۳۱٫۳	۳۹٫۸	۳۷٫۹
فرانس	۱۷٫۲	۱۷٫۵	۳۰٫۳	۴۳٫۸	۳۶٫۳
برطانیہ	۱۰٫۱	۹٫۱	۷۶٫۳	۳۶٫۵	۳۲٫۳
ترکی	۲٫۸	؟	؟	۳٫۰	؟
سرڈینیا	۱٫۴	۱٫۴	۱٫۴	۲٫۲	۲٫۵

قوم اور علم المعیشت کے علمبردار "جنگ" کے ایسے ہی حامی بن گئے تھے تو گیا اس طرح روس کے خلاف محاذ آرائی ایک طویل عرصے تک اور تن تنہا جاری رہ سکتی تھی۔ بہرحال سیاسی قیادت کی نظر میں فوجی اخراجات کے حد سے زیادہ بڑھنے کے امکانات تھے۔ پھر جنگ کریمیا کے نتیجے میں جو دشواریاں' فوجی' قانونی اور اقتصادی لحاظ سے درپیش ہوئیں ان سے سیاست دان ویسے ہی دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ فتح و نصرت کے خواب پورے نہ ہونے کی وجہ سے اہل برطانیہ سمجھوتہ کر لینے کے لیے رضا مند تھے۔ برطانیہ کے اس رجحان کو بہت سی یورپی اقوام (اہل فرانس' اہل آسٹریا اور اہل روس) شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ان کی نظر میں لندن کے مقاصد اور اعتماد دونوں کھٹکنے لگے۔ اہل برطانیہ بھی اپنی حکومت کے براعظم کے معاملات میں ٹانگ اڑانے پر پہلے سے کہیں زیادہ چین بہ جبیں تھے۔ چنانچہ نپولین کی ماتحتی میں فرانس تو ۱۸۵۶ء میں یورپ کے مرکزی اسٹیج کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ وہاں برطانیہ لحظہ بہ لحظہ کنارے سے لگتا جا رہا تھا۔ اس پسپائی میں شدت "بغاوت ہند" (۱۸۵۷ء) اور اندرون ملک ہونے والی تحریک اصلاحات سے بہت بڑھ گئی۔

اگر جنگ کریمین سے برطانیہ کو نقصان پہنچا تھا وہاں روس کی طاقت اور جوش و جذبے پر اس سے کہیں زیادہ مضر اثرات رونما ہوئے تھے۔ اس کے ۴۸۰۰۰۰ افراد کے جانی نقصان کا تو ذکر ہی کیا۔ گرینڈ ڈیوک کونسٹن ٹمولیوچ نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ:

> "ہم اپنے آپ کو مزید دھوکہ نہیں دے سکتے۔ ہم صف اول کی طاقت کے مقابلے میں غریب بھی ہیں اور کمزور بھی! علاوہ ازیں ہم مالی اور دماغی وسائل خصوصاً" انتظامی صلاحیت میں بھی بے حد پسماندہ ہیں"

اس شعور و آگہی نے روس کے مصلح افراد کو تبدیلی لانے پر مجبور کر دیا' خصوصاً" بیگاری اور رعیت پن کے خاتمے کے سلسلے میں! علاوہ ازیں ریلوے کی تعمیر اور صنعت سازی کا جو کام الیگزنڈر دوم کے باپ کے زمانے میں نہ ہو سکا وہ اس کے عہد میں جوش و جذبہ کے ساتھ ہونے لگا۔ چنانچہ ۱۸۶۰ء کے عشرے کے بعد کوئلہ' لوہا' فولاد' دیگر ضروریات زندگی اور وسیع پیمانے پر صنعت سازی میں خاصی ترقی ہوئی۔

روس کی معاشی تاریخ میں جو اعداد و شمار درج کیے گئے ہیں وہ پہلی ہی نظر میں خاصے موثر معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم حالات کے پیش نظر رائے متاثر ہو سکتی ہے۔ کیا روس کی جدید کاری غریب اور ناخواندہ کسانوں کی ہر سال بڑھتی ہوئی تعداد میں کمی کی ضامن ہو سکتی تھی؟ کیا اگلے دو عشروں میں ویسٹ مڈ لینڈ، روہر، سلیسیا اور پٹسبرگ میں لوہا، فولاد اور مصنوعات میں ہونے والی ہوشربا ترقی سے یہ روسی جدید کاری ہم آہنگ ہو سکتی تھی؟ کیا یہ اپنی منظم فوج کے باوجود اہل پروشیا کے فوجی انقلاب کے مساوی ہو سکتی تھی؟ ان سوالات کے جوابات سے روسی قوم پرست یقیناً" مایوسی کا شکار ہو گا' کیونکہ وہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۴۸ء میں اس کے ملک کو پورے یورپ میں جو اہم پوزیشن حاصل تھی وہ ختم ہو چکی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خانہ جنگی

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ڈی ٹاکویل اور دیگر عالمی سیاست کے ماہرین نے ہمیشہ یہ بات محسوس کی تھی کہ سلطنت روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ دونوں ایک دوسرے کے مساوی ترقی کرتے رہے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ان دونوں ریاستوں کے سیاسی کلچر اور قانون میں بنیادی فرق ہے۔ لیکن جہاں تک عالمی طاقت کا سوال ہے' دونوں اپنے جغرافیائی حدود اربعہ' اپنی کھلی ہوئی اور پھیلتی ہوئی سرحدوں' اپنی بڑھتی ہوئی آبادی اور پھیلتے ہوئے وسائل کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ مذکورہ حقائق کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انیسویں صدی کے تمام عرصے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس کی معیشت میں خاصا اہم فرق رہا ہے۔ اس کا اثر ان کی ملکی طاقت پر پڑتا رہا ہے۔ اس کی اول مثال مجموعی آبادی ہے۔ دونوں کی آبادی میں جو اہم خلا تھا وہ بتدریج کم ہوا ہے۔ مثلاً" ۱۸۱۶ء میں روس کی آبادی ۵۱ء۲ ملین تھی جبکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ۵ء۸! لیکن ۱۸۶۰ء میں روس کی اگر ۷۶ ملین ہو گئی تو امریکہ کی ۳۱ء۴ ملین ہو گئی۔ سب سے اہم بات آبادی کا کردار تھا۔ روس میں آبادی کا زیادہ حصہ رعیت پر مشتمل تھا۔ ان کی آمدنی بھی کم تھی اور ان کی پیداواری صلاحیت بھی قلیل تھی۔ اس کے برعکس امریکی اپنے مضافاتی مکان یا تیزی سے بڑھتے ہوئے شہروں میں نہایت اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ان کی قومی آمدنی دوسرے ملکوں کے مساوی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں وہاں اجرت کی جو شرح تھی وہ مغربی یورپ سے تین گنا زیادہ تھی۔ اور مذکورہ صدی میں یہ شرح اگر بڑھی نہیں تو برقرار ضرور رہی۔ ۱۸۵۰ء کی دہائی میں یورپ سے بھاری تعداد میں مہاجروں کی آمد کے نتیجے میں مغربی حصے کی زمینیں انھیں دستیاب ہوتی رہیں۔ پھر صنعت بھی تیزی سے فروغ پاتی رہی۔ نتیجتاً" مزدوروں کی دستیابی وافر نہیں رہی اور ان کی اجرت کی شرح بھی بڑھ گئی۔ چنانچہ صنعت کاروں نے مزدوروں سے بے نیاز کر دینے والے مشینیں استعمال کرنی شروع کیں۔ اس سے قومی پیداوار میں خاصا اضافہ ہونے لگا۔ یورپ میں اقتدار کی جنگ سے یہ نئی جمہوریہ بالکل الگ تھلگ ہو گئی۔ پھر برطانیہ کی شاہی بحریہ ۔نہ کہ مونرو کے قانون) نے پرانی دنیا کو نئی دنیا سے جدا کرنے کے لیے ایک گھیرا ڈال دیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانے لگا کہ امریکہ کی خوشحالی کو مستقبل میں برطانیہ سے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ تاہم ۱۷۷۶ء اور ۱۸۱۲ء کی تلخ یادوں اور شمال مغربی سرحدوں کے قضیے کے باوجود انگلستان اور امریکہ کے درمیان جنگ کے امکانات نہ تھے۔ برطانیہ کا سرمایہ اور مصنوعات ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہنچنے لگیں اور وہاں سے خام مال خصوصاً" روئی انگلستان برآمد کی جانے لگی۔ دفاعی طور پر محفوظ امریکہ اپنے مالی

وسائل فوجی ساز و سامان کی تیاری میں صرف کرنے کی بجائے معیشت کو بہتر بنانے میں استعمال کرنے لگا۔ نہ تو ریڈ انڈین کے ساتھ جھگڑے اور نہ ہی ۱۸۴۶ء میں میکسیکو کے ساتھ جنگ اس معیشتی ترقی میں مزاحم ہوئی۔

ان اسباب و عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپریل ۱۸۶۱ء میں خانہ جنگی کے آغاز سے بہت پہلے امریکہ اقتصادی لحاظ سے ایک جن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگرچہ یورپ سے طویل فاصلے' ملکی ترقی پر اس کی بھرپور توجہ (بیرونی تجارت اس میں شامل نہیں) اور ملک کے ناہموار علاقے اس کے اقدامات میں حائل ہوتے رہے ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں عالمی مصنوعات میں یہ برطانیہ سے تھوڑا ہی پیچھے تھا۔ البتہ جرمنی اور روس کے مقابلے میں بہت آگے تھا اور فرانس پر سبقت لے جانے کے قریب تھا۔ اس کی آبادی ۱۸۶۰ء میں روس کی آبادی کا ۴۰ فی صد تھی۔ لیکن شہری آبادی وہاں کی آبادی سے دو گنا تھی۔ روس اس وقت ساڑھے تین لاکھ ٹن لوہا پیدا کرتا تھا جبکہ امریکہ میں یہ شرح ساٹھ لاکھ تیس ہزار تھی۔ اس کی ایندھن کے جدید ذرائع سے توانائی پیدا کرنے کی سکت روس کے مقابلے میں پندرہ گنا زیادہ تھی' اور ریلوے لائن کی طوالت تیس گنا زیادہ تھی حتیٰ کہ یہ طوالت برطانیہ سے بھی یہ تین گنا زیادہ تھی۔ روس کی ۸'۶۲'۰۰۰ عظیم فوج کے مقابلے میں امریکہ کی مستقل فوج محض ۲۶'۰۰۰ نفری پر مشتمل تھی۔ براعظم جیسی وسیع و عریض ان دو ریاستوں میں اقتصادی اور فوجی قوت کے لحاظ سے اتنا بڑا فرق کبھی نہیں رہا جیسا کہ مذکورہ دور میں تھا۔

ایک ہی سال کے اندر اندر خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں قومی وسائل فوج پر صرف ہونے لگے۔ یہاں اس جھگڑے کے اسباب و عوامل پر بحث مقصود نہیں! لیکن چونکہ یہ متحارب قوتیں ایک دوسرے کو ختم کر دینے کی درپے تھیں اور ہر فریق کی آواز پر ہزاروں افراد لبیک کہتے ہوئے پہنچ جاتے تھے' اس وجہ سے یہ لڑائی طویل ہو گئی۔ اس کی شدت میں فاصلے کو بھی دخل تھا۔ جنگ کا محاذ ورجینیا کے ساحل سے مسی سی پی' حتیٰ کہ مغربی سمت میں میسوری سے ارکان تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ تمام کا تمام فاصلہ جنگلات' پہاڑی سلسلے اور دلدلی علاقے سے پر تھا۔ اسی طرح' شمال میں دشمنوں کی بندرگاہوں کی ناکہ بندی کے سلسلے میں اتنے وسیع ساحل کا چکر لگانا پڑتا تھا جیسے ہیمبرگ اور جینوا کے درمیان کے طویل فاصلے کا چکر لگاتا ہو۔ بادی النظر میں جنوبی علاقے کو کچلنا فاصلاتی اور فوجی لحاظ سے نہایت مشکل کام تھا خصوصاً" ان لوگوں کے لیے جن کی فوج بھی محدود تھی اور جنھیں وسیع پیمانے پر لڑی جانے والی جنگ کا تجربہ بھی نہ تھا۔

یہ چار سالہ جنگ تھکا دینے والی اور حد سے زیادہ خوں ریز تھی۔ اس میں یونین کے ۳۶۰'۰۰۰ افراد ہلاک ہوئے جبکہ متحدہ ریاستوں کے ۲۵۸'۰۰۰ آدمی مارے گئے۔ علاوہ ازیں' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مخفی قوتیں' تھوڑے ہی عرصے کے لیے ہی سہی' روئے زمین کی ایک زبردست لڑاکا قوم میں منتقل ہو گئیں تا آنکہ ۱۸۶۵ء کے فوراً" بعد جنگ و جدال کا یہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ ہلکی پھلکی جھڑپ کے آغاز کے بعد فریقین کے ہتھیار بند سپاہی باقاعدہ لڑاکا فوج میں تبدیل ہو گئے۔ وہ جدید قسم کی توپیں اور ہتھیار استعمال کرنے لگے۔ کبھی وہ شمالی ورجینیا کے محاصرے پر چڑھ دوڑتے اور کبھی ٹرین کے ذریعے مغربی محاذ پر پہنچ جاتے۔ وہ تار برقی کے ذریعے فوجی چھاؤنی کو تمام کاروائیوں کی اطلاع دیتے۔ جنگ کے اخراجات کے لیے جملہ اقتصادی وسائل بروئے کار لاتے۔ علاوہ ازیں' اس بحری جنگ میں پہلی مرتبہ آہن پوش جہاز' چکر دار برج توپ' تار

پیڈو اور سرنگیں اور تیز رفتار حملہ کرنے والے تجارتی جہاز استعمال کیے گئے۔ مذکورہ جنگ' جنگ کریمن یا پروشیا کی جنگوں سے کہیں زیادہ صنعتی جنگ تھی جو بیسویں صدی میں ہونے والی محاذ آرائی کے بالکل مماثل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شمال کو فتح نصیب ہوئی۔

اگرچہ خود اعتمادی اور جوش و جذبہ ہر فریق میں تھا' اس کے باوجود جنوب کی شکست کی وجہ دراصل وسائل اور آبادی میں تناسب کا فقدان تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جنوبی علاقے کو ابتداء ہی سے جنگ وجدال کا تجربہ حاصل تھا اور وہ بھی اپنی سرزمین میں! چنانچہ وہ بھاری تعداد میں اپنے سفید فام لوگوں کو مبارزت کے لیے بلا لیتا تھا جنہیں گھڑ سواری اور شکار کا خاصا تجربہ تھا۔ اس کے پاس باحوصلہ اور اچھی صلاحیتوں کے حامل جرنیلوں کی بھی کمی نہ تھی۔ پھر وہ جنگی سازو سامان کی پوری کرنے کے لیے اسلحہ اور دیگر ضروری سامان درآمد بھی کر لیتا تھا۔ لیکن شمال اور جنوب میں عددی عدم توازن کی وجہ سے یہ سارے لوازمات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ شمالی علاقے کی آبادی تقریباً" بیس ملین سفید فام افراد پر مشتمل تھی جبکہ کنفڈریسی کی آبادی کل چھ ملین تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یونین کی آبادی میں مہاجرین کی آمد سے مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یعنی ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۵ء کے دوران آٹھ لاکھ سے کچھ زیادہ ہی مہاجر آ گئے۔ پھر ۱۸۶۳ء کے فیصلے کے مطابق کالوں کو بھی فوج میں بھرتی کیا گیا۔ جنوب اس رویے سے پہلوتہی برتتا رہا تاآنکہ جنگ کے اختتام سے چند ماہ پہلے بادل ناخواستہ اس پالیسی کو اپنانے پر راضی ہوا۔ یونین کی فوج میں تقریباً" ۲ ملین آدمی کام کرتے تھے۔ ۵-۱۸۶۳ء کے جنگ کے دوران خاص لڑاکا فوج ایک ملین تھی۔ اس کے برعکس کنفڈریسی کی فوج میں صرف نو لاکھ افراد ملازم تھے۔ ان میں لڑنے والے باصلاحیت سپاہی ۴۶۴٬۵۰۰ سے زیادہ کبھی نہیں رہے۔ ۱۸۶۳ء میں اسے جو فوجی برتری حاصل تھی' اس میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔

تعداد کے علاوہ بھی اس جنگ کے اثرات نمایاں ہوئے۔ اپنی مختصر ترین فوج میں بھرتی کے لیے اس نے جنوب کے کھیت' کان اور کارخانوں سے زبردستی مزدوروں کو پکڑ کر بلوایا۔ اس طرح جنوبی علاقے نے طویل جنگ لڑنے کے لیے مطلوبہ معیشتی استحکام کو اور بھی کمزور کر کے رکھ دیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کنفڈریسی کو ابتدا ہی سے اقتصادی کمزوری کا سامنا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں شمال میں ۱۱۰٬۰۰۰ صنعتی کارخانے لگے ہوئے تھے جبکہ جنوبی علاقے میں کل ۱۸٬۰۰۰ تھے۔ (ان میں بھی زیادہ تر صنعتی مزدور اور ٹکنالوجی وغیرہ شمال سے لائے تھے۔) کنفڈریسی ۳۶٬۷۰۰ ٹن خام لوہا پیدا کرتا تھا جبکہ تنہا پنسلوانیا میں یہ پیداوار ۵۸۰٬۰۰۰ ٹن تھی۔ نیویارک کی ریاست میں جو مصنوعات تیار کی جاتی تھیں ان کی قیمت ۳۰۰ ملین ڈالر ہوتی تھی۔ اگر ورجینیا' الباما' لوئیزیانا اور مسی سی پی کی جملہ مصنوعات کو شامل کر لیا جائے تو نیویارک کی مصنوعات ان سے چار گنا زیادہ تھیں۔ اقتصادیات میں اتنے شدید فرق سے ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فریقین کی دفاعی قوت کیا تھی۔

شمال کے طور پر جنوب میں چند ہی رائفلیں تیار ہوتی تھیں اور وہ بھی قبضہ کی ہوئی مشینوں سے۔ چنانچہ وہ یہ اسلحہ زیادہ تر درآمد کیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس شمال میں نجی طور پر رائفلیں کثیر تعداد میں بنتی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہ ۱.۷ ملین سالانہ کی تعداد میں تیار ہوتی تھیں۔ شمال میں ریلوے کا نظام

دوران جنگ بھی برقرار رہا۔ وہاں کی ریل کی پٹڑی ۲۲ ہزار میل لمبی اور مشرق سے شمال مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ خانہ جنگی کے دوران نہ صرف ٹرینیں چلتی رہیں بلکہ ان میں بہتری بھی پیدا کی گئی۔ اس کے برعکس' جنوب میں ریلوے لائن کل نو ہزار میل لمبی تھی۔ انجن اور ایندھن کا ناکافی ہونے کی وجہ سے وہاں کی ٹرین رفتہ رفتہ ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ اسی طرح دونوں متحارب علاقوں کے پاس' میدان جنگ سے قریب کوئی زیادہ بحری جہاز نہ تھے۔ جو تھوڑے بہت تھے بھی' ان کی مرمت کے لیے جنوب کے پاس کوئی ورکشاپ نہ تھی۔ البتہ شمال میں ایسی درجنوں ورکشاپیں موجود تھیں۔ جنگ کے دوران ناکہ بندی کرنے والے تیز رفتار جہاز یورپ کے بنے ہوئے اسلحہ اتحادی ریاستوں کی فوج کے لیے لایا کرتے تھے۔ انہی دنوں جنوب کے حملہ آور تجارتی جہاز شمال کے تجارتی جہازوں کو خاصا نقصان پہنچاتے رہے۔ چنانچہ یونین والوں نے بحری طاقت میں بالادستی حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ اس کام میں وقت لگا' لیکن شمال نے رفتہ رفتہ جنوب کے ساحلوں کے چاروں طرف گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پھر یہ ہوا کہ دسمبر ۱۸۶۴ء تک یونین کے پاس ۶۷۱ جنگی جہاز تھے۔ ان میں ۲۳۶ دخانی جہاز بھی شامل تھے جو جنگ شروع ہوتے ہی مقامی طور پر بننے شروع ہو گئے تھے۔ شمال کی بحری طاقت بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس سے فوجیوں کو اندرون ملک بہنے والے دریاؤں پر کنٹرول قائم کرنے میں بڑی مدد ملی' خصوصاً" مسی سپی اور ٹینیسی کے علاقے میں ریل اور آبی مواصلات کے مشترکہ استعمال کی وجہ سے یونین کو مغربی محاذ پر حملہ آور ہونے میں خاصی سہولت رہی۔

بالآخر متحدہ ریاستوں کو جنگ کے اخراجات پورے کرنے میں دشواری پیش آنے لگی۔ دوران امن ان کی آمدنی کا ذریعہ روئی کی برآمد تھی۔ جب یہ تجارت ختم ہو گئی اور یورپی طاقتوں نے اس لڑائی سے الگ تھلگ رہنا مناسب سمجھا تو اس سے نہ صرف جنوب کو مایوسی ہوئی بلکہ نقصان پورا کرنے کی کوئی اور صورت بھی نظر نہیں آئی۔ ویسے جنوب میں بنک تھے مگر معدودے چند! نیز' حاضر سرمایہ کی بھی کمی تھی۔ زمین اور غلاموں پر ٹیکس نافذ کرنے کے باوجود آمدنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا اس لیے کہ جنگ کے مضمرات کی وجہ سے دونوں کی پیداواری صلاحیت متاثر ہوئی تھی۔ بیرونی ممالک سے بھی قرضہ نہ مل سکا۔ بہرحال بیرونی زرمبادلہ یا طلائی سکہ کی عدم موجودگی میں نہایت اہم قسم کی برآمدی اشیاء کی قیمت چکانی مشکل تھی۔ چنانچہ متحدہ ریاستوں کے محکمہ خزانہ نے چھاپہ خانے کی جانب رجوع کیا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک طرف کاغذی نوٹوں کا انبار لگ گیا تو دوسری طرف اشیائے صرف کی قلت پیدا ہو گئی۔ اس صورت حال کی وجہ سے شدید افراط زر کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نتیجتاً" عوام جنگ کو مزید جاری رکھنے کے خلاف ہو گئے۔ اس کے برعکس شمالی علاقہ کو فنڈ مہیا کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے ٹیکس نافذ کر کے اور ادھار لے کر جنگ کے اخراجات پورے کیے۔ پھر اس نے "گرین بیک" چھاپ کر ایک طرح سے صنعت و معیشت کو مزید فروغ دیا۔ یہ نہایت ہی اثر انگیز حقیقت ہے کہ یونین کی پیداواری صلاحیت جنگ کے زمانے میں بھی فروغ پاتی رہی۔ نہ صرف اسلحہ سازی میں ترقی ہوئی بلکہ ریلوے کی تعمیر اور آہن پوش بحری جہاز کی تیاری اور زرعی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ جب جنگ اختتام کو پہنچی تو شمالی علاقے کے سپاہیوں کی حالت بدرجہا بہتر تھی۔ انہیں کھانے پینے اور پہننے' اوڑھنے کے سامان اتنے وافر مقدار میں ملتے تھے۔ جس کی مثال تاریخ میں

نہیں ملتی۔ اگر اس فوجی محاذ آرائی کو خصوصاً" امریکی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پروفیسر ویلی کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ "امریکیوں کا اپنا طریقہ جنگ" تھا۔ یونین نے اپنے حرکت و عمل اور صنعتی و تکنیکی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس طریقے کو پہلی مرتبہ اپنایا اور دشمن کو نیست و نابود کر دیا۔

ایک ایسی جنگ کے بارے میں جو تقریباً" چار سال تک آگے پیچھے ڈانوں ڈول ہوتی رہی' مذکورہ بالا بیانات خاصے جبری محسوس ہوں گے' تاہم جنوبی علاقے کو فوجی نقطہ نظر سے جو بنیادی مسائل در پیش تھے' ان کا احاطہ بھی ضروری ہو گا۔ اپنے حدود و اربعہ اور آبادی کے عدم توازن کی وجہ سے وہ کسی بھی صورت میں شمالی علاقے پر غالب نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ دشمن کی فوج کو دھوکہ دیا جائے اور اس کے جذبہ خود اعتمادی کو چکنا چور کر دیا جائے تاکہ وہ ظلم و استبداد کے رویے سے باز آ جائے اور جنوب کے مطالبات تسلیم کر لے' یعنی "غلامی برقرار رکھے یا علیحدگی اختیار کر لے"۔ اگر میری لینڈ اور کنٹکی کی سرحدی ریاستیں کنفڈریسی کی بڑھ چڑھ کر حمایت کرتیں تو مذکورہ نظریے کو خاصی تقویت پہنچتی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اور اگر برطانیہ اس معاملے میں مداخلت کرتا تو معاملہ طول کھینچ لیتا۔ لیکن جنوبی علاقے کے لوگوں کا اس طرح توقع کرنا عبث تھا' اس لیے کہ ۱۸۶۰ء کے عشرے میں برطانیہ کی سیاسی ترجیحات کچھ اور تھیں۔ جب اہل جنوب کے سامنے کوئی اور صورت حال نہیں رہی' تو لامحالہ انھوں نے یونین کے شدید دباؤ کی مزاحمت کرنی شروع کی۔ اس حکمت عملی کے پس پردہ ان کا خیال تھا کہ اہل شمال طویل محاذ آرائی سے تنگ آ جائیں گے۔ چنانچہ یہ جنگ خاصی طویل ہوتی چلی گئی۔ ناچار شمالی علاقے کو اپنے عظیم تر وسائل استعمال میں لانے پڑے۔ اس نے کثیر مقدار میں گولہ بارود تیار کیا۔ سیکنڑوں جنگی جہاز سمندر میں اتار دیے۔ پھر' بحری ناکہ بندی کر کے شمالی ورجینیا میں مسلسل فوجی دباؤ ڈال کر مغربی سمت میں دور دور تک حملہ کر کے اور دشمنوں کے علاقے میں جرنیل شرمن کی تباہ کن یلغار کے ذریعے اپنا سکہ بٹھا دیا۔ چنانچہ جنوبی علاقے کی معیشت تباہ ہو گئی' مورال گر گیا اور صف اول کی لڑاکا فوجیں پسپا ہو گئیں۔ ۱۸۶۵ء کے آغاز میں اس کی فوج گھٹ کر ایک لاکھ پچپن ہزار رہ گئی۔ لہٰذا اس کے لیے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔

جرمنی کے اتحاد کی جنگیں

اگرچہ یورپ کے متعدد فوجی ماہرین نے امریکی خانہ جنگی کا مطالعہ کیا' لیکن اس کی اہم خصوصیات (مثلاً" طویل فاصلہ' لق و دق صحرا و بیابان اور پھر عوام کی آپس کی لڑائی) ان کی نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔ حالانکہ ۱۸۶۰ء کے عشرے میں یورپ میں ہونے والی جنگوں سے یہ کسی طرح بے وقعت نہ تھی۔ جنگ کریمین کی وجہ سے نہ صرف پرانے طرز کی سفارت کاری کو دھچکا پہنچا بلکہ صف اول کی طاقتوں کو اس نے یہ باور کرایا کہ وہ مرکز میں مداخلت سے پہلو تہی برتیں۔ چنانچہ روس کو اپنی عبرتناک شکست کے اثرات زائل کرنے میں برسوں لگ گئے۔ اور برطانیہ نے مجبور ہو کر شاہی معاملات اور ملکی مسائل میں خود کو محصور کرلیا۔ چنانچہ یورپ کے معاملات پر فرانس کی برتری چھا گئی۔ اگرچہ بعد میں یہ ملمع ہی ثابت ہوئیں۔ رہا پروشیا تو جنگ کریمین کے دوران وہ فریڈرک ولیم چہارم کی سرگرمی میں نہایت ممتاز مقام کا حامل تھا۔ لیکن اب وہاں ولیم اول اور پارلیمنٹ کے مابین فوجی اصلاحات کے مسئلے پر قانونی جنگ ہو رہی تھی۔ سلطنت ہیبسرگ کئی مسائل سے نبرد آزما تھی۔ ایک طرف پیڈ مونٹ کے مقابلے میں اپنے اطالوی مفادات کی پشت پناہی کر رہی تھی تو دوسری جانب جرمنی کے مفادات کو پروشیا پر ترجیح دے رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ہنگری میں ہونے والی اندرونی شورش کو بھی ہوا دے رہی تھی۔

ان سب کے مقابلے میں فرانس نپولین سوم کی فرمانروائی میں خاصا مستحکم اور باحوصلہ نظر آتا تھا۔ فرانس میں ۱۸۵۰ء کے ابتدائی عشرے کے بعد بینکاری' ریلوے اور صنعت میں ترقی ہوئی تھی۔ اس کی نو آبادیات مغربی افریقہ' ہند چین اور بحر الکاہل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے بحری بیڑے میں اس قدر توسیع ہوئی تھی کہ بسا اوقات (مثلاً" ۱۸۵۹ء میں) انگلش چینل تک اس سے خطرہ محسوس کیا گیا۔ فوجی اور سفارت کاری کے لحاظ سے اسے فیصلہ کرنے والوں میں تیسرا مقام حاصل تھا۔ لہٰذا جرمنی یا اٹلی کے قبضے میں بحیثیت تحکم یہ شامل تھا۔ اس کی مثال ۱۸۵۹ء کے واقعہ سے ملتی ہے جب فرانس نے پیڈمونٹ کے نمائندے کے طور پر آسٹریا کے خلاف ہونے والی مختصر ترین جنگ میں مداخلت کی تھی۔

میگنٹا اور سولفیرینو کی دو اہم جنگیں سلطنت ہیبسرگ کو اس امر پر مجبور کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں کہ وہ لومبارڈی پر اپنے قبضے سے دست بردار ہو جائے۔ ۱۸۵۹ء میں مبصرین نے یہ محسوس کر لیا ہو گا کہ یہ آسٹریا کی فوج کی نااہلی تھی نہ کہ فرانسیسی فوج کی مہارت (اور نہ ہی پیڈمونٹ کی عسکری ذہانت) کہ جس نے نتیجے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ افواج فرانس کے پاس آسٹریا کی فوج کے مقابلے میں بہت زیادہ رائفلیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آسٹریا کا اتنا زیادہ جانی نقصان ہوا کہ شہنشاہ فرانسس جوزف اس صدمے سے نڈھال ہو گیا۔ لیکن فرانس کی اپنی کچھ خامیاں بھی تھیں۔ اس کا دواؤں اور گولہ بارود کی ترسیل کا نظام ناقص تھا۔ فوجی نقل و حمل کی متعینہ تاریخ پر پوری طرح عمل در آمد نہیں ہوتا تھا۔ پھر نپولین سوم کی قائدانہ صلاحیت بھی بہتر نہ تھی۔ اس وقت ان خامیوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ اس وقت لڑنے والی سلطنت ہیبسرگ کی فوج بذات خود کمزور تھی اور جنرل گیولائی کی سپہ سالاری بھی حوصلہ افزا نہ تھی۔ لیکن

فوجی اسباب و عوامل آپس میں مربوط ہوا کرتے ہیں۔ اس کا اظہار بعد میں اس حقیقت سے ہوا جب ہیبسبرگ کی سپاہ نے زمینی جنگ میں اطالوی فوج کو شکست دی (۱۸۶۶ء میں کسٹوزا کے مقام پر)۔ پھر لیسا کے مقام پر بحری جنگ میں اسے ناکامی سے دو چار کیا۔ یہ باتیں اس وقت ہوئیں جب مذکورہ سلطنت فرانس، پروشیا اور روس سے مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھی۔ اس حقیقت سے یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اب فرانس مستقبل میں اپنے مختلف النوع دشمن کے مقابلے میں برتری حاصل نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ مستقبل میں کسی متوقع جنگ کا نتیجہ فوجی قیادت کی نوع بہ نوع سطح، اسلحے کے نظام اور سازو سامان تیار کرنے کے کارخانے پر ہی مبنی ہو گا۔

یہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کے عشرے کی بات ہے کہ صنعتی انقلاب کا براہ راست اثر طریقہ جنگ پر بھی پڑا۔ اس میں حیرت کی بات نہیں کہ ہر جگہ فوجی لوگ نئے نئے اسلحے کے استعمال میں الجھن محسوس کر رہے تھے۔ میدان جنگ میں نہ جانے کیا عالم ہوتا ہو گا جب پیدل سوار اپنی نئی توڑے دار رائفل اور گھڑ سوار موبائل گن استعمال کرتا ہو گا؟ نہ جانے محاذ پر ریلوے اور ٹیلیگرام کے کیا اثرات سپہ سالار پر مرتب ہوتے ہوں گے۔ جنگ کی نئی نئی تکنیک سے کسے فائدہ پہنچا ——— آگے بڑھتی ہوئی فوج کو یا دفاع کرنے والے لشکر کو؟ ایسے سوالات کا صحیح جواب یہی ہے کہ سب کچھ حالات پر منحصر تھا۔ یعنی جنگ کے نتائج میں یہ اسباب و عوامل بھی شامل تھے۔ نئے اسلحے کا موقع و محل کے لحاظ سے استعمال، سپاہیوں کا جذبہ اور فنی مہارت، مواصلات کا اعلیٰ نظام اور دیگر اہم عسکری حقائق! چونکہ پیش آنے والے واقعات کا پہلے سے مطلق علم نہیں ہوتا، اس لیے اعلیٰ درجے کا فوجی افسر ہی ان متوقع تمام مسائل سے نبرد آزما ہو سکتا تھا۔ اور موقع محل کے لحاظ سے اسلحے کے استعمال کی تاکید بھی کر سکتا تھا۔ اور ان تمام باتوں میں پروشیا کو ہیبسبرگ کی سلطنت اور فرانس کی فوج پر فوقیت حاصل تھی۔

۱۸۶۰ء کی دہائی میں پروشیا میں جو فوجی انقلاب رونما ہوا اور جسے ڈز رائیلی نے یورپ کے معاملات میں "جرمنی انقلاب" کی نوید قرار دیا تھا، بہت سے اسباب و عوامل سے مربوط تھا۔ ان میں پہلا تو قلیل المیعاد فوجی ملازمت کا قانون تھا جسے نئے بادشاہ ولیم اول اور اس کے وزیر جنگ نے اپنی مخالف لبرل پارٹی کے خلاف نافذ کیا تھا۔ اس قانون کے تحت ہر کسی کو "سپاہ باقاعدہ" میں تین سال ملازمت کرنی لازمی تھی۔ پھر چار سال "محفوظ فوج" میں گزارنا پڑتے تھے۔ اس کے بعد ہی ہر شخص "لینڈ ویہر" بنتا تھا، یعنی اس نے پروشیا کی متحرک فوج میں سات سالہ شمولیت اختیار کر لی ہے۔ چونکہ کسی اور قسم البدل کی اجازت نہ تھی، لہٰذا لینڈ ویہری محافظ دستے کے طور پر خدمت انجام دیتے اور حساس مقامات کی چوکسی بھی ان ہی کے سپرد تھی۔ اس طریقہ کار کے تحت پروشیا کے پاس صف اول کی لڑنے والی فوج ظفر موج تیار ہو گئی۔ یہ سہولت کسی دیگر بڑی طاقت کو حاصل نہ تھی۔ علاوہ ازیں، اس فوج کے لیے بنیادی تعلیم کا حصول ضروری تھا۔ بعض ماہرین کے خیال میں وسعت پذیر اور قلیل المدتی ملازمت کے اس نظام کے تحت جاہل کسانوں کی قوم میں فوجیوں کا کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر اس فوج میں اعلیٰ درجے کا نظم و ضبط بھی تھا تاکہ کثیرالتعداد فوج کو کنٹرول میں رکھا جا سکے۔ بہرحال پانچ / دس لاکھ فوج کا اکٹھا کر لینا بالکل بے معنی ہے اگر یہ پوری طرح تربیت یافتہ نہ ہو،

پہننے کو وردی نہ ہو، لڑنے کو اسلحہ نہ ہو، پیٹ بھرنے کو کھانا نہ ملتا ہو اور اسے محاذ جنگ تک بہ آسانی نہ پہنچایا جا سکتا ہو۔ اور اگر فوج کا سپہ سالار فوج ظفر موج کے ساتھ رابطہ نہ رکھ سکے اور اس پر اپنا کنٹرول قائم نہ کر سکے تو یہ افرادی قوت اور ملکی وسائل کا اچھا خاصا ضیاع ہو گا۔

مذکورہ فوج کا کنٹرول پروشیا کے جنرل اسٹاف کے ذمے تھا۔ یہ ۱۸۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں مولٹکے کی ذہانت کے نتیجے میں اس کے کنٹرول میں آیا تھا۔ اور یہ "فوج کا دماغ" کہلاتا تھا۔ امن کے دنوں میں زیادہ تر فوج لڑاکا یونٹوں میں منقسم ہوتی تھی۔ اس میں کوارٹر ماسٹر، افسران، انجینئر اور دیگر شعبے کے افراد شامل ہوتے تھے۔ اصل فوج جنگ چھڑنے پر یکجا ہو جاتی اور اس کے لیے سپہ سالار مقرر کر دیا جاتا۔ بہرکیف، مولٹکے نے "وار اکیڈمی" سے اعلیٰ قسم کے افراد چن کر انہیں مستقبل میں ہونے والی کسی بھی جنگ کی منصوبہ بندی کرنے اور فوجیوں کو تیار کرنے کی تعلیم دی تھی۔ محاذ آرائی سے بہت پہلے لڑنے کے منصوبے بنا لیے جاتے اور ان پر مسلسل نظر ثانی کی جاتی تھی۔ جیسا کہ دوسرے ملکوں میں تاریخی نوعیت کی جنگ میں ہوتا تھا، پروشیا میں بھی طریقہ جنگ اور مبارزت کا گہرا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ پروشیا کی ریلوے کی نگرانی کرتے رہنے کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کا یہ فرض تھا کہ فوجی دستوں اور سازو سامان کو مطلوبہ مقامات تک پہنچانے کو یقینی بنائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولٹکے کے اسٹاف سسٹم نے فوجی افسران میں بڑی سے بڑی فوج سے نمٹنے کے جوہر بھی پیدا کیے تھے۔ وہ آزادانہ بھی لڑ سکتے تھے اور محاذ جنگ کی صورت حال سے ہیڈ کوارٹر کو مطلع بھی کر سکتے تھے۔ اگر مولٹکے کے ہیڈ کوارٹر کے ساتھ مواصلاتی نظام میسر نہ ہوتا تو جرنیلوں کو محاذ پر آزادانہ کاروائی کرنے کا اختیار تھا۔ البتہ اس کے لیے چند ضروری قوانین بنا دیے گئے تھے۔

مذکورہ بالا نمونہ درحقیقت ایک مثالی نمونہ ہے۔ پروشیا کی فوج ہر طرح مکمل نہیں تھی۔ ۱۸۶۰ء کے ابتدائی اور وسطی عشرے میں کی جانے والی فوجی اصلاحات کے باوجود اسے میدان جنگ میں اذیت ناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہت سے سپہ سالار میدان جنگ میں مولٹکے کے مشورے سے صرف نظر کرتے۔ وہ قبل از وقت اندھا دھند حملے کرنے لگتے اور بسا اوقات غلط سمت میں۔ ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کی لڑی جانے والی جنگ ایسی غلطیوں سے بھرپور تھی۔ اسی طرح ۱۸۷۰ء میں گریولوٹ سینٹ پریوات کے مقام پر پروشیا کے گارڈز کو آمنے سامنے کی لڑائی میں جو ہزیمت اٹھانی پڑی اور جس طرح جانی نقصان ہوا وہ حماقت آمیز رویہ تھا۔ ریلوے کا ترسیلی نظام بھی کامیاب نہ تھا۔ اکثر و بیشتر اس کے ذریعے محاذ پر سازو سامان کا انبار سا لگا دیا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں فوج کسی اور سمت پیش قدمی کرتی۔ یہ بات بھی وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ پروشیا میں فوجی منصوبہ بندی کے تحت سپاہیوں کو نہایت اعلیٰ قسم کے ہتھیار میسر تھے۔ اس کے مقابلے میں آسٹریا کا توپ خانہ ۱۸۶۶ء میں نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ اسی طرح فرانس کی چیس پوٹ رائفل ۱۸۷۰ء میں بدرجہا بہتر تھی۔

اصل معاملہ یہ نہیں ہے کہ پروشیا کے فوجی نظام میں کسی قسم کا نقص نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں کے جنرل اسٹاف نے نہایت غور و انہماک سے اپنی گذشتہ کوتاہیوں کا جائزہ لیا۔ پھر، اسی لحاظ سے تربیت کاری، انتظامی امور اور اسلحہ سازی میں اصلاح کی۔ جب ۱۸۶۰ء میں پروشیا کے توپ خانوں کے نقائص سامنے

آئے تو وہاں کی فوج نے نہایت سرعت کے ساتھ کرپ نامی توڑے دار بندوق استعمال کرنی شروع کر دی۔ ۱۸۷۰ء میں یہ اسلحہ حد درجہ موثر ثابت ہوا تھا۔ جب ریلوے کے ناقص ترسیلی نظام کی وجہ سے سامان موصول ہونے میں تاخیر ہو جاتی تو اس کے ازالے کے لیے ایک نیا ادارہ قائم کیا جاتا۔ وہ نظام کو بہتر بنانے کی تجاویز پیش کرتا۔ علاوہ ازیں' مولٹک نے متعدد فوجی دستے قائم کرنے پر بھی زور دیا تھا۔ یہ دستے آزادانہ خدمات انجام دیتے تھے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر فوج بری طرح کسی مصیبت میں پھنس جاتی' جیسا کہ آسٹریا - پروشیا کی لڑائی اور فرانس - پروشیا کی محاذ آرائی کے دوران یہ نوبت آئی تھی' اس سے جنگ کی مجموعی صورت حال پر اثر نہیں پڑتا تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ مذکورہ حقائق کی بدولت اہل پروشیا نے ۱۸۶۶ء کے موسم گرما میں اہل آسٹریا پر بہت جلد فتح حاصل کر لی۔ بعض مبصرین نے اس کی پیش گوئی بھی کی تھی۔ اگرچہ ہنوور' سیکونی اور دیگر جرمن ریاستوں نے ہیبسبرگ کا ساتھ دیا' لیکن بسمارک کی سفارت کاری نے اس امر کو یقینی بنا دیا تھا کہ کوئی بھی بڑی طاقت جنگ کے ابتدائی مراحل میں مداخلت نہیں کرے گی۔ چنانچہ مولٹک نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے مختلف پہاڑی راستوں سے تین فوجی دستے بوہیمین روانہ کر دیے اور یہ ہدایت کی کہ وہاں کے میدان میں تینوں اکٹھا ہو کر سدووا (کونی گراتز) کے مقام پر آسٹریا والوں پر دھاوا بول دیں۔ تاریخی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو نتائج حسب توقع حاصل ہوئے۔ ہیبسبرگ کی افواج کا ایک چوتھائی حصہ حسب ضرورت اطالیہ میں تھا (جہاں اسے فتح بھی حاصل ہوئی)۔ ادھر' پروشیا کے بھرتی کے اصول کے مطابق' وہاں کی کم آبادی کے باوجود' مولٹک صف اول کے لڑاکا سپاہی زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھرتی کر سکتا تھا۔ ہیبسبرگ کی فوج مالی بحران کا شکار تھی۔ اس کا اسٹاف سسٹم بھی موجود نہ تھا۔ پھر سپہ سالار بے نیڈک کی قیادت بھی موزوں نہیں تھی۔ اگرچہ ہر انفرادی یونٹ نہایت جوانمردی سے لڑا' لیکن سارے سپاہی پروشیا کی اعلیٰ ترین رائفلوں سے بھون کر رکھ دیے گئے۔ بالآخر اکتوبر ۱۸۶۶ء میں ہیبسبرگ کو مجبور ہو کر وینیشیا سے دست بردار ہونا پڑا۔ ساتھ ہی جرمنی کے معاملے میں آئندہ دخل اندازی سے توبہ کرنی پڑی۔ اس کے بعد ——— ملک جرمنی' بسمارک کے "نارتھ جرمن فیڈریشن" کے تحت ازسرنو منظم ہونا شروع ہو گیا۔

جرمنی کا اقتدار حاصل کرنے کی جنگ تو اختتام کو پہنچ گئی' لیکن اس بات کا جھگڑا کہ مغربی یورپ' پروشیا اور فرانس میں کون بالا دست ہے ——— جاری رہا تا آنکہ ۱۸۶۰ء کے آخری عشرے میں ہر فریق موقع کی تاک میں لگا رہا۔ بظاہر' فرانس مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آبادی پروشیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ (ویسے یورپ میں جرمن زبان بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی)۔ فرانسیسی فوج کو کریمیا' اطالیہ اور سمندر پار علاقوں میں لڑنے کا تجربہ بھی تھا۔ اس کے پاس چیس پوٹ جیسی دنیا کی بہترین رائفل تھی جس نے پروشیا کی نیڈل گن کو مات کر دیا تھا۔ اس کے پاس ایک نئی اور نہایت خفیہ مشین گن میٹریلیوز بھی تھی جو ایک منٹ میں ۱۵۰ گولیاں فائر کرتی تھی۔ اس کی بحریہ بھی نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ پھر فرانس کو آسٹریا' ہنگری اور اطالیہ سے فوجی مدد حاصل ہونے کی توقع بھی تھی۔ جب جولائی ۱۸۷۰ء میں اہل پروشیا کو ان کی دیدہ دلیری پر گوشمالی کا وقت آیا (وہ اس لیے کہ بسمارک نے لکسمبرگ کے مستقبل اور ہسپانوی تخت کے

ایک ہوہن زولرن امید وار کے لیے جو سفارت کاری کی تھی' اس کی انھوں نے تکذیب کی تھی) تو اس وقت چند ہی فرانسیسیوں کو جنگ کے اچھے نتائج میں کوئی شک و شبہ تھا۔

جب ۴ ستمبر کو فرانس کی نہایت آزمودہ کار فوج نے سیڈان کے مقام پر ہتھیار ڈال دیے اور نپولین سوم کو قید کر لیا گیا اور پیرس میں شاہی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تو سارے خوش آئند تصورات چکنا چور ہو کر رہ گئے۔ ایسے کڑے موقع پر فرانس کی مدد کو نہ تو آسٹریا - ہنگری آیا اور نہ ہی اٹلی پہنچا۔ فرانس کی بحریہ بھی بالکل بے اثر ثابت ہوئی۔ یہ سب کچھ فرانس کو دشمنوں کی اعلیٰ درجے کی فوجی صلاحیت کی وجہ سے دیکھنا پڑا۔ اور اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ پروشیا سبھوں میں اعلیٰ ترین تھا۔ اگرچہ ہر فریق ٹرین کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فوج محاذ جنگ پر روانہ کرتا تھا' تاہم فرانس کا یہ ترسیلی نظام بہت زیادہ بہتر نہ تھا۔ جب محفوظ دستے کو طلب کیا گیا تو وہ اپنی اپنی رجمنٹوں کی تلاش میں تھے جو پہلے ہی محاذ پر جا چکی تھیں۔ توپوں کے لیے بیڑیاں پورے فرانس میں بمشکل دستیاب ہو رہی تھیں۔ ابھی جنگ شروع ہوئے پندرہ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ جرمن کی تین ڈویژن فوج (جس میں تین لاکھ سے زائد سپاہی شامل تھے)' سارلینڈ اور السا کی جانب پیش قدمی کرنے لگی۔ فرانس کی چیس پوٹ رائفل کی ساری کارکردگی پروشیا کی آگ برسانے والی توپ کے آگے دھری کی دھری رہ گئی۔ میٹریلیوز نامی مشین گن کو پچھلی قطار میں رکھا گیا تھا' چنانچہ وہ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکی۔ مارشل بازین کی سستی اور نااہلی کا ذکر ہی فضول ہے۔ خود نپولین کون سا بہتر تھا۔ اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ پروشیا کے فوجی یونٹوں نے غلطی پر غلطی کا ارتکاب کیا اور گھمسان کی جنگ میں انھیں شدید نقصان پہنچا۔ مولٹک نے فاصلے سے جس طرح فوجیوں کی رہنمائی کی اور حالات سے بہتر نتائج حاصل کرنے کی جو تدبیریں اختیار کیں اس نے حملے کی شدت کو برقرار رکھا تا آنکہ افواج فرانس ٹوٹنے لگیں۔ اگرچہ جمہوری فوجیں مزید چند ماہ مقابلہ جاری رکھ سکتی تھیں' لیکن ادھر جرمنی نے پیرس اور شمال مشرقی فرانس کے اردگرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے میں لوائر کی فوج کا جوابی حملہ اور فرانسیسیوں کی دیگر مزاحمتی کارروائیاں بے سود ثابت ہوئیں۔ چنانچہ یہ حقیقت اب عیاں ہو گئی کہ فرانس ایک آزاد بڑی طاقت کی حیثیت سے پارہ پارہ ہو چکا تھا۔

پروشیا اور جرمنی کو ان کے فوجی نظام کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی تھی لیکن میکائیل ہوورڈ کے الفاظ میں "کسی ملک کا فوجی نظام سماجی نظام سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ اسی کا جزو ہوتا ہے"۔ جرمن فوج کے رواں دواں وسیع اور جنرل اسٹاف کے مرتب شدہ عسکری نقشے کے پس پردہ ایک ایسی قوم نمایاں تھی جو کسی بھی یورپی ملک کے مقابلے میں جدید اسلحے سے اچھی طرح لیس تھی اور جنگ کے جدید طریقے سے پوری طرح آشنا بھی! علاوہ ازیں ۱۸۷۰ء میں جرمنی کی مشترکہ ریاستوں کی آبادی فرانس سے کہیں زیادہ تھی۔ البتہ اتحاد کے فقدان نے اسے ضعف پہنچایا تھا۔ جرمنی میں ریلوے لائن میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں فوجی مقاصد پورے کرنے کے اعلیٰ انتظامات کیے گئے تھے۔ اس ملک کی قومی مجموعی پیداوار اور لوہے اور فولاد کی مصنوعات فرانس سے زیادہ تھیں۔ وہاں کوئلہ دوسرے یورپی ممالک کے مقابلے میں ڈھائی گنا زیادہ پیدا ہوتا تھا اور اس کا استعمال موجودہ ایندھنی وسائل سے پچاس فی صد زیادہ تھا۔ جرمنی میں صنعتی انقلاب کے نتیجے

میں بڑے وسیع پیمانے پر صنعتیں لگ رہی تھیں۔ اسلحے کے کارخانے بھی نصب کیے گئے تھے۔ اس سے پروشیا کی فوجی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ فوج میں قلیل المدتی ملازمت کا نظام آزاد پسند طبقے کو پسند نہ تھا اور اسی طرح "پروشیا کی عسکریت" پر بھی انہی دنوں تنقید ہوتی رہی' لیکن جب جنگ کا آغاز ہوا تو قوم جوق در جوق اس مقصد کے لیے بھرتی ہونے لگی۔ ایسی مثال مغرب کے سرکاری نظام یا پس ماندہ مشرق میں نہیں ملتی۔ پھر ان تمام عوامل کے پس پردہ ایک ایسی قوم جلوہ گر تھی جس میں اعلیٰ درجے کی ابتدائی اور تکنیکی تعلیم کا رواج تھا۔ وہاں کی یونیورسٹی اور سائنسی تعلیم کے ادارے اپنی مثال آپ تھے۔ کیمیکل لیبارٹریاں اور تجربہ گاہیں بھی لاجواب تھیں۔

اس وقت کے ایک طنزیہ جملے کو دہراتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ "یورپ نے استانی تو ہاتھ سے کھو دی تھی البتہ ایک ماسٹر حاصل کر لیا تھا"۔ بسمارک کی قیادت میں دنیا کی بڑی طاقتوں کی باگ ڈور ۱۸۷۰ء کے بعد کامل دو عشروں تک جرمنی کے ہاتھ میں رہی۔ اس وقت کے سفارت کار یہ کہا کرتے تھے کہ "سارے راستے برلن کو جاتے ہیں"۔ تاہم اکثر لوگ یہ محسوس کریں گے کہ شاہی چانسلر کی چالاکی اور کھردرا پن ہی ایسی صفت نہ تھی جس نے جرمنی کو براعظم یورپ کی ایک اہم طاقت بنا دیا بلکہ یہ جرمنی کی صنعت اور ٹیکنالوجی تھی جس نے متحدہ جرمنی میں ترقی کے مدارج نہایت تیزی سے طے کیے۔ جرمنی کے استحکام و عروج میں سائنس' تعلیم' انتظامیہ اور پروشیا کی موثر فوج کا بھی حصہ تھا۔ جرمنی کی دوسری پارلیمنٹ میں بہت سے نقائص تھے جن پر بسمارک مستقل پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا۔ لیکن ملک کے یہ اندرونی نقائص بیرونی مبصرین کے علم میں شاذو نادر ہی آتے تھے۔ یورپ کی ہر قوم' حتیٰ کہ الگ تھلگ رہنے والے اہل برطانیہ بھی اس نئی وسیع سلطنت کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ اہل روس بھی' جو ۷۰-۱۸۷۱ء کی جنگ کے دوران غیر جانب دار رہے تھے اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بحر اسود میں اپنی پوزیشن مضبوط کر رہے تھے' اس بات پر سخت جھنجلائے ہوئے تھے کہ یورپی اقتدار کا محور اب برلن بن چکا ہے۔ وہ اس تشویش میں بھی مبتلا تھے کہ جرمنی کا اگلا قدم نہ جانے کیا ہوگا۔ اٹلی جس نے ۱۸۷۰ء میں روم پر قبضہ کر لیا تھا اور فرانس جسے لورین میں شکست ہوئی تھی' دونوں برلن کی جانب بتدریج مائل ہو رہے تھے۔ یہی صورت حال آسٹریا - ہنگری کی سلطنتوں کی بھی تھی' (واضح رہے کہ ۱۸۶۷ء کے معاہدہ ویانا کے تحت یہ نام اختیار کیا گیا تھا) جو یہ امید لیے بیٹھی تھیں کہ جرمنی اور اٹلی میں اس کے ہاتھ سے نکلے ہوئے علاقوں کی تلافی بلقان میں کر دی جائے گی۔ لیکن اسے یہ احساس بھی بخوبی تھا کہ اس نوع کی خواہش سے روس کا شدید رد عمل بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ ادھر صدمے سے نڈھال فرانس نے یہ ضروری خیال کیا کہ حکومت اور معاشرے کا از سر نو جائزہ لے کر اصلاحی اقدامات کیے جائیں مثلاً" تعلیم' سائنس' ریلوے' مسلح افواج اور اقتصادیات کے شعبوں میں! لیکن رھائن کے اس پار ایک طاقتور پڑوسی سے مسابقت کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ بہرحال ۱۸۷۰ء کا سال مذکورہ دور اور بعد کے آنے والے ایام میں یورپی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۸۶۰ء کے پورے عشرے میں جو ہنگامہ آرائی رہی' اس کے نتیجے میں بے شمار ملکوں نے سکھ کا سانس لینا چاہا۔ پھر نئے عالمی نظام میں سیاسی مدبرین پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء کے

بعد کے عشرے میں بڑی طاقتوں کی سفارت کاری کی تاریخ استحکام کی متلاشی نظر آتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ خانہ جنگی کے بعد تعمیر و ترقی کے اقدامات میں مصروف تھا اور جاپان "انقلاب میجی" کے مضمرات سے نبرد آزما ہونے میں لگا ہوا تھا' لہٰذا اس نئے نظام میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا جو سراسر مرکزی یورپ کے محور پر گھوم رہا تھا۔ اگرچہ یورپی پنچایت اپنی نئی شکل ہیئت میں موجود تھی' لیکن طاقت کا توازن ان ملکوں کے حق میں جھک گیا تھا جو ۱۸۱۵ء کے بعد قائم و دائم رہے۔ اب ایک کمزور پروشیا کی جگہ پروشیا - جرمنی کی ریاست وجود میں آ گئی تھی جو بسمارک کی قیادت میں یورپ کی نہایت مستحکم اور موثر حکومت قرار پا چکی تھی۔ متحدہ اطالیہ بھی الگ ایک طاقت تھی لیکن اپنی اقتصادی پست حالی (خصوصاً" کوئلہ کی پیداوار میں) کی وجہ سے اسے بڑی طاقتوں کے زمرے میں کبھی شامل نہیں کیا گیا' حالانکہ یورپی سفارت کاری میں یہ ملک دیگر ممالک' خصوصاً" اسپین یا ہالینڈ سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ چونکہ بحیرہ روم اور شمالی افریقہ تک اس کی رسائی ہو چکی تھی' لہٰذا اس ملک نے فرانس کے ساتھ نزاعی رویہ اختیار کر لیا۔ آخر الذکر کے اقتدار کو زک پہنچانے کے ساتھ ساتھ جرمنی کی جانب دست تعاون بڑھانے لگا۔ دوسرے' ویانا کے ساتھ اپنی جنگ آزادی کے نتیجے میں اور مغربی بلقان میں اپنے مفادات کے پیش نظر اٹلی آسٹریا - ہنگری کو بھی پریشان کرنے لگا۔ (یہ صورت ۱۸۸۲ء تک برقرار رہی تاآنکہ بسمارک نے آسٹریا - جرمنی - اٹلی کا اتحاد ثلاثہ قائم کر کے بحران کو ختم کر دیا)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو آسٹریا - ہنگری اور نہ ہی فرانس' جو جرمنی کے عروج کی وجہ سے گھاٹے میں رہے تھے' اپنی پوری توانائی برلن کی نذر نہیں کر سکے۔ یہ اس لیے تھا کیونکہ ان دونوں ریاستوں کی پشت پر اٹلی جیسا قد آور ملک تھا۔ پھر جہاں آسٹریا نے جرمنی کے ساتھ سمجھوتہ کر لینا مناسب سمجھا اور اس کے نتیجے میں اس کی ایک طفیلی ریاست بن جانا قبول کر لیا' وہاں فرانس کی قومی غیرت اور اتحاد کی طاقت برلن کے خلاف استعمال ہوئی۔ اس کی تمام تر وجہ ایک ناقابل یقین اور تشدد پسند ملک اٹلی اس کے جنوب میں واقع تھا۔

فرانس علیحدہ کھڑا تھا۔ آسٹریا - ہنگری ڈرے سہمے سے تھے۔ جنوبی جرمنی اور اٹلی کی "بفر ریاستیں" اپنے وسیع قومی یونٹوں میں ضم ہو چکی تھیں۔ اب جرمنی کی متوقع زیادتیوں کو روکنے والی صف اول کی آزاد طاقتیں روس اور برطانیہ کی رہ گئی تھیں۔ برطانوی انتظامیہ گلیڈ سٹون کی ملکی اصلاحات (۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۴ء) اور ڈزرائیل کی "شہنشاہیت" اور "ایشیائی" نام و نمود کی پالیسی (۱۸۷۴ء تا ۱۸۸۰ء) کے درمیان معلق ہو کر رہ گئی تھیں' چنانچہ اس لیے یورپ میں توازن کی برقراری کا مسئلہ شاذ و نادر ہی سوہان روح بنا۔ یہ صورت حال روس میں نہ تھی۔ چانسلر گورچا کوف اور دیگر زعما نے اپنی حاشیہ نشیں ریاست پروشیا کے ایک طاقتور ملک جرمنی میں ضم ہو جانے پر واویلا مچایا۔ لیکن اس نوع کے احساسات جلد ہی ختم ہو گئے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ۱۸۷۱ء کے بعد سینٹ پیٹر برگ اور پوسٹڈیم کی حکومتوں کے مابین خاندانی اور نظریاتی ہم آہنگی قائم ہو چکی تھی۔ دوسرے' روس جنگ کریمین کے مضمرات سے نکلنے کی تگ و دو میں ہنوز مصروف تھا۔ تیسرے روس کو امید تھی کہ اسے بلقان سے وابستہ اپنے مفادات کے سلسلے میں جرمنی کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔ آخری یہ کہ وسط ایشیا میں روس پھر سے دلچسپی لینے لگا تھا بہرحال' مغربی و وسطی یورپ میں

بڑی طاقتوں کی مداخلت کا انحصار تمام تر جرمنی کے اقدام پر تھا۔ پھر ان ملکوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر جرمنی
کی دوسری پارلیمنٹ اپنے حال میں مست ہے تو پھر مداخلت کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔
۱۸۷۱ء کے بعد کچھ اسی قسم کی یقین دہانی جرمنی کا وزیراعظم بسمارک کراتا رہا تھا۔ دراصل وہ
ایک "عظیم جرمنی" تخلیق کرنے کا مطلق خواہشمند نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس نوع کی ریاست بنے
جس میں آسٹریا کے لاکھوں کیتھولک لوگوں کو مدغم کرنا پڑے، جس کے قیام کی وجہ سے آسٹریا۔ ہنگری
سلطنت ختم ہو جائے اور جرمنی کینہ پرور فرانس اور روس جیسے شکی مزاج ملک کے درمیان تنہا کھڑا رہ
جائے۔ چنانچہ اس نے بہتری اسی میں سمجھی کہ تین سلطنتوں پر مبنی ایک لیگ قائم کی جائے۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء
میں اس کی تشکیل عمل میں آئی۔ یہ بظاہر ایک اتحاد تھا جس نے مشرقی سلطنتوں کے نظریاتی استحکام پر زور دیا
تھا (فرانس کی جمہوریہ کے برعکس) اور بلقان سے وابستہ مفادات میں آسٹریا۔ روس کے باہمی جھگڑے کو ختم
کرنے کی سعی کی تھی۔ جب ۱۸۷۵ء میں جنگ کا ہوا کھڑا ہوا، اس وقت یہ انکشاف ہوا کہ جرمنی فرانس کے
خلاف ایک مداخلتی جنگ کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس وقت بسمارک کو لندن اور خصوصاً سینٹ پیٹرز برگ
سے جو دھمکی موصول ہوئی، اس نے وزیراعظم کو اس بات کا قائل کر دیا کہ اگر یورپ کے توازن میں مزید
کوئی تبدیلی ہوئی تو اس کی سخت مخالفت کی جائے گی۔ چنانچہ اندرونی سیاست اور بیرونی سفارت کاری کے
اسباب و عوامل کے پیش نظر جرمنی ۱۸۷۱ء کی قائم شدہ سرحدوں کے اندر ہی رہا۔ بعض مورخوں کی نظر میں
اس وقت اس ملک کی حیثیت "منصف تیارتی طاقت" کی سی تھی تا آنکہ اپنی فوجی صنعت کی ترقی اور سیاسی
جذبے کے تحت جرمنی نے سر اٹھایا اور سرحدوں کی حدبندی کے خلاف مورچہ سنبھال لیا۔

تاہم، اس تبدیلی کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں اگلے باب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء
کے عشروں کے دوران بسمارک کی دور اندیش سفارت کاری نے "حالت قائمہ" کو برقرار رکھنا ہی ضروری
سمجھا تھا۔ اب جرمنی کے مفادات کے پیش نظر وہ اسے ہر صورت میں قائم رکھنا چاہتا تھا۔ چانسلر کو اس مہم
کے لیے جلد ہی ایک موقع مل گیا۔ ۱۸۷۶ء میں ایک پرانا مشرقی قضیہ پھر اٹھ کھڑا ہوا جب ترکی نے بلغاریہ
کے عیسائیوں کا قتل عام کیا اور روس نے فوج کے ذریعے جوابی اقدام کیا۔ اس طرح سب کی توجہ رھائن
سے قسطنطنیہ اور بحر اسود کی جانب مبذول ہو گئی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ڈینیوب کے نشیبی علاقے یا ڈار
ڈنلس میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھنے سے جرمنی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ پھر یہی فساد بڑھ کر بڑی طاقتوں
کی باہمی جنگ بن سکتا تھا اور ۱۸۷۸ء کے اوائل میں اس بات کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ تاہم،
بسمارک نے اپنی سفارت کارانہ صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے اس معاملے میں ایک "مخلص دلال" کا
کردار ادا کیا۔ اس نے تمام طاقتوں کو "اجلاس برلن" میں مدعو کیا۔ ان سبھوں کو آپس میں سمجھوتہ کر لینے پر
آمادہ کیا۔ اس نے بحران کے پر امن حل پر زور دیا۔ اس نے یہ حقیقت بھی واضح کی کہ یورپی معاملات میں
جرمنی کو ایک مرکزی اور مستحکم کرنے والی پوزیشن حاصل ہے۔

بایں ہمہ، ۱۸۷۶-۷۸ء کے بہت بڑے مشرقی بحران سے جرمنی کی متعلقہ پوزیشن بھی متاثر
ہوئی۔ اگرچہ روس کے چھوٹے بحری بیڑے نے بحر اسود میں ترکوں کے خلاف اچھی کارکردگی کا ثبوت دیا۔

لیکن ۱۸۷۷ء میں روس کی بری فوج کی کارکردگی سے یہ اندازہ ہوا کہ جنگ کریمین کے بعد جو فوجی اصلاحات
وہاں نافذ ہوئیں ان کا چنداں اثر ان سپاہیوں پر نہیں ہوا تھا، اگرچہ روسی فوجیوں نے اپنی بہادری اور وسعت
تعداد کی بدولت بلغاریہ اور ترکی محاذوں پر مقابلے میں فتح حاصل کی تھی، اس کے باوجود ان میں بہت سی
خامیاں بھی تھیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ انہیں اپنے دشمنوں کے ٹھکانے اور پیش قدمی کا صحیح علم
نہیں ہوتا تھا۔ یونٹوں کے درمیان رابطے کا فقدان تھا۔ پھر یہ کہ فوج کے اعلیٰ افسران میں افراتفری بھی پائی
جاتی تھی۔ اس پر افتاد یہ ہوئی کہ برطانیہ اور آسٹریا نے ترکی کی حمایت میں مداخلت کی دھمکی دے دی۔ روس
چونکہ دیوالیہ ہونے کے قریب تھا، لہٰذا ۱۸۷۷ء کے اواخر میں اپنی پیش کردہ شرائط کے مطابق صلح کرنے پر
راضی ہو گیا۔ اگر اتحاد سلافی کے علمبرداروں نے آگے چل کر بسمارک پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہی برلن
کانفرنس کا کرتا دھرتا تھا اور اسی کی وجہ سے یہ ذلت آمیز صورتیں ہوئیں تو یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ
سینٹ پیٹرز برگ کے بہت سے شرفا پہلے سے کہیں زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ برلن کے ساتھ
اچھے تعلقات قائم کرنے ضروری ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ۱۸۸۱ء میں نئے انداز سے تینوں شہنشاہوں کو
ایک ڈوری میں بندھ جانا چاہیے۔ جب ۱۸۷۹ء میں بحران انتہائی شدید تھا، تو ویانا نے بسمارک کے کنٹرول
سے نکل جانے کی دھمکی دے دی لیکن اسی سال جب آسٹریا اور جرمنی میں خفیہ اتحاد قائم ہو گیا تو ویانا پھر
جرمنی کی ڈوری سے بندھ گیا۔ اسی طرح ۱۸۸۱ء میں تین شہنشاہوں کا اتحاد رو بہ عمل آیا۔ پھر، ۱۸۸۲ء میں
برلن، ویانا اور اٹلی کے مابین اتحاد ثلاثہ قائم ہو گیا۔ یہ تمام معاہدے فرانس سے دور تحریر کیے گئے اور ان پر
دستخط ہوئے اور کسی نہ کسی حد تک یہ سب جرمنی کے مرہون منت تھے۔

۱۸۷۰ء کے آخری عشرے میں رونما ہونے والے واقعات نے انگلستان اور روس کے مابین پرانی
رقابت کو مشرق قریب اور ایشیا میں پھر سے ہوا دے دی تھی۔ چنانچہ دونوں نے جرمنی سے غیر جانب دار
رہنے کی درخواست کی اور عوام کی توجہ السیک۔ لورین اور وسطی یورپ سے دوردراز علاقے کی طرف
مبذول کر دی۔ یہ رجحان ۱۸۸۰ء کے عشرے میں اور بھی مستحکم ہو گیا جب واقعات کی سیریز نے "نئی
شہنشاہیت" کے عہد شروع ہونے کی نشاندہی کر دی، مثلاً "تیونس پر فرانس کا قبضہ (۱۸۸۱ء)، مصر میں برطانیہ
کی مداخلت (۱۸۸۲ء)، افریقہ کے لیے زبردست کش مکش (۱۸۸۴ء و بعدہ)، افغانستان میں روس اور برطانیہ کی
جنگ کی نئی دھمکی (۱۸۸۵ء)۔ مغربی نوآبادیات کے ازسرنو قیام کے طویل المیعاد اثرات سے بہت سی بڑی
طاقتوں کی پوزیشن میں تبدیلی رونما ہونے والی تھی۔ اسی طرح اس کے قلیل المیعاد اثرات کے نتیجے میں جرمنی
کا سفارتی اثر و رسوخ یورپ میں قائم ہو گیا اور اس طرح بسمارک کو حالت قائمہ برقرار رکھنے میں پوری
پوری مدد ملی۔ اگرچہ ۱۸۸۰ء کے عشرے میں اس نے معاہدے اور جوابی معاہدے کا جو ایک پیچ دار سلسلہ
قائم کیا تھا، اس سے قطعاً "استحکام پیدا نہیں ہوا تھا، تاہم اس سے اتنا اثر ضرور ہوا کہ مستقبل قریب میں
یورپی طاقتوں کے درمیان امن و امان کی فضا برقرار رہی۔

نتائج

۱۸۱۵ء سے ۱۸۸۵ء تک کے عرصے میں امریکی خانہ جنگی کو چھوڑ کر کوئی طویل اور مسلسل کر

دینے والی لڑائی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے کی چھوٹی چھوٹی محاذ آرائی' مثلاً" ۱۸۵۹ء میں فرانس اور آسٹریا کی لڑائی' ۱۸۷۷ء میں ترکوں پر روس کی یلغار نے بڑی طاقت کے نظام کو چنداں متاثر نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض مشہور لڑائیں بھی کئی صورتوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ جنگ کریمین محض ایک علاقائی جنگ تھی۔ قبل اس کے کہ برطانیہ اپنے وسائل کو پوری طرح بروئے کار لائے' یہ لڑائی ختم ہو گئی۔ اسی طرح آسٹریا و پروشیا اور فرانس و پروشیا کی جنگیں بھی وقتی نوعیت کی تھیں اور اٹھارھویں صدی کی طویل ترین محاذ آرائیوں کے بالکل ہی برعکس تھیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ فوجی ماہرین اور حکمت عملی کے مرد میدان مستقبل میں بڑی طاقتوں کے مابین جن بڑی لڑائیوں کا تصور کیے بیٹھے تھا' وہ ۱۸۷۰ء میں تیز تر مقابلہ آرائی کی جنگ تھی ---- یعنی ریل اور دیگر مواصلات کا نظام الاوقات' سرعت کے ساتھ حملہ کرنے کے لیے جنرل اسٹاف کی منصوبہ بندی' جلد فائر کرنے والی بندوقیں اور حرکت میں آنے والی فوج' مختصر المدتی لشکر ---- ان تمام عناصر کو آپس میں یکجا کرنے کا خیال تاکہ چند ہفتوں کے اندر اندر دشمنوں کا صفایا کیا جا سکے۔ یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ نئے اور سرعت کے ساتھ فائر کرنے والے اسلحوں کا اگر صحیح طریقے سے استعمال ہو تو حملہ کرنے کی بجائے دفاع کرنے میں یہ مفید ثابت ہوں گے۔ ایسے تصورات کی اس وقت پذیرائی نہیں ہوئی۔ افسوس کہ امریکی خانہ جنگی کے دوران بھی یہ تصور مفقا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ وجدال کے مروجہ اصول و ضوابط پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس خانہ جنگی کو طوفانی بھی بنا دیا گیا اور تباہ کن بھی اور یہ آج کی مختصر ترین' تیز تر یورپی جنگ کے بالکل برعکس تھی۔

تاہم ان تمام لڑائیوں سے ---- چاہے وہ وادی ٹیسی میں لڑی گئی ہوں یا بوہیمیا کے میدان میں' جزیرہ نمائے کریمیا میں برپا ہوئی ہوں یا لورین کے میدانوں میں ----- ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جن طاقتوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا' وہ دراصل مندرجہ ذیل امور کو بروئے کار لانے میں ناکام رہی تھیں۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں رونما ہونے والے فوجی انقلاب سے استفادہ کرنے' نئے اسلحوں کا استعمال میں لانے' مسلح اور سرعت کے ساتھ نقل و حرکت کرنے والی بڑی بڑی فوجیں تشکیل کرنے' ریلوے' دخانی جہاز اور ٹیلیگرام کی سہولیات سے فائدہ اٹھانے اور نفع بخش صنعتوں کا قیام عمل میں لانے! مذکورہ تمام جنگوں میں فتح پانے والے فریق کے جرنیلوں اور فوجی افسروں سے اکثر و بیشتر فاش غلطیاں سرزد ہوا کرتیں' لیکن وہ لوگ تربیت یافتہ افرادی قوت' ترسیل' تنظیم اور اقتصادی استحکام جیسی سہولتوں کو کبھی بھی صرف نظر نہیں کرتے تھے۔

اب ہم ۱۸۶۰ء کے بعد کے عرصے کے متعلق حتمی رائے قائم کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس باب کے آغاز میں کہا گیا ہے' واٹرلو کی جنگ کے بعد کی نصف صدی چند خصوصیات پر مشتمل تھی۔ مثلاً" بین الاقوامی اقتصادیات میں بتدریج ترقی ---- صنعتی انقلاب اور تکنیکی تبدیلی کی وجہ سے وسیع پیمانے پر مصنوعات کی فراہمی' بڑی طاقت کے نظام کا تناسب اور مختصر ترین اور مقامی نوعیت کی لڑائیوں کا انعقاد! علاوہ ازیں اگرچہ بری اور بحری فوج کے اسلحے میں کچھ جدت پیدا کی گئی تھی' لیکن بحیثیت مجموعی مسلح افواج نئی نئی حربی ٹیکنالوجی سے کم ہی مستفید ہوئی تھیں۔ اس کے برعکس' صنعتی انقلاب اور آئینی و سیاسی اصلاحات کے نتیجے

میں عام انسان زیادہ مستفیض ہوئے۔ نصف صدی کی اس تبدیلی سے سب سے زیادہ برطانیہ نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اپنی پیداواری صلاحیت اور عالمی وقار دونوں لحاظ سے یہ ملک ۱۸۶۰ء کے آخری عشرے میں امتیازی مقام حاصل کر چکا تھا۔ (اگرچہ گلیڈ سٹون کی وزارت اول کے دور میں ان حقائق کی نفی بھی کی گئی تھی۔) اس تبدیلی سے فائدہ نہ اٹھانے والا غیر یورپی طبقہ تھا۔ جو صنعت و حرفت سے محروم اور زراعتی معاشرے کا امین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ پس ماندہ معاشرہ نہ تو صنعتی مصنوعات کی مزاحمت کے قابل تھا اور نہ ہی مغرب کی فوجی یلغار کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا تھا۔ ان ہی اسباب و عوامل کے نتیجے میں یورپ کے کم صنعت یافتہ ممالک' مثلاً" روس' سلطنت ہیسبرگ وغیرہ اپنی مقبوضات کھونے لگے۔ اور ایک نئی متحدہ ریاست اٹلی صف اول میں اپنی جگہ بنانے سے قاصر رہی۔

علاوہ ازیں' ۱۸۶۰ء کے عشرے کے بعد سے یہ رجحانات پھیلتے چلے گئے۔ عالمی تجارت اور ساتھ ہی ساتھ مصنوعات میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ صنعت سازی جو قبل ازیں' برطانیہ' براعظم یورپ کے بعض علاقے اور شمالی امریکہ تک محدود تھی' دوسرے خطوں تک پہنچ گئی۔ خصوصی طور پر مستفیض ہونے والوں میں جرمنی کا ملک تھا جو ۱۸۷۰ء میں دنیا کی صنعتی پیداوار کے ۱۳ فی صد حصے کا مالک تھا۔ اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی تھا جس کا مجموعی پیداوار میں ۲۳ فی صد حصہ تھا۔ غرض' انیسویں صدی کے اواخر میں جو عالمی نظام فروغ پا رہا تھا' اس کی خصوصیات واضح اور روشن تھیں اگرچہ چند ہی مبصرین نے ان کا صحیح ادراک کیا ہے۔ دوسری جانب' ۱۸۱۵ء کے بعد کے "کنسرٹ سسٹم" کی متناسب اور مستحکم "پنچایت" اپنا وجود کھوتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ محض یہی نہ تھی کہ اس کے اراکین چند دہائی پہلے کی نسبت ۱۸۶۰ء کے عشرے میں آپس میں لڑنے کے شدید خواہش مند تھے۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ ان ملکوں میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں دو یا تین گنا زیادہ طاقت ور ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں' یورپ کو جدید صنعتی پیدوار میں جو اجارہ داری حاصل تھی وہ بحراوقیانوس کے علاقے میں ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی بھی معاشرہ حسب خواہش اور بصورت آزادی دخانی طاقت' ریل' بجلی اور دیگر جدید سازو سامان سے فیضیاب ہو سکتا تھا۔

۱۸۷۱ء کے بعد کے عرصے میں کوئی اہم جنگ وقوع پزیر نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں بسمارک نے یورپی سفارت کاری کی قیادت کی تھی۔ ان اوامر سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کے عشروں کے انتشار و پراگندگی کے بعد ایک نیا توازن قائم ہو چکا ہے۔ تاہم' فوجیوں' بحریوں اور بیرونی دفتروں سے دور ----- دور رس قسم کی صنعتی و تکنیکی ترقی بھی فروغ پا رہی تھی۔ ان سے عالمی اقتصادی توازن نہایت تیزی سے بدلتا جا رہا تھا۔ اور وہ دن دور نہیں تھا جب صنعت و حرفت کی یہ تبدیلی فوجی صلاحیتوں اور خارجہ پالیسیوں پر اپنے اثرات مرتب کرنے والی تھی۔

۵

دو قطبی دنیا کا وجود اور درمیانی درجے کی طاقتوں کا بحران

حصہ اول: ۱۸۸۵ء ـــ ۱۹۱۸ء

۱۸۸۴ـ۵ء کے موسم سرما میں دنیا کی بڑی طاقتیں چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ہمراہ برلن میں اکٹھا ہوئی تھیں۔ ان کی ملاقات کے مقصد یہ تھا کہ تجارت' جہاز رانی' مغربی افریقہ اور کانگو کے مابین سرحدوں کے تصفیے اور افریقہ میں باقاعدہ قبضے کرنے کے اصول و قواعد کے متعلق ایک معاہدہ عمل میں آئے۔ کئی وجوہات کی بنا پر برلن کی مغربی افریقی کانفرنس عالمی معاملات میں قدیم یورپ کی بالادستی کا مظہر معلوم ہوتی تھی۔ جاپان کانفرنس کا رکن نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی تیز رفتار جدیدیت کے باوجود مغربی ممالک کی نظر میں یہ ایک پس ماندہ ملک تھا۔ اس کے برعکس' ریاست ہائے متحدہ امریکہ برلن کانفرس میں موجود تھا۔ چنانچہ تجارت اور جہاز رانی کے موضوع پر جو گفتگو ہوئی اسے واشنگٹن نے امریکہ کے خارجی مفادات کے عین مطابق پایا۔ لیکن دیگر معاملات میں امریکہ بین الاقوامی منظر سے غائب رہا یہ تو ۱۸۹۲ء کی بات ہے جب یورپ کی بڑی طاقتوں نے واشنگٹن میں متعین اپنے اپنے سفارت کاروں کا عہدہ وزیر سے بڑھا کر سفیر کا کر دیا۔ گویا اس طرح انھوں نے امریکہ کو صف اول کا ملک تسلیم کر لیا تھا۔ روس بھی اس کانفرنس میں موجود تھا۔ ایشیا سے اس کی دلچسپی تو حق بجانب تھی' لیکن اسے افریقہ سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کانفرنس کے مندوبین کی دوسری فہرست میں روس کا نام شامل تھا۔ اس نے وہاں کوئی خاص کردار بھی انجام نہیں دیا سوائے اس کے کہ برطانیہ کی مخالفت میں فرانس کی حمایت کی تھی۔ کانفرنس کا ایجنڈا معاملات ثلاثہ پر مشتمل تھا' یعنی لندن' پیرس اور برلن کے درمیان تعلقات! بسمارک سب کے درمیان ایک اہم پوزیشن پر براجمان تھا۔ حالات کا رخ ویسا ہی تھا جیسا اس سے پہلے کی صدی میں تھا ـــــ یعنی یورپ کی وزارت عظمٰی کے ہاتھوں میں!۔ یہ بات یقینی تھی کہ اگر مذکورہ کانفرنس وادی کانگو کی بجائے سلطنت عثمانیہ کے متعلق فیصلہ کر دیتی تو آسٹریا ـ ہنگری اور روس جیسے ممالک کو اہم کردار ادا کرنے کا موقع مل جاتا۔ بہرکیف' اس دور کی اس حقیقت کو تو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ "یورپ ساری دنیا کا مرکز بنا ہوا ہے"۔ اسی زمانے میں روسی جرنیل ذراگی میروف نے اعلان کیا تھا:

"مشرق بعید کے تمام معاملات یورپ میں طے کیے جاتے ہیں"۔

اگلی تین دہائیوں کے دوران ـــــ یعنی بڑی طاقت کا نظام میں نسبتاً" مختصر مدت ـــــ یعنی براعظم یورپ خود کو چیرنے پھاڑنے لگا تھا اور اس کے کئی ممالک روبہ زوال تھے۔ پھر تین عشرے بعد' خاتمے کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ براعظم کا زیادہ تر حصہ اقتصادی لحاظ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ بعض خطے مسمار ہونے کے قریب تھے۔ لطف یہ کہ اس کے مستقبل کا فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو واشنگٹن اور ماسکو میں بیٹھے تھے۔

جہاں ۱۸۸۵ء میں ایسا کوئی بھی نہ تھا جو ساٹھ سال بعد یورپ میں ہونے والی تباہی و بربادی کی

پیش گوئی کرتا' وہاں کچھ دور اندیش مبصر موجود تھے جنھوں نے حالات کے رخ کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ دانشوروں' صحافیوں اور سیاست دانوں نے باہمی رسہ کشی' کامیابی' ناکامی' ترقی اور زوال کی کہانی رقم بھی کی اور سنائی بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مستقبل کے عالمی نظام کی ہیئت کم از کم ۱۸۹۵ء یا ۱۹۰۰ء میں معلوم ہو چکی تھی۔

مذکورہ پیش گوئی کے مطابق ڈی ٹاکویل کا یہ خیال صحیح ثابت ہونے والا تھا کہ مستقبل میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس ہی دنیا کی دو بڑی طاقتیں ہوں گی۔۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مذکورہ خیال اس وقت کالعدم ہو چکا تھا جب روس کو جنگ کریمین میں تباہی کا سامنا کرنا پڑا' یا جب روس ۱۸۷۷ء میں ترکوں کے بالمقابل بودا ثابت ہوا یا جب امریکہ خانہ جنگی کی آگ میں جلتا رہا اور جب کئی دہائیوں تک کچھ تعمیری اقدامات کیے جاتے رہے اور مقبوضات کی توسیع کا جذبہ پلتا رہا۔ بہرحال' انیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ کی صنعتی و زراعتی ترقی اور ایشیا میں روس کے فوجی اقدامات کو دیکھ کر بہت سے یورپی مبصرین کو تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ وہ بیسویں صدی کے ایسے عالمی نظام کی وجہ سے فکر مند تھے جہاں بقوال شخصے یا تو روس کا تازیانہ ہو گا یا پھر امریکہ کی تجوری! چونکہ نئے نئے تجارتی تصورات دنیا کی آزادانہ اور پرسکون فضا پر دوبارہ چھائے جا رہے تھے' لہٰذا یہ دلیل پہلے سے کہیں زیادہ وزنی معلوم ہوتی جا رہی تھی کہ اقتصادی طاقت میں تبدیلی سیاسی اور علاقائی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ حتیٰ کہ برطانیہ کے حد سے زیادہ محتاط وزیراعظم لارڈ سلسبری نے ۱۸۹۸ء میں یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ دنیا "زندہ" اور "مردہ" طاقتوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ ۱۸۹۴ـ۵ء میں جاپان کے ساتھ ہونے والی جنگ میں چین کی شکست' ۱۸۹۸ء میں مختصر ترین جنگ کے دوران ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہاتھوں اسپین کی اہانت اور ۱۸۹۸ـ۹ء میں دریائے نیل کے بالائی حصے میں فاشودہ کے قبضے پر برطانیہ کے روبرو فرانس کی پسپائی ـــــ یہ تمام واقعات اس حقیقت کی غمازی کر رہے تھے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو گی وہی ملکوں اور جانوروں کے مقدر کا مالک ہو گا۔ واضح رہے کہ بڑی طاقتوں کی یہ لڑائیاں محض یورپ کے معاملات سے متعلق نہ تھیں' جیسا کہ ۱۸۳۰ء یا ۱۸۶۰ء میں اس کی مثال ملتی ہے' بلکہ یہ جھگڑے فساد منڈیوں اور علاقوں کے حوالے سے ہوتے تھے اور یہ سلسلہ اقصائے عالم میں پھیلا ہوا تھا۔

اگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس اپنے حدود اربعہ اور آبادی کی بدولت مستقبل کی بڑی طاقتیں بننے والی تھیں' تو ان کا ساتھ کو دیتا؟ "تین عالمی سلطنتوں کے نظریہ" کے مطابق فقط تین (یا بہ حالت مجبوری چار) نہایت عظیم اور طاقت ور ممالک ہی آزاد ہوں گے۔ شہنشاہی ذہنیت کے سیاست دانوں نے اس خیال کی بڑی تشہیر کی تھی۔ برطانیہ کے وزیر نوآبادیات' جوزف چیمبرلن نے ۱۸۹۷ء میں اپنے ایک مخاطب سے یہ کہا تھا: "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضے کے مطابق ساری طاقتیں عظیم تر سلطنتوں کے ہاتھوں میں دے دینی چاہئیں۔ چھوٹی موٹی بادشاہتیں جو غیر ترقی یافتہ ہیں' دوسرے درجے میں اطاعت گزار بن کر رہیں گی"۔ اسی طرح ایڈمیرل ترپٹز نے قیصر ولیم کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ جرمنی کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یہاں ایک بہت بڑی بحریہ تیار کی جائے تاکہ وہ دنیا کی چار بڑی طاقتوں میں شمار ہو' یعنی

روس' انگلستان' امریکہ اور جرمنی"۔ فرانس کے ولی عہد موسیا دار کی نے متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"فرانس کو بھی صف اول کے مقام پر ہونا چاہئے کیونکہ جو لوگ ترقی کر کے آگے نہیں بڑھتے وہ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ اور جو پیچھے جاتا ہے' وہ معدوم ہو جاتا ہے"۔

برطانیہ' فرانس اور آسٹریا۔ ہنگری جیسی قدیم طاقتوں کے روبرو مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ بین الاقوامی "اسٹیٹس کو" کو درپیش نئے چیلنجوں کی صورت میں خود کو برقرار رکھ سکیں گی۔ ادھر جرمنی' اطالیہ اور جاپان جیسی نئی طاقتوں کا مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ برلن کے خیال کے مطابق "عالمی سیاسی آزادی" کے حصار کو توڑنے میں جلد کامیاب ہو جائیں گی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ انیسویں صدی جیسے جیسے اختتام کو پہنچ رہی تھی ہر انسان اسی سوچ میں غلطاں تھا۔ بہت سے لوگ گھریلو اور سماجی مسائل کے حوالے سے تشویش میں مبتلا تھے۔ بہت سے افراد باہمی خوشگوار تعاون کے آزادانہ خیال کے حامی تھے۔ تاہم' سرکاری افسروں' فوجی حلقوں اور شاہی اداروں میں عالمی نظام کا مروجہ تصور کار فرما تھا جس کے تحت ریاستی طاقت میں اضافے کے لیے جدوجہد تبدیلی' مسابقت' توانائی کا استعمال اور قومی وسائل کی تنظیم ضروری تھی۔ دنیا کے پس ماندہ علاقوں کی نہایت تیزی سے تراش خراش جاری تھی۔ لیکن یہ تو کہانی کا محض آغاز تھا۔ جغرافیائی مدبر سرہال فورڈ میکنڈر نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ مزید چند علاقوں کے الحاق سے جدید ریاستوں کی توجہ توسیعی عزائم کے برعکس وہاں کی فلاح اور ترقی کی جانب مبذول ہو جائے گی۔ وسیع تر جغرافیائی اور تاریخی استحکام کے درمیان نہایت عمیق قسم کا باہمی تعلق قائم ہو گا' یعنی بین الاقوامی توازن میں حجم اور عدد کی صحیح صحیح عکاسی ہوا کرے گی بشرطیکہ ان وسائل کو بحسن و خوبی استعمال میں لایا جائے۔ لاکھوں کسانوں کی آبادی پر مبنی کوئی ملک کسی قطار و شمار میں نہیں ہو گا۔ اسی طرح ایک جدید ریاست بھی گہنا کر رہ جائے گی اگر اس کی بنیاد وسیع صنعتی پیداوار پر استوار نہیں ہو گی۔ برطانیہ کے ایک شاہی رکن لیوامری نے ایک بار متنبہ انداز میں کہا تھا کہ: "کامیاب ترین طاقتیں وہ ہوں گی جہاں زیادہ سے زیادہ صنعتیں لگی ہوئی ہوں گی۔ جو لوگ صنعتی طاقت کے مالک ہوں گے' جن میں ایجاد کا ملکہ ہو گا' جنہیں سائنسی صلاحیت حاصل ہو گی' وہ دوسروں کو بہت پیچھے چھوڑ جائیں گے"۔

اگلی نصف صدی کے دوران بین الاقوامی معاملات مذکورہ پیش گوئیوں کے مطابق تکمیلی مراحل سے گزرنے لگے۔ اندرون اور بیرون یورپ' طاقت کے توازن میں ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی۔ پرانی سلطنتیں نہس نہس ہو گئیں اور نئی حکومتیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گئیں۔ ۱۸۸۵ء کی "کثیر القطبین دنیا" نے ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ "دو قطبی دنیا" میں تبدیل ہو گئی۔ بین الاقوامی جھگڑے شدت اختیار کر گئے۔ اب ایسی جنگیں ہونے لگیں جو انیسویں صدی کی محدود یورپی جنگ سے بالکل مختلف تھیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت ہونے والی صنعتی پیداوار ہی قومی استحکام کا ذریعہ بن گئی۔ مصنوعات میں بین الاقوامی حصص کی تبدیلی کا دارو

مدار فوجی طاقت اور سفارتی اثر و رسوخ پر ہوا کرتا ہے۔ بندوں کو ہنوز گنا جاتا تھا ۔۔۔۔۔ پھر لینن' ہٹلر اور اسٹالن کے دور میں کون کہہ سکتا تھا کہ ایسا نہیں ہوتا؟ ۔۔۔۔۔ لیکن انہیں صرف سیاسی طاقت کی خاطر گنا جاتا تھا' اس لیے کہ وہ ایک بڑی ریاست میں پیداواری عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر' جیسا کہ نازی جرمنی کی اپنی صورت حال سے ظاہر ہوا' جنگ چھڑنے کی عالمی طاقت کا امتحان لینا ایسے ملک کے لیے سراسر ناموزوں تھا جن کے پاس بھرپور صنعتی اور تکنیکی صلاحیت موجود نہ تھی اور نہ ہی وافر مقدار میں فوجی ساز و سامان میسر تھے۔ پھر اس کے لیڈر کی تمنائیں کس طرح بروئے کار آتیں۔

اگر چھ دہائیوں پر مشتمل بڑی طاقتوں کی محاذ آرائی کا واضح خاکہ ۱۸۹۰ء کے عشرے میں بیان کیا جاتا تو کسی بھی انفرادی ملک کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ ہنوز تصفیہ طلب ہوتا۔ ظاہر ہے' مذکورہ حقیقت کا انحصار اس بات پر ہے کہ کیا کوئی بھی ملک اپنی مصنوعات برقرار رکھ سکتا ہے یا اس میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ویسے اس بات کا دارو مدار جغرافیائی حالات پر بھی ہوتا ہے۔ کیا کوئی ملک بین الاقوامی جھگڑے کے مرکزی مقام سے قریب ہے یا اس کے اطراف و جوانب میں واقع ہے؟ کیا یہ حملے سے محفوظ ہے؟ کیا اسے ایک ساتھ دو یا تین سمتوں پر نگاہ رکھنی ہے؟ قومی وابستگی' حب الوطنی اور باشندوں پر حکومتی کنٹرول بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کیا کوئی معاشرہ جنگ کے مضمرات کو سہار سکتا ہے' اس کا انحصار اندرونی ساخت پر ہوتا ہے۔ ناکامی و کامیابی اتحادی سیاست اور فیصلہ سازی کی مرہون منت بھی ہوتی ہے۔ کیا کوئی ملک اتحادی بلاک کے ایک رکن کی حیثیت سے لڑ رہا ہے یا سب سے الگ ہو کر تنہا جنگ کر رہا ہے؟ کیا کوئی ملک ابتدا ہی میں جنگ میں کود پڑا یا درمیانی عرصے میں شامل ہوا؟ کیا دیگر طاقتیں جو پہلے غیر جانب دار تھیں' جنگ میں دوسرے فریق کا ساتھ دینے لگیں؟

مذکورہ سوالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ "دو قطبی دنیا کے وجود اور درمیانی درجے کی طاقتوں کے بحران" کے بھرپور جائزے کے لیے ضروری ہے کہ اسباب و عوامل کی تین مختلف مگر مربوط سطحوں کا جائزہ لیا جائے۔ اول فوج کی صنعتی یونٹ میں تبدیلی۔ بعض ریاستیں مادی طور پر زیادہ (یا کم) طاقتور بن جاتی ہیں۔ دوم جغرافیائی ۔ سیاسی ۔ فوجی حکمت عملی اور سماجی و ثقافتی اسباب جو عالمی توازن کی تبدیلی پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ سوم' سفارتی اور سیاسی تبدیلیاں جو بیسویں صدی کی ابتدائی جنگوں کی کامیابی اور ناکامی میں موثر ثابت ہوئیں۔

عالمی فوجی طاقت کا بدلتا ہوا توازن

عالمی امور کے ماہرین کا اس کلیے پر اتفاق تھا کہ اقتصادی اور سیاسی تبدیلی نہایت تیز رفتاری سے ہو رہی تھی۔ لہٰذا عالمی نظام پہلے کہیں زیادہ پر خطر ہو جائے گا۔ طاقت کے توازن میں ہمیشہ ردو بدل ہوتا رہا ہے جس کے نتیجے میں عدم استحکام بھی پیدا ہوا اور جنگ کی نوبت بھی آئی۔ تھوسی ڈائڈس "دی پیلو پونیسین وار" میں رقمطراز ہے: "ایتھنز کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کے نتیجے میں سپارٹا میں پھیلنے والے خوف و ہراس نے جنگ کو ناگزیر بنا دیا"۔ انیسویں صدی کے آخری ربع حصے میں ہونے والی تبدیلیاں بڑی طاقت کے نظام پر وسیع انداز میں اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ پہلے سے کہیں تیز تر تھیں۔ تجارت اور مواصلات کے عالمی نظام' یعنی ٹیلیگرام' دخانی جہاز' ریلوے اور جدید چھاپہ خانے کی وجہ سے سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش قدمی ہو رہی تھی اور مصنوعات ترقی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ اس بات کا قوی امکان نظر آرہا تھا کہ چند سال کے اندر اندر یہ تمام ذرائع ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچ جائیں گے۔ جب ۱۸۷۹ء میں گلکرسٹ اور تھامس نے مل کر سستے قسم کے فاسفورس کو بیٹنٹ فولاد میں ڈھالنے کا تجربہ کیا تو اس کے ٹھیک پانچ سال کے اندر اندر مغربی اور وسطی یورپ میں کچی دھات کو لوہے میں منتقل کرنے کے ۸۴ کارخانے بن گئے۔ پھر یہ تجربہ بحراوقیانوس سے ماورا تک پہنچ گیا۔ اس تجربے کا نتیجہ ملک کی فولادی صنعت میں خاطر خواہ اضافہ تھا۔ فوج کی خلقی صلاحیت پر بھی اس کے عمدہ اثرات مرتب ہوئے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا' فوج کی خلقی صلاحیت اس کی طاقت کے مماثل نہیں ہوتی۔ اقتصادی طور پر نہایت خوشحال ملک اپنے سیاسی کلچر اور جغرافیائی تحفظ کے پیش نظر فوجی لحاظ سے قد آور ہونا نہیں چاہے گا جبکہ اقتصادی وسائل سے محروم ریاست اپنے معاشرے کو اس طرح منظم کرے گی کہ وہ فوجی طور پر خاصی مستحکم ہو۔ مذکورہ دور میں اقتصادی استحکام نیز فوجی استحکام کا سادہ سا اصول برقرار نہیں رہا ہے۔ درج ذیل سطور میں اس کا ذکر ضروری ہو گا۔ تاہم' یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آج کے موجودہ اور صنعتی خطوط پر لڑی جانے والی جنگ کے دور میں اقتصادی امور اور فوجی حکمت عملی دونوں لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ ان طویل المیعاد تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے جو ۱۸۸۰ء کے عشرے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران بین الاقوامی طاقت کے توازن کو متاثر کر رہی تھیں' اقتصادی جدول پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ یہ گوشوارے اس لیے پیش کیے جارہے ہیں تاکہ ان سے کسی ملک کی جنگی صلاحیت کا اندازہ ہو سکے۔ لہٰذا ایسے اعداد و شمار یہاں درج نہیں کیے جارہے ہیں جو اقتصادی لحاظ سے تو خاصے معروف ہیں' لیکن ہمارے موضوع کے لیے مفید نہیں!

کسی ملک کی طاقت کی نشان دہی کے لیے آبادی کا حجم بھی قابل اعتناء نہیں ہوا کرتا۔ تاہم' جدول نمبر ۱۲ سے یہ حقیقت ضرور عیاں ہوتی ہے کہ آبادی کے لحاظ سے روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ دونوں دیگر ملکوں کے برعکس مختلف نوع کی بڑی طاقتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس میں جرمنی اور جاپان دوسروں کے مقابلے میں تھوڑی سبقت لے گیا ہے۔

جدول نمبر ۱۲ : بڑی طاقتوں کی مجموعی آبادی

۱۸۹۰ء -- ۱۹۳۸ء

(ملین میں)

	۱۸۹۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۳۰ء	۱۹۳۸ء	۱۹۳۸ء
۱۔ روس	۱۱۶٫۸	۱۳۵٫۶	۱۵۹٫۳	۱۷۵٫۱	۱۲۶٫۶	۱۵۰٫۴	۱۸۰٫۶ (۱)
۲۔ امریکہ	۶۲٫۶	۷۵٫۹	۹۱٫۹	۹۷٫۳	۱۰۵٫۷	۱۱۹٫۱	۱۳۸٫۳ (۲)
۳۔ جرمنی	۴۹٫۲	۵۶٫۰	۶۴٫۵	۶۶٫۹	۴۲٫۸	۵۵٫۴	۶۸٫۵ (۳)
۴۔ آسٹریا۔ ہنگری	۴۲٫۶	۴۶٫۷	۵۰٫۸	۵۲٫۴	-	-	-
۵۔ جاپان	۳۹٫۹	۴۳٫۸	۴۹٫۱	۵۱٫۳	۵۵٫۹	۶۲٫۱	۷۲٫۲ (۴)
۶۔ فرانس	۳۸٫۳	۳۸٫۹	۳۹٫۵	۳۹٫۷	۳۹٫۰	۴۱٫۰	۴۱٫۹ (۷)
۷۔ برطانیہ	۳۷٫۴	۴۱٫۱	۴۴٫۹	۴۵٫۶	۴۴٫۴	۴۵٫۷	۴۷٫۶ (۵)
۸۔ اٹلی	۳۰٫۰	۳۲٫۲	۳۴٫۴	۳۵٫۱	۳۷٫۷	۴۰٫۳	۴۳٫۸ (۶)

مذکورہ جدول میں درج شدہ سطحی اعداد و شمار کے جائزے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ ملک کی مجموعی آبادی کا شہری آبادی سے تقابل کیا جائے۔ (جدول ۳) اس طرح جدید صنعت و تجارت کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ دوسرا یہ کہ ان حاصل شدہ نتائج کو صنعت کاری کے ذریعے فی کس آمدنی سے مربوط کیا جائے' جیسا کہ جزائر برطانیہ کی پیائشی سطح کے بالمقابل جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ دونوں مشتق طریقے معلومات افزا ہیں اور ایک دوسرے کے لیے موثر بھی!

سردست جدول ۱۳ اور ۱۴ کے اعداد و شمار کے بغائر جائزہ لیے بغیر موٹی موٹی باتیں ذہن نشین کی جاسکتی ہیں۔ جب ایک مرتبہ جدید کاری کے طریقے' مثلاً" شہری آبادی کی شرح اور صنعت سازی کی وسعت واضح ہو جاتی ہے تو اس صورت میں بہت سی طاقتوں کی پوزیشن وہ نہیں رہتی جو جدول ۱۲ میں درج ہے۔ روس پہلے سے آخری درجے میں آگیا تاآنکہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں وہاں صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔ برطانیہ اور جرمنی کی پوزیشن بحال بہتر ہوئی ہے۔ امریکہ اپنی کثیر آبادی اور صنعتی معاشرے کی وجہ سے پوزیشن بحال رکھے ہوئے ہے۔ اس ابتدائی دور میں مضبوط اور کمزور دونوں قسم کی بڑی طاقتوں کے درمیان خاصا خلا موجود ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر بھی خاصا فرق تھا۔ ان تمام ملکوں میں جدید کاری کے طریقے ایک جیسے تھے۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ توانائی کے لحاظ سے ہر ایک ملک یکساں فائدہ اٹھائے گا۔

جدول نمبر ۱۳: بڑی طاقتوں کی شہری آبادی اور مجموعی آبادی کی شرح

۱۸۹۰ء ---- ۱۹۳۸ء

(ملین میں)

	۱۸۹۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۳۰ء	۱۹۳۸ء	۱۹۳۸ء
برطانیہ	۱۱٫۲	۱۳٫۵	۱۵٫۳	۱۵٫۸	۱۶٫۶	۱۷٫۵	(۵) ۱۸٫۷
(۱)	(۲۹٫۹٪)	(۳۲٫۸٪)	(۳۴٫۹٪)	(۳۴٫۶٪)	(۳۵٫۸٪)	(۳۸٫۲٪)	(۳۹٫۲٪)(۱)
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۹٫۶	۱۴٫۲	۲۰٫۳	۲۲٫۵	۲۷٫۳	۳۳٫۳	(۱) ۳۵٫۱
(۲)	(۱۵٫۳٪)	(۱۸٫۷٪)	(۲۲٫۰٪)	(۲۳٫۱٪)	(۲۵٫۹٪)	(۲۸٫۷٪)	(۲) (۲۷٫۸٪)
جرمنی	۵٫۶	۸٫۷	۱۲٫۹	۱۴٫۱	۱۵٫۳	۱۹٫۱	(۳) ۲۰٫۷
(۳)	(۸٫۳٪)	(۱۵٫۵٪)	(۱۹٫۹٪)	(۲۱٫۰٪)	(۲۵٫۷٪)	(۳۳٫۴٪)	(۳) (۳۰٫۴٪)
فرانس	۴٫۵	۵٫۲	۵٫۷	۵٫۹	۵٫۹	۶٫۳	(۷) ۶٫۳
(۳)	(۱۱٫۷٪)	(۱۳٫۳٪)	(۱۴٫۳٪)	(۱۴٫۸٪)	(۱۵٫۱٪)	(۱۵٫۲٪)	(۷) (۱۵٫۰٪)
روس	۴٫۳	۶٫۶	۱۰٫۲	۱۲٫۳	۴٫۰	۱۰٫۷	(۶) ۳۶٫۵
(۸)	(۳٫۶٪)	(۴٫۸٪)	(۶٫۴٪)	(۷٫۰٪)	(۳٫۱٪)	(۷٫۱٪)	(۵) (۲۰٫۴٪)
اٹلی	۲٫۷	۳٫۱	۳٫۸	۴٫۱	۵٫۰	۶٫۵	(۶) ۸٫۰
(۵)	(۹٫۰٪)	(۹٫۶٪)	(۱۱٫۰٪)	(۱۱٫۶٪)	(۱۴٫۴٪)	(۱۶٫۱٪)	(۶) (۱۸٫۴٪)
جاپان	۲٫۵	۳٫۸	۵٫۸	۶٫۶	۶٫۳	۹٫۷	(۳) ۲۰٫۷
(۹)	(۶٫۳٪)	(۸٫۶٪)	(۱۰٫۳٪)	(۱۲٫۸٪)	(۱۱٫۶٪)	(۱۵٫۶٪)	(۳) (۲۸٫۶٪)
آسٹریا۔ ہنگری	۲٫۳	۳٫۱	۳٫۹	۴٫۶	-	-	-
(۷)	(۵٫۶٪)	(۶٫۶٪)	(۸٫۳٪)	(۸٫۸٪)			

جدول نمبر ۱۴: صنعت سازی کی فی کس سطح

۱۸۸۰ء ---- ۱۹۳۸ء

(۱۹۰۰ء کی برطانوی شرح = ۱۰۰)

	۱۸۸۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۲۸ء	۱۹۳۸ء	-
۱۔ جزائر برطانیہ	۸۷	۱۰۰	۱۱۵	۱۲۲	۱۵۷	۲
۲۔ امریکہ	۳۸	۶۹	۱۲۶	۱۸۲	۱۶۷	۱
۳۔ فرانس	۲۸	۳۹	۵۹	۸۲	۷۳	۳
۴۔ جرمنی	۲۵	۵۲	۸۵	۱۲۸	۱۴۴	۳
۵۔ اٹلی	۱۲	۱۷	۲۶	۴۴	۶۱	۵
۶۔ آسٹریا	۱۵	۲۳	۳۲	-	-	-
۷۔ روس	۱۰	۱۵	۲۰	۲۰	۳۸	۷
۸۔ جاپان	۹	۱۲	۲۰	۳۰	۵۱	۶

عظیم طاقتوں کا عروج و زوال

بڑی طاقتوں کے مابین جو اہم فرق موجود تھا اس کا اظہار اس وقت ہو جاتا ہے جب ان کی صنعتی پیداوار کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے۔ چونکہ مذکورہ دور میں خام لوہا اور فولاد کی صنعت فوجی صلاحیت کا مظہر تصور کی گئی ہے اور بعد صنعت سازی کی بھی' لہٰذا جدول نمبر ۱۵ میں متعلقہ اعداد و شمار پیش کیے جا رہے ہیں۔

تاہم کسی ملک کی صنعت سازی کا پیمانہ اس کا توانائی کے موجودہ ذرائع کا استعمال ہے (مثلاً کوئلہ' پٹرولیم' قدرتی گیس اور پانی یا بھاپ سے پیدا شدہ بجلی۔ لیکن ایسی بجلی نہیں جو لکڑی سے پیدا کی گئی ہو۔) اس طرح کی پیمائش سے کسی بھی ملک کی تکنیکی صلاحیت' اس سے توانائی پیدا کرنے کی سکت اور اقتصادی ترقی کی شرح معلوم ہو جاتی ہے۔ ایسے اعداد و شمار جدول نمبر ۱۶ میں درج کیے گئے ہیں۔

جدول نمبر ۱۵: بڑی طاقتوں کی لوہے/فولاد کی پیداوار

۱۸۹۰ء -- ۱۹۳۸ء

(ملین ٹن میں: ۱۸۹۰ء میں خام لوہے کی پیداوار کے حساب سے ۔ فولاد کی پیداوار اس کے بعد کے زمانے میں)

	۱۸۹۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۲۰ء	۱۹۳۰ء	۱۹۳۸ء
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۹٫۳	۱۰٫۳	۲۶٫۵	۳۱٫۸	۴۲٫۳	۴۱٫۳	۲۸٫۸
برطانیہ	۸٫۰	۵٫۰	۶٫۵	۷٫۷	۹٫۲	۷٫۴	۱۰٫۵
جرمنی	۴٫۱	۶٫۳	۱۳٫۶	۱۷٫۶	۷٫۶	۱۱٫۳	۲۳٫۲
فرانس	۱٫۹	۱٫۵	۳٫۴	۴٫۶	۲٫۷	۹٫۴	۶٫۱
آسٹریا۔ ہنگری	۰٫۹۷	۱٫۱	۲٫۱	۲٫۶	-	-	-
روس	۰٫۹۵	۲٫۲	۳٫۵	۴٫۸	۰٫۱۶	۵٫۷	۱۸٫۰
جاپان	۰٫۰۲	-	۰٫۱۶	۰٫۲۵	۰٫۸۴	۲٫۳	۷٫۰
اٹلی	۰٫۰۱	۰٫۱۱	۰٫۷۳	۰٫۹۳	۰٫۷۳	۱٫۷	۲٫۳

جدول نمبر ۱۶: بڑی طاقتوں میں توانائی کا استعمال

۱۸۹۰ء ---- ۱۹۳۸ء

(ملین میٹرک ٹن میں)

	۱۸۹۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۲۰ء	۱۹۳۰ء	۱۹۳۸ء
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۴۷	۲۴۸	۴۸۳	۵۴۱	۶۹۴	۷۶۲	۶۹۷
برطانیہ	۱۴۵	۱۷۱	۱۸۵	۱۹۵	۲۱۲	۱۸۳	۱۹۶
جرمنی	۷۱	۱۱۲	۱۵۸	۱۸۷	۱۵۹	۱۷۷	۲۲۸
فرانس	۳۶	۴۷٫۹	۵۵	۶۲٫۵	۶۵	۹۷٫۵	۸۳
آسٹریا۔ ہنگری	۱۹٫۷	۲۹	۴۰	۴۹٫۴	-	-	-
روس	۱۰٫۹	۳۰	۴۱	۵۴	۱۴٫۳	۶۵	۱۷۷
جاپان	۴٫۶	۴٫۶	۱۵٫۴	۲۳	۳۴	۵۵٫۸	۹۶٫۵
اٹلی	۴٫۵	۵	۹٫۶	۱۱	۱۴٫۳	۲۴	۲۷٫۸

جدول ۱۵ اور ۱۶ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مخصوص ادوار میں بعض طاقتوں میں صنعتی تبدیلیاں نہایت تیزی سے آرہی تھیں، مثلاً ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۳ء تک جرمنی میں، ۱۹۳۰ء کی دہائی میں روس اور جاپان میں! اسی طرح برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی سست رفتار ترقی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اس سے خصوصی طور پر ملک کی صنعتی حیثیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ (جدول نمبر ۱۷)

آخر میں ہم جدول نمبر ۱۸ کی جانب متوجہ ہوا چاہتے ہیں۔ اس میں بیروچ کے فراہم کردہ وہ اعداد وشمار درج ہیں جن سے عالمی صنعت میں حصص کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز ان تبدیلیوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن کا جائزہ ہم گزشتہ باب میں انیسویں صدی کے توازن کے حوالے سے لے چکے ہیں۔

جدول نمبر ۱۷: بڑی طاقتوں کی مجموعی صنعتی صلاحیت

متعلقہ تناظر میں: ۱۸۸۰ ---- ۱۹۳۸ء

(برطانیہ عظمیٰ ۱۹۰۰ء میں = ۱۰۰)

	۱۸۸۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۲۸ء	۱۹۳۸ء
برطانیہ	۷۳٫۳	۱۰۰	۱۲۷٫۲	۱۳۵	۱۸۱
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۴۶٫۹	۱۲۷٫۸	۲۹۸٫۱	۵۳۳	۵۲۸
جرمنی	۲۷٫۴	۷۱٫۲	۱۳۷٫۷	۱۵۸	۲۱۴
فرانس	۲۵٫۱	۳۶٫۸	۵۷٫۳	۸۲	۷۴
روس	۲۴٫۵	۴۷٫۵	۷۶٫۶	۷۲	۱۵۲
آسٹریا۔ ہنگری	۱۴	۲۵٫۶	۴۰٫۷	-	-
اٹلی	۸٫۱	۱۳٫۶	۲۲٫۵	۳۷	۴۶
جاپان	۷٫۶	۱۳	۲۵٫۱	۴۵	۸۸

جدول نمبر ۱۸: عالمی صنعتی پیداوار میں حصص کا تناسب

۱۸۸۰ ---- ۱۹۳۸ء

	۱۸۸۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۲۸ء	۱۹۳۸ء
برطانیہ	۲۲٫۹	۱۸٫۵	۱۳٫۶	۹٫۹	۱۰٫۷
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۴٫۷	۲۳٫۶	۳۲٫۰	۳۹٫۳	۳۱٫۴
جرمنی	۸٫۵	۱۳٫۲	۱۴٫۸	۱۱٫۶	۱۲٫۷
فرانس	۷٫۸	۶٫۸	۶٫۱	۶٫۰	۴٫۴
روس	۷٫۶	۸٫۸	۸٫۲	۵٫۳	۹٫۰
آسٹریا۔ ہنگری	۴٫۴	۴٫۷	۴٫۴	-	-
اٹلی	۲٫۵	۲٫۵	۲٫۴	۲٫۷	۲٫۸

بڑی طاقتوں کی پوزیشن

۱۸۸۵ --- ۱۹۱۴ء

ایسے مایوس کن اعداو شمار کے پیش نظر جبکہ ایک طاقت ۱۹۱۳ء میں عالمی پیداوار کے ۲ء۷ فی صد حصے کی مالک تھی یا دوسری ۱۹۲۸ء میں اتنی کم صنعتی صلاحیت کی حامل تھی جو ۱۹۰۰ء میں برطانیہ کی صلاحیتوں کا کل ۴۵ فی صد تھی --- اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ یہ سارے گوشوارے بے جواز ثابت ہوں گے اگر انھیں تاریخی جغرافیائی اور سیاسی سیاق و سباق میں نہ دیکھا جائے۔ وہ ممالک جو بعینہ صنعتی پیداوار کے مالک ہیں' ان پر بڑی طاقتوں کے اثرات کی شرح مختلف ہو گی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً" متعلقہ معاشرے کی اندرونی یکجہتی' ریاستی کاموں کے لیے وسائل کی دستیابی' جغرافیائی پوزیشن اور سفارت کارانہ صلاحیت! جگہ کی تنگی کے باعث امکان نہیں کہ یہاں تمام بڑی طاقتوں کا سیر حاصل جائزہ لیا جا سکے جس طرح کوریلی برنٹ نے کئی سال قبل برطانیہ کا مبسوط جائزہ پیش کیا تھا۔ تاہم یہاں برنٹ کے وسیع تجزیے کا نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ دلیل دیتے ہوئے کہتا ہے:

> "کوئی بھی ملک محض مسلح افواج کی بدولت طاقت ور نہیں بن جاتا۔ اس بات کا انحصار اس کے معاشی اور تکنیکی وسائل پر بھی ہوتا ہے۔ اس میں مہارت' دور بینی اور قوت فیصلہ کو بھی دخل ہوتا ہے جس کے ذریعے خارجہ پالیسی طے کی جاتی ہے۔ سماجی اور سیاسی اداروں کی کارکردگی بھی قابل اعتنا ہوا کرتی ہے۔ یہ تمام باتیں عوام پر منحصر ہوتی ہیں ----- یعنی ان کے ہنر' توانائی' جذبہ' نظم و ضبط' پہل کاری' ان کا ایمان' تصورات اور اوہام بھی اپنا خاص کردار ادا کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ ایسے تمام عوامل ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں' ملکی طاقت کا جائزہ خارجی تعلقات اور حکومتی فرائض کے تناظر میں بھی لینا چاہیے۔ نیز' دوسری ریاستوں کی طاقتوں سے اس کا تقابل کرتے رہنا چاہیے"۔

نوجی حکمت عملی کے گہرے متنوع اثرات کا بخوبی جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ بین الاقوامی اسٹیج پر آنے والے تین نئے ملکوں پر پہلے نظر ڈال لی جائے' یعنی اٹلی' جرمنی اور جاپان! اول الذکر دو ملک ۱۸۷۰ء۔۱ء میں ہی متحدہ ریاستوں کے طور پر نمایاں ہوئیں جبکہ تیسرا ملک ۱۸۶۸ء کی "میجی تجدید" کے بعد ہی خود ساختہ علیحدگی کے حصار سے باہر نکلا۔ ان تینوں معاشروں میں قائم شدہ طاقتوں کی ہمسری کی کوشش جاری رہتی تھی۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کی دہائیوں میں مذکورہ ہر ملک سمندر پار کے علاقوں پر قبضہ جمانے میں مصروف تھا۔ ہر ایک نے اپنی فوج مستحکم کرنے کے لیے جدید قسم کے بحری بیڑے کی تیاری ضروری قرار دی

ہوئی تھی۔ اس زمانے کے سفارتی علم الاحصا میں ہر ایک کی اپنی قدر و اہمیت تھی۔ پھر' ۱۹۰۲ء کے اواخر میں یہ تینوں پرانی طاقتوں کے اتحادی بن گئے تھے۔ تاہم' ان خصوصیات کے باوجود ان سبھوں میں طاقت کا بنیادی فرق موجود تھا۔

اٹلی

ایک متحدہ اطالوی قوم کے وجود میں آنے سے یورپ کے توازن میں نمایاں فرق پیدا ہوا۔ یہ ملک چھوٹی چھوٹی جھگڑالو ریاستوں کے مجموعہ نہ تھا جو اکثر و بیشتر بیرونی تسلط کے زیر سایہ رہا اور اسے بیرونی مداخلت کا ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔ لیکن اب وہاں تیس ملین عوام کا ایک قوی تر بلاک تھا۔ وہاں کی آبادی اس تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ وہ فرانس کی مجموعی آبادی کے قریب تر پہنچ چکی تھی۔ اگرچہ مذکورہ دور میں اس کی بری اور بحری فوج بہت بڑی نہیں تھی' لیکن پھر بھی معقول تھی جیسا کہ جدول ۱۹ اور جدول ۲۰ سے منکشف ہوتا ہے۔

جدول نمبر۱۹: بڑی طاقتوں کی بری اور بحری افواج

۱۸۸۰ء---- ۱۹۱۳ء

	۱۸۰۰ء	۱۸۹۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء
روس	۷۹۱۰۰۰	۶۷۷۰۰۰	۱۱۶۲۰۰۰	۱۲۸۵۰۰۰	۱۳۵۲۰۰۰
فرانس	۵۴۳۰۰۰	۵۴۲۰۰۰	۷۱۵۰۰۰	۷۶۹۰۰۰	۹۱۰۰۰۰
جرمنی	۴۲۶۰۰۰	۵۰۴۰۰۰	۵۲۴۰۰۰	۶۹۴۰۰۰	۸۹۱۰۰۰
برطانیہ	۳۶۷۰۰۰	۴۲۰۰۰۰	۶۲۴۰۰۰	۵۷۱۰۰۰	۵۳۲۰۰۰
آسٹریا۔ ہنگری	۲۴۶۰۰۰	۳۴۶۰۰۰	۳۸۵۰۰۰	۴۲۵۰۰۰	۴۴۴۰۰۰
اٹلی	۲۱۶۰۰۰	۲۸۴۰۰۰	۲۵۵۰۰۰	۳۲۲۰۰۰	۳۴۵۰۰۰
جاپان	۷۱۰۰۰	۸۴۰۰۰	۲۳۴۰۰۰	۲۷۱۰۰۰	۳۰۶۰۰۰
امریکہ	۳۴۰۰۰	۳۹۰۰۰	۹۶۰۰۰	۱۲۷۰۰۰	۱۶۴۰۰۰

جدول نمبر۲۰ = بڑی طاقتوں کے جنگی جہازوں کا ٹن ماپ

۱۸۸۰ لغایت ۱۹۱۳ء

	۱۸۰۰ء	۱۸۹۰ء	۱۹۰۰ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء
برطانیہ	۶۵۰۰۰۰	۶۷۹۰۰۰	۱۰۶۵۰۰۰	۲۱۷۴۰۰۰	۲۷۱۴۰۰۰
فرانس	۲۷۱۰۰۰	۳۱۹۰۰۰	۴۹۹۰۰۰	۷۲۵۰۰۰	۹۰۰۰۰۰

روس	۲۰۰۰۰۰	۱۸۰۰۰۰	۳۸۳۰۰۰	۴۰۱۰۰۰	۶۷۹۰۰۰
امریکہ	۱۶۹۰۰۰	۲۴۰۰۰۰	۳۳۳۰۰۰	۸۲۴۰۰۰	۹۸۵۰۰۰
اٹلی	۱۰۰۰۰۰	۲۴۲۰۰۰	۲۴۵۰۰۰	۳۲۷۰۰۰	۴۹۸۰۰۰
جرمنی	۸۸۰۰۰	۱۹۰۰۰۰	۲۸۵۰۰۰	۹۶۴۰۰۰	۱۳۰۵۰۰۰
آسٹریا۔ ہنگری	۶۰۰۰۰	۶۶۰۰۰	۸۷۰۰۰	۲۱۰۰۰۰	۳۷۲۰۰۰
جاپان	۱۵۰۰۰	۴۱۰۰۰	۱۸۷۰۰۰	۴۹۶۰۰۰	۷۰۰۰۰۰

جیسا کہ ہم نے اوپر جائزہ لیا ' سفارتی نقطہ نظر سے اٹلی کا عروج اس کے دو اہم طاقت ور پڑوسیوں سے متصادم ہو رہا تھا' یعنی فرانس اور آسٹریا - ہنگری سے! جب ۱۸۸۲ء میں یہ ملک اتحاد ثلاثہ میں شامل ہوا تو اس سے اٹلی اور آسٹریا کا مابین دشمنی کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس طرح یہ حقیقت بھی عیاں ہو گئی کہ تنہا رہ جانے والے فرانس کو دو محاذوں پر دشمنوں کا سامنا تھا۔ متحد ہو جانے کے ایک عرصے کے اندر اندر اٹلی یورپ کی بڑی طاقتوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کا دارالخلافہ روم اور دیگر ملکوں کے اہم دارالسلطنتوں یعنی لندن' پیرس' سینٹ پیٹر برگ' ویانا' قسطنطنیہ کے مساوی قرار دیا گیا جہاں باقاعدہ سفیر کی تقرری ہوا کرتی تھی۔

لیکن اٹلی کے بڑی طاقت بن جانے کے باوجود' اس میں کئی خامیاں بھی تھیں' مثلاً" اس کی اقتصادی حالت خصوصاً" جنوبی علاقے میں نہایت ابتر تھی۔ اس ملک میں شرح خواندگی ۷ء۶۲ فی صد تھی۔ جبکہ جنوبی علاقے میں یہ شرح اور بھی زیادہ تھی۔ اس وقت یورپ کی مغربی یا شمالی علاقوں میں سب سے زیادہ ان پڑھ آبادی اٹلی کی تھی۔ وہاں کا زراعتی نظام بھی حد درجہ پس ماندہ تھا۔ کھیت بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ زمین زرخیز نہیں تھی۔ سرمایہ کاری بہت کم ہوتی تھی۔ مشترکہ کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ نقل و حمل کی سہولتیں ناکافی تھیں۔ اٹلی کی مجموعی پیداوار اور فی کس آمدنی کا موازنہ اسپین اور مشرقی یورپ جیسے زراعتی ملک سے کیا جاتا تھا نہ کہ نیدرلینڈ اور ویسٹ فالیہ سے! اٹلی کے پاس کوئلہ نہیں تھا' پانی اور بجلی سے بھاپ پیدا کرنے کے باوجود اٹلی میں ۸۸ فی صد ایندھن برطانیہ سے درآمد شدہ کوئلے سے حاصل کیا جاتا تھا۔ ایندھن کی درآمد جہاں توازن ادائیگی پر ایک بھاری بوجھ تھا وہاں فوجی نقطہ نظر سے بھی یہ ایک بڑی کمزوری تھی۔ ان حالات میں اٹلی کی بڑھتی ہوئی آبادی اور صنعت کا عدم فروغ ایک طرح کی زحمت تھی کیونکہ اس طرح فی کس صنعتی ترقی دوسری مغربی طاقتوں کے مقابلے میں فروتر تھی۔ پھر یہ موازنہ ایسی صورت میں سراسر لایعنی تھا جبکہ ہزاروں اطالوی باشندے ترک وطن کر کے بحراوقیانوس کے اس پار چلے جاتے تھے۔ ان تمام باتوں سے اٹلی بقول کیپ "تاخیر سے آنے والا نامراد ملک بن گیا تھا۔"

مذکورہ باتوں کے بیان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اٹلی میں جدید کاری نہیں ہو رہی تھی۔ فی الحقیقت یہ وہی زمانہ تھا جس کی جانب بہت سے مورخوں نے یوں اشارہ کیا تھا : "گیولٹ دور کا صنعتی انقلاب"۔ "ملک کی اقتصادی حالت میں ایک اہم تبدیلی"۔ کم از کم شمالی علاقے میں بھاری صنعتیں قائم ہوئی تھیں'

مثلاً" لوہا اور فولاد' جہاز سازی' آٹو موبائل کی صنعت' پارچہ بافی۔ جرچنکرون کے الفاظ میں : ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۸ء کے دوران اٹلی میں صنعت میں خاصی ترقی ہوئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اٹلی میں صنعت سازی یورپ کے دیگر ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ فروغ پا چکی تھی۔ اسی وجہ سے دیہی آبادی شہروں کی جانب نہایت تیزی سے رخ کرنے لگی۔ صنعتی ضرورتوں کے مطابق بینکاری کے نظام میں بھی تبدیلی عمل میں آئی۔ قومی آمدنی میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پیڈمونٹ کی زراعت بھی اسی رفتار سے ترقی کرتی رہی۔

تاہم' اطالیہ کے اعداد و شمار کا جب تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے تو ساری چمک دمک ماند پڑنے لگتی ہے۔ اگرچہ اس نے فولاد کا ایک کارخانہ قائم کر لیا تھا لیکن ۱۹۱۳ء میں اس کی پیداوار برطانیہ کی پیداوار کا آٹھواں حصہ اور جرمنی کا ساتواں حصہ تھی۔ یہ پیداوار صرف بلجیم کے مقابلے میں ۵/۲ تھی۔ اٹلی میں صنعتی ترقی بھی ہوئی تھی مگر وہ اتنے چھوٹے پیمانے سے شروع ہوئی تھی کہ نتائج بالکل ہی موثر نہ تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں اسے برطانیہ کی اس صنعتی صلاحیت کا ایک چوتھائی بھی حاصل نہ ہو سکا جو آخرالذکر کو ۱۹۰۰ء میں حاصل تھی۔ دنیا کی صنعتی پیداوار میں اٹلی کے حصے میں کمی آ گئی۔ ۱۹۰۰ء میں یہ حصہ ۲ء۵ فی صد تھا جو ۱۹۱۳ء میں گھٹ کر ۲ء۴ فی صد رہ گیا۔ اگرچہ اٹلی بڑی طاقتوں کی صف میں کسی حد تک شامل ہو چکا تھا لیکن یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سوائے جاپان کے بقیہ دیگر طاقتیں مذکورہ ملک کے مقابلے میں دو یا تین گنا زیادہ صنعتی صلاحیت کی حامل تھیں۔ بعض (جرمنی اور برطانیہ) کی صلاحیت چھ گنا زیادہ تھی جبکہ ایک ملک (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) تیرہ گنا زیادہ صلاحیت کا حامل تھا۔

اگر اٹلی کے باشندے چاہتے تو ان کمزوریوں کی کسی حد تک تلافی ہو سکتی تھی' لیکن ایسے عوامل ناپید تھے۔ اطالیہ کی سیاست میں جو رجحانات کار فرما تھے وہ سراسر گروہی اور مقامی تھے۔ ان میں مجموعی قومی جذبہ مفقود تھا۔ شمالی اور جنوبی اٹلی میں خاصا تفاوت تھا۔ اسے آخرالذکر علاقے کی صنعت کاری نے اور بھی وسیع کر دیا تھا۔ چونکہ وہاں کی حکومت اور کیتھولک چرچ کے درمیان مناقشت تھی لہذا' آخرالذکر نے اپنے اراکین کو سرکاری نوکری کرنے سے منع کر دیا تھا۔ نیز' دونوں کے تضاد کی وجہ سے بیرونی دنیا سے اس کے روابط نہ ہونے کے برابر تھے۔ نشاۃ الثانیہ کے وہ تصورات جو غیر ملکی دنیا میں راہ پا رہے تھے' اطالوی معاشرے کو کم ہی متاثر کر سکے۔ مسلح افواج میں بھرتی کا طریقہ کار خاصا مشکل تھا۔ عسکری اصول و قوانین کے تحت فوجی یونٹوں کا قیام ناممکن نظر آتا تھا۔ اعلیٰ سول اور فوجی افسران کے مابین تعلقات شکوک و شبہات پر مبنی تھے۔ اطالوی معاشرے میں فوج کے متعلق عموماً" اچھی رائے نہ تھی۔ فوجی افسران میں بہت سی خامیاں تھیں۔ پھر' جدید اسلحے کی خریداری کے لیے رقم کی ہمیشہ قلت رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اطالوی فوج کی اعلیٰ کارکردگی ۱۹۱۷ء کی ہولناک جنگ کپوریٹیا ۱۹۴۰ء کی جنگ مصر میں مشکوک تھی۔ اتحاد کے لیے لڑی جانے والی تمام جنگوں کا دار و مدار فرانس کی مداخلت پر تھا یا پھر پروشیا کی جانب سے آسٹریا - ہنگری کی دھمکی اٹلی کا سہارا بنتی۔ ۱۸۹۶ء میں ابی سینیا کے علاقے اڈووا میں اٹلی کو شدید شکست اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے اس ملک کی یوں بدنامی ہوئی کہ ایک افریقی قوم سے یورپ کی فوج ہار گئی۔ حالانکہ آخرالذکر کے پاس موثر فوجی وسائل بھی نہ تھے۔ اطالوی حکومت نے ۱۲-۱۹۱۱ء میں لیبیا کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ

کیا جس پر وہاں کے جنرل اسٹاف کو حیرانی بھی ہوئی۔ بہرکیف، اسے سوائے مالی تباہی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کی بحریہ جو ۱۸۹۰ء میں خاصی وسیع اور مستحکم تھی، بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی اور اس کی کارکردگی پہلے جیسی نہ رہی۔ بحیرہ روم میں تعینات رائل نیوی کے کمانڈر انچیف ہمیشہ یہ خیال کرتے رہے کہ اگر اسے فرانس کے ساتھ محاذ آرائی کرنی پڑی تو اٹلی کا بحری بیڑا غیر جانب دار رہے گا، کسی کے ساتھ اتحاد قائم نہیں کرے گا۔

اٹلی کی عسکری اور سفارتی پوزیشن پر مذکورہ بالا اسباب و عوامل کے اثرات خاصے گہرے اور مایوس کن تھے۔ اطالوی فوج کا جنرل اسٹاف اس حقیقت سے آشنا تھا کہ فرانس اور آسٹریا - ہنگری کے مقابلے میں وہ عددی اور تکنیکی لحاظ سے فروتر ہے۔ نیز، اٹلی میں ریلوے کا وسیع نظام نہ ہونے اور گہری علاقائیت کی وجہ سے رنگروٹوں کی بھرتی اس انداز میں نہیں ہو پاتی جیسی پروشیا میں ہوتی ہے۔ وہاں کی بحریہ بھی اپنے نقائص سے بخوبی آگاہ تھی۔ پھر، وہاں کے طویل اور ناہموار قسم کے ساحلی علاقے دوسرے ممالک سے اتحادی رشتہ قائم کرنے میں ہمیشہ سد راہ رہے۔ چنانچہ فوجی حکمت عملی وضع کرنے میں دشواریوں کا سامنا رہتا تھا۔ جب بسمارک نے فرانس کو تہ و بالا کر دینا چاہا تو ۱۸۸۲ء میں اٹلی کے ساتھ برلن کا اتحادی معاہدہ عمل میں آیا۔ یہ شروع میں بڑی تقویت کا باعث رہا تھا۔ بعد ازاں اطالوی حکومت نے برطانیہ کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس طرح فرانسیسی بحریہ غیر جانب دار ہو گئی۔ پھر، ۱۹۰۰ء کے بعد، جب برطانیہ اور فرانس ایک دوسرے کے قریبی ساتھی بن گئے اور برطانیہ و جرمنی دوستی ختم کر کے دشمنی پر اتر آئے تو اٹلی کو مجبوراً برطانیہ و فرانس کا ساتھ دینا پڑا۔ آسٹریا - ہنگری کی نفرت نے بھی اس اقدام کو اور ہوا دی۔ ادھر جرمنی کے ساتھ اس کے روابط میں بھی کمی آئی۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں اٹلی کی پوزیشن ۱۸۷۱ء جیسی رہ گئی۔ اور یہ بڑی طاقتوں کے قطار و شمار میں نہ تھا۔ پڑوسی ممالک کی نظروں میں اس کی وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے تجارتی اور توسیعی عزائم آلپس، بلقان، شمالی افریقہ اور دیگر دور دراز علاقوں میں روبہ عمل آیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ، وہاں دوستوں اور دشمنوں کے مفادات سے تصادم بھی رہا کرتا تھا۔ بہرحال، اقتصادی اور سماجی حالات نے اٹلی کو کمزور کر کے رکھ دیا اور واقعات پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو کر رہ گئی۔ پھر بھی وہ میدان میں ایک کھلاڑی کی حیثیت سے موجود تھا۔ مختصر یہ کہ بہت سارے ملکوں کے خیال میں انھیں اٹلی کو دوست بنا کر رکھنا چاہئے تھا نہ کہ دشمن!۔ اگرچہ اس سے کوئی خاص فائدہ بھی نہ تھا۔

جاپان

اگرچہ ۱۸۹۰ء میں اٹلی بڑی طاقتوں کے نظام میں ایک حاشیہ بردار کا ہی درجہ رکھتا تھا، مگر جاپان کو تو یہ مقام بھی حاصل نہ تھا۔ اس ملک پر صدیوں جاگیرداری نظام مسلط رہا۔ وہاں قدرتی وسائل مفقا تھے۔ زیادہ تر علاقہ پہاڑی تھا۔ صرف ۲۰ فی صد زمینی حصہ کاشت کاری کے قابل تھا۔ غرض اقتصادی ترقی کے جملہ اسباب و عوامل سے یہ ملک محروم تھا۔ اپنی پیچیدہ زبان کی وجہ سے اہل جاپان دنیا سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ ان کا کوئی قریبی دوست ملک نہ تھا۔ ان میں اپنے کلچر کے بے نظیر ہونے کا قوی احساس تھا۔ چنانچہ جاپانی

عوام خودی کے خول میں محدود ہو کر رہ گئے تھے اور بیرونی مداخلت کو کسی صورت میں پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ صورت حال انیسویں صدی کے نصف آخر تک برقرار رہی۔ ان اسباب و عوامل کی بنا پر جاپان سیاسی لحاظ سے نا تجربہ کار، اقتصادی لحاظ سے زبوں حال اور فوجی لحاظ سے ضعیف رہا۔ تاہم، دو نسلوں سے مشرق بعید کی بین الاقوامی سیاست میں جاپان نہایت اہم رول ادا کر رہا ہے۔

۱۸۶۸ء میں میجی کی تحریک تجدید کے زیر اثر جو تبدیلی آئی تھی اس میں جاپان کے شہریوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ مغرب کے زیر تسلط آنے سے اجتناب برتیں گے۔ یہ صورت تقریباً تمام ایشیائی خطوں میں موجود تھی۔ اگرچہ بعض اصلاحات عمل میں آئی تھیں اور جاگیردارانہ نظام کی بہتر بنانے کے کوشش کی گئی تھی۔ پھر اس سلسلے میں سمورائی قبیلے کی شدید مخالفت بھی ہوئی تھی۔ بہرحال، جاپان میں جدید کاری کے روبہ عمل آنے کی وجہ محض وہاں کے صنعت کاروں کی خواہش نہ تھی بلکہ حکومت نے خود اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ قدیم مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بعد جدید کاری کا عمل نہایت جذبے سے آگے بڑھنے لگا۔ ترقی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس کے مقابلے میں کولبرٹ یا فریڈرک اعظم کی سعی و کاوش پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ جاپان میں ایک نیا آئین پروشیا اور جرمنی کے نمونے کی بنیاد پر وضع کیا گیا۔ قانون میں اصلاح کی گئی۔ تعلیم کو وسیع پیمانے پر فروغ دیا گیا۔ چنانچہ ملک میں خواندگی کی شرح خاصی بڑھ گئی۔ جنتری کو بھی تبدیل کیا گیا۔ حتیٰ کہ لباس میں بھی تبدیلی آئی۔ بینکاری کا نیا نظام اپنایا گیا۔ برطانیہ کے شاہی بیڑے کے عملے کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ جاپان کے نئی وضع کے بحری بیڑے کی تیاری میں مشورہ دے۔ اسی طرح پروشیا سے فوج کا جنرل اسٹاف طلب کیا گیا تاکہ جاپان کی بری فوج کی نئے سرے سے تشکیل میں مدد دے۔ مغربی ملکوں میں قائم بری اور بحری فوج کی اکیڈمی میں تربیت کے لیے جاپانی افسروں کو بھیجا گیا۔ بیرونی ممالک سے جدید قسم کے اسلحے خریدے گئے۔ نیز، ملک میں بھی اسلحہ سازی کا ایک کارخانہ نصب کیا گیا۔ ریلوے، ٹیلیگرام اور بحری جہازوں کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں حکومت نے بھرپور مدد کی۔ جاپان کے ابھرتے ہوئے صنعت کاروں کے تعاون سے بھاری صنعت، مثلاً لوہا، فولاد اور جہاز سازی کو فروغ دیا گیا۔ اسی طرح پارچہ بافی کی صنعت کو نئے خطوط پر استوار کیا گیا، برآمد کنندگان کی مدد کرنے، جہاز رانی کی حوصلہ افزائی کرنے اور ایک نئی فیکٹری قائم کرنے کے لیے جاپان کی حکومت نے مالی امداد بھی فراہم کی۔ جاپان کی برآمدی اشیاء خصوصاً سلک اور سوتی کپڑے کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ ان تمام حقائق کے پاس پردہ اس قومی نعرے کو معنویت عطا کرنے کے سیاسی عزائم تھے: "فوکوکو کیوہی" (ایک امیر ملک - ایک طاقتور فوج) غرض جاپان میں اقتصادی استحکام اور بری و بحری طاقت دونوں ایک ساتھ پروان چڑھتے رہے۔

لیکن ان تمام باتوں کی تکمیل میں خاصا وقت لگا۔ چنانچہ رکاوٹیں اور دشواریاں حائل رہیں۔ اگرچہ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۳ کے دوران شہری آبادی دو گنی ہو گئی لیکن کھیت میں کام کرنے والوں کی تعداد جوں کی توں رہی۔ حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں وہاں کی آبادی کا ۵/۳ حصہ ہی زراعت، جنگل بانی اور ماہی گیری کا پیشہ انجام دیتا تھا۔ اگرچہ زراعت کے فن میں بہت سی ترقیاں عمل میں آئی تھیں، لیکن پہاڑی علاقے اور چھوٹے چھوٹے کھیت برطانیہ کے نمونے کے "زرعی انقلاب" سے محروم تھے۔ الغرض، نچلی سطح کی

زراعت ادنیٰ درجے کی صنعتی صلاحیت اور صنعت کاری کی نئی کس شرح کے سبب جاپان بڑی طاقتوں کی صف میں نہایت آخر میں کھڑا تھا۔ (ملاحظہ ہو جدول ۱۳ اور جدول ۱۷) اگرچہ ۱۹۱۴ء سے قبل جاپان جدید اینڈمنی وسائل سے کافی توانائی حاصل کر لیا کرتا تھا اور عالمی پیداوار میں بھی اس نے معقول ترقی کی تھی' اس کے باوجود وہ بہت سے شعبے میں ہنوز پس ماندہ تھا۔ اس کی لوہا اور فولاد کی پیداوار قلیل تھی' لہٰذا اسے زیادہ تر درآمدی اشیاء پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح' جاپان کی جہاز سازی کی صنعت تھی جو ترقی کر لینے کے باوجود کہیں اور سے جہاز منگوانے پر مجبور تھی۔ اس ملک کے پاس سرمائے کی بھی کمی تھی۔ وہ بیرونی ممالک سے قرض پر قرض لیے چلا جاتا تھا۔ اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں بچتا تھا کہ وہ صنعت سازی' تعمیر زیریں اور مسلح افواج پر خرچ کر سکے۔ جاپان نے اقتصادی لحاظ سے یقیناً "معجزہ کر دکھایا تھا۔ یعنی وہ واحد مغربی ملک تھا جس نے شہنشاہیت کے دور میں بھی ایک صنعتی انقلاب برپا کر دیا تھا لیکن پھر بھی' برطانیہ' ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی کے مقابلے میں صنعتی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور ملک تھا۔

بہرحال' ایسے دو عناصر تھے جن کی بدولت جاپان ترقی کر کے بڑی طاقت کا درجہ حاصل کر گیا۔ ان ہی عوامل سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے کہ آخر وہ کس طرح اٹلی سے آگے بڑھ گیا' پہلی بات تو اس کی جغرافیائی پوزیشن تھی۔ اس کو اپنے قریب کے براعظم سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا' اس لیے کہ وہاں کی چینی سلطنت روبہ زوال تھی۔ اگرچہ چین' منچوریا اور (کسی حد تک خطرناک ملک) کوریا کسی بڑی طاقت کی گرفت میں تو آ سکتے تھے' لیکن یہ جغرافیائی لحاظ سے جاپان ان تمام ممالک سے خاصا دور تھا۔ ان میں روس بھی شامل تھا جس نے ۵-۱۹۰۳ء میں وہاں ایک روسی دستہ روانہ کرنا چاہا لیکن چھ ہزار میل پر پھیلی ہوئی ریلوے لائن نے روس کے اوسان خطا کر دیے۔ اسی طرح برطانوی اور امریکی بحریہ نے کئی دہائیوں بعد جب فلپائن' ہانگ کانگ اور ملایا کی امداد کرنی چاہی تو فوجی نقل و حمل میں بے شمار دشواریاں حائل ہو گئیں۔ مشرقی ایشیا میں جاپان جس تیز رفتاری سے ترقی کر رہا تھا' اس سے روکنا کسی بھی بڑی طاقت کے بس میں نہ تھا۔

دوسری خصوصیت اس کا عزم و حوصلہ تھا۔ مضبوط اعصاب کے حامل جاپانیوں کے متعلق یہ باتیں ناقابل تردید ہیں: اپنے بے نظیر کلچر کا احساس' شہنشاہ کا تقدس' ملک کا احترام' فوج کی عزت' نظم و ضبط کی پابندی۔ ان اوصاف کی بنا پر وہاں ایک ایسا سیاسی کلچر وجود میں آیا جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھا اور جسے مصائب و آلام ختم نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جاپان فوجی تحفظ' منڈی کے استحکام اور خام مال کے استعمال کی بدولت "عظیم تر مشرقی" ایشیا بن گیا۔ جب ۱۸۹۴ء میں کوریا کے حق ملکیت کے سلسلے میں چین اور جاپان میں لڑائی ہوئی تو اہل جاپان نے اپنی بری اور بحری بالا دستی کا کامیاب مظاہرہ کیا۔ مسلح جاپانی افواج نے زمیںاور سمندری جنگ میں اپنے بے مثال جذبے کا ثبوت پیش کیا تھا۔ اگرچہ جنگ کے خاتمے پر روس' فرانس اور جرمنی کی دھمکی کے پیش نظر حکومت جاپان کو پورٹ آرتھر اور آبنائے لیاؤ تنگ سے دست بردار ہونا پڑا' لیکن بعد ازاں جاپان نے انھیں دوبارہ حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ حکومت جاپان کے چند ہی ارکان بیرن ہیاشی کی اس رائے سے متفق نہ ہوئے ہوں گے:

"اگر نئے جنگی جہاز کی ضرورت ہے تو ہمیں ہر قیمت پر اسے تیار کر لینا

چاہیے۔ اگر ہماری فوج منظم نہیں ہے تو ہمیں ابھی سے اس کی اصلاح شروع کر دینی چاہیے۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو پورا فوجی نظام تبدیل کر دیا جائے۔

سر دست جاپان کو خاموشی سے بیٹھا رہنا چاہیے تاکہ اس کے خلاف پیدا ہونے والے شکوک و شبہات واضح ہو جائیں۔ اس دوران ملکی طاقت کی بنیادیں مستحکم کی جائیں۔ نیز ہم مشرق کے حالات پر نگاہ رکھیں اور اس موقع کی تاک میں رہیں جو ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔ جب وہ دن آئے گا تو جاپان اپنے مقدر کا خود فیصلہ کرے گا۔"

دس سال بعد جاپان کو بدلہ لینے کا موقع اس وقت مل گیا جب کوریا اور منچوریا سے وابستہ اس کے مفادات زار روس کے مفادات سے متصادم ہوئے۔ چنانچہ ایڈمیرل ٹوگو کے بحری بیڑے نے تاشو ہیما کے مقام پر روسی جہازوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس سے دیگر ملکوں کے بحریہ کے ماہرین خاصے متاثر ہوئے لیکن جاپانی معاشرے نے دیگر مبصرین کو بھی اپنے کارناموں سے حیرت میں ڈال دیا۔ آرتھر کی بندرگاہ پر جاپان کے اچانک حملے کو مغربی ملکوں میں بہت سراہا گیا تھا۔ (یہ رویہ دراصل ۱۸۹۴ء میں چین کے ساتھ جنگ میں اختیار کیا گیا تھا۔ پھر اسے ۱۹۴۱ء میں دہرایا گیا۔) ادھر جاپان کے قوم پرست ہر صورت میں فتح کے خواہشمند تھے چاہے اس کے لیے کیسی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ قابل تعریف بات یہ بھی تھی کہ جاپان کی بری فوج کے افسروں اور عام سپاہیوں نے آرتھر کی بندرگاہ کے قریبی میدان اور مکدن کے علاقے میں شاندار کارنامے انجام دیے۔ لاکھوں فوجی سرنگوں سے اٹے ہوئے میدانوں' بجلی کے تاروں اور مشین گنوں کی آگ برساتی ہوئی گولیوں سے گزرتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔ تاآنکہ روسی خندقوں پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ سموری قوم کا جذبہ موجودہ صنعتی جنگ میں محض خنجر سے لڑ کر میدان جیتنے کا اہل تھا۔ جیسا کہ ہم عصر فوجی ماہرین کی رائے ہے' عزم و حوصلہ اور نظم و ضبط اب بھی فوجی طاقت کے لیے از حد ضروری ہے۔ اور جاپان ان خصوصیات کا حامل تھا۔

ان تمام حقائق کے باوجود جاپان کو بڑی طاقت کا بھرپور درجہ حاصل نہ تھا۔ جاپان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے بہت زیادہ پس ماندہ ملک چین اور زار جیسے مختل کے روس سے محاذ آرائی کرنی پڑی۔ فوجی لحاظ سے آخرالذکر اوپر سے تو بھاری تھا' لیکن اندر سے ہلکا! پھر سینٹ پیٹر برگ اور مشرق بعید کے درمیان طویل فاصلہ حائل تھا۔ مزید برآں' انگلستان - جاپان کے معاہدے بحریہ ۱۹۰۲ء کے مطابق آخرالذکر کو اپنے ہی علاقے کی حدود میں جنگ کرنی تھی اور کسی تیسری طاقت کو مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ نیز' جاپان کی بحریہ کے پاس برطانیہ کے بنے ہوئے جنگی جہاز تھے اور بری فوج کرپ نامی بندوق سے مسلح تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے جاپان کے پاس سرمایہ نہ تھا۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ سے قرض لینا پڑا۔ پھر یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۹۰۵ء کے اواخر میں جاپان دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب روس کے ساتھ صلح کی بات چل نکلی۔ ٹوکیو کے عوام کو نرم شرائط پر مبنی یہ معاہدہ

پسند نہیں تھا اور روس آخری مرحلے میں معاہدے سے بھی منحرف ہو گیا۔ بہرحال' جاپان کی فتح یقینی تھی۔ چنانچہ مسلح افواج کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کی اقتصادی حالت مستحکم ہونے لگی۔ اور اسے علاقائی لحاظ سے ہی سہی' ایک بڑی طاقت تسلیم کر لیا گیا۔ غرض جاپان اس عہد پر چھا گیا۔ کوئی محض مشرق بعید میں جاپان کی رضا مندی کے بغیر کوئی اہم کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔ تاہم یہ حقیقت واضح نہیں تھی کہ آیا یہ ملک بڑے طاقتوں کے رد عمل کے جذبے کو اکسائے بغیر مزید آگے بڑھ سکتا تھا یا نہیں!

جرمنی

دو باتیں ایسی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جرمنی کے عروج سے بڑی طاقتوں کے توازن پر فوری اور وسیع اثرات مرتب ہوں گے۔ اول یہ کہ جرمنی نے یورپ کے قدیم اور مرکزی ریاستی نظام میں استحکام حاصل کیا تھا۔ اس کی تعمیر و تشکیل سے آسٹریا۔ ہنگری اور فرانس کے مفادات پر زد پڑی تھی۔ پھر اس کے وجود سے بڑی طاقتوں کی پوزیشن بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ دوسرے' جرمنی کی تیز رفتار ترقی تھی اس نے صنعتی' تجارتی اور فوجی لحاظ سے خاصی پیش قدمی کی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اس کی طاقت اٹلی اور جاپان سے تین یا چار گنا زیادہ تھی۔ یہ ملک فرانس اور روس سے بہت آگے تھا۔ اس برطانیہ پر بھی سبقت حاصل کر لی تھی۔ جون ۱۹۱۳ء میں لارڈ ویلی نے پرانی یادیں دہراتے ہوئے کہا تھا: "نصف صدی قبل جرمنی محض چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں کا ایک ایسا مجموعہ تھا جس پر نااہل جاگیرداروں کی حکمرانی تھی"۔ لیکن اب انہی موصوف کی زندگی میں یہ یورپ کا نہایت طاقتور ملک بن چکا تھا جسے روز بروز استحکام حاصل ہوتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۹۰ء کے بعد نصف صدی تک جرمنی عالمی سیاست میں ایک اہم اور حیران کن موضوع بنا رہا۔

یہاں جرمنی کی ہوشربا اقتصادی ترقی کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کی آبادی جو ۱۸۹۰ء میں کل ۴۹ ملین تھی' ۱۹۱۳ء میں بڑھ کر ۶۶ ملین ہو گئی۔ روس کے بعد سارے یورپ میں آبادی کے لحاظ سے جرمنی دوسرے نمبر پر تھا۔ چونکہ جرمنی میں تعلیم کا معیار بہت بلند تھا' سماجی سہولتیں میسر تھیں' اور فی کس آمدنی روسیوں سے کہیں زیادہ تھی' اس لیے یہ قوم صنعتی اور کھیتی دونوں لحاظ سے افضل و اعلیٰ تھی۔ اطالوی دستاویز کے مطابق وہاں کی فوج میں بھرتی ہونے والوں کی ناخواندگی کی شرح یہ تھی: ایک ہزار میں ۳۳۰۔ آسٹریا۔ ہنگری میں ۱۰۰۰ میں ۲۲۰ افراد ناخواندہ تھے۔ فرانس میں ہزار میں ۶۸ ان پڑھ تھے۔ لیکن حیرت ناک بات یہ تھی کہ جرمنی میں ایک ہزار فوجیوں میں سے صرف ایک ان پڑھا ہوتا تھا۔ وہاں سے فیض یاب ہونے والوں میں صرف پروشیا کی فوج ہی نہ تھی' بلکہ فیکٹری میں کام کرنے والے ہنرمند مزدور' تجربہ کار انجینئر' لیبارٹری میں کام کرنے والے کیمسٹ' فرموں کے منیجر اور سیلز مین بھی تھے۔ جرمنی کے سکول' پولی ٹیکنیک کے ادارے' یونیورسٹیاں ایسے باصلاحیت لوگوں کی کھیپ تیار کیا کرتی تھیں۔ زرعی تعلیم کی بدولت وہاں کے کسان کیمیائی کھاد اور دیگر جدید ذرائع استعمال کیا کرتے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر جرمنی میں فی ایکڑ پیداوار بڑی طاقتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی۔ امیر زادوں اور کسانوں کی لیگ کو

خوش رکھنے کے لیے غلہ کا کاروبار کرنے والوں کو تحفظاتی زرخانے کی سہولت فراہم کی جاتی تھی تاکہ امریکہ اور روس سے آنے والی سستی اشیاء کا بہ آسانی مقابلہ کیا جا سکے۔ اس متعلقہ صلاحیت کے باوجود قومی آمدنی اور قومی پیداوار اس درجے کی نہ تھی جو براعظم کی دیگر بڑی طاقتوں میں موجود تھی۔

یہ امر واقعہ ہے مذکورہ زمانے میں جرمنی اپنی صنعت سازی کی وسعت کی بنا پر ممتاز و منفرد مقام کا حامل ٹھہرا۔ اس کی کوئلے کی پیداوار جو ۱۸۹۰ء میں ۸۹ ملین تھی' ۱۹۱۳ء میں بڑھ کر ۲۷۷ ملین ہو گئی۔ یہ عدد برطانیہ کے ۲۹۲ ملین سے تھوڑا کم اور آسٹریا۔ ہنگری کے ۴۷ ملین سے کہیں زیادہ تھا۔ اسی طرح فرانس (۴۰ ملین) اور روس (۳۶ ملین) میں کوئلے کی پیداوار سے جرمنی کی پیداوار حد سے زیادہ تھی۔ فولادی پیداوار میں بھی جرمنی کو فوقیت حاصل تھی۔ ۱۹۱۳ء میں یہ ۱۷۶ ملین ٹن تھی جو برطانیہ' فرانس اور روس کی مجموعی پیداوار سے بھی بہت زیادہ تھی۔ سب سے زیادہ موثر کن بات یہ تھی کہ جرمنی بیسویں صدی کی نئی صنعت' یعنی بجلی' آلہ بصر اور کیمیکل میں امتیازی مقام حاصل کر چکا تھا۔ سیمنز اور اے۔ای۔جی جیسی بڑی بڑی صنعتیں لگی ہوئی تھیں۔ جہاں مجموعی طور پر ایک لاکھ بیالیس ہزار افراد ملازم تھے۔ اس طرح جرمنی کو یورپ میں بجلی کی صنعت پر فوقیت حاصل تھی۔ جرمنی کی بائر اور ہوچسٹ جیسی کیمیائی فرمیں دنیا کا ۹۰ فی صد رنگ تیار کرتی تھیں۔ اس کامیابی کا لامحالہ اثر جرمنی کی بیرونی تجارت پر بھی پڑا۔ اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۳ء کے دوران اس کی تجارت میں تین گنا اضافہ ہوا۔ اس طرح یہ ملک عالمی برآمد کنندگان کی حیثیت سے برطانیہ کے قریب تر ہو گیا۔ اس میں کوئی تعجب نہ ہو گا کہ جرمنی کے تجارتی جہازوں میں بھی خاصی ترقی ہوئی تھی۔ جنگ عظیم کے موقع پر انھیں دنیا میں دوسرا مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اس وقت عالمی صنعتی پیداوار میں جرمنی کا حصہ (۱۴٫۸ فی صد) برطانیہ (۱۳٫۶ فی صد) سے کچھ زیادہ تھا جبکہ فرانس (۶٫۱ فی صد) سے ڈھائی گنا بڑھا ہوا تھا۔ فی الحقیقت جرمنی یورپ کا اقتصادی پاور ہاؤس' بنا ہوا تھا اور اس کی سرمایہ کی کمی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی۔ بہرحال' اس امر پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ فریڈرک نومن جیسے قوم پرست جرمنی کی اس ترقی اور دنیا میں اس کے امتیازی مقام پر فخرکناں رہا کرتے تھے۔ وہ رقمطراز ہے:

> "یہ سب کچھ جرمن قوم کے طفیل ہے .... اسی کی بدولت یہ بری فوج' یہ بحری فوج' یہ دولت' یہ طاقت ظہور میں آئی ہے۔ حصول طاقت کے جدید اور موثر ذرائع کا استعمال اسی وقت ممکن ہے جب با عمل افراد بہار کے بار و ثمر کو صحیح وقت پر محسوس کر کے اس سے فیضیاب ہو جائیں"۔

نومن جیسے تشہیر پسند اور پان ۔ جرمن لیگ اور جرمن نیوی لیگ کا پریشر گروپ جو توسیعی عزائم کے حامی تھے' جرمنی کے یورپ اور سمندر پار علاقوں میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے بہت خوش ہوئے اور اس سلسلے کو جاری رکھنے پر مصر تھے۔ "نئی شہنشاہیت" کے اس دور میں ایسی ہی آواز پر بڑی طاقت کے ہاں سنائی دے رہی تھی۔ جیسا کہ گلبرٹ مورلے نے ۱۹۰۰ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ہر ملک یہ دعویٰ کر

رہا تھا کہ ہم ہی تمام قوموں میں اعلیٰ و افضل اور ان کی پسند ہیں۔ لہٰذا ہم دوسروں پر حکمرانی کرنے کے سزاوار ہیں"۔ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ۱۸۸۵ء کے بعد جرمنی کا حکمران طبقہ بھی اس نظریے کا حامی تھا کہ وسیع پیمانے پر مقبوضہ علاقے حاصل کیے جائیں۔ ایڈمرل ترپز کی یہ دلیل تھی کہ جرمنی کی صنعت سازی اور سمندر پار علاقوں کی فتح قانون فطرت کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہاں کے چانسلر بولو کا یہ فرمان تھا: "سوال یہ نہیں کہ کیا ہم نوآبادی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہمیں ہر صورت میں نوآبادیات قائم کرنی ہیں چاہے ہم چاہیں یا نہ چاہیں"۔ خود قیصر ولیم نے یہ اعلان کیا تھا کہ "یورپ کی محدود سرحدوں کے پار جرمنی کو بہت سے امور انجام دینے ہیں"۔ اس نے پورے براعظم پر "نپولین کی بالادستی" قائم کرنے پر بھی خاصا زور دیا تھا۔ یہ سب خیالات بسمارک کی باتوں سے بالکل ہی مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ جس نے علی الاعلان کہا تھا کہ جرمنی ایک بھرپور اور مکمل طاقت ہے۔ یہ یورپ میں اسٹیٹس کو قائم رکھنے کا حامی ہے اور سمندر پار نوآبادی قائم کرنے کی تمنی نہیں (حالانکہ ۱۸۸۴-۸۵ء میں ایسی کوشش کی گئی تھی)۔ جرمنی کے توسیعی عزائم کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات کا اظہار نامناسب ہوگا۔ فرانس' روس' برطانیہ' جاپان' ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور اطالیہ کے سیاست دان بھی اپنے اپنے ملک کی سربلندی کا اعلان کرتے تھے' مگر شائستہ لہجے اور دھیمے انداز میں!

جرمنی کے توسیع پسندانہ عزائم کے پس پردہ یہ جذبہ محرک تھا کہ یا تو اتنی طاقت ہو کہ اسٹیٹس کو کا خاتمہ کر دے یا پھر ایسے وسائل ہوں کہ طاقت کا یہ درجہ حاصل کر لے۔ چنانچہ جرمنی کی اس صلاحیت کا موثر انداز میں اظہار ۱۸۹۸ء کے بعد ہوا جب نہایت تیزی سے بحری بیڑے تیار کیے جانے لگے۔ ایڈمرل ترپز کی سرکردگی میں جرمنی کی بحریہ نے اتنی ترقی کی کہ اس کا مقام دنیا کے چھٹے بحری بیڑے سے بلند ہو کر دوسرے نمبر پر آگیا' یعنی برطانیہ کے شاہی بیڑے سے ایک درجہ کم۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنی کے کھلے سمندر والے بیڑے میں تیرہ نہایت دہشتناک جنگی جہاز' تیرہ پرانے قسم کے جہاز اور پانچ گشت کرنے والے جہاز شامل تھے۔ یہ اتنی طاقت ور بحریہ تھی کہ اس نے برطانیہ کے نیول ہیڈکوارٹرز کو مجبور کر دیا کہ وہ سمندر پار اپنے تمام اڈوں سے جہاز نکال کر بحر شمالی میں لے آئے۔ غرض جرمنی کے جہاز بہتر اندرونی تعمیر' مار کرنے والے شیل' دور بین' بندوق پر بہتر گرفت' رات کی ٹریننگ' وغیرہ کی وجہ سے نہایت اعلیٰ درجے کے تھے۔ اگرچہ ایڈمرل ترپز انگلستان کے مقابلے میں ایک مضبوط بحریہ تیار کرنے کا عزم رکھتا تھا لیکن اس کے لیے اسے خاطر خواہ فنڈ میسر نہ تھے پھر بھی اس نے ایک ایسی بحری فوج ضرور تیار کرلی تھی جو فرانس اور روس کے بحری بیڑے کو مرعوب کرتی رہتی تھی۔

بعض مبصرین کے خیال میں جرمنی کی بری فوج اتنی موثر نہ تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۱۳ء سے قبل کے عشرے میں پروشیا کی فوج زار روس کی عظیم فوج کے سامنے بے وقعت ہو کر رہ گئی تھی۔ البتہ یہ فرانسیسی لشکر کے ہم پایہ تھی۔ بہرحال' یہ ساری باتیں بظاہر فریب نظر تھیں۔ اندرون ملک پیچیدہ سیاست کی بنا پر جرمن کی حکومت نے بری فوج کو محدود دائرے میں رکھنے اور ترپز کے بحری بیڑے کو دفاعی بجٹ کا زیادہ حصہ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں بین الاقوامی حالات حد درجہ کشیدہ ہو گئے' تب جرمنی نے

بری فوج میں اعلیٰ پیمانے پر توسیع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء کے دوران بری فوج کا بجٹ ۲۰۴ ملین ڈالر سے بڑھ کر ۴۴۲ ملین ڈالر ہو گیا جبکہ فرانس میں یہ بجٹ محض ۱۸۸ ملین ڈالر سے بڑھ کر ۱۹۷ ملین ڈالر ہو گیا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس ہاؤکٹ کو پورا کرنے کے لیے جہاں فرانس میں ۸۹ فی صد جوانوں کو مجبور کیا جاتا تھا وہاں فرانس میں یہ شرح ۸۹ فی صد تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۱۴ء میں روس اپنی بری فوج پر تقریباً "۳۲۴ ملین ڈالر خرچ کر رہا تھا' لیکن قاعدے ہوئے کے تحت واضح رہے کہ جہاں روس میں قومی آمدنی کا ۶.۳ فی صد دفاعی اخراجات کے لیے وقف تھا' وہاں یہ شرح جرمنی میں صرف ۴.۶ فی صد تھا۔ برطانیہ کو چھوڑ کر یورپ کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں جرمنی واحد ریاست تھی جس نے "اسلحے کا بوجھ" برداشت کیا۔ علاوہ ازیں' پروشیا کی فوج میں لاکھوں محفوظ دستے بھی تھے جو پوری طرح مسلح اور حرکت و عمل کے لیے تیار رہتے تھے۔ چونکہ ایسے تمام سپاہی تعلیم یافتہ اور تربیت حاصل کیے ہوئے تھے' لہٰذا انہیں حملے کے لیے صف اول میں تعینات کیا جاتا تھا۔ یہ بات فرانس اور روس کی فوج میں نہیں تھی۔ فرانس کے جنرل اسٹاف کا یہ خیال تھا کہ محفوظ دستے پچھلی صف میں رکھ کر ہی استعمال میں لائے جائیں۔ ادھر روس میں یہ حالت تھی کہ محفوظ فوج کے لاکھوں سپاہیوں کے لیے نہ اسلحہ تھا اور نہ بوٹ' نہ یونیفارم تھے اور نہ ہی ان کی تربیت سازی کے لیے افسران تھے۔ جرمنی کی فوج میں محض مذکورہ بالا خصوصیات ہی نہ تھیں' ان میں مواصلات کا بہتر نظام تھا' نقل و حرکت طے شدہ وقت کے تحت تربیت تیزی سے ہوتی تھی' تربیت سازی اعلیٰ طریقے سے ہوتی تھی اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا استعمال ہوتا تھا۔

لیکن جرمنی کی سلطنت جغرافیائی اور سفارتی نقطہ نظر سے کمزور تھی۔ چونکہ یہ ملک براعظم کے مرکز میں واقع تھا' لہٰذا اس کی ترقی دیگر طاقتوں کی نظر میں کھٹکتی رہتی تھی۔ جرمن فوج تربیت اعلیٰ درجے کی تھی۔ پھر اس میں ہین - جرمن تحریک کا وہ جذبہ بھی کارفرما تھا جس کے تحت یورپ کی سرحدوں کی نئی تشکیل مقصود تھی۔ چنانچہ ان عوامل نے فرانس اور روس دونوں کو ہوشیار کر دیا۔ چنانچہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ ادھر برطانیہ جرمن بحریہ کی تیز رفتار ترقی سے پریشان تھا۔ پھر جرمنی کی دھمکیوں سے بلجیم' ہالینڈ اور شمالی فرانس لرزہ براندام تھا۔ ایک اسکالر کے بقول "جرمنی کا وجود ایک دائرے میں محدود ہے"۔ اگر جرمنی توسیعی عزائم کے تحت سمندر پار کے ممالک کا رخ کرتا' تو اسے دیگر بڑی طاقتوں کے حلقہ اثر سے گزرنا ناگزیر تھا۔ لاطینی امریکہ میں مہم جوئی کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے جنگ ضروری تھی۔ ۱۸۹۰ء کے عشرے میں جب اس نے چین پر قبضہ جمانا چاہا تو برطانیہ اور روس نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ پھر جب ۱۹۰۵ء میں جاپان کو روس پر فتح حاصل ہو گئی تو جرمنی کا یہ معاملہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جب اس نے بغداد ریلوے کو ترقی دینا چاہی تو لندن اور پیٹرسبرگ دونوں ہوشیار ہو گئے۔ پرتگالیوں کی نوآبادیات پر جب اس نے قبضہ جمانا چاہا تو برطانیہ مسلسل اس کی نگرانی کرتا رہا۔ جب ریاست ہائے متحدہ

امریکہ مغربی خطے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی تھیں جب جاپان چین میں تجاوز کر رہا تھا' جب روس اور
برطانیہ مشرق وسطیٰ میں مداخلت کر رہے تھے اور فرانس شمال مغربی افریقہ میں اپنی مقبوضات کو ہموار کرنے
میں لگا ہوا تھا' اس وقت جرمنی تہی دست تھا۔ جب بولوف نے اپنی ۱۸۹۹ء کی مشہور تقریر میں غصے بھرے
لہجے میں یہ کہا تھا کہ "ہم کسی بیرونی طاقت حتیٰ کہ جو پیٹر کو یہ کہنے کی اجازت نہیں دیں گے کہ اب کیا ہو گا؟
دنیا تو بالکل ہی تقسیم کر دی گئی ہے"۔ تو اس وقت وہ ہر جگہ پھیلے ہوئے اضطراب کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ امر
باعث تعجب نہیں کہ جرمنی کے تشہیربازوں نے دنیا کے از سر نو تقسیم ہونے کا نعرہ لگایا تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ تمام ابھرتی ہوئی طاقتیں اس عالمی نظام میں تبدیلی کی خواہاں نظر آتی ہیں جسے
پرانی اور مستحکم قوتوں نے اپنے مفاد میں وضع کر رکھا تھا۔ سیاسی نقطہ نظر سے یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ
کیا چیلنج کرنے والی طاقت دوسرے کو برانگیختہ کیے بغیر تبدیلی لا سکتی ہے۔ پھر جغرافیائی حدود اربعہ کے ساتھ
ساتھ سفارت کاری کو بھی اس امر میں خاصا دخل ہوتا ہے۔ چونکہ جرمنی کو جاپان جیسی جغرافیائی پوزیشن
حاصل نہ تھی لہٰذا اس کے طرز حکومت کو غیر معمولی طور پر معیاری ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ جب بسمارک
نے یہ محسوس کر لیا کہ دوسری پارلیمنٹ میں بے اطمینانی اور نفرت کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے تو اس نے
۱۸۷۱ء کے بعد دوسری بڑی طاقتوں (خصوصاً" صف اول کی برطانوی اور روسی قوت) کو یہ باور کرانے کی سعی
کی کہ مزید مقبوضات کے لیے جرمنی کو چنداں خواہش نہیں ہے۔ ولیم اور اس کے مشیر اپنا دم خم دکھانا
چاہتے تو تھے مگر انھیں ذرا کم ہی تشویش تھی۔ انھوں نے نہ صرف موجودہ نظام سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار
کیا بلکہ برلن میں ہونے والے فیصلے کو بھی پوشیدہ رکھا۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ انھوں نے یہ کہہ کر تو
اپنی صفائی پیش کر دی کہ شہنشاہیت کے اعلیٰ مقاصد کے تحت فیصلے کو پوشیدہ رکھنا ضروری ہے' لیکن یہ
شورش اور عدم استحکام کی علامت تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے ان تمام عوامل کو قریب سے دیکھا' ان کی حیرت
کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان تمام باتوں کی وجہ دراصل ولیم دوم کے کردار کی کمزوری تھی۔ ایک اور وجہ
بسمارک کے نفاذ شدہ قانون کی خامیاں تھیں اور انھوں نے ہی اس رجحان کو مہمیز کیا۔ یعنی' ایسا کوئی ادارہ
(مثلاً" کابینہ) نہ تھا جو حکومت کی جملہ پالیسیوں کا ذمہ دار ہوتا' مختلف شعبے اور مفاد پرست لوگ اپنا مقصد
پورا کرنے میں لگے رہے۔ افسران بالا کی جانب سے کوئی پوچھ گچھ نہ تھی نہ یہ کہا جاتا کہ جو کام ضروری
ہوں وہ پہلے کیے جائیں۔ ادھر بحریہ کو اس بات کا چسکا لگا ہوا تھا کہ مستقبل میں انگلستان کے ساتھ جنگ کرنی
چاہیے۔ جرمنی کی بری فوج فرانس کا صفایا کرنے کے درپے تھی۔ مالی امداد فراہم کرنے والے اور کاروباری
لوگ چاہتے تھے کہ افواج بلقان' ترکی اور مشرق قریب میں داخل ہو کر وہاں سے روسی اثر و رسوخ ختم
کردیں۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ جرمنی کے چانسلر بیتھمین ہول وگ نے جولائی ۱۹۱۴ء میں فریاد و فغاں کے
انداز میں کہا تھا: چیلنج تو ہر کسی کو دیتا ہے' ہر کا راستہ ناپتا ہے اور ان تمام سعی و عمل کے دوران کسی کو
کمزور نہیں کرتا ہے"۔ انا پسند اور شکی مزاج راستوں کی اس دنیا میں یہ اعلان کامیابی کی ضمانت نہ تھا۔

علاوہ ازیں' یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اگر سفارتی یا علاقائی سطح پر کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو اس
سے جرمنی کے ولیم کی پیچیدہ ملکی سیاست متاثر ہو گی۔ اس کے شہزادگان کا طبقہ زرعی مفادات میں کمی'

مزدوروں کی تنظیم اور سماجی جمہوریت کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے پہلے ہی فکر مند تھا۔ یہ امر واقعہ ہے
کہ ۱۸۹۷ء کے بعد "ویلٹ پولیٹک" کی تحریک کو فروغ دیا گیا تاکہ اس طرح اہل جرمنی کی توجہ اندرونی
سیاست سے موڑ کر اس جانب مبذول کر دی جائے۔ بہرحال' جرمن حکومت کو دوہرے خطرات کا سامنا تھا۔
اگر وہ کسی "بیرونی جوہٹر" سے محاذ آرائی سے فرار اختیار کر لیتی ہے تو جرمنی کا قوم پرست طبقہ قیصر اور اس
کے حواریوں کو مورد الزام قرار دے گا لیکن اگر بھرپور انداز میں جنگ چھڑ جاتی ہے تو یہ واضح نہیں کہ
مزدوروں' سپاہیوں اور جہاز رانوں پر مبنی عوام کی حب الوطنی کا جذبہ قدامت پرست جرمنی ریاست سے
نفرت پر غالب نہ آ جائے۔ جہاں چند مبصرین کی یہ رائے تھی کہ جنگ کی بدولت کہ قوم بادشاہ کی قیادت میں
متحد ہو جائے گی وہاں بعض دوسرے مبصرین کا خیال تھا کہ سماجی سیاست کے تانے بانے اور بھی مضبوط تر ہو
جائیں گے۔ بہرحال' سیاق و سباق کے حوالے سے اس کا مزید ذکر ضروری ہے۔ مثال کے طور پر' جرمنی کی
اندرونی خامیاں روس اور آسٹریا ۔ ہنگری کے مقابلے میں اتنی تشویشناک نہ تھیں' پھر بھی وہ موجود تو تھیں
اور طویل جنگ لڑنے میں جرمنی کی کارکردگی پر اثر انداز بھی ہو سکتی تھیں۔

بہت سے مورخین نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ سلطنت جرمنی کا ایک مخصوص معاملہ تھا اس
لیے کہ وہ ملک ایک مخصوص راستے پر گامزن تھا۔ پھر ایک نہ ایک دن اسے سوشلزم کی طرف آنا ہی تھا۔
۱۹۰۰ء میں جو سیاسی کلچر فروغ پا رہا تھا' اس کے مد نظر تجزیہ قائم کیا گیا ہے جو نہایت شدید ہے اور اس پر
نظرثانی کی ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ جرمنی میں سامیت کے خلاف جو رجحان کارفرما تھا' کم از کم اسی کے
مساوی یہ رجحان روس اور آسٹریا میں بھی موجود تھا۔ جس طرح جرمنی میں جنگ جویانہ حب الوطنی کا دور دورہ
تھا' وہی صفت فرانس میں بھی پائی جاتی تھی۔ جرمنی ہی کی طرح جاپان میں بھی انفرادی ثقافت اور عظمت کا
احساس جاگزیں تھا۔ مذکورہ ہر طاقت اپنی جگہ انفرادی خصوصیت کی حامل تھی اور شہنشاہیت کے دور میں اسے
قائم و دائم رکھنے کی خواہشمند بھی تھی۔ تاہم' جرمنی کچھ ایسی خصوصیات کا حامل تھا جن کی خاصی اہمیت تھی۔
یہ ایک ایسی بڑی طاقت تھی جسے مغربی جمہوریتوں جیسی جدید اور صنعتی صلاحیت حاصل تھی۔ وہ مشرقی
سلطنتوں کے متعلق استبدادی فیصلہ کرنے کا بھی مجاز تھا۔ یہ ابھرنے والی وہ نئی بڑی طاقت تھی جو مروجہ نظام کو
چیلنج کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ بایں ہمہ' اس نے اپنی سرحدوں کو مشرقی اور مغربی سمت میں جو
پھیلا دیا تھا وہ طاقتور پڑوسیوں کو زچ کر کے ہی کیا تھا۔ یہ وہ ملک تھا جس کی ترقی نے کے لیو کے الفاظ میں
"بلا واسطہ" یا بالواسطہ" یورپ کے توازن کو ڈگمگا دیا تھا۔ غرض یہ ملک حیرت ناک خصوصیات کا مجموعہ تھا جو
ترپز کے قول کے مطابق "نقصان کی تلافی کے لیے جان کی بازی تک لگا دیا کرتا تھا"۔

ابھرتی ہوئی حکومتوں کے لیے حالات سے نبرد آزما ہونا ناگزیر تھا' لیکن اس زمانے کی قدیم بڑی
طاقتوں کو بھی اپنی ساکھ اور وقار کی بحالی کی خاطر کچھ نہ کچھ کرنا لازمی تھا۔ یہاں یہ ضروری ہو گا کہ مذکورہ
تین بڑی طاقتوں ـــــ آسٹریا ـ ہنگری' فرانس اور برطانیہ ـــــ کے درمیان پائی جانے والے اہم اختلافات
کا جائزہ لے لیا جائے۔ اور خاص طور پر اول الذکر اور آخرالذکر کے مابین فرق کو بھی واضح کر دیا جائے۔
عالمی معاملات میں ان کے عمل دخل کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام کی تمام طاقتیں انیسویں صدی

کے اواخر میں نمایاں طور پر کمزور ہو چکی تھیں اور ویسی زور آور نہیں رہی تھیں جیسی پچاس ساٹھ سال قبل تھیں، حالاں کہ اس وقت ان کا دفاعی بجٹ خاصا وسیع تھا اور ان کی نو آبادیاں بھی دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر وہ یورپ میں مزید مقبوضات کی خواہشمند بھی تھیں، خاص طور پر فرانس اور آسٹریا - ہنگری! مزید برآں، ان ملکوں کی قیادت بین الاقوامی منظر سے بخوبی آشنا تھی۔ وہ اس امر کا ادراک کر چکی تھیں کہ سابقہ حکمرانوں کے برعکس موجودہ قیادت کو نہایت پیچیدہ قسم کے عالمی ماحول کا سامنا ہے۔ چنانچہ موجودہ حکمران نئے اور بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے کے پیش نظر اپنی پالیسیوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے مجبور ہو چکے تھے۔

آسٹریا۔ ہنگری

اگرچہ آسٹریا - ہنگری کی سلطنت مستحکم بڑی طاقتوں میں بے حد کمزور واقع ہوئی تھی اور ٹیلر کے بقول "اپنے اعلیٰ درجے سے گرتی جا رہی تھی"، لیکن اقتصادی اعداد و شمار کے پیش نظر ایسی صورت حال نہ تھی۔ نقل مکانی کے باوجود وہاں کی آبادی میں معتدبہ اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۸۹۰ء میں جو آبادی ۴۱ ملین تھی وہ ۱۹۱۳ء میں بڑھ کر ۵۲ ملین ہو گئی۔ گویا یہ ملک اس لحاظ سے فرانس اور اٹلی کے قریب تھا اور برطانیہ سے کچھ آگے! ان تمام عشروں میں وہاں صنعت سازی کا کام بھی خاصا ہوا۔ البتہ وہاں تبدیلی کی رفتار ۱۹۰۰ء سے قبل جس طرح تیز تھی ویسی بعد ازاں نہیں رہی۔ ۱۹۱۳ء تک وہاں کوئلہ کی پیداوار ۴۸ ملین ٹن تھی جو فرانس اور روس کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ نیز، فولادی پیداوار اور توانائی کے استعمال میں بھی یہ ملک دونوں اتحادی قوتوں سے کم نہ تھا اس کی کپڑے کی صنعت ترقی پر تھی۔ شراب اور شکر کی پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا۔ گیلیشیا کے علاقے میں تیل کی دریافت ہوئی۔ ہنگری کے ریاستی علاقوں میں تکنیکی عمل تیزی سے ہوا۔ سکودا میں اسلحہ سازی کا کام دو چند ہوگیا۔ بڑے بڑے شہروں میں بجلی فراہم کی گئی۔ حکومت نے ریلوے کو نہایت جوش و جذبے کے ساتھ ترقی سے ہم کنار کیا۔ بیروچ کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۱۳ء میں آسٹریا - ہنگری کی مجموعی قومی پیداوار فرانس کے مساوی تھی۔ لیکن یہ بیان کچھ مشکوک نظر آتا ہے۔ جیسا کہ قیریر نے دعویٰ کیا تھا "آسٹریا - ہنگری کا یورپی طاقتوں" میں جو حصہ تھا وہ ۱۸۹۰ء میں ۳ فی صد تھا اور ۱۹۱۰ء میں محض ۴ء۷ فی صد تک جا پہنچا۔ تاہم، یہ حقیقت واضح ہے کہ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۳ء تک اس سلطنت کی ترقی کی شرح یورپ میں بہت نمایاں تھی۔ پھر اس کی صنعتی کارکردگی بھی روس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر تھی۔

لیکن، جب آسٹریا - ہنگری کی اقتصادی اور سماجی حالت کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جاتا ہے تو بہت سی اہم خامیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ فی کس آمدنی اور پیداوار کی شرح علاقائی لحاظ سے خاصی مختلف تھی۔ اس طرح ان علاقوں میں جو آپس سے بوکووینا تک پھیلے موجود سماجی، اقتصادی اور گروہی عناصر کا فرق ظاہر ہو جاتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۱۰ء میں صرف گیلیشیا اور بوکووینا کی ۷۳ فی صد آبادی کھیتی باڑی میں معروف تھی جبکہ اس کے مقابلے میں پوری سلطنت کی ۵۵ فی صد آبادی زراعت سے وابستہ تھی۔ سب سے اہم اور تشویش ناک بات دولت کی غیر مساوی تقسیم تھی۔ آسٹریا کے زیریں علاقے

میں فی کس آمدنی ۸۵۰ کراؤن تھی۔ بوہیمیا میں یہ شرح (۷۶۱ کراؤن) گیلیشیا (۳۱۶ کراؤن)، بوکووینا (۳۱۰ کراؤن) اور ولماتیا (۲۶۴ کراؤن) سے بہت زیادہ تھی۔ جہاں آسٹریائی صوبوں اور بوہیمیائی علاقوں میں صنعتیں لگ رہی تھیں اور ہنگری میں زراعت فروغ پا رہی تھی، وہاں سلاوی کے غریب زدہ خطوں میں محض آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آسٹریا - ہنگری میں فی کس صنعتی پیداوار دیگر بڑی طاقتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔ اپنی پیداواری صلاحیت کے باوجود، اس ملک کا عالمی پیداوار میں ان دنوں محض ۵ء۴ فی صد حصہ تھا۔ اقتصادی لحاظ سے یہ ایسی مضبوط بنیاد نہ تھی کہ آسٹریا - ہنگری جیسا ملک فوجی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوتا۔

مذکورہ خامیوں کی تلافی وسیع پیمانے پر قومی اور ثقافتی ہم آہنگی سے ممکن تھی جیسا کہ جاپان اور فرانس میں اس کی مثال پہلے سے موجود تھی۔ لیکن افسوس کہ ویانا کے مقدر میں ایسی آبادی کا جھگڑا تھا جو زبان، نسل اور گروہ بندی میں بٹی ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر جب ۱۹۱۴ء میں جنگ کا آغاز ہوا تو فوج کو نقل و حرکت کا پیغام پندرہ بالکل ہی مختلف زبانوں میں دیا گیا تھا۔ شہنشاہ فرانسس جوزف اور اس کے مشیروں کے لیے جرمن اور چیک زبان بولنے والوں کا باہمی اور دیرینہ جھگڑا اتنا پریشان کن نہیں تھا، لیکن "نوجوانان چیک تحریک" نے اس کو مزید پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اگرچہ ۱۸۶۷ء کے مابعد ہنگری اور ویانا مساوی درجے کے پارٹنر تھے، لیکن ان کے تعلقات زنخنائے 'گروہی اقلیتی فرقے کے ساتھ سلوک' فوج میں میگیار نسل والوں کی بھرتی جیسے معاملے میں اس درجہ کشیدہ ہو گئے کہ ۱۸۹۹ء میں مغربی مبصرین یہ قیاس آرائی کر رہے تھے کہ پوری سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ادھر فرانس کا وزیر خارجہ ڈلکاسے "روس کے ساتھ دوہرے اتحاد" کی خفیہ بات چیت کرنے لگا تاکہ جرمنی آسٹریا کے علاقوں پر قبضہ نہ کر لے اور ایڈریاٹک کے ساحل تک نہ پہنچ جائے۔ ۱۹۰۵ء کے قریب ویانا میں فوج کا جنرل اسٹاف ہنگری پر قبضے کے منصوبے نہایت خاموشی سے بنا رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ حالات جوں ہی خراب ہوں، فوج کے ذریعے قبضہ کر لیا جائے۔ ویانا میں چیک اور میگیار نسل والوں کے قومی نوعیت کے مسائل حل نہیں ہو پائے۔ جنوب میں اٹلی والے اپنے علاقوں میں جرمن تحریک کے پرچار پر سخت غصے میں تھے اور مدد کے لیے روم سے مصالحت کرنے لگے۔ ادھر رومانیہ کے پھنسے ہوئے لوگ مشرقی سمت میں بخارسٹ کی جانب امداد کے لیے نظر دوڑا رہے تھے۔ اس کے برعکس پولینڈ والے کچھ نہ کچھ مطمئن اور خاموش تھے کیونکہ ہیبسبرگ سلطنت کے زیر سایہ جو حقوق حاصل تھے وہ ان علاقوں سے بدرجہا بہتر تھے جہاں جرمنی اور روس کی حکمرانی تھی۔ لیکن مذکورہ سلطنت کو سب سے زیادہ خطرہ جنوب کے سلاوی لوگوں سے تھا۔ وہاں کا منحرف طبقہ سربیا اور روس سے امداد کا طلب گار تھا۔ بہرحال، جنوب کے ان سلاویوں کے مطالبات کے سلسلے جنبانی اکثر و بیشتر چلتا رہا تھا۔ اس کوشش کے پس پردہ ویانا کا آزاد پسند طبقہ تھا۔ لیکن میگیار نسل کے لوگ اس پیش رفت کی شدید مخالفت کیا کرتے۔ وہ نہ صرف ہنگری کے اقتدار کے کٹر مخالف تھے بلکہ اپنی گروہی اقلیت کا امتیاز اندرون ہنگری نہایت شد و مد کے ساتھ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ چونکہ اس مسئلے کا کوئی سیاسی حل نہ نکل سکا تو آسٹریا - جرمنی کے قوم پرست مثلاً" چیف آف اسٹاف جنرل کونریڈ نے یہ رائے دی کہ سربیا والوں اور ان کے حامیوں کو طاقت کے ذریعے کچل دیا جائے۔ شہنشاہ

فرانس جوزف کی سختی کے باوجود یہ مسئلہ جوں کا توں رہا کہ سلطنت کے وجود کو بھی اس سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا۔

بلا شبہ یہ تمام باتیں آسٹریا - ہنگری کی طاقت پر آنچ انداز ہوتی رہیں' اور وہ بھی مختلف انداز میں! یہ بات نہیں تھی کہ فرقہ واریت کی وجہ سے فوجی قوت کمزور پڑ گئی تھی۔ فوج ہر طرح مربوط اور متحد تھی۔ پھر وہ ملک کی متنوع زبانوں میں دیئے گئے احکامات پر پوری طرح عمل پیرا رہا کرتی تھی۔ جب وہ محافظ دستہ یا کسی مہم پر تعینات کی جاتی تو اس کا قدیم رویہ "تقسیم کرکے حکومت کرو" فراموش نہیں ہوا کرتا تھا۔ تاہم بعض حالات میں چیک اور ہنگری کے فوجی دستے پر مکمل تعاون کے لیے بھروسہ کرنا مشکل تھا۔ حتیٰ کہ کروٹس کی وفاداری بھی مشکوک تھی حالانکہ وہ ایک زمانے سے سرحدوں کے محافظ چلے آرہے تھے۔ یہ چیز ہنگری والوں کے رویے کی وجہ سے ختم ہوئی۔ ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ ویانا اپنے سابقہ طرز عمل کو روبہ کار لاتے ہوئے ان مطالبات کا حل پیش کرتا تھا' یعنی کمیٹیاں بنتیں' نوکریاں فراہم کی جاتیں' ٹیکس میں چھوٹ دی جاتی' ریلوے لائن بچھائی جاتی اور اسی طرح کے کام انجام دیے جاتے۔ ۱۹۱۴ء میں تیس لاکھ سے زائد سول ملازمین مختلف اداروں میں خدمات انجام دینے پر مامور تھے' مثلاً" اسکول' ہسپتال' فلاحی مراکز' محکمہ محصولات' ریلوے' ڈاکخانہ وغیرہ۔ ان تمام شعبوں میں اتنی وافر رقم خرچ ہو جاتی تھی کہ فوج کے لیے کم ہی بچتی تھی۔ رائٹ کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق دوسری طاقتوں کے برعکس آسٹریا - ہنگری کی سلطنت میں قومی آمدنی کا بہت ہی قلیل حصہ دفاعی اخراجات کے لیے مختص ہوا کرتا تھا۔ نتیجتاً" اس کے بحری بیڑے فنڈ کی عدم دستیابی کی وجہ سے اٹلی' فرانس وغیرہ کی بحریہ کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔ علاوہ ازیں' روس اور پروشیا کی بری فوج کے لیے جو مجموعی رقم مختص کی جاتی تھی' اس کا ایک تہائی یا نصف حصہ اس ملک کی فوج کے لیے مخصوص تھا۔ فوجی اسلحہ' خصوصاً" توپیں ایک تو دقیانوسی تھیں' دوسرے عددی لحاظ سے بھی کم تھیں۔ فنڈ کی قلت کی وجہ سے افرادی قوت کا محض ۳۰ فی صد حصہ ملازم رکھا جاتا تھا۔ ان میں سے اکثر افراد کو "مستقل رخصت" پر بھیج دیا جاتا تھا۔ نیز' ان لوگوں کو محض ۸ ہفتے کی تربیت دی جاتی تھی۔ یہ طریقہ کار بھاری تعداد میں ایسے باہنر افراد تیار نہ کرسکا جو جنگ کے دنوں میں "محفوظ دستہ" کے طور پر کام آتے۔

جب ۱۹۰۰ء کے بعد کے عشرے میں عالمی بحران پیدا ہوا تو اس وقت آسٹریا - ہنگری کی فوجی پوزیشن خطرے سے دوچار تھی۔ اندرونی تقسیم سے ملک کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ پھر بہت سے پڑوسی ملکوں کے ساتھ تعلقات بھی پیچیدہ تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' اس کی اقتصادی حالت برطانیہ اور جرمنی جیسی طاقتوں کے مساوی نہ تھی۔ دیگر بہت سے ملکوں کے برعکس یہاں فی کس آمدنی کا نہایت قلیل حصہ دفاع پر خرچ کیا جاتا تھا۔ نیز' اس ملک کے موزوں ترین نوجوانوں کی نہایت قلیل تعداد فوج میں بھرتی کی جاتی تھی۔ اس سلطنت کے اس قدر دشمن تھے کہ جنرل اسٹاف کو مہم جوئی کے لیے نت نئے طریقے وضع کرنے پڑتے تھے۔ یہ پیچیدہ صورت حال دوسرے ملکوں میں خال خال تھی۔

یہ بات کہ سلطنت آسٹریا - ہنگری کے بہت سے مضبوط دشمن ہونے کی اصل وجہ اس کی منفرد قسم کی جغرافیائی اور گروہی صورت حال تھی۔ اتحاد ثلاثہ کے باوجود ۱۹۰۰ء کے بعد اس کی اٹلی کے ساتھ

کشیدگی نہایت شدید ہو گئی۔ وہاں کا جنرل کونارڈ اپنے جنوب والے اس پڑوسی پر دھاوا بول دینے کا اکثر کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا رہتا تھا۔ اگرچہ وزارت خارجہ اور شہنشاہ نے جنرل کی مذکورہ رائے کو ہمیشہ کالعدم قرار دے دیا' اس کے باوجود اٹلی سے ملحقہ سرحدوں پر محافظ دستے تعینات کیے گئے اور قلعہ بندی بھی کی گئی۔ ادھر کچھ فاصلے پر ویانا' رومانیہ سے ہراساں دکھائی دیتا تھا۔ جو ۱۹۱۲ء سے ہی خطرے کی علامت بن چکا تھا جب اس نے مخالف کیمپ میں شمولیت اختیار کرلی تھی لیکن سربیا نے سب سے زیادہ توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اس نے مونٹی نیگرو کے ساتھ مل کر جنوب کے سلامیوں کو ابھارنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک ایسی خطرناک تحریک جنم لے رہی تھی جس کا ازالہ ضروری تھا۔ لیکن اس مسئلے کے حل کرنے میں ایک دشواری حائل تھی۔ اگر سربیا پر حملہ کیا جاتا ہے تو آسٹریا - ہنگری سلطنت کا سب سے طاقتور دشمن روس برافروختہ ہو کر شمال مشرقی محاذ پر بلہ بول دے گا جبکہ اپنے ملک کی فوج کا بیشتر حصہ جنوب کی سمت پیش قدمی کر رہا ہوگا۔ اگرچہ نہایت جنگجو مزاج کونارڈ نے یہ کہا تھا کہ یہ تو سفارت کاروں کا کام ہے کہ وہ سلطنت کو تمام دشمنوں کے ساتھ فوری جنگ کرنے سے باز رکھے' لیکن ۱۹۱۴ء سے قبل کے عرصے میں اس نے جو منصوبہ تیار کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فوج کو محاذ آرائی کے لیے باقاعدہ تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تفصیل کے مطابق نو دستوں پر مشتمل ایک خصوصی فوج (اے-اسٹافل) اٹلی یا روس پر حملے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ تین دستوں پر مشتمل فوج (منی ملکرپ بلکان) سربیا - مونٹینیگرو کے خلاف لڑنے کے لیے مخصوص تھی۔ علاوہ ازیں چار دستوں پر مشتمل لشکر (بی-اسٹافل) محفوظ دستے کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد "اے-اسٹافل" کی مدد کرکے اسے مزید طاقت ور بنانا تھا۔ یا پھر اٹلی اور روس سے خطرہ نہ ہونے کی صورت میں منی "ملکرپ بلکان" کے ساتھ مل کر سربیا پر پوری شدت سے حملہ کرنا تھا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے' ان تمام باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ سلطنت آسٹریا - ہنگری اپنے کمزور وجود کے ساتھ بڑی طاقت جیسا کارنامہ دکھانا چاہتی تھی۔ اس کے باعث اس کی تمام محاذوں پر مورچہ سنبھالنے کی کوشش نے سلطنت کو ہر جگہ کھوکھلا کرکے رکھ دیا۔ سب سے زیادہ خرابی اس وقت ہوئی جب ریلوے کو نہایت اعلیٰ اور اسے کنٹرول کرنے والے افسروں کو باصلاحیت بنانے کی ضرورت نے حکومت پر اخراجات کا خاصا بوجھ ڈال دیا۔ ایک اور حقیقت بھی تھی جسے ویانا کے مبصرین ۱۸۷۰ء سے بادل ناخواستہ تسلیم کر رہے تھے' یعنی بڑی طاقتوں کی جنگ چھڑنے کے موقع پر آسٹریا - ہنگری کو جرمن حکومت کی حمایت کی شدید ضرورت تھی۔ آسٹریا اور اٹلی کے درمیان جنگ میں اس کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی کہ کونارڈ کی تشویش کے باوجود یہ نچلی سطح کی جنگ تھی۔ البتہ سربیا کے ساتھ جنگ چھڑنے کی صورت میں اور روس کی اسے مدد حاصل ہونے کے نتیجے میں جرمنی کی فوجی امداد لازمی تھی۔ ویسے ۱۹۱۴ء کے فوراً" بعد کونارڈ اس معاملے میں جرمنی کی یقین دہانی کے لیے مسلسل کوشاں بھی تھا۔ بہرحال' حملے کی اس عجیب و غریب صورت سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے (جسے معاصرین نے تو تسلیم کرلیا تھا' لیکن بعد کے مورخین نے رد کر دیا) کہ اگر بلکان اور خود سلطنت کے اندر قوم پرستوں کی شورش جاری رہتی تو اس صورت میں قیصر جوزف کی ورثے والی شہنشاہت کا قائم رہنا مشکل تھا لیکن جب ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو یورپ کا توازن برقرار نہ رہ سکا۔

فرانس

۱۹۱۴ء میں فرانس، آسٹریا - ہنگری کے مقابلے میں زیادہ فائدے میں تھا۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ اس کا صرف ایک ہی دشمن، جرمنی تھا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے جملہ قومی وسائل معرف میں لائے جاتے تھے۔ یہ صورت حال ۱۹۸۰ء کی دہائی میں نہ تھی جب فرانس برطانیہ کو مصر اور مغربی افریقہ میں چیلنج کیا کرتا تھا۔ تب وہ انگلستان کے شاہی بیڑے کا بھی مقابلہ کیا کرتا، اٹلی سے بھی لڑتا اور جرمنی سے بدلہ لینے کے لیے بھی تیاری کیا کرتا۔ بہرحال، محتاط قسم کے سیاست دانوں نے ملک کو تباہی کے دہانے سے واپس لیا۔ پھر روس کے ساتھ قدیم اتحاد دوبارہ قائم کیا گیا۔ اس کے باوجود اس ملک کا فوجی معاملہ خاصا گمبھیر تھا۔ اور اس کا دشمن جرمنی بہت زیادہ طاقتور بنا ہوا تھا۔ ادھر اطالیہ کی بحریہ اور نوآبادیات بھی فرانس کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی تھیں۔ اس سے نہ صرف اس کے وجود کو خطرہ لاحق تھا بلکہ جنگ چھڑنے کی صورت میں فرانس کا اہم دشمن جرمنی بھی اطالیہ کی مدد کو آنے کا امکان تھا جس کے باعث آسٹریا - ہنگری کو اپنی فوج کے کئی ڈویژن شمال مشرق میں تعینات کرنے ہوتے۔ بحریہ میں قدیم نوعیت کا یہ مسئلہ پھر کھڑا ہو گیا کہ بحری بیڑے کو بحیرہ روم میں رکھا جائے یا بحراوقیانوس کی بندگاہوں پر لنگر انداز کیا جائے یا پھر بحری فوج کو دو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے۔

یہ حالات اس وقت مزید پیچیدہ ہو گئے جب انگلستان اور فرانس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور اس کے نتیجے میں برطانیہ نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۸۴ء کے بعد سے دونوں ملک بحری طاقت کی سابقت میں محدود ہو کر رہ گئے۔ اس طرح برطانیہ کو بحیرہ روم میں اپنے قائم شدہ مواصلاتی نظام میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ پھر اسے بارہا یہ دھڑکا بھی لگا رہا کہ فرانس چینل پار کر کے حملہ نہ کر دے۔ لیکن اس سے زیادہ گمبھیر فرانس اور برطانیہ کے درمیان نوآبادیاتی جھگڑے تھے۔ دونوں ۵-۱۸۸۴ء میں کانگو کے معاملے میں باہم دست و گریبان رہے۔ پھر ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کا تمام عشرے میں مغربی افریقہ پر تسلط جمانے کے سلسلے میں دونوں لڑتے بھڑتے رہے۔ ۱۸۹۳ء میں سیام کے مسئلے پر محاذ آرائی شروع ہونے کے قریب تھی سب سے بڑی لڑائی ۱۸۹۸ء میں رونما ہوئی اور اس کے نتیجے میں وادی نیل کے سلسلے میں دونوں میں تیرہ سال سے قبضہ جاری تھا۔ اس میں اس وقت شدت آ گئی جب کچنار کی فوج اور مرچند کے چھوٹے سے مہم جو دستے میں فاشودہ کے مقام پر ٹکراؤ ہو گیا۔ اگرچہ فرانس نے اس موقع پر پسپائی اختیار کر لی تھی، لیکن شہنشاہی جذبہ ان میں ماند نہیں پڑا تھا۔ نہ تو ٹمبکٹو کے باشندوں نے اور نہ ہی ٹونکن کے رہنے والوں نے فرانس کی حکومت کو روبہ زوال سمجھا۔ فرانس نے ۱۸۷۱ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان اپنی نوآبادیات میں ۳۰۵ ملین مربع میل کا اضافہ کر لیا تھا۔ اس طرح برطانیہ کے بعد سب سے زیادہ سمندر پار کے نوآبادیاتی علاقے اس کی تحویل میں تھے۔ اگچہ ان علاقوں کی معاشی حالت مستحکم نہ تھی، پھر بھی فرانس نے وہاں ایک اچھی خاصی فوج تیار کر لی تھی اور اس نے ڈکار سے سائیگون تک بحری اڈے قائم کر رکھے تھے۔ حتیٰ کہ لیونٹ اور جنوبی چین میں جہاں فرانس کی کوئی نوآبادی نہ تھی، اس کا اثر و رسوخ بہت وسیع تھا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ فرانس نے اس قدر موثر انداز میں نوآبادیاتی منصوبے کو جاری و ساری رکھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں چند افسروں، کالونی کے گورنروں، نوآبادیاتی نظام کے حمایتیوں کو اس بات کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ اس معاملے کو فروغ دیں۔ پھر اس "تیسری جمہوریت" میں وزارتیں جس تیزی سے بدل رہی تھیں ان کے پیش نظر اس رجحان پر کنٹرول کرنا مشکل بھی تھا۔ فرانس کی پارلیمانی سیاست نے مستقل عہدے والے افسروں اور ان کے نوآبادیاتی رجحان رکھنے والے دوستوں کے ہاتھوں میں شاہی منصوبہ سازی کو دے کر شہنشاہیت کو تقویت تو پہنچا دی تھی، لیکن بری اور بحری افواج کے معاملات میں کوئی خوشگوار پیش قدمی نہیں کی تھی۔ مثال کے طور پر حکومت کے جلد جلد بدل جانے سے وزیر جہاز رانی بھی بدل جاتا تھا۔ بسا اوقات ایسا وزیر محض خانہ پری کے لیے ہوا کرتا تھا۔ لیکن بعض تو بحری امور کے متعلق نپی تلی رائے بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ فرانس کی بحریہ کو کثیر رقم مختص کیے جانے کے باوجود یہ بطریق احسن خرچ نہیں ہوتی تھی۔ ایک حکومت کے دور کا پروگرام دوسری حکومت کے آتے ہی تبدیل ہو جاتا تھا۔ یعنی ایک کا منصوبہ تجارتی جہاز پر حملہ کرنے والے بیڑے کی تیاری کا ہوتا تھا جبکہ دوسری حکومت جنگی جہازوں کی تعمیر و تشکیل پر زور دیتی تھی۔ اس طرح فرانسیسی بحریہ کے پاس بھانت بھانت کے جہاز اکٹھا ہو جاتے۔ پھر لطف یہ کہ ان کا معیار برطانیہ یا جرمنی کے جہازوں کے مقابلے میں بہت ادنیٰ ہوتا تھا۔ بہرحال، بحری فوج پر سیاسی اثرات بری فوج کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھے۔ وہاں کے کروپس (Crops) افسران جمہوریت کے ان سیاست دانوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ پھر سول اور فوجی افسران کے جھگڑوں نے ویسے بھی فرانس کو خاصا ضعف پہنچایا تھا۔ اس طرح فوج کی وفاداری اور کارکردگی پر حرف آ رہا تھا۔ جب ۱۹۱۴ء کے ابتدائی دنوں میں جرمنی کے ساتھ جنگ ہوئی تو اس وقت سول اور فوجی افسران کا باہمی جھگڑا وقتی طور پر موقوف ہو گیا تھا۔ بہرحال، بہت سے لوگوں کو خیال تھا کہ سیاست کے اس درجہ تسلط نے فرانس کی مسلح افواج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔

حکومت فرانس معاشی بحران سے بھی دو چار تھی۔ یہ معاملہ پیچیدہ ہے جسے ماہرین اقتصادیات نے اور بھی گمبھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ بہرحال مثبت صورت حال کی جھلک بھی دیکھ لی جائے:

> "مذکورہ دور میں بینکاری اور مالیاتی اداروں کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ یہ سب صنعت میں سرمایہ کاری بھی کر رہے تھے اور بیرون ملک قرضے بھی فراہم کر رہے تھے۔ لوہے اور فولاد کے جدید طرز کے کارخانے قائم کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے پلانٹ تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ سب خصوصی طور پر لورین کے علاقے میں نصب کیے گئے تھے جہاں فلزیات کی بہتات تھی۔ فرانس کے شمال میں بھی جہاں کوئلے کی کانیں تھیں، وہاں بھی صنعتیں لگائی گئیں۔ انجینئرنگ اور صنعت سازی کے شعبے میں اہم پیش رفت ہوئی۔ فرانس کے پاس ایسے نامی گرامی کار انداز اور موجد افراد تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے

> اوائل میں فولاد سازی' انجینئرنگ' موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں کی تعمیر و تشکیل میں امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا۔ وہاں شیسنڈیز' پیگوٹ' میچلن اور رینالٹ جیسی مشہور فرمیں موجود تھیں۔"

ہنری فورڈ کے کثیر الپیداواری طریقے رائج ہونے سے قبل ہی فرانس دنیا میں آٹوموبائیل کا ممتاز پیداکار قرار دیا جاتا تھا۔ یہاں ۱۸۸۰ کی دہائی میں نہایت شدومد سے ریلوے کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلیگرام' ڈاک اور اندرون ملک بحری سفر کے نظام میں ترقی ہوئی۔ اس کے نتیجے میں قومی نوعیت کی منڈیوں کو فروغ دینے کا رجحان عام ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں میلن نرخنامے کے ذریعے زراعت کو تحفظ فراہم کیا گیا۔ اعلی قسم کے مال تیار کرنے کا رجحان عام ہوا۔ فی کس آمدنی بھی اچھی خاصی تھی۔ چنانچہ اقتصادی ترقی اور آبادی میں قلیل اضافے کے نتیجے میں پیداوار کا گوشوارہ متاثر کن تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ فرانس گردشی سرمایہ کی بدولت خاصا امیر ملک تھا۔ ملک کی عمدہ سفارت اور اعلی فوجی صلاحیت کو بروئے کار لانے میں یہ سرمایہ بہت مفید ثابت ہوتا تھا' مثلاً" ۱۸۷۱ء میں جرمنی کے عائد شدہ تاوان / جرمانہ کی ادائیگی نہایت سرعت کے ساتھ کر دی گئی' حالانکہ بسمارک کا خیال تھا کہ اس طرح فرانس کی طاقت ایک طویل عرصے کے لیے کمزور پڑ جائے گی۔ اسی عرصے میں فرانس اندرون اور بیرون یورپ سرمایہ کاری بھی کرتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں فرانس کی یہ سرمایہ کاری ۹ ملین ڈالر تک پہنچ چکی تھی جو برطانیہ کے بعد دوسرے نمبر پر تھی۔ اس سرمایہ کاری سے جہاں یورپ کے بیشتر حصوں اور اطالیہ میں صنعت سازی ہوئی وہاں فرانس کو بھی سیاسی اور سفارتی نقطہ نظر سے خاصے فوائد حاصل ہوئے۔ اتحاد ثلاثہ سے دور اٹلی نئی صدی کے آغاز میں مالی بحران کا شکار تھا۔ چنانچہ ضرورت کے مطابق اس کی مالی امداد کی گئی۔ ریلوے کے حقوق اور دیگر مراعات کے بدلے فرانس اور روس کا جو قرضہ چین کو دیا جاتا تھا' اس کا سارا حساب کتاب پیرس میں ہوا کرتا اور سینٹ پیٹر برگ کے ذریعے رقم پہنچائی جاتی۔ فرانس نے جس وسیع انداز میں ترکی اور بلقان میں سرمایہ لگایا تھا اور جس کا بدحال اہل جرمن ۱۹۱۴ء تک مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے' اس کے نتیجے میں اسے نہ صرف سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے فائدہ پہنچا بلکہ اس کے بدلے جرمنی کے بجائے اسلحہ سازی کا ٹھیکہ بھی اس کو مل گیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ فرانس نے اپنے اتحادی ملک روس میں صنعت سازی کے لیے بھی سرمایہ فراہم کیا۔ پہلا قرضہ اکتوبر ۱۸۸۸ء میں دیا گیا جبکہ دوسرا ۱۹۱۳ء کے بحرانی دور میں جو ۵۰۰ ملین فرانک کی صورت میں پیش کیا گیا۔ شرط یہ رکھی گئی کہ پولینڈ کے صوبوں میں روسی ریلوے کے نظام کو خاصی وسعت دی جائے تاکہ روسی دستہ نہایت سرعت کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا جرمنی کو کچل کر رکھ دے۔ ان تمام باتوں سے یہ حرج ہوتا ہے کہ فرانس دولت کے ذریعے خود اپنی طاقت کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ روس تو فوجی لحاظ سے طاقت ور بنتا گیا' اسی طرح جرمنی بھی زور پکڑتا گیا تاآنکہ وہ فرانس پر چڑھ دوڑا۔

یہ بات واضح رہے کہ اقتصادی اعداد و شمار کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو فرانس کی ترقی کا یہ مثبت پہلو ماند پڑنے لگتا ہے۔ اگرچہ بیرون ملک نہایت وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری ہوا کرتی تھی' لیکن اس کا

کوئی ثبوت نہیں کہ اس کے بدلے آیا منافع کی رقم وصول ہو جاتی تھی یا فرانسیسی مصنوعات کے لیے غیر ممالک سے وافر خریداری کے آرڈر موصول ہوتے تھے۔ پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جرمن تاجر اکثر و بیشتر اس قسم کے آرڈر کا وافر حصہ ہتھیا لیا کرتے تھے اور ایسی حرکت وہ روس میں بھی کیا کرتے تھے۔ جرمنی نے ویسے بھی ۱۸۸۰ء کے ابتدائی عشرے میں یورپی سامان کی برآمدات کے معاملے میں فرانس پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۱۱ء تک جرمنی کی برآمدات کی شرح دو گنی ہو گئی تھی۔ ان حالات کے نتیجے میں یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آئی کہ جہاں دو نسل پہلے برطانیہ صنعت سے مسابقت کرنے میں فرانسیسی معیشت تباہ ہوئی تھی' وہاں یہ اب جرمن جیسے قد آور صنعتی ملک کے عروج پانے سے بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ آٹوموبائل انڈسٹری کے قیام کے باوجود دیگر اقتصادی اعداد و شمار سے بگڑی ہوئی حالت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ جنگ کے دنوں میں فرانس کی مجموعی پیداواری صلاحیت جرمنی کی صلاحیت کا کل ۴۰ فی صد تھی۔ فولادی مصنوعات ۱/۶ فی صد اور کوئلے کی پیداوار بمشکل ۱/۷ فی صد تھی۔ پھر کوئلہ' فولاد اور لوہا کی فرانسیسی مصنوعات عموماً" مہنگی بھی ہوتی تھیں اور کم معیاری بھی! یہ سب چھوٹے چھوٹے کارخانے اور ادنیٰ درجے کی کانوں کی پیداوار تھیں۔ کیمیائی صنعت کا نام نہاد فروغ کے باوجود ملک کا زیادہ تر انحصار جرمنی کی درآمدات پر تھا۔ بہرحال' فرانس کے چھوٹے چھوٹے پلانٹ فرسودہ طریقہ کار اور مقامی منڈیوں پر زیادہ تر انحصار کی وجہ سے انیسویں صدی میں اس کی صنعتی ترقی غیر تسلی بخش رہی تھی۔

ازانس کا قصباتی (Bucolic) حسن طاقت و دولت کا نعم البدل نہ بن سکا۔ سلک اور شراب کی پیداوار کو ایک خاص بیماری سے جو شدید نقصان پہنچا' اس کی تلافی پوری طرح کبھی نہیں ہو سکی۔ پھر میلن نرخنامہ جس کی غرض و غایت زراعتی آمدنی کا تحفظ اور سماجی استحکام کا قیام تھا' اس سے زراعت کو تو نہیں البتہ نااہل کاشتکاروں کو فائدہ پہنچا۔ علاوہ ازیں' ۱۹۱۰ء تک فرانس کی آبادی کا محض ۴۰ فی صد حصہ کھیتی باڑی کرتا تھا اور کھیت ہنوز چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اس کا اثر فرانس کی پیداوار اور مجموعی دولت پر پڑتا تھا۔ بیروچ کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں جرمنی کے مقابلے میں فرانس کی مجموعی قومی پیداوار ۵۵ فی صد اور عالمی پیداوار فقط ۴۰ فی صد تھی۔ رائٹ کے بیان کے مطابق ۱۹۱۴ء میں فرانس کی فی کس آمدنی ۶ بلین ڈالر تھی جبکہ جرمنی کی ۱۲ بلین ڈالر تھی۔ اپنے مشرقی پڑوسی کے ساتھ محاذ آرائی میں فرانس تنہا رہ جاتا اور ۷۱-۱۸۷۰ء کی صورت حال عود کر آتی۔

مذکورہ بالا حقائق کے علاوہ اور بھی باتوں میں فرانس ریاست ہائے متحدہ امریکہ' برطانیہ' روس اور جرمنی سے پیچھے رہ گیا تھا۔ نتیجتاً" بیسویں صدی کے آغاز میں اس ملک کا درجہ بڑی طاقتوں میں فقط پانچواں تھا۔ پھر جرمنی کے ساتھ اس کے تعلقات بھی خوشگوار نہ تھے۔ اولذکر کے مقابلے میں فرانسیسی حکومت کی طاقت بھی مسلسل گھٹتی رہی۔ اس کے نمایاں اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۴ء کے دوران جرمنی کی آبادی میں تقریباً" آٹھ ملین کا اضافہ ہوا تھا جبکہ فرانس کی آبادی اس عرصے میں صرف ایک ملین بڑھی تھی۔ اس کے علاوہ جرمنی کے پاس قومی دولت خاصی وافر تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فرانس کی فوجی طاقت کے باوجود دونوں ملکوں میں خاصا فرق تھا۔ فرانس نے اپنے ۸۰ فی صد توانا نوجوانوں کو زبردستی بھرتی کر کے

بہت بڑی فوج تیار کر لی تھی۔ اس کا اندازہ کچھ یوں لگایا جا سکتا ہے۔ اپنی ۴۰ ملین کی آبادی سے اس نے آٹھ ڈویژن فوج تیار کر لی تھی۔ اس کے مقابلے میں آسٹریا نے اپنی ۵۲ ملین والی آبادی سے فوج کے ۴۸ ڈویژن تیار کیے تھے۔ لیکن جرمنی کی سلطنت کے مقابلے میں یہ سب کچھ ہیچ تھا۔ وہاں کے جنرل اسٹاف کی ماتحتی میں نہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ محفوظ دستہ موجود تھا' بلکہ ایک سو ڈویژن فوج بھی دستیاب تھی۔ اس کی وجہ افرادی قوت کی بہتات تھی۔ جرمنی میں مطلوبہ عمر کے دس ملین افراد آسانی سے فراہم ہو جاتے تھے جبکہ فرانس میں ایسے پانچ ملین لوگ تھے۔ پھر جرمنی کے پاس ۱۱۲۰۰۰ نہایت تربیت یافتہ نان کمیشن افسران تھے جو فوج کے نہایت اہم عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے برعکس فرانس کی فوج میں ایسے کل ۴۸۰۰۰ افسران تھے۔ علاوہ ازیں' قومی آمدنی کا ایک معمولی سا حصہ فوجی اخراجات کے لیے مختص کرنے کے باوجود وہ دوسرے متعلقہ امور میں خاصی رقم صرف کرتا تھا۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے تمام عشرے کے دوران فرانس کے اعلیٰ افسران نے احساس کمتری کو ختم کرنے کی بے سود کوشش جاری رکھی۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر جرمنی کو سازو سامان میں جو برتری حاصل تھی وہ بے حد حیران کن تھی۔ خفیہ رپورٹ کے مطابق جرمنی کے پاس ۴۵۰۰ مشین گنیں تھیں جب کہ فرانس کے پاس کل ۲۵۰۰ تھیں۔ اسی طرح جرمنی کے پاس ۷۷ ملی میٹر والی ۶۰۰۰ توپیں تھیں۔ اس کے برعکس فرانس کے پاس ۷۵ ملی میٹر والی ۳۸۰۰ توپیں تھیں۔ جبکہ جرمنی کو بھاری قسم کی توپوں میں بھی فرانس پر برتری حاصل تھی۔

ان تمام حقائق کے باوجود فرانس کی فوج ۱۹۱۴ء کی جنگ میں کود پڑی۔ اسے فتح کا کامل یقین تھا۔ چنانچہ اس نے دفاعی حکمت عملی اختیار کرنے کی بجائے حملہ آور ہونے کو ترجیح دی۔ گرینڈ میسن اور دوسرے افسران نے فوجیوں کے مورال کو بھی خاصا بلند کر دیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نفسیاتی طور پر یہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کا یہ ڈھکوسلا تھا۔ اس موقع پر جنرل میسنگ نے یہ نصیحت کی تھی:

> "فتح نہ تو فوجیوں کی تعداد سے حاصل ہوتی ہے نہ اسلحے سے!۔ یہ صرف بہادری اور اعلیٰ صلاحیتوں سے ہی حاصل ہوگی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں جسمانی اور روحانی طور پر برداشت کی قوت حاصل ہو اور بھرپور انداز میں حملہ کرنے کی طاقت بھی میسر ہو۔"

اس دعوے کے ساتھ ساتھ فرانس میں حب الوطنی کے احیاء کی وہ تحریک بھی جاری تھی جس کا آغاز ۱۹۱۱ء کے مراکشی بحران کے بعد ہوا تھا۔ اس تحریک کے تحت اس بات کا مسلسل اعادہ کیا جا رہا تھا کہ یہ ملک ۱۸۷۰ء کے مقابلے میں کہیں بہتر انداز میں لڑے گا۔ حالانکہ وہاں کے معاشرے میں طبقہ واریت اور سیاسی تقسیم کے مضمرات بھی موجود تھے۔ اس وقت کے فوجی ماہرین یہ باور کیے بیٹھے تھے کہ جنگ مختصر عرصے کے لیے ہوگی۔ پھر یہ معاملہ بھی تھا کہ جنگ میں فوجی ڈویژن اتارے جائیں گے نہ کہ جرمنی کے بڑے بڑے فولاد اور کیمیکل کے کارخانے اور نہ ہی رنگروٹوں کی فوج ظفر موج!

فرانس کے قومی اعتماد میں مزید اضافہ اس بات سے بھی ہوا کہ وزیر خارجہ "ڈلکاسے" اور اس

کے سفارت کاروں کی کوششوں سے نئی صدی کے آغاز میں ملک کی بین الاقوامی پوزیشن بہت بہتر ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے سینٹ پیٹر برگ سے تعلقات قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی' حالانکہ قیصر کی حکومت نے اسے کمزور کرنے کی سفارتی مہم جاری رکھی۔ نیز' ان لوگوں نے اٹلی کے ساتھ روابط بھی بڑھا لیے اور اسے اتحاد ثلاثہ سے الگ کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ اس طرح فرانسیسیوں کا سوانے اور لورین میں محاذ آرائی جیسا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ۱۹۰۴ء میں اہل فرانس برطانیہ سے نوآبادیات کا قضیہ حل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر لبرل پارٹی کے سرکردہ ممبران کو یہ باور کرا دیا کہ فرانس کا تحفظ ہر طرح برطانیہ کے مفاد میں ہے۔ اگرچہ برطانیہ میں اندرونی سیاست مستحکم اتحاد کے حق میں نہ تھی' تاہم کھلے سمندروں میں جرمنی کے بحری بیڑے کی گشت اور مغربی جانب حملے کے امکان نے (جو بلجیم کی غیر جانب دار علاقے سے متوقع تھا)' فرانس کے لیے برطانوی حمایت کا حصول آسان بنا دیا۔ اگر برطانیہ پیش قدمی کر بیٹھتا تو جرمنی کو نہ صرف روس سے خطرہ مول لینا پڑتا بلکہ اس کے کھلے سمندروں میں چلنے والے بحری بیڑے کو "شاہی بیڑے" سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا۔ پھر سمندر پار ملکوں میں اس کی تجارت کو بھی خطرہ لاحق تھا۔ اور شمالی فرانس میں برطانیہ کی مہم جو فوج کی تعیناتی بھی وجہ فکر بن سکتی تھی۔ بہرحال' ۱۸۷۱ء سے فرانس یہی خواب دیکھ رہا تھا کہ اہل جرمنی' روس اور برطانیہ سے متصادم ہو جائے لیکن ایسا پورا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

فرانس اتنا مضبوط نہ تھا کہ وہ جرمنی کا دو بدو مقابلہ کرتا۔ چنانچہ ہر فرانسیسی حکومت اس سے پہلو بچاتی رہی تھی۔ اگر بڑی طاقت سے مراد ایسا ملک ہے جو دوسرے پر دھاوا بول دے اور چڑھ بیٹھے تو پھر فرانس بھی (آسٹریا - ہنگری کی طرح) اس قابل نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۱۴ء کے عرصے میں یہ تصور اس قوم کے لیے بالکل ہی بے معنی تھا جو نفسیاتی طور پر جنگ کے لیے تیار تھی' فوجی قوت کی حامل تھی اور اس کے پاس دولت کی فراوانی بھی تھی۔ ان تمام امور میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ لائق و فائق ہو چکی تھی۔ پھر اس کے تمام اتحادی ممالک بھی مضبوط تر تھے۔ بہرحال' ان جملہ خصوصیات کے پیش نظر فرانس' جرمنی کے سامنے ٹھہر سکتا تھا' یہ ایک عام سا سوال تھا۔ لیکن زیادہ تر اہل فرانس کا یہ خیال تھا کہ ایسا ممکن تھا۔

جزائر برطانیہ

پہلی ہی نظر میں برطانیہ بے حد اثر انگیز نظر آتا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں اس کی سلطنت اتنی وسیع و عریض تھی کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی' یعنی بارہ ملین مربع میل کے علاقے اور دنیا کی چوتھائی آبادی اس کی دسترس میں تھے۔ صرف گزشتہ تین دہائیوں میں اس کی سلطنت میں ۴ء۲۵ ملین مربع میل کے علاقوں اور ۶۶ ملین افراد کا اضافہ ہوا تھا۔ یہ بات نہ صرف بعد کے مورخوں کے لیے حیرت ناک تھی بلکہ اس وقت اہل فرانس' اہل جرمنی' اہل برما اور دیگر علاقوں کے لوگ بھی اس انداز میں سوچ رہے تھے:

> "۱۹۱۴ء سے قبل' محض نصف صدی کے اندر برطانوی طاقت بے پناہ پھیل گئی۔ یہ ان قوموں کے ساتھ بھی خیر سگالی کا جذبہ رکھتی تھی جو اسی

قسم کا عزم رکھتی تھیں۔ واقعتاً" کسی قوم نے عالمی طاقت بننے کی جدوجہد کی تھی' تو وہ برطانیہ تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس نے نہ صرف کوشش کی بلکہ مقصد کو حاصل بھی کیا۔ اہل جرمنی بغداد تک ریلوے لائن بچھانے کی بڑ ہانکتے تھے اور انگلستان کی ملکہ ہندوستان کی حکمران بن گئی۔ اگر کسی ملک نے عالمی طاقت کے توازن کو ڈانواں ڈول کیا ہے تو وہ برطانیہ تھا۔"

برطانیہ کی طاقت کی اور بھی علامتیں تھیں۔ اس کے "شاہی بیڑے" میں اچھی خاصی توسیع ہوئی تھی۔ دو بڑے بڑے بحری بیڑوں جیسی طاقت اسے حاصل تھی۔ اس کے بحری اڈے اور کیبل اسٹیشن تمام دنیا میں قائم تھے جو اپنی مثال آپ تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی جہاز اس ملک کے سامان کی بار برداری میں مصروف تھے جو عالمی تجارت میں ایک امتیازی مقام رکھتا تھا۔ پھر شہر لندن کی مالیاتی خدمات بھی لاجواب تھی۔ اس صفت کی بدولت عالمی اقتصادیات میں برطانیہ کو بہت بڑے سرمایہ کار' بینکار' بیمہ کنندہ اور سوداگر کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ جب ۱۸۹۷ء میں وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات منعقد ہوئیں تو عوام کو حد سے زیادہ مسرور و شاداں ہونے کا جواز بھی تھا۔ آنے والی صدی کی تین چار بڑی سلطنتوں کا جب بھی ذکر ہوا تو نہ ہی فرانس' نہ آسٹریا - ہنگری' نہ ہی دیگر ممالک ان مختصر اراکین کی فہرست میں شامل تھے' البتہ برطانیہ ہمیشہ اس صف میں موجود رہا۔

اگر دیگر اسباب و عوامل کے پیش نظر جائزہ لیا جائے' مثلاً" باطانوی افسروں کے بھاری بھرکم اعداد و شمار یا برطانوی طاقت کے زوال کے دور سے وابستہ مورخوں کی رائے کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ سلطنت انیسویں صدی کے اواخر میں عالمی طاقت بننے کی جدوجہد نہیں کر رہی تھی بلکہ ایک صدی قبل سے وہ اس طرح کی کوشش میں معروف تھی۔ پھر یہ سارا سعی و عمل ۱۸۱۵ء کی فتح پر منتج ہوا۔ پھر نصف صدی تک بحریہ اور شاہی اعزاز و وقار میں کوئی اسے چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم' ۱۸۷۰ء کے بعد عالمی طاقت کے توازن میں تبدیلی کا اثر دو طرح سے برطانیہ کی بالادستی پر پڑتا رہا۔ اول یہ کہ صنعت سازی میں ترقی ہوئی تھی اور بری و بحری طاقت میں تبدیلی آئی تھی۔ اس نے برطانوی سلطنت کو دوسرے ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حالت قائمہ میں بنیادی تبدیلی پیدا ہونے کے باعث اسے فائدے کی بجائے نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک متحدہ اور طاقتور جرمنی کے وجود میں آنے سے برطانیہ براہ راست اتنا متاثر نہیں ہوا تھا جتنا فرانس اور آسٹریا - ہنگری جیسے ممالک متاثر ہوئے تھے۔ (یہ تو ۱۹۰۴-۵ء کے بعد لندن اس مسئلے سے نمٹنے میں کامیاب رہا۔) لیکن امریکی طاقت کے عروج سے اس ریاست کو خاصی تشویش لاحق تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ براعظم امریکہ سے وابستہ برطانوی مفادات (کینیڈا' کیریبین میں بحری اڈا' لاطینی امریکہ میں تجارت اور سرمایہ کاری) یورپ سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ روسی سرحد کی توسیع اور تاجکستان میں ریلوے کے قیام سے برطانیہ پر برے اثرات مرتب ہوئے۔ مشرق قریب اور خلیج فارس میں اس کے اثر و رسوخ اور برصغیر پاک و ہند میں اس کے تسلط کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ چین کی بیرونی

تجارت پر زیادہ تر یہی ملک چھایا ہوا تھا۔ لیکن وہاں اسمالی بادشاہت کے قیام یا اس خطے میں نئی طاقت کے وجود میں آنے سے بھی نقصان کا احتمال تھا۔ اسی طرح افریقہ اور بحرالکاہل کے علاقے میں بھی برطانیہ کے اثر و رسوخ کو زک پہنچا جب وہاں ۱۸۸۰ء کے اوائل میں نوآبادیات کی کش مکش شروع ہوئی۔ ہو بسبام کے الفاظ میں اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ نے اپنی ایک چوتھائی کے قریب باقاعدہ بادشاہت کو بے حد وسعت دے کر دنیا کی زیادہ تر غیر ترقی یافتہ سلطنتوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ اس دور میں اگرچہ کوئن وکٹوریہ کی سلطنت میں دھڑا دھڑ نئی مقبوضات شامل کی جا رہی تھیں' مگر یہ کوئی اچھا سودا نہیں تھا۔

اگرچہ افریقہ یا چین کے حوالے سے درپیش مسائل نئے نئے تھے' لیکن ایشیا کے معاملے میں روس کے ساتھ دشمنی اور نصف مغربی کرے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ چپقلش نے برطانوی انتظامیہ کو عرصہ دراز سے پریشان کر رکھا تھا۔ البتہ فرق صرف اتنا تھا کہ متعلقہ ممالک اب بہت زیادہ طاقتور بن چکے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خطرات میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جس طرح آسٹریا - ہنگری کی سلطنت یورپ میں کئی دشمنوں کے ساتھ محاذ آرائی کرنے کی وجہ سے کمزور پڑ چکی تھی' اسی انداز میں برطانوی سیاست دان سفارتی اور فوجی انداز میں دنیا بھر میں پنجہ آزمائی کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں' ۱۸۹۵ء کے بحرانی دور میں حسب ذیل باتوں کی وجہ سے حکومت برطانیہ کو تشویش بھی لاحق تھی: چین اور جاپان کی لڑائی کے پیش نظر اول الذکر کے ساتھ تعلقات کا خاتمہ' آرمیبیا کے بحران کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کا زوال' جنوبی افریقہ کے معاملے میں جرمنی کے ساتھ ایسے وقت میں جھگڑا جبکہ وینزویلا' برطانیہ - گائنا سرحد کے سلسلے میں امریکہ سے لڑائی' افریقہ میں فرانسیسی فوج کی مہم جوئی اور روسیوں کی کوہ ہندوکش کی جانب پیش قدمی! یہ شعبدہ بازی بحری معاملات میں بھی دکھائی گئی۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ "شاہی بیڑے" کے بجٹ میں کس قدر اضافہ ہو چکا تھا' ۱۸۹۰ء کے عشرے میں پانچ یا چھ غیر ملکی بیڑوں کے مقابلے میں سمندروں پر اس کا اس طرح سکہ چلنا ناممکن تھا جیسا مذکورہ صدی کے وسط میں چلتا تھا۔ جیسا کہ برطانیہ کے امیرالبحر نے بارہا اعلان کیا تھا کہ یہ نصف مغربی کرے میں امریکہ کے چیلنج کا جواب دے سکتا ہے۔۔۔ لیکن اس صورت حال میں جب کہ یورپی سمندروں سے جنگی جہاز ادھر روانہ کر دیئے جائیں۔ نیز مشرق بعید میں "شاہی بیڑے" کو مزید مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے بحیرہ روم میں تعینات بحری فوج کو کم کرنا پڑے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ برطانیہ کی شاہی بحریہ ہر جگہ تو مستحکم نہیں رہ سکتی تھی۔ بہرحال یہی شعبدہ بازی بری فوج کے معاملے میں بھی دکھائی گئی۔ یعنی ایمرجنسی کے تحت فوجی بٹالین کو ایلڈرشوٹ سے قاہرہ اور ہندوستان سے ہانگ کانگ بھیجا جاتا رہا اور یہ سب کچھ چھوٹے موٹے والنٹیر دستے کے ذریعے انجام دیا جاتا تھا جن کی کثیرالتعداد فوج میں کوئی اہمیت نہ تھی۔

برطانیہ کی دوسری کمزوری اگرچہ ڈرامائی نہیں تھی لیکن بہت زیادہ تشویشناک تھی۔ یعنی اس کے صنعتی اور تجارتی استحکام میں کمی آ رہی تھی' حالانکہ اسی اہم عنصر پر اس کی بحریہ' بری فوج اور بادشاہت کی طاقت منحصر تھی۔ اگرچہ متعلقہ دہائیوں میں برطانیہ میں کوئلہ' کپڑے اور فولادی ساز و سامان کی پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا لیکن عالمی پیداوار میں اس کا حصہ کم ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں' نئی اور نہایت اہم صنعتیں

فولاد، کیمیکل، مشینی اوزار، بجلی کے سامان وغیرہ میں برطانیہ کو جو برتری حاصل تھی، وہ ختم ہو چکی تھی۔
شا۔ اس کی صنعتی پیداوار کی سالانہ شرح ۱۸۲۰ء اور ۱۸۴۰ء کے دوران ۴ فی صد تھی اور ۱۸۴۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کے عرصے میں ۳ فی صد رہی لیکن پھر اس میں شدید کمی آتی گئی۔ ۱۸۷۵ء اور ۱۸۹۴ء کے دوران یہ شرح کل ۱٫۵ فی صد تھی جو ملک کے بڑے بڑے دشمنوں کے مقابلے میں خاصی کم تھی۔ صنعتی بالادستی میں کمی کا اثر زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کے مقابلے پر بھی پڑا۔ یعنی صنعت یافتہ یورپ اور شمالی امریکہ کی منڈیوں میں برطانوی برآمدات کی صحیح قیمت نہیں لگتی تھی۔ پھر ان بازاروں کو تیز نرخنامے کا تحفظ بھی حاصل تھا۔ پھر بعض نو آبادیات کی منڈیوں میں دوسری طاقتوں کا مقابلہ بھی رہتا۔ پھر غیر ملکی مصنوعات کے اندرون ملک سیلاب سے برطانیہ کی صنعت سازی کو بھی دھچکا لگا۔ نیز یہ حقیقت بھی عیاں ہو گئی کہ اب یہ ملک مسابقت کا اہل نہیں رہا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں برطانیہ کی پیداوار میں کمی آنے اور مسابقت کرنے کی اہلیت گھٹ جانے کا یہ مسئلہ اقتصادیات کی تاریخ میں غور و فکر کا حامل رہا ہے۔ اس میں یہ پیچیدہ موضوعات زیر بحث رہے ہیں: قومی کردار، نسلی امتیاز، سماجی اقدار اور تعلیمی نظام، علاوہ ازیں اقتصادیات کے یہ مخصوص عوامل بھی ان میں شامل تھے۔ سرمایہ کاری کا فقدان، فرسودہ پلانٹ، مزدوروں کے ساتھ ناخوشگوار تعلقات، ادنیٰ درجے کی فروش کاری وغیرہ وغیرہ اعلیٰ حکمت عملی کا جائزہ لینے والے طالب علم کے لیے جو متعلقہ حالات کا ادراک کرنا چاہتا ہو، یہ وضاحتیں اتنی اہم نہیں ہیں جتنی اہم یہ حقیقت ہے کہ اس ملک کی بنیاد نہایت تیزی سے کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی۔ ۱۸۸۰ء میں دنیا کی مجموعی پیداوار میں برطانیہ عظمیٰ کا حصہ ہنوز ۲۲٫۹ فی صد تھا۔ لیکن ۱۹۱۳ء میں یہ شرح گھٹ کر ۱۳٫۶ فی صد رہ گئی۔ اسی طرح ۱۸۸۰ء میں عالمی تجارت میں اس کا ۲۳٫۲ فی صد حصہ تھا جو ۱۹۱۱ء-۱۹۱۳ء میں محض ۱۴٫۱ فی صد رہ گیا۔ بہرحال صنعت سازی کے میدان میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی سبقت لے جا چکے تھے۔ اب "دنیا کا کارخانہ" ایک تیسری جگہ لگ چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کام نہیں کر رہا تھا بلکہ دوسرے ممالک نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

برطانوی حکمرانوں کو کسی چیز نے اتنا فکر مند نہیں بنایا جتنا اس اقتصادی زوال نے! اس تشویش کی وجہ یہ تھی کہ اس سے برطانیہ کی طاقت پر زد پڑی تھی۔ پروفیسر ڈبلیو، اے، ایس ہیونز نے ۱۹۰۴ء میں یہ سوال پیش کیا تھا:

> "فرض کیجئے کہ ایک ایسے کارخانے کو بیرونی مسابقت سے خطرہ لاحق ہو جو آپ کے قومی دفاع کے لحاظ سے بڑی قدر و قیمت کا حامل ہو تو پھر ایسی صورت میں آپ کہاں ہوں گے؟ آپ فولاد سازی کی صنعت اور اعلیٰ درجے کے مشینری سازوسامان کی تجارت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ بصورت دیگر جدید دور کی محاذ آرائی کے دوران اپنے بحری بیڑے اور اپنی بری فوج کو بہتر حالات میں رکھنے کے ذرائع سے آپ محروم ہوں گے۔"

مذکورہ صورت حال کے مقابلے میں مغربی افریقہ میں نو آبادیات کی سرحدوں کا جھگڑا یا ساموآن جزیرہ پر تسلط کا قضیہ نہایت ہیچ تھے۔ پھر نرخنامے کی اصلاحات سے بادشاہوں کی دلچسپی بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے برطانوی صنعت کو تحفظ دینے کی خاطر آزاد تجارت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ پھر مفید خام والوں کی حکومتوں سے قریبی تعلقات قائم کیے گئے تاکہ دفاعی امداد بھی حاصل ہو اور وسیع منڈی بھی ملے۔ جوزف چیمبرلینڈ کے تشویش انگیز الفاظ میں "یہ تھکا ماندہ عظیم الجثہ ملک اپنے مقدر کے وسیع دائرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔" آگے چل کر بحری فوج کے اول لارڈ نے یہ تنبیہ کی تھی۔ "برطانیہ عظمیٰ اتنی طاقت کا حامل نہیں ہو گا کہ وہ امریکہ، روس اور اغلباً" جرمنی کے دوش بدوش اپنی پوزیشن برقرار رکھ سکے۔ طاقتوں کے ریلے میں ہم کنارے پر کھڑے رہ جائیں گے۔"

۱۹۰۵ء میں ایک با اثر صحافی گاروِن نے بہت مایوس کن انداز میں یہ پوچھا تھا۔ "کیا یہ سلطنت جو ٹریفلگر کی صد سالہ تقریبات منا رہی ہے اگلی صدی میں باقی بھی رہے گی؟" بہرحال برطانوی حکمران اپنے طویل المیعاد وجود پر یقین رکھتے تھے اور وہ محض یہی چاہتے تھے کہ درپیش خطرات کے ذکر میں مبالغہ آرائی بھی کی جائے۔ دنیا کی مختلف منڈیوں میں ان کی لوہے، فولاد اور مشینی سازوسامان کی تجارت پر دوسرے ممالک قابض ہو چکے تھے۔ بہرحال یہ صنعت بالکل ہی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۳ء سے قبل کے برسوں میں کپڑے کی برآمدات کو انتہائی فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان کی گرمی اس کی نمایاں وجہ تھی۔ برطانیہ کی جہاز سازی کی صنعت جو شاہی بحریہ اور تجارتی جہازوں کی ترقی کے لیے لازمی تھی، اپنے عروج پر تھی۔ ان عشروں میں یہ ملک دنیا کے تجارتی جہازوں کا ۶۰ فی صد اور جنگی جہازوں کا ۳۳ فی صد تیار کر رہا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے باعث تسکین تھی جو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ جنگ کے دنوں میں برطانیہ کا گزارہ محض غذائی اشیاء اور خام مال کی برآمدات پر ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر برطانیہ بڑی طاقتوں کے طویل اور وسیع صنعتی لڑائی میں شامل ہو جاتا تو اس صورت میں اسے احساس ہو جاتا کہ اس کی اسلحہ سازی (شیل، توپ، ایئر کرافٹ، گولے دار دھرا، شیشے کے آلات، میگنیٹ، رنگ کا سامان) ناکافی تھی۔ اس طرح یہ روایتی سوچ واضح ہو جاتی ہے کہ برطانوی فوج محض نو آبادیات کی چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے لیے موزوں تھی نہ کہ براعظم کی بڑی بڑی لڑائیوں کے لیے! عجب اتفاق ہے کہ اس دور میں برطانوی فوج زیادہ تر چھوٹے موٹے جھگڑوں اور فساد کو دبانے میں ہی مصروف رہی۔ جیساکہ بعض دور اندیش مبصرین ۱۸۹۸ء میں پیش گوئی کر رہے تھے، اگر ہوشربا اور طویل جنگ جدید طریقہ کار کے ساتھ چھڑ جاتی تو اس صورت میں صحیح قسم کے جنگی سازوسامان طلب کرنے میں برطانیہ تنہا نہیں ہوتا۔

متعلقہ دور میں برطانیہ کو اقتصادی استحکام بھی حاصل تھا۔ ملکی مسائل کو جس مایوس کن انداز میں پیش کیا جاتا تھا، ان کا ازالہ معاشی بہتری سے یقینیاً" ممکن تھا۔ اگر ماضی میں جھانک کر دیکھا جائے تو یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے: "۱۸۷۰ء سے ۱۹۳۰ء تک برطانیہ کی تاریخ اقتصادی، فوجی اور سیاسی لحاظ سے نہایت شان دار اور زوال سے نا آشنا تھی۔ دوسری بڑی طاقتوں کی طرح اسے بھی خوشحالی اور قوت حاصل تھی۔ یہ سب کچھ انیسویں صدی کے وسط میں برپا ہونے والے صنعتی انقلاب کا نتیجہ تھا۔" لیکن اس

ملک کے زوال کی تیز رفتاری بیان کرنے کا بھی خدشہ ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ غیر صنعتی علاقوں میں اس کی جو کچھ بھی ساکھ رہی ہو اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ وہ ملک ہے جو اندرونی اور بیرونی طور پر دولت و ثروت سے مالا مال تھا۔ البتہ ۱۹۱۴ء سے قبل کے دو عشروں میں برطانیہ کے سرکاری خزانے پر خاصا دباؤ رہا تھا۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ نئی ٹیکنالوجی کی دریافت سے ایک جنگی جہاز کی قیمت دوگنی ہو گئی۔ علاوہ ازیں بجلی کے وسیع استعمال سے عوامی سطح پر اچھے خاصے اخراجات اٹھ رہے تھے۔ اگر بندوق اور تھمن کی اضافہ شدہ قیمت ہوشربا معلوم ہو رہی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ رات کی پہرہ داری کرنے والی حکومت ہر شخص کی آمدنی سے برائے نام ٹیکس وصول کر رہی تھی جبکہ وہ قومی آمدنی کا نہایت قلیل حصہ سرکاری مقاصد کے لیے استعمال میں لاتی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۳ء میں اس کی مرکزی و مقامی حکومت کے کل اخراجات مجموعی قومی آمدنی کے محض ۱۲ء۳ فی صد حصے کے مساوی تھے۔ اگرچہ ۱۹۱۴ء سے پہلے برطانیہ دفاع پر سب سے زیادہ خرچ کرنے والا ملک تھا' اس کے باوجود اسے یورپ کی کسی بھی بڑی طاقت کے برعکس اپنی ملکی آمدنی کا بہت کم حصہ اس مد میں خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اگر اس ملک کے حکمران صنعتی طاقت کو فروغ دینے کی بجائے برطانیہ کے مالی استحکام کی فکر کرتے تو اس کے پاس تقریباً ۱۹ء۵ بلین پونڈ کی رقم جمع ہو جاتی جس سے سمندر پار ملکوں میں سرمایہ کاری ہو سکتی تھی۔ اس طرح دنیا کی بیرونی سرمایہ کاری میں یہ ۴۳ فی صد کے مساوی ہوتی اور یقیناً" یہ آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا۔ تاہم اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اعلیٰ پیمانے پر کسی جنگ چھڑنے کی صورت میں یہ دولت ضرورت پڑنے پر کام بھی آ سکتی تھی یا نہیں! اس بات میں بھی شبہ تھا کہ کیا برطانیہ اپنے آزاد سیاسی کلچر کو برقرار رکھ سکتا ہے۔۔۔ یعنی آزاد تجارت کم سے کم سرکاری اخراجات' زبردستی بھرتی سے اجتناب' بحری فوج پر زیادہ تر انحصار۔۔۔ اگر وہ اسلحے اور جدید قسم کی جنگ میں قومی وسائل استعمال کرنے پر مجبور کر دیا جاتا لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی تجوری بہت بڑی تھی۔

بعض ایسے اسباب و عوامل بھی تھے جن کی وجہ سے بڑی طاقتوں کی صف میں برطانیہ کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ اگرچہ ایسے دور میں جبکہ فوجی ٹرین اور کثیرالتعداد مسلح افواج ہندوستان اور دیگر مقبوضات کے سیاسی اور جغرافیائی تحفظ کو بے وقعت بنا رہی تھیں' سلطنت کے خشکی والے حصے کی سرحدوں کا دفاع خاصا مشکل امر تھا۔ لیکن برطانیہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھا کہ وہ ایک جزیرہ تھا۔ اس کی آبادی کو پڑوسی ملک کی فوج کے اچانک حملہ کر دینے کا خطرہ لاحق نہیں تھا۔ پھر اس ملک میں بری فوج کی بجائے بحری فوج کی طاقت میں اضافہ کرنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ وہاں کے سیاست دانوں کو جنگ اور امن کے زمانے کے موضوعات پر اظہار خیال کی مکمل آزادی تھی جو براعظم کی کسی اور ریاست میں نہ تھی۔ علاوہ ازیں' اس سلطنت کو وسیع نوآبادیات کے تحفظ کے مسائل کا بھی سامنا تھا لیکن اس سے یہ فائدہ پہنچا کہ برطانیہ کو نت نئی فوجی حکمت عملیاں اختیار کرنے کا موقع ملا۔ شاہی محافظ دستے' کوئلہ فراہم کرنے کے اسٹیشنوں اور بحری اڈے کی وجہ سے اس ملک کی طاقت دیگر یورپی قوتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی لہٰذا وہ براعظم سے باہر کسی بھی لڑائی میں ان سے بہ آسانی نمٹ سکتا تھا۔ چونکہ برطانیہ سمندر پار اپنی مقبوضات کی مالی امداد کیا کرتا

تھا' لہٰذا وہ سارے علاقے' خصوصاً" ہندوستان اس سلطنت کو فوجی دستے' بحری جہاز' خام مال اور رقم فراہم کیا کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وائٹ ہال کے سیاست دان سمندر پار رہنے والے اپنے بھائی بندوں کو بادشاہت کے تحفظ کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ آخری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ چونکہ برطانیہ کی طاقت اور اس کے اثر و رسوخ ابتدائی دنوں میں ہی خاصے وسیع ہو گئے تھے' لہٰذا اس کے پاس بفرزون خاصی تعداد میں موجود تھے' ایسے بہت سے علاقے تھے جن کے ساتھ اس کے اہم مفادات وابستہ تھے اور سمجھوتہ کر لینے کے متعدد مواقع بھی میسر تھے۔

برطانوی شہنشاہت کے متعلق لوگوں کی رائے سے یہ قطعاً" آشکار نہیں ہوتا کہ "کچھ رعایت اور کچھ سختی" ہی اس عہد کا نظام تھا۔ اس کے برعکس' شعبہ جاتی صلاح مشورے اور کابینہ کے فیصلے کے مطابق ہی برطانیہ میں فوجی حکمت عملی وضع کی جاتی اور اس کی ترجیحات کے مطابق ہی کام ہوتا۔ یہی طریقہ ہر سال جاری رہتا اور دیگر ملکوں کے ساتھ عہد و پیمان کے مطابق ہر مسئلے کا جائزہ لیا جاتا۔ پھر اسی کے مطابق سمجھوتہ ہوتا یا سختی کا رویہ اختیار کیا جاتا۔ اسی طریقے کے مطابق انگلستان اور امریکہ کے درمیان لڑائی کا تجزیہ کیا گیا۔ اور یہ بات سامنے آئی کہ یہ جنگ اقتصادی تباہی کا باعث ہوگی' یہ سیاسی لحاظ سے ناپسندیدہ قرار دی جائے گی اور فوجی لحاظ سے مشکلات کا سامنا بھی ہوگا۔ لہٰذا یہ تجویز ٹھہری کہ وینیزویلا کے قضیے' نہر کے جھگڑے' الاسکا کی سرحدوں کے تنازعے وغیرہ میں کچھ رعایت کا پہلو اختیار کیا جائے۔ لیکن یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ ۱۸۹۰ء کے عشرے میں جہاں برطانیہ' مغربی افریقہ' جنوب مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل کے علاقے میں واقع نوآبادیات کے قضیے کے معاملے میں سودا بازی کر رہا تھا' وہاں وادی نیل پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لیے جھگڑا بھی کر رہا تھا۔ ایک دہائی کے بعد' یہی ملک انگلستان اور جرمنی کے درمیان چلی آنے والی مخالفت کو جو بحری جہازوں کی تعداد' پرتگالی نوآبادیات اور بغداد ریلوے کے متعلق تھی' ختم کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ لیکن براعظم میں جنگ چھڑ جانے کی صورت میں غیر جانب دار رہنے کا کوئی وعدہ و عہد بھی نہیں کر پاتا تھا۔ ۱۹۱۴ء سے قبل خارجہ سکریٹری گرے نے برلن کے ساتھ جو کامیاب تعلق استوار کیا تھا وہ سلسبری کی گذشتہ ان کوششوں کی مانند تھا جب سینٹ پیٹر برگ کے ساتھ ایشیا کے معاملے میں سمجھوتہ عمل میں آیا تھا۔ دونوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ عالمی معاملات سفارتی سطح پر حل کیے جا سکتے ہیں۔ ایک طرف یہ رائے قائم کرنا کہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ برطانیہ کی عالمی پوزیشن ویسی ہی کمزور تھی جیسی ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں تھی' پھر دوسری جانب یہ دلیل دینا کہ ۱۹۱۴ء سے قبل برطانیہ کی طاقت وسیع و عریض تھی ۔۔۔ یک طرفہ کاروائی قرار دی جائے گی۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل کے عرصے میں ہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی نے صنعت سازی میں برطانیہ پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ آخرالذکر کو تجارت' نوآبادیات اور جہاز رانی میں شدید مقابلے کا سامنا تھا۔ تاہم' برطانیہ اپنے مالی وسائل پیداواری صلاحیت' شاہی مقبوضات اور بحری طاقت کی وجہ سے ہنوز اول درجے کی عالمی طاقت بنا ہوا تھا اگرچہ اس کی قائدانہ صلاحیت ۱۸۵۰ء جیسی نہیں رہی تھی لیکن یہ اول درجہ بھی برطانیہ کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ برطانیہ کو ایک پختہ کار ریاست کی حیثیت

حاصل ہو چکی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ قائم شدہ نظام جاری رہے اور کوئی تبدیلی بھی آئے تو آہستہ آہستہ اور پرسکون انداز میں!۔ وہ چند مقاصد کے تحت ہی لڑنا پسند کرتا تھا ۔۔۔۔ یعنی ہندوستان کا دفاع' بحری طاقت میں بالادستی خصوصاً" اپنے سمندروں میں اور شاید یورپ میں طاقت کے توازن کی برقراری!۔ لیکن ہر معاملہ اس بات کا متقاضی تھا کہ اسے وسیع تناظر میں دیکھا جائے اور برطانیہ کے دیگر مفادات پر اسے ترجیح دی جائے۔ ان ہی اسباب کی بنا پر سلسبری نے ۱۸۸۹ اور ۱۹۰۱-۱۸۹۸ء میں جرمنی کے ساتھ ہونے والے دفاعی معاہدے کی مخالفت کی تھی۔ دلچسپ بات یہ کہ گرے نے ۱۳-۱۹۰۶ء میں جرمنی کے خلاف فوجی معاہدے کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ برطانیہ کے مستقبل کی منصوبہ بندی پیرس اور برلن کے منصوبہ سازوں کے لیے جہاں غیر یقینی بن گئی وہاں پامرسٹن کے اس اعلان سے کہ "ملک کے مفادات تو پائیدار ہیں لیکن کوئی ساتھی مستقل نہیں" پوری حقیقت بھی آشکار ہو گئی۔ اگرچہ انیسویں صدی کے اختتام کے ساتھ وہ حالات بھی باقی نہیں رہے جن کی وجہ سے یہ آزادانہ اقدامات کیے جاتے تھے' مگر برطانیہ کی روایتی شعبدہ بازی جاری رہی۔ وہ اپنے متنوع مفادات کے درمیان کوئی نہ کوئی کرتب دکھاتا رہا۔ کبھی شہنشاہیت کا ذکر تو کبھی براعظم کا چرچا! کبھی فوجی حکمت عملی کی فکر تو کبھی مالی استحکام کی تشویش!

روس

آنے والی بیسویں صدی میں زار کی سلطنت بھی بڑی طاقتوں کے منتخب کلب کی خود بخود ایک رکن بن گئی تھی۔ اس کی وسیع و عریض حدود جو فن لینڈ سے ولے دی ووسٹوک تک پھیلی ہوئی تھیں' اس کی رکنیت کو مزید مستحکم بنا رہی تھیں۔ پھر اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بھی اس میں عمل دخل تھا کیونکہ یہ جرمنی کے مقابلے میں تین گنا اور برطانیہ کے مقابلے میں چار گنا زیادہ تھی۔ کال چار صدیوں تک یہ ملک مغرب' جنوب اور مشرق کی جانب پھیلتا رہا تھا اور نامساعد حالات کے باوجود رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ انیسویں صدی کے پورے عرصے میں اس کی فوج یورپ میں سب سے بڑی سمجھی جاتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر بھی دیگر ممالک کی افواج کے مقابلے میں یہ خاصی بڑی تھی۔ اس کے پاس ۱ء۳ ملین ہراول دستہ تھا اور جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا تھا' ۵ ملین ریزرو فوج تھی۔ روس کے فوجی اخراجات بھی حد سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے معمول کے اخراجات جرمنی کے مجموعی اخراجات کے برابر تھے۔ ۱۹۱۳ء سے قبل ریلوے کی تعمیر نہایت تیزی سے سرانجام پا رہی تھی۔ اس نے مختصر سی مدت میں جرمنی کے شلیفن پلان کو بے وقعت بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس طرح اس کے مغربی سمت سے حملے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ پھر' جاپان سے محاذ آرائی کے بعد ایک نئے روسی بحری بیڑے کی تیاری پر بھی رقم خرچ کی جا رہی تھی۔ روس کی اس بڑھتی طاقت کو دیکھ کر پروشیا کا جنرل اسٹاف ہوشیار ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ نوجوان مولٹک یہ کہے بغیر نہ رہا کہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء تک پروشیا کے دشمنوں کی فوجی قوت اتنی بڑھ جائے گی کہ اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہو گا۔ فرانس کے بعض مبصرین نہایت خوشی سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب روس کا سیل بے پناہ مغربی سمت میں بڑھ کر برلن کو غرقاب کر دے گا۔ کچھ اہل برطانیہ جن میں وہ لوگ خصوصیت سے شامل تھے جو سینٹ پیٹر برگ کے سفارت خانے سے وابستہ تھے' اپنے سیاست دانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ "روس نہایت

تیزی سے نہایت طاقتور ملک بنتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں ہر صورت میں اس کے ساتھ دوستی برقرار رکھنی چاہئے"۔ غرض روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے گلیشیا سے پروشیا اور بیجنگ تک تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

مذکورہ بیانات کی روشنی میں روس کیا واقعی ایک بار پھر یورپ کا تھانے دار بننے والا تھا۔ ویسے اٹھارھویں صدی سے موجود دور تک مغربی مبصرین کے لیے اس ملک کی صحیح طاقت کا اندازہ لگانا خاصا مشکل رہا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً" قابل اعتماد گوشوارے کی عدم دستیابی۔ روسی غیر ملکیوں سے کچھ کہتے اور اپنے آپ سے کچھ اور کہتے اور اس طرح حقیقت سامنے نہیں آتی۔ پھر معروضی حقائق کے برعکس موضوعی بیانات پر انحصار کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ "۱۹۱۴ء سے قبل یورپ روس کو کس انداز میں دیکھتا تھا" یہ جاننے کے لیے سروے کیا گیا تھا لیکن یہ اس جائزے جیسا نہیں تھا جو روس کی طاقت کے متعلق لیا گیا تھا۔

بہرحال' چند شواہد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۹۱۴ء سے قبل کی دہائیوں میں روس مضبوط بھی تھا اور کمزور بھی!۔ یہ کہنا پڑے گا کہ اس وقت یہ ملک صنعتی لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ بن چکا تھا اور کریمین جنگ کے وقت اس کی جو حیثیت تھی وہ اب نہیں رہی تھی۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۹۱۳ء کے خاصے طویل دور میں روس کی صنعتی پیداوار سالانہ ۵ فی صد شرح سے بڑھتی رہی۔ پھر ۱۸۹۰ء کے عشرے میں یہ شرح بڑھ کر ۸ فی صد ہو گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اس کی فولادی صنعت فرانس اور آسٹریا ۔ ہنگری سے زیادہ تھی جبکہ اٹلی اور جاپان سے اس معاملے میں یہ بہت آگے تھا۔ کوئلہ کی پیداوار میں بھی شدت سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں یہ پیداوار ۶ ملین ٹن تھی جو ۱۹۱۳ء میں بڑھ کر ۳۶ ملین ٹن ہو گئی۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں روس دوسرے نمبر پر تھا۔ اس کی پارچہ بافی کی قدیم صنعت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہاں فرانس اور آسٹریا ۔ ہنگری کے مقابلے میں بہت زیادہ سوتی تکلے تیار کیے جاتے تھا۔ کیمیکل اور بجلی کی صنعت میں بھی حالیہ دور میں پیش رفت ہوئی تھی۔ یہاں اسلحہ سازی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ سینٹ پیٹر برگ' ماسکو اور دیگر اہم شہروں میں بے شمار کارخانے تھے جہاں ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ روس میں ریلوے کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں ریلوے لائن کوئی ۳۱ ہزار میل پر محیط تھی۔ اس میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ۱۹۱۳ء میں یہ ۴۶ ہزار میل تک پھیل گئی۔ بیرونی تجارت ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۳ء کے دوران تین گنا ترقی کر گئی۔ روس نے ۱۸۹۴ء میں معیار طلا کو رواج دیا تھا جس سے تجارت خاصی مستحکم ہوئی۔ اسی دوران روس تجارت کرنے والے ملکوں میں چھٹے نمبر پر تھا۔ روسی حکومت کی اعلیٰ کارکردگی' ریلوے بانڈز اور یہاں کی منفعت بخش تجارت کی بدولت غیر ملکیوں نے یہاں خوب سرمایہ کاری کی۔ اس کے نتیجے میں راس المال کی بہتات ہو گئی اور اقتصادی نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا۔ نقد رقم کے اس سیلاب میں وہ زری آمدنی بھی شامل تھی جو محصول اور وودکا جیسی اشیائے صرف پر ٹیکس کے نتیجے میں حکومت کو حاصل ہو رہی تھی۔ اس طرح اقتصادی نظام مستحکم ہوا۔ جیسا کہ بہت سی تاریخوں میں مذکور ہے' ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ روس دنیا کی چوتھی صنعتی طاقت بن چکا تھا۔ اگر یہ انداز برقرار رہتا تو کیا روس اپنے علاقے کی وسعت اور آبادی کی کثرت کے دوش بدوش صنعت میں امتیازی مقام حاصل نہ کر لیتا؟

تاہم' بغور جائزہ لینے پر ایک مختلف تصویر ابھرتی ہے۔ اگرچہ ۱۹۱۳ء میں روس میں تقریباً" تین ملین مزدور کام کرتے تھے' لیکن یہ آبادی کا محض ۷۵.۱ فی صد حصہ تھے اسی طرح ایک کارخانے میں دس ہزار مزدوروں کے کام کرنے کی بات بھی محض ہوائی تھی۔ اب بہت سے مبصرین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ اعداد و شمار غلط ہو سکتے ہیں۔ رات کے وقت مردوں اور عورتوں کی تازہ دم شفٹ پارچہ بافی کا کام ایسے معاشرے میں انجام دیتی تھی جہاں مزدوروں کی بہتات تو تھی لیکن تکنیکی صلاحیت کا فقدان تھا۔ غالباً" یہ بات نہایت اہم قرار دی جائے گی کہ دیسی صنعت کاروں کے ہوتے ہوئے روس میں زیادہ تر صنعت سازی کا کام غیر ملکی افراد انجام دیتے تھے' مثلاً" ایک بین الاقوامی نوعیت کی فرم جس کا نام سنگر تھا یا پھر برطانوی انجینئروں کی جماعت ------ یہ سب وہاں صنعت و حرفت کو فروغ دے رہے تھے۔ حتیٰ کہ غیر ملکی افراد روس میں سرمایہ کاری بھی کر رہے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں تو یہ صورت حال تھی کہ کان کنی کا ۹۰ فی صد کام' تیل نکالنے کا صد فی صد کام' دھات سازی کا ۴۰ فی صد کام' ۵۰ فی صد کیمیائی صنعت اور پارچہ بافی کی صنعت کا ۲۸ فی صد کام غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں تھا اور یہی اس کی روح رواں تھے۔ یہ کوئی اچنبے کی بات نہ تھی اس لیے کہ اٹلی میں بھی یہی صورت حال تھی۔ البتہ اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ روس میں غیر ملکی پیدا کاروں' صنعت سازوں اور ان کے سرمایے پر کس قدر انحصار کیا جاتا تھا۔ ویسے یہ الگ معاملہ ہے کہ وہ اپنے سرمائے سے کیا کچھ منافع کماتے تھے اور صنعتی ترقی کے لیے ملکی ذرائع کو استعمال میں لاتے تھے یا نہیں!۔ روس بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کا سب سے زیادہ غیر ملکی قرض لینے والا ملک تھا۔ چنانچہ سرمائے کے بھاؤ کے لیے منڈی کے ریٹ سے کہیں زیادہ سہولت سرمایہ کاروں کو دینے پر مجبور تھا۔ تاہم' بیرونی سود تجارتی توازن سے کہیں زیادہ تھا۔ غرض یہ تشویش ناک صورت حال تھی۔

غیر مستحکم معیشت کی ایک نمایاں وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کے کارخانے' کپڑے کی صنعت اور غذائی اشیاء کی تیاری کے لیے وقف تھے۔ انجینئرنگ اور کیمیکل کے کارخانے کم تھے۔ اپنی ناقص اور غیر معیاری مصنوعات کو تحفظ دینے کے لیے روس کا نرخنامہ سارے یورپ میں سب سے اونچا تھا۔ تاہم غیر ملکی مصنوعات کی ریل پیل سی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ دفاعی بجٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور ریلوے کی عمارتیں بھی تیزی سے تعمیر ہوتی جارہی تھیں۔ بایں ہمہ' روس کے غیر ترقی یافتہ ہونے کی علامت ۱۹۱۳ء ہی میں عیاں ہونے لگی تھی۔ اس وقت وہاں کی برآمدی اشیاء میں ۶۳ فی صد زرعی سامان تھے جبکہ ۱۱ فی صد عمارتی لکڑی تھی۔ ان دونوں کی برآمدات اشد ضروری تھی کہ ان ہی کی بدولت حسب ذیل کی ادائیگی ہوا کرتی تھی: امریکہ سے درآمد شدہ کھیتی باڑی کے سامان۔ جرمنی سے منگوائے گئے مشینی کل پرزے۔ غیر ملکی قرضوں پر سودی رقم۔ حیرت کی بات یہ کہ ان برآمدات سے قرضوں کی ادائیگی بمشکل ہوا کرتی تھی۔

پیداواری لحاظ سے روس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اگرچہ ۱۹۱۳ء سے قبل یہ ملک صنعتی لحاظ سے چوتھے درجے پر فائز تھا' اس کے باوجود یہ اس معاملے میں امریکہ' برطانیہ اور جرمنی سے بہت پیچھے تھا۔ اپنی فولادی صنعت' توانائی کے استعمال' عالمی مصنوعات میں حصے اور صنعتی صلاحیت کے اعتبار سے یہ برطانیہ اور جرمنی کے مقابلے میں بے حد کم تر تھا۔ جب ان اعداد و شمار کا موازنہ وہاں کی آبادی سے کیا جاتا ہے اور پھر

فی کس آمدنی کا حساب لگایا جاتا ہے تو ان سب میں بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں وہاں فی کس صنعت سازی کی شرح جرمنی کی شرح کا ایک چوتھائی اور برطانیہ کی شرح کی ۱/۶ سے بھی کم تھی۔

بنیادی طور پر روس ایک زرعی ملک تھا اگرچہ ۱۹۱۴ء میں اس نے نوجوان مولنگ اور سینٹ پیٹر برگ میں متعین برطانوی سفیر کو خاصا مرعوب بھی کیا تھا۔ وہاں کی ۸۰ فی صد آبادی کا گزر بسر کھیتی باڑی پر ہوتا تھا۔ بقیہ لوگ دیہی زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ یہ تشویش ناک حقیقت دو عوامل سے مربوط تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ روس کی آبادی میں شدید اضافہ ہوتا گیا۔ وہاں ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۴ء کے دوران ۶۱ ملین بچے پیدا ہوئے۔ یہ آبادی زیادہ تر گاؤں اور نہایت پس ماندہ علاقوں میں بڑھتی گئی جہاں نہ زمین زرخیز تھی' نہ کھاد کا ہی بندوبست تھا۔ جہاں لکڑی کے بنے ہوئے ہل استعمال کیے جاتے تھے۔ دوسرے اس دور کے گوشوارے کے تقابل سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ روس میں زراعت کا معیار ناقص تھا۔ وہاں گندم کی کاشت برطانیہ اور جرمنی کی تہائی کاشت سے بھی کم تھی۔ ٹماٹر دونوں ملکوں کی پیداوار کے نصف ہوتا تھا۔ اگرچہ بالٹک کے علاقے میں جدید قسم کی جائیدادیں اور کھیت کھلیان تھے' لیکن دیگر بہت سی جگہوں پر زمین گروہ یا قبیلے کے زیر نگیں ہوتی تھی اور اجتماعی زراعت کا قدیم رواج برقرار تھا۔ اس سے انفرادی پیدا کاری کا جذبہ مفقود ہوگیا تھا۔ پھر گاہے بہ گاہے زمین کی تقسیم بھی ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ خاندانی زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کیے جاتے تھے تاکہ اگلی تقسیم کے موقع پر مستفیض ہونے کا موقع مل سکے۔ ان گمبھیر مسائل کے ساتھ ساتھ مواصلات کا ناقص نظام' فصل کے اوپر موسم کے مضر اثرات' جنوب کے خود کفیل صوبہ اور قدیم روس کے غیر زرخیز اور گنجان علاقوں کے درمیان نمایاں فرق موجود تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زرعی پیداوار میں اضافے (تقریباً" ۲ فی صد سالانہ) کے باوجود ساری یافت بڑھتی ہوئی آبادی (تقریباً" ۱٫۵ فی صد سالانہ) کی نذر ہو جاتی تھی۔ علاوہ ازیں' فی کس زرعی پیداوار میں اضافہ کی شرح فقط ۰٫۵ فی صد تھی جبکہ قومی پیداوار فی کس ایک فی صد کے حساب سے بڑھ رہی تھی۔ یہ شرح جرمنی' ریاست ہائے متحدہ امریکہ' جاپان' کینیڈا اور سویڈن کے مقابلے میں بے حد قلیل تھی۔ گویا ۵ یا ۸ فی صد سالانہ ترقی کے مقابلے میں یہ نہایت ادنیٰ شرح تھی۔

روس کی طاقت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے مذکورہ عوامل کے سماجی نتائج کا ادراک بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ پروفیسر گراس مین کے تجزیے کے مطابق "صنعت سازی کا عمل نہایت سست رفتاری کے ساتھ جاری تھا۔ دوسرے شعبوں خصوصاً" زراعت اور شخصی مصارف میں بھی کمی آتی رہی۔ معاشرے کو جدید خطوط پر ڈھالنے کا رجحان بھی ناپید تھا"۔ یہ انداز بیان حقیقت آمیز ہے' اس لیے کہ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ یہی تھا کہ اقتصادی طور پر نہایت پس ماندہ ملک کو ارباب اختیار جدید دور میں گھسیٹ رہے تھے۔ وہ محض یہ چاہتے تھے کہ روس کو یورپ کی بڑی طاقت کا درجہ حاصل ہوجائے اور وہ قائم و دائم بھی رہے۔ اگرچہ پیدا کار بھی جدیدیت کی طرف مائل نظر آتے تھے' لیکن اس معاملے میں زیادہ عمل دخل حکومت کا تھا اور وہ بھی فوجی ضروریات کے تحت' مثلاً" ریلوے' لوہا' فولاد' اسلحے وغیرہ وغیرہ! غیر ملکی مصنوعات کی درآمدات کا بار سہنے اور حد سے زیادہ بیرونی قرض کی ادائیگی کے لیے روسی حکومت زرعی پیداوار خصوصاً" گندم

دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے پر مجبور تھی۔ قحط سالی میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا' مثلاً" ۱۸۹۱ء میں! زرعی پیداوار میں کوئی خاص اضافہ نہ ہونے کی وجہ سے کسانوں کا محروم اور افلاس زدہ طبقہ برسوں کسمپرسی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ چونکہ حکومت کو صنعت سازی اور دفاعی اخراجات میں کثیر رقم صرف کرنی پڑتی تھی' لٰہذا بالواسطہ محصول وقتاً" فوقتاً" نافذ کیا جاتا۔ اس طرح شخصی مصارف میں کمی آجاتی۔ اقتصادی ماہرین کی رائے میں "زار کی حکومت مجبور و لاچار عوام سے زبردستی ان کا سرمایہ ضبط کر رہی تھی"۔ نہایت خوفناک حقیقت تو یہ تھی کہ ۱۹۱۳ء میں اوسط روسی باشندے کی ۵۰ فی صد سے زیادہ آمدنی دفاعی اخراجات کی خاطر بحق سرکار ضبط ہو جاتی تھی۔ انگلستان کے باشندوں کے ساتھ ایسا کڑا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر ہر روسی باشندے کی آمدنی برطانوی شخص کے مقابلے میں محض ۲۷ فی صد تھی۔

زرعی پس ماندگی' صنعت سازی اور حد سے زیادہ دفاعی اخراجات کے مضمرات سے وہاں کا پورا معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ۱۹۱۳ء میں حکومت نے مسلح افواج کے لیے تو ۹۷۰ ملین روبل مختص کیے تھے لیکن تعلیم اور صحت کے لیے محض ۱۵۴ ملین روبل مخصوص کیے گئے تھے۔ چونکہ روسی انتظامیہ نے وہاں کی مقامی آبادیوں کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا انگلستان کی لوکل گورنمنٹ کی طرز پر مالی اختیارات نہیں دے رکھے تھے' لٰہذا یہ نقص وہاں ہمیشہ موجود رہا۔ پھیلتے ہوئے شہروں میں نہ تو گندے پانی کی نکاسی کا انتظام تھا اور نہ صحت و صفائی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ گھروں کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی تھی اور اس پر مستزاد حد سے زیادہ کرایہ! چنانچہ مزدور طبقے کو ان حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ پھر انھیں نشہ کرنے کی لت بھی بری طرح پڑی ہوئی تھی۔ یہ دراصل تلخی ایام سے وقتی گریز کا ایک بہانہ تھا۔ وہاں نوشی کی شرح پورے یورپ کے مقابلے میں سب سے زیادہ تھی۔ ایسے ناساعد حالات' کارخانوں میں کی جانے والی بے جا سختی اور غیر معیاری زندگی کی وجہ سے پورے نظام کے خلاف ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے نتیجے میں جمہور پسند' بولشویک' فراری اور انتہا پسند طبقے کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ سنسرشپ کے باوجود ہر ایک شخص تبدیلی کی بات کر رہا تھا۔ ۱۹۰۵ء کی شورش کے بعد وقتی طور پر سکون قائم ہو گیا تھا۔ لیکن ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک کے تین سالہ دور میں ہڑتال' عوامی احتجاج' گرفتاری اور ہلاکت کی صورت خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی' تاہم' کیتھرین اعظم سے لے کر موجودہ حکومت تک تمام روسی لیڈروں کے لیے جو بات حد سے زیادہ باعث تشویش رہی ہے' وہ کسانوں کا معاملہ ہے۔ جب فصل خراب ہوتی اور چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتیں تو اس صورت حال کے نتیجے میں مکان کا کرایہ زیادہ ہو جاتا اور حالات کار ابتر نظر آتے۔ چنانچہ غم و غصے کی لہر دوڑ جاتی اور کسانوں میں شورش برپا ہو جاتی۔ ۱۹۰۰ء کے بعد جو صورت حال تھی' اس کا تذکرہ نورمین اسٹون نے کچھ اس طرح کیا ہے:

> "پولٹاوا اور ٹیمبوف کے صوبوں میں زیادہ تر علاقے تباہ و برباد کر دیے گئے۔ گھر جلا دیے گئے۔ جانوروں کو ہلاک کر دیا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں فوج نے ۱۵۵ مرتبہ مداخلت کی۔ (۱۸۹۸ء میں محض ۳۶ مرتبہ فوجی مداخلت ہوئی تھی) ۱۹۰۳ء میں تو یہ حالت ہوئی کہ شورش کو دبانے کے لیے فوج کو

> ۳۲۲ مرتبہ تادیبی اقدام کرنا پڑا۔ اس مہم میں گھڑسواروں کے ۲۹۵ دستے اور پیدل فوج کے ۳۰۰ بٹالین شامل تھے۔ بعض کے پاس توپیں بھی تھیں۔ ۱۹۰۲ء میں صورت حال انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ کسانوں کو کچلنے کے لیے ۳۶۵ مرتبہ فوج طلب کی گئی۔ ۱۹۰۳ء میں ایک ایسی فوج تیار کی گئی جو پورے ملک میں امن برقرار رکھ سکے۔ یہ ۱۸۱۲ء میں تیار کی جانے والی فوج سے کہیں بڑی تھی۔ سیاہ مٹی والے وسطی علاقے کے ۵۷ صوبوں میں ۶۸ ایسے تھے جہاں ہنگامے اور فساد ہوئے۔ ۵۴ ریاستیں تباہ ہوئیں۔ سب سے زیادہ تباہی سراٹوف میں واقع ہوئی۔"

جب وزیر داخلہ اسٹولی پن نے ۱۹۰۸ء کے بعد بدامنی کو ختم کرنے کے لیے کسانوں کے کمیون کو توڑنا شروع کیا تو فساد پھر شروع ہو گیا۔ یہ ہنگامے یا تو ان علاقوں میں ہوئے جہاں لوگ اپنے کمیون کے نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے یا پھر نئے نئے آزاد ہونے والے کسانوں نے شورش برپا کی جو دیوالیہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۰۹ء میں ۱۳۵۰۷ دفعہ فوج کو طلب کرنا پڑا۔ پھر مذکورہ سال کے تمام عرصے کے دوران ۱۱۳۰۸ مرتبہ فوج بلانا پڑی۔ ۱۹۱۳ء میں سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کے سلسلے میں ایک لاکھ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان عوامل نے فوج پر خاصا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ وہ پہلے ہی اقلیتوں کے ہنگامے فرو کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ ان میں پولینڈ' فن لینڈ' جورجیا' لٹاویا' استونیا' آرمینیا وغیرہ کے باشندے شامل تھے۔ جو فرقہ واریت پھیلا رہے تھے۔ وہ دراصل روسی بنائے جانے کی رعایت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ جو انھوں نے ۶-۱۹۰۵ء میں حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حاصل کر لی تھی۔ اس نوع کے مزید ہنگامے سے مسکووی کے اقتدار کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ہمارے پاس صحیح گوشوارے موجود نہیں' تاہم اس فرقے کے دو ملین لوگوں نے اگست ۱۹۱۴ء میں شادی کرلی تھی تاکہ فوج میں بھرتی ہونے سے بچ رہیں۔

بولشویک انقلاب کے مابعد کے تناظر میں دیکھا جائے تو تو یوں لگتا ہے جیسے ۱۹۱۴ء سے قبل روس سماجی اور سیاسی لحاظ سے چقماق کی حیثیت رکھتا تھا۔ خراب فصل ہونے کی صورت میں رعایت دینے کا روادار نظر آتا تھا اور اسی طرح کارخانے کے مزدوروں کی فلاح و بہبود کا خواہشمند تھا۔ اور جنگ عظیم کے لیے بھی غالباً" تیار تھا۔ بایں ہمہ' زار اور ملک کے ساتھ وفاداری کے عنصر بہت سے علاقوں میں موجود تھا۔ ساتھ ہی ساتھ قومی رجحان' پین۔ سلاوک ہمدردی اور غیر ملکیوں کے ساتھ نفرت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۰۴ء کی طرح ۱۹۱۴ء میں بھی ایسے ڈھنڈورچی اور کاسہ لیس موجود تھے جو یہ کہا کرتے تھے کہ حکومت بین الاقوامی معاملات میں خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اگر اسے جنگ کرنی پڑی تو پوری قوم اس کے فاتحانہ جذبے اور لگن کی حمایت کرے گی۔

کیا اس فتح کی امید کی جاسکتی خصوصاً" ایسی حالت میں جب ۱۹۱۴ء میں روس کے دشمن اور مخالف موجود تھے؟ اس میں شک نہیں کہ کہ روسی سپاہیوں نے نہایت دلیری اور حوصلہ مندی کے ساتھ جاپانیوں کا

مقابلہ کیا تھا۔ انھوں نے ۱۸۷۷ء میں ترکی کے خلاف جنگ کریمین میں بھی ایسا ہی مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے باوجود ناقص منصوبہ بندی' رسد کا خراب نظام اور جنگ کے غیر اصولی طریقے کے مضمرات بھی اپنا اثر دکھاتے رہے ہیں۔ کیا اس وقت روسی افواج آسٹریا۔ ہنگری سے متصادم ہونے کی اہلیت رکھتی تھیں اور کیا سلطنت جرمنی کے صنعتی چشمہ طاقت پر دھاوا بولنے کے قابل تھیں؟ کیا ان کے یہ اقدامات کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے تھے؟ اس دور میں صنعتی مصنوعات میں معتدبہ اضافے کے باوجود روس کی پیداواری صلاحیت روبہ انحطاط تھی' اور جرمنی کے مقابلے میں کم تر درجے پر تھی۔ مثال کے طور پر ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۳ء کے دوران روس کی فولادی صنعت میں ۲۰۲ ملین ٹن سے ۴۰۸ ملین ٹن کا اضافہ ہوا تھا۔ اس کے برعکس جرمنی میں یہ اضافہ ۶۰۳ سے ۱۷۰۶ ملین ٹن ہوا تھا۔ اسی طرح وہاں توانائی کا استعمال اور صنعتی صلاحیت بھی جرمنی کے مقابلے میں کم تر درجے کی تھی۔ آخر میں یہ بات ملحوظ رہے کہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۳ء تک کے عرصے میں عالمی پیداوار میں روس کا حصہ بھی کم ہو گیا تھا' یعنی ۸۰۸ فی صد سے ۸۰۲ فی صد! اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ اس معاملے میں جرمنی اور خصوصی طور پر امریکہ سبقت لے گیا تھا۔ یہ صورت حال روس کے لیے حوصلہ افزا نہ تھی۔

اس ضمن میں فوجی نقطہ نظر سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ روس طاقتور ملک تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اقتصادیات' ریاستی نظم و نسق اور مسلح افواج پر جنگ کے کیا اثرات رونما ہوں گے' ان کا اندازہ فوجی ماہرین نے مطلق نہیں لگایا تھا۔ واضح رہے کہ روس کی ہم عصر جرمن فوجی طاقت نے کرپ کے فولادی کارخانے' شپ یارڈز' ریلنے کی مصنوعات' ریلوے اور ہراول دستے کی جانب توجہ مبذول کی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بڑی طاقت بننے اور جنگ جیتنے کے لیے بس فوجیوں کی تعداد ہی کی اہمیت ہوتی ہے تو اس لحاظ سے روس میں فوج کے ڈویژن پر ڈویژن بن رہے تھے' توپیں ڈھل رہی تھیں' فوجی ٹرینیں بن رہی تھیں اور جنگی جہاز تیار ہو رہے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا ان عوامل نے کوئی تاثر بھی پیدا کیا؟ یہ سوچ کر کہ جنگ تو مختصر عرصے کے لیے ہوگی' مذکورہ عام سے گوشوارے پیش کر کے یہ باور کر لیا گیا کہ روس کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اعداد و شمار کے یہ گورکھ دھندے جونہی الگ کر دیے جائیں تو فوج کا مسئلہ حد سے زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ روس کی سماجی' اقتصادی اور تکنیکی زبوں حالی ہی دراصل سارے مسائل کا پیش خیمہ تھا۔ کسانوں پر مشتمل کثیر آبادی کا مطلب یہ تھا کہ ہر سال اس کا پانچواں حصہ زبردستی فوج میں بھرتی کر لیا جاتا۔ ہر تنومند شخص کے رنگروٹ بنا دیے جانے کے نتیجے میں پورا سماجی نظام بگڑ گیا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ بھرتی کیے جانے والے یہ کسان صنعتی دور کی جدید جنگ کے لیے مطلق کار آمد ثابت نہیں ہوتے تھے۔ یہاں جنگی سازو سامان پر تو خاصی توجہ مبذول کی جاتی' لیکن قوم و ملک کی مجموعی طاقت مثلاً " تعلیم' تکنیکی صلاحیت اور بہتر نوکر شاہی ـــ مطلق بے توجہی کا شکار تھی۔ چنانچہ روس میں سرکاری عملہ معیار کے مطابق نہ تھا۔ ۱۹۱۳ء تک یہ حال تھا کہ وہاں خواندگی کی شرح کل ۳۰ فی صد تھی۔ ایک مبصر نے طنزیہ انداز میں یہ کہا تھا کہ "اٹھارھویں صدی کے وسط میں انگلستان میں خواندگی کی جو شرح تھی' اس کے مقابلے میں تو یہ بے حد قلیل تھی"۔ رنگروٹوں پر تو بے پناہ رقم صرف کی جاتی تھی' لیکن کیا یہ فوج ظفر موج فائدہ مند بھی تھی

جبکہ مسلح افواج میں نان کمیشن افسر خال خال ہی تھے؟ یہ وہ حقیقت تھی جسے روس کی جنرل اسٹاف نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا' لیکن جرمنی کی طاقت کو دیکھ دیکھ کر احساس کمتری اور جذبہ عداوت میں مبتلا ضرور تھا۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھا کہ اچھے فوجی افسروں کی بے حد کمی ہے اور یہ بات غیر ملکی مبصرین بھی جانتے تھے۔ آج جو شواہد ہمارے سامنے آتے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھاری بھر کم توپوں' مشین گنوں' بے پناہ پیدل فوجیوں' تکنیکی طریقوں' مواصلاتی سہولتوں اور ہوائی جہازوں کے باوجود روسی فوج کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔

یہ تاریک پہلو اس وقت بھی سامنے آئے جب روس کے نہایت منظم اور منصوبہ بندی سے چلنے والا ریلوے کا نظام تفصیلی طور پر زیر بحث آیا۔ اگرچہ ۱۹۱۳ء میں اس کی ریلوے لائن کی وسعت خاصی موثر معلوم ہوتی تھی' لیکن جب روسی سلطنت کے طویل فاصلے کو دیکھا جاتا یا اس کا مغربی یورپ کے نظام سے مقابلہ کیا جاتا تو اس کی کم مائیگی ظاہر ہو جاتی۔ روس میں جو ریلوے لائن بچھائی گئی تھی وہ بہت ہی ناقص طریقے سے بچھائی گئی تھی اس کی پٹڑی عموماً" کمزور ہوتی تھی اور ریلوے لائن کی نچلی سطح بھی مضبوط نہیں ہوتی تھی۔ اس میں پانی کے ٹینک بھی کم ہوتے اور کراسنگ گیٹ بھی خال خال تھے بعض انجن کوئلے سے چلتے' بعض تیل سے اور کچھ لکڑی سے۔ اس سے بھی صورت حال پیچیدہ ہو جاتی تھی۔ بہرحال' یہ اتنا اہم مسئلہ نہ تھا جتنا گھمبیر معاملہ فوجی چھاؤنی کا تھا۔ یعنی امن کے زمانے میں فوجیوں کی رہائش کا انداز جنگ میں محاذوں پر تعیناتی سے بالکل مختلف تھا۔ پھر مختلف فوجیوں کی تو مختلف مقامات پر تعیناتی بھی ایک ایسا معاملہ تھا جس کا اثر فوج کی کارکردگی پر پڑتا تھا' مثلاً" پولینڈ کے رہنے والے سپاہی ایشیا میں تعینات کیے گئے تھے اور کاؤکاشیا کے فوجی بالٹک کے صوبوں میں خدمت انجام دے رہے تھے۔ بہرحال جب کوئی بڑے پیمانے کی جنگ شروع ہوتی تو پوری فوج بذریعہ ٹرین محاذ پر پہنچا دی جاتی۔ ریلوے کا عملہ ناکافی ہوتا تھا اور اس میں بھی ہر تیسرا شخص پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ پھر ریلوے کے تین چوتھائی افسران تکنیکی تربیت سے محروم تھے۔

روس نے فرانس اور سربیا کے ساتھ جو وعدے وعید کر رکھے تھے اس کے نتیجے میں فوج کے نقل و حمل اور تعیناتی کا مسئلہ بھی خاصا گھمبیر ہو گیا تھا۔ پھر وہاں کا ریلوے نظام بھی غیر تسلی بخش تھا۔ اور مشرقی پروشیا اور گلیشیا کے حملے کا تدارک کرنے کے لیے جو فوج تعینات کی گئی تھی وہ نہایت ناموزوں تھی۔ ۱۹۰۰ء سے قبل کے عرصے میں روسی سربراہ کا عندیہ یہ ہوتا تھا کہ جنگ کی ابتداء میں مدافعانہ رویہ اختیار کیا جائے' پھر آہستہ آہستہ فوجی قوت کا اظہار کیا جانا چاہیے۔ ۱۹۱۲ء میں بھی بعض فوجی ماہرین نے ایسا ہی رویہ اختیار کرنے پر زور دیا تھا۔ کئی جرنیل آسٹریا۔ ہنگری کو شکست دینے کے خواہشمند تھے۔ انھیں اس مہم میں اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔ اور جب ویانا اور بلغراد کے درمیان کشیدگی انتہا کو پہنچ گئی تو انہی جرنیلوں نے سربیا پر آسٹریا۔ ہنگری کے حملے کے وقت بلغراد کی مدد کرنا ضروری سمجھا۔ روس جنوبی محاذ پر فوج روانہ کرنے سے بھی گریزاں تھا۔ اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جرمنی کس وقت کیا کچھ کر بیٹھے۔ ۱۸۷۱ء کے بعد کے عشروں میں منصوبہ سازوں نے یہ قیاس آرائی کر لی تھی کہ روس اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑتے ہی مشرقی محاذ پر آخرالذکر کو جلد ہی شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن جب شیلیفن کے منصوبے کے خدوخال واضح ہو گئے

تو فرانس نے سینٹ پیٹر سبرگ پر دباؤ ڈالا کہ وہ جلد از جلد جرمنی کے خلاف جارحانہ اقدام کرے تاکہ اس کے مغربی اتحادی ملک کو فائدہ پہنچے۔ ایک طرف فرانس کی تباہی کا خیال دامن گیر تھا تو دوسری طرف پیرس کی یہ شرط تھی کہ قرض صرف جارحانہ اقدامات کو بہتر بنانے کے لیے دیا جائے گا۔ چنانچہ روسی منصوبہ ساز مغربی سمت حملہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان تمام اسباب و عوامل کی بنا پر ۱۹۱۴ء سے قبل کے برسوں میں جنرل اسٹاف میں اچھی خاصی توتو میں میں ہونے لگی۔ پھر مختلف مکتب فکر کے لوگ درج ذیل امور سے متعلق مختلف آراء کے حامل تھے: جنوبی محاذ کے برعکس شمالی محاذ پر متعینہ فوج کی تعداد۔ پولینڈ کے حفاظتی قلعے کو تباہ و برباد کر دینے کی اسکیم، کیونکہ وہاں نئی قسم کی بہت سی توپیں نصب تھیں۔ ساری فوج کے نقل و حمل کی بجائے تھوڑے تھوڑے دستے کی روانگی کا حکم! روس کی سفارتی مجبوریوں کے تحت اس کے گومگو کے عالم میں رہنے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن اس رویے سے فوج کی کارکردگی اتنی بھی بہتر نہیں ہوئی کہ دشمنوں پر فتح پانے کا امکانات روشن ہو جاتے۔

مسائل بے پناہ بڑھ رہے تھے۔ روسی گھڑ سوار فوج کے پچاس ڈویژن تھے۔ ان میں تقریباً" دس لاکھ گھوڑے موجود تھے۔ مگر ان کے لیے بہت زیادہ مقدار میں چارے کے ساتھ ساتھ نقل و حمل کے لیے سڑکوں کی بھی ضرورت تھی مگر وہاں جدید طرز کی سڑکیں خال خال تھیں۔ چنانچہ گھوڑوں کو چارے کے طور پر ریلوے کے ذریعے سوکھی گھاس ہی فراہم کی جاتی تھی۔ اور اسی کے باعث مواصلاتی نظام درہم برہم ہوتا تھا۔ پھر اسی وجہ سے فوج کی نقل و حمل اور خصوصاً" محفوظ دستوں کے محاذ پر پہنچنے میں تاخیر ہوا کرتی۔ روس میں ٹرانسپورٹ کا نظام اس درجہ ناقص تھا فوجی سپاہی جنگ کے موقع پر لاکھوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہراول دستے کے طور پر لڑنے کے چنداں قابل نہ ہوتے تھے۔ اگرچہ ۱۹۱۴ء سے قبل دفاعی ضرورتوں کے لیے کثیر رقم مختص کی جاتی تھی، لیکن یہ تمام کی تمام محض فوجیوں کے کھانے، پینے اور جانوروں کے چارے پر ہی صرف ہو جاتی۔ ادھر بحری فوج میں بڑے وسیع پیمانے پر اچھے اور نئے طرز کے بیڑے کا اضافہ ہوا تھا۔ اس کے باوجود ضرورت اس بات کی تھی کہ عملے کو اعلیٰ درجے کی تکنیکی تربیت دی جائے اور موثر قسم کی بحری مشق سے گزارا جائے۔ چونکہ بحریہ کے زیادہ تر فوجی ساحل پر رہتے تھے، اس لیے ان کے لیے ایسی تربیت اور مشق ممکن نہ تھی۔ پھر روس نے اپنے بحری بیڑوں کو بحیرہ بالٹک اور بحر اسود کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ اس وجہ سے اس کی بحری طاقت میں امتیازی مقام حاصل کرنے کے امکانات روشن نہیں تھے۔ صرف ترکوں سے لڑائی کی حد تک اسے یہ صلاحیت حاصل تھی۔

آخری بات یہ کہ مذکورہ دور میں روس کی مجموعی کارکردگی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ یہ تنقید کا نشانہ بنے بغیر نہ رہ سکی۔ اگرچہ بعض قدیم خیال کے غیر ملکی افراد نے وہاں کے آمرانہ اور مرکزی نظام کی تعریف کی تھی اور یہ کہا تھا کہ اس طرح دفاتی منصوبوں کو استحکام حاصل ہوتا ہے جو مغربی طرز جمہوریت میں ممکن نہیں! تاہم، اگر ان باتوں کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو بہت سی خامیاں عیاں ہو جاتی ہیں۔ زار نکولس دوم ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ سادہ مزاج، عزلت نشیں، مشکل فیصلے سے اجتناب برتنے والا اور روسی عوام کے ساتھ مقدس رشتے کا معترف تھا۔ (یہ اور بات ہے کہ روسی باشندوں کی فلاح و بہبود کا

اسے چنداں خیال بھی نہیں آیا۔) اعلیٰ سطح پر حکومت کے فیصلے صادر کرنے کے جو طریقے تھے وہ [illegible] طرز شہنشاہیت کو شرما دینے کے لیے کافی تھے۔ دربار میں بڑے بڑے غیر ذمہ دار قسم کے لوگ تھے، جو [illegible] اور متلون طبیعت کے شہزادگان تھے، جلد ردعمل ظاہر کرنے والے جرنیل تھے اور ہر آمائش قسم کے [illegible] تھے۔ یہ لوگ ذہین اور لائق و فائق وزراء سے تعداد میں بھی زیادہ تھے اور رتبے میں بھی کہ [illegible] بہرحال حکومت کے ملازم تھے، لہٰذا زار روس تک ان کی نہ پہنچ تھی اور نہ شنوائی! وزارت خارجہ اور فوج میں باہمی مشاورت اور ہم آہنگی کا فقدان بسا اوقات تشویشناک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ سرکار دربار کا رویہ اسمبلی کے ساتھ نہایت معاندانہ تھا! ایسی صورت حال میں اصلاح احوال کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ طبقہ امراء کو اپنے مفادات عزیز تھے اور زار کو ذہنی سکون عزیز تھا۔ اس ملک میں شرفاء کو ہمیشہ مزدوروں اور کسانوں کی شورشوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اگرچہ سرکاری اخراجات دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے، تاہم، امیروں پر براہ راست ٹیکس قلیل تھا (یعنی سرکاری آمدنی کا فقط ٦ فی صد)۔ البتہ محصول کا بہت زیادہ بوجھ اشیائے خوردنی اور روڈکا شراب پر تھا (تقریباً" ۴۰ فی صد)۔ اس ملک میں ادائیگی کو توازن نہایت عمدہ تھا۔ لیکن بیرون ملک جو رقم اللے تللے پر امراء خرچ کرتے تھے اسے روکنے یا اس پر ٹیکس عائد کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ چونکہ روس میں طبقہ امراء کا حد سے زیادہ تسلط تھا، طبقہ وراثت کا نظام رائج تھا، تعلیمی سطح نہایت ادنیٰ تھی اور اجرت کی شرح بھی قلیل ہوا کرتی تھی، لہٰذا وہاں جرمنی، برطانیہ اور جاپان جیسے لائق و فائق سول ملازمین کا فقدان تھا۔ فی الحقیقت روس ایک مستحکم ریاست نہ تھی۔ اور اس کے حکمرانوں میں اعلیٰ قیادت کے فقدان کی وجہ سے غیر ملکی امور میں ۱۹۰۴ء کے تلخ تجربات کے باوجود یہ ملک غلطی پر غلطی کرتا رہتا تھا۔

آخر ہم کس طرح مذکورہ دور میں روس کی طاقت کا تعین کریں؟ اس میں شک نہیں کہ وہ صنعتی اور فوجی لحاظ سے سال بہ سال ترقی کیے چلا جا رہا تھا۔ نیز اس کی اور بھی خصوصیات تھیں، مثلاً" اس کی فوج بہت بڑی تھی، معاشرے میں حب الوطنی اور عزت کا احساس جاگزیں تھا۔ یہ سب باتیں درست تھیں اس میں آسٹریا۔ ہنگری، ترکی، حتیٰ کہ جاپان کے ساتھ لڑنے اور فتح پانے کی پوری صلاحیت تھی۔ لیکن بدبختی یہ تھی کہ جرمنی کے ساتھ اس کی محاذ آرائی پہلے سے چلی آ رہی تھی جو مسلسل جاری تھی۔ ۱۹۰۹ء میں اسٹولی پن نے یہ کہا تھا کہ "اس ریاست کو بیس سال کے لیے اندرونی اور خارجی طور پر امن سے رہنے دیجئے۔ پھر آپ روس کو پہچان نہیں سکیں گے"۔ یہ بات یقیناً" سچ ثابت ہو سکتی تھی۔ بایں ہمہ، اس مدت میں جرمنی کی طاقت بھی تو فزوں ہوتی رہتی۔ پروفیسر ڈوران اور پروفیسر پارسنز کے اعداد و شمار کے مطابق (دیکھئے چارٹ نمبر ۱) ۱۸۹۴ء کے بعد روس کی طاقت مذکورہ دہائیوں میں نچلی سطح سے بڑھتی رہی ہے جبکہ اس دوران جرمنی کی طاقت عروج پر تھی۔

اگرچہ بعض قارئین کی نظر میں یہ تصوراتی انداز کی پیشکش معلوم ہو گی، لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے زیادہ تر عرصے میں بڑھتی ہوئی معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ روس کی طاقت اور اثر و رسوخ کو زوال آچکا تھا۔ ہر بڑی جنگ ـــــــ، مثلاً" جنگ کریمین،

روس اور جاپان کی جنگ ---- نے فوج کی کمزوری کو عیاں کر دیا۔ حالات نے وہاں کی حکومت کو وہ خلا پُر کرنے پر مجبور کر دیا جو روس اور مغربی ملکوں کے درمیان واقع تھا۔ ۱۹۱۴ء سے قبل مبصرین کو ایسا محسوس ہوا جیسے خلا دوبارہ پُر کر دیا گیا ہے۔ تاہم، بعض کے خیال میں نمایاں اسقام ہنوز موجود تھے۔ چونکہ اسٹولی پن کی خواہش کے مطابق روس کو بیس سالہ امن حاصل نہ ہو سکا، اور اسے پھر جنگ کی بھٹی سے گزرنا پڑا۔ اس جنگ کا اصل مدعا یہ معلوم کرنا تھا کہ یورپ کی سیاسی طاقت میں اسے وہی پوزیشن حاصل ہو گئی ہے یا نہیں جو ۱۸۱۵ء اور ۱۸۳۸ء میں حاصل تھی۔

روس اور جرمنی کی متعلقہ قوت

چارٹ نمبرا

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں عالمی طاقت کے توازن میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں ایک نہایت اہم تبدیلی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا عروج تھا۔ خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد امریکہ اپنے وسائل سے کما حقہ فائدہ اٹھانے میں مصروف ہو گیا۔ ہم ان قدرتی وسائل کا پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں، یعنی زراعت کے لیے نہایت زرخیز زمین، خام مال کی بہتات اور جدید ٹیکنالوجی (مثلاً" ریلوے، بھاپ سے چلنے والے انجن، کان کنی کے آلات)۔ ان سب کی مدد سے وسائل کو ترقی دی جانے لگی۔ پھر وہاں سماجی، جغرافیائی اور سیاسی بحران کی کمی بھی تھی، بیرونی خطرات بھی لاحق نہیں تھے، بیرونی سرمایہ کاری کی ریل پیل تھی، اندرون ملک بھی لوگ نہایت تیزی سے سرمایہ لگا رہے تھے۔ اس طرح امریکہ برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ یہاں اس کی ایک مثال دی جا سکتی ہے۔ ۱۸۶۵ء میں خانہ جنگی کا اختتام اور ۱۸۹۸ء میں اسپین و امریکہ کی جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ اس دوران امریکہ کی پیداوار میں اضافے کی شرح یہ تھی: گندم ۲۵۶ فی صد، مکئی ۲۲۲ فی صد، اعلیٰ قسم کی شکر ۴۶۰ فی صد، کوئلہ ۸۰۰ فی صد، لوہے کی پٹڑی ۵۲۳ فی صد۔ پھر نئی ریلوے لائن بچھانے کے کام میں ۵۶۷ فی صد اضافہ ہوا تھا۔ نئے نئے کارخانوں میں جب کام شروع ہوا تو اس قدر ترقی ہوئی کہ فی صدی کا معاملہ بے مایہ ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح پٹرول کی پیداوار جو ۱۸۶۵ء میں تقریباً" تیس لاکھ بیرل تھی، ۱۸۹۸ میں بڑھ کر پانچ کروڑ پچاس لاکھ بیرل ہو گئی۔ اسی طرح فولاد کی مصنوعات بیس ہزار ٹن سے بڑھ کر نوے لاکھ ٹن ہو گئی۔ اسپین کے ساتھ ہونے والی جنگ کی وجہ سے اس ترقی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ بیسویں صدی کے اوائل میں اس میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ کے مذکورہ وسائل سے فائدہ اٹھانے کا عمل مسلسل جاری رہا۔ اگر اس میں کوئی رخنہ پڑا بھی تو وہ یا تو قدرتی آفات کا نتیجہ تھا، خانہ جنگی کا اثر تھا، یا پھر لاکھوں باشندوں کے بحرالکاہل کے علاقے میں نقل مکانی کر جانے کے باعث تھا۔ واضح رہے کہ ہجرت کر جانے والے اپنے حصے کا سونا حاصل کرنے وہاں گئے تھے اور اپنے پیچھے محنت مزدوری کرنے والوں کا ایک خلا چھوڑ گئے۔

یوں لگتا ہے جیسے امریکہ کو وہ تمام اقتصادی وسائل میسر تھے جو دیگر ملکوں کو جزوی طور پر ہی حاصل تھے۔ دلچسپ بات یہ کہ ان ملکوں کی تحریک میں محرومی اس کے مقدر میں نہ تھی۔ یہ ملک حد درجہ وسیع و عریض تھا، لیکن اس کا فاصلہ مواصلات کے بہتر نظام کی بدولت خاصا کم ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ریلوے لائن ڈھائی لاکھ میل پر محیط تھی۔ اس کے مقابلے میں روسی ریلوے لائن محض چھیالیس ہزار میل پر پھیلی ہوئی تھی، حالانکہ یہ ملک امریکہ سے ڈھائی گنا بڑا تھا۔ امریکہ میں زرعی کاشت روس کی نسبت بیشتر زیادہ

رہی۔ وسطی یورپ کی زراعت کے مقابلہ میں امریکی زراعت وسیع پیمانے کی نہ تھی' پھر بھی زیر کاشت زمین کا وافر رقبہ' اعلیٰ درجے کے زرعی آلات' ریلوے اور اسٹیمر کے ذریعے ترسیل کی کم اجرت کی وجہ سے امریکہ میں گندم' مکئی' سور (Pork)' گائے کا گوشت اور دیگر اشیائے خوردنی یورپ کے مقابلے میں سستی تھیں۔ امریکہ کی مشہور کمپنیاں' مثلاً" انٹرنیشنل ہارویسٹرز' سنگر' ڈیوپونٹ' بیل' کولٹ اور اسٹینڈرڈ آئل تکنیکی لحاظ سے دنیا کی فرموں کی نہ صرف ہم پلہ تھیں' بلکہ بسا اوقات ان سے کہیں بہتر تھیں۔ مذکورہ کمپنیوں کو اندرون ملک وسیع منڈی حاصل تھی اور اعلیٰ درجے کا منافع بھی۔ یہ خصوصیات ان کی مخالف جرمنی' برطانیہ' اور سوئٹزر لینڈ کی فرموں کو میسر نہ تھیں۔ روس میں صورت حال "دیو قامتی" صنعتی کارکردگی کے لیے ہمیشہ بامناسب رہی۔ لیکن امریکہ میں یہی بات سازگار تھی۔ مثال کے طور پر' انڈریو کارنیگی کی فولادی مصنوعات پورے انگلستان کی مجموعی مصنوعات سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ ۱۹۰۱ء کی بات ہے جب یہ کارخانہ یونائیٹڈ اسٹیٹس اسٹیل کارپوریشن کو فروخت کر دیا گیا۔ جب ۱۹۰۳ء میں برطانیہ کے مشہور جنگی جہاز کے ڈیزائنر' سرولیم وائٹ امریکہ کے دورے پر آئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ امریکی شپ یارڈز میں بہ ایک وقت چودہ جنگی جہاز اور تیرہ مسلح کشتی جہاز تیار کیے جا رہے تھے۔ (حیرت کی بات یہ کہ تجارتی جہاز کم تعداد میں تیار ہو رہے تھے)۔ صنعت و حرفت ہو' زراعت ہو یا مواصلات' ہر شعبے میں اعلیٰ پیمانے پر ترقی ہو رہی تھی۔ لہٰذا یہ بات باعث حیرت نہ تھی کہ ۱۹۱۳ء میں امریکہ کی قوم آمدنی اور فی کس آمدنی ہر لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔

جدول نمبر ۲۱

۱۹۱۳ء میں عالمی طاقتوں کی قومی آمدنی' آبادی اور فی کس آمدنی

	قومی آمدنی	آبادی	فی کس آمدنی
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۳۷ بلین ڈالر	۹۸ ملین	۳۷۷ ڈالر
برطانیہ	۱۱ 〃	۴۵ 〃	۲۴۴ 〃
فرانس	٦ 〃	۳۹ 〃	۱۵۳ 〃
جاپان	۲ 〃	۵۵ 〃	۳٦ 〃
جرمنی	۱۲ 〃	٦۵ 〃	۱۸۴ 〃
اٹلی	۴ 〃	۳۷ 〃	۱۰۸ 〃
روس	۷ 〃	۱۷۱ 〃	۴۱ 〃
آسٹریا۔ ہنگری	۳ 〃	۵۲ 〃	۵۷

نہایت تیزی سے ہونے والی اس توسیع کا اندازہ جدول ۲۱ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ نیز' اعداد و شمار کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کوئلہ کی پیداوار ۵۵۵ ملین ٹن تھی جو برطانیہ اور جرمنی کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ (برطانیہ میں کوئلہ کی پیداوار ۲۹۲ ملین تھی جبکہ جرمنی میں ۲۷۷ ملین!) اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ تیل امریکہ میں (نکلتا) تھا۔ اسی طرح تانبے کا استعمال بھی وہاں سب سے زیادہ تھا۔ کچا لوہا بھی وہاں جرمنی' برطانیہ اور فرانس کے مجموعی لوہے سے زیادہ ہوتا تھا۔ فولادی مصنوعات بھی ان تینوں کے مساوی تھیں۔ ۱۹۱۳ء میں وہاں جدید قسم کے ایندھن کا استعمال برطانیہ' جرمنی' فرانس روس اور آسٹریا ۔ ہنگری کے برابر تھا۔ ساری دنیا میں سب سے زیادہ موٹر گاڑیاں امریکہ میں بنتی تھیں اور اتنی ہی زیادہ استعمال بھی ہوتی تھیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ پورا براعظم مسابقت میں آگے آگے تھا اور اتنی تیزی سے ترقی کر رہا تھا کہ عنقریب پورے یورپ کو مات کرنے والا تھا۔ ایک تخمینے کے مطابق اگر یہ ترقی کی رفتار جاری رہتی اور جنگ عظیم نہ ہوتی تو ۱۹۲۵ء تک امریکہ اپنی اقتصادی برتری کی وجہ سے پورے یورپ کو پیچھے چھوڑ جاتا۔ البتہ' پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جہاں معیشت تباہ و برباد ہوئی اور قدیم پرانی طاقتوں کی ساکھ متزلزل ہوئی' وہاں امریکہ نے چھ سال قبل ہی وہ مجوزہ مقام پالیا ---- یعنی ۱۹۱۹ء میں! واسکوڈی گاما کا وہ دور جو چار صدیوں تک پوری دنیا پر یورپ کی بالا دستی سے عبارت تھا' ۱۹۱۳ء کے پرآشوب زمانے سے قبل ہی ختم ہو رہا تھا۔

امریکہ کی اقتصادی ترقی میں بیرونی تجارت کا کردار خاصا کم رہا تھا۔ یعنی ۱۹۱۳ء میں اس کی مجموعی قومی آمدنی کا محض ۸ فی صد حصہ غیر ملکی تجارت کے ذریعے حاصل ہوتا تھا جبکہ برطانیہ میں یہ شرح ۲٦ فی صد تھی۔ اس حقیقت کے باوجود دوسرے ملکوں پر امریکہ کے اقتصادی اثرات قائم تھے۔ روایتی طور پر امریکہ خام مال خصوصاً" روس کو برآمد کیا کرتا تھا۔ باہر کے ملکوں سے تیار مال منگواتا تھا۔ تجارت میں معمول کے خسارے کو سونا برآمد کر کے پورا کرتا تھا لیکن خانہ جنگی کے بعد کے دور میں صنعت سازی کی ترقی نے اس طریقہ کار کو بالکل بدل ڈالا۔ امریکہ نہایت تیزی سے دنیا کا سب سے بڑا مصنوعات بنانے والا ملک بنتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عالمی منڈی میں اپنے ہاں کے بنے ہوئے زرعی آلات' لوہے اور فولاد کی بنی ہوئی مصنوعات' مشینی اوزار' بجلی کے سامان اور دیگر تیار مال بھیجنا شروع کر دیا۔ بایں ہمہ شمالی علاقے کے صنعت سازوں کی انجمن اتنی طاقتور تھی کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ غیر ملکی مصنوعات کو اپنی منڈیوں میں آنے نہیں دیا جائے گا۔ اس کے لیے نرخنامہ خاصا بڑھا چڑھا کر رکھا گیا۔ پھر بھی خام مال اور خصوصی سامان مثلاً" جرمنی سے رنگنے کا سامان خاصی بڑی مقدار میں منگوایا جاتا تھا۔ پھر امریکہ کے ضرورت مند کارخانوں کو منتقل کر دیا جاتا تھا۔ جہاں ملکی صنعت کی برآمدات فروغ پا رہی تھیں وہاں "مواصلاتی انقلاب" کی بدولت زرعی پیداوار بھی خاصی مقدار میں بیرون ملک روانہ کی جا رہی تھی۔ ۱۹۰۰ء سے قبل کی نصف صدی میں ایک بشل گندم کے شکاگو سے لندن بھیجنے میں ۱۰ سے ۴۰ سینٹ خرچ آتا تھا۔ چنانچہ امریکہ کی زرعی پیداوار بحیرہ اوقیانوس سے بھی آگے پہنچنے لگی۔ ۱۸۹۷ء میں ۲۱۲ ملین بشل مکئی برآمد کی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں ۲۳۹ ملین بشل گندم بیرون ملک روانہ کی گئی۔ اس روز افزوں برآمدی تجارت میں غلہ' آٹا' گوشت اور لحمی مصنوعات بھی

شامل تھیں۔

اس تجارتی لین دین کا اثر جہاں اقتصادی حالات پر پڑا وہاں ساتھ ساتھ بین الاقوامی تعلقات بھی اس کے زیر اثر آئے۔ امریکی کارخانے اور فارم کی حد سے بڑھی ہوئی مصنوعات سے یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ خود اندرون ملک منڈیوں میں اتنے سارے سال کی کھپت بمشکل ہو سکے گی۔ چنانچہ اس کام میں دلچسپی رکھنے والے مضبوط طبقے (مثلاً" مغرب کے وسط میں رہنے والے کسان اور پیرگ کے لوہے کے صنعت کار) نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ سمندر پار ملکوں میں منڈیاں قائم کرنے کے لیے امداد فراہم کرے۔ چین میں کھلا مسلک قائم رکھنے کے سلسلے میں خاصا احتجاج ہوا۔ پھر لاطینی امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اقتصادی برتری برقرار رکھنے کی تحریک بھی چلی۔ چنانچہ ان دو عوامل نے عالمی تجارت میں ملکی حصص کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۹۱۴ء کے دوران امریکی برآمدات سات گنا سے بھی زیادہ بڑھ گئیں (یعنی ۳۳۴ ملین ڈالر سے ۲۰۳۶۵ بلین ڈالر) چونکہ امریکہ اپنی منڈیوں کو تحفظ فراہم کرنا چاہتا تھا' لہٰذا اس کی درآمدات میں محض پانچ گنا ہی اضافہ ہوا (یعنی ۳۵۶ ملین ڈالر سے ۱۰۸۹۶ بلین ڈالر) امریکہ کی سستی غذاؤں کی ریل پیل سے براعظم یورپ کے کسانوں کو خاصی تشویش ہوئی اور انہوں نے نرخنامہ بڑھانے پر اصرار کیا جس میں انہیں کامیابی بھی ہوئی۔ برطانیہ میں آزاد تجارت کی پالیسی اپنا کر کسانوں کو ویسے ہی نقصان پہنچایا گیا تھا۔ اب امریکہ سے درآمد ہونے والی مشین' لوہا' فولاد وغیرہ نے وہاں تشویش کی لہر دوڑا دی۔ ۱۹۰۲ء میں ڈبلیو' ٹی' اسٹیڈ نامی صحافی نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس نے اس کا عنوان ہی رکھا تھا "دی امریکا ئیزیشن آف دی ورلڈ" ادھر قیصر ولیم اور یورپ کے دیگر سیاست دان اس بات پر مصر تھے کہ امریکہ کے ناروا تجارتی فروغ کے مقابلے میں سبھوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔

امریکہ کا غیر مستحکم بنا دینے والا زیادہ اثر دنیا بھر کے مالیاتی نظام اور رقم کے لین دین پر پڑا۔ چونکہ یورپ کے ساتھ تجارت میں اس کا بہت زیادہ مال کھپا ہوا تھا' لہٰذا یورپی ممالک کو اپنا خسارہ برابر کرنے کے لیے وہاں سرمایہ منتقل کرنا پڑتا۔۔ یعنی امریکی صنعت' افادی کاموں اور دیگر سروسز میں سرمایہ لگانا پڑتا۔ ۱۹۱۳ء میں اس طرح کی سرمایہ کاری کی مجموعی رقم تقریباً" ۷ بلین ڈالر تھی۔ اگرچہ مغربی کرے میں قدرتی سکوں کی جو ریل پیل لگی ہوئی تھی اس میں کمی آ گئی اور اس کی وجہ دراصل یورپ والوں کی سرمایہ کاری پر سود کی ادائیگی اور خود امریکہ کے جہاز اور انشورنس کے اخراجات تھے' پھر بھی زروجواہر کا پرنالہ بہتا جا رہا تھا اور اس میں مزید وسعت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ پھر امریکی خزانے نے ایسی پالیسی اپنائی کہ دنیا کا ایک تہائی سونا اس ملک میں جمع ہو گیا۔ اس وقت تک امریکہ عالمی تجارت کے نظام کا جزولاینفک بن چکا تھا۔ ایک طرف تو خام مال فراہم کرنے والے ملکوں کے ساتھ ادائی کا خاسر توازن تھا تو دوسری طرف یورپ میں امریکی مال کی بہتات تھی۔ اس کے باوجود اس کا اپنا مالیاتی ڈھانچہ ہنوز ترقی پذیر تھا۔ مثال کے طور پر اس کی زیادہ تر بیرونی تجارت اسٹرلنگ میں ہوتی تھی۔ اور لندن سونا فراہم کیا کرتا تھا۔ ایسا کوئی مرکزی بینک نہ تھا جو منڈیوں کے مالیاتی لین دین کو کنٹرول کرتا۔ ادھر نیویارک اور لین دین میں ملوث زراعتی ریاستوں کے مابین فنڈز کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ اس میں فصل اور ناسازگار آب و ہوا کا عمل دخل بھی تھا۔ پھر سٹہ باز بھی نہ صرف

اندرون ملک نظام زر پر اثر انداز ہو رہے تھے بلکہ لندن سے بھی سونے کے بھاؤ تاؤ کے سلسلے میں ساز باز کر رہے تھے۔ بہرحال ۱۹۱۴ء سے قبل کے برسوں میں عالمی تجارت پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اثرات پوری طرح مرتسم ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں امریکہ میں بینکوں کا بحران پیدا ہوا تھا اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ سٹہ بازوں نے تانبے کی خریدوفروخت کے سلسلے میں منڈیوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ اس افتاد کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ لندن' ایمسٹرڈم اور ہمبرگ جیسے شہر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس طرح یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ پہلی جنگ عظیم سے ماقبل امریکہ دوسری بڑی طاقتوں کے اقتصادی نظام پر کس طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔

امریکہ کی صنعتی طاقت اور سمندر پار تجارت کو جس طرح فروغ حاصل ہو رہا تھا' اس میں سفارت کاری اور بہتر انداز کی سیاست کا بھی عمل شامل تھا۔ امریکیوں کا یہ اعلان تھا کہ روئے زمین کے انسان فطری خصوصیات اور اخلاقی قدروں کے حامل ہیں۔ وہ سماجی نظریہ ارتقاء کے قائل تھے۔ صنعتی اور زرعی پریشر گروپوں پر ان کا مسلسل دباؤ تھا کہ وہ سمندر پار کے علاقوں میں منڈیاں تلاش کریں۔ اس طرح امریکہ کی خارجہ پالیسی قدیم دنیا کے مقابلے میں بہت اعلیٰ و افضل ہو گئی۔ اب امریکہ نظریہ مونرو کے ساتھ وسعت پسندوں کے نظریہ "نوشتہ دیوار" کو بحرالکاہل تک پھیلانے کا عزم کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ کسی ملک کے ساتھ اتحاد کرنے سے گریز کر رہا تھا' تاہم اندرون ملک کئی طبقے امریکی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ فعال سفارت کاری اختیار کی جائے۔ چنانچہ میکنلے اور خصوصاً" تھیوڈور روز ولٹ کے عہد حکومت میں اس پر عمل کیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں برطانیہ کے ساتھ وینزویلا کی سرحد کے معاملے میں جھگڑا ہوا جسے نظریہ مونرو کے تحت نمٹا دیا گیا۔ اس کے ٹھیک تین سال کے بعد کیوبا کے معاملے میں ہسپانیہ کے ساتھ نہایت ڈرامائی انداز میں جنگ ہوئی۔ واشنگٹن کا مطالبہ تھا کہ برطانیہ کے ساتھ ماضی میں آدھے آدھے پر حق ملکیت کا سمجھوتہ ہوا تھا' اس کے برعکس اب پوری خاکنائی نہر پر امریکہ کا تسلط ہونا چاہیے۔ وہ کینیڈا کی مخالفت کے باوجود الاسکا کی سرحد کا از سر نو تعین کرنا چاہتا تھا۔ پھر وینزویلا کے خلاف جرمنی کے اقدامات کے پیش نظر بحر کریبین میں ۱۹۰۲-۳ء کے دوران بحری بیڑے تیار کرنا چاہتا تھا۔ ان تمام باتوں سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ مغربی نصف کرے میں امریکی عزائم کو چیلنج کرنے والی کوئی بھی بڑی طاقت موجود نہ تھی۔ ان حقائق کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ امریکی انتظامیہ نے سفارتی ذرائع اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر لاطینی امریکہ کے ملکوں' نکارہ گوا' ہیٹی' میکسیکو اور جمہوریہ ڈومی نکن میں اس وقت مداخلت شروع کر دی جب انہوں نے امریکہ کے ساتھ بدتمیزی کرنا شروع کی۔

اس دور میں امریکہ کی خارجہ پالیسی کا اہم عنصر یہ رہا کہ اس نے مغربی نصف کرے کے باہر کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی جائے۔ چنانچہ ۱۸۸۴-۵ء میں برلن میں مغربی افریقہ کے متعلق جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی' اس میں امریکہ کی حاضری خلاف معمول بھی تھی اور پریشان کن بھی!۔ وہاں' امریکی وفد نے آزاد تجارت اور وسیع مسلک اختیار کرنے پر دھواں دھار تقریریں کیں۔ چنانچہ اس کے بعد زیر بحث معاہدے کی کبھی توثیق نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ ۱۸۹۲ء میں امریکہ کا مشہور اخبار "دی نیویارک ہیرالڈ" اسٹیٹ

ڈیپارٹمنٹ کو یکسر ختم کر دینے کا مشورہ دے رہا تھا کیونکہ سمندر پار ملکوں میں اس کے پاس کام بہت تھوڑا تھا۔ لیکن جب ۱۸۹۸ء میں ہسپانیہ کے ساتھ جنگ کا آغاز ہوا تو سب کچھ بدل گیا۔ مغربی بحرالکاہل (فلپائن) میں امریکہ کی پوزیشن مضبوط ہو گئی اور وہ بھی ایشیا کی نو آبادیاتی طاقت بن گیا۔ بایں ہمہ ان سیاست دانوں کی بھی چاندی ہو گئی جو سخت قسم کی پالیسی اختیار کرنے پر زور دے رہے تھے اسی سال سیکرٹری آف اسٹیٹ ہے نے وسیع مسلک کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ اس امر کی اولین علامت تھی کہ اب امریکہ چین میں بھی کوئی نہ کوئی اقدام اٹھائے گا۔ چنانچہ بین الاقوامی فوج کے ساتھ کمٹ منٹ کے نتیجے میں ۱۹۰۰ء میں ۲۵۰۰ امریکی سپاہی چین میں بھیجے گئے تاکہ وہاں امن و امان قائم کریں۔ تاہم روز ولٹ نے تو اس سے کہیں زیادہ بڑی سطح پر سیاسی اقدامات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ روس اور جاپان کی جنگ ختم کرانے میں اس نے ثالث کا کردار ادا کیا۔ جب ۱۹۰۶ء میں مراکش کے معاملے میں کانفرنس منعقد ہوئی تو اس نے امریکیوں کو اس میں شرکت پر آمادہ کیا۔ اس نے جاپان اور دیگر طاقتوں سے چین کے معاملے میں وسیع مسلک اختیار کرنے کی بات بھی کی۔ بعد کے دانشوروں نے ان باتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی کیونکہ ان کے خیال میں عالمی امور میں دلچسپی لی جا رہی تھی' لیکن امریکہ کی خارجہ پالیسی ناپختگی کا شکار تھی۔ ان مبصروں کا کہنا تھا کہ اس پالیسی کا مقصد اندرون اور بیرون ملک سامعین سے بس واہ واہ کا ڈونگرا حاصل کرنا تھا۔ غرض اس طریقہ کار نے مستقبل میں امریکہ کی خارجہ پالیسی کو خاصا گھمبیر بنا کر رکھ دیا۔ اگر یہ حقائق صحیح ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ بادشاہت کے طمطراق اور قومی فخر و امتیاز کے اس دور میں امریکہ تنہا اپنے مسلک پر ڈٹا ہوا تھا۔ روز ولٹ کے جانشینوں نے سوائے چین کے معاملات میں دلچسپی لینے کے بحیثیت مجموعی اس ملک میں اپنی سفارت کاری کو برقرار نہیں رکھا۔ بلکہ انہوں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایسے تمام امور سے الگ تھلگ رکھنا پسند کیا جو مغربی نصف کرے سے باہر کے ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔

ان سفارتی اقدامات کے ساتھ ساتھ اس کے دفاعی اخراجات میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ بری فوج کی بجائے بحری فوج کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیرونی حملے کی صورت میں یا نظریہ مونرو کی مخالفت کے وقت ملک کا دفاع اسی سے ممکن تھا۔ علاوہ ازیں' لاطینی امریکہ' بحرالکاہل اور کسی جگہ بھی امریکی سفارت اور معیشت کو مستحکم کرنے کا یہ موثر ذریعہ تھا۔ اگرچہ ۱۸۸۰ء کے آخری عشرے میں بحری بیڑے کی تیاری کا کام شروع ہو چکا تھا' لیکن اس میں شدت ہسپانیہ اور امریکہ کی جنگ کے موقع پر پیدا ہوئی۔ مذکورہ لڑائی میں امریکی بحریہ کی فتح نے ایڈمیرل ماہان اور بحری فوج کی حمایت کرنے والی لابی کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ بحری فوج کو تقویت دی جائے۔ پھر حربی حکمت عملی کے ماہرین برطانیہ اور جرمنی کے ساتھ ہونے والی جنگ سے تشویش میں مبتلا تھے۔ چنانچہ جنگی بیڑے کو بتدریج ترقی دی جانے لگی۔ بعد ازاں ہوائی' ساموآ' فلپائن اور بحر کریبین میں بحری اڈے حاصل کیے گئے۔ لاطینی امریکہ میں بحریہ کے جہاز "پولیس مین" کا کردار انجام دینے لگے۔ پھر ۱۹۰۷ء میں روزولٹ نے اپنا سفید بحری بیڑا خیر سگالی کے طور پر تمام دنیا کے سفر پر روانہ کیا۔ جس سے دنیا پر امریکہ کی بحری طاقت کا اظہار ہوتا رہا۔

اس بحری طاقت کی اہمیت کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۹۰ء میں بحری فوج پر ۲۲ ملین ڈالر خرچ کیے گئے جو

مجموعی سرکاری خرچ کا ۶٫۹ فی صد حصہ تھا۔ لیکن اس میں اضافہ ہوتا گیا تاآنکہ ۱۹۱۴ء میں ۱۳۹ ملین ڈالر خرچ کیے گئے جو مجموعی ملکی اخراجات کا ۱۹ فی صد تھا۔ مگر یہ ساری رقم صحیح طریقے سے خرچ نہیں کی گئی۔ اندرون ملک بے شمار بحری اڈے تھے اور پھر مقامی سیاست دانوں کا دباؤ بھی رہتا تھا۔ تاہم بحریہ کی مجموعی کارکردگی بہتر تھی۔ اگرچہ امریکی بحریہ برطانیہ اور جرمنی کی بحریہ سے "ستا" چھوٹی تھی' پھر بھی ۱۹۱۴ء میں اسے پوری دنیا میں تیسرا مقام حاصل تھا۔ حتیٰ کہ امریکہ کے کنٹرول میں تعمیر ہونے والی نہر پانامہ بھی امریکی منصوبہ سازوں کی منقسم ہوتی ہوئی بحری قوت یا سمندری خطرات کے دھڑکے سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ اس زمانے کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض افسران بیرونی طاقتوں سے مشکوک تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نئی صدی کے آغاز میں برطانیہ کے ساتھ مفاہمت ہو جانے کے بعد امریکہ محفوظ ہو گیا۔ اور اگر اسے جرمنی کی بحری طاقت کا خوف تھا تو یہ دوسری اہم طاقتوں کے مقابلے میں قدرے کم تھا۔

امریکہ کی بری فوج خاصی مختصر اور حفاظتی ضرورت کے مطابق تھی لیکن اسپین کے ساتھ جنگ ہونے کی وجہ سے اس میں بھی توسیع کی گئی اور اس حد تک توسیع کی گئی کہ عوام کو یہ کہنا پڑا کہ "یہ پہلے ہی کتنی چھوٹی تھی۔ نیشنل گارڈ کس قدر غیر منظم ہوا کرتا تھا۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ کو کیوبا کی جنگ میں اسی مختصر فوج کی وجہ سے ہی ابتدا میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔" اگرچہ ۱۹۰۰ء کے بعد امریکی فوج میں تین گنا اضافہ ہو گیا تھا اور فلپائن اور دیگر جگہوں میں مزید قلعہ بندیاں بھی ہوئی تھیں' اس کے باوجود یہ یورپ کے درمیانے درجے کے ملک سربیا یا بلغاریہ کے مقابلے میں اتنی موثر نہ تھی۔ امریکہ میں برطانیہ سے کہیں زیادہ فوجیوں کے جم غفیر کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اتحادیوں کے ساتھ کوئی فوجی معاملہ کرنے سے پہلو تہی کی جاتی تھی۔ امریکہ کی مجموعی قومی آمدنی کا ایک فی صد سے بھی کم حصہ دفاع پر خرچ ہوتا تھا۔ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۳ء تک کے دوران شاہی قسم کے اقدامات کے باوجود یہ ملک بقول ماہر عمرانیات ہربرٹ اسپنسر روس کی طرح ایک فوجی معاشرہ نہ تھا۔ پانامہ نہر جو امریکہ کی نگرانی میں تیار ہوئی' اس کے امریکی منصوبہ سازوں نے بحریہ کے جملہ رازوں کو مخفی رکھا۔ بلکہ ایک صنعتی معاشرہ تھا۔ بہت سے مورخوں کا خیال ہے کہ کئی طاقتوں کو اسی زمانے میں عروج حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر روس اور امریکہ کی جو پوزیشن تھی اس کا جائزہ لیا جائے تو اس میں خاصا فرق نظر آئے گا۔ اول الذکر کے پاس ثانی الذکر کے مقابلے میں دس گنا زیادہ اعلیٰ درجے کی فوج تھی۔ لیکن اس صورتحال کے برعکس امریکہ میں روس کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ فولاد پایا جاتا تھا' دس گنا زیادہ توانائی استعمال کی جاتی تھی اور صنعتی مصنوعات زیادہ تھیں۔ فی کس آمدنی میں امریکہ چھ گنا زیادہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ روسی فوج دیگر یورپی ممالک کی فوج کے مقابلے میں زیادہ طاقتور تھی۔ لیکن دیگر زاویے سے دیکھا جائے تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ مضبوط تھا اور روس کمزور!

یقیناً" امریکہ ایک عظیم طاقت بن چکا تھا' لیکن وہ عظیم طاقتوں کے نظام کا حصہ نہیں تھا۔ اگرچہ صدر اور کانگریس کے درمیان اقتدار کی تقسیم نے اتحاد کی پالیسی کو خاصا مشکل بنا دیا تھا' تاہم لوگ پرسکون علیحدگی کو خیرباد کہنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ امریکہ اور دیگر طاقتور ممالک کے درمیان لاکھوں میل کا

سمندری فاصلہ خاصی تھا اس کے پاس فوج نہایت قلیل تھی۔ نصف کرے پر بالادستی حاصل کر کے یہ ملک مطمئن تھا۔ روز ویلٹ کے بعد یہ عالمی سطح کی سفارت کاری کا چنداں شائق نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود امریکہ ۱۹۱۳ء میں عظیم طاقت کے سسٹم کے قریب تر پہنچ چکا تھا۔ ۱۹۰۶ء کے بعد زیادہ تر ممالک کی توجہ ایشیاء اور افریقہ کے برعکس بلکان اور بحر شمالی کی جانب مبذول ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ان سبھوں نے عالمی طاقت کے توازن میں امریکہ کو کوئی اہمیت نہیں دی' حالانکہ آنے والی صدی میں معاملہ کچھ اور دکھائی دے رہا تھا۔ بہرحال ۱۹۱۳ء سے قبل کے عرصے میں امریکہ کے متعلق یہی تصورات تھے یہ اور بات ہے کہ جنگ عظیم نے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا۔

اتحاد اور جنگ کے رجحانات

۱۸۹۰ء — ۱۹۱۴ء

مذکورہ دہائیوں میں عظیم طاقت کا نظام جس طرح تبدیل ہو رہا تھا' اس کو سمجھنے کی تیسری اور حتمی صورت یہ ہے کہ بسمارک کی موت کے بعد سے لے کر پہلی جنگ عظیم شروع ہونے تک اتحاد کی ڈپلومیسی کا جائزہ لیا جائے۔ ۱۸۹۰ء کے عشرے میں چھوٹے پیمانے پر جنگیں برپا ہوئیں' مثلاً "چین اور جاپان کی جنگ' ہسپانیہ اور امریکہ کے درمیان محاذ آرائی اور جنگ بوئر! پھر روس اور جاپان کے درمیان مقامی سطح کی ایک بڑی جنگ لڑی گئی۔ اس کے بعد جو صورتحال سامنے آئی' اس کے متعلق فلیکس گلبرٹ نے کہا تھا کہ "اتحادیوں کے بلاک کو مستحکم کیا جا رہا تھا" اس کے ساتھ ہی ساتھ کی حکومتیں یہ توقع بھی کر رہی تھیں کہ آئندہ جب کبھی جنگ عظیم برپا ہو گی تو وہ اتحادی جماعت کی رکن ہو گی۔ چونکہ اتحاد سے نقصان بھی پہنچا اور فوائد بھی حاصل ہوئے' لہٰذا کسی بھی متعلقہ طاقت کا صحیح تجزیہ کرنے میں مشکلات درپیش ہوں گی۔

اس وقت اتحاد قائم کرنے کا جو رجحان کارفرما تھا اس سے دور دراز واقع ریاست ہائے متحدہ امریکہ متاثر نہیں ہوئی تھی اور جاپان علاقائی سطح پر اس رجحان سے متاثر ہوا اور وہ بھی ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۵ء میں جب انگلستان اور اس کے درمیان اتحاد قائم ہوا تھا۔ البتہ اس رجحان نے یورپ کی تمام بڑی طاقتوں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ حتیٰ کہ جزیرے والا برطانیہ بھی اس کے زیر اثر آیا۔ ایسے اتحاد کی تمام تر وجہ اس زمانے کا مروجہ خوف اور دشمنی تھی! زمانہ امن میں پہلی مرتبہ فوجی اتحاد کا ڈول بسمارک نے ۱۸۷۹ء میں ڈالا تھا۔ چونکہ وہ ویانا کی خارجہ پالیسی پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتا تھا اور سینٹ پیٹر برگ کو دھمکی دینا چاہتا تھا' لہٰذا اس نے آسٹریا کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا۔ جرمنی کے چانسلر کے درپردہ منصوبے کے تحت اس اتحاد کا یہ بھی مقصد تھا کہ روس کو ذرا دھمکا کر اس کی جارحانہ پالیسی سے باز رکھا جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ "ثلاثہ شہنشاہیت کی لیگ" میں واپس آ جائے چنانچہ کچھ مدت کے لئے روس نے اس منصوبے پر عمل بھی کیا۔ بسمارک کا طویل المیعاد منصوبہ یہ تھا کہ اگر آسٹریا۔ ہنگری پر روس نے حملہ کیا تو جرمنی اول الذکر کی مدد کو پہنچ جائے گا۔ ۱۸۸۲ء میں برلن نے روم کے ساتھ اسی نوعیت کا معاہدہ کیا تھا کہ فرانس کے حملے کی صورت میں آخرالذکر اس کی مدد کرے۔ پھر دوسرے ہی سال جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری میں ایک اور اتحاد

ہوا جس کا مقصد روسی حملے کے وقت رومانیہ کی مدد کرنا تھا۔ اس نوع کی سفارت کاری پر عبور رکھنے والے دانشوروں کا خیال ہے کہ بسمارک کے پیش نظر ہمیشہ قلیل المیعاد اور دفاعی طرز کے مقاصد ہوا کرتے تھے۔ ان کا مقصد تمام تر یہی تھا کہ ویانا' روم اور بخارسٹ جیسے دوست ممالک کو پریشانی کے عالم میں سکون فراہم کیا جائے' فرانس کو سفارتی سطح پر تنہا کر دیا جائے اور بلکان پر روسی حملے کے وقت منہ توڑ جواب دیا جائے۔ ان باتوں کی سچائی میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بسمارک نے ایسا کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ پھر اس خفیہ معاہدے کے منظر عام پر نہ آنے کی وجہ سے فرانس اور روس دونوں کو اپنے تنہا رہ جانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ نیز انہیں اس بات کا اندیشہ بھی ہوا کہ برلن نے ایک مستحکم اتحاد قائم کر لیا ہے تاکہ دوران جنگ وہ ان پر مسلط ہو جائے۔

اگرچہ بسمارک نے سینٹ پیٹر برگ کو ایک "خفیہ پیغام" روانہ کیا تھا (یعنی ۱۸۸۷ء کا تجدیدی معاہدہ) تاکہ جرمنی اور روس کے مابین تعلقات ٹوٹنے نہ پائیں۔ لیکن چانسلر کا یہ رویہ محض مصنوعی تھا۔ اس کا مقصد فقط اتنا تھا کہ ۱۸۸۰ء کے آخری عشرے میں فرانس اور روس کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے رجحان کو غت ربود کیا جا سکے۔ فرانس نے الاسکا۔ لورین پر قبضہ جمانا چاہا تھا اور روس مشرقی یورپ میں توسیع کے عزائم رکھتا تھا۔ لیکن جرمنی کی مداخلت کے خوف سے یہ خواہشات پوری نہ ہو سکیں۔ براعظم فرانس اور جرمنی کا کوئی اور قابل ذکر اتحادی نہ تھا۔ پھر یہاں فرانس کے قرضوں اور اسلحے سے روس فیض یاب ہو رہا تھا' وہاں فرانس کو بھی روس کی فوجی امداد حاصل ہو رہی تھی اگرچہ بورژوائی نظریے کے حامل فرانس اور تشدد پسند حکومت زار کے درمیان وقتی طور پر تعلقات میں کمی آ گئی تھی' لیکن ۱۸۹۰ء میں بسمارک کے فارغ الخدمتی ہو جانے اور ولیم دوئم کی حکومت کے تشویش ناک اقدامات کے بعد تعلق پھر سے بحال ہو گیا۔ ۱۸۹۴ء میں جرمنی' آسٹریا۔ ہنگری اور اٹلی کے درمیان جو "اتحاد ثلاثہ" قائم ہوا تھا' اس کا توڑ فرانس اور آسٹریا کے باہمی معاہدے کی صورت میں سامنے آیا۔ مذکورہ دونوں معاہدے سیاسی اور فوجی نوعیت کے تھے اور کافی عرصے تک برقرار رہے۔

یہ صورت حال نہ صرف برقرار رہی بلکہ یورپ کے معاملات مستحکم نظر آنے لگے۔ دونوں اتحادی بلاکوں میں ایک قسم کا توازن قائم تھا۔ چنانچہ عظیم طاقتوں کے مابین جھگڑے کے امکانات معدوم دکھائی دے رہے تھے۔ فرانس اور روس علیحدگی کے خول سے نکل کر افریقہ اور ایشیا کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔ السا کا اور بلغاریہ میں بحران کم ہو جانے کی وجہ سے مذکورہ دونوں ملکوں کے اقدامات کو تقویت پہنچی۔ ۱۸۹۷ء میں ویانا اور سینٹ پیٹر برگ اس بات پر راضی ہو گئے کہ بلکان کے معاملے کو سرد خانے میں ڈال دیا جائے۔ علاوہ ازیں جرمنی بھی عالمی سیاست میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ادھر اطالیہ اپنے مزاج کے مطابق ابی سینیا کو سرگرم عمل تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۹۰ء کے درمیانی عشرے میں ہی جنوبی افریقہ' مشرق بعید' وادی نیل اور پروشیا لوگوں کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔ یہ بحری فوج میں جدت طرازی کا زمانہ بھی تھا۔ جملہ طاقتیں اس خیال کے تحت اپنے بحری بیڑوں کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھیں کہ جہاز رانی کی بدولت ہی نو آبادیات کی تسخیر ممکن ہے۔ یہی وہ عشرہ تھا جب برطانیہ جو یورپ کے معاملات سے ہمیشہ دور رہا کرتا تھا' اپنے

پرانے دشمن ممالک فرانس اور روس' نیز ابھرتی ہوئی نئی طاقتوں' یعنی جرمنی' جاپان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جانب سے خاصا دباؤ محسوس کرنے لگا۔ ان حالات میں یورپی ملکوں کے اتحاد نے فوج سے متعلق شق کی اہمیت بے معنی سی ہو کر رہ گئی۔ اب جنگ چھڑنے کی وہ پہلی جیسی صورت نہیں رہی تھی' جب فشودہ کے مقام پر انگلستان اور فرانس کے درمیان محاذ آرائی ہوئی تھی (۱۸۹۸ء) جنگ بوئیر برپا ہوئی تھی اور چین میں مراعات حاصل کرنے کے سلسلے میں جھگڑا ہوا تھا۔

سلطنتوں کی آپس کی دشمنیاں بڑی طاقتوں کے باہمی تعلقات پر اور خصوصاً" یورپی ممالک کے ماحول پر خاصا اثر انداز ہوئیں۔ مذکورہ صدی کے اختتام پر سلطنت برطانیہ اتنے شدید دباؤ سے دوچار تھی کہ نو آبادیات کے سیکرٹری جوزف چیمبرلینڈ کے حلقہ بگوشوں نے "تنہا پسندی" کے رویے کو ختم کر کے برلن کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے کا مشورہ دیا۔ بیلفور اور لینڈس ڈون جیسے وزراء بھی سفارتی سطح پر سمجھوتے کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ چنانچہ انگلستان اور امریکہ کے مابین تعلقات نئے سرے سے قائم ہوئے اور ان کے نتیجے میں معاہدہ عمل میں آیا۔ اس کے تحت نہر کا قضیہ' الاسکا کی سرحدوں کا جھگڑا' مچھلیوں کے شکار کا معاملہ حل ہوا اور امریکہ کو رعایت دینی پڑی۔ ان اسباب کی بناء پر مغربی نصف کرے میں برطانیہ کی پہلے جیسی کمزور پوزیشن نہیں رہی۔ پھر سب سے اہم بات یہ کہ انیسویں صدی کے سیاست دانوں نے جو کچھ طے کر لیا تھا اب اس کے برعکس ہو گیا۔ یعنی انگلستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات سردمہری کا شکار ہوں گے اور کبھی کبھی ان میں جارحیت کا عنصر غالب ہو گا۔ ۱۹۰۲ء میں انگلستان اور جاپان کے درمیان اتحاد قائم کرتے وقت برطانوی سیاست دانوں نے یہ بھی توقع کی تھی کہ اس طرح چین پر فوجی نوعیت کے دباؤ کو ہلکا کیا جا سکے گا۔ پھر ۱۹۰۳ء میں برطانیہ کا ایسا موثر طبقہ موجود تھا جو نو آبادیات کے مسئلے پر فرانس سے سمجھوتہ کر لینے کا روا دار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فشودہ کے قضیے کے موقع پر فرانس نے نیل کے معاملے میں جنگ نہ کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔

اگرچہ مذکورہ بالا ساری کاروائیوں کا تعلق غیر یورپی معاملات سے تھا' لیکن یورپ کی بڑی طاقتوں پر بھی اس کے بالواسطہ اثرات مرتب ہوئے۔ مغربی نصف کرے میں برطانیہ جس گوگو کی کیفیت میں مبتلا تھا' اس سے چھٹکارا ملنے اور مشرق بعید میں جاپانی بحری بیڑے کا تعاون حاصل ہو جانے کے بعد اس کی "شاہی بحریہ" پر دباؤ میں خاصی کمی آ گئی تھی اور پھر جنگ کی صورت میں وہ کارکردگی دکھانے کے لائق ہو گئی۔ پھر فرانس اور انگلستان کے درمیان قائم شدہ دشمنی کے خاتمے سے برطانیہ کی بحریہ کو مزید تحفظ حاصل ہو گیا۔ ان تمام عوامل کے اثرات اٹلی پر بھی پڑے۔ اس کے ساحلی علاقے پہلے ہی دفاعی لحاظ سے کمزور تھے' چنانچہ انگلستان اور فرانس کے اتحاد کے بالمقابل اس کی اپنی کوئی حیثیت نہ تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایسے شواہد موجود تھے (مثلاً" مالیاتی اور شمالی افریقہ) جن کی وجہ سے فرانس اور اٹلی میں بہتر تعلقات قائم ہوئے۔ بہرحال' اٹلی آہستہ آہستہ اتحاد ثلاثہ سے منحرف ہو رہا تھا اس نے آسٹریا - ہنگری کے ساتھ اس کے جھگڑے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آخری بات یہ کہ دور دراز واقع جاپان کے ساتھ انگلستان کا اتحاد یورپ کے ریاستی نظام پر بھی اثر انداز ہوا یعنی یہ بات طے ہو گئی کہ یورپ کی کوئی بھی

تیسری طاقت جاپان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جاپان نے کوریا اور منچوریا کے مسئلے پر روس کو دھمکی دے دی تو کوئی بھی تیسری طاقت چیں بہ جبیں نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں' جب جنگ کا آغاز ہو گیا تو انگلستان و جاپان کے معاہدے اور فرانس و روس کے اتحاد کی مخصوص شرائط اپنے اپنے حلیفوں' برطانیہ اور فرانس کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ جنگ میں شریک ہونے سے پہلو تہی برتیں۔ لہٰذا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے کہ جب مشرق بعید میں محاذ آرائی شروع ہوئی تو برطانیہ اور فرانس دونوں نے اپنے اپنے نو آبادیاتی جھگڑے کو ختم کر دیا اور اپریل ۱۹۰۴ء میں دوستی قائم کر لی۔ ان دونوں ممالک کے مابین وہ مناقشت جو ۱۸۸۲ء میں مصر پر برطانیہ کے قبضے کے بعد سے چلی آ رہی تھی اب ختم ہو چکی تھی۔

۵-۱۹۰۴ء کے "سفارتی انقلاب" کے پس پردہ دو اور باتیں کار فرما تھیں۔ پہلی یہ کہ برطانیہ اور فرانس دونوں جرمنی کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ اس کے مقاصد واضح نہیں تھے' لیکن وہاں کے وزیراعظم بیولو اور شہنشاہ ولیم دوم "جرمنی کی صدی" کے آغاز کا اعلان کر رہے تھے۔ ۱۹۰۳-۱۹۰۴ء میں کھلے سمندروں پر چلنے والا عظیم بحری بیڑا اس غرض کو ذہن میں رکھ کر تیار کیا گیا تھا کہ اس سے برطانیہ کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ برطانیہ کا امیرالبحر اس کا توڑ پیدا کرنے کی فکر میں تھا۔ علاوہ ازیں' جہاں آسٹریا - ہنگری کے معاملے میں جرمنی کی دلچسپی کو پیرس ناپسند کرتا تھا وہاں' میسوپوٹامیہ میں اس کی دخل اندازی برطانوی سلطنت کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ فرانس اور برطانیہ دونوں بیولو کی اس سفارتی سطح کی کوشش سے سخت غصے میں تھے کہ ۱۹۰۴ء میں مشرق بعید میں جنگ کے شعلے کو ہوا دے کر دونوں کو اس میں گھسیٹ لیا جائے۔ اس میں تمام تر فائدہ صرف برلن کا تھا۔

جنگ کے دوران بری اور بحری لحاظ سے جاپان کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی' اس کے نتیجے میں یورپ کے توازن اور باہمی تعلقات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بایں ہمہ' ۱۹۰۵ء کے دوران روس میں بے چینی کی لہر سی پھیلی رہی۔ چونکہ آنے والے برسوں میں روس غیر متوقع طور پر ایک دوسرے درجے کی طاقت بن کر رہ گیا' لہٰذا اس کے سبب فوجی توازن برلن کی جانب مرکوز ہو گیا۔ چنانچہ فرانس کا مستقبل ۱۸۷۰ء سے کہیں زیادہ مخدوش ہو گیا۔ اگر جرمنی مغربی سمت حملہ کرنا چاہتا تو ۱۹۰۵ء کا موسم گرما اس کام کے لیے بہت مناسب تھا لیکن قیصر اندرون ملک سماجی بحران میں الجھا ہوا تھا۔ وہ روس کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی فکر میں بھی لگا ہوا تھا۔ پھر اسے برطانیہ کی جانب سے بھی خطرے کا گمان تھا جو اپنے جنگی جہاز چین سے واپس لا کر اپنے ساحل پر لنگر انداز کر رہا تھا۔ پھر اسے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ اگر جرمنی نے فرانس پر حملہ کر دیا تو وہ امداد کے لیے واویلا مچائے گا۔ ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ برلن نے جنگ کرنے کی بجائے سفارتی سطح پر فتح حاصل کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ اپنے خاص دشمن اور فرانسیسی وزیر خارجہ ڈلکاسے کو مجبور کیا کہ ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جائے۔ مدعا یہ تھا کہ مراکش کے متعلق فرانس کا عندیہ معلوم کیا جائے۔ لیکن معاملہ کچھ الٹا ہو گیا۔ کانفرنس کے زیادہ تر شرکاء نے مراکش میں فرانس کی خصوصی پوزیشن کی حمایت کی تھی۔ اس طرز عمل سے جرمنی کی سفارت کاری کو دھچکا لگا اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ بسمارک کے بعد جرمنی کی سفارتی ساکھ کس قدر کمزور ہو چکی تھی' حالاں کہ

اس ملک کی صنعتی، بحری اور بری طاقت خاصی افزوں بھی ہو چکی تھی۔

مراکش کے بحران کی وجہ سے بین الاقوامی سطح کی دشمنیاں افریقہ سے نکل کر براعظم یورپ تک پھیل گئیں۔ تین مزید اہم باتوں کی وجہ سے اس رجحان کو مزید تقویت پہنچی۔ پہلی یہ کہ ۱۹۰۷ء میں پروشیا، تبت اور افغانستان کے حوالے سے انگلستان اور روس میں دوستی ہو گئی۔ اگرچہ یہ معاملہ علاقائی نوعیت کا تھا، لیکن اس کی بدولت ایشیا میں لندن اور پیٹر سبرگ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کے خاتمہ ہو گیا۔ پھر برطانیہ کے لیے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط رکھنی خاصی آسان ہو گئی۔ لیکن اس صورت حال سے جرمن گھبرا گئے اور وہ خود کو یورپ میں "محصور" تصور کرنے لگے۔ ادھر برطانیہ میں ایسے بہت سے افراد تھے خصوصاً" لبرل پارٹی کی حکومت میں، جو جرمنی کے خلاف ہونے والے کسی بھی اتحاد کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان کا ایک دوسرے واقعہ سے کمزور پڑ گیا ——— یعنی ۹۔۱۹۰۸ء میں انگلستان اور جرمنی میں بحری طاقت کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ ادھر جرمنی میں جنگی جہاز بنانے کے پروگرام میں تیزی آ گئی۔ اس کی وجہ سے اہل برطانیہ کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ بحر شمالی میں بھی ان کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔ اگلے تین سال تک برطانوی حکومت اس بات کی کوشش کرتی رہی کہ یہ مقابلہ بازی ختم ہو۔ اس کے جواب میں جرمنی نے یہ شرط عائد کر دی کہ یورپ کی جنگ میں برطانیہ کو غیر جانب دار رہنا ہو گا۔ لیکن اہل برطانیہ مشکوک ہو کر اس پابندی سے منحرف ہو گئے۔ وہ اور اہل فرانس ۹۔۱۹۰۸ء میں بلکان کے بحرانی واقعات کا نہایت فکر مندی سے جائزہ لے رہے تھے۔ اس موقع پر روس اس بات پر خاصا برہم تھا کہ بوسینا۔ ہرزیگووینا کے صوبے آسٹریا۔ ہنگری میں ضم کر دیے گئے ہیں۔ اس پر جرمنی نے یہ مطالبہ کر دیا کہ آیا روس اس حتمی فیصلے کو تسلیم کرے یا نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ چونکہ جاپان کے ساتھ ہونے والی حالیہ جنگ میں روس کو نقصان اٹھانا پڑا تھا، لہٰذا اس نے یہ بات مان لی۔ سفارتی سطح پر زک پہنچانے کے اس رویے سے روس میں رد عمل کی صورت پیدا ہوئی جو تمام تر حب الوطنی سے عبارت تھی۔ چنانچہ دفاعی اخراجات میں اضافہ کیا گیا اور یہ فیصلہ بھی ہوا کہ اتحادی ملک کے ساتھ وابستگی قائم رکھنی چاہیے۔

۱۹۰۹ء کے بعد، یوں تو دو ملکوں کے درمیان گاہے بہ گاہے دوستی کا پیمان بندھتا رہا، لیکن اب اسے مستحکم کرنے کا رجحان تیزی سے فروغ پانے لگا۔ ۱۹۱۱ء میں مراکش کے معاملے پر پھر قضیہ پیدا ہوا۔ تب برطانیہ نے فرانس کا پوری طرح ساتھ دیا اور جرمنی کی بری طرح مخالفت کی۔ مذکورہ قضیے کے نتیجے میں فرانس اور جرمنی میں حب الوطنی کے جذبے کو فروغ حاصل ہوا اور فرج میں اچھی خاصی توسیع عمل میں آئی۔ ادھر برطانیہ میں حکومت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یورپ کی جنگ میں شرکت کرنے کے پیش نظر بری اور بحری فوج کو مستحکم کیا جائے۔ ایک سال بعد، برطانیہ کا وزیر لارڈ ہیلڈن سفارتی مشن پر برلن روانہ ہوا لیکن یہ ملاقات ناکام رہی۔ ادھر جرمنی نے اپنے بحری بیڑوں میں خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ چنانچہ لندن نے نومبر ۱۹۱۲ء میں فرانس کے ساتھ بحری مفاد کے پیش نظر ایک سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن اس وقت تک اطالیہ کی فوجوں نے ترکی پر حملہ کر دیا تھا۔ اس اقدام کو بلکان لیگ سے وابستہ ریاستوں نے محرک کیا تھا۔ اس حملے کے نتیجے میں عثمانیہ سلطنت کو یورپ سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اراکین لیگ مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔

اس طرح قدیم دور کا "مشرقی معاملہ" ایک بار پھر عود کر آیا جو نہایت ہی گھمبیر ثابت ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ریاست ہائے بلکان سے فیضیاب ہونے کے جذبے نے جو محاذ آرائی کی صورت اختیار کر لی تھی، اس پر بڑی طاقتوں کا کنٹرول ہونا مشکل تھا۔ دوسری یہ کہ بعض ایسے نئے حالات رونما ہوئے تھے جو مذکورہ طاقتوں کے اہم مفادات کے یکسر منافی تھے، مثلاً" سربیا میں بیداری کی لہر دوڑ گئی جس سے ویانا ہوشیار ہو گیا تھا۔ پھر ترکی پر جرمن فوج کے بڑھتے ہوئے اثرات نے سینٹ پیٹر سبرگ کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ جب جون ۱۹۱۴ء میں آرک ڈیوک فرڈیننڈ کو قتل کر دیا گیا تو آسٹریا۔ ہنگری پہلے سربیا اور پھر روس کے خلاف سخت اقدامات کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ آرک ڈیوک کی موت محض ایک چنگاری تھی جس نے آگ بھڑکا دی۔

جون ۱۹۱۴ء میں ہونے والا یہ قتل تاریخ میں ایک ایسے واقع کے طور پر خاصا معروف ہے جس نے پہلے تو عمومی نوعیت کا ایک بحران پیدا کیا پھر عالمی جنگ کو ہوا دی۔ آسٹریا۔ ہنگری نے پہلے تو سربیا سے تاوان طلب کیا۔ اس نے مصالحت آمیز جواب دیا جسے رد کر دیا گیا۔ اور بلغراد پر دھاوا بول دیا گیا۔ اس پر روس اپنے اتحادی ملک کی مدد کے لئے آگے بڑھ آیا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر پروشیا کے جنرل اسٹاف نے شیلفن پلان پر فوری طور پر عملدر آمد کا فیصلہ کیا یعنی بلجیئم کے راستے مغربی سمت میں واقع فرانس پر حملہ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ برطانیہ جنگ میں کود پڑے گا۔

مذکورہ قضیے میں ہر بڑی طاقت اپنے قومی مفاد کے پیش نظر الجھ پڑی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جنگ میں کود جانے کا فیصلہ پہلے سے موجود آپریشن پلان کے تحت ہوا تھا۔ ۱۹۰۹ء کے بعد کے عرصے میں جرمنی نے آسٹریا۔ ہنگری کے ساتھ نہ صرف سفارتی تعلقات بحال کیے بلکہ فوجی تعاون بھی پیش کیا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا جس کے بارے میں بسمارک نے سوچا بھی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں، جرمنی کے آپریشن پلان کے تحت بلجیم کے راستے فرانس پر فوری اور شدید حملہ کرنا تھا، قطع نظر اس سے کہ جنگ کے اسباب کیا تھے۔ ویانا کے فوجی منصوبہ سازوں نے مختلف محاذوں پر محاذ آرائی جاری رکھنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا لیکن سربیا پر خصوصیت کے ساتھ شدید حملہ ان کی اولین ترجیح تھی۔ فرانس کی مالی امداد کے بل بوتے پر روس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جنگ شروع ہوتے ہی وہ نہایت تیزی سے پیش قدمی اختیار کرے گا اور مغربی سمت سے حملہ آور ہوگا۔ فرانس نے ۱۹۱۱ء میں اپنا مشہور منصوبہ نمبر ۱۷ وضع کیا تھا۔ جس کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ السا ک۔ لورین کے علاقے میں دندناتے ہوئے گھس جایا جائے۔ اب یہ توقع نہیں رہی تھی کہ اٹلی اتحاد ثلاثہ کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لے گا۔ چنانچہ بلجیم اور فرانس پر جرمنی کے حملہ آور ہونے کی صورت میں برطانوی فوج کا یورپ میں مداخلت کرنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہر ملک کے جنرل اسٹاف کا یہی خیال تھا کہ "تیز روی" ہی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ یعنی جیسے ہی جھڑپ شروع ہونے کا امکان ہو فوج کو سرحد کی طرف لازما" پیش قدمی شروع کر دینی چاہیے قبل اس کے کہ دشمن وہاں پہنچے۔ یہ بات برطانیہ کے لیے بالکل درست تھی۔ وہاں کی فوج نے مصمم عزم کر رکھا تھا کہ وہ مغرب کی سمت سے بھرپور حملہ کرے گی، پھر مشرق کی جانب پیش قدمی کر کے روس کی سست رفتار فوج

سے متصادم ہو گی' لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یہی صورت حال ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ ایک بڑی جنگ چھڑ جانے کی صورت میں سفارت کاروں کے پاس تو صلح صفائی کے لیے اتنا وقت نہیں ہوتا تھا' البتہ فوجی حکمت عملی وضع کرنے والے آگے بڑھ کر معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔

ان جنگی منصوبوں کا مقصد وہ نہ تھا جو صریحاً" نظر آتا ہے' یعنی اینٹوں کی ایک ایسی قطار کہ ایک بھی گر جائے تو ساری زمیں بوس ہو جائے۔ یہ بات بھی قابل اہمیت تھی کہ مشترکہ طور پر لڑی جانے والی جنگ ۱۸۵۹ء یا ۱۸۷۰ء جیسی نہیں رہی تھی۔ دوسرے اس امکان کو اہم عصروں نے ذرہ برابر بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ ایسی لڑائی طویل بھی ہو سکتی ہے۔ جب جولائی / اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو نہایت غلط اندازہ لگایا گیا کہ کرسمس تک یہ ختم ہو جائے گی۔ پھر یہ بات بھی ذہن نشیں نہیں رہی کہ گولے برساتی ہوئی توپوں اور فائر کرتی ہوئی بندوقوں کی یورش میں دو بدو جنگ نہیں ہوتی بلکہ فوج کی فوج کو خندقوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے جہاں سے وہ نکل نہیں سکتی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ توپوں کی بمباری اور پیدل فوج کے جارحانہ اقدامات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا' کیونکہ گولہ باری سے زمین دھواں دھار ہو جاتی ہے اور دشمن کو علم ہو جاتا ہے کہ کس جانب سے حملہ متوقع ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بحری فوج کے افسران نے بھی ہونے والی جنگ کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا۔ وہ محض فیصلہ کن انداز میں بحری جنگ لڑنے کی تیاری کرتے رہے۔ انھوں نے بحر شمالی اور بحیرہ روم کے جغرافیائی خدو خال کا پوری طرح ادراک نہیں کیا' نہ ہی انھیں یہ اندازہ تھا کہ جدید وضع کے سمندری ہتھیار' مثلاً" تارپیڈو اور سب میرین کی موجودگی میں بحری بیڑے کی قدیم کارکردگی بے حد مشکل ہو جائے گی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جدید ٹکنالوجی کے فروغ سے سمندری اور زمینی جنگ میں جلد کامیابی کی امید نہیں رہی تھی۔

یہ سارے حقائق اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن ان کا جائزہ اتحاد کے مروجہ نظام کے حوالے سے لیا جانا ضروری ہے۔ اگر روس کو آسٹریا۔ ہنگری پر تنہا حملہ کرنے کا موقع مل جاتا یا جرمنی فرانس پر اس طرح حملہ آور ہوتا کہ ساوی طاقتیں غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتیں تو اس صورت میں فتح (کچھ تاخیر ہی سے سہی) یقینی تھی۔ لیکن اس "اتحادی نظام" کے معنی یہ تھے کہ اگر ایک متحارب قوت جنگ میں بری طرح شکست کھا جائے یا اس کے وسائل ختم ہو جائیں تو اس صورت میں اس کے اتحادی اس کی ہمت بڑھاتے رہیں اور امداد بھی فراہم کرتے رہیں تاکہ وہ جنگ لڑتا چلا جائے۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھیے۔ اگر اتحادیوں کی بروقت مدد حاصل نہ ہوتی تو فرانس نیوئیل کے دندان شکن حملے اور ۱۹۱۷ء کی بغاوت کے بعد سنبھل نہیں سکتا تھا' اٹلی ۱۹۱۷ء میں کپوریٹو کے مقام پر شکست کھانے کے بعد تباہی کا شکار ہو جاتا اور آسٹریا۔ ہنگری کی سلطنت ۱۹۱۶ء کے تباہ کن نقصانات کے بعد قائم نہیں رہ سکتی تھی' نہ ہی گیلیسیا اور سربیا میں ۱۹۱۴ء کی ناکامی کے بعد اپنا وجود برقرار رکھ سکتی تھی۔ غرض اتحاد کے اس نظام نے اس بات کی ضمانت دے رکھی تھی کہ کسی جنگ کا فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں ہو جاتا۔ نیز' یہ حقیقت واضح بھی کر دی تھی کہ اٹھارھویں صدی کی مشترکہ طور پر لڑی جانے والی جنگوں کی طرح فتح اسی فریق کی حاصل ہو گی جس کے اتحادی کے پاس بری و بحری قوت اور مالی' صنعتی اور ٹکنیکی وسائل ہوں گے۔

مجموعی جنگ اور طاقت کا توازن

۱۹۱۴ ــــــ ۱۹۱۸ء

قبل اس کے کہ دو اتحادی حلیفوں کی فوجی اور صنعتی قوت اور شاندار فوجی حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی جنگ عظیم کا جائزہ لیا جائے' بہتر یہی ہو گا کہ ۱۹۱۴ء کے مروجہ بین الاقوامی نظام میں ہر بڑی طاقت کی حیثیت کا ذکر کر دیا جائے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک جانب کھڑا تھا۔ برطانیہ اور فرانس کے ساتھ اس کے کاروباری اور مالی تعلقات خاصے گہرے تھے۔ چنانچہ ولسن کی یہ درخواست کہ "امریکہ ذہنی اور عملی طور پر غیر جانب دار رہے" منظور ہونی مشکل تھی۔ جاپان نے نہایت آزادی سے انگلستان اور جاپان کے اتحاد کی شرائط کا اعلان کیا تاکہ اس کی رو سے چین اور وسطی بحرالکاہل میں جرمن کی مقبوضات کو اپنے قبضے میں لے لے لیکن نہ تو اس کا یہ اعلان اور نہ اس کے بحری بیڑے کا حفاظتی اقدام فیصلہ کن ثابت ہو سکا تھا۔ ویسے اتحادیوں کے لیے زیادہ بہتر یہ تھا کہ جاپان کو دوست بنا کر رکھا جائے نہ کہ خونخوار دشمن! اس کے برعکس اطالیہ نے ۱۹۱۴ء میں غیر جانب دار رہنا پسند کیا اور اپنی فوجی و اقتصادی کم مائیگی کے سبب اس پالیسی پر قائم رہنا اس کے لیے بہتر تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اس نے مرکزی طاقتوں کے خلاف جنگ میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے آسٹریا۔ ہنگری کو زک پہنچا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اتحادی ملکوں کے سفارت کاروں کی توقع کے مطابق اس سے برطانیہ' فرانس اور روس خاصے فائدے میں رہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ جب ترکی نے نومبر ۱۹۱۴ء میں جنگ میں جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو اس سے سب سے زیادہ فائدہ کس کو پہنچا۔ یہ صحیح ہے کہ اس فیصلے سے آبنائے ملاکا کی ناکہ بندی ہو گئی اور روسی غلے کی برآمدات اور اسلحے کی درآمدات رک گئی۔ پھر ۱۹۱۵ء میں تو یہ صورت ہو گئی کہ روس کی گندم کو کسی علاقے تک پہنچانا بھی مشکل ہو گیا۔ جبکہ مغربی ملکوں میں فاضل اسلحہ کا ذخیرہ بھی نہ تھا۔ ترکی کے مذکورہ فیصلے سے فرانس اور خصوصاً" برطانیہ کے لیے مشرق قریب تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ علاوہ ازیں' ہندوستانی حکومت اور وائٹ ہال والوں کی توجہ اب مغربی محاذ کی جانب نہیں رہی۔

یورپ کی پانچ بڑی طاقتوں کی مقبوضات خطرناک صورت حال سے دو چار تھیں۔ اس وقت آسٹریا۔ ہنگری کو جرمنی سے بالکل الگ ایک حیثیت دینا محض خام خیالی تھی۔ اگرچہ ویانا کے عزائم اکثر اوقات برلن سے مختلف ہوتے تھے' یہ لڑ بھی سکتا تھا اور صلح بھی کر سکتا تھا اور بظاہر بڑی طاقت کے طور پر آزادانہ زندہ بھی رہ سکتا تھا' لیکن ان سب باتوں کے لیے اس کے طاقتور حلیف کی رضامندی ضروری تھی۔ آسٹریا اور جرمنی کا اشتراک بے مثال تھا۔ اس کی صف اول کی فوجیں فرانس اور روس کے مقابلے میں اگرچہ کم تھیں' لیکن ان کی کارکردگی بہت بہتر تھی۔ پھر رنگروٹوں سے انھیں مدد بھی بروقت پہنچائی جاتی تھی' جیسا کہ جدول ۲۲ سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھیں صنعتی اور ٹیکنالوجی کی طاقت میں اتحاد ثلاثہ پر برتری حاصل تھی۔

فرانس اور روس کی پوزیشن بالکل معکوس تھی۔ دونوں میں نصف یورپ کا برابر کا فاصلہ تھا۔ فوجی حکمت عملی کے سلسلے میں دونوں کو ایک دوسرے سے رابطہ کرنا خاصا مشکل تھا۔ جنگ کی ابتداء میں

دونوں فوجی لحاظ سے بالا دست تھے۔ لیکن چالاک جرمنی نے صف اول میں اپنے تجربہ کار محفوظ دستے تعینات کر دیے، جس سے ان دونوں کی طاقت کم تر ہو گئی۔ پھر ۱۹۱۴ء کے موسم خزاں میں فرانس اور روس کے نا مناسب جارحانہ اقدامات سے انھیں اور بھی نقصان پہنچا۔ اگرچہ تیزی کا مظاہرہ کرنے والوں کو فتح اتنی آسانی سے ملنے والی نہ تھی، پھر بھی یہ بات یقینی تھی کہ کامیابی طاقتور کا ہی مقدر ہو گی۔ یہاں صنعتی معیار حوصلہ افزائی کا باعث نہ تھا۔ اگر فرانس اور روس وسطی طاقتوں کے خلاف ایک طویل اور مجموعی جنگ میں کود پڑتے تو یہ سوچنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر انھیں فتح کس طرح حاصل ہوتی۔

بہرحال، یہ امر واقعہ ہے کہ بلجیم کے راستے فرانس پر حملہ کرنے کے جرمن حکومت کے فیصلے سے برطانیہ کو مداخلت کا موقع مل گیا۔ رہا سوال کہ آیا اس اقدام کے پس پردہ سبب طاقت کا توازن برقرار رکھنے کا روایتی خیال تھا یا اس کا مقصد "چھوٹے سے غیرب ملک بلجیم" کی مدافعت کرنا تھا، بہرکیف برطانیہ کا جرمنی کے ساتھ اعلان جنگ نہایت گمبھیر واقعہ تھا۔ برطانیہ کی مختصر اور طویل المدتی فوجی ملازمت والی افواج مد مقابل کے وسیع لشکر پر اثر انداز ہونے کی بہت تھوڑی صلاحیت رکھتی تھیں۔ کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ وہ براعظم میں مروجہ عسکری نظام کے تحت خود کو مستحکم اور وسیع کرتیں۔ چونکہ یہ جنگ چند ماہ کی بجائے طویل عرصے تک قائم رہی، لہٰذا یہاں برطانیہ کی فوجی استعداد قابل غور ہے۔ اس کی بحری فوج نے جرمن بیڑوں کو غیر موثر بنا کر رکھ دیا اور مرکزی قاقتوں کی ناکہ بندی کر دی۔ اگرچہ یہ مذکورہ طاقتیں برطانیہ کے آگے سرنگوں تو نہیں ہوئیں لیکن ان تک فوجی سازو سامان کا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ اس کے برعکس اتحادی ملکوں کو سامان فراہم ہوتے رہے۔ البتہ "یو۔ بوٹ" کی مہم جوئی کی وجہ سے اس میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ برطانیہ کو جو سہولتیں میسر تھیں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں: برطانیہ ایک دولت مند کاروباری ملک تھا۔ ساری دنیا سے اس کے تعلقات قائم تھے۔ سمندر پار ملکوں میں اس نے نہایت وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہوئی تھی۔ اس کے بدلے ڈالر کی خریداری بہ آسانی ہو جاتی تھی۔ سفارتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سمندر پار ملکوں کے ساتھ تعلقات کی بنا پر ہی برطانیہ نے مشرق بعید میں جاپان کے اثر و رسوخ میں مداخلت کی اور اٹلی نے غیر جانب دار رہنے کا اعلان کر دیا، پھر بعد میں اس سے منحرف بھی ہو گیا اور امریکہ نے اس کو امداد فراہم کی۔ سمندر پار کے علاقوں میں آیا اسے برطانوی سلطنت نے وسائل فراہم کیے یا پھر ہندوستان سے مطلوبہ اشیاء دستیاب ہوئیں۔ آخر الذکر کی فوج دندناتی ہوئی جرمنی کی نوآبادیاتی سلطنت میں داخل ہو گئی۔ بعد ازاں، ترکی سے متصادم ہونے کے لیے آگے بڑھ گئیں۔

علاوہ ازیں، برطانیہ کے نہایت کثیر صنعتی اور مالی وسائل یورپ کو مہیا کیے جاتے رہے۔ یہ قرض کے طور پر بھی بھیجے گئے اور ساتھ ہی ساتھ فرانس، بلجیم، روس اور اٹلی کو فوجی سازو سامان کی صورت میں بھی روانہ کیے گئے۔ نیز، ہیگ نے مغربی محاذ پر بھاری تعداد میں جو فوج تعینات کی تھی، اس کے اخراجات بھی برداشت کیے گئے۔ جدول ۲۲ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عظیم طاقتوں کے نظام میں برطانیہ کی مداخلت کتنی اہمیت کی حامل تھی۔

جدول نمبر ۲۲: ۱۹۱۴ء کے اتحادی ملکوں کی صنعتی/ٹیکنالوجی صلاحیتوں کا موازنہ

	جرمنی/آسٹریا۔ہنگری	فرانس/روس+ برطانیہ
۱۔ عالمی مصنوعات کی فی صد شرح (۱۹۱۳ء)	۱۹٫۲ فی صد	۱۴٫۳ فی صد + ۱۳٫۶ فی صد = ۲۷٫۹ فی صد
2۔ توانائی کا استعمال (۱۹۱۳ء) کوئلہ کے ہم وزن میٹرک ملین ٹن	۲۳۶٫۳ "	۱۱۶٫۷ " + ۱۹۵٫۰ " = ۳۱۱٫۸ "
3۔ فولادی مصنوعات (۱۹۱۳ء) ملین ٹن میں	۲۰٫۲ "	۹٫۳ " + ۷٫۷ " = ۱۷٫۱ "
۴۔ مجموعی صنعتی صلاحیت (۱۹۰۰ء میں برطانیہ = ۱۰۰)	۱۷۸٫۴ "	۱۳۳٫۹ " + ۱۲۷٫۲ " = ۲۶۱٫۱ "

یہ بات یقینی ہے کہ اتحادیوں کو مالی وسائل میں خاصی اہم برتری حاصل تھی۔ ۱۹۱۵ء میں اٹلی کی شمولیت کے بعد اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ تاہم اگر پیداواری لحاظ سے مستحکم اتحادیوں کو بڑی طاقتوں کی اس طویل جنگ میں بالآخر فتح حاصل ہوئی تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تین سال تک جنگ کرنے کے باوجود یہ اتحادی اپنا وجود قائم رکھنے میں کیوں ناکام ہو رہے تھے اور پھر ۱۹۱۷ء میں ان کی شکست کے آثار کیوں پیدا ہو گئے تھے۔ اور آخرکار انھوں نے اس جنگ میں امریکہ کو شامل کرنا کیوں ضروری سمجھا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ علاقے جہاں یہ سارے اتحادی اپنے آپ کو مضبوط سمجھ رہے تھے، وہاں مرکزی طاقتوں پر فیصلہ کن اور جلد فتح حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کی نوآبادیاتی سلطنت معاشی لحاظ سے اتنی غیر مستحکم تھی کہ اسے نقصان کا کوئی احتمال ہی نہیں تھا۔ سمندر پار ملکوں میں جرمنی کی تجارت کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا، لیکن اس حد تک بھی نہیں جیسا کہ "برطانیہ کی سمندری طاقت" کے حواریوں نے سوچ رکھا تھا۔ جرمنی کی برآمدی تجارت پھر شروع ہو گئی۔ اب کے اس کا مقصد سامان جنگ کی ترسیل تھا۔ مرکزی طاقتوں کی ناکہ بندی کے باوجود وہاں غذائی اشیاء کا ذخیرہ موجود تھا اور ان کا مواصلاتی نظام بحال بھی ہو جاتا تھا۔ فوجی فتوحات کی وجہ سے خام مال کی کمی پوری ہو جاتی تھی۔ بہت سے سامان غیر جانب دار پڑوسیوں کے توسط سے حاصل ہو جاتے تھے۔ ویسے سمندری ناکہ بندی کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت میں موثر ہوتی جب ہر محاذ پر فوج کا غلبہ چھایا رہتا۔ پھر بھی ناکہ بندی۔۔۔۔۔ نہایت سست رفتاری سے انجام پاتی تھی۔ آخری بات یہ کہ برطانوی فوج میں ہنوز نہایت قدیم اور روایتی قسم کے ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔ محدود نوعیت کے حملے اسی طرح کیے جاتے تھے جس طرح ۱۸۰۸ء اور ۱۸۱۴ء کے دوران جزیرہ نمائے اسپین اور پرتگال کی جنگ میں کیے جاتے تھے۔ پھر اس قسم کے حملے کا اطلاق جرمنی کے ساحلی علاقوں پر ہونا خاصا مشکل تھا کیونکہ وہاں کا زمینی اور سمندری دفاعی نظام نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ پھر جب اس کی زد میں کمزور طاقتیں آتیں، مثلاً "گیلی پولی یا سلونیکا کے مقام پر"، تو اتحادی حملے کا مقابلہ نہیں کر پاتے تھے، وہ بھی اس صورت میں جبکہ جرمنی نئے نئے ہتھیار استعمال کر رہا تھا۔ چنانچہ

برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی امیدوں پر پانی پھر جاتا جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر دیکھنے میں آیا' دشمن کے محفوظ علاقے کی تلاش میں اتحادیوں کی فوجیں فرانس کے میدان جنگ سے کہیں اور چلی گئیں۔

اتحادیوں کو بحریہ میں جو بالادستی حاصل تھی' اس پر بھی مذکورہ بالا حقائق صادق آتے ہیں۔ بحر شمالی اور بحیرہ روم کی جغرافیائی صورت کچھ ایسی تھی کہ اتحادیوں کا مواصلاتی نظام بالکل محفوظ تھا۔ چنانچہ انھیں دشمنوں کے جہازوں کا سراغ لگانے کی چنداں ضرورت نہ تھی اور نہ ہی خطرناک قسم کی ناکہ بندی کرنی پڑتی تھی۔ اس کے برعکس' جرمنی اور آسٹریا - ہنگری کے بحری جہازوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ سامنے آکر انگلستان' فرانس اور اٹلی کے بحری بیڑوں کو چیلنج کریں تاکہ سمندروں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔ اور اگر وہ بندرگاہ پر ہی لنگر انداز رہتے تو اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ تاہم مرکزی طاقتوں نے اپنے سے زیادہ طاقتور بحری بیڑوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگی جہاز روانہ کرنا پسند نہیں کیا کہ اس میں سوائے ہلاکت کے کچھ نہ تھا۔ چنانچہ سمندر میں محض چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئیں اور وہ بھی فوجی لحاظ سے اتنی اہم نہیں تھیں۔ البتہ ان سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ سمندری راستوں پر اتحادیوں کا کنٹرول قائم تھا۔ مزید سمندری جھڑپوں میں کمی آگئی تھی۔ اس کی وجہ جنگی جہازوں کو سرنگ سب میرین' گشتی ہوائی جہاز اور یقینی خطرے کا سامنا تھا۔ چنانچہ ہر فریق کے امیر البحر اپنے بحری بیڑے روانہ کرنے سے اجتناب برتتے تھے تاوقتیکہ دشمن کا جہاز ان کے ساحل کے قریب نہ آ رہا ہوتا۔ سمندری جنگ کی اس صورت حال کے پیش نظر مرکزی طاقتوں نے اتحادیوں کے کاروباری جہازوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا جو اور بھی زیادہ خطرناک بات تھی۔ لیکن اپنے فطری عمل کی وجہ سے تجارتی جہازوں کے خلاف سب میرین کا استعمال نہایت ست روی سے مگر تباہ کن انداز میں ہوتا تھا اور اس کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا تھا کہ کتنے تجارتی جہاز تباہ کیے گئے اور کتنے نئے جہاز اتحادیوں کے شپ یارڈ میں تیار کیے گئے۔ پھر اس بات کا تخمینہ بھی ضروری تھا کہ کتنے "یو بوٹ" تباہ ہوئے۔ یہ اس قسم کی جنگ نہیں تھی کہ جلد فتح کا مژدہ سنا دیتی۔

اتحادیوں کی عددی اور صنعتی برتری کے باوجود ان کی کمزوری کا پہلو خود فوج کی کارکردگی سے عیاں تھا۔ جب ہر فریق کے لاکھوں فوجی سینکڑوں میل کی سرحدوں کے پار رینگ رہے ہوتے تو اس صورت میں خصوصاً" مغربی یورپ میں فتح کا حصول ناممکن تھا۔ اگرچہ بہت قبل زبردست حملے کی منصوبہ بندی کر لی گئی تھی' لیکن چھوٹی چھوٹی سینکڑوں جھڑپوں کی وجہ سے یہ پلان غت ربود ہو جاتا تھا۔ پھر مواصلاتی نظام کے درہم برہم ہونے کی بھی اس میں خاصا دخل ہوتا تھا۔ اگرچہ اگلے مورچے پر فوج آگے پیچھے ہوتی رہتی تھی' لیکن ایک دوسرے کا زور توڑنے کے ذرائع کے نہ ہونے کی وجہ سے ہر فریق کی فوج حرکت میں آجاتی اور محفوظ دستے شیلنگ کے تازہ اسٹاک' خاردار تاریں اور توپیں گھمسان کے رن کے لیے استعمال میں آ جاتیں۔ جنگ کے اختتام تک کوئی فریق اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ دشمن کے دفاعی مورچے تک اپنے فوجی دستے پہنچا دے۔ البتہ جوابی فائرنگ ہوتی رہتی اور برستے ہوئے گولوں سے زمیں دھواں دھار بنتی رہتی۔ ایسی صورت میں کسی بھی فریق کی فوج پیش قدمی کرنے سے قاصر تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی اچانک حملے کے لیے ضروری سامان دستیاب

نہیں ہوتا۔ ریلوے لائن پشت کی جانب بہت دور واقع ہوتی اور گھڑ سوار بھی سراسر ناموزوں ثابت ہوتے۔ بھاری سامان سے لدے پھندے پیدل فوج کے سپاہی سرعت کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ پھر توپوں کے گولے' بارود گھڑ سواری کے ذریعے پہنچائے جانے کے باعث تاخیر سے موصول ہوتے۔

میدان جنگ میں فتح سے ہمکنار ہونے میں یہ مشکل تو درپیش ہوتی ہی تھی' تاہم اس ضمن میں جرمنی کو دو اہم سہولتیں بھی میسر تھیں۔ ایک تو یہ کہ اگست / ستمبر ۱۹۱۴ء میں فرانس اور بلجیم کی جانب نہایت تیزی سے پیش قدمی کرنے کے باعث اس نے بلند جگہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح اسے مغربی محاذ پر نگاہ رکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے بعد سے جرمنی مغربی سمت میں دفاعی اقدام میں مصروف رہا۔ پھر انگریزی اور فرانسیسی فوج کو مجبور کیا کہ وہ نامساعد حالات میں حملہ کرے۔ اگرچہ یہ سپاہ عددی لحاظ سے برتر تھی' لیکن مذکورہ نوعیت کا نقص دور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ دوسرے جرمنی کو جغرافیائی لحاظ سے بھی فوقیت بھی حاصل تھی۔ وہاں مشرق سے مغرب تک مواصلات کا عمدہ نظام موجود تھا۔ چنانچہ اتحادیوں کے حصار میں آنے کے باوجود اس کے لئے نکلنے کی کوئی نہ کوئی راہ موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فاکن ہایان اور لیوڈن ڈورف جیسے جرنیل اپنے فوجی دستے ایک محاذ سے دوسرے محاذ تک منتقل کرتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو پوری کی پوری فوج ایک ہفتے کے اندر وسطی یورپ کے اس پار پہنچا دی گئی۔

۱۹۱۴ء میں جب زیادہ تر فوج مغربی سمت میں حملہ کر رہی تھی' اس وقت پروشیا کے جنرل اسٹاف نے گھبراہٹ کے عالم میں مشرقی محاذ پر اپنے دو دستے تعینات کر دیے تھے۔ اس اقدام کا مغربی سمت میں ہونے والے حملے پر کوئی اثر نہیں ہوا' بلکہ فوجی نقطہ نظر سے یہ سراسر ناموزوں تھا۔ اس سے الٹا جرمنی کو فائدہ پہنچا۔ مشرقی پروشیا میں روسیوں کی متوقع پیش قدمی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے ماسوری جھیل کے اردگرد حملے شروع کر دیے۔ جب نومبر ۱۹۱۴ء میں پیرس کے مقام پر خوں ریز جنگ کے بعد فاکن ہائیں کو اس محاذ پر فتح کی کوئی امید نہیں رہی تو مشرقی محاذ پر آٹھ ڈویژن فوج روانہ کر دی گئی۔ آسٹریا - ہنگری کی فوج کو سلیسیا کی جنگ میں شدید نقصان برداشت کرنا پڑا۔ پھر ۱۹۱۴ء کی فرانسیسی منصوبہ بندی نمبر ۱۷ لورین کے مقام پر بری طرح ناکام ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں ۶۰۰۰۰۰ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہو گئی کہ پولینڈ اور گلیشیا کے روسی علاقے کے کھلے میدانوں میں ہی فوجی کاروائی موثر ہو سکتی تھی۔ بہرحال یہ حقیقت پوری طرح واضح نہیں تھی کہ روسیوں کو لیمبرگ کے مقام پر آسٹریا - ہنگری کے مقابلے میں فتح حاصل ہو گی یا جرمنی ماسوری جھیل / ٹین برگ میں فتح سے ہمکنار ہو گا۔ انگلستان اور فرانس کی فوجیں ۱۹۱۵ء کے پورے عرصے میں مغربی مورچے پر محاذ آرائی میں مصروف رہیں۔ اس میں فرانس کے مزید ۱۶۵ ملین اور برطانیہ کے تین لاکھ سپاہی ہلاک ہوئے تھے۔ اس دوران جرمنی نے زور دار قسم کے مسلسل حملوں کی بھرپور تیاری کر لی۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ کارپیتیا میں ---- آسٹریا۔ ہنگری کے محصور لوگوں کو آزاد کرایا جائے لیکن سب سے اہم مقصد میدان جنگ میں موجود روسی فوج کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ روسی فوج نہ صرف کثیر تھی' بلکہ اس کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس کو شکست و ریخت سے دو چار کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن ۱۹۱۵ء کے اواخر میں کچھ ایسا

ہوا کہ جرمنی کی اعلیٰ اور جانباز فوجیوں کے ہاتھوں روس کو سخت شکست ہوئی۔ پھر اسے لیتھونیا' پولینڈ اور گیلیشیا چھوڑنا پڑا۔ ادھر جنوبی علاقے میں جرمنی کی تازہ دم فوجیں آسٹریا کی فوجوں سے آملیں۔ بلغاریہ کی موقع پرست سپاہ بھی اس جتھے میں شامل ہو گئی۔ پھر سب نے مل کر سربیا پر زبردست دھاوا بول دیا۔ ۱۹۱۵ء میں مغرب کے اتحادیوں نے گیلی پولی مہم سے لے کر سلونیکا میں داخل ہونے کی جو ناکام کوشش کی تھی اور اطالیہ کو جنگ میں گھسیٹ لیا تھا' ان سب باتوں سے دراصل روس کو ہی فائدہ پہنچا تھا۔ چنانچہ اس نے مرکزی طاقتوں کی جماعت کو چیلنج کر دیا تھا۔

۱۹۱۶ء میں فالکن ہائن نے جرمنی کی فوجی حکمت عملی میں غلط قسم کی تبدیلی کر دی تھی' یعنی فوجی یونٹوں کو مغربی محاذ پر روانہ کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وردن پر مسلسل حملہ کر کے فرانس کے باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ لیکن اس مہم میں جرمن فوج کی خاصی بڑی تعداد ہلاک ہو گئی۔ اس سے روسیوں کو موقع مل گیا کہ وہ جون ۱۹۱۶ء میں جرنل بروشیلوف کی سرکردگی میں مشرقی محاذ پر بردست حملہ کر دیں۔ چنانچہ اس نے ہیبسبرگ کی غیر منظم فوج کو کار دیسمیا کے پہاڑوں کی سمت واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ جس سے مذکورہ سپاہ کے وجود کو خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ تقریباً" اسی دور میں برطانوی فوج نے ہیگ کی سرکردگی میں سوی پر زبردست حملہ کر کے جرمنوں کے پہاڑی مورچے پر مہینوں دباؤ ڈالتے رہے تھے۔ دونوں اتحادیوں کے حملے کے نتیجے میں وردن کی محاذ آرائی کافی سرد پڑ گئی۔ پھر اگست ۱۹۱۶ء میں فالکن ہائن کی جگہ ہنڈن برگ اور لیوڈن ڈورف کی تعیناتی عمل میں آئی۔ جس سے جرمنی کی فوجی پوزیشن مستحکم ہو گئی۔ سوی کی جنگ میں جرمنی کو خاصے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ ہیگ کے مقابلے میں یہ کم درجے کا تھا۔ مغربی محاذ پر جارحانہ کاروائی کی وجہ سے جرمنی کو مشرقی سمت فوج منتقل کرنے کا دوبارہ موقع مل گیا۔ پہلے تو اس نے آسٹریا ۔ ہنگری کی افواج کو منظم کیا ور پھر رومانیہ پر چڑھ دوڑا۔ بعد ازاں اس نے جنوب میں بلغاریہ کو امداد فراہم کی۔

جرمنی کو اندرون ملک کئی طرح کی سہولتیں حاصل تھیں' مثلاً" ریلوے کا نہایت موثر نظام اور اعلیٰ درجے کی دفاعی پوزیشن۔ لیکن اصل سوال "وقت" کا تھا۔ اتحادیوں کے پاس بے پناہ وسائل تھے لیکن ۱۹۱۴ء میں حصول فتح کے لیے ان کی "بروقت" ترسیل نہ ہو سکی۔ روس کی فوجی انتظامیہ جنگ میں سپاہیوں کے ہلاک ہونے کی کمی رنگروٹوں کی بھرتی سے کر لیا کرتی تھی' لیکن نہ تو اسے تربیت دینے کے لیے وافر اسٹاف میسر تھا اور نہ انھیں پوری طرح مسلح کرنے کے لیے ہتھیار! ادھر مغرب میں یہ صورت حال تھی کہ کہیں ۱۹۱۶ء میں ہیگ کی قیادت میں سپاہیوں کی تعداد ایک ملین سے کچھ اوپر ہوئی۔ اس برتے پر اہل برطانیہ بیرون یورپ کی مہمات میں اپنی فوج کو ملوث کرنے کے آرزو مند نظر آتے تھے۔ اس طرح جرمنی پر دباؤ کی کیفیت میں کمی آ جاتی۔ لڑائی کے پہلے دو سال کے دوران روس اور فرانس دونوں جرمن فوج کی صلاحیت کا مسلسل جائزہ لیتے رہے تھے۔ اگرچہ ہر ایک فریق نہایت بے جگری سے لڑا تھا' لیکن ۱۹۱۷ء کے اوائل میں ہمت شکنی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے نیز ۱۹۱۷ء ہی میں نیوئیل کے شدید حملے کے نتیجے میں وردن میں فرانسیسی فوج محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ برو زلوف کے حملے نے ہیبسبرگ کی فوج کی صلاحیت ختم کر کے رکھ

دی تھی' لیکن جرمنی کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ البتہ روس کی ریلوے' غذائی ذخیرے' سرکاری خزانے اور افرادی قوت کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔ اگرچہ ہیگ کی سربراہی میں نئی فوج نے فرانس کے عسکری سقم کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی' اس کے باوجود مغربی محاذ پر اتحادیوں کو فتح حاصل نہ ہو سکی۔ اگر انھیں محاذ پر حملے کے دوران شکست دے دی جاتی تو جرمنی کو فلینڈر میں اپنا وجود قائم رکھنا ممکن ہو جاتا۔ پھر وہ مشرق کی سمت تیزی سے پیش قدمی کر بیٹھتا۔ آخری بات یہ کہ آپس کے جنوبی علاقے سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہیں تھی' اس لیے کہ اطالیہ پریشانی کے عالم میں خود "المدد" "المدد" پکار رہا تھا۔

ہر فریق کو جس انداز میں اتنے وسیع پیمانے پر فوجی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا اس کا ازالہ مالیاتی اور صنعتی شعبوں کی کارکردگی کی بدولت ہو گیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے قومی معیشت کو جس طرح فروغ دیا اس کا حال میں خاصا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جنگ کے نتیجے میں بہت سے علاقوں میں پہلی مرتبہ نئی اور جدید صنعتیں لگائی گئیں اور فوجی سازو سامان کثیر تعداد میں تیار کیا گیا۔ ان باتوں سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ حیران کن نہیں۔ ۱۹۱۴ء سے ذرا پہلے فوجی مقابلے کی دوڑ میں ہونے والے اخراجات کے متعلق حریت پسند اور دیگر طبقہ تشویش کا اظہار کیا کرتا ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ قومی دولت کا نہایت قلیل حصہ (یعنی اوسطاً" ۴ فی صد) فوجی سازو سامان میں صرف کیا گیا تھا۔ جب بھرپور جنگ کا آغاز ہوا تو یہ شرح ۲۵ سے ۳۰ فی صد تک بڑھی تھی۔ اس موقع پر متعلقہ حکومتوں نے کارخانے' مزدور اور مالیات پر اپنا حکم نافذ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اسلحہ سازی میں حد سے زیادہ شدت پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ چونکہ ۱۹۱۴ء کے اواخر اور ۱۹۱۵ء کے اوائل میں فوجی جرنیل بموں کی قلت کی شکایت کر رہے تھے' لہٰذا سیاست دانوں نے صنعت کاروں اور مزدوروں کے ساتھ رابطہ قائم کیا تاکہ مطلوبہ سامان تیار کیا جا سکے۔ جدید دور میں افسر شاہی نظام کے تحت چلنے والی حکومت ضرورت کے تحت قرض حاصل کرتی ہے اور ٹیکس کا نفاذ عمل میں لاتی ہے' لہٰذا اس صورت میں اٹھارھویں صدی کی تباہ کن اور طویل جنگ کے اخراجات برداشت کرنے کا جواز نہ تھا۔ تاہم نئی ضروریات کے پیش نظر تمام ملکوں میں زیادہ سے زیادہ اسلحے تیار کیے گئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ متعدد متحارب قوتوں کے اقتصادی نظام میں دوران جنگ کہاں کہاں جھول پیدا ہوا۔ اس لیے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر دولت مند اتحادیوں کی طرف سے مالی مدد نہ ملتی تو وہ روبہ زوال ہو جاتیں۔ اس ضمن میں دو نہایت ہی کمزور طاقتوں کا ذکر کیا جائے گا' یعنی آسٹریا ۔ ہنگری اور اٹلی کا! اول الذکر کے متعلق یہ بات واضح ہے کہ وہ دوران جنگ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا خصوصاً" اطالوی محاذ پر۔ لیکن روس کے ساتھ ہونے والی جنگ میں یہ یقیناً" شکست فاش سے دو چار ہو جاتا اگر جرمنی کی فوجی امداد اسے بروقت حاصل نہ ہوتی۔ اس مالی منفعت کے نتیجے میں سلطنت ہیبسبرگ' برلن کی طفیلی بن کر رہ گئی۔ رہ گیا اٹلی' تو اسے کسی بھی موقع پر براہ راست فوجی امداد کی ضرورت نہیں پڑی۔ البتہ کپوریٹو کی تباہی پر یہ اس نوع کی امداد لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ویسے غذائی اشیاء' کوئلہ' خام مال' جہاز کی فراہمی اور اسلحہ اور دیگر ضروری مصنوعات کی خریداری کے لیے ۲٫۹۶ بلین ڈالر کے قرض کے لیے اسے اپنے دولت مند اور نہایت ہی طاقتور اتحادیوں کا مرہون منت ہونا پڑا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں اسے حاصل ہونے والی

فتح بھی ہیبسبرگ سلطنت کی شکست و ریخت کی طرح کسی اور کے عملی اقدامات اور فیصلے کا نتیجہ تھی۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۷ء کے قریب اٹلی، آسٹریا - ہنگری اور روس تینوں زوال پذیر ہوتے
جارہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ روس ایسی دو وجوہات کی بنا پر سب سے پہلے روبہ زوال ہوتا جن سے روم
اور ویانا قدرے محفوظ تھے۔ اول یہ کہ ہزاروں میل پر پھیلی ہوئی سرحدوں پر جرمنی کی تربیت یافتہ فوج کے
مسلسل اور حوصلہ شکن حملوں سے روس خطرے سے دو چار ہو گیا تھا۔ دوسرے اگست ۱۹۱۴ء ہی میں اور پھر
ترکی کے جنگ میں کود پڑنے کے بعد یہ ملک فوجی لحاظ سے یک و تنہا رہ گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس قابل بھی نہیں رہا
تھا کہ جنگ برقرار رکھنے کے لیے اس دوست ممالک فوجی اور اقتصادی امداد فراہم کرتے۔ جب دوسری
متحارب قوتوں کی طرح روس کے علم میں یہ بات آئی کہ جنگی منصوبہ بندی کے برعکس اپنے اسلحے کے ذخیرے
کو دس گنا زیادہ استعمال کر رہا ہے تو "نتیجتاً" اسے اپنی ملکی مصنوعات کو فروغ دینا پڑا۔ یہ طریقہ بہتر ثابت
ہوا۔ اس لیے کہ سمندر پار سے آنے والے فوجی سازو سامان کے انتظار میں وقت گزاری کا احتمال نہیں رہا۔
پھر اس طرح منتشر وسائل ماسکو کے صنعت کاروں کے ہاتھوں میں آگئے۔ جنگ کے ابتدائی اڑھائی برسوں کے
دوران روس میں فوجی سازو سامان خاصی مقدار میں تیار کیا گیا۔ یہی صورت حال صنعتی اور زرعی مصنوعات
کی تھی۔ لیکن مواصلات کے ناقص نظام پر خاصا دباؤ بھی پڑا' کیونکہ فوجی دستوں' گھوڑوں کے چارے اور
دیگر عسکری سامان کی نقل و حمل میں پہلے ہی دشواری کا سامنا تھا۔ چنانچہ گولہ بارود کا ذخیرہ محاذ جنگ سے
میلوں دور پڑا رہتا۔ غذائی اشیاء ضرورت کی جگہ "خصوصاً" شہروں میں بر وقت نہیں پہنچائی جا سکتی تھیں۔
اتحادیوں کی طرف سے آیا ہوا سامان مرمانسک اور ارچنگل کی بندرگاہ کے اردگرد مہینوں پڑا رہتا۔ روس کی غیر
موثر انتظامیہ ان خرابیوں کا ازالہ نہ کر سکی۔ پھر صف اول کے سیاست داں بھی اس ضمن میں کوئی امدادی
کاروائی انجام نہ دے سکے۔ اس کے برعکس حکومت زار ناموزوں اور غیر متوازن مالیاتی پالیسی وضع کر کے
اپنی قبر خود کھود رہی تھی۔ اس نے تجارت پر قدغن لگا دی تھی' حالانکہ ملک کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ اسی
کے ذریعے حاصل ہوتا تھا۔ ریلوے سے خاصا نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا جو دوران امن آمدنی کا اہم ذریعہ ہوا کرتا
تھا۔ پھر لائیڈ جارج کے برعکس' خوشحال طبقے پر ٹیکس لگانا پسند نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ جنگ کے اخراجات
پورے کرنے کے لیے حکومت قرض پر قرض حاصل کرتی رہی اور نوٹ پر نوٹ چھاپتی رہی۔ "نتیجتاً" قیمتوں کا
اشاریہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ جون ۱۹۱۴ء میں عرفی قیمت ۱۰۰ تھی جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں بڑھ کر ۳۹۸ ہو گئی۔ پھر جون
۱۹۱۷ء یہ اشاریہ ۷۰۲ تک پہنچ گیا۔ پھر تو یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ غذائی اشیاء کی قلت اور شدید افراط
زر کے نتیجے میں ہڑتالوں کا سلسلہ چل پڑا۔

جنگ کے ابتدائی دو تین سال کے دوران روس کی فوجی کارکردگی اس کی صنعتی پیش رفت کی
طرح امتیازی درجے کی حامل تھی' اگرچہ جنگ سے پہلے والی "فولادی بلیمن" کی طرح نہ تھی جو راستہ پاتی
ہوئی یورپ تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی فوج حد درجہ منظم اور پر وقار تھی۔ سخت جان اور قوت برداشت کی
حامل تھی۔ فنون حرب سے کما حقہ واقف تھی۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جن سے مغربی افواج ناآشنا تھیں۔
آسٹریا - ہنگری کی فوج کے مقابلے میں روسی افواج کی کارکردگی کا ریکارڈ انکی کامیابیوں کا مظہر ہے۔ لمبرگ کے

مقام پر ستمبر ۱۹۱۴ء میں حاصل ہونے والی فتح سے لے کر بروشیلوف کا حملہ' ترکی کے خلاف کاؤ کاسس کی مہم
ہی کی طرح بے مثال تھا۔ البتہ اعلیٰ قسم کے اسلحے سے لیس اور نہایت تیزی سے حرکت کرنے والے جرمن
سپاہیوں کے مقابلے روسی فوج کا ریکارڈ اچھا نہ تھا۔ لیکن اس نقص کو تاریخ کے پس منظر میں دیکھنا ضروری
ہے۔ جب روس کو ایک محاذ پر شکست کا سامنا کرنا پڑا' مثلاً "۱۹۱۴ء میں ٹینن برگ / ماسوریا جھیل کی جنگ یا
۱۹۱۵ء میں کارپاتھیا کی محاذ آرائی' تو ہلاک ہونے والے سپاہیوں کی کمی رنگروٹوں سے پوری کر دی جاتی۔ ویسے
یہ حقیقت ہے کہ اتنی بھاری تعداد میں فوجیوں کی ہلاکت سے مجموعی افواج کی کارکردگی اور مورال متاثر
ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مثال ملاحظہ کیجئے: ٹینن برگ / ماسوریا جھیل کے مقام پر ڈھائی لاکھ فوجی مارے گئے'
۱۹۱۵ء کے اوائل میں کارپاتھیا کی محاذ آرائی میں دس لاکھ سپاہی ہلاک ہوئے جب میکنسن نے پولینڈ کے
مرکزی حصے پر حملہ کیا تو روسی فوج کے چار لاکھ سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ جب ۱۹۱۶ء میں بروشیلوف نے
رومانیہ پر حملہ کیا تو اس خوں ریز جنگ میں جہاں آخر الذکر تباہی کا نشانہ بنا وہاں ایک لاکھ روسی سپاہی مار
ڈالے گئے۔ ۱۹۱۶ء کے اواخر میں روسی فوج کو نہایت گھمبیر تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ۳ء۶ ملین سپاہی یا
تو ہلاک یا بری طرح زخمی ہو گئے۔ اس کے مزید ۲ء۱ ملین فوجی مرکزی طاقتوں نے قیدی بنا لیے۔ اس وقت
روس کی حکومت نے دوسری قسم کے رنگروٹ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں خاندان کے کماؤ مرد شامل کئے
گئے تھے۔ اس طرح نہ صرف دیہاتی کسانوں میں بے چینی پھیلی بلکہ فوج میں بیگار کے ایسے لاکھوں سپاہی
شامل کیے گئے جو جبری بھرتی پر کبیدہ خاطر تھے۔ نیز' یہ حقائق بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ روسی فوج میں
نان کمیشن آفیسر کی تعداد کم تھی۔ محاذ پر اسلحے' گولہ بارود اور کھانے پینے کا سامان قلیل مقدار میں پہنچتا تھا۔
پھر جرمنی کو اپنے فوجی ذرائع سے روس کی ساری منصوبہ بندی کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ مخالف کی
اس فوجی برتری کی وجہ سے بھی روسی فوج احساس کمتری کا شکار تھی☆ مزید برآں جرمن سپاہی توپ کے
گولے برسانے اور بہت جلد آگے بڑھ جانے میں ماہر تھے۔ ۱۹۱۷ء کے اوائل میں جہاں میدان جنگ میں
روسیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا' وہاں شہروں میں خاصی تشویش پھیلی ہوئی تھی اور دیہاتوں میں
زمینوں کی تقسیم کی افواہ گرم تھی۔ چنانچہ فوجیوں پر ان باتوں کے مضر اثرات مرتب ہوئے۔

جولائی ۱۹۱۷ء میں کرن اسکائی نے آسٹریا پر حملہ کیا۔ یہ ابتداء میں تو کامیاب رہا' بعد ازاں
میکنسن نے جوابی حملے میں اسے بالکل ہی ناکام بنا دیا۔ یہی روس کے لیے آخری دھچکا تھا۔ بقول اسٹاف کے:

> "روسی فوج محض دیکھنے میں بڑی نظر آتی ہے۔ ویسے یہ تھکی ماندی اور
> حقیر سی ہے۔ یہ پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنے والے اور غصہ ور سپاہیوں کا
> ایک مجموعہ ہے۔ یہ امن کے متلاشی اور عام محرومیوں کے ترجمان
> ہیں۔"

☆ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لئے کہ روسی فوج نہایت بے پروائی سے وائرلیس کا
استعمال کرتی اور اس کا پیغام باسانی دشمن تک پہنچ جاتا۔

اب روس کے مقدر میں شکست لکھی جا چکی تھی۔ پھر ایک ایسا انقلاب رونما ہونے والا تھا جو ۱۹۰۵ء سے کہیں زیادہ گمبھیر تھا۔

۱۹۱۷ء کے وسطی عرصے میں فرانس کو بھی یہی سب کچھ دیکھنا نصیب ہوا۔ جب نیوئیل نے بے سوچے سمجھے جارحانہ اقدامات کیے تو اس کے نتیجے میں ہزاروں سپاہی باغی ہو گئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ روس کے زیادہ تر حالات سے مشابہت کے باوجود فرانسیسیوں کو ایسے اہم مواقع حاصل تھے جن کی وجہ سے وہ جنگ لڑتے رہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس ملک میں اعلیٰ درجے کی قومی یکجہتی تھی۔ وہاں کے لوگوں نے جرمنوں کو رھائن کے پار بھگا دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ دوسری وجہ جو بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھی' "اتحادی جنگ" تھی۔ یعنی فرانس کو اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر لڑنے کا موقع حاصل تھا' جس سے روس سراسر محروم تھا۔ ۱۸-۱۹۱۷ء ہی میں اہل فرانس کو اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تنہا جرمنی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کے دوران ہونے والی محاذ آرائی نے اس خیال کو مزید تقویت دے دی تھی۔ اس بات کے اظہار کا قطعی یہ مقصد نہیں ہے کہ فرانس نے جنگ میں جو فوجی اور معاشی کارنامے انجام دیے' ان کی نفی کی جائے۔ مدعا حالات کو صحیح تناظر میں دیکھنا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس ملک کی ۳۶ فی صد کچا لوہا پیدا کرنے کی صلاحیت' ۲۴ فی صد فولادی مصنوعات بنانے کی صلاحیت اور ۴۰ فی صد کوئلہ پیدا کرنے کی صلاحیت ایکا ایکی جرمنوں کے ہاتھوں میں چلی گئی' ۱۹۱۴ء کے بعد وہاں رونما ہونے والا صنعتی انقلاب فرانس کے لیے باعث اعزاز تھا۔ (یہاں اتفاق سے یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ وہاں انیسویں صدی میں سیاسی ماحول سازگار ہوتا تو کیا کچھ کارنامے انجام نہ دے دیے گئے ہوتے۔) تمام ملک میں چھوٹے بڑے کارخانے قائم کیے گئے۔ عورتوں' بچوں اور محب وطن افراد کو ملازم رکھا گیا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو جنگ میں جبراً" بھرتی کیے گئے تھے اور خندقوں میں چھپے ------ بیٹھے تھے' باہر نکالے گئے اور ان کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ ماہرین فن' کاروباری افراد اور مزدوروں کی یونین نے آپس میں مل کر قومی نوعیت کا یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو بم' بندوق' ایئرکرافٹ' ٹرک اور ٹینک زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کیے جائیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں جس طرح فوجی مصنوعات تیار ہوئیں ان کو دیکھتے ہوئے ایک دانشور کو یہ کہنا پڑا : "پہلی جنگ عظیم میں فرانس برطانیہ سے بڑا اور امریکہ سے کہیں زیادہ بڑا جمہوریت کا اسلحہ خانہ بنا ہوا تھا۔"

غرض فوجی مصنوعات پر بھرپور توجہ دی گئی جس کے نتیجے میں مشین گنیں تیار کرنے کی شرح ۱۷۰ گنا بڑھ گئی۔ اسی طرح رائفل بنانے کا کام ۲۹۰ گنا زیادہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ نا ممکن تھا اگر فرانس کو برطانیہ اور امریکہ سے امداد نہ ملتی۔ یہ تعاون کوئلہ' کوک پتھر' خام لوہا' فولاد اور مشینی اوزار کی صورت میں دستیاب ہوتا رہا۔ یہ ساری چیزیں اسلحہ سازی کے لیے حد درجہ اہمیت رکھتی تھیں۔ پھر انگلستان اور امریکہ سے ۳ء۶ بلین ڈالر سے زیادہ کا قرض بھی حاصل ہوا تاکہ فرانس سمندر پار کے ملکوں سے خام مال خرید سکے۔ علاوہ ازیں برطانیہ نے اس تمام سامان کے نقل و حمل کے لیے اپنے متعدد جہاز بھی فراہم کیے۔ آخرالذکر شے سے فرانس کی بدحالی کا پتہ چلتا ہے۔ ویسے حالت امن میں یہی ملک ضرورت سے زیادہ زرعی اشیاء پیدا کیا کرتا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ کو چھوڑ کر دیگر یورپی ممالک کی طرح فرانس نے بھی جنگ کے موقع پر اپنی کاشت کو تباہ و برباد کیا تھا۔ ان متحارب قوتوں نے اپنے اپنے کھیتوں سے جبراً" کسانوں کو فوج میں بھرتی کیا' گھوڑوں کو سواروں کے رسالے میں جوت دیا یا فوجی سازوسامان کے نقل و حمل میں استعمال کیا اور گولہ بارود اور توپ کے لیے کھاد اور کھیت کے دیگر سامان کو تصرف میں لایا۔ ۱۹۱۷ء کا سال فصل کے لحاظ سے

نہایت ہی خراب تھا جس سے غذائی اشیاء کی قلت پیدا ہو گئی۔ چیزوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ حتیٰ کہ فرانسیسی فوج کا راشن گھٹ کر صرف دو دن کا رہ گیا۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال تھی اور اس کے نتیجے میں بغاوت پھیل گئی۔ ایسے نامساعد حالات میں برطانیہ کے جہاز امریکی غلہ بھر بھر کر فرانس پہنچاتے رہے اور اس طرح بلائے ناگہان ٹل گئی۔

اسی طرح فرانس مغربی محاذ پر جنگ جاری رکھنے کے لیے برطانیہ اور امریکہ کی عسکری امداد کا محتاج تھا۔ جنگ کے ابتدائی دو تین سال تو وہ بے جگری سے لڑتا رہا اور جانی نقصان بھی سہتا رہا جو تین ملین سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ چونکہ فرانس کے پاس ایسی غیر تربیت یافتہ افرادی قوت کی بہتات نہ تھی جیسی جرمنی' روس اور برطانیہ کے پاس تھی' لہٰذا جانی نقصان کی صورت میں اس کی تلافی بہت مشکل ہو جاتی تھی۔ تاہم ۱۷-۱۹۱۶ء کے دوران مغربی محاذ پر ہیگ کے زیر کمان فوج کو فرانسیسی فوج کی تعداد سے دو تہائی گنا زیادہ کیا گیا۔ یہ اسی میل سے زیادہ کے علاقے پر تعینات تھی۔ اگرچہ برطانوی ہائی کمان حملہ کر دینے کا خواہاں تھی' لیکن سومی کی محاذ آرائی نے وردون کے دباؤ کو خاصا کم کر دیا تھا۔ یہ اسی طرح تھا کہ ۱۹۱۷ء میں پاچنڈیل نے جرمنی کی فوجی توانائی کا رخ فرانس کے محاذ سے موڑ دیا تھا۔ اس وقت پیتین بغاوت کے ہنگامے کے بعد اپنی فوج کا مورال بلند کرنے میں مصروف تھا۔ نیز وہ ٹرکوں' ہوائی جہازوں اور بھاری قسم کی توپوں کا انتظار کر رہا تھا تاکہ مہم سر کی جا سکے۔ یہ وہ کام تھا جسے پیدل فوج کی اکثریت بھی انجام دینے سے قاصر تھی۔ مارچ اور اگست ۱۹۱۸ء کے دوران فرانس کو مغربی محاذ پر برطانیہ کے شاہی ڈویژن کے ساتھ ساتھ امریکی فوجیوں کی مدد کی ضرورت بھی آ پڑی تھی۔ جب جنرل فاش نے ستمبر ۱۹۱۸ء میں جوابی حملہ کیا تو اس وقت اس نے جرمنی کے ۱۹۷ ڈویژن کا مقابلہ فرانس کے ۱۰۲' برطانیہ کے ۶۰' امریکہ کے ۴۲ اور بلجیم کے ۱۲ ڈویژنوں سے کیا تھا۔ مخلوط فوجوں کی مدد سے ہی جرمنوں کو فرانس کی سرزمین سے مار بھگایا جا سکتا تھا اور ملک کو دوبارہ آزادی نصیب ہو سکتی تھی۔

جب اگست ۱۹۱۴ء میں برطانیہ میدان جنگ میں کود پڑا تو اس بات کا کوئی شائبہ نہ تھا کہ وہ فتح کے حصول کے لیے کسی بڑی طاقت کا کاسہ لیس بن جائے گا۔ جنگ کے آغاز سے پہلے اس نے جس قسم کی منصوبہ بندی کی تھی اور جس انداز میں فوجی تیاری مکمل کی تھی' اس کو دیکھ کر فوجی ماہرین نے یہ قیاس کر لیا تھا کہ برطانیہ کا شاہی بیڑا جرمنی کے مال بردار جہازوں اور کھلے سمندروں پر چلنے والے بیڑوں کو مار بھگائے گا۔ ادھر جرمنی کی نو آبادیات پر انگریزی حکومت اور برطانیہ کی ہندوستانی فوج کا قبضہ ہو جائے گا۔ پھر ایک مہم جو دستہ چینل سے آگے روانہ کیا جائے گا تاکہ فرانس اور بلجیم کی فوجوں کے درمیان حائل خلا کو پر کرے نیز جرمنی کے حملے کو روکتا رہے تاآنکہ روس کا فولادی بیلن اور "فرانسیسی پلان نمبر ۱۷" فادر لینڈ کے اندرونی علاقے میں دور تک پہنچ جائے۔ دیگر طاقتوں کی طرح برطانیہ بھی کسی طویل جنگ کے لیے تیار نہ تھا۔ ویسے ان سبھوں نے ایسے اقدامات کیے تھے کہ ان کے بین الاقوامی نوعیت کے لین دین اور تجارت میں کوئی بحران نہ پیدا ہو۔ نیز وہ سب براعظم یورپ میں وسیع پیمانے کی فوجی کاروائی کے لیے بھی تیار نہ تھیں۔ لہٰذا یہ بات تعجب خیز نہیں کہ فرانس میں ایک ملین برطانوی فوج کی تعیناتی سے قبل ایک دو سال تک اس کی تیاری ضروری تھی۔ پھر اس دوران وہاں کی حکومت نے رائفل' توپ' مشین گن' ہوائی جہاز' فوجی ٹرک اور گولہ بارود کی تیاری میں کثیر رقم تو خرچ کر دی تھی لیکن ان تمام مصنوعات میں کئی قسم کی خامیاں موجود تھیں۔ لائیڈ جارج کی وزارت اسلحہ نے ان سب نقائص کو آہستہ آہستہ دور کیا تھا۔ بہرحال اسلحہ پھر نہایت

زور شور سے تیار کیا جانے لگا۔ اس کا اندازہ جدول نمبر۲۳ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی تعجب کی کوئی بات نہیں کہ برطانیہ کے دفاعی اخراجات جو ۱۹۱۳ء میں ۹۱ ملین پونڈ تھے وہ ۱۹۱۸ء میں بڑھ کر ۱۹۵۶ ملین تک جا پہنچے یعنی حکومت کے مجموعی خرچ کے حساب سے یہ شرح ۸۰ فی صد تھی اور اگر مجموعی قومی پیداوار کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ شرح ۵۲ فی صد تھی۔

جدول نمبر۲۳: برطانیہ کی حربی مصنوعات

۱۹۱۳ء — ۱۹۱۸ء

	۱۹۱۳ء	۱۹۱۵ء	۱۹۱۶ء	۱۹۱۷ء	۱۹۱۸ء
بندوق	۹۱	۳۳۹۰	۳۳۱۴	۵۱۳۷	۸۰۳۹
ٹینک	-	-	۱۵۰	۱۱۱۰	۱۳۵۹
ہوائی جہاز	۲۰۰	۱۹۰۰	۶۱۰۰	۱۴۷۰۰	۳۲۰۰۰
مشین گن	۳۰۰	۶۱۰۰	۳۳۵۰۰	۷۹۷۰۰	۱۲۰۹۹۰

برطانیہ کے فوجی ڈویژن ہوائی جہاز کے اسکواڈرن اور وزنی توپوں کی بیڑی کی تعداد کی تفصیل پیش کرنا اتنا ضروری نہیں جتنا ضروری ان عسکری خامیوں کی جانب اشارہ کرنا ہے جو پہلی جنگ عظیم کے دوران ظاہر ہو گئی تھیں۔ پہلی یہ کہ جغرافیائی پوزیشن اور عظیم الشان بیڑے کی عددی برتری نے سمندروں پر اتحادیوں کی بالادستی قائم کر دی تھی لیکن برطانیہ کا شاہی بیڑا جرمنی کے یو۔ بوٹ (جسے وہ ۱۹۱۷ء سے استعمال کر رہا تھا) کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ دوسری خامی یہ تھی کہ سستے قسم کے حربی ذرائع یعنی ناکہ بندی' نو آبادیاتی مہم اور خشکی و سمندری راستے سے حملہ' ایک ایسے دشمن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے جس کے اپنے فوجی ذرائع خاصے وسیع تھے۔ پھر جرمن فوج کے ساتھ براہ راست تصادم سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر افرادی قوت کے لحاظ سے یہ بھی خاصا مہنگا تھا۔ جب سوم کی محاذ آرائی نومبر ۱۹۱۶ء میں اختتام کو پہنچ رہی تھی اس وقت تک اس میں برطانیہ کے چار لاکھ سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ اگرچہ اس جنگ کی وجہ سے برطانیہ کے نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور سیاست دانوں کو الگ رنج پہنچا' لیکن جنرل ہیگ کے مکمل فتح حاصل کرنے کے جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ۱۹۱۷ء کے وسطی عرصے میں اس نے پیرس کے شمال مشرق سے پاسچنڈیل تک زبردست حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ یہ ایک بھیانک خواب ثابت ہوا جس میں چار لاکھ فوجیوں کا جانی نقصان ہوا اور فرانس میں زیادہ تر فوجیوں کے مورال پر مضر اثرات مرتب ہوئے۔ چنانچہ جنرل ہیگ اور جنرل رابرٹ سن کے احتجاج کے باوجود لائیڈ جارج اور جنگی ذہنیت رکھنے والی کابینہ نے برطانیہ کی فوج کو مشرق کی طرف زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھیجنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ ان کے خیال میں وہاں فائدے کے آثار نمایاں تھے اور جرمنوں کے مضبوط مورچوں پر ضرب لگانے میں جو خطرات پنہاں تھے ان کا دور دور شائبہ تک نہ تھا۔

برطانیہ کو پاسچنڈیل کی محاذ آرائی سے پہلے ہی جرمنی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں قائدانہ درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ اگرچہ فرانس اور روس کی کثیر فوجیں میدان کارزار میں اتری ہوئی تھیں لیکن وہ سب نیوئیل کے شدید حملے اور جرمنی کے جوابی حملے سے تھک کر چور ہو چکی تھیں۔ برطانیہ کو یہ قائدانہ رتبہ معاشی لحاظ سے بھی حاصل تھا۔ عالمی منڈی میں وہ ایک بینکار اور قرض کا لین دین کرنے والے ملک کی

حیثیت سے روشناس ہو چکا تھا۔ وہ صرف اپنے لیے ہی قرض حاصل نہیں کرتا تھا' بلکہ روس' اٹلی اور فرانس جیسے ممالک جب قرض لیتے تو برطانیہ ان کی ضمانت دیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سمندر پار ملکوں سے حاصل کیے جانے والے گولہ بارود اور خام مال کے عوض سونا فراہم کرنا یا بیرونی سرمایہ کاری کی مملوکات پیش کرنا اتحادیوں کے بس میں نہ تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ یکم اپریل ۱۹۱۷ء تک جنگ کے سلسلے میں اتحادیوں کے لیے ہوئے قرضے ۴۰۳ بلین ڈالر تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے ۸۸ فی صد حصے کی ضامن حکومت برطانیہ تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھارھویں صدی کا برطانیہ یاد آ جاتا ہے جب وہ اتحادیوں کے درمیان بینکار کا رول ادا کیا کرتا تھا۔ لیکن اب اس میں نمایاں فرق قائم ہو چکا تھا۔ امریکہ اتحادی ملکوں کو بلین ڈالر کی مالیت کے فوجی سازوسامان فراہم کر رہا تھا اور اس کے عوض چند اشیاء کا طلب گار تھا۔ اس لین دین میں تجارتی ۔خسیر کا احتمال رہتا تھا۔ اس خلا کو نہ تو سونے کے ذریعے اور نہ ہی ضمانتی سرمایہ کے ذریعے پاٹا جا سکتا تھا۔ البتہ نیویارک اور شکاگو کے بازار زر سے قرض لے کر ہی امریکی سپلائر کو فراہم شدہ سامان کی ادائیگی ڈالر میں کی جا سکتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگی کاروائی کو جاری رکھنے کے لیے اتحادیوں کو امریکی امداد کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں برطانوی خزانے کے چانسلر نے یہ تنبیہ کی تھی:

> "اگلے سال جون میں یا اس سے پہلے جمہوریہ امریکہ کا صدر اس قابل ہو جائے گا کہ حسب خواہش ہم سے اپنی شرائط منوائے گا۔"

یہ صورت حال آزاد قسم کی بڑی طاقتوں کے لیے خطرے کی علامت تھی۔ اور جرمنی؟ جنگ میں اس کی کارکردگی چونکا دینے والی تھی۔ جیساکہ پروفیسر مارچ رقمطراز ہیں:

> "اپنے اتحادیوں سے اسے کوئی خاص مدد نہیں ملی تھی۔ اس کے باوجود اس نے ساری دنیا کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے روس کی پٹائی کی تھی' فرانس کو بھگا دیا تھا اور پوری دو صدی تک یورپ کا فوجی عفریت بنا رہا اور اپنے عروج کے آخری دور میں پھر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا"

اس کی ایک وجہ تو وہ خصوصیات تھیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے' یعنی اندرون ملک مواصلات کا نہایت عمدہ نظام' مغرب میں دفاعی پوزیشن اور مشرق میں فوج کے نقل و حمل کے لیے کھلے میدان۔ پھر اس میں جرمن فوج کے لڑنے کی اعلیٰ صلاحیت کو بھی دخل تھا۔ علاوہ ازیں فوج کے اسٹاف آفیسرز نہایت ذہین اور چھان بین کرنے والے تھے۔ دوسری فوج کے افسروں کے مقابلے میں یہ لڑائی کے جدید طرز کو نہایت سرعت سے اپنا لیتے تھے۔ پھر ۱۹۱۶ء میں انھوں نے جنگ کے دفاعی نظام اور حملے کے طریقے پر از سر نو غور کر کے تبدیلی پیدا کر لی تھی۔

جرمنی بھرپور جنگ کے لیے اپنی زیادہ سے زیادہ آبادی اور صنعتی مصنوعات کو استعمال میں لانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وہ روس کے مقابلے میں زیادہ افرادی قوت کو تصرف میں لایا تھا' یعنی ۱۳ ملین تک! دونوں ملکوں کی کثیر آبادی کے پیش نظر جرمنی کا یہ اقدام یقیناً "عظیم الشان تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ میدان جنگ میں اس کے ڈویژن روس کی نسبت زیادہ ہوا کرتے تھے۔ اس ملک میں جنگی

سازوسامان اعلیٰ فوجی افسروں کی نگرانی میں تیار ہوتا تھا۔ اس میں والتھر رتھناؤ جیسے کاروباری لوگ بھی خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ خام مال مہیا کرنے میں ہر طرح کی سہولت فراہم کرتے اور درپیش رکاوٹوں کو دور کر دیتے۔ ماہر کیمیا دانوں نے ایسے سامان کے لیے ضروری مواد تیار کیا جو برطانوی ناکہ بندی کے دوران ناکارہ ہو چکے تھے۔ لکسمبرگ اور شمالی فرانس کے مقبوضہ علاقے سے فلزیات اور کوئلہ حاصل کیا گیا۔ بلجیم کے مزدوروں کو جرمنی کے کارخانوں میں کام پر لگا دیا گیا اور پھر ۱۹۱۶ء میں حملے کے نتیجے میں رومانیہ کی گندم خود بخود اس کے ہاتھ لگ گئی اور تیل کا ذخیرہ بھی مل گیا۔ نپولین اور ہٹلر کی طرح جرمنی کے فوجی قائد فتح سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے خوگر تھے۔ ۱۹۱۷ء کے اول نصف عرصے میں جہاں روس روبہ زوال تھا' فرانس ڈانواں ڈول ہو رہا تھا' برطانیہ "یو۔ بوٹ" کی زد میں تھا' وہاں جرمنی فتح و نصرت سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ اپنے اس نعرے کے باوجود کہ "آخری دم تک لڑنا ہے" لندن اور پیرس میں بیٹھے ہوئے سیاست داں صلح کرنے کی بات کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگلے بارہ مہینے کے لیے جنگ بندی کا سمجھوتہ ہو جائے۔ پھر تو حالات پلٹا کھائیں گے ضرور!

ان فوجی اور صنعتی صلاحیتوں کے پس پردہ بہت سے مسائل پوشیدہ تھے جو ۱۹۱۶ء کے موسم گرما سے قبل ذرا بھی واضح اور نمایاں نہ تھے۔۔۔ خصوصاً" اس وقت جب جرمن فوج مغربی محاذ پر دفاعی اقدامات میں مصروف تھی اور مشرقی مورچے پر شدید حملے کر رہی تھی۔ واضح رہے کہ وردن اور سوم کی جنگ طاقت کے استعمال اور شکست کے زخموں کی وجہ سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ مغربی محاذ پر ۱۹۱۵ء میں جرمنی کا تقریباً" ۸۵۰۰۰۰ فوجیوں کا جانی نقصان ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۱۶ء میں یہ بڑھ کر ۱٫۲ ملین ہو گیا تھا۔ برطانیہ نے سوم کے محاذ پر جس طرح حملہ کیا تھا' اس سے جرمن سپاہ بے حد متاثر ہوئی تھی۔ دراصل برطانوی فوج کے رویے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کی خاطر تمام قومی وسائل کو مصرف میں لا رہی تھی۔ اسی جذبے کے تحت اگست ۱۹۱۶ء میں ہنڈن برگ پروگرام تیار کیا گیا۔ اس کے تحت یہ طے کیا گیا کہ اسلحہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کیا جائے۔ پھر جرمنی کے اقتصادی نظام اور اس کے معاشرے کو شکنجے میں کسا جائے تاکہ بھرپور جنگ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ یہ خود مختار حکومت ایک طرف تو عوام پر اپنے احکامات مسلط کر رہی تھی دوسری جانب اپنی آمدنی بڑھانے اور ٹیکس نافذ کرنے کی بجائے قرض پر قرض لیے چلی جا رہی تھی اور کاغذی نوٹ چھاپ رہی تھی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں افراط زر میں زبردست اضافے کی صورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ عوام کے مورال پر اس کے مضر اثرات رونما ہوئے۔ یہ ایک ایسی ناقص حکمت عملی تھی جسے لیوڈن ڈورف بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس وقت لائیڈ جارج یا کلیمن جیسے سیاست دان بھی موجود نہ تھے۔

اقتصادی لحاظ سے ہنڈن برگ پروگرام میں کئی خامیاں تھیں۔ دھماکہ خیز مادوں کی تیاری دوگنی کر دی گئی اور مشین گنیں تین گنا زیادہ تیار ہونے لگیں۔ ان کے بہ بانگ دہل اعلان سے الٹا رکاوٹیں پیدا ہوئیں اس لیے کہ جرمنی کے کارخانے ان مطلوبہ اشیاء کو پورا کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرنے لگے۔ بہرحال برطانیہ کے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے بہت سے زائد مزدوروں کی ضرورت تھی۔ پھر دھماکہ کرنے والی بھٹی سے لے کر رھائن کے اوپر پل کی تعمیر کے لیے مزدوروں کی بھی ضرورت تھی اور سرمایہ کی بھی! حکمرانوں کو یہ بات بہت جلد سمجھ میں آ گئی کہ مذکورہ پروگرام اسی وقت پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب ہنرمند مزدور فوجی ملازمت سے واپس بلا لئے جائیں۔ چنانچہ ایسے باہنر مزدوروں کی ۱٫۲ ملین تعداد ستمبر ۱۹۱۶ء میں

فوجی ملازمت سے فارغ کی گئی اور ۱٫۹ ملین جولائی ۱۹۱۷ء میں! مغربی محاذ پر ہونے والے نقصانات اور مشرقی حصے میں فوجیوں کی ہلاکت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فوجی ملازمت سے اتنے کثیر افراد کو فارغ کرنے کے معنی یہ تھے کہ جرمنی کے تنومند مردوں کی تعداد سکڑ گئی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پاسچنڈیل جہاں برطانوی فوج کے لیے جہنم بن گیا تھا وہاں لیوڈن ڈورف نے بھی اسے تباہی کا مرکز قرار دیا تھا کیونکہ اس کی فوج کے مزید چار لاکھ افراد اپاہج ہو گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں جرمن فوج میں ۳۸٫۰ ملین سپاہی شامل تھے۔ یہ خاصی بڑی تعداد چھ ماہ قبل بھی تھی۔

ہنڈر برگ پروگرام میں زراعت کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جرمنی میں فرانس اور روس سے کہیں زیادہ آدمی' گھوڑے اور جلاون کھیتوں سے لیے جاتے تھے۔ اس طرح فوجیوں یا اسلحے کے کارخانوں کی ضرورتیں پوری ہوتیں۔ یہ نہایت نامعقول بات تھی کیونکہ جرمنی فرانس کی طرح سمندر پار کے علاقوں سے غلہ درآمد کر کے اس غلطی کا ازالہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہاں زرعی پیداوار میں کمی آئی تو غذائی اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ ملک میں ہر جگہ لوگ خوردونوش کے سامان کی قلت کا رونا رونے لگے۔ چنانچہ ایک دانشور نے نہایت سخت انداز میں یہ رائے ظاہر کی تھی:

> "اقتصادی نظام کو فروغ دینے کے برعکس فوجی افسران گولہ بارود تیار کرنے پر زیادہ توجہ مبذول کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے اس اقدام کی وجہ سے جرمنی ۱۹۱۸ء کے اواخر میں قحط سالی کے قریب جا پہنچا تھا۔"

اس وقت جو صورت حال تھی وہ ۱۹۱۷ء سے بالکل مختلف تھی۔ تب اتحادی جنگ کے زخم خوردہ نظر آتے تھے۔ روس روبہ زوال تھا۔ فرانس اور اٹلی کی بدقسمتی بھی اسی نوع کی تھی۔ گویا ہر ہلاک جنگ کی وجہ سے تھک کر چور ہو رہا تھا۔ لیکن جرمنی کو ہنوز فوجی برتری حاصل تھی۔ ان حالات میں تمام اتحادیوں کی نظریں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہ تھی کہ اس صورت حال سے پہلے بھی امریکہ کی ہمدردی اتحادیوں کے ساتھ تھی۔ اتحادیوں کی جمہوری سلطنتوں کے ساتھ امریکہ کی نظریاتی وابستگی تھی۔ ویسے بحری ناکہ بندی کے معاملے میں کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود امریکی عوام ان حکومتوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ پھر امریکہ کے برآمد کنندگان کا انحصار مغربی یورپ کی منڈیوں پر بڑھتا جا رہا تھا۔ لہٰذا واشنگٹن نے جرمنی کے معاملے میں بالکل غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن جب جرمن آب دوز "یوبوٹ" تجارتی جہازوں کو نشانہ بنانے لگی اور جرمنی نے ایک خفیہ ٹیلیگرام کے ذریعے میکسیکو کو اتحاد کی پیشکش کی تو امریکی صدر ولسن اور وہاں کی کانگریس کو بالاخر جنگ میں شرکت کرنی پڑی۔

اس لڑائی میں امریکہ کی شرکت فوجی لحاظ سے چنداں اہمیت کی حامل نہ تھی' خصوصاً" اپریل ۱۹۱۷ء کے بعد کے بارہ پندرہ مہینوں میں! اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپی افواج کے برعکس یہ جدید محاذ آرائی کے لیے پوری طرح تیار نہ تھی۔ لیکن وہ لاکھوں ڈالروں سے اتحادیوں کی جنگی ضروریات بہ حسن و خوبی پوری کر رہا تھا۔ جرمنی کی دگرگوں اقتصادی حالت کے مقابلے میں امریکہ کی صنعتی صلاحیت اور عالمی پیداوار میں اس کا حصہ اڑھائی گنا زیادہ تھا۔ اس کے سینکڑوں تجارتی جہاز سطح سمندر پر رواں دواں تھے۔ ایسے وقت میں جب جرمنی اپنی آبدوز کشتی (یوبوٹ) کے ذریعے برطانیہ اور اتحادیوں کے جہاز مسلسل غرق کیے

چلا جا رہا تھا' یہی امریکی مطلوبہ جہازوں کی مانگ کو پورا کر رہے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ امریکہ تین ماہ کی مدت میں حیرت انگیز طور پر تارپیڈو تیار کر سکتا تھا۔ دنیا کی غذائی برآمدات کا نصف حصہ امریکہ پیدا کرتا تھا۔ یہ خوردنی اشیاء فرانس' اٹلی اور برطانیہ روانہ کی جاتی تھیں۔

اقتصادی طاقت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو امریکہ کے جنگ میں شامل ہو جانے سے توازن میں تبدیلی آ گئی' ساتھ ہی ساتھ روس کے روبہ زوال کی تلافی بھی ہو گئی۔ جیساکہ جدول نمبر۲۳ سے ظاہر ہوتا ہے' (اس کا موازنہ جدول نمبر۲۲ سے کیا جانا چاہیے) مرکزی طاقت کے برعکس دیگر ملکوں کے صنعتی وسائل بہت زیادہ تھے۔

جدول نمبر۲۳= امریکہ کے ساتھ صنعتی/ تکنیکی موازنہ
(اس میں روس شامل نہیں ہے)

	برطانیہ/امریکہ/فرانس	جرمنی/آسٹریا۔ ہنگری
۱۔ عالمی صنعتی پیداوار کی شرح (۱۹۱۳ء)	۵۱٫۷	۱۹٫۲
۲۔ توانائی کا استعمال (۱۹۱۳ء) (ملین میٹرک ٹن کوئلہ کے مساوی)	۷۹۸٫۸	۲۳۶٫۴
۳۔ فولادی مصنوعات (۱۹۱۳ء) ملین ٹن میں	۴۴٫۱	۲۰٫۲
۴۔ مجموعی صنعتی صلاحیت (برطانیہ ۱۹۰۰ء میں =۱۰۰)	۴۷۲٫۶	۱۷۸٫۴

اقتصادی صلاحیتوں کو فوجی صلاحیتوں میں تبدیل کرنے کے دوران' جنگ میں امریکہ کی شمولیت کے اثرات ملے جلے سے تھے۔ مختصر سی مدت میں وہ ٹینک' توپ اور لڑاکا ہوائی جہاز بنانے سے قاصر تھا۔ چنانچہ یہ سب سامان اسے فرانس اور برطانیہ سے ادھار لینے پڑے۔ لیکن اس دوران امریکہ چھوٹے چھوٹے جنگی سامان اور دیگر ضروری اشیاء فراہم کرتا رہا۔ امرواقعہ یہ ہے کہ لندن' پیرس اور روم انہی فراہم شدہ سامان پر انحصار کیے ہوئے تھے۔ پھر امریکہ نے بینک کے ذریعے ان تمام اشیاء کی قیمت ادا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں طویل المعیاد بنیاد پر امریکی فوج تازہ دم' قابل اعتماد اور خوشحال دستوں کی صورت میں طاقت کا ایک ایسا سرچشمہ بنی ہوئی تھی جس نے یورپ کا دفاعی توازن برقرار رکھا ہوا تھا۔ اسی عرصے میں پاسچنڈیل کی دلدل میں برطانوی سپاہ پھنس کر رہ گئی' روسی فوج انتشار سے دوچار ہو گئی' جرمنی کی تازہ کمک کی مدد سے مرکزی طاقتوں نے اٹلی پر شدید حملہ کر دیا اور لیوڈن ڈورف مشرقی محاذ سے اپنی فوج واپس طلب کر کے انگلستان اور فرانس کی مشترکہ فوج پر آخری حملہ کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ بیرون یورپ برطانیہ مشرق قریب میں ترکی کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔ جرمن فوج یورپ میں جس طرح پیش قدمی کرتی چلی جا رہی تھی' اگر اسی انداز میں آگے بڑھ کر بیت المقدس اور دمشق پر قابض ہو گئی ہوتی تو فرانس کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی ممکن نہ ہوتی۔

یہی اسباب تھے جن کی بنا پر بڑی بڑی متحارب قوتوں کے لیڈروں نے یہ باور کر لیا تھا کہ ۱۹۱۸ء کی جنگ نہایت گمبھیر بھی ہو گی اور فیصلہ کن بھی! نئے نئے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسعت

دینے کی غرض سے جرمنی نے دس لاکھ سے زیادہ فوجی مشرقی محاذ پر پہنچا دیے تھے۔ بولشویک انقلاب پسندوں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف مارچ ۱۹۱۸ء میں بریسٹ' لیٹوویسک کے صلح نامے کے موقع پر کیا تھا۔ اس کے برعکس لیوڈن ڈورف نومبر۱۹۱۷ء ہی سے ہر ماہ دس ڈویژن فوج مغربی محاذ پر بھیج رہا تھا۔ جب مارچ ۱۹۱۸ء کے آخری ہفتے میں جرمن حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس وقت انگلستان و فرانس کی اتحادی فوجوں کے مقابلے میں اس کے پاس تیس ڈویژن فوج زائد تھی۔ اسے صرف یہی برتری حاصل نہ تھی بلکہ بروچ مولر اور دیگر جرنیلوں نے جرمنی کے متعدد فوجی یونٹوں کو "طوفانی دستہ" نامی تکنیک میں تربیت دی تھی۔ اگر وہ اتحادی فوجوں کی صف میں دراز پیدا کر دیتے اور انھیں پیرس اور انگلش چینل کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیتے تو جنگ کی تاریخ میں یہ بہت بڑی فتح کہلاتی۔ لیکن ایسے اقدامات میں خطرات بھی مضمر تھے۔ لیوڈن ڈورف تھا اس جنگ کے لیے جرمنی کے تمام بچے کھچے وسائل کو مصرف میں لا رہا تھا۔ رزمیہ لحاظ سے یہ ایک جوئے کی مانند تھا یعنی "یا سب کچھ یا پھر کچھ نہیں" اس تمام شور و غوغے کے پس منظر میں جرمنی کی اقتصادی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں اس کی صنعتی پیداوار کی شرح ۵۷ فیصد کم ہو گئی تھی۔ اس ملک میں زراعت کو پہلے سے کہیں زیادہ نظر انداز کر دیا گیا تھا اور رہی سہی کسر موسم کی خرابی نے نکال دی تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ عوام میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مال برداری کرتے کرتے ریلوے کے ڈبے اور انجن اس قدر خستہ ہو چکے تھے کہ اب وہ مشرقی علاقوں سے خام مال مطلوبہ جگہ پہنچانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ لیوڈن ڈرف نے مغربی محاذ پر جو ۱۹۲ ڈویژن فوج تعینات کی تھی ان میں ۵۶ کو "حملہ آور ڈویژن" سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہ بات دراصل حقیقت کو چھپانے کے مترادف تھی۔ دراصل فوجی سازوسامان اور اسلحہ کا اسٹاک تقریباً ختم ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس ڈویژن کو اہمیت دے کر محدود جنگی سامان استعمال کرنے کا مجاز ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ ایک طرح کی بازی تھی اور فوج کے اعلیٰ افسران اسے جیتنے کا پورا یقین رکھتے تھے۔ اگر حملہ ناکام ہو جاتا ہے تو جرمنی کے سارے وسائل اس وقت تک ختم ہو چکے ہوتے اور ایسے وقت میں امریکہ' فرانس میں اپنے تین لاکھ فوجی دستے ہر ماہ بھیج رہا ہوتا۔ پھر اتحادیوں کے بدرستے "یوبوٹ" کے حملے کو ناکارہ بنا رہے ہوتے۔

جنرل لیوڈن ڈروف کو ابتدا میں کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں وہ برطانیہ کی پانچویں ڈویژن فوج کو تباہ کر چکا تھا۔ اس نے فرانسیسی اور برطانوی فوج کے درمیان گویا پچر ٹھونک دیا تھا۔ پھر جولائی ۱۹۱۸ء میں تو وہ پیرس سے محض ۳۷ میل دور تک پہنچ گیا تھا۔ اس صورت حال سے اتحادی طاقتیں ہراساں ہو گئی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے فوچ کو مغربی محاذ پر تعینات جملہ سپاہ کا نگران اعلیٰ بنا دیا تھا۔ پھر انگلستان' اٹلی اور مشرق قریب سے تازہ فوجی کمک پہنچ رہی تھی۔ بہرحال اتحادی ملکوں کے لوگ در پردہ سمجھوتہ کر لینے کے لیے فکر مند تھے۔ ادھر جرمنی نے اپنے آپ کو بہت زیادہ پھیلا رکھا تھا اور دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کی بجائے حملہ آور ہونے کو ترجیح دی۔ چنانچہ اس اقدام کے مضمرات کا اسے سامنا کرنا پڑا۔ اس نے پہلی مرتبہ برطانوی سیکٹر پر دو شدید حملے کیے۔ اس کے نتیجے میں برطانیہ کے ۲۴۰۰۰۰ اور فرانس کے ۹۲۰۰۰ فوجی جاں بحق ہوئے۔ لیکن جرمنوں کے اپنے جانی نقصانات ۳۴۸۰۰۰ فوجی جوانوں سے کم نہ تھے۔ جولائی تک جرمنی کے ۹۷۳۰۰۰ افراد لقمہ اجل بن چکے تھے اور دس لاکھ سے زیادہ مریض بن چکے تھے۔ پھر اکتوبر تک تو یہ حالت ہوئی کہ مغربی محاذ پر جرمنی کے کل ۲٫۵ ملین فوجی موجود تھے۔ ایسے میں نئی بھرتی کا سلسلہ حوصلہ شکن تھا۔ جولائی کے وسط سے اتحادیوں کی حالت بہتر ہونے لگی۔ اپنے تازہ دم سپاہیوں اور توپ' ٹینک اور جنگی ہوائی جہازوں کی

بدولت انھیں برتری حاصل ہو گئی۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ' امریکہ اور فرانس کی فوجوں نے جرنیل فوج کی سرگرمی میں بھرپور حملہ شروع کر دیا تاکہ جرمنی کے کمزور فوجیوں کو سستانے کا موقع نہ مل سکے۔ انھی دنوں اپنی فوجی برتری اور جم کر لڑنے کی صلاحیت کی بدولت اتحادیوں کو شام' بلغاریہ اور اٹلی میں شاندار کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ ستمبر/اکتوبر ۱۹۱۸ء میں اعصاب زدہ لیوڈن ڈروف کو ایسا محسوس ہوا جیسے پورا جرمن بلاک زمین بوس ہو رہا ہے۔ محاذ جنگ پر شکست ہو جانے کی وجہ سے اندرون ملک بے چینی اور بغاوت کی لہر دوڑ گئی۔ ان تمام باتوں کے نتیجے میں ہزیمت' انتشار اور سیاسی افراتفری جرمنی کا مقدر بن گئی۔ نہ صرف جرمنی فوجی بازی ہار گئے بلکہ یورپ کا پرانا نظام بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

میدان جنگ اور گھروں میں انفرادی لحاظ سے نقصان رنج و غم اور تباہی و بربادی کا ساں پیدا ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کا سانحہ یورپ کے تہذیب و تمدن اور روئے عالم پر اس کے اثرات کے لیے خود پروانہ اجل تھا۔ اس صورت حال میں مزید ایک گوشوارہ (نمبر۲۵) پیش کرنا کچھ عجیب سا محسوس ہو گا۔ دراصل اس کا مقصد اوپر بیان کیے ہوئے واقعات کا اظہار ہے: یعنی مرکزی طاقتوں کو بہت سی سہولتیں میسر تھیں---- اندرون ملک بہتر مواصلاتی نظام تھا۔ جرمن فوج کی کارکردگی اعلیٰ درجے کی تھی۔ بہت سے علاقے اس کے قبضے میں آ چکے تھے اور ان سے فوائد بھی حاصل کیے جا رہے تھے۔ روس تنہا رہ گیا تھا پھر اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان کی وجہ سے اقتصادی بدحالی اور متحرک فوج کے نقائص کالعدم نہیں ہو گئے تھے۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں جرنیل لیوڈن ڈروف با صلاحیت اور تنومند فوجیوں کے فقدان کی وجہ سے جس طرح مضطرب تھا اس سے فوج میں عدم توازن کا پتہ چلتا تھا۔ لہذا جرمنی کے ہراول دستے کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اتحادیوں کے فوجی یونٹ کس قدر مراعات یافتہ ہیں' انھیں ہر طرح کی سہولت میسر ہے۔ اس کے برعکس اسی سال موسم بہار میں جرمن سپاہ ان تمام ضروری اشیاء کے لیے ترسنے لگی۔ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہاں پیداوار میں خاصا عدم توازن قائم تھا۔

یہ دعویٰ کرنا سراسر غلط ہو گا کہ پہلی جنگ عظیم کے نتائج کا فیصلہ قبل ازیں کر لیا گیا تھا۔ یہاں جو شواہد پیش کیے جا رہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران اقتصادی اور صنعتی ترقی ساتھ ساتھ فروغ پا رہی تھیں اور ہر اتحادی فریق کو مختلف محاذ پر فوجی قوتیں حاصل تھیں۔ نیز دونوں فریقوں میں ابتداً ایک دوسرے کو زچ کرنے کی صلاحیت جنگ میں اٹلی کی غیر موثر شمولیت' روس کا رفتہ رفتہ زوال' اتحادیوں کی کاروائی کو موثر بنانے کے لیے امریکہ کی مداخلت اور مرکزی طاقت کا بالآخر انہدام---- یہ سارے عوامل ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ یہ بات یقینی ہے کہ جرنیل اب بھی اپنی فوج کی غلط یا صحیح قیادت کرتے تھے' دشمنوں کے مورچوں پر حملہ کرنے کے لیے فوج کو اب بھی جوش و جذبے کی ضرورت پڑتی تھی اور جہاز رانوں کو اب بھی سمندری جنگ کے نتائج برداشت کرنے پڑتے تھے۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اوصاف اور ذہانت دونوں طرف موجود تھی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد خصوصی طور پر اگر کسی فریق کو بالادستی حاصل تھی تو وہ پیداوار کا شعبہ تھا۔ ماضی میں مشترکہ طور پر لڑی جانے والی طویل جنگوں میں یہی عنصر فتح و نصرت کی ضمانت بنتا تھا۔

جدول نمبر۲۵: جنگ کے اخراجات اور مجموعی متحرک فوجیں

(۱۹۱۳ء --- ۱۹۱۹ء)

		جنگ کے اخراجات ۱۹۱۳ء کے نرخناے میں (بلین ڈالر)	مجموعی متحرک فوجیں (ملین میں)
۱۔	سلطنت برطانیہ	۲۳٫۰	۹٫۵
۲۔	فرانس	۹٫۳	۸٫۲
۳۔	روس	۵٫۴	۱۳٫۰
۴۔	اٹلی	۳٫۲	۵٫۶
۵۔	ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۷٫۱	۳٫۸
۶۔	دیگر اتحادی ممالک ☆	۰٫۳	۲٫۶
۷۔	مجموعی اتحادی ممالک	۵۷٫۷	۴۰٫۷
۱۔	جرمنی	۱۹٫۹	۱۳٫۲۵
۲۔	آسٹریا۔ ہنگری	۴٫۷	۹٫۰
۳۔	بلغاریہ' ترکی	۰٫۱	۲٫۸۵
۴۔	مجموعی مرکزی طاقتیں	۲۴٫۷	۲۵٫۱۰

☆ بلجیم۔ رومانیہ۔ پرتگال۔ یونان۔ سربیا

٦

دو قطبی دنیا کا وجود اور درمیانی درجے کی طاقتوں کا بحران

حصہ دوم۔۔ ۱۹۱۹ء ۔۔ ۱۹۴۲ء

جنگ کے بعد کا عالمی نظام

۱۹۱۹ء کے اوائل میں بڑی اور چھوٹی طاقتوں کے سیاست دان پیرس میں اکٹھے ہوئے تاکہ صلح کی بات کر سکیں۔ ان کے سامنے کئی ایسے مسائل تھے جو ۱۸۵۶ء' ۱۵-۱۸۱۴ء اور ۱۷۶۳ء میں ان کے پیش رووں کو درپیش معاملات سے زیادہ گھمبیر تھے۔ ۲۸۔ جون ۱۹۱۹ء کو ورسیلز کی صلح کے مطابق بہت سے امور طے ہو گئے تھے۔ تاہم مشرقی یورپ میں انتشار کی کیفیت برقرار تھی۔ لسانی گروہ اپنی اپنی ریاستیں قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ روس میں خانہ جنگی کی فضا قائم تھی۔ ادھر ترکی کے قوم پرست افراد ایشیائے کوچک کی تقسیم پر رد عمل کا اظہار کر رہے تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر بہت سے مسائل ۱۹۲۰ء تک حل نہیں ہو سکے تھے بلکہ بعض معاملات تو ۱۹۲۳ء میں نمٹائے گئے تھے۔ یہاں ہمارا مقصد یہ ہے کہ جملہ سمجھوتوں کا بالاستیاب مطالعہ کیا جائے۔

یورپ میں حیران کن تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ اب ہیسبرگ' رومانیہ اور ہیونزولر جیسی قدیم سلطنتوں کی جگہ پولینڈ' چیکوسلواکیہ' آسٹریا' ہنگری'یوگوسلاویہ' فن لینڈ' ایستونیا' لٹویا اور لیتھونیا جیسی ریاستیں عالم وجود میں آ گئی تھیں۔ اگرچہ جرمنی کو لسانی گروہ کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں منقسم ہو جانا پڑا اور سوویت روس اور منتشر شدہ آسٹریا۔ ہنگری سلطنت کے مقابلے میں یہ زیادہ نقصان میں رہا۔ لیکن اس کی طاقت دیگر وجوہات کی بناء پر بھی کمزور ہو گئی تھی۔ مثلاً" الساک۔ لورین کا علاقہ دوبارہ فرانس کے قبضے میں چلا گیا' بلجیم اور ڈنمارک کے ساتھ سرحدوں کی نئی تقسیم' رھائن لینڈ پر اتحادیوں کا قبضہ' سارلینڈ کی معیشت سے اہل فرانس کا ناجائز استفادہ' فوجی محکمے میں نامناسب تبدیلی یعنی مختصر فوج اور ساحلی علاقے کی حفاظت کے لیے بحریہ۔ نہ ہوائی فوج' نہ ٹینک نہ سب میرین' پروشیا کے جنرل اسٹاف کی برطرفی! پھر جنگ کے تاوان کا بل! اس پر مستزاد یہ کہ جرمنی کی وسیع نو آبادیات برطانیہ' خود مختار حکومتوں اور فرانس کے قبضے میں چلی گئیں۔ اسی طرح مشرق قریب میں ترکی کی مقبوضات بھی برطانیہ اور فرانس کی ملکیت ہو گئیں۔ ان سب کی نگرانی بہت دور بیٹھی لیگ آف نیشنز کرتی تھی۔ ادھر مشرق بعید میں جرمنی کے مجموعہ ہائے جزائر واپس ان کے وارث جاپان کو مل گئے۔ البتہ اس نے ۱۹۲۲ء میں شنٹونگ چین کو لوٹا دیے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں واشنگٹن میں جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی' اس میں شامل طاقتوں نے بحرالکاہل اور مشرق بعید میں اسٹیٹس کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ متعلقہ فارمولا کے تحت ان کے بحری بیڑے کے سائز کو کم کیا جائے۔ اس طرح انگلستان' امریکہ اور جاپان میں بحری مسابقت پیدا ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشرق و مغرب میں ۱۹۲۰ء کے اوائل میں عالمی نظام مستحکم ہو گیا تھا۔ اب جو بھی دشواریاں رہ گئی تھیں یا مستقبل میں پیش آنے والی تھیں' انھیں لیگ آف نیشنز حل کرنے والی تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے انحراف کے باوجود لیگ کا اجلاس جنیوا میں نہایت باقاعدگی سے ہوتا تھا۔

۱۹۲۰ء کے بعد امریکہ نے اچانک سفارتی سطح پر اپنی دلچسپیاں محدود کر دیں اور الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دی۔ یہ گویا عالمی طاقت کے اس رجحان کی نفی تھی جو ۱۸۹۰ء کے عشرے سے پروان چڑھ رہا تھا۔ عالمی سیاست کے کرتا دھرتاؤں کو اس دور میں پورا یقین تھا کہ بین الاقوامی منظر پر اگر جرمنی' روس اور

امریکہ غالب نہیں آئیں گے تو اپنے اثرات ضرور مرتب کریں گے۔ لیکن ہوا کچھ اور! اول الذکر کو شکست فاش نصیب ہوئی تھی۔ ثانی الذکر انقلاب کے بعد بکھر چکا تھا۔ پھر بولشویک تحریک کے زیر اثر گوشہ نشین ہو گیا تھا اور آخرالذکر نے جو ۱۹۱۹ء میں دنیا کا انتہائی طاقت ور ملک تھا' سفارتی منظر نامے سے الگ ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۰ء کے عشرے میں اور بعد ازاں فرانس اور برطانیہ سرگرم عمل رہا' اگرچہ پہلی جنگ عظیم سے دونوں کو نقصان پہنچا تھا یا پھر لیگ آف نیشنز کا عمل دخل تھا۔ واضح رہے کہ فرانسیسی اور برطانوی سیاست دان ہی اس لیگ پر حاوی تھے۔ اب آسٹریا۔ ہنگری کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ اٹلی جہاں ۱۹۲۲ء کے بعد مسولینی کے زیر قیادت نیشنل فاسسٹ پارٹی کی حکومت تھی' بڑی حد تک خاموش تھا۔ جاپان بھی ۲۲-۱۹۲۱ء کی واشنگٹن کانفرنس کے فیصلے کے زیر اثر ساکن و جامد نظر آ رہا تھا۔

ایسا لگتا تھا دنیا کی ساری طاقت مرکزی یورپ کے محور پر گھوم رہی تھی۔ اس دور کی سفارت کاری کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فرانس اپنے تحفظ و سلامتی کی تلاش میں سرگرداں تھا تاکہ مستقبل میں اگر جرمنی نے پھر کروٹ لی تو اس کی زد سے دور رہا جا سکے۔ اس وقت اسے انگلستان اور امریکہ کا فوجی تعاون بھی حاصل نہیں تھا کیونکہ امریکی سینٹ نے ورسیلز کے معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ فرانس نے ان سب کا نعم البدل تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس نے مشرقی یورپ میں ایسی ریاستوں کے قیام کی حوصلہ افزائی شروع کر دی جو اصلاحی عمل کے خلاف تھیں' یعنی ۱۹۲۱ء میں چیکوسلواکیہ' یوگوسلاویہ اور رومانیہ کے درمیان ہونے والا نام نہاد اتحاد صغیرا فرانس نے علیحدہ علیحدہ مختلف ریاستوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً" بلجیم (۱۹۲۰ء میں) پولینڈ (۱۹۲۱ء میں) چیکوسلواکیہ (۱۹۲۴ء میں) رومانیہ (۱۹۲۶ء میں) اور یوگوسلاویہ (۱۹۲۷ء میں) بایں ہمہ اس نے بری اور ہوائی افواج بھی بہت بڑی تعداد میں تیار کر لی تھیں اس کا مقصد جرمنی کو دہشت زدہ کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے معاملات میں مداخلت بھی کرنے لگا۔ چنانچہ جب جرمنی نے تاوان جنگ پیش کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا تو فرانس نے ۱۹۲۳ء میں اس سے ٹکر لے لی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انگلستان کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ فرانس کی سرحدوں کے تحفظ کی ضمانت بھی دے۔ چنانچہ اس کی یہ خواہش ۱۹۲۵ء میں صلح لوکارنو سے بالواسطہ طور پر پوری ہو گئی۔ یہ دور مالیاتی لحاظ سے سفارتی سطح پر خاصا دباؤ بڑھا رہا تھا۔ جرمنی کو تاوان جنگ ادا کرنے کا مسئلہ درپیش تھا تو اتحادیوں کو جنگی قرضے واپس کرنے کی فکر دامن گیر تھی۔ چنانچہ فاتح اور مفتوح ممالک میں تعلقات خاصے کشیدہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ امریکہ اور اس کے سابق یورپی اتحادیوں میں بھی بگاڑ کی صورت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۲۴ء میں ڈیوس پلان کے ذریعے جو سمجھوتے ہوئے ان کے تحت یہ مالیاتی بحران خاصا کم ہوا۔ پھر اسی سال مذکورہ پلان کے تحت "صلح لوکارنو" عمل میں آئی۔ اس صلح نامے کی رو سے جرمنی لیگ میں شامل ہو گیا اور ۱۹۲۹ء میں "ینگ پلان" کا مالیاتی سمجھوتہ عمل میں آیا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں یورپ خوشحالی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ عالمی نظام میں لیگ کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ۱۹۲۸ء کے صلحنامہ پیرس کی رو سے متعدد ریاستوں نے مستقبل میں کسی تصیے کو چکانے کے لیے جنگ نہ کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ سفارت کاری اپنے معمول پر آ چکی تھی۔ اسٹریسمین' برائنڈ اور آسٹن چیمبرلینڈ جیسے سیاست دان منظر عام پر آ چکے تھے اور ماضی کے میٹرنخ اور بسمارک کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ یہ سب عالمی معاملات کو حل کرنے کے لیے یورپ کے مختلف مقامات پر اکٹھا ہو رہے تھے۔

مذکورہ موثر حالات کے باوجود ۱۹۱۹ء کے بعد کا بین الاقوامی نظام نصف صدی قبل کی اثر

انگیز صورت حال سے بالکل مختلف اور غیر مستحکم قسم کا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ساڑھے چار سال پر محیط اس عالمی جنگ نے دنیا کی آبادی کو تس نس کر دیا تھا اور اقتصادی حالت دگرگوں کر دی تھی۔ باقاعدہ جنگ میں ۸ ملین افراد ہلاک ہوئے تھے جبکہ ۷ ملین لوگ معذور ہو گئے تھے۔ پھر زخمی ہونے والوں کی تعداد ۱۵ ملین تھی۔ ایسے تمام لوگوں میں زیادہ تعداد ان نوجوانوں کی تھی جو معیشت کے لیے ہر درجہ فعال تھے۔ علاوہ ازیں روس کو چھوڑ کر سارے یورپ میں ۵ ملین آبادی لقمۂ اجل بن گئی۔ یہ سب لوگ جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کا شکار ہوئے تھے' یعنی بیماری' قحط' تنگ دستی اور فوجی مظالم! روس میں یہ جانی نقصان اور بھی زیادہ ہوا تھا۔ دوران جنگ شرح پیدائش میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ اس کی وجہ جنگ میں شمولیت کی وجہ سے مردوں کی گھر میں غیر موجودگی اور اہل خاندان کی غیر مطمئن زندگی تھی۔ آخری بات یہ کہ اگرچہ میدانی جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن بعد از جنگ سرحدوں پر جھڑپیں جاری تھیں اور قتل عام ہو رہا تھا' مثلاً" مشرقی یورپ' آرمیبیا اور پولینڈ میں! پھر جنگ سے متاثر ہونے والے علاقے ۱۹۱۸ء-۱۹ میں انفلوئنزا کی وباء کی لپیٹ میں آ گئے۔ چنانچہ اس مہلک بیماری سے بھی لاکھوں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ غرض اس مدت میں ۶۰ ملین انسان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان ہلاک ہونے والوں میں نصف تعداد روسیوں کی تھی۔ مزید برآں فرانس' جرمنی اور اٹلی بھی بہت زیادہ نقصانات کی زد میں رہے۔ اس عظیم انسانی تباہی کے نتیجے میں ذاتی غم و غصے اور نفسیاتی صدمے کی کیا کیفیت تھی' اس کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ سیاست دانوں سے لے کر کسانوں تک سب ہی اس جنگ سے بے طرح متاثر ہوئے تھے۔

اس جنگ کے نتیجے میں ہونے والے مادی نقصانات کی تو کوئی مثال ہی نہیں ملتی۔ جن لوگوں نے شمالی فرانس' پولینڈ اور سربیا کے تباہ شدہ علاقوں کو بچشم خود دیکھا ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ یہ المیہ کتنا عظیم ہے۔ ہزاروں گھر مسمار ہو گئے' کھیت کھنڈر بن گئے۔ سڑکیں' ریلوے اور تار کی لائنیں تباہ ہو گئیں' مال مویشی ہلاک ہو گئے' جنگلات جل کر خاک ہو گئے اور بغیر پھٹے ہوئے بموں اور سرنگوں کی موجودگی میں زمین کا وافر حصہ کھیتی باڑی کے قابل نہ رہا۔ پھر جہازوں کی تباہی' مواصلات کے بالواسطہ اور بلا واسطہ اخراجات اور متحارب ملکوں کے قرضے بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ غرض مجموعی رقم ناقابل فہم ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ رقم ۲۶۰ بلین ڈالر بنتی ہے جو اٹھارھویں صدی کے اختتام اور پہلی جنگ عظیم کے درمیان لیے جانے والے قرضوں سے ساڑھے چھ گنا زیادہ ہے۔ کئی عشرے کی ترقی کے بعد عالمی پیداوار میں کمی آ گئی۔ ۱۹۲۰ء میں یہ شرح ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں ہنوز ۷ فی صد کم تھی۔ زرعی پیداوار میں بھی ایک تہائی کمی واقع ہو گئی تھی۔ ما قبل جنگ کے مقابلے میں برآمدات کی شرح نصف کے قریب تھی۔ یورپ کی اقتصادی حالت ست روی کا شکار تھی' یعنی وہ ترقی کے معاملے میں آٹھ سال پیچھے چلا گیا تھا۔☆ دیگر ممالک اس سے کہیں زیادہ تباہی کی زد میں تھے۔ ۱۹۲۰ء کی تباہی کے دنوں میں روس کی صنعتی پیداوار ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں گھٹ کر ۱۳ فی صد رہ گئی تھی۔ لیکن جرمنی' فرانس' بلجیم اور مشرقی یورپ کے بعض حصوں میں صنعتی پیداوار ما قبل جنگ کے مقابلے میں ۳۰ فی صد کم تھی۔

☆ کہنا یہ ہے کہ ۱۹۲۹ء میں اس کی جو مجموعی پیداوار تھی' وہ ۱۹۲۱ء میں ہی حاصل ہو چکی ہوتی اگر جنگ نہ برپا ہوتی اور ۱۹۱۳ء سے قبل والی ترقی کی رفتار جاری رہی۔

جنگ عظیم کی وجہ سے جہاں بہت سے معاشرے بے پناہ تباہی کی لپیٹ میں آئے تھے وہاں چند ایک بچ بھی گئے تھے اور بعض نے اپنی حالت بہتر بنا لی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جدید قسم کی یہ جنگ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی صنعتی پیداوار میں افزائش نے مثبت اثرات بھی مرتب کیے تھے۔ اقتصادی اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ان برسوں میں متعدد نوع کی ترقیاں روبہ کار آئی تھیں۔۔۔ مثلاً" آٹوموبائل اور ٹرک کی تیاری' جہاز رانی' تیل کی صفائی اور کیمیکلز' بجلی' رنگ سازی اور فولادی مرکبات کی صنعت' ریفریجریٹر اور کیننگ کی صنعت اور دیگر بہت سی مصنوعات میں!۔ ظاہر ہے ان سہولتوں سے ایسے ممالک نے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے اپنی اقتصادی حالت کو ترقی دی جو محاذ جنگ سے دور واقع تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' جنوبی افریقہ' ہندوستان اور جنوبی امریکہ کے بعض علاقے جنگ میں ملوث یورپ کے صنعتی' خام مال اور غذائی اشیاء کے مطالبات کو پورا کر کے اپنی اقتصادی حالت کو مستحکم کر رہے تھے۔ جیساکہ ماضی میں ہوا کرتا تھا کہ تجارتی نوعیت کی جنگ سے ایک ملک کو تو نقصان پہنچتا لیکن دوسرا فائدے میں رہتا۔ لیکن آخرالذکر کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ جنگ کے اخراجات سے بچا رہتا یا کم از کم اس کے شعلوں سے محفوظ رہتا۔

جدول نمبر۲۶: دنیا کی صنعتی پیداوار کا اشاریہ

۱۹۱۳ء ـــ ۱۹۲۵ء

	۱۹۱۳ء	۱۹۳۰ء	۱۹۳۵ء
دنیا	۱۰۰	۹۳٫۶	۱۳۱٫۶
یورپ☆	۱۰۰	۷۷٫۸	۱۰۳٫۵
روس	۱۰۰	۱۳٫۸	۷۰٫۱
امریکہ	۱۰۰	۱۳۲٫۲	۱۳۸٫۰
دنیا کے بقیہ ممالک	۱۰۰	۱۰۹٫۵	۱۳۸٫۱

دنیا کی صنعتی پیداوار کا یہ گوشوارہ اس حقیقت کو بخوبی واضح کر رہا ہے کہ یورپ اور خصوصاً" روس عالمی جنگ سے کس درجہ متاثر ہوئے تھے جبکہ دوسرے کئی ممالک خاصے فائدے میں رہے تھے۔ بہرحال صنعت و حرفت یورپ سے نکل کر جس طرح امریکہ' جاپان' ہندوستان اور آسٹریا تک پہنچی اور پھر عالمی تجارت میں ان ملکوں نے بڑھ چڑھ کر جو حصہ لیا' وہ فی الحقیقت اس معاشی رجحان کا اظہار تھا جو انیسویں صدی کے اواخر سے فروغ پا رہا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ۱۹۱۳ء سے قبل امریکہ میں ترقی کی جو رفتار تھی اس نے ۱۹۲۵ء میں مجموعی پیداواری لحاظ سے یورپ پر سبقت حاصل کر لی۔ البتہ جنگ کی بدولت

☆ برطانیہ عظمیٰ' فرانس' بلجیم' نیدرلینڈ' جرمنی' ڈنمارک' ناروے' سویڈن' فن لینڈ' سوئزر لینڈ' آسٹریا' اٹلی' چیکوسلواکیہ' ہنگری' پولینڈ' رومانیہ' یونان' اسپین

چھ سال کی مدت میں اس میں خاصی تیزی آ گئی تھی۔ دوسری جانب دیکھیں تو ۱۸۸۰ء اور ۱۹۱۳ء کے دوران رونما ہونے والی تبدیلیوں کے برعکس، دنیا کے اقتصادی توازن میں ایسی تبدیلی کئی عشروں سے عالم امن میں بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی منڈی کی قوتیں اس پر اثر انداز ہوئی تھیں۔ اس کے برعکس جنگ کا آغاز کرنے اور ناکہ بندی کا طریقہ اختیار کرنے والی ایجنسیاں تحکمانہ لہجہ اختیار کیے ہوئے تھیں اور اس طرح انہوں نے عالمی پیداوار اور تجارت کے فطری انداز کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ مثال کے طور پر، جہاز سازی کی استعداد خصوصی طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس وقت بہت زیادہ بڑھ گئی جب جرمن آبدوز سمندروں میں جہازوں کو غرقاب کر رہی تھیں۔ لیکن ۲۰-۱۹۱۹ء کے بعد تو یہ صورت حال ہوئی کہ تمام دنیا میں جہاز کے لنگر انداز ہونے کے لیے خاصی تعداد میں برتھیں موجود تھیں۔ پھر جنگ کے دوران براعظم یورپ میں صنعتی پیداوار میں خاصی کمی آ گئی تھی جبکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ میں اسے بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔ لیکن جب یورپ کے صنعت کاروں نے سنبھالا لے لیا تو پھر ان کی استعداد کی کوئی حد نہ رہی۔ اقتصادیات کا اہم شعبہ زراعت بھی اس مسئلے سے دوچار ہوا۔ دوران جنگ براعظم یورپ میں زرعی پیداوار مرجھا کر رہ گئی تھی اور روس کی ماقبل جنگ غلے کی برآمدات کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس کے برعکس شمالی و جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا میں اناج بہت بڑی مقدار میں پیدا ہو رہے تھے اور آخرالذکر ملک کے کسان آرچ ڈیوک کی موت سے خاصے فائدے میں رہے تھے۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء کے آخری عشرے میں یورپ میں زراعت نے سنبھالا لیا تو پوری دنیا میں غلے کی مانگ کم ہو گئی اور قیمت بھی گر گئی۔ اس قسم کے حالات سے یوں تو تمام علاقے ہی متاثر ہوئے تھے، لیکن مشرقی یورپ کا مرکزی حصہ اس سے کہیں زیادہ ہی متاثر ہوا تھا۔ وہاں کی موروثی ریاستیں نئی سرحدی تقسیم، غیر مستحکم منڈی اور ناقص مواصلات کے مسائل سے دوچار تھیں۔ ورسیلز کی صلح اور نسلی اعتبار سے یورپ کی نئی نقشہ نویسی اقتصادی استحکام کی ضمانت تو نہیں دے سکتی تھی۔

آخری بات یہ کہ جنگ کے اخراجات سے معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ ان متحارب قوتوں میں بہت کم نے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ٹیکس نافذ کیے۔ (برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس فہرست میں شامل نہیں!) اس کے برعکس انہوں نے اس امید پر قرض لینا شروع کر دیا تھا کہ ہارے ہوئے دشمن کو تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا، جیساکہ ۱۸۷۱ء میں فرانس کے ساتھ معاملہ پیش آیا تھا۔ عوامی قرض جسے سونے کا تحفظ حاصل نہیں تھا، بے انتہا بڑھ چکا تھا۔ کاغذی نوٹ سرکاری خزانے سے امنڈتا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس کے باعث چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ جنگ کی وجہ سے جو اقتصادی بحران اور علاقائی چھینا جھپٹی ہوئی تھی، اس کے پیش نظر کوئی یورپی ملک بھی ۱۹۱۹ء میں امریکہ کے معیار طلا کی روایت کو اپنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ لچک دار قسم کی زری اور مالیاتی پالیسی کی وجہ سے افراط زر میں شدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ وسطی اور مشرقی یورپ میں اس کے مضر اثرات مرتب ہوئے۔ برآمدات کو فروغ دینے کے لیے ملکی کرنسی میں تخفیف کی گئی جس سے مالیاتی عدم استحکام بھی پیدا ہوا اور سیاسی چپقلش نے بھی جنم لیا۔ اس پر مستزاد اتحادیوں کے آپس کے قرض اور جرمنی سے فاتح ممالک (خصوصاً" فرانس) کے تاوان جنگ ادا کرنے کے مطالبات جیسے گمبھیر مسائل تھے۔ یورپ کے زیادہ تر اتحادی برطانیہ کے مقروض تھے۔ ان پر فرانس کا قرض کچھ کم تھا۔ لیکن مذکورہ دونوں طاقتیں امریکی قرض میں بری طرح جکڑی ہوئی تھیں۔ بولشویک نے ۳ء۶ بلین ڈالر کے روسی قرض کی صاف تردید کر دی تھی۔ امریکہ اپنی

رقم واپس مانگ رہا تھا۔ فرانس، اٹلی اور دیگر ممالک قرض ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھے تاوقتیکہ انہیں جرمنی سے تاوان جنگ نہ مل جائے۔ ادھر جرمنی یہ اعلان کر رہا تھا کہ اس کے لیے اس رقم کی ادائیگی ممکن نہیں! چنانچہ برسوں کشیدگی کی فضا قائم رہی۔ اس کے نتیجے میں مغربی یورپ اور امریکہ کے درمیان سیاسی تعلقات میں خلا سا پیدا ہو گیا۔

گرچہ ۱۹۲۴ء میں ڈیوس پلان کی وجہ سے مذکورہ کشیدگی میں کمی آ گئی تھی، لیکن اس قصے کے سیاسی اور سماجی اثرات خاصے گمبھیر تھے، خصوصاً" ایک سال قبل جرمنی کے شدید افراط زر کی وجہ سے! بایں ہمہ جو بات خطرے کی تھی اور جسے اس وقت محسوس نہیں کیا گیا تھا وہ یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء کے وسطی عشرے میں عالمی معیشت کا استحکام ایسی کمزور بنیادوں پر استوار تھا جو پہلی جنگ عظیم سے قبل کی اساس سے بالکل مختلف تھیں۔ اگرچہ اس وقت بعض ممالک میں معیار طلا کو برقرار رکھا گیا تھا، لیکن ۱۹۱۳ء سے قبل بین الاقوامی تجارت اور ترسیل زر جس طرح لندن پر منحصر تھی، وہ بات اب نہیں رہی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لندن نے اپنا یہ مقام حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ اس نے ۱۹۲۵ء میں بدل پذیر اسٹرلنگ کی شرح بھی ماقبل جنگ جیسی رکھی تھی یعنی ۱ پونڈ= ۴ء۸۶ ڈالر! لیکن اس سے برطانیہ کے برآمد کنندگان کو بہت زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بیرون ملک قرضہ دینے کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ بہرحال ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان عالمی مالیات کا مرکز اب بحراوقیانوس کے پار منتقل ہو چکا تھا کیونکہ یورپ بین الاقوامی لحاظ سے بہت زیادہ مقروض ہو چکا تھا اور امریکہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا لین دین کرنے والا ملک بن چکا تھا۔ دوسری طرف امریکہ کا اقتصادی نظام بالکل مختلف تھا۔ وہاں بیرونی تجارت پر انحصار کم تھا۔ پھر عالمی معیشت سے کم سے کم ربط تھا۔ تامین پسند زراعت کی طرف زیادہ راغب تھے نہ کہ آزاد تجارت کی جانب! پھر وہاں بینک آف انگلینڈ کے پائے کے بینک کی کمی تھی۔ چنانچہ وہاں تجارتی کاروبار میں اتار چڑھاؤ جاری رہتا۔ ایسے میں سیاست دانوں پر وطن پرست حلقوں کا براہ راست اثر قائم تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کا مالیاتی اور کاروباری نظام ایک متلون اور ناقص سے محور پر گردش کر رہا تھا۔ اب کوئی ایسا دائن نہیں تھا جو عالمی اقتصادی نظام کی ترقی کی خاطر طویل المیعاد قسم کا قرضہ فراہم کرے اور بین الاقوامی کھاتے میں عارضی طور پر پیدا ہونے والی تفریق کو دور کر دے۔

جب ۱۹۲۰ء کی آخری دہائی میں یورپی حکومتوں کو قلیل المیعاد قرض دینے کے سلسلے میں امریکی ڈالر کی بے پناہ ترسیل شروع ہوئی تو ہر ایک ملک بہ رضا و رغبت زیادہ سے زیادہ سود ادا کرنے پر تیار تھا، اس لیے کہ ملک کی ترقی اور ادائیگی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے فنڈ کی شدید ضرورت تھی۔ قلیل المیعادی قرض کو طویل المیعاد منصوبوں پر خرچ کیا جانے لگا۔ وسطی اور مشرقی یورپ میں زراعتی شعبے میں کثرت سے سرمایہ کاری کی جانے لگی۔ چنانچہ کھیتوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ پھر قرض کا معاوضہ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا چونکہ برآمدات کے ذریعے ان کی ادائیگی ممکن نہ تھی، لہٰذا مزید قرض لینے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء کے موسم گرما میں یہ نظام ٹوٹنے پھوٹنے لگا۔ تب امریکہ کی ملکی گرم بازاری اور فیڈرل ریزرو کی سود کی شرح میں اضافے کے سبب سرمایہ کی ترسیل خاصی کم ہو گئی۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں وال اسٹریٹ کی اس گرم بازاری کے خاتمے اور امریکی قرض میں مزید کمی کے باعث مسلسل رد عمل کی تحریک پیدا ہوئی جس پر کنٹرول کرنا ممکن نہ رہا۔ حاضر قرض کی عدم موجودگی کے باعث سرمایہ کاری اور صرف دونوں میں کمی آ گئی۔ صنعتی ممالک میں طلب کی کمی سے وہاں کے صنعت کاروں

کو غذائی اشیاء اور خام مال کی فراہمی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ زیادہ سے زیادہ مال بیچنے لگے، لیکن انھیں اس کی صحیح قیمت نہیں مل پائی۔ چنانچہ اپنے مال کے بعد ان کے لیے دیگر مصنوعات خریدنا ممکن نہ رہا۔ تفریط زر' طلا کا بحران' تخفیف قدر زر' تجارت اور سرمائے پر پابندی' بین الاقوامی قرض کی عدم ادائیگی ــــــ اس زمانے کی یہ مختلف کیفیتیں تھیں۔ تجارت اور لین دین کے عالمی نظام پر ان سب میں مضر اثرات رونما ہوئے۔ امریکی کسانوں کو مدد فراہم کرنے کے سلسلے میں بہت بڑے تامین پسند اسموٹ اور ہالے نے جو نرخنامہ بنایا تھا اسے ایک ایسے ملک نے منظور کیا تھا جو تجارتی سامان میں خود کفیل تھا۔ چنانچہ دوسرے ملکوں کے لیے ڈالر کا حصول اور زیادہ مشکل ہو گیا۔ ایسی صورت حال کا نتیجہ انتقامی کاروائی اور مال کی ضبطی تھی۔ چنانچہ امریکی برآمدات کو بے پناہ نقصان پہنچا۔ ۱۹۳۲ء کے موسم گرما میں بہت سے ملکوں میں صنعتی پیداوار ۱۹۲۸ء کے مقابلے میں آدھی تھی۔ پھر عالمی تجارت سکڑ کر ایک تہائی ہو گئی تھی۔ یورپ کی تجارتی قدر جو ۱۹۲۸ء میں ۵۸ بلین ڈالر تھی۔ وہ ۱۹۳۵ء میں گھٹ کر ۲۰۰۸ بلین ڈالر رہ گئی۔ یہ ایسا زوال تھا جس کی زد میں جہاز رانی' جہاز سازی' بیمہ کاری وغیرہ آ گئیں۔

اس وقت عالمی سطح پر جو بحران اور اس کے نتیجے میں بیروزگاری کا مسئلہ درپیش تھا' اس کے مضمرات سے بین الاقوامی سیاست محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ مصنوعات' خام مال اور غذائی اشیاء میں شدید مسابقت کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ اس سے قومی سطح پر بے چینی کی فضا قائم ہو گئی۔ چنانچہ ہر حلقہ انتخاب نے اپنے اپنے سیاست داں پر دباؤ ڈالا کہ وہ غیر ملکیوں کی ادائیگی کی کوشش سرانجام دے۔ دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں نے معاشی عدم استحکام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آزاد سرمایہ دارانہ نظام پر سخت تنقید کی اور اس بات پر زور دیا کہ قطعی طور پر قومی قومیت کی پالیسیاں وضع کی جائیں اور اگر ضرورت پڑے تو بزور شمشیر ان کا دفاع کیا جائے۔ کمزور قسم کے جمہوری ملکوں خصوصاً" جرمنی' اسپین' رومانیہ وغیرہ میں سیاست آمیز اقتصادی نظام کا خاصا دباؤ تھا۔ جاپان میں قدامت پرست حکمرانوں کو قومیت کے حامی اور فوجی افسران نے ایک طرف کر دیا تھا۔ اگر مغرب میں جمہوری نظام برقرار رہ گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے سیاست دانوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ ملک کی اقتصادی حالت بہتر بنانے پر توجہ دیں اور اپنے پڑوسی کو کنگال کر دینے کے رویے کو اپنائیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور فرانس کے پاس کافی مقدار میں سونا موجود تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی مقروض ریاستوں کا قرضہ معاف کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے برعکس فرانس نے اپنی مالی طاقت کی بدولت جرمنی کے طور طریقے پر کنٹرول قائم کرنا چاہا (کیونکہ اس سے رھائن کی دوسری جانب انتشار پھیل چکا تھا) وہ یورپ میں اپنی سفارت کاری کو بھی مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ جرمنی کے ذمے تاوان جنگ کے سلسلے میں ہوورنے باقاعدہ التوائے قرض کا اعلان کیا تھا۔ اس سے فرانس کو سخت اشتعال پیدا ہوا تھا۔ بہرحال مذکورہ معاملے کو قرض میں کمی کر دینے ورنہ نادہندگی کے باعث جرمانہ عائد کرنے کے معاملے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امریکی اس بات سے اور بھی چڑ گئے۔ تخفیف قدر زر میں مقابلہ آرائی کے رجحان اور ۱۹۳۳ء میں عالمی اقتصادی کانفرنس میں پاؤنڈ اسٹرلنگ کے بارے میں اختلاف رائے ظاہر ہو جانے کے باعث یہ منظر اور بھی تاریک ہو گیا۔

اس وقت تک دنیا کا نظام کئی متحارب یونٹوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک اسٹرلنگ بلاک تھا جو برطانیہ کے تجارتی طریق کار پر استوار تھا۔ ۱۹۳۲ء کی اٹاوہ کانفرنس کی شہنشاہی ترجیحات سے یہ مملو تھا۔ دوسرا طلائی بلاک تھا۔ اس کی قیادت فرانس کو حاصل تھی۔ ادھر مشرق بعید میں ین بلاک تھا جو جاپان کے زیر نگیں تھا۔ امریکہ کی سرپرستی میں قائم ایک ڈالر بلاک تھا (روز ویلٹ کے بعد یہ طلائی بلاک بھی بن گیا تھا) ان سب کے برعکس روس میں سوشلزم کا رجحان آہستہ آہستہ فروغ پا رہا تھا۔ ادھر جرمنی میں خود کفالتی کا نظریہ قائم تھا۔ یہ بہت کچھ فروغ پا چکا تھا جب ہٹلر نے خود کفیل اور ہزار سالہ شہنشاہیت کا منصوبہ بنایا تھا جس میں غیر ملکی تجارت مخصوص اشیاء اور بدل بیوپار تک محدود تھی۔ فرانس اینگلو سکسن طاقت پر اس لیے معترض تھا کہ جرمنی نے تاوان جنگ ادا کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا تھا۔ ادھر روز ویلٹ کا کہنا تھا کہ برطانیہ کے ساتھ معاملہ کرنے میں امریکہ کو ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا ہے اور پھر نیویل چیمبرلین اپنے اس پرانے قول پر اب بھی مصر تھا کہ "امریکہ کی ساری پالیسی محض زبانی جمع خرچ ہے" ۱۹۱۹ء کے اس پر عیب عالمی نظام میں جو عناصر علاقائی تبدیلیاں لانے پر مصر تھے' ان سے بخوبی نمٹنے کے لیے کسی بھی شخص کے دماغ میں جمہوری طرز عمل موجود نہ تھا۔

قدیم دنیا کے سیاست دان اور دفتر خارجہ اقتصادی مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے میں ہمیشہ مشکلات سے دو چار رہے تھے۔ لیکن اس سے بد تر صورت حال انیسویں صدی میں کابینہ کی طرز سفارت کاری میں تھی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے عشرے میں بین الاقوامی امور پر عوام کی رائے موثر سمجھی جاتی تھی۔ ویسے یہ اقدام بعض صورتوں کے پیش نظر ناگزیر تھا۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل یورپ کی سیاسی جماعتیں "قدیم طرز سفارت کاری" کے پر اسرار تعلق اور حکمرانوں کے نظریئے کی حامی ہونے پر تنقید کرتی رہی تھیں۔ وہ مروجہ سسٹم میں اصلاح چاہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری معاملات عوام اور ان کے نمائندوں کی جانچ پڑتال کے لیے سامنے آنے چاہئیں۔ ۱۹۱۴ء۔۱۸ کے قضیے کے دوران مذکورہ مطالبے کو خاصی تقویت ملی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں: (۱) اس مطالبے کے حامی جو معاشرے کو مجموعی طور پر متحرک دیکھنا چاہتے تھے یہ باور کر رہے تھے کہ عوام اپنی دی گئی قربانیوں کا معاوضہ بھی چاہیں گے اور دوران امن کچھ کہنے کا حق بھی رکھیں گے۔ (۲) یہ جنگ جو اتحادیوں کے پروپیگنڈہ کرنے والوں کے مطابق جمہوریت اور قومی اعزاز کی خاطر شروع کی گئی تھی' اس نے مشرق وسطی یورپ کی استبدادی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ (۳) ووڈرو ولسن کی طاقتور اور موثر شخصیت ایک نئے اور روشن خیال عالمی نظام کی تشکیل پر زور دے رہی تھی جبکہ کلیمنسی اور لائیڈ جارج مکمل فتح کی ضرورت کا اعلان کر رہے تھے۔

لیکن ۱۹۱۹ء کے بعد عوامی خیال کے ضمن میں جو مسئلہ پیدا ہو گیا تھا' وہ یہ تھا کہ مختلف طبقے گلیڈسٹون اور ولسن کے نظریئے کے حامل آزاد خیال' تعلیم یافتہ اور کھلے ذہن کے لوگوں کی طرح نہیں تھے اور نہ ہی ان میں بین الاقوامی سطح کی سوچ' مثبت رجحان اور قانون فطرت کا پاس و لحاظ تھا۔ جیسا کہ آرنو میئر کی رائے ہے "قدیم فن سفارت ہی جنگ عظیم کا سبب بنا ہے (اور یہی لوگوں کی رائے بھی ہے) اسے ۱۹۱۷ء کے بعد نہ صرف ولسن کے نظریئے کے حامل مصلح افراد نے چیلنج کیا تھا بلکہ بولشویک نے بھی اس

پر تنقید کی تھی۔۔۔۔ یہ ایسی با اصول تنقید تھی جسے دونوں متحارب کیمپ کے مزدوروں نے سراہا تھا۔ اس کے نتیجے میں لائیڈ جارج جیسے سیاست دانوں نے ترقی پسندانہ ملکی و غیر ملکی منصوبوں کا "پیکج تیار کیا" ولسن کی اپیل کو غیر جانب دار قرار دیا اور سوشلزم کی جانب مزدوروں کے میلان کو روکا۔ اتحادی کیمپ کے قدامت پرست اور محب الوطن افراد پر اس کے مختلف اثرات مرتب ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ ملکی تحفظ کے پیش نظر ولسن کے اصول و نظریات کو یکسر کالعدم قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس سرحدی "سمجھوتے" نو آبادیات کے قبضے اور تاوان جنگ کے ذریعے تحفظ کا مسئلہ حل کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ لینن کی دھمکی کو جو خوف و ہراس کی فضا پیدا کر رہی تھی' نہ صرف بولشویک کے مرکزی علاقے میں بلکہ مغرب میں آبسنے والے روسیوں کے درمیان بھی پوری شدت سے فت ربود کر دیا جائے۔ بادی النظر میں یوں کہیے کہ امن و آشتی کی فضا قائم کرنے کے لیے سیاست اور سفارت کو نظریاتی اور ملکی پس منظر میں اس طرح روبہ کار لایا جا رہا تھا جس سے ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۸ء کی کانگریس نا آشنا تھی۔

اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ مغربی جمہوریت میں "پہلی جنگ عظیم" کے متعلق یہی تاثر ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے تک قائم تھا کہ یہ موت' تباہی' خوف و ہراس' بربادی اور سعی لاحاصل کا پیش خیمہ تھی۔ پھر ۱۹۱۹ء کے کار تصیح کا معاہدہ عوام کی قربانیوں کے بدلے میں معاوضے کی حسب وعدہ ادائیگی میں کمی' لاکھوں محب وطن اپاہج افراد اور بیوائیں' ۱۹۲۰ء کے عشرے کا اقتصادی بحران' عہد وکٹوریہ کے سماجی اور انفرادی تعلقات پر اعتماد کی کمی۔۔۔۔ ان تمام باتوں کا سبب جولائی ۱۹۱۴ء کے احمقانہ فیصلے کو قرار دیا جاتا ہے۔ جنگ و جدال اور فوجی اقدامات سے لوگ وسیع پیمانے پر بدظن تھے۔ پھر بھی بہت سے حلقوں میں امید کی یہ شمع جل رہی تھی کہ لیگ آف نیشنز اس قسم کی تباہی کے اعادے کو ناممکن بنا دے گی۔ لیکن جنگ میں شمولیت اختیار کرنے والے تمام تر ممالک کی سوچ ایسی قطعا" نہ تھی۔۔۔۔ حالانکہ انگلستان اور امریکہ کا ادب جنگ کے خلاف تاثر ابھار رہا تھا۔ محاذ جنگ پر جانے والے لاکھوں سپاہی بیروزگاری' افراط زر اور لڑائی کے بعد پیدا ہونے والے بورژوائی نظام کی بوریت کا شکار تھے۔ ان کے خیال میں یہ جنگ افسردگی کا مظہر ضرور تھی' لیکن مثبت پہلو بھی رکھتی تھی۔ فوجی اقدار' سپاہیوں کی اولوالعزمی' حربی جوش و خروش اور عملی اقدام! ایسے لوگ خصوصی طور پر جرمنی اور ہنگری جیسے مفتوح ممالک' اٹلی جیسے فاتح لیکن غیر مطمئن ملک اور فرانس کے دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نظر میں فاشتی تحریک اور اس کی خصوصیات' نظم و ضبط' قومی وقار' بولشویک اور یہودیوں کی تباہی' ذہانت کا زوال اور متوسط درمیانی طبقے کی خوشحالی و آزادی بے حد موثر تھیں۔ ان کی نظر میں' نیز ان کے ہم خیال جاپانیوں کی نظر میں جدوجہد' طاقت اور ہیرو ازم ہی دراصل زندگی کی اہم خصوصیات تھیں۔ ولسن کی بین الاقوامیت کے اصول و نظریات لغو اور دور ازکار تھے۔

ان سب باتوں کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے عشرے میں نظریات کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں پیچیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ پھر عالمی معاشرہ سیاسی دھڑے بندیوں میں تقسیم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں اقتصادی درجہ بندی کا عمل شروع ہو گیا۔ ایک طرف تو مغربی جمہوریتیں تھیں' خصوصا" انگریزی بولے جانے والے علاقے میں جہاں لوگ پہلی جنگ عظیم کے خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔

یہ تمام افراد ملکی مسائل کی جانب توجہ مبذول کیے ہوئے تھے اور دفاعی تنصیبات کو بڑے پیمانے پر ختم کر رہے تھے۔ اگرچہ فرانس' جرمنی کے دوبارہ سنبھل جانے کے خوف سے اب بھی بڑی تعداد میں بری اور ہوائی فوج رکھے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے زیادہ تر عوام جنگ سے کبیدہ خاطر تھے اور سماجی تعمیر کے خواہاں تھے۔ دوسری طرف روس تھا جو دنیا کے سیاسی و اقتصادی نظام سے بالکل ہی الگ تھلگ دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک ایسی نئی تہذیب "قائم کی تھی جس نے اور باتوں کے علاوہ حزن و ملال کی گہری کیفیت کو ختم کر دیا تھا۔ مغرب میں روس کے اس اقدام کو خاصا سراہا گیا تھا' حالانکہ اس ملک سے بے پناہ نفرت بھی کی جاتی تھی۔ آخری بات یہ کہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں جرمنی' جاپان اور اٹلی فاشتی اور جنت پسند ریاستیں تھیں۔ یہ سب جہاں بولشویک تحریک کی مخالف تھیں وہاں انھوں نے ۱۹۱۹ء میں آزاد سرمایہ دارانہ نظام کی حالت قائمہ کے دوبارہ قیام کو مسترد کر دیا تھا۔ ان حالات میں جمہوری سیاست دانوں کے لیے خارجہ پالیسی وضع کرنا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ لوگ فاشتی یا بولشویک ذہنیت سے کماحقہ واقف نہ تھے اور محض یہ چاہتے تھے کہ ایڈورڈ کے عہد کا سکون قائم ہو جائے جسے جنگ نے بری طرح درہم برہم کر دیا تھا۔

اگر مذکورہ حالات و مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو ۱۹۱۹ء کے بعد کے عرصے میں وسطی یورپ کو جن چیلنجوں کا سامنا تھا' وہ اتنے خطرناک نہ تھے مگر اہم ضرور تھے۔ یہاں ۱۹۱۳ء سے قبل کی مثالوں کا اندراج ضروری ہو گا' مثلا" مصر میں عرابی پاشا کی بغاوت ۱۹۰۸ء کے بعد نوجوانان ترکی کی مزاحمت' تلک کی انڈین کانگریس کی تحریک کو انتہا پسند بنانے کی جدوجہد اور چین میں مغربی تسلط کے خلاف سن یات سن کی مہم! اسی انداز میں مورخین نے یہ بات درج کی ہے کہ ۱۹۰۵ء میں جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست اور اسی سال برپا ہونے والے روسی انقلاب نے کس طرح اولین قوم پرست قوتوں کو ایشیاء اور مشرق وسطی کے بعض علاقوں میں ابھارا اور انھیں متحرک کیا۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ ملکوں میں نو آبادیات قائم کی گئیں۔ انھیں تجارت اور مالیات کے عالمی نظام سے روشناس کرایا گیا اور مغربی خیالات و نظریات سے انھیں واقفیت دلائی گئی' اسی شدت سے قومی رد عمل ظہور میں آیا۔ چاہے یہ قبائلیوں کے اس اضطراب کے نتیجے میں ہوا ہو کہ ان کے روایتی طرز زندگی اور تجارت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور وہ اس کے مخالف تھے' یا پھر اس کی وجہ کہ وہ مغربی تعلیم یافتہ وکلاء اور دانشور تھے جو عوام پر مشتمل بڑی بڑی جماعتیں بنانا چاہتے تھے اور قومی شعور کے احیاء کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ بہرحال رد عمل کی یہ کیفیت نو آبادیات پر یورپ کے کنٹرول کے لیے ایک ایسا چیلنج تھا جس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں مذکورہ رجحانات فروغ پاتے چلے گئے۔ اول یہ کہ متعلقہ حارہ کے علاقوں میں اقتصادی ضروریات کے تحت خام مال کا بے پناہ استحصال کیا جا رہا تھا۔ پھر نو آبادیات کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ "مرکزی قوت" کے اقتدار کی جنگ میں افرادی قوت اور ٹیکس دونوں طرح سے تعاون کریں۔ چنانچہ یہ سوال لازما" پیدا ہوا کہ آخر اس کا "بدل" کیا ہو گا۔ اسی طرح کا رجحان یورپ کے مزدور طبقے میں بھی فروغ پا رہا تھا۔ علاوہ ازیں' مغربی جنوب مغربی اور مشرقی افریقہ' مشرق قریب اور بحرالکاہل کے علاقے میں نو آبادیاتی سلطنت کے جواز و قیام کے متعلق سوالات اٹھ رہے تھے۔ اس رجحان کو اتحادیوں کے اس پروپیگنڈے سے تقویت مل رہی تھی جو "قومی خود مختاری" اور "جمہوریت" کے متعلق کیا جا رہا تھا۔ ادھر جرمنی مغرب' آئرلینڈ' مصر اور ہندوستان میں مذکورہ پروپیگنڈے کے جواب میں اپنی مہم چلا رہا تھا۔ ۱۹۱۹ء کے قریب یورپی طاقتیں اپنی لیگ آف نیشنز کے لیے مینڈیٹ مرتب کرنے میں مصروف تھیں' اور جیساکہ اے

جے پی ٹیلر نے ایک مرتبہ کہا تھا اپنے شہنشاہی مفاد کے عیب کو چھپا رہی تھیں۔ انہی دنوں "پین افریقن کانگریس" پیرس میں منعقد ہو رہی تھی تاکہ وہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کر سکے۔ مصر میں فواد پارٹی قائم کی جا رہی تھی۔ چین میں "مے فورتھ تحریک" سرگرم عمل تھی۔ کمال اتاترک جدید ترکی کے معمار کی حیثیت سے نمایاں ہو رہے تھے۔ تیونس میں دستور پارٹی پھر متحرک ہو رہی تھی۔ انڈونیشیا میں شرکت السلام پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۲۵ لاکھ ہو چکی تھی۔ اور گاندھی ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مخالفت میں نئے نئے طریقے اختیار کر رہا تھا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ مغرب کے خلاف بغاوت کی اس لہر میں بڑی طاقتیں آپس کے اختلافات ختم کر کے متحد نہیں ہو پا رہی تھیں۔ گویا اس طرح ان کے اور دنیا کے غیر ترقی یافتہ لوگوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو چکی تھی۔ پھر "برلن ویسٹ افریقن کانفرنس" کے بعد تو یہ خلا اور بھی وسیع ہو گیا۔ جب بڑی طاقتوں کے کلب میں جاپان شامل ہو گیا تو یہ اتحاد فضول سا معلوم ہوا۔ آخرالذکر کے بعض دانشور ۱۹۱۹ء سے ہی یہ خیال ظاہر کر رہے تھے کہ مشرقی ایشیاء میں "باہمی خوشحالی کا ایک خطہ" ہونا چاہئے۔ پھر لینن اور ولسن کا تجویز کردہ "نئی سفارت کاری" کا خیال اس پر اپنا اثر قائم کر گیا۔ واضح رہے کہ ان کرشمہ ساز لیڈروں میں آپس میں جو بھی سیاسی اختلافات رہے ہوں لیکن دونوں یورپ کے قدیم نو آبادیاتی نظام سے نفرت کرتے تھے اور اسے کسی اور چیز میں تبدیل کر دینے کے متمنی تھے۔ کئی اسباب کی بناء پر دونوں ہی لیگ کے منشور کے تحت نو آبادیات کی مزید توسیع کو نہ روک سکے لیکن ان کی آواز شہنشاہی حدود سے نکل کر اپنا جادو جگاتی رہی اور قوم پرستوں کی تحریک میں جان ڈالتی رہی۔ ۱۹۲۰ء کے آخری عشرے میں چین میں بھی انقلاب کی یہی صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ وہاں یورپ کا قائم شدہ قدیم تجارتی نظام اپنی وقعت کھو چکا تھا اور اس کی جگہ وہ طریق کار مروج ہو رہا تھا جس کی تجویز روس، امریکہ اور جاپان نے دی تھی۔ پھر چین میں قوم پرستی کی تحریک بھی تو شروع ہو چکی تھی۔

ان باتوں سے ہرگز یہ مترشح نہیں ہوتا کہ مغرب کا نو آبادیاتی نظام ختم ہونے کے قریب تھا۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے مقام پر برطانیہ کی جوابی کاروائی،☆ ۱۹۲۰ء کے آخری عشرے میں ڈچ حکومت کا سوئیکارنو اور انڈونیشیا کے دوسرے لیڈروں کا داخل زنداں کرنا اور انڈونیشیا میں تجارتی یونینوں کا خاتمہ، چاول اور ربڑ کے معاملے میں ٹو نکیسوں کی شورش کو فرانسیسی حکومت کا سختی سے دبا دینا------ یہ تمام اقدامات یورپی فوج اور اسلحے کی برتری کے غماز تھے۔ اور یہی بات اٹلی کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جو ۱۹۳۰ء کی وسطی دہائی میں ابی سینیا میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کا متلاشی تھا۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے اہم نقصانات کے نتیجے میں شاہی کنٹرول کا خاتمہ ممکن ہو سکا۔ تاہم ۱۹۲۰ء اور خصوصاً ۱۹۳۰ء کے عشرے میں یہ نو آبادیاتی شورش بین الاقوامی تعلقات کے معاملے میں چنداں اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ سب سے پہلے اس معاملے نے بعض بڑی طاقتوں کی توجہ اور وسائل کو یورپ میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کی بجائے اپنی جانب مبذول کر لیا۔ ایسی صورت حال خصوصی طور پر برطانیہ میں پیش آئی تھی جس کے لیڈر سوڈنن لینڈیا

☆ مصنف کا یہ اشارہ جلیانوالہ باغ میں حریت پسندوں کے مجمع پر جنرل ڈائر کی اندھا دھند فائرنگ کی طرف ہے۔ (مترجم)

ا۔بلزبنگ کی بجائے فلسطین، ہندوستان اور سنگاپور کے لیے زیادہ فکر مند تھے۔ ان کی یہ ترجیحات ۱۹۱۹ء کے بعد کے "شاہی" دفاعی منصوبے سے بھی واضح ہیں۔ افریقہ کے معاملات میں دخل اندازی سے فرانس کو اسی طرح مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر اطالوی فوج بھی اسی مسئلے سے دوچار ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں بعض مواقع پر ماورائے یورپ اور نو آبادیات کے مسائل پھر پیدا ہو رہے تھے۔ اس سے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان قائم ہونے والے اتحادی ڈھانچے پر زد پڑ رہی تھی۔ شہنشاہیت کے سوال نے امریکہ کو دھچکا پہنچایا تھا اور وہ انگلستان اور فرانس کی پالیسیوں سے بہت زیادہ غیر مطمئن ہو چکا تھا۔ ادھر ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا عالمی سیاست پر اثر پڑا، مثلاً" ابی سینیا پر اٹلی کا حملہ اور چین میں جاپان کا جارحانہ اقدام! ان اسباب کی بناء پر ۱۹۳۰ء کی دہائی میں روم اور ٹوکیو لندن اور پیرس سے الگ ہو گئے۔ ادھر جرمنی کو نئے ساتھی میسر آ گئے۔ یہاں یہ بات پھر دہرانی پڑے گی کہ قدیم طرز سفارت کاری کے ذریعے پیچیدہ نوعیت کے بین الاقوامی تعلقات کو استوار کرنا خاصا مشکل معاملہ بن چکا تھا۔

جنگ کے بعد نا مساعد حالات کی اہم وجہ یہ تھی کہ جرمنی کا معاملہ ہنوز طے نہیں ہوا تھا بلکہ یہ اور بھی الجھا دیا گیا تھا۔ جرمنی کو اکتوبر ۱۹۱۸ء میں جب زوال آیا تھا اس وقت اس کی فوجیں یورپ میں بلجیم سے لے کر یوکرائن پر قابض تھیں۔ چنانچہ اس کی یوں شکست سے قوم پرست اور دائیں بازو کی قوتوں کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ اس ذلت آمیز شکست کا ذمہ دار ملکی غداروں کو ٹھہرا رہے تھے۔ جب پیرس کے سمجھوتے کے نتیجے میں مزید ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا تو جرمن قوم کی کثیر تعداد نے "غلاموں کا سمجھوتہ" اور اس کو تسلیم کرنے والے سیاست والوں کو جھٹک کر رکھ دیا۔ تاوان جنگ ادا کرنے کے مسئلے اور ۱۹۲۳ء کے شدید افراط زر نے جرمنی میں بے انتہا بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کر دی۔ نیشنل سوشلسٹ قسم کے لوگ ؟ انتہا پسند تھے، ۱۹۲۰ء کے زیادہ تر عشرے میں فتنہ انگیز تحریک چلاتے رہے۔ لیکن بہت تھوڑے جرمن کسی طور پر بھی تبدیلی پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال جرمنی میں تاوان جنگ کا معاملہ پولستان کی مقبوضہ زمین کا تنگ قطعہ، مسلح افواج پر پابندی اور جرمن زبان کے علاقوں کی فادر لینڈ سے علیحدگی جیسے معاملات تا دیر برداشت نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ کس طرح جلد سے جلد ان پابندیوں کو ختم کیا جائے اور اسٹیٹس کو بدلنے کے لیے سفارت کاری کو کس حد تک کام میں لایا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کی آمد کے بعد جرمنی میں محض تنقیحی اقدامات اپنائے گئے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی طاقت کی جس انداز میں غیر متوازن تقسیم عمل میں آئی تھی، اس سے جرمنی کو یورپ میں اس کا صحیح مقام دلوانے میں خاصی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ علاقے کے ہاتھ سے نکل جانے، فوج پر پابندی عائد ہو جانے اور معاشی عدم استحکام کے باوجود جرمنی ۱۹۱۹ء کے بعد بھی اپنی صلاحیت کی وجہ سے بڑی طاقت میں شمار ہوتا تھا۔ اس ملک کی طاقت اور خامی کا مفصل جائزہ ذیل میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جرمنی کی آبادی فرانس کے مقابلے میں اب بھی بہت بڑی تھی اور لوہے اور فولاد کی پیداوار میں اس سے تقریباً" تین گنا زیادہ استعداد رکھتا تھا۔ اس کا مواصلاتی نظام، کیمیکل اور بجلی کے پلانٹ، جامعات اور تکنیکی ادارے سب ہی ٹھیک ٹھاک کام کر رہے تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں ایک لمحے کا اندر جرمنی تباہ و برباد ہو گیا۔ جرمنی کی کمزوری اس کا سب سے پہلا مسئلہ تھا۔ لیکن کئی برس کی معمول کی زندگی کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی کی طاقت ہی دراصل

ایک مسئلہ تھا۔ جیساکہ ٹیلر کا کہنا ہے' براعظم یورپ میں طاقت کا وہ قدیم توازن اب نہیں رہا تھا جو جرمنی کو اس کے توسیعی عزائم سے روکے ہوئے تھا۔ روس پسپا ہو چکا تھا۔ آسٹریا۔ ہنگری کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ محض فرانس اور اٹلی باقی تھے۔ لیکن دونوں افرادی قوت اور اقتصادی وسائل کے لحاظ سے کم تر تھے۔ پھر جنگ کی وجہ سے تھک بھی گئے تھے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' پہلے امریکہ اور اس کے بعد برطانیہ نے یورپ میں مداخلت سے بیزاری کا اظہار کیا۔ بایں ہمہ ان دونوں نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ فرانس جرمنی کو دبا کر رکھ دے۔ تاہم یہ خدشہ بھی تھا کہ فرانس کو تحفظ حاصل نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پیرس مسلسل اس تگ و دو میں تھا کہ جرمنی دوبارہ طاقتور نہ بننے پائے۔ اس کے ساتھ ہی فرانس پورا تاوان جنگ ادا کرنے کے لیے جرمنی پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس نے بہت بڑی فوج بھی تیار کر رکھی تھی اور اس پر خاصی رقم خرچ کر رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں بھی لگا ہوا تھا کہ لیگ آف نیشنز ایک ایسا ادارہ بن جائے جو حالت قائمہ کو برقرار رکھے رہے۔ نیز وہ ایسی ہر تجویز کی بھی مخالفت کر رہا تھا جس کی رو سے جرمنی کو فرانس کے مساوی فوجی مقام حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور دائیں بازو کے انتہا پسندوں کو احتجاج کرنے کا موقع مل گیا۔

فرانس کے پاس ایک اہم سفارتی اور سیاسی ہتھیار یہ تھا کہ مشرقی یورپ کی "وارث ریاستوں" کے ساتھ اس کے روابط قائم تھے۔ اس بناء پر پولینڈ' چیکوسلواکیہ اور ۲۱-۱۹۱۹ء کے سمجھوتے سے مستفیض ہونے والے علاقے کے دیگر ممالک کی حمایت بھی ایک کارگر حکمت عملی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس طرح جرمنی کے توسیع پسندی کے عزائم کی ہر موڑ پر مزاحمت کی جا سکتی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مذکورہ منصوبہ خاصا مشکل تھا۔ مختلف نسلوں پر مشتمل سابقہ سلطنتوں کی متعدد آبادی کے جغرافیائی مضمرات کے نتیجے میں ۱۹۱۹ء کے عرصے میں علاقے کا قضیہ حل نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ زیادہ تر اقلیتی فرقے سلطنت کی ایسی سرحدوں پر متمکن تھے جو ہر طرح ناموزوں تھا۔ اس طرح اندرون ملک خلفشار اور بیرون ملک غم و غصے کی لہر پیدا ہونے کے خدشات ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ ادھر جرمنی تنہا اس بات کا مطالبہ نہیں کر رہا تھا کہ پیرس کے معاہدے پر نظرثانی کی جائے۔ اگر فرانس حالت قائمہ میں تبدیلی پیدا نہ کرنے پر زور بھی دیتا' تو بھی اسے اس بات کا علم تھا کہ نہ تو برطانیہ اور نہ ہی امریکہ اس علاقے میں غلط قسم کی سرحد بندی کی حمایت کرے گا۔ جیساکہ ۱۹۲۵ء میں لندن کی حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ مشرقی یورپ کے لیے "لوکارنو" کے طرز کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

اقتصادی معاملے نے مشرقی اور وسطی یورپ کے حالات کو اور بھی خراب کر دیا تھا۔ اس کی وجہ کسٹم اور ٹارف کی وہ حد بندیاں تھیں جو ان نئی تشکیل شدہ ریاستوں کے گرد قائم کی گئی تھیں۔ اس سے علاقائی دشمنی مزید بڑھ گئی اور ترقی کی رفتار میں کمی آ گئی۔ جنگ سے پہلے یورپ میں کل چودہ قسم کے مختلف سکوں کا چلن تھا۔ لیکن اب ان کی تعداد ۲۷ ہو چکی تھی۔ اسی طرح ۱۲٬۰۰۰ میل لمبی سرحد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت سی سرحدوں پر فیکٹریاں خام مال سے خاصی دور ہو گئیں' لوہے کے کارخانے اور کوئلے کی کان کے درمیان بہت فاصلہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ کسانوں کے کھیت بھی منڈیوں سے دور ہو گئے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فرانس اور برطانیہ کے بینک اور کاروباری طبقے ۱۹۱۹ء کے بعد ان نئی ریاستوں میں آئے تھے' لیکن صحیح معنوں میں ان کا تجارتی شریک کار جرمنی تھا جس نے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں اپنی معاشی حالت دوبارہ بہتر بنا لی تھی۔ پھر جرمنی کو یہ برتری بھی حاصل تھی کہ وہ ریل اور سڑک کے ذریعے مشرقی یورپ کی منڈی سے

بہت قریب تھا اور اس علاقے کی فالتو غذائی پیداوار کو بہ آسانی استعمال میں لے آتا تھا۔ یہ سہولتیں فرانس اور برطانیہ کو میسر نہ تھیں۔ علاوہ ازیں جرمنی ان اشیاء کے بدلے میں ہنگری سے گندم' رومانیہ سے تیل ضرورت کی مشینیں اور اسلحہ حاصل کر لیتا۔ ان ملکوں کو جرمنی کی ہی کرنسی کے مسئلے کا سامنا بھی تھا۔ چنانچہ ان سبھوں کے لیے بدل بیوپار کا طریقہ زیادہ آسان تھا۔ غرض اقتصادی لحاظ سے یورپی خطے پر جرمنی کی بالادستی پھر قائم ہو رہی تھی۔

جب ۱۹۱۹ء میں پیرس کے مقام پر باہمی مشاورت ہوئی تو اس مجلس کے شرکاء مذکورہ بالا چند مسائل سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ ان سبھوں نے لائیڈ جارج کی طرح نئی تشکیل شدہ لیگ آف نیشنز کو ہی اس قابل سمجھا کہ وہ ان مسائل کو حل کرے' تعمیری کام انجام دے اور پریشانیوں کا ازالہ کرے۔ لیگ کی حیثیت عدالت مرافعہ کی ہو گی اور وہی تمام معاملات کو حل کرے گی۔ گویا مختلف ریاستوں کے مابین سیاسی یا اقتصادی جھگڑے کا فیصلہ اب وہ معزز لوگ کریں گے جو جنیوا کے اجلاس میں ایک میز کے گرد بیٹھے ہوں گے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا ایک خوشگوار تصور تھا لیکن اسے سخت ترین حقائق کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے لیگ میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ چونکہ سوویت یونین کو اچھوت قسم کی ریاست سمجھا جاتا تھا لہٰذا اسے لیگ سے الگ تھلگ رکھا گیا۔ یہی حال شکست کھا جانے والی طاقتوں کا تھا جنہیں ابتدائی برسوں میں لیگ میں گھسنے نہیں دیا گیا۔ جب تبدیلی کی خواہاں ریاستوں نے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں تشدد کا آغاز کیا تو انہوں نے لیگ کو خیرباد کہہ دیا۔

علاوہ ازیں لیگ کی ہیئت کے متعلق ابتدا میں فرانس اور برطانیہ کے مابین اختلاف رائے تھا۔ یعنی اسے کیا ہونا چاہئے' ایک تھانیدار یا ثالث بالخیر! چنانچہ اس تنظیم کو کوئی طاقت نہ تھی نہ ہی تحفظ قائم کرنے کے صحیح ذرائع میسر تھے۔ چنانچہ بدقسمتی سے لیگ حملہ آوروں کی مزاحمت تو نہ کر سکی البتہ بصورت کے لیے خطرات پیدا کرتی رہی۔ مغرب میں جنگ سے خائف لوگوں میں لیگ بہت مقبول تھی۔ بایں ہمہ بہت سے لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اب تو لیگ مستقبل کی جنگ کو برپا ہونے سے روک دے گی' لہٰذا ملک میں دفاعی فوج کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ بہرحال لیگ کے وجود نے کابینہ اور وزرائے خارجہ کو "نئی" اور "پرانی" سفارت کاری کے درمیان ڈانواں ڈول ہوتے رہنے پر مجبور کر دیا وہ فائدہ کسی ایک سے بھی نہ اٹھا پائے۔ منچوریہ اور ابی سینیا کے معاملات اس کی زندہ مثال ہیں۔

مذکورہ تمام مشکلات کے پیش نظر اور صلح ویلز کے بیس سال بعد یورپ کے ایک دوسری عظیم جنگ میں کود پڑنے کے واقعہ کے نتیجے میں نہایت حیرت انگیز طور پر مورخین نے اس بیس سالہ مدت کو عارضی صلح سے تعبیر کیا ہے اور اس عہد کو نہایت تاریک اور افسردہ قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ زمانہ بحران' دھوکہ بازی' ظلم و ستم اور بے عزتی کا مظہر رہا ہے۔ لیکن یہاں دو ایسی کتابیں قابل ذکر ہیں جن سے اس خدشے کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ۱۹۲۰ء کے عشرے اور ۱۹۳۰ء کے عشرے کے درمیان فرق کو نظرانداز کر دیا جائے گا۔ ایک کا عنوان ہے "اے بروکن ورلڈ--- دی لوسٹ پیس" اور دوسری کا نام ہے "دی ٹونٹی ایئرز کرائسس" ان دونوں کتب نے مذکورہ دونوں عشروں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ یہاں ایک ایسے بیان کی نقل پیش کی جا رہی ہے جو ۱۹۲۰ء کے آخری عشرے میں دیا گیا تھا۔ "لوکارنو اور کیلاگ برائنڈ کے سمجھوتے" (پیرس کی صلح) فرانس اور جرمنی کے مابین اختلافات کا خاتمہ لیگ کے اجلاس' خوشحالی کا دور وغیرہ---- ان سب عوامل سے اندازہ ہوتا تھا کہ جہاں تک بین الاقوامی تعلقات کا معاملہ ہے' پہلی جنگ

عظیم ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اگلے ایک دو سال کے اندر مالیاتی اور صنعتی بحران نے اس ہم آہنگی کو بری طرح متاثر کیا تھا اور جاپان' جرمنی اور اٹلی کے قوم پرستوں نے نئے نظام کو جس طرح چیلنج کیا تھا وہ اس پر اثر انداز بھی ہو رہا تھا۔ نہایت مختصر سی مدت میں جنگ کے بادل پلٹ آئے۔ یہ نظام ایک ایسے وقت میں خطرے کی لپیٹ میں تھا جبکہ جمہوریت ابھی پوری طرح پروان بھی نہیں چڑھی تھی اور نہ ہی نفسیاتی اور فوجی لحاظ سے اس بحران کا سامنا کر سکتی تھی۔ پھر ۱۹۱۹ء کے سمجھوتے کے بعد کسی وقت بھی اس سے صحیح معنوں میں رابطہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال ۱۹۳۰ء کے نا مساعد عشرے میں تسلی دینے والے کا جو بھی رویہ رہا ہو' یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اس وقت ایسی عدیم المثال الجھنیں اور پیچیدگیاں تھیں جن سے سیاست داں نبرد آزما تھے۔

یہ جائزہ لینے سے قبل کہ اس دور کا بین الاقوامی بحران کس طرح جنگ کا پیش خیمہ بنا' یہ ضروری ہے کہ ہم ایک دفعہ پھر ہر اس بڑی طاقت کی قوت اور کمزوری پر نظر ڈال لیں جو نہ صرف ۱۸-۱۹۱۴ء کی لڑائی سے متاثر ہوئی تھی بلکہ جنگ کے درمیانی عرصے میں ہونے والی معاشی اور فوجی ترقی سے مستفیض بھی ہوئی تھی۔ آخرالذکر معاملے میں جدول ۱۸-۱۲ کا بار بار حوالہ دیا جائے گا جس سے پتہ چلتا ہے کہ بڑی طاقتوں کے مابین پیداواری توازن کس طرح تبدیل ہو رہا تھا۔ قبل ازیں فوجی سازوسامان کے اخراجات کے متعلق جو بات کہی گئی تھی' یہاں اس کا اعادہ ضروری ہے۔ تشویش کی پہلی بات ترقیاتی شرح میں فرق تھا جو ۱۹۲۰ء کے پہلے عشرے کے برعکس ۱۹۳۰ء کی دہائی میں بہت زیادہ نمایاں تھا۔ عالمی اقتصادیات کا نظام مختلف بلاکس میں منقسم ہو چکا تھا۔ ہر ملک میں اپنے اپنے طور پر اقتصادی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی۔ اس میں چار سالہ پلان سے لے کر نئے معاملات اور روایتی قسم کے تفریط زر پر مبنی بجٹ شامل تھے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ بعض ملکوں میں پیداوار میں اضافہ ہو رہا تھا اور دولت بڑھتی جا رہی تھی جبکہ دوسرے ممالک کی پیداوار اور دولت میں ڈرامائی طور پر کمی آ رہی تھی۔ دوسرے جنگ کے درمیانی عرصے میں دفاعی ٹیکنالوجی میں بہت ترقی ہوئی تھی۔ چنانچہ مسلح افواج پہلے کے برعکس ملک کے پیداواری وسائل پر کہیں زیادہ انحصار کرنے لگی تھیں۔ جب تک صنعتی بنیاد مستحکم نہیں ہوتی اور معاشرہ سائنس سے بحسن و خوبی آشنا نہیں ہوتا اور جدید سامان جنگ میں مہارت حاصل نہیں کر لیتا' آنے والی جنگ میں فتح کا حصول نا ممکن نظر آتا تھا۔ اسٹالن کے الفاظ میں "اگر مستقبل کی باگ ڈور بڑے بڑے فوجی دستوں کے ہاتھوں میں ہو گی تو وہ لامحالہ جدید ٹیکنالوجی اور کثیر صنعتی پیداوار پر ہی انحصار کریں گے۔"

چیلنجرز

کسی ملک کی قیادت کیسی ہی فعال اور حوصلہ افزا کیوں نہ ہو' لیکن اقتصادی طور پر وہ نہایت غیر مستحکم ہو' اس کی نمایاں مثال ۱۹۳۰ء کے عشرے میں اٹلی کی تھی۔ اسی بنیاد پر مسولینی کی فاشسٹ حکومت نے ملک کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر دنیا کے صف اول کے ممالک میں لا کھڑا کیا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں "لوکارنو سمجھوتہ" جب عمل میں آیا تو بیرون ملک برطانیہ اس کا ضامن تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ہونے والے میونخ سمجھوتے پر دستخط کرنے والوں میں برطانیہ' فرانس اور جرمنی کے ساتھ اٹلی بھی شامل تھا۔ اٹلی نے بحیرہ روم میں اپنی برتری قائم رکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کو کئی واقعات سے پشت پناہی حاصل ہوئی۔ مثلاً" ۱۹۲۳ء میں کورفو پر حملہ' لیبیا کے ساتھ معاہدہ اور اسپین کی خانہ جنگی میں پچاس ہزار اطالوی فوجیوں کی مداخلت! ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان حبشہ پر جارحانہ قبضہ کر کے مسولینی نے اوروا کی شکست کا بدلہ لے لیا تھا۔ گویا اس نے لیگ کی منظوری اور مغربی ملکوں کے تشدد آمیز رویے کے خلاف نہایت جرات مندانہ اقدام کیا تھا۔ بعد ازاں اٹلی نے حالت سابقہ کی حمایت کر دی۔ ۱۹۳۴ء میں برنیر تک فوجی پیش قدمی کی تاکہ ہٹلر کو آسٹریا پر قابض ہونے سے روک دے۔ پھر ۱۹۳۵ء میں جرمنی کے خلاف سٹریسا میں ہونے والے سمجھوتے پر بہ رضا و رغبت دستخط کر دیے۔ بولشویک تحریک کے متعلق اس کے ہتک آمیز بیانات نے ۱۹۲۰ء کی دہائی میں غیر ملکیوں خصوصاً" چرچل کے دل موہ لیے اور ان سبھوں نے اٹلی کو کلمہ تحسین پیش کیا۔ حتیٰ کہ جنوری ۱۹۳۹ء میں چیمبرلین نے روم کا سفر اختیار کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ وہ جرمن کیمپ سے مکمل طور پر وابستہ نہ ہونے پائے۔

کامیاب و کامران سفارت کاری ہی اٹلی کی وجہ عظمت نہ تھی۔ اس فسطائی ریاست نے دھڑے بازی والی سیاست کو ختم کر دیا تھا۔ سرمایہ اور محنت کے درمیان حائل جھگڑوں کے ازالے کے لیے بھرپور حمایت کی جاتی تھی۔ جس سے بعد از جنگ کے یورپی معاشرے کو عمدہ نمونہ عمل ملا۔ پھر بولشویک اس ملک نے اجتماعی' اقتصادی منصوبہ بندی کی تھی۔ حکومت کے اقدامات کی تحریک کے نمونے سے جو لوگ کبیدہ خاطر تھے انہیں اٹلی کے اقدامات خاصے موثر معلوم ہوئے۔ اتحادیوں کی سرمایہ کاری کی وجہ سے بھاری صنعتوں خصوصاً" اسلحہ سازی کو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کے عرصے میں خاصا فروغ حاصل ہوا۔ مسولینی کی ماتحتی میں اس ملک نے جوش و جذبے کے ساتھ جدید کاری کے پروگرام وضع کیے۔ ان میں دلدلی زمین کی کھدائی' ہائیڈرو الیکٹریسٹی کی ترقی اور ریلوے کے نظام کی بہتری شامل تھی۔ الیکٹرو کیمیکل کی صنعت' ریان اور دیگر مصنوعی ریشوں کے کارخانے کو وسعت دی گئی۔ آٹو موبائیل کی صنعت کو بھی فروغ دیا گیا۔ اٹلی میں ایروناٹیکل کا کارخانہ دنیا میں اپنی جدت کاری کی وجہ سے خاصا مشہور و معروف تھا۔ اس کے ہوائی جہاز بھی تیز رفتاری اور کارکردگی میں اپنی مثال آپ تھے۔

فوجی قوت سے بھی اٹلی کے افضل و اعلیٰ مقام کا پتہ چلتا تھا۔ اگرچہ ۱۹۲۰ء کے عشرے کے دوران اس ملک نے اپنی افواج پر کوئی زیادہ رقم خرچ نہیں کی تھی' لیکن مسولینی کے طاقت کے احساس' فتح حاصل کرنے کے نئے جذبے اور اٹلی کی سرحدوں کی توسیع کی خواہش نے اسے ۱۹۳۰ء کی دہائی کے دوران دفاعی ضروریات پر اچھی خاصی رقم صرف کرنے پر مجبور کر دیا۔ قومی آمدنی کا دس فی صد اور حکومتی آمدنی کا ایک تہائی حصہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں مسلح افواج کے لیے مخصوص تھا۔ یہ رقم برطانیہ اور فرانس کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور امریکہ کے کل فوجی اخراجات سے کہیں زیادہ تھی۔ فرانسیسی بحریہ اور برطانیہ کے بحیرہ روم کے بحری بیڑوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے نئے جہاز سمندروں میں اتارے گئے۔ اس کا مقصد دراصل یہ بھی تھا کہ مسولینی کے اس دعوے کی تصدیق ہو کہ "بحیرہ روم میرے اقتدار میں ہے" جب اٹلی جنگ میں شریک ہوا تو اس وقت اس کے پاس ۱۱۳ سب میرین تھیں جو شاید روس کے بعد دنیا میں سب میرین کا سب سے بڑا بحری دستہ تھا۔ اسی طرح "ریگیا ایرونوٹیکا ایئرفورس" پر بھی بہت زیادہ رقم خرچ کی گئی۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۰ء تک چلتا رہا۔ اس تمام جدوجہد کی غایت یہ تھی کہ جدیدیت' سائنس' تیز رفتاری اور چمک دمک کے ذریعے فسطائی نظام کی اہمیت واضح کی جائے۔ حبشہ اور اسپین دونوں ممالک میں اٹلی نے اپنی ہوائی فوج کا مظاہرہ کیا۔ اس کا مقصد جہاں خود کو اطمینان دلانا تھا وہاں غیر ملکیوں پر بھی یہ تاثر قائم کرنا تھا کہ دنیا میں اٹلی کی ہوائی فوج نہایت ترقی یافتہ ہے۔ اٹلی نے اپنی بحریہ اور فضائیہ پر جس طرح رقم خرچ کی' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بری فوج کی تعمیر و ترقی کے لیے رقم نہ رہی۔ تاہم ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں اس نے اپنے تیس ڈویژن فوج کو بہت بہتر بنا لیا تھا۔ بایں ہمہ نئے نئے ٹینک اور توپیں بھی مذکورہ فوج کو فراہم کی گئیں۔ اس کے علاوہ مسولینی کا یہ خیال تھا کہ اس کی پوری فسطائی قوم ہر طرح مسلح اور تربیت یافتہ ہے' لہٰذا اگلی جنگ عظیم میں اٹلی کے پاس دعوے کا مطابق آٹھ ملین خنجر بردار بندوقیں ہوں گی۔ ایک دوسری سلطنت روم کی تشکیل کے لیے ہر طرح تیاری مکمل تھی۔

افسوس کہ ان حسین خوابوں کے باوجود فاشسٹ اٹلی سیاسی طاقت کے نقطہ نظر سے خاصا کمزور تھا۔ اہم مسئلہ یہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ ملک اقتصادی لحاظ سے نیم ترقی یافتہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں یہاں فی کس آمدنی اتنی ہی تھی جتنی انیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ اور امریکہ کی تھی اور فرانس سے بھی مذکورہ آمدنی کئی دہائیاں پیچھے تھی۔ قومی آمدنی کے گوشوارے میں یہ بات چھپائی گئی تھی کہ شمالی علاقے میں فی کس آمدنی ۲۰ فی صد سے زائد تھی اور جنوب میں ۳۰ فی صد سے کم! اور یہ کہ خلا وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ ترک مکانی کرنے والوں کا سلسلہ ادھر بھی قائم تھا۔ دوران جنگ اٹلی کی آبادی میں ہجرت سے سالانہ ایک فی صد کا اضافہ ہوا تھا۔ چونکہ ملک کی مجموعی پیداوار میں سالانہ ۲ فی صد کا اضافہ ہو رہا تھا۔ لہٰذا فی کس آمدنی میں محض ایک فی صد کا اضافہ ہو سکا۔ اسے تباہ کن تو قرار نہیں دیا جا سکتا' لیکن ہم اسے معاشی معجزہ بھی تو نہیں کہہ سکتے۔ اٹلی کی کمزوری میں ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ وہاں چھوٹے پیمانے کی زراعت پر مسلسل انحصار کیا جاتا رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں قومی مجموعی پیداوار میں زراعتی آمدنی کا محض ۴۰ فی صد حصہ تھا۔ پھر کھیتی باڑی کرنے والے کل ملکی آمدنی کا صرف ۵۰ فی صد تھے۔ وہاں کے اقتصادی بحران کی ایک بیّن مثال یہ بھی تھی کہ ۱۹۳۸ء میں خاندان کے نصف اخراجات صرف کھانے پینے کی اشیاء پر ہوا کرتے تھے۔ اس عدم توازن کو دور کرنے کی بجائے اٹلی کی فاشسٹ حکومت نے دیہی زندگی کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی' زراعت کو ترقی دینے کے لیے کئی طریقے اپنائے مثلاً "محفوظ زرخیزی" کھیتوں کی توسیع اور گندم کی

منڈی پر مکمل کنٹرول! اطالوی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ بیرون ملک غذائی اشیاء پیدا کرنے والوں پر انحصار کو کم کیا جائے اور کسانوں کو شہروں میں آباد ہونے سے روکا جائے ورنہ وہاں پہنچ کر یہ بےروزگاری کے مسئلے کو اور پیچیدہ کریں گے۔ اس طرح سماجی خرابیاں جنم لیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہی علاقوں میں بےروزگاری بری طرح بڑھ گئی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ صورت حال بھی پیدا ہو گئی کہ پیداوار کم تھی' جہالت عام تھی اور علاقے میں شدید محرومیوں کا احساس جاگزیں تھا۔

اٹلی کی بد تر اقتصادی حالت اور اسلحے اور دیہی زراعت پر ہونے والے سرکاری اخراجات کی وجہ سے اتنی رقم بھی نہ بچتی تھی کہ کسی کاروبار میں سرمایہ کاری کی جا سکے۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جہاں ملکی سرمایہ گھٹ کر رہ گیا' وہاں معاشی بحران اور تامین پسندی کا اعادہ اور بھی نقصان کا باعث ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی کمپنیاں پھلتی پھولتی رہیں جنھیں حکومت سے ہوائی جہاز اور ٹرک تیار کرنے کا آرڈر ملا کرتا تھا تاہم یہ بعید از قیاس تھا کہ اٹلی کی صنعتی ترقی خود کفالتی کے اقدامات کا نتیجہ تھا۔ ٹیرف سے نااہل صنعت کاروں کو تحفظ حاصل تھا۔ پھر اس زمانے کے تجارتی طریقے نے اس ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کو کم کر دیا تھا' حالانکہ اسی چیز نے ابتدا میں اطالوی صنعت کو فروغ دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء تک اٹلی کی یہ حالت تھی کہ عالمی پیداوار میں اس کا محض ۲ء۸ فی صد حصہ تھا۔ یہ ملک ۲ء۱ فی صد فولاد' ۱ فی صد کچا لوہا' ۰ء۷ فی صد کچ دھات اور ۰ء۱ فی صد کوئلہ پیدا کرتا تھا۔ توانائی استعمال کرنے کی شرح بڑی طاقتوں میں ہر ایک سے کم تر تھی۔ ادھر مسولینی' فرانس اور کبھی کبھار برطانیہ اور فرانس دونوں کے ساتھ جنگ کرنے کا بے حد متمنی تھا۔ چنانچہ اٹلی کھاد' کوئلہ' تیل' لوہے کی سلاخ' ربڑ' تانبا اور دیگر ضروری اور اہم خام مال کے لیے درآمدات پر انحصار کرتا تھا۔ ایسے ۸۰ فی صد سامان جبرالٹر یا مصر سے درآمد کیے جاتے تھے۔ انھیں زیادہ تر برطانیہ کے جہاز ڈھو ڈھو کر لایا کرتے تھے۔ اس حکومت کی عجیب و غریب بات یہ تھی کہ درآمدی سامان آنے سے کُل اتفاقی مصارف کا گوشوارہ مطلق تیار نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر ایسے اہم سامان کی ذخیرہ گری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں ۱۹۳۰ء کی آخری دہائی میں تو نوبت یہ آگئی تھی کہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اٹلی کے پاس بیرونی کرنسی تک نہ تھی۔ کرنسی کی شدید قلت کی وجہ سے اطالوی حکومت ۱۹۳۵ء کے بعد کے برسوں میں جرمنی سے ایسی ضروری مشینیں نہ خرید سکی جو جدید قسم کے ہوائی جہاز' ٹینک' بندوق اور بحری جہاز کی تیاری کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔

اٹلی کی اقتصادی بدحالی سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوئی ہے کہ مسولینی کی حکومت نے مسلح افواج پر اگرچہ بھرپور توجہ دی تھی اور اس کی ترقی کے لیے سارے وسائل بروئے کار لائے تھے' لیکن ان کی کارکردگی اور معیار دونوں ناقص تھے۔۔۔۔۔ بلکہ خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اگرچہ بحریہ تینوں مسلح افواج میں زیادہ سازوسامان سے لیس تھی' اس کے باوجود اس کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ بحیرہ روم سے برطانیہ کی رائل نیوی کو مار بھگا نہ سکی۔ جہاز کے عرشے پر ایئرکرافٹ کے اترنے اور اڑنے کی کوئی سہولت نہ تھی۔ مسولینی نے اس کی تعمیر کی ممانعت کر دی تھی۔ نتیجتاً" اطالوی بحریہ کو ہوائی فوج پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ خراب انتظامی حالات کی وجہ سے مطلوبہ تعاون حاصل نہیں ہو پاتا تھا۔ اٹلی کے کروزر صاف ستھرے ماحول کے عادی جہاز معلوم ہوتے تھے۔ پھر سب میرین کی لمبی قطار محض سرمایہ کاری کا ضیاع تھا۔ ان میں حملہ کے کمپیوٹر نصب نہ تھے۔ جب یہ کشتیاں حملہ کرنے کے لیے سمندر کی گہرائی میں غوطہ لگاتیں تو ان کا ایئرکنڈیشن کا نظام خراب ہو جاتا اور زہریلی گیس پیدا ہونے لگتی۔ پھر غوطہ لگانے میں بھی یہ سست واقع ہوئی تھیں۔

چنانچہ دشمن کے ہوائی جہاز جب قریب آ جاتے تو ان کے لیے بچنا مشکل ہو جاتا۔ بحر نقائص اطالوی ایئر فورس میں بھی پائے جاتے تھے۔ حالانکہ ابی سینیا کے قبائلیوں پر اس نے نہایت کامیابی سے بمباری کی تھی اور اسپین کی خانہ جنگی کے موقع پر اپنی کارکردگی سے بہت سے مبصرین کو متاثر کیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں اس کا بائی پلین فیٹ سی آر ۴۲ برطانیہ اور جرمنی کے نئے نئے مونوپلین کے سامنے دھندلا کر رہ گیا تھا۔ حتیٰ کہ اٹلی کا بامبر جہاز نہایت ہلکے پھلکے بم سے لیس ہوتا' انجن بھی عموماً" کمزور ہوتا اور بسا اوقات بم بھی ناکارہ ثابت ہوتا۔ بہرحال مذکورہ بالا دونوں مسلح افواج نے دفاعی بجٹ کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے لیے مختص کرا رکھا تھا۔ اس کے برعکس بری فوج کی گرانٹ میں کمی آتی گئی۔ ۱۹۳۵-۶ء میں دفاعی بجٹ میں اس کا حصہ ۵۸ء۲ فی صد تھا جو ۱۹۳۸-۹ء میں گھٹ کر ۴۳ء۵ فی صد رہ گیا تھا اور یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب بری فوج کو جدید قسم کے ٹینک' توپ' ٹرک اور مواصلاتی آلات کی بے پناہ ضرورت تھی۔ جب اٹلی دوسری جنگ عظیم میں شامل ہوا تھا تو اس وقت اس کا خصوصی جنگی ٹینک فیٹ ایل ۳ تھا' مگر حالت یہ تھی کہ ساڑھے تین ٹن وزنی اس فوجی ٹینک میں ریڈیو نہ تھا' دور تک دیکھنے کا آلہ بھی نہ تھا اور کل دو عدد مشین گنیں نصب تھیں۔ انہی دنوں جرمنی اور فرانس کے پاس بیس بیس ٹن کے بھاری ٹینک تھے۔ جدید طرز کے بنے ہوئے ان ٹینکوں میں بھاری اسلحے نصب تھے۔

فاشسٹ نظریے نے اٹلی کے اقتصادی حالات کو جس طرح بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ملک کا مجموعی ڈھانچہ کمزور ہو کر رہ گیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا سراسر زیادتی ہو گی کہ اگر کوئی اور عظیم جنگ بڑی طاقت کے خلاف ہوتی تو اٹلی کو یقیناً" فتح حاصل ہوتی۔ امر واقعہ ہے کہ ایسی ساری توقعات پر اس لیے اوس پڑ گئی تھی کہ اس کی مسلح افواج کو قبل از وقت مسلح کر دیا گیا تھا اور وہ بھی غلط انداز میں! چونکہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں یہ ایک عمومی قسم کا مسئلہ تھا جس سے فرانس اور روس بھی دوچار تھے' لہٰذا اٹلی کی کمزوریوں کا جائزہ لینے سے قبل مذکورہ معاملے کا مختصر ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس دور میں فوج کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے سائنسی اور تکنیکی طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ یہ ایک اہم پیش رفت تھی اس لیے کہ اس کی بدولت تینوں مسلح افواج میں جدید قسم کے اسلحے استعمال ہونے لگے تھے۔ مثال کے طور پر چھوٹے قسم کے اور ہلکے پھلکے جہازوں کی بجائے لڑاکا طیارے استعمال میں آ رہے تھے۔ اسی طرح بمبار جہاز ان ملکوں میں رواج پا گئے تھے جو پرانے' دو انجن اور مختصر مار کرنے والے بمباروں کی جگہ چار انجن والے جہاز کا خرچ برداشت کر سکتے تھے۔ اس نوع کے بمبار طیارے میں وزنی بم رکھے جا سکتے تھے اور دو ہزار میل کے قطر میں یہ بمباری کر سکتے تھے۔ واشنگٹن کی صلح کے بعد طریقہ جنگ (کنگ جارج پنجم' بسمارک اور نارتھ کیرولینا کے برعکس) نہایت تیز رفتاری پر مبنی تھا۔ پھر فوج پوری طرح مسلح ہوتی تھی۔ سابقہ دور کے برعکس جہازوں پر مار گرانے والے آلات نصب ہونے لگے تھے۔ بحری جہازوں میں بڑے بڑے اور منصوبہ بندی کے تحت تیار کیے ایئر کرافٹ کیریئر بننے لگے۔ ان میں دور تک مار کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ چنانچہ یہ دیگر کیریئر اور ۱۹۲۰ء کی دہائی کے جنگی کروزر سے بدرجہا بہتر تھے۔ اسی طرح بھاری بھرکم پوری طرح اسلحہ سے لیس اور طاقتور انجن والے ٹینک بن رہے تھے۔ یہ ۱۹۳۵ء کے بعد کے برسوں میں بننے والے ٹینکوں سے کارکردگی اور ساخت دونوں لحاظ سے بالکل مختلف تھے۔ علاوہ ازیں اسلحے کے اس نظام پر بجلی کا مواصلاتی طریقہ' بحری جہاز کے جدید آلات' سب میرین کا سراغ لگانے والے آلے' راڈار اور اعلیٰ کارکردگی کے ریڈیو کے اثرات بھی مرتب ہو رہے تھے۔ اس طرح جدید اسلحے نہ صرف

بہت مہنگے داموں بکنے لگے بلکہ ان کے انتظام و انصرام کا طریقہ بھی بے حد پیچیدہ ہو گیا تھا کیا ہر ملک کے پاس ایسے جدید آلات تھے کہ ان مشینوں کو ٹھیک ٹھاک کیا جا سکتا؟ کیا اسلحہ سازی کا کام اور بجلی کی فراہمی سے ضروریات پوری ہو سکتی تھیں؟ کیا ان ملکوں میں فالتو کل پرزے اور تجربہ کار انجینئر موجود تھے؟ کیا کوئی ملک قدیم طرز کے اسلحے بنانے کا کام محض اس لیے روک سکتا تھا کہ جدید طرز کے اسلحوں کی جانچ پڑتال کر لی جائے۔ پھر اسے بنایا جائے۔ آخری مگر اہم نوعیت کی یہ بات قابل غور ہے کہ آخر اس قسم کی اسلحہ سازی کا کسی ملک کے اقتصادی حالات سے کیا تعلق تھا' ملکی و بیرونی وسائل تک رسائی سے کیا ربط تھا اور خرچ برداشت کرنے کی اہلیت سے کیا لگاؤ تھا؟ یہ کوئی نیا المیہ نہ تھا البتہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں واقع منصوبہ سازوں نے حکمت عملی اختیار کرنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی۔

مذکورہ بالا تکنیکی' اقتصادی نیز سفارتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ۱۹۳۰ء کے عشرے میں بڑی طاقتوں کے متنوع اسلحہ سازی کے منصوبے کی غرض و غایت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس عشرے کے دوران مختلف ملکوں کے دفاعی اخراجات کے گوشوارے میں بڑی خامیاں ہیں' پھر بھی جدول نمبر ۲۷ سے اس دور کے حقائق کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

جدول نمبر ۲۷: بڑی طاقتوں کے دفاعی اخراجات

۱۹۳۰ء --- ۱۹۳۸ء

(موجودہ ملین ڈالر میں)

	جاپان	اٹلی	جرمنی	روس	برطانیہ	فرانس	امریکہ
۱۹۳۰ء	۲۱۸	۳۶۶	۱۶۲	۷۲۲	۵۱۲	۴۹۸	۶۹۹
۱۹۳۳ء	۱۸۳	۳۵۱	۴۵۲	۷۰۷	۳۳۳	۵۲۴	۵۷۰
	(۳۵۶)	(۳۶۱)	(۶۲۰)	(۳۰۳)	(۵۰۰)	(۸۰۵)	(۷۴۳)
	(۳۸۷)						
۱۹۳۴ء	۲۹۲	۴۵۵	۷۰۹	۳۴۷۹	۵۴۰	۷۰۷	۷۰۳
	(۳۸۳)	(۳۴۷)	(۹۳)	(۹۸۰)	(۵۵۸)	(۷۳۱)	(۷۰۸)
	(۳۴۷)						
۱۹۳۵ء	۳۰۰	۹۶۶	۱۶۰۷	۵۵۱۷	۶۳۶	۸۶۷	۸۰۶
	(۹۰۰)	(۹۶۶)	(۲۰۲۵)	(۱۶۰۷)	(۶۷۱)	(۸۳۹)	(۱۰۳۳)
	(۳۶۳)						
۱۹۳۶ء	۳۱۳	۱۱۴۹	۲۳۳۲	۲۹۳۳	۸۴۳	۹۹۵	۹۳۲
	(۴۴۰)	(۱۴۵۴)	(۳۲۶۶)	(۲۹۰۳)	(۹۹)	(۹۸۰)	(۱۱۱۹)
	(۳۸۸)						
۱۹۳۷ء	۹۴۰	۱۲۳۵	۳۲۹۸	۳۳۳۶	۱۲۳۵	۸۹۰	۱۰۳۲
	(۱۶۲۱)	(۱۰۱۵)	(۳۷۶۹)	(۳۳۳۰)	(۱۲۸۳)	(۸۶۳)	(۱۰۷۹)
	(۱۰۶۳)						

۱۹۳۸ء	۱۷۳۰	۷۳۶	۷۳۱۵	۵۳۲۹	۱۸۶۳	۹۹	۳۳۱
	(۲۳۸۹)	(۸۱۸)	(۵۸۰۷)	(۳۵۴۷)	(۱۹۵)	(۱۰۱۳)	(۳۳۱)
	(۱۷۰۶)						

مذکورہ تقابلی جائزے سے اٹلی کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے اول نصف عشرے میں اس نے اسلحہ پر زیادہ رقم خرچ نہیں کی تھی۔ تاہم اس نے روس کو چھوڑ کر دیگر ملکوں کے مقابلے میں اپنی قومی آمدنی کا وافر حصہ تینوں مسلح افواج پر خرچ کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ابی سینیا کی مہم جوئی اور اسپین میں مداخلتی اقدام کی وجہ سے اس ملک کو ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے دوران بے پناہ دفاعی اخراجات کرنے پڑے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ ان برسوں میں وہاں کا دفاعی بجٹ زیادہ تر انہی محاذ آرائیوں میں صرف کیا گیا۔ تینوں مسلح افواج کے معیار کو بہتر بنانے یا اسلحہ کا کارخانہ قائم کرنے کے ضمن میں رقم بالکل خرچ نہیں کی گئی۔ ابی سینیا اور اسپین کی محاذ آرائیوں نے اٹلی کی قوت کو خاصی حد تک کمزور کر کے رکھ دیا۔ اس کی وجہ محض میدان جنگ میں شکست کا سامنا نہ تھا۔ بلکہ جنگ کی طوالت' فوجی سازوسامان کی بکثرت درآمد اور ان کی ادائیگی کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۹ء کے آتے آتے بینک آف اٹلی کا محفوظ سرمایہ ختم ہو گیا۔ چنانچہ ہوائی اور بری فوج کو جدید خطوط پر ڈھالنے کے لیے ضروری سازوسامان منگوانا ممکن نہ رہا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں یہ ملک ۱۹۴۰ء سے قبل کے دو تین برسوں میں کمزور ہو کر رہ گیا۔ بری فوج بھی اندرونی طور پر بہتر نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ڈویژن میں رجمنٹ کو تین سے کم کر کے دو کر دیا گیا۔ اس طرح تمام ڈویژن کی تعداد نصف کے قریب تو ہو گئی اور افسروں کو ترقیاں بھی ملیں' لیکن بحیثیت مجموعی فوج کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہوائی فوج کی تیاری کا دارومدار ایک ایسے کارخانے پر تھا جو ۱۸-۱۹۱۵ء کے مقابلے میں پیداواری لحاظ سے کم تر درجے پر تھا۔ اس کے باوجود اٹلی یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کے ۸۵۰۰ ہوائی جہاز تھے۔ مزید تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ مجموعی تعداد غلط تھی۔ بامبر جہاز تو ۴۵۴ تھے جبکہ لڑاکا طیارے کل ۱۲۹۔ ان میں چند ایک ہی اعلیٰ درجے کے جہاز قرار دیے جا سکتے تھے۔ اٹلی کے پاس نہ تو صحیح قسم کے ٹینک تھے نہ ہی جہاز کو مار گرانے والی بندوقیں' نہ ہی تیز رفتار لڑاکا طیارے تھے نہ ہی اعلیٰ قسم کے بم اور ایئرکرافٹ کیریئر' نہ راڈار تھا' نہ ہی غیر ملکی کرنسی اور نہ ہی فوجی سازوسامان کے نقل کے مناسب ذرائع۔ ان حقائق کے باوجود مسولینی نے ۱۹۴۰ء میں اپنے ملک کو دوسری جنگ میں جھونک ڈالا محض اس امید پر کہ فتح تو اسے حاصل ہونی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فوجی سازوسامان کی اس شدید کمی کے نتیجے میں پیش آنے والی تباہی سے یا تو معجزہ بچا سکتا تھا یا اہل جرمنی!

اسلحہ اور فوجی تعداد کو زیادہ اہمیت دی جانے کے باعث قائدانہ صلاحیتوں' افسروں کی استعداد اور جنگ کے لیے قومی جوش و جذبے کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ مذکورہ عناصر بجائے اس کے کہ مادی وسائل کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے' الٹا ملک کی کمزوریوں میں اضافے کا باعث بنے رہے۔ اٹلی میں فاشی نظام کے تحت ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۰ء کے عرصے میں نہ تو معاشرے میں کوئی تبدیلی آئی تھی اور نہ ہی سیاسی کلچر میں۔ حتیٰ کہ فوج کی ملازمت بھی تعلیم یافتہ اور جوش و جذبے سے مملو مرد حضرات کے لیے باعث کشش نہ تھی۔ اس کے برعکس فوجیوں میں حسن کارکردگی کا فقدان تھا۔ پہل کرنے کی استعداد بالکل نہ تھی اور ذاتی ترقی حاصل کرنے کی دھن سوار رہتی تھی۔ ان باتوں کو دیکھ دیکھ کر جرمنی کے فوجی اتاشی اور مبصر حیران رہ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ فوج بھی مسولینی کی پوری گرفت میں نہ تھی اور

اس کی خواہش کے برعکس اقدام کر بیٹھتی۔ دوسرے کسی صلاح مشورے کے بغیر فوج کو جنگ میں دھکیل دیا جاتا حالانکہ اس سے بہتر صورت بھی اختیار کی جا سکتی تھی۔ اٹلی کی فوج میں تجربہ کار سینئر افسروں نیز نان کمیشن افسران کی بہت کمی تھی۔ چنانچہ بڑی طاقت کے لیے ہونے والی جنگ میں اس کی کارکردگی مایوس کن تھی۔ البتہ اس ملک کی بحریہ قدرے بہتر تھی۔ اگر اٹلی کی ہوائی فوج کا عملہ پڑھا لکھا اور تجربہ کار ہوتا تو بھی ناکارہ قسم کے لڑاکا طیاروں کی وجہ سے اس کی کارکردگی پر حرف آتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہاں ایسی چیف آف اسٹاف کمیٹی تھی ہی نہیں جو تینوں مسلح افواج کے درمیان رابطہ کاری کا فریضہ انجام دیتی یا کم از کم دفاعی ترجیحات پر تبادلہ خیال کرتی۔

آخری بات یہ کہ خود مسولینی فوجی نقطہ نظر سے سراسر ایک بوجھ تھا۔ وہ ہٹلر جیسا "قطعاً" نہ تھا حالانکہ وہ اس جیسا ہونے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ شاہ وکٹر ایمیل سوم نے بڑی جدوجہد کر کے اپنا شاہی اختیار قائم رکھا اور نوکر شاہی اور فوجی افسروں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ پاپائیت بھی آزاد واقع ہوئی تھی اور بہت سے اطالوی باشندوں کی نظر میں وہ اختیارات کا مرکز تھی۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ ۱۹۳۰ء کے تمام عشرے میں بڑے بڑے صنعت کار اور عام کسان حکومت کے لیے کوئی جذبہ نہیں رکھتے تھے۔ وہی نیشنل فاشسٹ پارٹی اور اس کے علاقائی عہدہ داران وہ سب ملک کی بہتری کی بجائے ملازمت کی بندر بانٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اگر مسولینی کی حکومت بہت اعلیٰ درجے کی ہوتی تو بھی اٹلی کی پوزیشن جوں کی توں رہتی اور اس میں بہتری کے آثار نمایاں نہ ہوتے۔ اس کی وجہ "ڈوچا" (مسولینی) کی خود غرضی' کروفر' کذب بیانی' فکر و عمل میں تضاد اور انتظامی نااہلی تھی۔

۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں مغرب کے اتحادیوں نے اس حقیقت پر بہت غور و خوض کیا تھا جب اٹلی غیر جانب دار رہنے کی بجائے جنگ میں جرمنی کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس وقت برطانیہ کے چیف آف سٹاف کی یہ خواہش تھی کہ اٹلی جنگ سے دور رہے تاکہ بحیرہ روم اور مشرق قریب میں امن بحال رکھا جا سکے۔ اس وقت اس رائے کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا گیا تھا' لیکن ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھا جائے تو یہ خیال صحیح تھا۔ انسانی جنگ کی تاریخ میں ایسا شاذونادر ہی ہوا ہے کہ لڑائی میں مزید ایک دشمن کے شامل ہو جانے سے اس کے دشمن کو نہیں' خود اس کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسولینی اور اس کا ملک اٹلی اپنی مثال آپ ہے۔

جاپان نے اس وقت کے حالات قائمہ کو جس طرح چیلنج کیا تھا وہ اگرچہ انفرادی نوعیت کا معاملہ تھا' لیکن مستحکم قوتوں کو نہایت فکریہ انداز میں اس کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے عشرے میں دنیا میں نسلی اور تہذیبی منافرت کا رنگ شدت سے غالب تھا۔ مغرب میں بہت سے لوگ جاپانیوں کو "زردی مائل ٹھگنا آدمی" کہہ کر دھتکار دیتے تھے۔ لیکن پرل ہاربر' ملایا اور فلپائن حملے کے بعد ان لوگوں نے دنیا کو نہ صرف حیرت میں ڈال دیا بلکہ مذکورہ بالا فقرے کی مکمل نفی کر دی۔ جاپانی بحریہ نے اپنے عملے کو دن رات جنگ کرتے رہنے کے تجربے سے آشنا کیا۔ اس ملک کے اتاشی جہاں بھی تھے وہاں سے حکمت و دانش کے موتی رول رول کر وطن بھیج رہے تھے۔ اسی طرح بری فوج اور بحری جہاز پر تعینات ہوائی فوج کے افسران خاصے تجربہ کار تھے۔ اعلیٰ صلاحیت کے حامل پائلٹ اور جاں باز عملہ وافر تعداد میں بحری جہاز پر موجود

رہتا۔ جاپان کی بری فوج کے افسران بھی باہمت اور جوش و جذبے سے سرشار تھے۔ وہ حملہ اور دفاع دونوں صورتوں میں اپنی جاں بازی اور جرات کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ کمزور قسم کے وزراء کو جان سے مار ڈالنے کا واقعہ ان کی شجاعت کا مظہر تھا۔ دوسرے ممالک کی افواج آخری سپاہی تک لڑنے کا دعویٰ کیا کرتی تھیں، لیکن جاپان کے فوجیوں نے اس قول کو برت کر دکھا دیا۔

قدیم "زونو" جانبازوں کے مقابلے میں جاپان کے موجودہ سپاہی فوجی تکنیک سے بخوبی واقف تھے اور ان میں شان شجاعت بھی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں صنعت سازی کو فروغ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اتحادی ملکوں سے جاپان کو جہاں اسلحہ فراہم کرنے کا ٹھیکہ مسلسل مل رہا تھا وہاں اس کے جہازوں کی مانگ کی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسرے جاپان کے برآمد کنندگان بہ آسانی ایشیا کی منڈیوں کو سامان پہنچا رہے تھے جو مغرب کے تاجروں کے لیے ممکن نہ تھا۔ جنگ کے دوران جاپان کی درآمدات اور برآمدات میں تین گنا اضافہ ہوا تھا۔ اسی طرح فولاد اور سیمنٹ کی مصنوعات دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔ اسی طرح کیمیائی اور بجلی کی صنعت کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح جنگ کے دوران جاپان کا بیرونی قرضہ ادا ہو چکا تھا اور اس کی حیثیت ایک دائن کی ہو گئی تھی۔ جہاز سازی کی صنعت میں جاپان کو ایک امتیازی مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اس نے ۱۹۱۳ء میں جہاں ۸۵۰۰۰ ہزار ٹن وزنی جہاز سطح سمندر پر اتارے تھے، وہاں ۱۹۱۹ء میں اتارے گئے جہازوں کا وزن ۶۵۰۰۰۰ ٹن تک پہنچ چکا تھا۔ لیگ آف نیشنز کے شائع کردہ "ورلڈ اکانومک سروے" سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ کے نتیجے میں جاپان کی صنعتی پیداوار ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ پھر ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران جاپان کی صنعتی ترقی اسی طرح برقرار رہی۔ چنانچہ اس معاملے میں یہ روس کے بعد دوسرے نمبر پر فائز تھا۔ (ملاحظہ کیجئے جدول ۲۸)

جدول نمبر۲۸: مصنوعات کی تیاری کا سالانہ گوشوارہ

۱۹۱۳ء ۔۔ ۱۹۳۸ء

(۱۹۱۳ = ۱۰۰)

سال	دنیا	امریکہ	جرمنی	برطانیہ	فرانس	روس	اٹلی	جاپان
۱۹۱۳ء	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰
۱۹۲۰ء	۹۳٫۶	۱۲۲٫۲	۵۹	۹۲٫۶	۷۰٫۴	۱۲٫۸	۹۸٫۴	۱۶۷٫۱
۱۹۲۱ء	۸۱٫۱	۹۸	۷۴٫۷	۵۵٫۱	۶۱٫۴	۲۳٫۳	۹۸٫۴	۱۶۷٫۱
۱۹۲۲ء	۹۹٫۵	۱۲۵٫۸	۸۱٫۸	۷۳٫۵	۸۷٫۸	۲۸٫۹	۱۰۸٫۱	۱۹۷٫۹
۱۹۲۳ء	۱۰۴٫۵	۱۴۱٫۴	۵۵٫۴	۷۹٫۱	۹۵٫۲	۳۵٫۴	۱۱۹٫۳	۲۰۶٫۳
۱۹۲۴ء	۱۱۱	۱۳۳٫۲	۸۱٫۸	۸۷٫۸	۱۱۷٫۹	۴۷٫۵	۱۴۰٫۷	۲۲۳٫۳
۱۹۲۵ء	۱۲۰٫۷	۱۴۸	۹۴٫۹	۸۶٫۳	۱۱۴٫۳	۷۰٫۲	۱۵۶٫۸	۲۲۱٫۸
۱۹۲۶ء	۱۲۶٫۵	۱۵۶٫۱	۹۰٫۹	۷۸٫۸	۱۲۹٫۸	۱۰۰٫۳	۱۶۲٫۸	۲۶۴٫۹
۱۹۲۷ء	۱۳۴٫۵	۱۵۴٫۵	۱۲۲٫۱	۹۶٫۰	۱۱۵٫۶	۱۱۴٫۵	۱۶۱٫۲	۲۷۰
۱۹۲۸ء	۱۴۱٫۸	۱۶۲٫۸	۱۱۸٫۳	۹۵٫۱	۱۳۴٫۴	۱۴۳٫۵	۱۷۵٫۲	۳۰۰٫۲
۱۹۲۹ء	۱۵۳٫۳	۱۸۰٫۸	۱۱۷٫۳	۱۰۰٫۳	۱۴۲٫۷	۱۸۱٫۴	۱۸۱	۳۲۴
۱۹۳۰ء	۱۳۷٫۵	۱۴۸	۱۰۱٫۶	۹۱٫۳	۱۳۹٫۹	۲۳۵٫۵	۱۶۴	۲۹۴٫۹
۱۹۳۱ء	۱۲۲٫۵	۱۲۱٫۶	۸۵٫۱	۸۲٫۴	۱۲۲٫۶	۲۹۳٫۹	۱۴۵٫۱	۲۸۸٫۱
۱۹۳۲ء	۱۰۸٫۴	۹۳٫۷	۷۰٫۲	۸۲٫۵	۱۰۵٫۴	۳۲۶٫۱	۱۲۳٫۳	۳۰۹٫۱
۱۹۳۳ء	۱۲۱٫۷	۱۱۱٫۸	۷۹٫۴	۸۳٫۳	۱۱۹٫۸	۳۶۳٫۲	۱۳۳٫۲	۳۶۰٫۷
۱۹۳۴ء	۱۳۶٫۴	۱۲۱٫۶	۱۰۱٫۸	۱۰۰٫۲	۱۱۱٫۴	۴۳۷	۱۳۴٫۷	۴۱۳٫۵
۱۹۳۵ء	۱۵۴٫۵	۱۴۰٫۳	۱۱۶٫۷	۱۰۷٫۹	۱۰۹٫۱	۵۳۳٫۷	۱۶۲٫۲	۴۵۷٫۸
۱۹۳۶ء	۱۷۸٫۱	۱۷۱	۱۲۷٫۵	۱۱۹٫۱	۱۱۶٫۳	۶۹۳٫۳	۱۶۹٫۲	۴۸۳٫۹
۱۹۳۷ء	۱۹۵٫۸	۱۸۵٫۸	۱۳۸٫۱	۱۲۷٫۸	۱۲۳٫۸	۷۷۲٫۲	۱۹۴٫۵	۵۵۱
۱۹۳۸ء	۱۸۲٫۷	۱۴۳	۱۴۹٫۳	۱۱۷٫۶	۱۱۴٫۶	۸۵۷٫۳	۱۹۵٫۲	۵۵۲

یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۳۸ء کے بعد جاپان نہ صرف اٹلی کے مقابلے میں اقتصادی لحاظ سے زیادہ مستحکم تھا بلکہ جملہ صنعتی مصنوعات میں وہ فرانس سے بھی خاصا آگے نکل گیا تھا۔ (دیکھیے جدول ۱۴ تا ۱۸) اگر اس کے فوجی سربراہ ۱۹۳۷ء میں چین کے ساتھ جنگ نہ کرتے اور ۱۹۴۱ء میں بحرالکاہل کے علاقے میں خون ریز لڑائی میں ملوث نہ ہوتے تو یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۶۰ء کے وسطی عشرے میں یہ ملک پیداواری لحاظ سے برطانیہ کو بھی مات کر چکا ہوتا۔

یہاں یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ جاپان نے بغیر کدو کاوش کے اپنے سارے اقتصادی مسائل حل کر لیے تھے۔ غرض یہ کرنا ہے کہ وہ لحظہ بہ لحظہ مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ حالانکہ اس کا بینکاری کا نظام خاصا فرسودہ تھا جس کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم کے دوران اس کے لیے ایک دائن کی حیثیت اختیار کرنا خاصا مشکل مرحلہ تھا اور رسدزر کے معاملے کی وجہ سے وہاں شدید افراط زر کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں اس فساد کا ذکر مقصود نہیں ہے جو جاپان میں ۱۹۱۹ء میں چاول کی وجہ سے برپا ہوا تھا۔ جب امن بحال ہونے کے بعد یورپ نے پارچہ بافی، تجارتی جہاز اور دیگر اشیاء کی صنعت سازی شروع کی تو نئی نئی مسابقت سے جاپان پر خاصا دباؤ پڑا۔ اس دور میں جاپانی مصنوعات کی پیداواری لاگت پورے مغربی ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں جاپان کی زیادہ تر آبادی چھوٹے چھوٹے کھیتوں پر انحصار کرتی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کو تائیوان اور کوریا سے درآمد شدہ چاول کے نتیجے میں خاصا نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ نیز ۱۹۳۰ء کے بعد جاپان کی خاص برآمدی شے یعنی ریشم کی مانگ امریکہ میں باقی نہیں رہی۔ اقتصادی طور پر اس کے مضر اثرات بھی رونما ہوئے۔ ان نقصانات کے ازالے کے لیے سلطنت کی توسیع ہوتی رہی تاکہ فکر مند مگر پرجوش جاپانی سیاست دانوں کی اشک شوئی ہو سکے۔ اس کی واضح مثال منچوریہ کی فتح ہے جس کے نتیجے میں اسے معاشی اور دفاعی فوائد حاصل ہوئے۔ جب ۱۹۳۰ء کے عشرے میں جاپان کی صنعت و تجارت نے ترقی کی اور اسلحہ کی برآمد اور مشرقی ایشیا کی منڈیوں پر تسلط کے نتیجے میں اس کا کاروبار خوب چمکا تو لامحالہ اسے بیرونی ملکوں سے زیادہ سے زیادہ خام مال منگوانا پڑا۔ (اس لحاظ سے جاپان کی حیثیت اٹلی جیسی تھی) جب جاپان میں فولاد کے کارخانے وسیع پیمانے پر کام کرنے لگے تو اس ملک کو چین اور ملایا سے کچا لوہا منگوانا پڑا۔ صنعتی ضرورتوں کے لحاظ سے ملکی کوئلے اور تانبے کا ذخیرہ ناکافی تھا۔ پھر بھی یہ اتنی تشویشناک بات نہ تھی جتنا فکر انگیز معاملہ پٹرول سے فراہم کردہ ایندھن پر کلی انحصار کا تھا۔ جاپان کا مطمع نظر اقتصادی تحفظ کا حصول تھا جو

قوم پرستوں اور فوجی حکمرانوں کے لیے وجہ طمانیت تھا اور اسی نظریے کی اساس پر یہ ملک آگے کی جانب رواں دواں رہا۔۔ لیکن نتائج ملے جلے تھے۔

مذکورہ تمام اقتصادی مشکلات کے باوجود تکاہاشی کی وزارت مالیات ۱۹۳۰ء کے ابتدائی عشرے میں بے انتہا قرض پر قرض لیے چلی جا رہی تھی تاکہ دفاعی ضروریات پر زیادہ سے زیادہ خرچ کیا جا سکے۔ چنانچہ اس مد میں جو رقم ۳۲-۱۹۳۱ء میں خرچ کی گئی تھی' اس کی شرح ۳۱ فی صد تھی جو ۳۷-۱۹۳۶ء میں بڑھ کر ۴۷ فی صد ہو گئی۔ جب معاشی بحران پیدا ہونے کے نتیجے میں اس نے اس بڑھتی ہوئی شرح کو روکنا چاہا تو اسے فوجیوں نے فی الفور ہلاک کر ڈالا۔ پھر اسلحے کے اخراجات میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اگلے سال حکومت کے مجموعی اخراجات کا ۷۰ فی صد حصہ مسلح افواج کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اس طرح جاپان کسی بھی مال دار جمہوری حکومت سے کہیں زیادہ رقم دفاع کے مد میں خرچ کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں جاپان کی مسلح افواج اعلیٰ کی فوجوں سے بدرجہا بہتر تھیں اور یہ بھی یقین کیا جا سکتا ہے کہ فرانس اور برطانیہ سے بھی اعلیٰ تھیں۔ واشنگٹن کے معاہدے کے تحت جاپان کی شاہی بحریہ پر یہ پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ وہ برطانیہ اور امریکہ کی بحریہ کے نصف ہو گی' اس کے باوجود یہ ملک دونوں ملکوں سے بحری طاقت میں کہیں زیادہ برتری رکھتا تھا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں بحری طاقت میں برتری رکھنے والے ملک' برطانیہ اور امریکہ نے اگرچہ اس مد میں کفایت شعاری اختیار کی تھی لیکن جاپان مقررہ حد کے تحت اپنی بحریہ کو مستحکم کرتا گیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ در پردہ مقررہ حد سے تجاوز بھی کرتا چلا گیا' مثلاً" مسلح نامے کے تحت اس کے کروزر کو ۸ ہزار ٹن وزنی ہونا چاہیے تھا لیکن جاپان نے اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے چودہ ہزار ٹن وزنی بنا لیا۔ جاپان کے بڑے بڑے جنگی جہاز تیز رفتار بھی تھے اور پوری طرح مسلح بھی اور اس نے قدیم طرز کے جہازوں کو جدید وضع کا بنا لیا گیا تھا۔ بعد ازاں تو یہ صورت حال ہوئی کہ ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں جاپان نے "یاماتو" قسم کے اعلیٰ جہاز سطح سمندر پر اتار دیے۔ دنیا میں کسی بھی ملک کے جہازوں سے یہ جاپانی جہاز بہت زیادہ بڑے تھے۔ سب سے اہم بات جسے دیگر ممالک کے امیرالبحر نے محسوس نہیں کیا جاپانی بحریہ کی طاقتور اور نہایت موثر قسم کی ہوائی سروس تھی۔ اس کے بحری جہازوں میں ۲۰۰۰ ہزار ایئرکرافٹ اور ۳۵۰۰ پائلٹ تھے۔ یہ سب اگرچہ کیریئر میں ہی موجود ہوتے لیکن ان کے علاوہ نہایت خطرناک قسم کے بم اور تارپیڈو سے لیس ایسے اسکوڈرن بھی ہوتے تھے جو خشکی پر حکم کے منتظر رہتے۔ جاپان کے تارپیڈو اپنی طاقت اور کارکردگی میں بے مثال تھے۔ آخری بات یہ کہ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی جہازوں میں یہ ملک تیسرے درجے پر فائز تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جاپانی بحریہ نے سب میرین کے ذریعے جنگ کرنے کو سراسر نظرانداز کر دیا تھا۔

جاپان میں جبری بھرتی کا رواج عام تھا۔ چنانچہ بری فوج کے لیے سپاہی با آسانی فراہم ہو جاتے۔ پھر انھیں روایتی انداز کی فرماں برداری اور جفاکشی کی تربیت دی جاتی۔ اگرچہ ابتدائی سالوں میں جاپان نے اپنی بری فوج کا سائز مختصر رکھا تھا لیکن بعد ازاں اس میں توسیع کا پروگرام بنایا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں بری فوج کے ۲۴ ڈویژن اور ۵۴ ائر اسکوڈرن تھے۔ ۱۹۴۱ء میں توسیعی منصوبے کے تحت ۵۱ ڈویژن اور ۱۳۳ ائر اسکوڈرن ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں ۱۰ ڈپوٹ ڈویژن تربیت کے لیے مخصوص تھے۔ پھر لاتعداد بریگیڈ اور محافظ دستے تھے جو بلا شبہ ۳۰ ڈویژن فوج کے برابر تھے۔ جنگ کے موقع پر جاپان کے پاس دس لاکھ سے زائد سپاہیوں پر مشتمل ایک شان دار فوج موجود تھی۔ مزید بیس لاکھ افراد پر مشتمل تجربہ کار محفوظ دستے اس کی

پشت پناہی کر رہا تھا۔ البتہ جاپان کو ٹینک میں فوقیت حاصل نہ تھی۔ اس میدان میں زیادہ طاقتور نہ ہونے کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ میدان جنگ یا مشرقی ایشیا میں زیادہ تر لکڑی کے بنے ہوئے پل ٹینکوں کے نقل و حمل کے لیے سراسر ناموزوں تھے۔ بہرحال جاپان کے پاس اچھی قسم کی متحرک توپیں موجود تھیں۔ پھر جاپانی فوج اتنی تربیت یافتہ تھی کہ جنگلوں میں مہم جاری رکھتی' دریاؤں کو عبور کر جاتی اور نہایت سرعت سے میدان جنگ میں آ دھمکتی۔ پیادہ فوج کے صف اول کا دو ہزار ایئرکرافٹ کا دستہ' بحریہ ہی کی طرح جنگجو قسم کے "زیرو" لڑاکا طیاروں پر مشتمل تھا۔ یہ اس درجہ تیز رفتار اور جنگجویانہ صفت کا حامل تھا کہ ایسی کوئی چیز اس وقت یورپ میں تیار نہیں ہوئی تھی۔

غرض جاپان کی فوجی کارکردگی نہایت اعلیٰ تھی۔ پھر بھی یہ ملک کمزوریوں سے مبرا نہ تھا۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں حکومت نے جو فیصلے کیے وہ بے سود ہو کر رہ گئے۔ اس کی وجہ دراصل مختلف دھڑوں میں آپس کی لڑائی' سول اور فوجی افسران کا باہمی جھگڑا اور پھر قتل کا سلسلہ تھا۔ علاوہ ازیں' بری اور بحری فوج میں رابطہ کاری کی کمی تھی۔ یہ صورت حال ویسے تو کوئی انوکھی نہ تھی جاپان کے معاملے میں یہ نہایت تشویش ناک تھی اس لیے کہ ہر دو افواج کو مختلف دشمنوں اور علاقوں کا سامنا تھا۔ جاپانی بحریہ کو جہاں برطانیہ یا امریکہ سے متصادم ہونے کا خدشہ تھا وہاں بری فوج کی تمام تر توجہ براعظم ایشیا اور وہاں جاپانی مفاد کو درپیش روسی خطرات کی جانب مرکوز تھی۔ چونکہ جاپان کی سیاست میں بری فوج کا عمل دخل زیادہ تھا اور شاہی جنرل ہیڈ کوارٹرز پر بھی اسی کا اثر قائم تھا' لہٰذا عمومی طور پر اسی کی رائے تسلیم کی جاتی تھی۔ بحریہ اور وزارت خارجہ کے افسران کی جانب سے اس معاملے میں کوئی خاص مخالفت تو نہ ہوتی تھی البتہ دونوں ۱۹۳۷ء میں اس وقت اڑ گئے جب بری فوج نے مارکوپولو کے پل والے واقعہ کے پیش نظر چین کے خلاف مزاحمتی کاروائی اختیار کرنے پر زور دیا تھا۔ اگرچہ جاپان کی بری فوج نے منچوریہ کے راستے شمالی چین پر شدید حملہ کیا تھا اور یہ چین کے ساحلوں پر اتر آئی تھی' لیکن اسے فیصلہ کن فتح حاصل نہ ہو سکی۔ اگرچہ چیانگ کائی شیک کے فوجی بڑی تعداد میں ہلاک ہوئے تھے' پھر بھی اس نے لڑائی جاری رکھی اور ان علاقوں میں دور تک گھس گیا جہاں جاپانی دستے اور ایئر کرافٹ حملے کر رہے تھے۔ اگرچہ اس مہم جوئی میں شاہی جنرل ہیڈ کوارٹرز کو اس قدر نقصان نہیں اٹھانا پڑا تھا (صرف ستر ہزار سپاہی مارے گئے تھے) لیکن دور دراز کی اس ناکام اور بے نتیجہ محاذ آرائی میں اخراجات تو کثیر ہوئے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے آخر تک چین میں جاپان کی سات لاکھ فوج تعینات تھی۔ اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ (ولسوٹ کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۳۸ء میں جاپان کی دس لاکھ پچیس ہزار فوج چین میں تعینات تھی۔ یہ تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے) بہرحال یہ جاپانی فوج چینیوں کو باج گزار نہ بنا سکی۔ ٹوکیو کے ایک اعلامیے کے مطابق اس چینی مہم کی وجہ سے روزانہ ۵ ملین ڈالر کی رقم خرچ ہو رہی تھی اور اس سے کہیں زیادہ خرچ دفاعی اخراجات پر اٹھ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں راشن کا نظام نافذ کرنا پڑا۔ اسی طرح اور بھی مناسب اقدامات عمل میں آئے۔ غرض اس طرح جاپان ایک جنگ عظیم کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے حکومت قرض پر قرض لیے چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ قومی قرضہ میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔

یہ صورت حال اور بھی ناگفتہ بہ ہو گئی جب جاپان کی غیر ملکی کرنسی کا اسٹاک کم ہو گیا اور خام مال کا ذخیرہ بھی باقی نہیں رہا۔ پھر اپنی درآمدی اشیاء کے لیے وہ زیادہ تر امریکہ، برطانیہ اور ولندیزیوں پر بھروسہ کرتا تھا جو اس سے کٹے ہوئے تھے۔ چونکہ اس کی ہوائی فوج نے چین کی محاذ آرائی میں بہت بڑی مقدار میں ایندھن استعمال کر لیا تھا لہٰذا اس کی کو پورا کرنے کے لیے حکم دیا گیا کہ ٹیکسیاں ۳۷ فی صد بحری جہاز ۱۵ فی صد اور آٹو موبائل ۳۵ فی صد تیل کا استعمال کم کر دیں۔ اہل جاپان کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ ان کو یقین تھا کہ چیانگ کائی شیک کی فوجیں محض اس لیے مزاحمت برقرار رکھے ہوئے تھیں کہ انھیں برما، فرانسیسی انڈو چین اور دیگر ملکوں کے راستے مغربی ممالک سے امداد پہنچائی جا رہی تھی۔ چنانچہ عوام کے اصرار بڑھا کہ جاپان جنوب کی جانب سے حملہ کر دے۔ اس طرح چین کو تنہا کر کے جنوب مشرقی ایشیا، ولندیزی شرق الہند اور بورنیو کے تیل کے ذخائر اور دیگر خام مال پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہی وہ فوجی حکمت عملی تھی جس کو بروئے کار لانے کے لیے جاپانی بحریہ ہمیشہ کوشاں رہی۔ حتیٰ کہ بری فوج بھی جو سوویت یونین اور چین کی سمات پر زیادہ متوجہ تھی، رفتہ رفتہ اس بات کی قائل ہو گئی کہ جاپان کی اقتصادی حالت کی بہتری کے لیے یہ اقدام ناگزیر ہے۔

اس طرح مسئلہ اور بھی گھمبیر ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے تک جاپان نے اپنی فوجی صلاحیت کو جس تیزی سے فروغ دیا تھا اس کے پیش نظر وہ فرانسیسیوں کو انڈو چین سے اور ولندیزیوں کو شرق الہند سے با آسانی بھگا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ سلطنت برطانیہ بھی جاپان کے مد مقابل آنے سے گریزاں رہتی۔ اس کا اعتراف وائٹ ہال میں فوجی حکمت عملی وضع کرنے والوں نے خفیہ طور پر ۱۹۳۰ء کی دہائی کے دوران خود کیا تھا۔ جب یورپ میں جنگ کا آغاز ہو گیا تو اس صورت میں برطانیہ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مشرق بعید کے خاطر کوئی پابندی اپنے سر لیتا۔ بہرحال یہ جاپانیوں کا اپنا معاملہ تھا کہ وہ روس یا امریکہ کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آئیں۔ مثال کے طور پر مئی اور اگست ۱۹۳۹ء کے دوران سرحدی قضیے کے سلسلے میں روسی فوج کے ساتھ طویل اور خون ریز جنگ سے شاہی جنرل ہیڈ کوارٹرز فوس کی اعلیٰ درجے کی توپوں، بہتر ہوائی جہازوں اور آگ کے گولے برساتے ہوئے بڑے بڑے ٹینکوں کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو چکا تھا۔ پھر منچوریہ کے پاس جو مجموعی فوج تھی وہ اس فوج کا محض نصف تھی جسے روس نے منگولیا اور سائبیریا میں تعینات کیا تھا۔ پھر جاپان کی فوج کا کثیر حصہ چین میں پھنسا ہوا تھا۔ چنانچہ انتہا پسند فوجی افسروں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سوویت یونین کے ساتھ جنگ کرنے سے اس وقت تک گریز کیا جائے جب تک بین الاقوامی حالات سازگار نہ ہو جائیں۔

اگر شمال کی جنگ سے جاپان کی مجبوریاں ظاہر ہو سکتی ہیں تو جنوب کی جنگ سے کیوں نہیں جبکہ اس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو گھسیٹنے کا احتمال تھا؟ اور کیا روز ویلٹ کی حکومت جس نے چین میں جاپانی اقدام کی سخت مذمت کی تھی، محض تماشائی بنی کھڑی رہتی جبکہ ٹوکیو ولندیزیوں کے شرق الہند اور ملایا پر قبضہ کر کے متمتع ہو رہا ہوتا اور اس طرح امریکہ کے اقتصادی دباؤ سے گلو خلاصی حاصل کر چکا ہوتا؟ چنانچہ جولائی ۱۹۳۸ء میں ہوابازی کے جملہ سامان کی برآمد پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اسی سال امریکہ اور جاپان کے مابین تجارتی معاہدہ کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اس دوران سب سے اہم واقعہ یہ ہوا کہ جب جولائی ۱۹۴۱ء میں جاپان نے انڈو چین پر قبضہ کر لیا تو برطانیہ، ولندیز اور امریکہ نے مل کر اس ملک کو تیل اور لوہے کی کچ دھات برآمد کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ چنانچہ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جاپان کو

"اقتصادی تحفظ" اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے باقاعدہ جنگ کی جائے۔ لیکن اہل جاپان کو یہ اندازہ غالباً" نہ تھا کہ امریکہ کی آبادی ان کے ملک کے مقابلے میں دوگنی اور آمدنی سات گنا زیادہ تھی۔ وہ پانچ گنا زیادہ فولاد اور سات گنا زیادہ کوئلہ پیدا کرتا تھا۔ وہ سال میں اسی گنا زیادہ موٹر گاڑیاں بناتا تھا۔ اس کی صنعتی صلاحیت ۱۹۳۸ء کے ناسازگار حالات کے باوجود جاپان کے مقابلے میں سات گنا زیادہ تھی۔ اگلے برسوں میں اس کے نو سے دس گنا زیادہ ہو جانے کے امکانات تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اہل جاپان بے حد محب وطن تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۵ء میں چین اور ۱۹۰۵ء میں روس جیسے بڑے دشمنوں کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ لیکن اب وہ عجیب احمقانہ اقدام پر تلے ہوئے تھے۔ ایڈمرل یاماموتو جیسا سنجیدہ حکمت عملی وضع کرنے والا شخص امریکہ جیسے نہایت طاقتور ملک پر حملہ کرنے کی بے وقوفی کر رہا تھا وہ بھی ایسے وقت میں جب جاپانی فوج کو چین میں ابھی رہنا تھا۔ غرض جولائی ۱۹۴۱ء کے بعد امریکہ سے محاذ آرائی نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مغرب کے اقتصادی بلیک میل کرنے والوں پر جاپان کی حقیقت کھل جاتی جو وہاں کے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت معاملہ تھا۔ چنانچہ پیچھے ہٹنے کی بجائے جاپان کے فوجی افسران میدان کارزار میں کودنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

۱۹۲۰ء کے عشرے میں جرمنی خاصا کمزور ہو چکا تھا اور بڑی طاقتوں کی وجہ سے بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا جو جنگ کے بعد علاقائی انتظامات اور اقتصادی معاملہ بندی سے مطمئن نہ تھے۔ جرمنی صلح ورسیلز کے دفاعی اقدامات کی وجہ سے مل کر رہ گیا تھا۔ اسے تاوان جنگ ادا کرنے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اپنے سرحدی علاقے فرانس اور پولینڈ کو منتقل ہو جانے کی وجہ سے وہ دفاعی لحاظ سے خاصا دباؤ میں تھا۔ پھر اندرون ملک افراط زر، طبقہ واریت کا بحران اور سیاسی جماعتوں کی بے چینیاں الگ سوہان روح بنی ہوئی تھیں۔ ایسی صورت حال میں جرمنی کو خارجہ امور میں آزادانہ اقدامات کرنے کی وہ آزادی میسر نہ تھی جو اٹلی اور جاپان کو حاصل تھی۔ بہرحال مذکورہ عشرے کے اواخر میں خوشحالی آنے کی وجہ سے نیز سفارت کاری کے ذریعے جرمنی کی پوزیشن کو بہتر بنانے کی کامیاب جدوجہد کی بدولت ملک کے حالات خاصے سنبھل گئے اور ترقی کے امکانات روشن ہو گئے۔ لیکن ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک جو مالیاتی اور تجارتی بحران رہا اس کی وجہ سے جرمنی پورے طور پر بڑی طاقت کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ علاوہ ازیں اس کی مستحکم اقتصادی حالت اور ویمار کی قائم کردہ مگر حد سے زیادہ ناپسندیدہ جمہوریت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔

ہٹلر کے اقدامات نے محض چند برسوں میں یورپ میں جرمنی کی پوزیشن میں خاصی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ لہٰذا اس ضمن میں جو باتیں قبل ازیں بیان کی گئی تھیں، ان کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے: یہ امر واقعہ ہے کہ ہر جرمن تبدیلی کا خواہاں تھا۔ پھر نازی کی خارجہ پالیسی دراصل جرمن قوم پرستوں اور کچلے ہوئے فوجیوں کے جذبات و خواہشات کی مظہر تھی۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۲ء کے دوران مشرقی و وسطی یورپ میں سرحدی تنازعہ جس طرح طے ہوا تھا اس سے دیگر بہت سے ممالک اور نسلی طبقے مطمئن نہیں تھے۔ ان تمام لوگوں نے اس میں تبدیلی کے لیے اصرار کیا تھا اور یہ بات نازیوں کے برسراقتدار آنے سے بہت پہلے کی ہے۔ اگرچہ جرمنی کے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے، آبادی تباہ و برباد ہوئی تھی اور خام مال کا متاثر ہوا تھا، اس کے باوجود اس کی صنعتی صلاحیت یورپ کی طاقتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔

بہرحال جرمنی کی ترقی و استحکام کے بغیر عالمی توازن ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں جان دار نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہٹلر نے جرمنی کی فوجی اور سفارتی پوزیشن کو مستحکم بنانے میں خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حالات ہٹلر کے لیے خاصے سازگار تھے۔

ہٹلر کی خصوصیت کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ جرمنی کو نیشنل سوشلسٹ ملک بنانا چاہتا تھا' یعنی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا تھا جو یہودیوں' جپسیوں اور اسی قبیل کے لوگوں سے پاک ہو اور عوام ذہنی اور قلبی طور پر اور بے چوں و چرا حکومت کی حمایت کریں تاکہ کلاس' چرچ' علاقے اور خاندان کے ساتھ وابستہ قدیم وفاداری ختم ہو۔ سلطنت کی توسیع کی خاطر اقتصادی نظام کو متحرک کیا جائے اور اسے حسب ضرورت کنٹرول میں رکھا جائے چاہے بڑی طاقتوں کو یہ اقدام کیسا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ طاقت' جدوجہد اور نفرت پر مبنی ایک ایسا نظریہ قائم ہو جس کے تحت دشمنوں کو ٹھوکریں مار کر مسرت حاصل ہو۔ جس میں سمجھوتے کے تصور کی بیخ کنی ہو۔ بیسویں صدی میں جرمن معاشرے کا جو سائز اور تنوع تھا' اس کے پیش نظر یہ کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کا یہ تصور بالکل غیر حقیقی تھا۔ پورے ملک میں ہٹلر کی طاقت لامحدود نہ تھی۔ چند مفاد پرست ایسے ضرور تھے جنہوں نے ۳-۱۹۳۲ء میں اور پھر ۹-۱۹۳۸ء میں اس کی حمایت کی تھی۔ لیکن پھر جذبہ سرد پڑنے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں بہت سے لوگوں نے کھلے عام حکومت کی مخالفت کی تھی' وہاں چند ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے عوام کو ذہنی طور پر مزاحمت کے لیے تیار کیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود نیشنل سوشلسٹ حکومت بہت مقبول تھی۔ پھر سب سے اہم بات یہ کہ حکومت قدرتی وسائل کو بے دریغ استعمال کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ وہاں ایک ایسا سیاسی کلچر وجود میں آ چکا تھا جس کا مطمع نظر ہی جنگ و جدال اور نفرت و کامرانی تھا۔ اور سیاسی نہج کی اقتصادیات کچھ ایسی تھی کہ ۱۹۳۸ء میں سرکاری اخراجات کا ۵۲ فی صد اور مجموعی قومی پیداوار کا ۱۷ فی صد صرف اسلحے کے لیے وقف تھا۔ غرض جرمنی یورپ کے دیگر ممالک کے برعکس ایک عجیب و غریب ہیئت کی ریاست بن چکا تھا جس زمانے میں میونخ کا معاہدہ عمل میں آیا تھا' جرمنی' برطانیہ' فرانس اور امریکہ کے مجموعی اخراجات سے کہیں زیادہ رقم اسلحہ پر خرچ کر رہا تھا۔ غرض حکومت کی بھرپور توجہ اس بات پر تھی کہ ملک کی جملہ توانائیاں نئی جدوجہد کے لیے وقف کر دی جائیں۔

جرمنی کے دوبارہ اسلحہ سے لیس ہونے کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی حالت دگرگوں ہو گئی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اٹلی اور جاپان کو بھی ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں اسی قسم کے معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھر یہی صورت حال فرانس اور برطانیہ کے ساتھ بھی پیش آ چکی تھی جب یہ دونوں ملک اسلحہ کے ڈھیر لگانے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ان مذکورہ ملکوں میں مسلح افواج نے اتنی تیزی اور اچانک ترقی نہیں کی جتنی سرعت سے جرمنی نے ترقی کے مراحل طے کیے۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں جرمنی کی فوج ایک لاکھ سے زائد فوجیوں پر مشتمل نہ تھی۔ ویسے ہٹلر کے برسراقتدار آنے سے پہلے وہاں یہ خفیہ منصوبہ تیار ہو چکا تھا کہ سات ڈویژن فوج کو توسیع دے کر اکیس ڈویژن فوج بنائی جائے گی۔ اسی طرح نجی طور پر ہوائی فوج' ٹینک اور دیگر دفاعی سامان تیار ہونے لگے تھے جو ورسیلز کے صلح نامے کے بالکل منافی تھے اور ایسا کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ہٹلر نے فروری ۱۹۳۳ء میں وون فرچ کو یہ واضح ہدایت دی تھی کہ "ممکنہ حد تک نہایت طاقتور فوج تیار کی جائے" چنانچہ منصوبہ سازوں نے اس سے یہ اشارہ اخذ کیا کہ گذشتہ منصوبے پر عمل درآمد کیا جائے۔ پھر مالیاتی اور افرادی قوت کا مسئلہ بھی نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے

نافذ تک جبری بھرتی کی جانے لگی اور فوج کی تعداد میں ۳۶ ڈویژن کی توسیع کر دی گئی۔ پھر ۱۹۳۸ء میں آسٹریا کے فوجی یونٹ شامل کر لیے گئے۔ رھائن لینڈ کی ملٹری پولیس پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ لینڈوھر کی از سرنو تنظیم کی گئی۔ اس طرح فوجی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ جب اسی سال کے آخر میں ملک میں بحران کی کیفیت پیدا ہوئی اس وقت فوج میں ۴۲ فعال ڈویژنز' ۷ محفوظ دستے اور ۲۱ لینڈوھر یونٹ موجود تھے۔ جب اگلے سال موسم گرما میں لڑائی کا آغاز ہوا تو میدان جنگ میں ۱۰۳ ڈویژنز فوج تعینات تھی۔ گویا ایک سال کے اندر ۳۲ ڈویژنز کا اضافہ ہو چکا تھا۔ لفٹ ویف میں اس سے بھی کہیں زیادہ توسیع ہوئی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں جرمنی نے کل ۳۶ ہوائی جہاز تیار کیے تھے۔ لیکن ۱۹۳۳ء میں یہ تعداد ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۶ء میں ۵۱۱۲ تک پہنچ گئی۔ جولائی ۱۹۳۴ء کی ہدایت کے بموجب ۳۶ اسکوڈرن تھے جنہیں بڑھا کر ۳۰۲ کر دیا گیا۔ پھر جنگ کے آغاز میں چار ہزار صف اول کے لڑاکا طیارے تھے۔ اس کے برعکس بحریہ سائز کے اعتبار سے موثر نہ تھی۔ اس کی وجہ تیرز کے جائزے کے مطابق یہ تھی کہ جنگ کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کی اور مضبوط بحریہ تیار کرنے میں دس سے بیس سال لگ جاتے ہیں۔ پھر بھی ۱۹۳۹ء میں ایڈمیرل ریڈر کی ماتحتی میں نہایت تیز رفتار اور جدید قسم کے کئی جنگی جہاز کام کر رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء کے مقابلے میں اس وقت بحریہ کا عملہ پانچ گنا زیادہ تھا۔ اور ہٹلر کے برسراقتدار آنے سے پہلے ہی بحری جہازوں کے مد میں پانچ گنا زیادہ رقم خرچ ہو رہی تھی۔ سمندری' زمینی اور ہوائی لحاظ سے جرمنی کا از سرنو مسلح ہونا دراصل طاقت کے توازن میں جلد از جلد تبدیلی لا رہا تھا۔

اگرچہ باہر سے یہ سارے عوامل نہایت خوش آئند معلوم ہو رہے تھے' لیکن اندر سے یہ بالکل کھوکھلے تھے۔ ورسیلز کی صلح سے علاقے کی جو تقسیم ہوئی تھی' اس سے جرمنی کو سخت دھچکا پہنچا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں اسے افراط زر کا بحران دیکھنا پڑا۔ تاوان جنگ ادا کرنے کا مسئلہ الگ سوہان روح بنا رہا۔ پھر ۱۹۱۴ء سے قبل بیرونی منڈیوں میں جو ساکھ تھی' اس کا حصول بھی خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ۱۹۲۷ء میں جرمنی کی مجموعی پیداوار اتنی ہی تھی جتنی پہلی جنگ سے ما قبل تھی۔ لیکن یہ سنبھالا اگلے برسوں کے اقتصادی بحران کی وجہ سے عارضی ثابت ہوا۔ دیگر ملکوں کے برعکس جرمنی اس بحران کا کچھ زیادہ ہی شکار رہا۔ ۱۹۳۲ء میں صنعتی پیداوار ۱۹۲۸ء کے مقابلے میں کل ۵۸ فی صد تھی اور درآمد و برآمد بھی نصف ہو کر رہ گئی تھی۔ مجموعی قومی پیداوار ۸۹ بلین سے گھٹ کر ۵۷ بلین رہ گئی تھی۔ بے روزگار لوگوں کی تعداد ۱۴ ملین سے بڑھ کر ۵٫۶ ملین ہو گئی تھی۔ ہٹلر کی شہرت کی یہ وجہ بھی تھی کہ اس کے وسیع پروگرام کے تحت سڑکیں بن رہی تھیں' بجلی ہر جگہ پہنچائی جا رہی تھی اور صنعت میں سرمایہ کاری کی وجہ سے اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ جبری بھرتی سے پہلے ہی بے روزگاری کم ہو گئی تھی۔ بہرحال ۱۹۳۹ء کے قریب جو تھوڑا بہت اقتصادی استحکام حاصل ہوا تھا وہ اسلحے کی خریداری سے خاصا ڈانواں ڈول ہو گیا۔ بہرحال اس کے نتائج نہایت تشویش ناک تھے۔ صرف امریکہ کا اقتصادی نظام ایسا تھا کہ دفاعی اخراجات کا بوجھ سہار لیتا تھا۔ لیکن جرمنی کا اقتصادی نظام ایسا کرنے سے قاصر تھا۔

جرمنی کا ایک گھمبیر مسئلہ ایسا بھی تھا جسے اس زمانے کے غیر ملکی مبصرین نے کماحقہ محسوس نہیں کیا تھا۔ یعنی وہاں کی نیشنل سوشلسٹ حکومت کے فیصلہ کرنے کا نہایت پیچیدہ انداز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر نے اپنا تسلط پوری طرح قائم رکھنے کے لیے یہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ چار سالہ منصوبے کا اعلان تو کر دیا گیا تھا لیکن اس میں ایسا قومی نوعیت کا جامع پروگرام شامل نہیں تھا کہ دفاعی سازوسامان کی تیاری

ملک کی اقتصادی حالت کے مطابق عمل میں آئے اور تینوں مسلح افواج کی ترجیحات کے عین مطابق ہو۔ گورنگ جو اس منصوبے کا انچارج تھا' نہایت بودے قسم کا منتظم تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دفاعی شعبے نے اپنی وسیع ضروریات کو مقدم رکھا نئی نئی ترجیحات اپنائیں' زیادہ سے زیادہ فنڈ حاصل کرنے کی جدوجہد کی اور خام مال وافر مقدار میں ہتھیا لینے کی کوشش کی۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ صورت حال اور بھی گمبھیر ہوتی اگر مزدوروں پر حکومت کا سخت کنٹرول نہ ہوتا' نجی کارخانوں کو اپنے منافع کی رقم مصنوعات میں لگانے کا کوئی دباؤ نہ ہوتا۔ بہت زیادہ ٹیکس کا نفاذ نہ ہوتا' قرض وصول کرنے کا جارحانہ رویہ نہ ہوتا اجرت اور ذاتی مصارف پر کڑی نگاہ نہ رکھی جاتی اور اسلحہ سازی میں قومی آمدنی کے بے طرح خرچ کیے جانے پر سختی نہ کی جاتی۔ ۱۹۳۸ء میں مجموعی قومی آمدنی کا ۳۳ فی صد حصہ سرکاری اخراجات پر اٹھنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ نجی سرمایہ کاری بھی حکومت کی درخواست پر کی جا رہی تھی۔ لیکن تینوں مسلح افواج کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورے کرنے کے وسائل ناکافی ثابت ہو رہے تھے مثلاً" جرمنی کی بحریہ کے لیے جو زیڈ پلان بیڑا تیار کیا جا رہا تھا اسے ایندھن کے لیے ۶ ملین ٹن تیل کی ضرورت تھی۔ یہ مقدار جرمنی کے پورے سال کے خرچ کے مساوی تھی۔ لفٹ ولف منصوبے کے تحت ۱۹۰۰۰ صف اول کے اور محافظ لڑاکا طیارے ۱۹۴۲ء تک تیار ہونے تھے۔ اس کے لیے دنیا میں پیدا ہونے والے مجموعی تیل کا ۸۵ فی صد حصہ درکار تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر دفاعی شعبہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ افرادی قوت' فولاد' پیٹرولیم اور دیگر فوجی سامان حاصل ہو۔

چنانچہ دفاعی سازوسامان کی بے دریغ اور ہوشربا تیاری سے درآمد شدہ خام مال پر خاصا دباؤ پڑا۔ جرمنی کے پاس صرف کوئلے کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ لیکن اسے اپنی جدید انداز کی صنعت کو فروغ دینے اور اسلحے کے نئے نظام کو بہتر بنانے کے لیے کچا لوہا' تانبا' بکسائیٹ' نکیل' پٹرول' ربڑ اور دیگر خام مال کافی مقدار میں مطلوب تھے۔ اتفاق سے امریکہ' سلطنت برطانیہ اور سوویت یونین ان تمام چیزوں میں مالا مال تھے۔ ۱۹۱۴ء سے قبل جرمنی ایسی تمام درآمدی اشیاء کی قیمت اپنی اعلیٰ درجے کی مصنوعات کی برآمدات کے عوض ادا کرتا رہا تھا لیکن ۱۹۳۰ء کے عشرے میں یہ صورت حال برقرار نہیں رہی تھی۔ اب جرمنی کے سارے ہی کارخانے جنگی ضروریات کے تحت ٹینک' بندوق اور لڑاکا طیارے بنانے میں معروف تھے۔ علاوہ ازیں پہلی جنگ عظیم کے اخراجات تاوان جنگ کی ادائیگی اور برآمدی تجارت میں خسارے کے باعث جرمنی کے پاس غیر ملکی کرنسی کا ذخیرہ بالکل ہی نہیں رہا۔ ۱۹۳۸ء میں اس کے پاس دنیا کے مجموعی سونے اور مالیاتی ذخائر کا صرف ایک حصہ تھا۔ اس کے مقابلے میں امریکہ کے پاس ۵۴ فی صد' فرانس کے پاس ۱۱ فی صد اور برطانیہ کے پاس ۱۱ فی صد حصے موجود تھے۔ جرمنی کی حکومت نے بغیر سونا یا غیر ملکی کرنسی منتقل کیے بغیر ضروری درآمدی اشیاء کی قیمت چکانے کے لیے کئی اقدامات کیے' مثلاً" کرنسی پر کنٹرول' اشیاء کے بدلے اشیاء اور دیگر مخصوص طریقے اپنائے گئے۔ نیز چار سالہ منصوبے کے تحت تیل' کھاد وغیرہ کا نعم البدل پیدا کرنے کی جدوجہد کا اعلان بھی کیا جاتا رہا تاکہ بیرونی ملکوں پر ان چیزوں کے لیے انحصار نہ کرنا پڑے۔ اگرچہ ہر طریقے سے کچھ نہ کچھ مدد ملی لیکن بحیثیت مجموعی ان سے دفاعی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔ اس سے جرمنی کے اسلحہ ساز کارخانوں کو درپیش مسائل کا اندازہ ہوتا ہے۔ خام مال ختم ہو چکے تھے اور مزید نئے مال منگوانے کے لیے رقم موجود نہ تھی۔ چنانچہ وہاں کے ریڈر نے ۱۹۳۷ء میں یہ تنبیہ کی تھی کہ جب تک سامان مہیا نہ ہو جائے۔ بحریہ کا سارا کام معرض التوا میں ڈال دیا جائے۔ حتیٰ کہ جنوری ۱۹۳۹ء میں خود ہٹلر نے یہ حکم نافذ

کیا کہ جنگی ضروریات کے لیے لوہا' تانبا' ربڑ اور دیگر سامان کی سپلائی میں زیادہ سے زیادہ کمی کر دی جائے۔ غیر ملکی کرنسی کا ذخیرہ بڑھانے کے لیے اقتصادی حالات بہتر بنائے جائیں تاکہ سامان برآمد کیا جا سکے۔

جرمنی کی طاقت اور سیاست کے سلسلے میں مذکورہ باتوں کے تین مربوط نتائج برآمد ہوئے۔

پہلا یہ کہ ہٹلر کی خواہش اور مغربی جمہوریتوں کے خوف و تشویش کے برعکس جرمنی فوجی اعتبار سے ۹-۱۹۳۸ء میں اتنا مضبوط نہ تھا جتنا مغربی جمہوریتیں خیال کرتی تھیں۔ اس کی میدانی فوج جنگ کے آغاز میں ۲،۷۵ ملین سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس کے پاس متحرک اور پوری طرح مسلح ڈویژن خاصی کم تعداد میں تھے۔ اس کا محفوظ دستہ اگرچہ کثیر تھا' لیکن یہ بھی اسلحے سے پوری طرح لیس نہ تھا۔ رنگروٹوں کی فوج ظفر موج کو تربیت دینے کے لیے تجربہ کار فوجی عملہ اور نان کمیشن افسر ناکافی ثابت ہوتے تھے۔ گولہ بارود کا ذخیرہ بہت کم تھا۔ حتیٰ کہ جرمنی کے مشہور زمانہ آرمرڈ یونٹ کے پاس گنتی کے چند ہی ٹینک تھے جبکہ اس سے کہیں زیادہ انگلستان اور فرانس کے پاس موجود تھے۔ ۱۹۳۰ء کی وسطی دہائی میں جرمن بحریہ جنگ کا منصوبہ تو بنا رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ برطانیہ کے ساتھ بڑے وسیع پیمانے پر محاذ آرائی کے لیے یہ پوری طرح مسلح بھی نہ تھی' اگرچہ آبدوزیں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تیار تھیں۔ جہاں تک لفٹ ویف یونٹ کا معاملہ ہے یہ اس لیے مضبوط تھا کہ اس کا مقابل دشمن حد درجہ کمزور تھا۔ پھر بھی یہ یونٹ محفوظ دستے اور تینوں افواج کے تعاون کے فقدان کی وجہ سے بحران کا شکار رہا۔ ۱۹۳۰ء کی آخری دہائی میں جب بین الاقوامی سطح کا انتشار پیدا ہوا تو جرمنی اپنے مخالفین کے تصورات کے مطابق اتنا طاقتور نہ تھا اس کے لڑاکا طیارے بنانے کے کارخانے اور ہوائی عملہ دونوں ہوا بازی کی "دوسری نسل" کی موافقت کرنے میں خاصی دشواری محسوس کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر میونخ بحران کے برعکس جہاز کو آپریٹ کرنے والا عملہ تعداد میں معدودے چند تھا۔ ایسی صورت میں لندن شہر پر بمباری کرنے کا خیال انتہائی احمقانہ تھا۔

موجودہ انقلاب پسندوں نے جو لٹریچر مرتب کیا ہے اور جس میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ۱۹۳۹ء میں جرمنی جنگ میں شرکت کے لیے تیار نہ تھا' کا مطالبہ کرنا غیر دانشمندانہ ہو گا۔ جب دن ختم ہوتا ہے تو فوج کی کارکردگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ دیگر ملکوں کے چند ہی فوجی یونٹ ایسے ہوں گے جو یہ دعویٰ کر سکیں کہ ان کی مطلوبہ چیزیں فراہم ہو گئی ہیں اور وہ پوری طرح مطمئن ہیں۔ پھر جرمنی کی کمزوریوں کا تجزیہ اس کے دشمنوں کے نقائص کو سامنے رکھ کر ہی کرنا ہو گا اور جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو صورت حال جرمنی کے عین حسب خواہ ہوتی ہے کیونکہ آپریشن کے اصول و ضوابط کے لحاظ سے اس کی تینوں مسلح افواج بہتر کارکردگی کی حامل تھیں۔ اس کی بری فوج ٹینک برداروں پر پوری توجہ مرکوز رکھتی تھی۔ ہر میدان جنگ میں کارنامہ انجام دینے کی ہدایت دی جاتی تھیں۔ اس تمام عرصے میں ریڈیو کے ذریعے رابطہ رکھا جاتا تھا۔ اس کی ہوائی فوج اپنی مخصوص نوعیت کی ذمہ داریاں تو پوری کرتی ہی تھی' اس کے ساتھ ہی ضرورت پڑنے پر بری فوج کی مدد بھی کرتی۔ "یوبوٹ" مختصر ہونے کے باوجود اپنی کارکردگی میں جواب نہیں رکھتی تھی۔ ان عوامل کی موجودگی میں ربڑ کی قلت کی کوئی حیثیت نہیں۔

اب ہم دوسرے نتیجے کی طرف آتے ہیں۔ جرمنی کی مسلح افواج کو نہایت تیزی کے ساتھ دوبارہ مستحکم کیا گیا تھا۔ چنانچہ مالیات پر اس کا خاصا بوجھ پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہٹلر جنگ کے ذریعے ان معاشی مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ آسٹریا کے حاصل ہو جانے کی بدولت نہ صرف پانچ ڈویژن فوج لوہے اور تیل کے ذخائر اور دھات کے کارخانے ہاتھ آئے تھے بلکہ سونے اور غیر ملکی

زرمبادلہ کی صورت میں ۲۰۰ ملین ڈالر بھی ملے تھے۔ ویسے سوڈٹین لینڈ کوئلے کے ذخائر کے باوجود اتنا مفید نہیں تھا۔ پھر ۱۹۳۹ء کے اوائل میں جرمن سلطنت غیر ملکی کرنسی کے بحران میں مبتلا تھی۔ چنانچہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ہٹلر چیکوسلواکیہ کے بقیہ حصے پر حریصانہ نظر ڈالے ہوئے تھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۹ء میں وہ پراگ جا پہنچا تاکہ یہ جائزہ لے سکے کہ قبضے کے بعد یہاں کیا کیا مال غنیمت حاصل ہو گا۔ جرمنوں نے نہ صرف چیکوسلواکیہ کے قومی بینک میں موجود سونے اور کرنسی کے ذخائر پر قبضہ کیا' بلکہ بھاری مقدار میں فلزیات بھی ہتھیا لیے۔ یہ سب ملکی صنعت میں کام آئیں۔ علاوہ ازیں چیکوسلواکیہ کے نفع بخش دفاعی سازوسامان کے کارخانوں کا بھی جرمنی نے خوب استعمال کیا۔ وہ یوں کہ بلقان کے گاہکوں کو مذکورہ ملک کی مصنوعات مہیا کر کے خوب زرمبادلہ حاصل کیا۔ اسی طرح چیکوسلواکیہ میں تیار شدہ لڑاکا طیارے' ٹینک اور ہتھیار بھی قبضے میں کیے گئے۔ ان سامانوں سے جہاں ایک طرف تمام فوجی ڈویژن کو مسلح کیا گیا' وہاں کچھ حصہ فروخت کر کے غیر ملکی کرنسی بھی حاصل کی گئی۔ ان تمام باتوں کے نتیجے میں اور چیکوسلواکیہ کی صنعتی مصنوعات کی بدولت یورپ میں جرمنی کی طاقت عروج پر آ گئی۔ چنانچہ ہٹلر نے دوبارہ فوج کو منظم کرنا شروع کیا۔۔۔۔ حتیٰ کہ دوسرا بحران آ پہنچا! جیسا کہ ٹم میسن نے کہا ہے: آمریت اور دوبارہ فوجی تیاری کی وجہ سے اس سلطنت کو جس دباؤ اور بحران کا سامنا تھا' اس کا واحد حل مزید آمریت اور صف بندی تھی! جرمنی کی نیشنل سوشلزم حکومت کی دہشت ناک منطق کی رو سے افرادی قوت اور سازوسامان لوٹنے کے لیے جنگ کرنا معاشی حالت کو بہتر بنانے کے مترادف ہے۔

تیسرا نتیجہ جسے ایک مسئلہ کہہ لیجیے یہ ہے: آخر جرمنی خود کو توسیع دیئے بغیر فتح اور لوٹ مار کرنے کی پالیسی پر کب تک کاربند رہ سکتا تھا۔ جب شروع شروع میں دوبارہ فوجی تیاری کا عمل جاری تھا اور جرمنی کی مسلح افواج جدید دفاعی سازوسامان سے لیس تھیں' اس وقت کمزور پڑوسیوں کو دبانا نئی نئی مقبوضات حاصل کرنا' خام مال کو قبضے میں کرنا اور وہاں کی کرنسی کو تصرف میں لانا ان کے لیے باعث تسکین تھا۔ اپریل۔ مئی ۱۹۳۹ء میں یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اب پولینڈ نشانہ بننے والا ہے اور اگر یہ ملک قبضے میں آ جاتا ہے تو کیا جرمنی' فرانس اور برطانیہ کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا؟ یعنی ایک ایسی جنگ میں ملوث ہونا عظیم جرمنی کی اقتصادی حالت کے لیے چیلنج نہیں تھا جبکہ یہ ملک خام مال کی درآمدات میں دوسروں کا مرہون منت تھا؟ واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ جب ہٹلر ۱۹۳۹ء میں مغربی جمہوری ملکوں سے جنگ کرنے کا خطرہ مول لے رہا تھا' اس وقت وہ یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ وہ ریاستیں پھر پیچھے ہٹ جائیں گی اور اسے پولینڈ کو لوٹنے کے لیے چھوٹی موٹی جھڑپ کی اجازت دے دیں گی۔ اس طرح جرمنی کی اقتصادی حالت بہتر ہو جائے گی۔ پھر وہ ۱۹۴۰ء کے وسطی عشرے میں بڑی طاقت کی پہلی جنگ کے لیے تیار ہو چکا ہو گا۔ اگرچہ فرانس اور برطانیہ کی اقتصادی اور فوجی طاقت اس وقت کمزور تھی اور دونوں کی سیاسی قیادت ڈھل مل یقینی کا شکار تھی' اس کے باوجود ان سے جنگ کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اور اس طرح جرمنی کو جدید اسلحے میں جو برتری حاصل تھی' وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی۔ پھر ہٹلر کے لیے فتح کا حصول اور بھی مشکل ہو جاتا اگر امریکہ اتحادیوں کی مدد کو پہنچ جاتا اور اگر محاذ آرائی کا سلسلہ روس تک پہنچ جاتا تو اس ملک کی وسعت کے نتیجے میں جنگ طویل ہو جاتی پھر تو جرمنی کی اقتصادی زبوں حالی کا کوئی حدوحساب بھی نہ ہوتا۔

چونکہ نازی حکومت فتوحات پر زندہ تھی اور ہٹلر ایک علاقہ قبضہ کرنے کے بعد دوسرے کی سمت بڑھتا جا رہا تھا' ایسی صورت میں ٹکراؤ کب اور کہاں ہو سکتا تھا؟ ہٹلر کے بڑا بننے کا خبط اور اس کا

منطقی استدلال یہ تھا کہ کوئی بھی طاقت نہ تو یورپ میں اور نہ ہی دنیا میں جرمنی کی مدمقابل بن سکے۔ اسی منطق کی بدولت اس کے تمام دشمنوں کا کام تمام ہو سکتا ہے' یہودیوں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور ہزار سالہ جرمن حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے۔ بہت سی باتوں میں مطابقت کے باوجود جرمنی کا ہٹلر عالمی طاقت کا عظیم الشان منصوبہ تیار کرنے میں فریڈرک اور بسمارک سے بالکل مختلف تھا۔ وہ مزاحمتوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتا تھا۔ قلیل المیعاد ہنگامے سے فرار حاصل کرنے اور طویل المیعاد خواہشات کو بروئے کار لانے والا یہ ہٹلر جاپانیوں ہی کی طرح عالمی نظام کو جلد از جلد تبدیل کر دینے کے درپے تھا۔

فرانس اور برطانیہ

ایسے ہنگامی حالات میں فرانس اور برطانیہ دونوں کی پوزیشن سخت مشکل سے دوچار تھی۔
اگرچہ دونوں ملکوں میں خاصے اہم اختلافات تھے' پھر بھی دونوں آزاد قسم کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے علمبردار تھے۔ دونوں ہی جنگ کے مضر اثرات کے مارے ہوئے تھے۔ اپنی کوشش بسیار کے باوجود دونوں ایڈورڈ کی خوشگوار سیاسی اقتصادیات بحال نہیں کر سکے تھے۔ دونوں ہی اندرون ملک مزدوروں کی تحریک سے متاثر ہو رہے تھے۔ دونوں ہی کے عوام مزید لڑائی سے گریزاں تھے اور یہ چاہتے تھے کہ امور خارجہ کی بجائے ملک کے سماجی معاملات میں دلچسپی لی جائے۔ یہ سب کہنے کا ہرگز یہ مدعا نہیں ہے کہ لندن اور پیرس کی سفارت کاری یکساں تھی۔ چونکہ دونوں کی جغرافیائی اور دفاعی پوزیشن مختلف تھی اور دونوں کی حکومتوں پر دباؤ بھی مختلف نوعیت کے تھے' لہٰذا جرمنی کا مسئلہ حل کرنے کے معاملے میں بھی دونوں جمہوری ملکوں میں اختلافات رائے تھا۔ اگرچہ اس کے طریق کار کے متعلق دونوں میں تضاد تھا لیکن نتیجے سے دونوں کا اتفاق بھی تھا۔ بہرحال ۱۹۱۹ء کے بعد کے پریشان کن حالات میں فرانس اور برطانیہ دونوں دنیا کی ایسی بڑی طاقتیں تھیں جہاں حالات پہلے جیسے تھے۔

یہ فرانس تھا جو ۱۹۳۰ء کے ابتدائی عشرے میں یورپ کے تمام اہم مناظر پر اپنے استحکام اور اثرورسوخ کی بناء پر چھایا ہوا تھا۔ اس تمام عرصے میں سوویت یونین کے بعد وہ واحد ملک رہا تھا جو دیگر بڑی طاقتوں کے مقابلے میں بہت بڑی فوج رکھتا تھا اور اس طرح دوسرے نمبر پر فائز تھا۔ اسی طرح ہوائی فوج میں بھی روس کے بعد دوسرے نمبر پر یہی ملک فائز تھا۔ سفارت کاری میں بھی اسے با اثر پوزیشن حاصل تھی' خصوصاً" جنیوا اور مشرقی یورپ میں ۱۹۱۹ء کے بعد فرانس کو اقتصادی بحران کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جب اسے احساس ہو گیا کہ وہ انگلستان اور امریکہ کی اعانت پر مزید انحصار نہیں کر سکتا اور جرمنی سے پورا تاوان جنگ ملنے کی امید نہیں تو اس نے فرانک میں تطبیق کر لی۔ لیکن جب ۱۹۲۶ء میں لچوائن کیئر نے کرنسی کو استحکام عطا کیا تو اس کے نتیجے میں فرانس کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔ کچا لوہا جو ۱۹۲۰ء میں ۴ء۳ ملین ٹن پیدا ہوتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں بڑھ کر ۱۰ء۳ ملین ٹن ہو گیا۔ اسی طرح فولاد ۳ سے ۹ء۷ ملین' آٹو موبائل ۴۰۰۰۰ سے ۲۵۴۰۰۰ تک جا پہنچے۔ اسی طرح کیمیکل' رنگ سازی کا سامان اور بجلی کی مصنوعات جرمنی کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ فرانک کی قیمت کے حسب خواہ تعین سے فرانس کی تجارت کو استحکام حاصل ہوا۔ پھر بینک آف فرانس کے پاس سونے کے بڑے ذخائر موجود ہونے کی وجہ سے تمام وسطی اور مشرقی یورپ میں اس ملک کی ساکھ مضبوط ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب "عظیم سانحہ" پیش آیا تو فرانس اس کے اثرات سے "ستا" محفوظ رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے پاس سونے کا محفوظ ذخیرہ تھا دوسرے اس کی کرنسی معیاری تھی جو برطانیہ کے برعکس اس ملک کی اقتصادیات پر کم سے کم انحصار کرتی تھی۔

تاہم ۱۹۳۳ء کے بعد فرانس کی اقتصادی حالت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونے لگی۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ جب بہت سے اہم تجارتی ممالک بحران طلا میں مبتلا تھے' اس وقت فرانک کی

قدر میں تخفیف نہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ فرانس کی برآمدات ایک تو کم ہو گئیں پھر ان کے لیے سابقت نہیں رہی۔ نیتجتاً" ملک کی غیر ملکی تجارت کو شدید دھچکا لگا۔ درآمدات میں ۶۰ فی صد اور برآمدات میں ۷۰ فی صد کی ہو گئی۔ یہ اقتصادی زبوں حالی کئی برس تک قائم رہی۔ پھر ۱۹۳۵ء میں فرانسیسی صنعت میں نئی جان پیدا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس جذبے کو مزید تقویت ۱۹۳۶ء میں ملی جب پاپولر فرنٹ کی انتظامیہ نے ہفتہ میں چالیس گھنٹے کام کرنے کی پابندی عائد کر دی اور ساتھ ہی ساتھ اجرت میں بھی اضافہ کر دیا۔ چنانچہ اس اقدام کے نتیجے میں نیز اکتوبر ۱۹۳۶ء میں فرانک کی قدر میں بہت زیادہ تخفیف کی وجہ سے سونے کی اچھی خاصی مقدار فرانس سے باہر جانے لگی۔ اس سے ملک کے بین الاقوامی کریڈٹ کو سخت دھچکا لگا۔ فرانس کے زراعتی شعبے سے ملک کی نصف آبادی وابستہ تھی۔ اس کی پیداوار مغربی یورپ کے مقابلے میں اتنی موثر نہ تھی۔ فالتو پیداوار کی وجہ سے جہاں قیمت میں کمی رہی وہاں فی کس آمدنی پر اور بھی مضر اثرات رونما ہوئے۔ پھر کارخانوں میں ملازمت سے برطرفی کی وجہ سے لوگ جوق در جوق گاؤں کی طرف آنے لگے تھے۔ بہرحال زمین کی طرف مراجعت سے فرانس کو اٹلی ہی کی طرح یہ فائدہ پہنچا کہ بے روزگاری کی صحیح صورت حال مخفی ہو کر رہ گئی۔ تعمیرات کا کام رک گیا۔ نئی نئی صنعتیں خصوصاً" آٹو موبائل اور ملکوں میں تو ترقی کی جانب گامزن تھیں جبکہ فرانس میں ٹھپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ ۱۹۲۸ء میں فرانک کی جو قدر تھی اب یعنی ۱۹۳۶ء میں اس کے مقابلے میں ۳۶ فی صد رہ گئی تھی۔ ایک عشرے پہلے فرانس کی جو صنعتی پیداوار تھی وہ اب محض ۸۳ فی صد رہ گئی تھی۔ اسی طرح فولاد کی پیداوار ۶۳ فی صد اور مکانات کی تعمیر کی شرح محض ۱۱ فی صد رہ گئی تھی۔ فرانس کی طاقت کے لیے زیادہ مضر صورت وہاں کی فی کس آمدنی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں اس کی جو شرح تھی وہ "معاہدہ میونخ" کے زمانے میں ۱۸ فی صد گھٹ گئی۔ یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہو رہا تھا جب جرمنی حد سے زیادہ خطرناک بنا ہوا تھا اور ملک میں دفاعی تیاری ازبس ضروری تھی۔

اس حقیقت کی وضاحت بہت آسان ہو گی کہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں فرانس کی فوجی کارکردگی پر محض اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے مضر اثرات رونما ہوئے تھے۔ چونکہ ۱۹۲۰ء کی آخری دہائی میں یہاں خوشحالی کا دور دورہ تھا' پھر جرمنی کی دفاعی تیاری بھی تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی لہٰذا فرانس نے اپنے مالی سال ۳۰-۱۹۲۹ء اور ۳۱-۱۹۳۰ء کے دوران نہایت دھڑلے سے دفاع کے لیے زیادہ رقم مختص کر دی۔ کاش جنیوا میں تخفیف اسلحہ کے اجلاس کے موقع پر جو جھوٹی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ مایوسی و اضمحلال کی کیفیت کو پیش نظر رکھ کر کی جاتیں۔ ۱۹۳۴ء میں دفاعی اخراجات کے لیے قومی آمدنی کا ۴ء۳ فی صد حصہ وقف کیا گیا تھا جو ۱۹۳۰-۱ء میں بھی بجٹ تھا۔ لیکن جو رقم فی الواقع خرچ کی گئی وہ ۴ ملین فرانک سے بھی کم تھی۔ اس لیے کہ وہاں کی اقتصادی حالت خاصی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ لی ان بلم کی پاپولر فرنٹ حکومت نے دفاعی اخراجات میں جو کمی کی تھی اس نے اس کے ازالے کی کوشش کی لیکن یہ ۱۹۳۷ء میں ہی ممکن ہو سکا۔ بعد ازاں اخراجات ۱۹۳۰ء کے زمانے سے بھی زیادہ فزوں ہو گئے۔ ایسے اخراجات زیادہ تر میدان جنگ کی فوج کے نقائص کو دور کرنے اور مزید قلعہ بندیاں تعمیر کرنے میں صرف ہوئے تھے۔ ایسے پر آشوب زمانے میں جرمنی اقتصادی اور فوجی دونوں لحاظ سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ بقول آر جے بکہ:

"فرانس آٹو موبائل تیار کرنے میں برطانیہ اور جرمنی سے بہت پیچھے تھا۔

لڑاکا طیارہ بنانے میں اسے جو پہلی پوزیشن حاصل تھی اس سے گر کر چوتھے درجے پر آگیا تھا۔ اس کی فولادی صنعت ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۷ء کے دوران محض ۳۰ فی صد بڑھی تھی۔ اس کے مقابلے میں جرمنی کی صنعت میں ۳۰۰ گنا زیادہ کا اضافہ ہوا تھا۔ اسی طرح فرانس میں کوئلہ بھی مذکورہ پانچ سالہ دور میں بہت کم پیدا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ۱۹۳۵ء کے اوائل میں اسے سار میں واقع کوئلے کی کانیں واپس کرنی پڑی تھیں اور اس کے نتیجے میں جرمنی کی مصنوعات میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔"

بڑھتی ہوئی اقتصادی زبوں حالی قرض کی ادائیگی اور ۱۸-۱۹۱۴ء کے زمانہ جنگ کی پنشن پر ملک کے مجموعی اخراجات کا نصف حصہ اٹھ رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں فرانس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی تینوں مسلح افواج کو از سرنو تیار کر سکے' حالانکہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں وہ اپنے سالانہ بجٹ کا ۳۰ فی صد حصہ دفاع کے لیے مختص کرتا رہا تھا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ فرانس نے اپنی بحریہ کی اچھی خاصی نگہداشت کی تھی' اس کے پاس ۱۹۳۹ء کے عرصے میں جدید قسم کے نہایت متوازن بحری بیڑے موجود تھے' لیکن جب جرمنی نے ملک پر حملہ کیا تو یہ کوئی خاص کارنامہ انجام نہ دے سکی۔ تینوں مسلح افواج میں سب سے زیادہ خستہ حالت فرانسیسی ہوائی فوج کی تھی۔ اس کے پاس فنڈز کی ہمیشہ کمی رہی تھی۔ بہرحال اس فوج کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے ہوابازی کا سامان بنانے والی فیکٹری قائم کی گئی جس نے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۷ء کے دوران پچاس پاسٹر جہاز ہر مہینے تیار کیے تھے جو جرمنی کی مجموعی کارکردگی کا محض دسواں حصہ تھا۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۷ء میں جرمنی نے ۵۶۰۶ لڑاکا طیارے بنائے جبکہ فرانس نے صرف ۳۷۰ تیار کیے تھے۔ (بعض حوالے کے مطابق یہ تعداد ۷۴۳ بھی بتائی جاتی ہے) ۱۹۳۸ء میں ہی ایسا ہوا کہ حکومت نے لڑاکا طیارے بنانے والے کارخانوں کو مالی امداد فراہم کی۔ اس اچانک توسیع کی وجہ سے کئی ناگزیر قسم کی دقتیں بھی پیدا ہو گئیں۔ یہاں ساخت اور اڑان کے مسائل کا ذکر مقصود نہیں جو نئے اور اعلیٰ قسم کے طیارے بنانے کے سلسلے میں پیش آئے تھے۔ یہ صورت حال ایک مثال سے واضح ہوتی ہے۔ ہوائی فوج کے شعبے نے جنوری - اپریل ۱۹۴۰ء کے دوران ڈیوٹائن کے کل ۸۰ لڑاکا طیارے منظور کیے تھے جبکہ وعدہ ۵۲۰ جہاز فراہم کرنے کا تھا اور ابھی پائلٹ ان جہازوں کو اڑانے کی مشق کر رہی رہے تھے کہ دشمن کی ہوائی فوج نے دھاوا بول دیا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ اقتصادی اور پیداواری بحران کے پس پردہ نہایت گمبھیر قسم کے سماجی اور سیاسی مسائل تھے۔ جنگ عظیم میں نقصان اٹھانے' اقتصادی بحران سے مسلسل دل گرفتگی پیدا ہونے' طبقاتی تقسیم اور نظریاتی وابستگی کے مضر اثرات سہتے رہنے کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے جنہیں سیاست دان حل کرنے میں نہ صرف ناکام رہے بلکہ انہوں نے ان کو اور بھی پیچیدہ کر دیا۔ پھر کرنسی کی قیمت کم ہو جانے' افراط زر کی صورت پیدا ہونے ہفتے میں چالیس گھنٹے کام کرنے کی پابندی عائد ہونے' حد سے زیادہ ٹیکس نافذ ہونے اور جنگ کی از سرنو تیاری کرنے کی وجہ سے ۱۹۳۰ء کے عشرے اور اس کے بعد کے برسوں میں فرانس کے عوام کا مورال بے حد گر گیا اور ان میں یکجہتی کا جذبہ باقی نہ رہا۔ جب اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی تھی اس وقت یورپ میں فاشزم کی تحریک پھیل رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں فرانس کے عوام میں مختلف آراء قائم ہوئی تھیں۔ دائیں بازو کے انتہا پسندوں کا یہ نعرہ تھا۔ ہٹلر سے بلم تک! اور

بائیں بازو والے اسلحہ کی خریداری پر رقم خرچ کرنے اور ہفتے میں چالیس گھنٹے کام کرنے کے قانون کے سراسر خلاف تھے۔ یہ نظریاتی چپقلش' سیاسی جماعتوں کی تلون مزاجی اور دوران جنگ فرانسیسی حکومت کا عدم استحکام (۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے دوران ۲۴ حکومتیں تبدیل ہوئی تھیں) ایک ایسے معاشرے کی نشاندہی کر رہا تھا جو خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا ہو۔ فرانس کے متعلق کم سے کم بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ وہ ہٹلر کی جرات مندانہ پیش قدمی کے سامنے سینہ سپر ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی مسولینی کے دیوانہ پن کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

جیسا کہ فرانس کی سیاست میں پہلے بھی بارہا ہوا تھا اس قسم کی صورت حال سے سول اور ملٹری تعلقات متاثر ہوئے تھے اور معاشرے میں فوج کی ساکھ کو زک پہنچا تھا۔ ان نامساعد حالات میں فرانسیسی لیڈر اپنے فرائض انجام دیے چلا جا رہے تھے۔ اس کے باوجود بہت سی خامیاں وہاں موجود تھیں۔ برطانیہ کی کمیٹی آف امپیریل ڈیفنس یا چیف آف سٹاف سب کمیٹی کی طرح فرانس میں ایسا کوئی با اثر ادارہ موجود نہ تھا جو موثر انداز میں فوجی حکمت عملی وضع کرنے اور مخالف قوتوں کی دفاعی آراء پر غوروخوض کرنے کے سلسلے میں حکومت کی سول اور ملٹری شخصیات کو اکٹھا کرتا۔ اس وقت کے فوجی افسران مثلاً" گیملن' جارجز' ویگینڈ اور پس پردہ رہنے والے پے تین ساٹھ اور ستر کے پیٹے میں تھے۔ یہ لوگ مدافعانہ ذہنیت رکھنے والے حد سے زیادہ محتاط اور جنگ کے نئے نئے فنون اپنانے سے گریزاں رہتے تھے۔ جب ڈیگال نے مختصر اور جدید قسم کے ٹینک کے دستے کی تجویز پیش کی تو اسے ان لوگوں نے بے دھڑک رد کر دیا۔ جدید نوعیت کے ہتھیار کے برعکس کوئی اور دفاعی سازوسامان استعمال کرنے کا مسئلہ بھی حل نہ کر سکے۔ ملے جلے ہتھیار استعمال کرنے کی پالیسی پر بھی عمل درآمد نہ ہو سکا۔ میدان جنگ کو کنٹرول کرنے اور مواصلاتی نظام (مثلاً" ریڈیو) کی اہمیت کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ہوائی طیارے کا کردار زمین تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ فرانس کے جاسوسوں نے اہل جرمنی کے خیال و ارادے کے متعلق ڈھیر ساری معلومات فراہم کر دی تھیں پھر بھی انہیں مسترد کر دیا گیا۔ فوج کے یونٹوں کو وسیع پیمانے پر مسلح کرنے کا خیال سرے سے ندارد تھا حالانکہ اہل جرمنی اپنی افواج کے لیے یہ طریقے استعمال میں لا رہے تھے۔ حتیٰ کہ گوودرین کی کتاب Achtung Panzer کے جو ترجمے فرانس کی ہر محافظ فوج کی لائبریری میں رکھوائے گئے تھے' اسے کسی نے الٹ کر دیکھا بھی نہیں! ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جہاں فرانس کے کارخانوں میں اعلیٰ کوالٹی کے بے شمار ٹینک تیار ہو رہے تھے' وہاں ان کے استعمال کے متعلق کوئی قواعد و ضوابط موجود نہ تھے۔ صحیح احکامات کے فقدان اور عدم تربیت کی وجہ سے فرانس کی فوج کے لیے یہ سخت مشکل مرحلہ بن چکا تھا کہ اگر ملک دوسری بڑی جنگ میں ملوث ہوتا ہے تو سماجی و سیاسی بحران اور زوال پذیر اقتصادیات کے مضر اثرات کا کس طرح ازالہ کیا جا سکے گا۔

۱۹۱۴ء سے قبل جس طرح ملکی کمزوریوں کا ازالہ نہ ہو سکا تھا' اب بھی ان کمزوریوں کے ازالے کی صورت نہ تھی چاہے کامیاب سفارت کاری اور اتحاد قائم کرنے کی حکمت عملی ہی کیوں نہ اختیار کی جاتی۔ پھر ۱۹۳۰ء کے عشرے کے اختتام پر تو یہ حالت ہوئی کہ فرانس کی خارجہ پالیسی کی علی الاعلان تردید ہوتی رہی۔ پہلی اس وقت ہوئی تھی جب میگنیوٹ لائن کے پس پشت دفاعی اقدام اختیار کیے جاتے تھے تاکہ مشرقی یورپ میں جرمنی کی پیش قدمی کو روکا جا سکے اور اگر معاہدے کے مطابق ضرورت محسوس کی گئی تو فرانس کے یورپی اتحادیوں کی مدد بھی کی جا سکے۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں سارلینڈ پر جرمنی کے قبضے اور رھائن لینڈ

کے علاقے پر ہٹلر کے دوبارہ تسلط ہو جانے کی وجہ سے فرانس کے لیے پیش قدمی ممکن نہ رہی' حالانکہ اس کے فوجی افسران حملہ کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہے تھے۔ بہرحال یہ سب کچھ اس دھچکے کے مقابلے میں ہیچ تھا جو ۱۹۳۶ء میں فرانس کی سفارتی اور فوجی پوزیشن کو لگا تھا۔ یعنی حبشہ کے قضیے میں اٹلی کے ساتھ ہونے والی جنگ جس میں مذکورہ ملک جرمنی کے معاملے میں پہلے کی طرح فرانس کا اتحادی نہ رہا بلکہ شدید دشمن بن گیا۔ اسپین میں خانہ جنگی کا آغاز جس کے نتیجے میں فرانس کے عقب میں ایک فاشسٹ حکومت کا قیام۔ پھر بلجیم کے غیر جانب دار ہو جانے کی وجہ سے دفاعی پیچیدگیوں کا سامنا! مذکورہ پر آشوب سال کے اختتام کے بعد فرانس اپنی شمال مشرقی سرحد پر تنہا توجہ دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نیز اپنے ایک مشرقی اتحادی کی مدد کے لیے رھائن لینڈ پہنچنا بھی اب اس کے لیے خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ میونخ کے بحران کے وقت بہت سے ممتاز اہل فرانس چیکوسلواکیہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد پورا کرنے پر ششدر رہ گئے تھے۔ آخری بات یہ کہ جب میونخ کے معاہدے پر دستخط ہوئے تھے' اس وقت سوویت یونین مغربی یورپ کے ساتھ تعاون کرنے سے انتہائی بدظن ہو چکا تھا۔ پھر وہ ۱۹۳۵ء میں فرانس اور روس کے مابین ہونے والے پیکٹ کو اہمیت دینے سے بھی گریزاں تھا۔

سفارتی فوجی اور اقتصادی لحاظ سے ایسے پر آشوب دور میں فرانس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ اگر مستقبل میں جرمنی کے ساتھ جنگ ہوتی ہے تو برطانیہ کی بھرپور حمایت حاصل کی جائے۔ اس فیصلے کے پس پردہ کئی معاشی اسباب و عوامل بھی تھے۔ فرانس کئی درآمدی اشیاء کے لیے برطانیہ پر ہی زیادہ تر انحصار کیا کرتا تھا۔ مثلاً" کوئلہ (۳۰ فی صد)' تانبا (صد فی صد) تیل (۹۹ فی صد) ربڑ (صد فی صد) اور دیگر خام مال۔ پھر یہ ساری چیزیں برطانیہ کے تجارتی جہازوں کے ذریعے فرانس پہنچائی جاتی تھیں۔ اگر بھرپور جنگ شروع ہو جاتی تو کم قیمت والے فرانک کے لیے "بینک آف انگلینڈ" کی مدد کی ضرورت پڑ جاتی تاکہ فرانس کے خریدے ہوئے سامان کی قیمت ادا کی جا سکے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۷-۱۹۳۶ء کے دوران فرانس' انگلستان اور امریکہ کی مالی اعانت پر ہی گزارہ کر رہا تھا۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا برطانیہ کے شاہی جنگی بیڑے کی مدد سے جرمنی کو سمندر پار ملکوں کی اشیاء کی فراہمی سے محروم رکھا جا سکتا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں فرانس کو برطانیہ کے رائل ایئرفورس کی مدد کی ضرورت بھی آ پڑی تھی۔ ان تمام عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رائے دی جاتی ہے کہ فرانس کی دفاعی حکمت عملی طویل المیعاد قسم کی منطق پر مبنی تھی۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ۱۹۱۴ء ہی کی طرح مغربی محاذ پر جرمنی کے حملے کو روکا جا سکتا ہے اور اس طرح انگلستان اور فرانس کے اعلیٰ ترین وسائل محفوظ رہیں گے۔ نیز چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کے مشرقی علاقے دوبارہ حاصل کرنے پر بھی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہ بات مشکل ہی سے کہی جا سکتی ہے کہ "برطانیہ کا انتظار" والی حکومت عملی فرانس کے لیے بدشگونی تھی۔ بظاہر تو اس سے ہٹلر کو ترغیب پیدا ہوئی اور ۱۹۳۴ء کے بعد اس نے بارہا یہ اعلان کیا کہ اسے مسئلے سے نمٹنا آتا ہے۔ پھر اس طرح فرانس کے ہاتھ بھی بندھ گئے تھے۔ (اگرچہ اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ بونیٹ اور گیملن جیسے افراد نے دب جانے کو ہی ترجیح دی تھی) ۱۹۱۹ء سے برطانیہ' فرانس پر زور دے رہا تھا کہ وہ جرمنی کے معاملے میں نرم اور خوشگوار رویہ اختیار کرے اور انتہا پسندی کے رجحان سے گریز اختیار کرے کہ انگلستان والوں نے اسے سخت ناپسند کیا تھا۔ جب چار سال بعد ہٹلر برسراقتدار آ گیا تو برطانوی حکومت اور اہل انگلستان فرانس کے تحفظ کے مسئلے سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔

سب سے اہم بات یہ کہ جب فرانس نے مشرقی یورپ کی "جانشین ریاستوں" کو فوجی امداد فراہم کرنے کی پیشکش کی تو برطانیہ نے اسے سخت ناپسند کیا اور جب انگلستان اور فرانس کے مابین باہمی تعاون ناگزیر ہو گیا تو مذکورہ ریاستوں نے پیرس پر دباؤ ڈالا کہ وہ تحریری معاہدہ سے منحرف ہو جائے۔ چیکوسلواکیہ کے بحران سے بہت پہلے برطانیہ نے برلن کے متعلق فرانس کی قدیم اور سخت پالیسی کو رد کر دیا تھا' لیکن اس کے بدلے میں کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ بہرحال ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں دونوں ملکوں کے درمیان فوجی اتحاد ہو گیا تاہم سیاسی لحاظ سے ان کے باہمی شکوک و شبہات رفع نہیں ہوئے تھے۔ جیساکہ ہم درج ذیل سطور میں دیکھیں گے۔ انگلینڈ اتنا جھوٹا اور جعلیا" نہ تھا جتنا نظر آتا تھا۔ وہ امید افزا خیال کا حامل تھا جسے متعدد گھریلو اور شاہی مسائل کا سامنا تھا۔ بہرحال برطانیہ پر فرانس کا محض اس لیے انحصار کرنے کا معاملہ کہ جرمنی کے توسیع پسندانہ عزائم سے محفوظ رہا جائے' کمزور اور غیر یقینی سا دکھائی دیتا ہے۔

غالباً" فرانس کا یہ غلط اندازہ تھا کہ برطانیہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں بھی جرمنی کی یلغار کو روکنے میں اسی طرح ممد و معاون ثابت ہو گا جس طرح ۱۹۱۴ء میں ثابت ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اب بھی ایک بڑی طاقت کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ متعدد فوجی خصوصیات کا حامل تھا۔ پھر اس کی مصنوعات اور صنعتی صلاحیت فرانس کے مقابلے میں دوگنی تھی۔ لیکن برطانیہ کی پوزیشن دو عشرے پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اہل برطانیہ پہلی جنگ عظیم سے نفسیاتی طور پر خائف تھے۔ بعد ازاں "کارتھا گینیین پیس" کی جو تحریک چلی تھی اس کی بے اثری کے سحر سے نکل آئے تھے۔ عسکری ماحول' براعظم میں شمولیت اور طاقت کے توازن کے سلسلے میں بے جا فکر و تشویش سے عوام بدظن ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں پارلیمانی جمہوریت کو فروغ نصیب ہوا۔ (۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۸ء کے الیکشن کے ذریعے) اور لیبر پارٹی عروج پر آئی۔ پھر ان دہائیوں میں فرانس سے کہیں زیادہ دیگر ممالک میں قومی سیاست سماجی نوعیت کے گرد گھوم رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں سرکاری خزانے کا محض ۱۰٫۵ فی صد مسلح افواج کے لیے مختص کیا گیا جبکہ اس کے مقابلے میں سماجی کاموں پر ۳۶٫۶ فی صد سرمایہ صرف کیا گیا۔ بالڈون اور چیمبرلین نے کابینہ کے اراکین کو بارہا یاد دلایا کہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے یہ غیر ضروری ہے کہ مشرقی وسطی یورپ کے پیچیدہ مسائل میں الجھا جائے جبکہ ان علاقے کی سرحدیں اتنی مقدس بھی نہیں!

جو سیاسی جماعتیں اور حکمت عملی وضع کرنے والے سماجی معاملات اور انتخابی مہم کے برعکس خارجہ امور میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ء کے بین الاقوامی منظر کے پیش نظر خاصے محتاط ہو گئے تھے۔ جنگ جونہی اختتام پذیر ہوئی' خودمختار ریاستیں اپنی اپنی پوزیشن کے تعین پر زور دینے لگیں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں بلفور ڈیکلریشن اور ۱۹۳۱ء میں اسٹیچوٹ آف ویسٹ منسٹر کا اعلان ہوا جس کے تحت وہ آزاد ریاستیں قرار پائیں اور اپنی خواہش کے مطابق آزاد خارجہ پالیسی اختیار کر سکتی تھیں۔ ان ریاستوں میں کوئی بھی یورپ کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی آرزومند نہ تھی۔ ویسے بعض ریاستیں مثلاً" آئر' جنوبی افریقہ اور کینیڈا ہر معاملے میں لڑنے جھگڑنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔ اگر برطانیہ نے شاہی وحدت کے تصور کو برقرار رکھنا چاہا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ اسی وقت کسی معاملے میں جنگ کرنے پر آمادہ ہو سکتا تھا جو دیگر ریاستوں کی حمایت کا موجب بنتا اور جب جرمنی اٹلی اور جاپان کی دھمکیوں کے نتیجے میں اس نوع کی "علیحدگی" کا تصور عیاں ہو گیا تو لندن بیرون یورپ اپنی خارجہ پالیسی کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ فوجی نقطہ نظر سے سب سے اہم بات وہ شاہی منصوبے تھے جن کے تحت برطانوی فوج اور برطانوی فضائیہ ہندوستان' عراق' مصر' فلسطین اور دیگر

علاقوں میں مصروف کار تھی۔ جنگ کے زیادہ تر عرصے میں برطانوی فوج عہد وکٹوریہ کے زمانے کے کردار کی طرف مراجعت کر رہی تھی۔ ہندوستان پر روس کے حملے کی دھمکی فوجی لحاظ سے بہت بڑے خطرے کی علامت تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں وہاں کے باشندوں کو خاموش و پر سکون رکھنا روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ آخر کار برطانیہ کی فوجی حکمت عملی پر شاہ کی اثر اندازی کے نتیجے میں شاہی بحریہ نے اپنا خاص بحری بیڑہ سنگاپور روانہ کیا۔ پھر وہائٹ ہال نے یہ اعلان کیا کہ دور دراز کی مقبوضات کو جاپانیوں کے حملے سے محفوظ رکھا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کی فوجی حکمت عملی صدیوں پرانی طرز کی تھی لیکن سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ اسے ایسی حالت میں بروئے کار لایا جائے جبکہ صنعتی بنیاد کمزور پڑ چکی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں برطانیہ کی مصنوعات کی پیداواری شرح نہایت ادنیٰ تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اسٹرلنگ کو معیار طلا تک لانے کے لیے قیمت کی سطح کو خاصا بلند کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ برطانیہ کو جرمنی اور امریکہ کی طرح اتنا نقصان نہیں اٹھانا پڑا پھر بھی اس کی زبوں حال اقتصادی حالت اس وقت ڈانواں ڈول ہو گئی جب ۱۹۲۹ء کے بعد ساری دنیا کے کاروبار میں مندی کا رجحان پیدا ہوا۔ کپڑے کی صنعت جس پر برطانیہ کی ۴۰ فی صد برآمدات کا انحصار تھا' گھٹ کر دو تہائی رہ گئی۔ اسی طرح کوئلہ جو برآمدات کا ۱۰ فی صد حصہ ہوتا تھا۔ اس میں ۱/۵ فی صد کمی آ گئی۔ جہاز سازی کی صنعت بری طرح تباہ ہوئی تھی۔ جنگ سے پہلے جہاز جس تعداد میں تیار ہو رہے تھے وہ ۱۹۳۳ء میں ۷ فی صد گھٹ گئی۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران فولادی صنعت میں ۴۵ فی صد کمی آ گئی جبکہ ان تین سال میں کچے لوہے کی مصنوعات ۵۳ فی صد تک گھٹ گئی۔ چونکہ بین الاقوامی تجارت میں مندے کا رجحان عود کر آیا تھا اور اس کے نتیجے میں پابند کرنسی نے جگہ لے لی تھی لہٰذا عالمی تجارت میں برطانیہ کی ساکھ گرتی جا رہی تھی۔ صورت حال کچھ یوں ہو گئی تھی کہ ۱۹۱۳ء میں یہ شرح ۱۴ء۱۵ فی صد تھی جو ۱۹۲۹ء میں ۱۰ء۷۵ اور ۱۹۳۷ء میں ۹ء۸ فی صد رہ گئی۔ علاوہ ازیں جہاز رانی' انشورنس اور سمندر پار سرمایہ کاری سے جو آمدنی گذشتہ ایک صدی کے دوران حاصل ہو رہی تھی اور اس سے تجارتی خلا پر ہوتا تھا اب اس کے امکانات نہیں رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی عشرے میں برطانیہ کو اپنے ہی سرمایہ پر گزران کرنا پڑا۔ پھر ۱۹۳۱ء میں پیدا شدہ بحران کے نتیجے میں لیبر گورنمنٹ ختم ہو گئی اور طلا کے بغیر ہی کام چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ سیاست دانوں کو ملک کی اقتصادی زبوں حالی کا پوری طرح احساس ہو گیا تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ان لیڈروں کی تشویش حد سے زیادہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی تھی۔ ۱۹۳۳ء سے اقتصادی حالت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی تھی۔ اگرچہ شمالی علاقے کے پرانے کارخانے ہنوز جمود کا شکار تھے لیکن لڑاکا طیارے' آٹو موبائل' پیٹرو کیمکلز اور بجلی کے سامان بنانے کے نئے نئے کارخانے لگ رہے تھے۔ "اسٹرلنگ کی پابندی" کے تحت ہونے والی تجارت سے برطانیہ کے برآمد کنندگان کو کچھ سہارا مل گیا۔ غذائی اشیاء اور خام مال میں کمی آ جانے سے برطانوی صارف کو فائدہ پہنچا۔ لیکن یہ چھوٹی چھوٹی باتیں وزارت خزانہ کے لیے کافی نہ تھیں۔ وہ تو بیرون ملک برطانیہ کی پیچیدہ کریڈٹ پوزیشن سے فکر مند تھی جبکہ اسٹرلنگ کا معاملہ اس کے لیے الگ سوہان روح بنا ہوا تھا۔ اس کے خیال میں دنیا میں ادائیگی کے طریقے کے لیے ملک کو ترجیحی اقدام کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے یہ باتیں لازمی تھیں: کھاتا برابری کم سے کم ٹیکس کا نفاذ اور سرکاری اخراجات پر پابندی! حتیٰ کہ جب ۱۹۳۲ء میں منچوریہ کے بحران کے نتیجے میں حکومت کو دس

سال☆ حکومت کرنے کا منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ اس وقت بھی وزارت خزانہ نے اس امر پر زور دیا کہ اس سے قطعاً یہ مطلب نہ لیا جائے کہ تینوں مسلح افواج اپنے اخراجات میں توسیع کر دیں اور مالیاتی اور اقتصادی زبوں حالی کو سراسر نظر انداز کر دیں۔

ملکی سیاست اور اقتصادی دباؤ کے نتیجے میں برطانیہ بھی فرانس کی طرح ۱۹۳۰ء کے ابتدائی عشرے میں اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کر رہا تھا جبکہ آمریت کا شکار ریاستیں اس نوع کے اخراجات میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ۱۹۳۶ء سے قبل تک صورت حال یہ رہی تھی کہ برطانیہ کو دفاعی اخراجات میں کمی کرنی پڑی تھی۔ ادھر ہٹلر کے از سر نو فوجی نقل و حمل اور حبشہ کے واقعہ سے صدمہ بھی پہنچا تھا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کو دفاعی بجٹ میں اضافہ کرنا پڑا جو اٹلی کے مقابلے میں خاصا کم اور جرمنی کے مقابلے میں ایک تہائی یا ایک چوتھائی تھا۔ چونکہ اس وقت وزارت خزانہ کا سخت کنٹرول قائم تھا اور سیاست دان عوام کے تیور سے خائف تھے لہٰذا وسیع پیمانے پر فوجی تیاری عمل میں نہ آ سکی لیکن ۱۹۳۸ء میں حالات ناگفتہ بہ ہوئے تو ایسا اقدام ممکن ہو سکا تاہم مذکورہ سال سے قبل ہی سے مسلح افواج اپنی بے سروسامانی کا رونا رو رہی تھیں اور بار بار یہ اطلاع دے رہی تھیں کہ جرمنی' اٹلی اور جاپان کے حملے سے ملکی تجارت علاقے اور اہم مفادات کا تحفظ ان کے بس میں نہیں۔ بایں ہمہ وہ حکومت پر زور دے رہی تھیں کہ خاص خاص دشمنوں کو کم سے کم کیا جائے اور اس ضمن میں طاقتور اتحادیوں کی حمایت حاصل کی جائے۔ دوسرے معنوں میں ایک ایسی سفارت کاری کی ضرورت تھی جو معاشی لحاظ سے کمزور اور جغرافیائی لحاظ سے پھیلی ہوئی سلطنت کو مشرق بعید' بحیرہ روم اور یورپ میں درپیش خطرات سے محفوظ رکھ سکے۔ کسی بھی ملک کے چیف آف اسٹاف کی نظر میں برطانیہ طاقتور ملک کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور یہ منفی پوزیشن بھی لفٹ ویف کے تشویشناک حالات سے مزید دگرگوں ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جزیرے کے عوام پہلی مرتبہ کسی دشمن کے حملے کا نشانہ بنے تھے۔

اس بات کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ برطانیہ کے چیف آف اسٹاف اپنے ملک کے بہتر مستقبل کی طرف سے خاصے مایوس ہو چکے تھے یہی صورت حال دیگر ریاستوں کے فوجی افسران کی بھی تھی۔ پہلی جنگ عظیم نے ان سبھوں کو محتاط اور قنوطی بنا دیا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۳۶ـ۷ء کے دوران جرمنی کی فضائیہ نے برطانوی فضائیہ پر برتری حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ برطانیہ کی بری فوج براعظم یورپ میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسی طرح اس ملک کی بحریہ کے لیے یورپی سمندروں پر کنٹرول

☆ ۱۹۱۹ء کے بعد کی ہدایات کے مطابق مسلح افواج کو اپنا دفاعی اخراجات کا گوشوارہ اس طرح بنانا تھا کہ وہ اگلے دس سال کسی اہم جنگ میں ملوث نہیں ہوں گی۔

کرنا اور اپنا خاص بیڑہ سنگاپور روانہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ پھر برطانیہ کے کرتا دھرتاؤں کے لیے یہ بات زیادہ سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ چیف آف اسٹاف کے مطالبے کے مطابق طاقتور قسم کے اتحادیوں کو تلاش کرنا مشکل مسئلہ بن چکا تھا۔ برطانیہ نے قبل ازیں نپولین کا مقابلہ کرنے کے لیے جو اتحاد قائم کیا تھا اور جس قسم کے دوستانہ معاہدے ۱۹۰۰ء کے بعد کے دنوں میں وجود میں آئے تھے' اب ان کے امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ جاپان اب اتحادی کی بجائے دشمن بن چکا تھا۔ یہی وطیرہ اٹلی نے بھی اپنایا ہوا تھا۔ روس جو صف اول کی طاقت تھا اور جس نے براعظم پر تسلط قائم رکھنے کے لیے روایتی انداز میں برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ اب سفارتی میدان میں تنہا کھڑا مغربی جمہوریتوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی اور وسطی عشرے میں امریکہ نے جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ وائٹ ہال کے مایوس ذہن کے لیے لاینحل بنی ہوئی تھی۔ یعنی کسی قسم کے سفارتی اور فوجی وعدے سے اجتناب' لیگ میں شمولیت سے پہلو تہی' برطانیہ کے اس رویئے ـــــ کہ تبدیلی پسند ریاستوں کو کچھ دے دلا کر گلو خلاصی حاصل کر لی جائے' اسے سخت اختلاف (یعنی مشرقی ایشیاء میں جاپان کی خاص پوزیشن کو تسلیم کر لیا جائے اور جرمنی کو ادائیگی اور تبادلے کے لیے خاص سہولتیں فراہم کرنا) اور ۱۹۳۷ء کے غیر جانب داری کے قانون کے مطابق برطانیہ کو اس امر سے باز رکھا جائے کہ وہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۷ء کے دوران جس طرح جنگ برقرار رکھنے کے لیے امریکہ کی منڈیوں سے سامان بطور قرض لیا کرتا' وہ اب نہ لے۔ گویا امریکہ برطانیہ کی فوجی حکمت عملی کو اسی طرح بے وقعت بنا رہا تھا۔ جس طرح آخرالذکر مشرقی یورپ کے معاملے میں فرانس کے فوجی منصوبے کو غت ربود کر رہا تھا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں فرانس اور سلطنت برطانیہ ایک طاقتور اتحادی کی حیثیت سے سامنے آ گئے۔ بہرحال فرانس کی سفارتی ضرورت کے پیش نظر برطانیہ نے وسطی یورپ میں تعاون کی پیشکش کر دی لیکن دیگر تمام سلطنتوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ پھر اس سارے تاروپود کا تحفظ خاصا مشکل بن گیا۔ دوسری طرف سلطنت برطانیہ کی ساری توجہ اور وسائل جرمنی سے لاحق خطرات کی جانب مرکوز ہو گئے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۰ء کے دوران برطانیہ ایسے سفارتی اور فوجی معاملات میں الجھ کر رہ گیا جس کا کوئی اطمینان بخش حل نظر نہیں آتا تھا۔

یہاں یہ کہنے کا ہرگز یہ مدعا نہیں کہ اگر اس موقع پر بیلڈون چیمبرلین اور ان کے ساتھی موجود ہوتے تو بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے اور نہ ہی یہ دعویٰ کرنا مقصود ہے کہ برطانیہ کی تسلی بخش پالیسی اس نوعیت کی تھی کہ اس کے مدمقابل جو بھی پالیسیاں چرچل اور دیگر نقادوں نے پیش کی تھیں وہ قابل عمل نہ تھیں۔ حکومت برطانیہ کی یہ خواہش تھی کہ نازی حکومت کے ساتھ جو مناسب رویہ اختیار کیا جائے وہ قابل اعتماد ہو۔ اس کے برعکس کمیونزم کے ساتھ جو جذباتی انداز کی نفرت تھی اس کے پیش نظر روس کی یہ اہمیت نظر انداز کی جاتی رہی کہ وہ فاشزم کے خلاف اتحاد کا ایک طاقتور رکن بھی ہے۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی معمولی ریاستیں مثلاً چیکوسلواکیہ اور پولینڈ ہمیشہ وبال جان بنی رہتی تھیں۔ انھیں فرانس کے مسائل کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس سے ان ریاستوں کی اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا تھا۔ جرمنی اور اٹلی کی طاقتیں معمولی شواہد کی بناء پر حد سے زیادہ تصور کی جاتی تھیں جبکہ برطانیہ کی جملہ دفاعی کمزوریاں عملی اقدام نہ کرنے کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ یورپ میں طاقت کے توازن کے متعلق وائٹ ہال کا نظریہ خود غرضی پر مبنی اور قلیل المیعاد قسم کا تھا۔ تسلی آمیز پالیسی پر اعتراض کرنے والوں مثلاً چرچل کی رائے کو نہایت خوش اسلوبی سے منسوخ کر دیا جاتا پھر حکومت یہ اعلان بھی کرتی رہتی کہ وہ عوام کی رائے کا پاس و لحاظ رکھے گی۔

حکومت برطانیہ کی یہ خواہش کہ آمریت پسند ریاستوں کے مد مقابل نہ آیا جائے۔ کیسی ہی خوش آئند اور ٹھوس بنیاد کی حامل نظر آتی ہوں لیکن موجودہ وقت کے فاصلے سے دیکھا جائے تو حد درجہ کھوکھلی اور بے وقت نظر آتی ہے۔

اگر اقتصادی اور فوجی حقائق کی چھان پھٹک کی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ۱۹۳۰ء کی آخری دہائی میں برطانیہ کو جن دفاعی نوعیت کے مسائل کا سامنا تھا' وہ محض روپے کی تبدیلی یا وزرائے اعظم کے بدل جانے سے حل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہٹلر کے مزید جارحانہ عزائم اور برطانوی عوام کی جھنجلاہٹ کے پیش نظر چیمبرلین تسلی آمیز پالیسی سے جتنا زیادہ اجتناب برتتا' اتنا ہی تضاد نمایاں ہوتا۔ اگرچہ چیف آف اسٹاف دفاعی اخراجات میں مزید اضافے کا تقاضا کر رہے تھے۔ لیکن وزارت خزانہ کا یہ کہنا تھا کہ اس نوع کے اصراف اقتصادی لحاظ سے تباہی کا باعث ہوں گے۔ ۱۹۳۷ء میں برطانیہ فرانس ہی کی طرح اپنی مجموعی قومی آمدنی کا وافر حصہ دفاع پر خرچ کر رہا تھا۔ حالانکہ ہر دو ملک نے ۱۹۱۴ء سے قبل کے ہنگامی دور میں اتنی رقم اس مد میں خرچ نہیں کی تھی۔ اس وافر اخراجات کے باوجود سیکورٹی کے معاملے میں کوئی اہم پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بین وجہ یہ تھی کہ جرمنی کی ریاست اس مد میں بہت زیادہ رقم صرف کر رہی تھی اور جب برطانیہ کے دفاعی اخراجات میں مزید اضافہ ہوا مثلاً ۱۹۳۷ء میں مجموعی قومی آمدنی کا ۵۰۵ فی صد خرچ ہوتا تھا جو ۱۹۳۸ء میں ۸۰۵ فی صد ہو گیا تو پھر ۱۹۳۹ء میں یہ شرح ۱۲۰۵ فی صد تک پہنچ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی پیچیدہ اقتصادی حالت اور بھی ابتر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ جب دفاعی سازوسامان کی تیاری کے لیے رقم مہیا کی گئی تو صنعتی پلانٹ کی کمی اور تجربہ کار انجینئروں کے فقدان کی وجہ سے لڑاکا طیارے' ٹینک اور جنگی جہاز توقع کے مطابق تیزی سے نہ بن سکے۔ چنانچہ دفاعی شعبوں نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسلحے' فولادی چادریں' بال بیئرنگ اور دیگر ضروری سامان مہیا کرنے کے لیے سویڈن اور امریکہ جیسے غیر جانب دار ملکوں کو آرڈر دیئے۔ اس طرح نہ صرف زرمبادلہ کے محفوظات میں کمی واقع ہوئی بلکہ ادائیگی کے توازن کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا۔ جب ملک میں سونے اور ڈالر کا اسٹاک کم ہونا شروع ہوا تو اس کی بین الاقوامی ساکھ پہلے سے کہیں زیادہ متاثر ہوئی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۳۹ء میں جب دوبارہ جنگی تیاری شروع کرنے کی درخواست وزارت خزانہ سے کی گئی تو اس نے سرد مہری کے انداز میں یہ جواب دیا "اگر ہم اس مغالطے میں ہیں کہ ۱۹۱۴ء کی طرح ایک طویل جنگ لڑ سکتے ہیں تو گویا ہم ریت میں اپنا سر دھنسا رہے ہیں" یہ ایک ایسی طاقت کے لیے اچھا شگون نہ تھا جس کے فوجی منصوبہ سازوں نے یہ تصور کر لیا تھا کہ وہ قلیل المیعاد قسم کی جنگ میں تو فتح حاصل نہیں کر سکتے' البتہ غیر فیصلہ کن جنگ میں کسی قدر کارکردگی دکھا سکتے ہیں۔

جنگ کے موقع پر خود فوجی حلقے میں سنگین نوعیت کے تضادات پائے جاتے تھے۔ جب ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ فرانس کے ساتھ کیے گئے قدیم وعدے وفا کیے جائیں اور بحیرہ روم کے برعکس سنگاپور میں بحری بیڑے تعینات کیے جائیں تو اس سے کئی فوجی معاملات تو حل ہو گئے لیکن مشرق بعید میں انگلستان کے مفادات کا راز افشا ہو گیا جس کی وجہ سے جاپان جارحانہ اقدام کرنے پر مجبور ہو گیا۔ متضاد اقدام کا اظہار اس وقت بھی ہوا جب موسم بہار ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے پولینڈ کو اپنی حمایت کی بھرپور یقین دہانی کرائی تھی۔ پھر یہی رویہ یونان' رومانیہ اور ترکی کے لیے بھی اختیار کیا گیا۔ ان باتوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ وائٹ ہال نے براعظم میں طاقت کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے مشرقی یورپ اور بلکان کا اہم

جواز تلاش کر لیا ہے۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ تھا کہ برطانیہ کی مسلح افواج جرمنی کے حملے سے مذکورہ علاقوں کو بچانے کی کم ہی صلاحیت رکھتی تھیں۔

مختصر یہ کہ نہ تو مارچ ۱۹۳۹ء کے بعد جرمنی کے معاملے میں چیمبرلین کی سخت ترین پالیسی نے اور نہ ہی مئی ۱۹۴۰ء میں اس کی جگہ لینے والے چرچل نے برطانیہ کے فوجی اور اقتصادی مسائل کو حل کیا۔ بلکہ ان کے اقدام سے مسئلے اور بھی گمبھیر ہو گیا۔ دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی یہ سلطنت اپنی تاریخ کے آخری دنوں میں بھی ایک چوتھائی عالم کو زیر نگیں کیے ہوئے تھی۔ لیکن یہ سب کچھ محض اس کی ۹ سے ۱۰ فی صد صنعتی طاقت اور جنگی صلاحیت کے بل بوتے پر ہو رہا تھا۔ یہ "اطمینانی" اور "بے اطمینانی" کی کیفیت نقصان کا باعث ٹھہری۔ البتہ کسی نہ کسی خرابی کی پسند کا معاملہ تھا۔ ہاں' ۱۹۳۹ء میں صحیح قسم کے فیصلے کو پسند کیا گیا تھا یعنی ہٹلر کے جارحانہ عزائم کی بھرپور مزاحمت! لیکن اس کے بعد یورپ اور مشرق بعید میں برطانیہ کے مفادات کے خلاف طاقتیں آپس میں اس طرح ہم آہنگ ہو گئیں کہ یہ صورت حال ناسازگار بن گئی۔ اب فاشزم کے خلاف فتح بڑی طاقتوں کی مداخلت کے بغیر ممکن نہیں رہی۔ اور پھر اس میں بھی کئی مضمرات مخفی تھے۔

میدان عمل سے دور ------ سپرپاورز

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' جب برطانیہ اور فرانس کے منصوبہ ساز ۱۹۳۰ء کے عشرے میں سفارتی اور فوجی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کر رہے تھے' ان میں ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ اس وقت کی دو عظیم طاقتیں یعنی روس اور امریکہ کسی قدر الگ تھلگ تھیں۔ کیا فاشی ملکوں کے خلاف اتحاد میں شامل ہونے پر انھیں راضی کرنا مناسب تھا' چاہے اس کے لیے ماسکو اور واشنگٹن کو ان کے حسب خواہش کچھ مراعات ہی کیوں نہ دینی پڑیں؟ اور کیا اس طرح اندرون ملک تنقید کی بوچھاڑ کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا؟ پھر ان طاقتوں میں کسی کی زیادہ منت سماجت کی جاتی اور کیوں کر؟ کیا روس کے ساتھ سلسلہ جنبانی سے جرمنی یا جاپان رد عمل کا اظہار نہیں کر سکتا تھا؟ برلن اور ٹوکیو (اور کسی قدر روم) کے نقطہ نظر کے مطابق روس اور امریکہ دونوں کا طرز عمل اہمیت کا حامل تھا۔ اگر ہٹلر وسطی یورپ کی سرحدوں کو عبور کرتا ہوا اس علاقے میں گھس گیا تو کیا اس موقع پر یہ طاقتیں الگ تھلگ رہیں گی؟ اگر جاپان نے چین میں مزید مقبوضات حاصل کرنے کی کوشش کی یا جنوب مشرقی ایشیاء میں یورپ کی قدیم سلطنتوں کے خلاف جارحانہ کاروائی کی تو اس صورت میں ان کا رد عمل کیا ہو گا؟ کیا امریکہ مغربی جمہوریتوں کو اقتصادی امداد فراہم کرے گا جس طرح اس نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۷ء کے دوران کیا تھا؟ اور کیا اقتصادی اور علاقوں کے سمجھوتے کے ذریعے روس کو خریدا جا سکتا ہے؟ آخری بات یہ کہ مذکورہ دونوں حکومتوں کی واقعتاً کوئی حقیقت بھی تھی؟ آخر وہ کس قدر طاقتور تھیں؟ پھر بدلتے ہوئے بین الاقوامی نظام میں ان کی کیا اہمیت تھی؟

سوویت یونین جیسے بند معاشرے کے معاملے میں ایسے سوالوں کا جواب دینا خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ تاہم اس وقت وہاں اقتصادی ترقی اور فوجی طاقت کی جو کیفیت تھی اس کے شواہد اب دستیاب ہیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کی محاذ آرائی کے بعد سے اور پھر انقلاب اور خانہ جنگی کے نتیجے میں روس دیگر بڑی طاقتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور ہو چکا تھا۔ اس کی آبادی جو ۱۹۱۴ء میں ۱۷۱ ملین تھی۔ ۱۹۲۱ء میں گھٹ کر ۱۳۲ ملین ہو گئی۔ پولینڈ' فن لینڈ اور بالٹک کی ریاستوں کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے ملک کے کئی صنعتی پلانٹ' ریلوے' فارم وغیرہ بھی دسترس میں نہیں رہے اور جو بچ بھی گئے ۱۱ طویل جنگ کے نتیجے میں تباہ و برباد ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں مصنوعات ۱۹۲۰ء کے قریب ۱۳ فی صد تک گھٹ گئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی اہم اشیاء کی پیداوار زد میں آئی ہو گی۔ جنگ سے قبل کی پیداواری شرح کے مقابلے میں کچا لوہا ۱۰۶ فی صد' قلزات ۲۰۴ فی صد' فولاد ۴ فی صد اور روئی ۵ فی صد رہ گئی تھی۔ بیرونی تجارت ختم ہو چکی تھی۔ غلے کی پیداوار شرح جنگ سے قبل کے مقابلے میں نصف ہو گئی تھی۔ فی کس آمدنی میں ۶۰ فی صد سے بھی زیادہ کی آ گئی تھی جو خاصی تشویشناک بات تھی۔ چونکہ یہ زوال ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۱ء کے سماجی اور سیاسی بحران کی وجہ سے آیا تھا' لہٰذا سوویت حکومت (یا کوئی اور حکومت) اپنے قیام کے نتیجے میں ان مضمرات کا ازالہ کرنے پر مجبور تھی۔ بولشویک تحریک کے ورثے میں روسی صنعت جنگ سے قبل اور بعد کے زمانے میں فروغ پاتی رہی اور کارخانوں' ریلوں' سڑکوں اور تار کی لائنوں کا ایک جال سا بچھ

گیا۔ پھر ایسے صنعتی مزدور بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے جو خانہ جنگی کے خاتمے پر واپس فیکٹری آ گئے تھے۔ زرعی پیداوار کا اپنا ایک مستحکم انداز تھا۔ پھر غذائی اجناس دیہاتوں اور شہروں میں خوب فروخت ہو رہی تھیں اور اگر لینن نے ۱۹۲۱ء کی نئی اقتصادی پالیسی کے تحت یہ فیصلہ کر لیا کہ کھیتی باڑی کو کمیونزم کے لاحاصل مجموعی دائرے میں لانے کے برعکس انفرادی زراعت کی اجازت دی جائے تو غلہ گوداموں میں رکھا جا سکتا تھا۔ بہرحال ۱۹۲۶ء کے آتے آتے زرعی پیداوار جنگ سے قبل والی سطح پر آ گئی۔ پھر دو سال بعد صنعتی پیداوار کی پوزیشن بھی یہی ہو گئی۔ جنگ اور انقلاب کے نتیجے میں روس کے تمیں سالہ اقتصادی استحکام کو دھچکا لگا تھا۔ لیکن اب یہ مائل پرواز نظر آ رہا تھا۔

لیکن ترقی کی اس پرواز میں تیزی کا فقدان تھا۔ اس کی وجہ اسٹالن کا ظالمانہ رویہ نہ تھا۔
روس اپنی معاشی کمزوریوں کے باوجود جدوجہد کیے جا رہا تھا۔ البتہ بیرونی سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر تھی۔ وسیع پیمانے پر صنعت کو فروغ دینے کے لیے نجی شعبے سے مالی معاونت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ پھر جنگ و جدال کی اس دنیا میں مناسب فوج تیار کرنے کے لیے بھی لوگوں سے قرض حاصل کیے جاتے تھے۔ درمیانہ طبقہ ختم ہو چکا تھا۔ اب اسے سرمایہ پیدا کرنے کی ترغیب دی جا رہی تھی یا پھر اس کی دولت پر غاصبانہ قبضہ کیا جا رہا تھا۔ نیز' ۱۹۲۶ء میں روس کی ۸۷ فی صد آبادی زراعتی شعبے کے نہایت نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ سب کے سب زمین داروں کے اسیر تھے۔ ایسی صورت میں اسٹالن کی حکومت کے لیے رقم کے حصول کا ایک ہی ذریعہ رہ جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ زراعت سے صنعت کی طرف پیش قدمی کی رفتار بھی تیز کی جا سکتی تھی۔ یعنی' اجتماعی کھیتی باڑی کا نظام کسانوں کی کمیون میں زبردستی تبدیلی' زمین داری کا خاتمہ' زمین کی پیداوار کی نگرانی' کھیت پر کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت کا تعین اور فروخت کے لیے غذائی اشیاء کی قیمت کا زیادہ سے زیادہ تعین! اس طرح حکومت نے عجیب و غریب انداز میں خود کو دیہی پیدا کار بھی ظاہر کیا تھا اور شہری صارف بھی! اس طرح دونوں طرف سے اس قدر رقم ہتھیائی گئی تھی جس کا زار کی ظالمانہ حکومت۔نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ اس پر مستزاد قیمتوں میں اضافہ مختلف نوعیت کے ٹیکس اور واجبات کا نفاذ اور سرکاری بانڈ خریدنے کی پابندی تھی۔ اقتصادی گوشوارے کے مطابق ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ روس کی مجموعی قومی پیداوار کا زیادہ حصہ نجی مصارف میں کام آنے لگا۔ پھر پیداواری شرح میں بھی ۵۱/۵۲ فی صد کی آ گئی۔ جبکہ دوسرے ملکوں میں یہ صورت حال تھی کہ صنعت کے فروغ کے باعث یہی شرح تقریباً" ۸۰ فی صد تک پہنچ چکی تھی۔

سوشلسٹ نظام کے تحت رونما ہونے والے اقتصادی حالات کے دو متضاد نتائج سامنے آئے۔ اول یہ کہ سوویت یونین کی زرعی پیداوار میں بے انتہا کمی واقع ہو گئی۔ اس کی وجہ زمین داری کے خاتمے اور اجتماعی کھیتی باڑی کے نظریئے کے خلاف زمین داروں کا احتجاج تھا جسے کچل دیا گیا۔ پھر کھیتوں پر کام کرنے والے جانوروں کا بے دریغ ذبیحہ بھی اس کا نمایاں سبب تھا۔ ۱۹۲۸ء میں گھوڑوں کی تعداد ۳۳۰۵ ملین تھی جو ۱۹۳۵ء میں گھٹ کر محض ۱۶۰۶ ملین رہ گئی۔ پھر مال مویشیوں کی تعداد بھی ۷۰۰۵ سے گھٹ کر ۳۸۰۴ ملین رہ گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں جہاں گوشت کی کمی واقع ہو گئی وہاں غلے کی پیداوار پر بھی اس کے مضر اثرات مرتب ہوئے۔ چنانچہ زندگی کا معیار جو پہلے ہی پست تھا اور بھی پست ہو کر رہ گیا۔ اس صورت حال میں تبدیلی خروشیف کے عہد میں ہی آ سکی تھی۔ روس کی قومی آمدنی کے تناسب سے ہی یہ جائزہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازاں یہی آمدنی ٹریکٹر کی تیاری اور بجلی کی تنصیبات کے لیے مختص کی گئی تھی۔

لیکن ٹریکٹر بنانے کی یہی فیکٹریاں ہلکے پھلکے ٹینک بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ کسان اس رویئے پر نظر رکھنے سے سراسر قاصر تھے۔ بہرحال مذکورہ زمانے میں سوویت یونین کی زرعی پیداوار روبہ زوال ہو گئی۔ پھر ۱۹۳۳ء کے قحط اور دیگر اسباب کی بناء پر لاکھوں افراد لقمہ اجل بن گئے۔ جب ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں پیداوار میں تھوڑا بہت اضافہ ہونے لگا تو پھر اس کو حد سے زیادہ وسعت دینے کے لیے ہزاروں ہزار ٹریکٹر استعمال میں لائے گئے۔ زرعی سائنس داں زراعت کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور اجتماعی کھیتی باڑی پر فوجیوں کی سخت نگرانی قائم رہی۔ لیکن انسانوں کو اس کی جو قیمت ادا کرنی پڑی وہ بے حد و بے حساب تھی۔

دوسرا نتیجہ سوویت یونین کی اقتصادی اور فوجی طاقت کے لیے سودمند ثابت ہوا۔ روس نے مجموعی قومی آمدنی کے حصص کو ذاتی استعمال کے لیے اس حد تک گرا دیا تھا کہ جدید تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یوں کہیے کہ نازی حکومت بھی جرمنی میں اتنی ادنیٰ سطح پر حصص کو لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ غرض روس مجموعی قومی آمدنی کا ۲۵ فی صد حصہ صنعت و حرفت کے لیے مختص کر دیتا۔ اس کے بعد بھی اتنا سرمایہ بچ رہتا کہ اسے تعلیم سائنس اور مسلح افواج کے مد میں صرف کیا جاتا۔ روسی عوام کے روزگار میں بھی نہایت وسیع پیمانے پر تبدیلیاں پیدا کی گئی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۰ء تک کے بارہ برسوں کے دوران کھیتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ۷۱ فی صد سے گھٹ کر ۵۱ فی صد رہ گئی تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ لوگوں کو اتنے وسیع پیمانے پر تعلیم دی جا رہی تھی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ دو باتوں کی وجہ سے فروغ تعلیم کی وہاں بڑی اہمیت تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ جرمنی اور امریکہ کے مقابلے میں روس میں فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور غیر تربیت یافتہ اور ان پڑھ ہوتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ مصنوعات کے فروغ کے لیے وہاں نہایت قلیل تعداد میں انجینئر' سائنس دان اور مینجر موجود تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ لاکھوں مزدوروں کو فیکٹری کے اسکولوں اور ٹیکنیکل کالجوں میں تربیت دی جا رہی تھی۔ پھر جلد ہی یونیورسٹیوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں ایسے باہنر اور تجربہ کار افراد کثیر تعداد میں نمایاں ہونے لگے جو ترقی کے لیے بہت ضروری تھے۔ گریجویٹ کی سطح کے انجینئروں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۸ء میں یہ تعداد کل ۴۷۰۰۰ ہزار تھی' لیکن ۱۹۳۱ء میں بڑھ کر ۲۸۹۹۰۰ ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ مذکورہ دور میں روس کے پروپیگنڈہ کرنے والوں نے بہت سے گوشوارے بڑھا چڑھا کر پیش کیے تھے اور بہت ساری خامیوں کو چھپا بھی دیا تھا' لیکن اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ معاشی ترقی کے لیے ملکی وسائل پوری طرح بروئے کار لائے جا رہے تھے۔ اسی طرح کوہ یورال کے دامن میں نئے نئے پاور پلانٹ اور فولاد کے کارخانے قائم کیے گئے تھے جو مغربی ملکوں اور جاپان کے حملوں سے محفوظ تھے۔

نہایت محتاط طریقے سے پیش کیے گئے اس گوشوارے کے مطابق مصنوعات کی پیداوار اور قومی آمدنی کو جو فروغ حاصل ہوا تھا وہ صنعت و حرفت کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ ۱۹۱۳ء کے ابتدائی دنوں میں پیداوار کی شرح کا حجم اور اقدار دونوں لحاظ سے نہایت قلیل تھی۔ ایسے میں سال بہ سال کی فی صد تبدیلی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگرچہ جدول نمبر۲۸ سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ "عظیم بحران" کے دوران روس میں مصنوعات کی پیداوار فروغ پا رہی تھی۔ بہرحال اگر دو پنج سالہ پلان (۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۷ء) کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ روس کی قومی آمدنی ۳۵۰۴ روبل سے بڑھ کر ۹۶۰۳ روبل ہو گئی۔ کوئلہ کی پیداوار ۳۵۰۴ ٹن سے بڑھ کر ۱۲۸ ملین ٹن ہو گئی تھی۔ فولاد کی پیداوار' ۴ ٹن

سے ۱۷ ملین ٹن ہو گئی۔ بجلی کی پیداوار میں سات گنا اضافہ ہو گیا۔ مشینی اوزار بیس گنا زیادہ تیار کیے گئے۔ ٹریکٹر ۴۰ گنا زیادہ بنائے گئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے آخری دہائی میں روس کی صنعتی پیداوار میں جو اضافہ ہوا تھا وہ نہ صرف فرانس جاپان اور اٹلی سے زیادہ تھا' بلکہ برطانیہ سے بھی بہت بڑھ گیا تھا۔

تاہم اس موثر انداز کے تعمیری کام کے باوجود وہاں بہت سی خامیاں بھی تھیں۔ اگرچہ زرعی پیداوار ۱۹۳۰ء کے وسطی عشرے میں آہستہ آہستہ بڑھی تھی اس کے باوجود ملکی ضروریات پورا کرنے کے زمانے میں سب سے آسان ترین کام یہ بھی تھا کہ ذمہ داری سے گریز اختیار کیا جائے ہر کام کے لیے اپنے اعلیٰ افسر سے ہدایت لی جائے۔ جب کوئی حکم ملے تو مشینی انداز میں اس کی تعمیل کی جائے۔ ان تمام باتوں کے دوران مقامی ضرورتوں پر چنداں توجہ نہ دی جائے۔ اس طرح کسی مخص کی چمڑی تو پٹائی سے بچ جاتی تھی لیکن مجموعی اقتصادی حالت میں بہتری تو نہیں آتی تھی۔

چونکہ سوویت یونین جنگ کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا اور اسے پولینڈ' جاپان اور برطانیہ جیسے قومی دشمنوں سے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا لہٰذا ۱۹۲۰ء کے زیادہ تر عشرے میں اس نے قومی بجٹ کا وافر حصہ (۱۲ تا ۱۶ فی صد) دفاعی اخراجات کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ لیکن پہلے پانچ سالہ منصوبے کے دوران اس مد میں کمی آ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک روس کی باقاعدہ مسلح افواج ۶۰۰۰۰۰ افراد پر مشتمل تھیں۔ پھر ان کی پشت پناہی کے لیے اس سے دوگنی تعداد میں ملیشیا بھی موجود تھی جو اگرچہ اتنی موثر نہ تھی۔ پھر منچوریہ کے ہنگامے اور ہٹلر کے برسراقتدار آ جانے کے نتیجے میں فوج میں مزید توسیع کی گئی' یعنی ۱۹۳۴ء میں سپاہیوں کی تعداد ۹۴۰۰۰۰ کر دی گئی جبکہ اگلے سال یہ ۱۰۳ ملین تک پہنچ گئی۔ پانچ سالہ منصوبوں پر عمل درآمد کے نتیجے میں جب صنعتی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوا تو خاصی تعداد میں ٹینک اور لڑاکا طیارے بنائے گئے۔ میخائل توخا چیسکی کے اردگرد موجد قسم کے جو افسران تھے وہ ڈوہٹ' فلر' لیڈل ہارٹ' گوڈرین اور دیگر مغربی جنگی ماہرین کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے خواہاں نظر آتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی عشرے میں روس کے پاس نہ صرف ٹینک بردار فوج تھی بلکہ چھاتہ بردار فوج بھی بڑی تعداد میں موجود تھی۔ اگرچہ سوویت یونین کی بحری فوج چھوٹی اور غیر موثر تھی لیکن فضائیہ دیگر تمام طاقتوں کے مقابلے میں اعلیٰ تھی۔ وہاں ۱۹۲۰ء کے عشرے کے آخر میں لڑاکا طیارے بنانے کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا جا چکا تھا جو ہر سال اتنی تعداد میں جہاز تیار کرتا تھا جو دیگر بڑی طاقتوں کے مشترکہ جہازوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ (ملاحظہ کیجئے جدول نمبر ۲۹)

جدول نمبر ۲۹: بڑی طاقتوں کے لڑاکا طیارے بنانے کی رفتار = ۱۹۳۲ء - ۱۹۳۹ء

	۱۹۳۲ء	۱۹۳۳ء	۱۹۳۴ء	۱۹۳۵ء	۱۹۳۶ء	۱۹۳۷ء	۱۹۳۸ء	۱۹۳۹ء
فرانس	(۶۰۰)	(۶۰۰)	(۶۰۰)	۷۸۵	۸۹۰	۷۴۳	۱۳۸۲	۳۱۶۳
جرمنی	۳۶	۳۶۸	۱۹۶۸	۳۱۸۳	۵۱۱۲	۵۶۰۶	۵۲۳۵	۸۲۹۵
اٹلی	(۵۰۰)	(۵۰۰)	(۷۵۰)	(۱۰۰۰)	(۱۰۰۰)	(۱۵۰۰)	۱۸۵۰	(۲۰۰۰)
جاپان	۶۹۱	۷۶۶	۶۸۸	۹۵۲	۱۱۸۱	۱۵۱۱	۳۲۰۱	۴۴۶۷
برطانیہ	۴۴۵	۶۳۳	۷۴۰	۱۱۴۰	۱۸۷۷	۲۱۵۳	۲۸۲۷	۷۹۴۰

عظیم طاقتوں کا عروج و زوال

سے ۱۷ ملین ٹن ہو گئی۔ بجلی کی پیداوار میں سات گنا اضافہ ہو گیا۔ مشینی اوزار بیس گنا زیادہ تیار کیے گئے۔ ٹریکٹر ۴۰ گنا زیادہ بنائے گئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے آخری دہائی میں روس کی صنعتی پیداوار میں جو اضافہ ہوا تھا وہ نہ صرف فرانس جاپان اور اٹلی سے زیادہ تھا' بلکہ برطانیہ سے بھی بہت بڑھ گیا تھا۔

تاہم اس موثر انداز کے تعمیری کام کے باوجود وہاں بہت سی خامیاں بھی تھیں۔ اگرچہ زرعی پیداوار ۱۹۳۰ء کے وسطی عشرے میں آہستہ آہستہ بڑھی تھی اس کے باوجود ملکی ضروریات پورا کرنے کے زمانے میں سب سے آسان ترین کام یہ بھی تھا کہ ذمہ داری سے گریز اختیار کیا جائے ہر کام کے لیے اپنے اعلیٰ افسر سے ہدایت لی جائے۔ جب کوئی حکم ملے تو مشینی انداز میں اس کی تعمیل کی جائے۔ ان تمام باتوں کے دوران مقامی ضرورتوں پر چنداں توجہ نہ دی جائے۔ اس طرح کسی مخص کی چمڑی تو پٹائی سے بچ جاتی تھی لیکن مجموعی اقتصادی حالت میں بہتری تو نہیں آتی تھی۔

چونکہ سوویت یونین جنگ کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا اور اسے پولینڈ' جاپان اور برطانیہ جیسے قومی دشمنوں سے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا لہٰذا ۱۹۲۰ء کے زیادہ تر عشرے میں اس نے قومی بجٹ کا وافر حصہ (۱۲ تا ۱۶ فی صد) دفاعی اخراجات کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ لیکن پہلے پانچ سالہ منصوبے کے دوران اس مد میں کمی آ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک روس کی باقاعدہ مسلح افواج ۶۰۰۰۰۰ افراد پر مشتمل تھیں۔ پھر ان کی پشت پناہی کے لیے اس سے دوگنی تعداد میں ملیشیا بھی موجود تھی جو اگرچہ اتنی موثر نہ تھی۔ پھر منچوریہ کے ہنگامے اور ہٹلر کے برسراقتدار آ جانے کے نتیجے میں فوج میں مزید توسیع کی گئی' یعنی ۱۹۳۴ء میں سپاہیوں کی تعداد ۹۴۰۰۰۰ کر دی گئی جبکہ اگلے سال یہ ۱۰۳ ملین تک پہنچ گئی۔ پانچ سالہ منصوبوں پر عمل درآمد کے نتیجے میں جب صنعتی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوا تو خاصی تعداد میں ٹینک اور لڑاکا طیارے بنائے گئے۔ میخائل توخا چیسکی کے اردگرد موجد قسم کے جو افسران تھے وہ ڈوہٹ' فلر' لیڈل ہارٹ' گوڈرین اور دیگر مغربی جنگی ماہرین کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے خواہاں نظر آتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی عشرے میں روس کے پاس نہ صرف ٹینک بردار فوج تھی بلکہ چھاتہ بردار فوج بھی بڑی تعداد میں موجود تھی۔ اگرچہ سوویت یونین کی بحری فوج چھوٹی اور غیر موثر تھی لیکن فضائیہ دیگر تمام طاقتوں کے مقابلے میں اعلیٰ تھی۔ وہاں ۱۹۲۰ء کے عشرے کے آخر میں لڑاکا طیارے بنانے کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا جا چکا تھا جو ہر سال اتنی تعداد میں جہاز تیار کرتا تھا جو دیگر بڑی طاقتوں کے مشترکہ جہازوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ (ملاحظہ کیجئے جدول نمبر ۲۹)

جدول نمبر ۲۹: بڑی طاقتوں کے لڑاکا طیارے بنانے کی رفتار = ۱۹۳۲ء - ۱۹۳۹ء

	۱۹۳۲ء	۱۹۳۳ء	۱۹۳۴ء	۱۹۳۵ء	۱۹۳۶ء	۱۹۳۷ء	۱۹۳۸ء	۱۹۳۹ء
فرانس	(۶۰۰)	(۶۰۰)	(۶۰۰)	۷۸۵	۸۹۰	۷۴۳	۱۳۸۲	۳۱۶۳
جرمنی	۳۶	۳۶۸	۱۹۶۸	۳۱۸۳	۵۱۱۲	۵۶۰۶	۵۲۳۵	۸۲۹۵
اٹلی	(۵۰۰)	(۵۰۰)	(۷۵۰)	(۱۰۰۰)	(۱۰۰۰)	(۱۵۰۰)	۱۸۵۰	(۲۰۰۰)
جاپان	۶۹۱	۷۶۶	۶۸۸	۹۵۲	۱۱۸۱	۱۵۱۱	۳۲۰۱	۴۴۶۷
برطانیہ	۴۴۵	۶۳۳	۷۴۰	۱۱۴۰	۱۸۷۷	۲۱۵۳	۲۸۲۷	۷۹۴۰

بن چکے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے بعد جو پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا اس میں وسیع پیمانے پر اسلحہ کی تیاری کا پروگرام بھی شامل تھا۔ خصوصاً" لڑاکا طیارے! اس کی تعداد جرمنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ رکھی گئی تھی۔ لیکن مختص شدہ سرمایہ اعلیٰ درجے کی مسلح افواج کی تیاری میں ابھی صرف بھی نہ ہو پایا تھا کہ اسٹالن نے یہ محسوس کیا کہ روس "خطرے کے زون" سے گزر رہا ہے اور یہ حالت ۲۲-۱۹۱۲ء کے برسوں کی طرح حد درجہ تشویشناک ہے۔ چنانچہ بیرونی حالات کی وجہ سے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں روسی سفارت کاری میں متعدد تبدیلیاں لانے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ منچوریہ میں جاپان کی جارحانہ کاروائیوں اور جرمنی میں ہٹلر کے مذموم عزائم کے پیش نظر اسٹالن نے گھبرا کر دو ایسے محاذوں پر لڑنے کا منصوبہ بنایا جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور واقع ہوئے تھے۔ (دراصل یہی وہ منصوبہ تھا جس نے برطانیہ کے جنگی منصوبہ سازوں کو زک پہنچائی تھی) ۱۹۳۴ء میں روس نے لیگ آف نیشنز میں شمولیت اختیار کر لی تھی پھر ۱۹۳۵ء میں فرانس اور چیکوسلواکیہ کے ساتھ معاہدے بھی کیے تھے۔ لیکن مغربی ممالک کی جانب یہ سفارتی میلان تحفظ قائم رکھنے کی خواہش پوری نہ کر سکا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ پولینڈ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیے بغیر روس نہ تو فرانس کی مدد کر سکتا تھا اور نہ چیکوسلواکیہ کی اور نہ کسی دوسرے ملک کی! ادھر برطانیہ جرمنی کے خلاف متحدہ سفارتی محاذ قائم کرنے پر سخت ناراض تھا۔ دراصل ایسا اقدام کرنے میں اسٹالن کا ہسپانوی خانہ جنگی کے حوالے سے محتاط رویہ بھی تھا۔ نیز ماسکو کو یہ خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اسپین کی سوشلسٹ جمہوریہ کی کامیابی سے متاثر ہو کر برطانیہ اور فرانس دائیں بازو کی حمایت کرنے لگیں گے۔ پھر فرانس کے حامی ملک اٹلی اور جرمنی کے ساتھ جنگ میں روس کو بھی گھسیٹ لیا جائے گا۔

۹-۱۹۳۸ء کے زمانے میں اسٹالن کی نظر میں بیرونی حالات پہلے سے کہیں زیادہ تشویشناک دکھائی دے رہے تھے۔ (ایسے میں اس کی "صفایا" کر دینے والی تحریک زیادہ احمقانہ معلوم ہو رہی تھی) میونخ سمجھوتے کی رو سے مشرقی وسطی یورپ میں ہٹلر کے عزائم پوری طرح واضح ہو چکے تھے۔ پھر یہ بات بھی فکر انگیز تھی کہ مغربی ممالک اس کی مخالفت کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ اس امر کے زیادہ شائق تھے کہ جرمنی کی طاقت کو مشرق کی سمت مزید پھیلنے کا موقع دیا جائے۔ ان دو برسوں کے دوران سوویت یونین اور جاپان کے مابین مشرق بعید میں متعدد فوجی جھڑپیں ہوئیں اور جن کے نتیجے میں سائبیریا میں روسی فوج خاصی تعداد میں تعینات کی گئی۔ چنانچہ یہ بات باعث حیرت نہیں کہ اسٹالن نے برلن کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی پالیسی اختیار کی' حالانکہ ایسا کرنے میں اسے اپنے نظریاتی دشمن کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ چونکہ مشرقی یورپ سے روس کے اپنے سیاسی عزائم وابستہ تھے۔ لہذا ماسکو اس علاقے میں آزاد ریاستیں اس وقت تک قائم کرنے کے حق میں نہ تھا جب تک اس کا خاطر خواہ مفاد بحال نہ رہے۔ اگست ۱۹۳۹ء میں نہایت حیرت انگیز طور پر نازی سوویت پیکٹ روبہ عمل آیا۔ اس کے تحت روس کو مغربی سرحد پر ایک بفر زون مل گیا۔ ساتھ ہی دوبارہ فوجی تیاری کے لیے اسے کافی وقت بھی ہاتھ آ گیا۔ ادھر ہٹلر نے چونکہ پولینڈ پر حملہ کر دیا تھا' لہذا اس کے نتیجے میں مغربی ممالک جرمنی سے لڑ پڑے۔ یہاں چرچل کا یہ قول دہرانا پڑے گا کہ "مگر مچھ کو نوالہ کھلاتے رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ہمیں کھا جائے"

مذکورہ تمام اسباب و عوامل کے پیش نظر ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں روس کی طاقت کا تعین کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے' خصوصاً" ایسی صورت میں جبکہ متعلقہ جنگی مہارت سے نہ تو عوام کے مورال کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ ہی مسلح افواج کی کارکردگی کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی جغرافیائی پوزیشن واضح

ہوتی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سرخ فوج اب پہلی جیسی "عظیم' ضخیم اور جدید دور کی مسلح طاقت کی حیثیت سے برقرار نہیں رہی' جیسا کہ میکسوش نے اسے ۱۹۳۶ء میں قرار دیا تھا۔ لیکن اسے کہاں تک نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ یہ واضح نہیں تھا! بہرحال ۴۰-۱۹۳۹ء کے دوران فن لینڈ کے خلاف "سردیوں والی جنگ" برپا ہوئی تو روس کے زوال کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ پھر ۱۹۳۹ء میں جاپان کے ساتھ ہونے والے جھگڑے جو ہنوز غیر معروف ہیں' سے ایک جدید طرز کی فوج کی موجودگی کا احساس ابھر آیا تھا۔ یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ۱۹۴۰ء میں جرمن فوج کو جس انداز سے فتوحات حاصل ہو رہی تھیں ان سے اسٹالن خاصا ہراساں تھا۔ چنانچہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ اس بات کے لیے فکرمند تھا کہ ہٹلر کو جنگ کے لیے ہرگز ہرگز نہ اکسایا جائے۔ پھر اسٹالن کو ایک فکر یہ بھی تھی کہ مشرق بعید میں ٹوکیو نہ جانے کہاں حملہ کر بیٹھے۔ اس تشویش کی وجہ یہ نہ تھی کہ جاپان بہت طاقتور دشمن تھا بلکہ سائبیریا کا تحفظ فوجی نقل و حمل کے لحاظ سے نہایت مہنگا پڑ رہا تھا۔ پھر جرمنی کے خطرے کے پیش نظر سائبیریا کا معاملہ روس کی فوجی طاقت کے مزید کمزور ہونے کا سبب بن جائے گا۔ جب جاپان کے ساتھ مشرق بعید میں ایک سرحدی تصفیہ عمل میں آ چکا تھا اس کے بعد ستمبر ۱۹۳۹ء میں مشرقی پولینڈ پر حملہ کرنے کے لیے ژوکوف کے مسلح دستے کو فوری طلب کرنا محض ایک شعبدہ بازی ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہو رہا تھا کہ "سرخ فوج" کو پہنچنے والے نقصانات کا نہایت سرعت کے ساتھ ازالہ کیا جا رہا تھا اور اس کی تعداد میں بھی بہت زیادہ اضافہ کیا گیا (یعنی ۱۹۴۱ء میں ۳۳۲۰۰۰۰ سپاہی بھرتی کیے گئے تھے) بایں ہمہ سوویت یونین کی جملہ اقتصادی قوت جنگی سازوسامان تیار کرنے' وسطی روس میں بڑے بڑے کارخانے نصب کرنے اور جدید لڑاکا طیارے اور ٹینک (جن میں نہایت طاقتور ٹی-۳۴ بھی شامل ہے) کی جانچ پڑتال کرنے میں صرف ہو رہی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں وفاقی بجٹ ۱۶ء۵ فی صد تھا جو ۱۹۴۰ء میں بڑھ کر ۳۲ء۶ فی صد تک جا پہنچا۔ مذکورہ زمانے میں دیگر بڑی بڑی طاقتوں کی طرح سوویت یونین بھی نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں اسٹالن نے اپنے ہم وطنوں پر زور دے کر کہا تھا کہ "مغرب اور ہمارے درمیان جو پیداواری خلا ہے اسے پر کر دیا جائے۔ سست روی کے معنی گر کر پیچھے رہ جانا ہے۔ اور جو گر جاتے ہیں وہ پٹتے بھی ہیں۔ زار کے زمانے میں روس کو مسلسل مار پڑتی رہی اس لیے کہ یہ صنعتی پیداوار اور فوجی طاقت میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بہرحال اپنے آمرانہ ذہنیت کے خشک مزاج لیڈر کی ماتحتی میں سوویت یونین نے فاصلے کو طے کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ آیا ہٹلر روس کو ایسا کرنے کا موقع دے گا یہ کہنا اس وقت مشکل تھا۔

دوران جنگ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طاقت عالمی امور کے معاملے میں روس اور جرمنی کی نسبتاً" معکوس رہی تھی۔ دراصل امریکہ ۱۹۲۰ء کے عشرے میں خاصا مستحکم تھا لیکن ۱۹۳۰ء کی دہائی میں بڑی طاقتوں کے مقابلے میں یہ زیادہ زوال آشنا ہوا۔ البتہ اس عشرے کے آخر میں اسے کچھ سنبھلنے کا موقع ملا۔ اول الذکر عشرے میں اس کی فضیلت کی وجہ پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے۔ امریکہ' جاپان کے علاوہ وہ واحد عظیم ملک تھا جسے جنگ عظیم سے خاصا فائدہ پہنچا۔ وہ دنیا میں پہلے ہی بڑے پیمانے پر مختلف مصنوعات اور غذائی اشیاء تیار کرنے میں نام پیدا کر چکا تھا اور اب وہ دنیا کا امیر ترین ملک بنا ہوا تھا اور دوسروں کو قرض دے رہا تھا۔ اس کے پاس سونے کا بہت بڑا اسٹاک تھا۔ اس ملک میں منڈیوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ بڑی بڑی فرمیں تقسیم کنندگان وغیرہ آٹو موبائل اور دیگر مصنوعات باآسانی بازار میں لے آئے۔ یہاں زندگی کا معیار بہت بلند تھا۔ سرمایہ کاری کے لیے رقم ہمیشہ باآسانی دستیاب ہو جاتی۔ چنانچہ مصنوعات کے

کارخانوں میں وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کی جاتی اور جو بھی چیز بنائی جاتی صارفین کے بڑھتے ہوئے طلب کو بخوبی پورا کر دیتی۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۹ء میں وہاں ۴ء۵ ملین موٹر کاریں بنائی گئی تھیں۔ اس کے مقابلے میں فرانس میں ۲۱۱۰۰۰، برطانیہ میں ۱۸۲۰۰۰ اور جرمنی میں ۱۱۷۰۰۰ کاریں تیار ہوئی تھیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ان مصنوعات کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ربڑ، ٹن، پٹرول اور دیگر خام مال کثیر تعداد میں درآمد کیے گئے تھے۔ اسی طرح ۱۹۲۰ء کے تمام عشرے میں کاریں، زراعتی مشینیں، دفتری سامان اور دیگر ضروری اشیاء بھی وسیع پیمانے پر برآمد کی گئی تھیں۔ اس صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ امریکی عوام سمندر پار نہایت دمزلے سے سرمایہ کاری بھی کر رہے تھے۔ یہ بات اگرچہ مشہور ہے لیکن یہاں اس کا ذکر ناگزیر ہے کہ مذکورہ برسوں میں امریکہ وہ واحد ملک تھا جو تنہا اتنی ساری اشیاء پیدا کر رہا تھا جو دنیا کی دیگر چھ بڑی طاقتوں کی مجموعی پیداوار سے کہیں زیادہ تھیں۔ پھر اس کی پیداکاری کی صلاحیت یوں افزوں ہو جاتی ہے کہ وہاں کی مصنوعات کی مجموعی قیمت فی کس آبادی کے لحاظ سے برطانیہ اور جرمنی کے مقابلے میں دوگنی تھی جبکہ روس اور اٹلی کے مقابلے میں دس سے گیارہ گنا زیادہ تھی۔

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دنیا میں امریکہ کے سیاسی اثرات کا اس کی غیر معمولی صنعتی صلاحیتوں سے چنداں لگاؤ نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے میں یہ ضروری بھی نہ تھا اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ امریکہ کے عوام نے عالمی سیاست میں کوئی کردار ادا کرنے سے اجتناب برتنے کا عزم کر رکھا تھا۔ جب تک کہ امریکہ کے تجارتی مفاد کو کسی ملک کے اقدام سے نقصان نہ پہنچے، بیرونی معاملات میں دخل در معقولات سے پہلو تہی برتی گئی۔ مثلاً" مشرقی یورپ یا افریقہ میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس سے امریکہ نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ دوسرے امریکہ کی وسیع پیمانے کی برآمدات اور درآمدات ملک کے اقتصادی حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ ہمہ گیر نہ تھیں۔ اس کی وجہ بس یہ تھی کہ ملک خود کفیل تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجموعی مصنوعات کا جو حصہ برآمد کیا جاتا اس میں ۱۹۱۳ء کے دوران ۱۰ فی صد کی کمی آگئی تھی۔ پھر ۱۹۲۹ء میں ۸ فی صد کمی ہو گئی۔ لیکن بیرون ملک کی جانے والی سرمایہ کاری کی بدولت کل قومی پیداوار میں جو اضافہ ہوتا تھا، وہ جوں کا توں رہا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عالمی منڈی کے تصور کو اصولی طور پر قبول کر لینے کے باوجود امریکہ کی اقتصادی پالیسی ملکی ضروریات کے محور پر گھومتی تھی۔ چند قسم کے خام مالوں کے سوا بیرونی دنیا امریکہ کی خوشحالی کے لیے چنداں اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ آخری بات یہ کہ ۱۹۱۹ء کے بعد کے عشرے میں عالمی معاملات امریکی مفادات کے لیے خطرے کا اہم سبب بالکل نہ تھے۔ یورپی ممالک ہنوز آپس میں لڑ رہے تھے، اگرچہ ان کی محاذ آرائی ۱۹۲۰ء کے ابتدائی عشرے جیسی نہ تھی۔ روس سب سے الگ تھلگ کھڑا تھا۔ جاپان خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ واشنگٹن کے معاہدے کے تحت "سمندری رقابت" کم ہو چکی تھی۔ ایسی صورت حال میں امریکہ نے اپنی فوج کو کم سے کم کر دیا۔ (یعنی ۱۳۰۰۰۰ ریگولر فوج) لیکن فضائیہ کو وسعت بھی دی گئی اور جدید بھی بنایا گیا۔ ساتھ ہی بحریہ کو اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ لڑاکا طیارے اور مضبوط ترین کروزر رکھنے کے پروگرام کو عملی شکل دے۔ اگرچہ بعض جرنیل اور امیرالبحر وقتاً" فوقتاً" یہ شکایت کرتے رہے تھے کہ کانگریس انھیں مناسب مقدار میں وسائل مہیا نہیں کرتی اور ملکی سلامتی کے خلاف بعض اقدامات بھی کیے گئے (مثلاً" ۱۹۲۹ء کا اسٹی من کا واقعہ) لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس دہائی میں امریکہ اقتصادی لحاظ سے تو نہایت بلند مقام پر فائز تھا لیکن فوجی لحاظ سے یہ درمیانہ درجے کا حامل تھا۔ اس پر سکون دور کا ہی نتیجہ تھا کہ امریکہ میں اس وقت اعلیٰ درجے کا سول اور ملٹری ادارہ نہ تھا جو فوجی حکمت عملیوں پر

غوروخوض کرے۔ حالانکہ برطانیہ میں امپیریل ڈیفنس کمیٹی موجود تھی یا خود آگے چل کر اس ملک میں نیشنل سیکورٹی کونسل قائم ہوئی۔ آخر اس قسم کے ادارے کی ضرورت ہی کیا تھی جب امریکہ کے عوام نے فیصلہ کن انداز میں جنگ کے تصور ہی کو جھٹک دیا ہو؟

۱۹۲۹ء میں مالی بحران کی جو کیفیت پیدا ہوئی تھی اس میں امریکہ کے کردار کا جائزہ قبل ازیں لیا جا چکا ہے۔ قومی طاقت کے موازنہ کے سلسلے میں جو بات نہایت اہم ہے وہ یہ کہ مسلسل بحران اور تنزل نے دوسرے ملکوں کی ترقی یافتہ معیشت کے مقابلے میں امریکی اقتصادیات کو کچھ زیادہ ہی زک پہنچایا۔ اگر اس کی ایک وجہ امریکی سرمایہ کی غیر منضبط اور متلون فطرت تھی تو دوسری وجہ ۱۹۳۰ء میں تامین پسندی کے سلسلے میں اسموٹ ہالے ٹارف بھی تھا۔ بیرونی مسابقت کے نامناسب ہونے کی شکایت امریکہ کے کسانوں اور بعض بااثر صنعتی حلقوں نے کی تھی اس کے باوجود ملک کی صنعتی اور زرعی پیداوار کا یہ عالم تھا۔ (جو درآمدات کے مقابلے میں فاضل برآمدات سے ظاہر ہوتا ہے) کہ اگر دنیا کی تجارتی کمپنیاں مال منگوانے کے لیے آرڈر دینا بند کر دیتیں تو امریکہ کے برآمد کنندگان کو دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔ ملک کی مجموعی قومی پیداوار جو ۱۹۲۹ء میں ۹۸ء۴ ملین تھی، وہ تین سال میں گر کر اس کی آدھی رہ گئی۔ ۱۹۳۳ء میں تیار مال کی قیمت ۱۹۲۹ء کے مقابلے ایک چوتھائی کم ہو گئی تھی۔ تقریباً" ۱۵ ملین مزدوروں کا روزگار ختم ہو چکا تھا اور وہ نان جویں کے بغیر جی رہے تھے۔ اسی زمانے میں امریکی برآمدات کی مالیت ۵ء۲۴ بلین ڈالر سے گھٹ کر ۱ء۶۱ بلین ڈالر رہ گئی تھی۔ گویا تخفیف کی یہ شرح ۶۹ فی صد تھی۔ دوسرے ممالک تو نہایت تیز رفتاری سے محفوظ تجارتی بلاک میں شامل ہو رہے تھے، لیکن امریکہ کے وہ کارخانے جو برآمدات پر ہی بھرپور انداز میں انحصار کیے رہے، روبہ زوال ہو رہے تھے۔ دس سال قبل مجموعی طور پر ۲۰۰ ملین ڈالر کی گندم بیرون ملک روانہ کی گئی تھی جو ۱۹۳۲ء میں گھٹ کر ۵ ملین ڈالر کی رہ گئی۔ اس زمانے میں عالمی تجارت عموماً" ہبوط کا شکار تھی لیکن امریکہ کی بیرونی تجارت کہیں زیادہ انحطاط پذیر تھی۔ یہ شرح ۱۹۲۹ء میں ۱۳ء۸ فی صد تھی جو ۱۹۳۲ء میں دس فی صد سے بھی زیادہ گھٹ گئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ۱۹۳۰ء کے وسطی اور آخری عشرے کے دوران جہاں دیگر اہم ملکوں نے اپنی پیداوار کی کمی پوری کر لی تھی، وہاں امریکہ کو ۱۹۳۷ء میں ایک اور اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے گذشتہ پانچ سال کے دوران جو بھی پیش رفت ہوئی تھی وہ کالعدم ہو گئی۔ عالمی اقتصادیات میں خلفشار کی صورت پیدا ہو جانے کی وجہ سے تجارتی بلاک کی جانب مراجعت کا رجحان پیدا ہوا جو ۱۹۲۰ء کے عشرے کی نسبت زیادہ مکمل دکھائی دیتا تھا۔ ان حالات میں امریکہ کے کاروباری انحطاط نے دوسرے ملکوں پر زیادہ مضر اثرات مرتب نہیں کیے۔ ان تمام باتوں سے جو مجموعی نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ کہ میونخ کے قضیہ کے موقع پر عالمی مصنوعات کی پیداواری شرح میں امریکی پیداوار کی شرح ہر زمانے کی نسبت کم تر تھی، خصوصاً" ۱۹۱۰ء کے بعد سے! (دیکھئے جدول نمبر۳۰)

جدول نمبر ۳۶ عالمی مصنوعات کی پیداواری شرح

۱۹۲۹ء۔۱۹۳۸ء

	۱۹۲۹ء	۱۹۳۲ء	۱۹۳۷ء	۱۹۳۸ء
امریکہ	۴۳٫۳	۳۱٫۸	۳۵٫۱	۲۸٫۷
روس	۵٫۰	۱۱٫۵	۱۴٫۱	۱۷٫۶
جرمنی	۱۱٫۱	۱۰٫۶	۱۱٫۳	۱۳٫۲
برطانیہ	۹٫۳	۱۰٫۹	۹٫۳	۹٫۲
فرانس	۶٫۶	۶٫۹	۴٫۵	۴٫۵
جاپان	۲٫۵	۳٫۵	۳٫۵	۳٫۸
اٹلی	۳٫۳	۳٫۱	۲٫۷	۲٫۹

شدید نوعیت کی کساد بازاری اور مجموعی قومی پیداوار میں غیر ملکی تجارت کی شرح میں کمی کی وجہ سے ہوور اور خصوصاً" روزویلٹ کے عہد اقتدار میں امریکہ پالیسی تمام تر خود بینی پر مبنی تھی۔ تنہا پسند طبقے کی موثر رائے کے نتیجے میں اور خود روزویلٹ کے اندرونی مسائل پر زور دینے کی وجہ سے اس امر کی امید نہ تھی کہ وہ کورڈل ہل اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے منشا کے مطابق عالمی معاملات پر خصوصی توجہ مبذول کرے گا۔ تاہم عالمی معیشت میں امریکہ کو جو فیصلہ کن پوزیشن حاصل تھی اس کے پیش نظر یہ صائب رائے دی جا رہی تھی کہ مقبوضات کے ساتھ ساتھ ملکی نقصانات کی تلافی بھی ہونی چاہئے۔ پھر فوری عمل کی خواہش اور اس کے جلد حاصل شدہ نتیجے اور ملکی منصوبہ بندی کے خصوصی انداز نے امریکی پروگراموں کو دوسروں کی نظر میں اتنا موثر نہیں بنایا۔ بعد ازاں اس ضمن میں چند فیصلے کیے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں ایسی بیرونی حکومت کو قرض دینے پر پابندی عائد کر دی گئی جس نے پہلے جنگ کے موقع پر لیے گئے قرض واپس نہیں کیے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں دوران جنگ اسلحہ کی ترسیل پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پھر چند ہی دنوں بعد متحارب قوتوں کو بھی قرض نہ دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں برطانیہ اور فرانس دونوں چونک اٹھے اور اب وہ فاشسٹ ملکوں کے خلاف محاذ آرائی میں زیادہ محتاط ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی کے ساتھ معاہدے ختم کر دیئے گئے تھے پھر فوراً" ہی امریکہ نے مسولینی کی حکومت کو زیادہ مقدار میں پٹرول فراہم کرنا شروع کر دیا۔ اس سے برطانیہ کے امیرالبحر کو خاصی حیرت بھی ہوئی تھی۔ جرمنی اور جاپان کے جارحانہ اقدامات کے نتیجے میں ان دونوں ملکوں پر متعدد تجارتی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس طرح دونوں دشمنی پر اتر آئے۔ نیز ان ممالک کے دشمنوں کو بھی کوئی باقاعدہ امداد فراہم نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس نوع کی اقتصادی پالیسی نے امریکہ کے لیے دشمن تو زیادہ بنائے۔ دوست کم پیدا کیے۔ پھر اس کا گمبھیر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وائٹ ہال اور واشنگٹن کے درمیان شکوک و شبہات پیدا ہو گئے جس کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہونی چاہئے۔ بہرحال یہ صورت حال اس وقت سامنے آئی جب آمرانہ حکومتیں دعوت مبارزت دے رہی تھیں۔

بہرحال ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ روزویلٹ فاشسٹ حکومتوں کی دھمکیوں سے بہت زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔ لیکن امریکی عوام کی رائے اور اقتصادی مجبوریوں نے اسے فوری اقدام کرنے سے باز رکھا۔ بہرحال اس نے برلن اور ٹوکیو کو دو ٹوک انداز میں پیغامات ضرور روانہ کیے۔ ساتھ ہی ساتھ

اس نے برطانیہ اور فرانس کی نہایت گرمجوشی سے پیٹھ بھی تھپتھپائی۔ (ویسے ان دونوں جمہوری ملکوں کو اس سے فی الفور کوئی فائدہ نہیں پہنچا) ۱۹۳۸ء ہی میں انگلستان اور امریکہ کے مابین اس موضوع پر خفیہ بات چیت بھی چل رہی تھی کہ جاپان اور جرمنی کے چیلنجوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ صدر کی "قرنطینہ تقریر" سے پہلی مرتبہ یہ حقیقت واضح ہوئی تھی کہ وہ آمرانہ ریاستوں کے مابین اقتصادی امتیاز روا رکھیں گے۔ سب سے اہم بات یہ کہ وسیع پیمانے پر دفاعی اخراجات کے لیے روزویلٹ کی تحویل میں خاصی رقم موجود تھی۔ جیساکہ اوپر درج شدہ جدول نمبر۳۶ سے اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں بھی امریکہ، برطانیہ یا جاپان کے مقابلے میں اسلحے پر نہایت قلیل رقم خرچ کر رہا تھا جرمنی اور سوویت یونین کے مقابلے میں یہ رقم کسر کا درجہ رکھتی تھی۔ تاہم ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران لڑاکا طیارے دوگنی تعداد میں بنائے گئے۔ پھر آخرالذکر سال میں کانگریس نے بحریہ کا ایک قانون منظور کیا جس کے تحت بحری بیڑوں میں وسیع پیمانے پر توسیع کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اسی زمانے میں بی۔۱۷ بمبار طیارے پر بھی تجربہ کیا جا رہا تھا۔ بحری فوج بھی نئی جنگی تکنیک کے پیش نظر اپنے اصول و ضوابط میں ترمیم و اضافہ کر رہی تھی۔ بری فوج جس کے پاس اب تک اعلیٰ درجے کا ٹینک نہ تھا، میدان جنگ کے تکنیکی مسائل کو حل کرنے میں منہمک تھی اور فوج کی تعداد کو وسیع کرنے کا جامع منصوبہ بھی بنا رہی تھی۔ جب یورپ میں جنگ کا آغاز ہوا تو تینوں مسلح افواج میں سے کوئی ایک بھی پوری طرح تیار نہ تھی۔ پھر بھی وہ سب موجودہ جنگ کے تقاضے کے مطابق بہت بہتر تھیں اور ان کی وہ پوزیشن نہ تھی جو ۱۹۱۴ء میں تھی۔

فوجی تیاری کے ان اقدامات نے امریکہ کی معیشت کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں وہاں کی معیشت کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس سے بہت کم استفادہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں تقریباً" دس ملین افراد بے روزگار تھے، تاہم فی کس گھنٹے کے حساب سے صنعتی پیداوار کو خاصا فروغ دیا گیا تھا۔ نیز مختلف سازوسامان بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کی گئی تھی۔ پھر آفس مینجری کی تکنیک کو بھی بہتر بنایا گیا تھا لیکن مزدوروں کے جبر کی وجہ سے اوقات کار میں جو کمی کر دی گئی تھی اس کے نتیجے میں اس تکنیک سے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ پھر طلب میں کمی واقع ہو گئی تھی جسے ۱۹۳۷۔۸ء کا تراجع بھی دور نہ کر سکا۔ چنانچہ مختلف نوع کی اسکیمیں بنائی گئیں لیکن یہ سب معیشت کو مہمیز کرنے میں مفید ثابت نہ ہو سکیں نہ ہی غیر استعمال شدہ پیداواری صلاحیت سے ہی فائدہ اٹھایا گیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۸ء میں امریکہ نے ۲۶٫۴ ملین ٹن فولاد پیدا کیا جبکہ جرمنی نے ۲۰٫۷ ملین ٹن، روس نے ۱۸٫۵ ملین ٹن اور جاپان نے ۶ ملین ٹن فولاد پیدا کیا تھا گویا امریکہ فولادی صنعت میں مذکورہ تینوں ملکوں سے بہت آگے تھا۔ تاہم جرمنی، روس اور جاپان کے کارخانے اپنی پوری استعداد کے مطابق کام کر رہے تھے جبکہ امریکہ میں دو تہائی فولادی پلانٹ بیکار پڑے تھے۔ لیکن جب صورت حال میں تبدیلی آئی تو پھر غیر استفادہ شدہ معیشت کو فوجی تیاری میں استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں بحریہ کے لڑاکا بیڑے کی تعداد دوگنی کر دی گئی۔ فضائیہ میں ۸۴ گروپ بنائے گئے جن میں ۷۸۰۰ لڑاکا طیارے شامل تھے اور مختلف قوانین کے ذریعے ایک ملین نفری پر مشتمل بری فوج تیار کی گئی۔ ان تمام اقدامات کا اثر معیشت پر پڑا تھا۔ لیکن امریکی معیشت اٹلی، فرانس اور برطانیہ جیسی نہ تھی جو مختلف مسائل سے دوچار تھی۔ بلکہ یہ تو کساد بازاری کی وجہ سے غیر استفادہ شدہ معیشت تھی! ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پاس وافر صلاحیتیں تھیں جبکہ دیگر ملکوں کی معیشت بے مقصد طریقے پر استعمال کی جا رہی تھی۔ بہرحال مستقبل کی جدوجہد کے نتائج کو پوری طرح سمجھنے کے لیے

نہایت اہم گوشوارہ ۱۹۳۸ء کی فولادی اور صنعتی پیداوار کا جائزہ نہیں ہو گا' بلکہ وہ مناسب رہے گا جس میں قومی آمدنی کا احاطہ کیا گیا ہو (جدول ۳۱) یا "جنگی استعداد" کے اعداد و شمار پیش کیے گئے ہوں۔ (جدول نمبر ۳۲) ہر دو معاملے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر امریکہ کساد بازاری کے عظیم بحران کے دوران نقصان کا سامنا کرتا رہا تو بقول ایڈمیل یاماموتو یہ ایک ایسے جن کی مانند بھی تھا جو ان دنوں بے خبر خراٹے لے رہا تھا۔

جدول نمبر ۳۱: ۱۹۳۷ء میں بڑی طاقتوں کی قومی آمدنی اور دفاعی اخراجات کی شرح

(بلین میں) دفاعی اخراجات کی شرح

	قومی آمدنی (بلین ڈالر میں)	دفاعی اخراجات کی شرح
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۶۸	۱٫۵
سلطنت برطانیہ	۲۲	۵٫۷
فرانس	۱۰	۹٫۱
جرمنی	۱۷	۲۳٫۵
اٹلی	۶	۱۳٫۵
سوویت یونین	۱۹	۲۶٫۴
جاپان	۴	۲۸٫۲

یہ جن ۱۹۳۸ء کے بعد بیدار ہو گیا اور ۱۹۴۰ء کے بعد تو خصوصی طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ چنانچہ اس کی بیداری کے نتیجے میں اسلحے کی دوڑ اور دفاعی حکمت عملیوں میں وقت کے تعین کی پوری تصدیق ہو گئی۔ چنانچہ برطانیہ اور روس کی طرح امریکہ بھی اسلحے کے اس خلا کو پر کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا جو فاشسٹ حکومتوں کے بے پناہ دفاعی اخراجات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اگر ملک کے سیاسی حالات اجازت دیں تو امریکہ دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ رقم اس مد میں خرچ کر سکتا ہے۔ ان حقائق کا اندازہ دیئے گئے اعداد و شمار سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ویسے ۱۹۳۹ء میں امریکہ کے مجموعی اخراجات میں دفاعی خرچ صرف ۱۱٫۷ فی صد تھا جو مجموعی قومی پیداوار کا فقط ۱٫۶ فی صد تھا۔ یہ شرح دیگر بڑی طاقتوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

جدول ۳۲: ۱۹۳۷ء میں بڑی طاقتوں کی حربی صلاحیت

ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۴۱٫۷ فی صد
جرمنی	۱۴٫۴ فی صد
روس	۱۴ فی صد
برطانیہ	۱۰٫۲ فی صد
فرانس	۴٫۲ فی صد
جاپان	۳٫۵ فی صد
اٹلی	۲٫۵ فی صد
دیگر ۷ بڑی طاقتیں	۹۰٫۵ فی صد

امریکہ کی مجموعی قومی پیداوار کا وافر حصہ دفاعی اخراجات کے لیے مختص کر دیا گیا تاکہ فاشسٹ حکومتوں کے مقابلے میں اس کی فوجی صلاحیت کم تر نہ رہے۔ اس طرح امریکہ دنیا کا نہایت طاقتور فوجی ملک بن گیا۔ علاوہ ازیں ایسے کئی شواہد موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ برلن اور ٹوکیو امریکہ کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کو مستقبل میں اپنے توسیعی عزائم کے لیے ایک مزاحمت تصور کر رہے تھے۔ جہاں تک ہٹلر کا معاملہ تھا وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایک ذلیل و خوار ملک سمجھ کر اس سے سخت نفرت کرتا تھا۔ لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ ۱۹۴۰ء کی وسطی دہائی سے پہلے فتح و کامرانی حاصل نہیں کر سکتا' اس لیے کہ اس وقت تک فوجی طاقت کا توازن انگلستان' فرانس اور امریکہ کے مابین برقرار تھا۔ جاپان نے امریکہ کے معاملے میں نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کیا تھا لہٰذا ان کا اندازہ زیادہ قرین قیاس تھا۔ چنانچہ جاپان کی بحریہ کا یہ تخمینہ تھا کہ ۱۹۴۱ء کے اواخر تک اس کے لڑنے کی صلاحیت امریکی بحریہ کی طاقت کے مقابلے میں ستر فی صد ہو گی جو ۱۹۴۲ء میں گھٹ کر ۶۵' ۱۹۴۳ء میں ۵۰ اور ۱۹۴۴ء میں ۳۰ فی صد رہ جائے گی۔ جرمنی کی طرح جاپان بھی ایک ایسی فوجی حکمت عملی اختیار کرنا چاہتا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے درمیانے درجے کی حیثیت سے جلد از جلد چھٹکارا پا لے اور اس دنیا میں ایک امتیازی مقام حاصل کر لے جو صرف سپر پاورز کے مقدر میں ہے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کے بحران

جب ہم نے بڑی طاقتوں کے جملہ محاسن و استقام کا بھرپور جائزہ لے لیا اور متعلقہ دور کے اقتصادی اور تکنیکی محرکات کو بھی پرکھ لیا تو ایسی صورت میں ۱۹۳۰ء کے عشرے میں بین الاقوامی سفارت کاری کا انداز قابل فہم محسوس ہوتا ہے۔ یہاں یہ تاثر دینا مراد نہیں ہے کہ مختلف بحران ---- شاہ مکدن، ایتھوپیا یا سوڈیٹن لینڈ ---- چونکہ مقامی نوعیت کے تھے، لہٰذا غیر متعلقہ تھے۔ نیز یہ کہ اگر بڑی طاقتوں میں ہم آہنگی ہوتی تو بین الاقوامی مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے۔ لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ جب کسی علاقے میں مقامی نوعیت کا کوئی بحران پیدا ہوا تو ہر ممتاز ملک کی سیاسی شخصیات نے ایسے معاملے کو نہ صرف سفارت کاری کے وسیع تناظر میں دیکھا بلکہ اپنے علاقے کے گوناگوں مسائل کی روشنی میں بھی پرکھا ہے۔ جب ۱۹۳۱ء میں منچوریہ کا معاملہ پیش آیا جس کے نتیجے میں اسٹرلنگ کا بحران پیدا ہوا اور دوسری لیبر حکومت ختم ہوئی تو اس وقت برطانیہ کے وزیراعظم میکڈونلڈ نے اپنے رفیق کار بیلڈون سے نہایت خوبصورت طریقے سے یہ کہا تھا:

> "ہم لوگ آئے دن کسی نہ کسی مصیبت سے اس طرح دوچار ہوتے رہتے ہیں کہ تمام صورت حال کا جائزہ لینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ نہ ہی اسی ضمن میں کوئی پالیسی وضع کرنے کی نوبت آتی ہے۔ البتہ احتجاج کا ہی سامنا کرتے رہتے ہیں۔"

اس طرح یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ سیاست دان کسی معاملے میں طویل المیعاد حل اور حکمت عملی کے برعکس فوری سوچ و فکر کے عادی تھے۔ برطانوی حکومت نے اگرچہ اس دھچکے کو سہہ لیا تھا لیکن اس نے منچوریا پر جاپان کے قبضہ کے بعد کسی خاص نوعیت کی پالیسی نہیں اپنائی۔ اس بات سے قطع نظر کہ اقتصادی معاملات پر مسلسل توجہ دینے کی سخت ضرورت تھی اور عوام مشرق بعید میں ٹانگ اڑانے سے سخت کبیدہ خاطر تھے، برطانیہ کے لیڈر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ڈومینین صلح پر زور دے رہی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک ایسے علاقے میں جہاں جاپان کو فوجی برتری حاصل ہے، برطانیہ کی دفاعی پوزیشن خاصی کمزور ہو چکی ہے۔ بہرحال برطانیہ کے بہت سے لوگ چین کے قوم پرستوں کے ساتھ جاپان کی معاملہ بندی کو بہتر سمجھ رہے تھے جبکہ بہت سے افراد جاپان کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ لیکن جاپان کے مزید جارحانہ اقدامات نے اہل برطانیہ کو مذکورہ رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اب صرف یہی طریقہ کار رہ گیا تھا کہ وائٹ ہال لیگ آف نیشنز یا کسی بڑی طاقت کو ساتھ ملا کر جاپان کے خلاف سخت قدم اٹھائے۔

لیکن لیگ اپنے اصول کی تمام تر خوبیوں کے باوجود منچوریہ میں جاپان کے جارحانہ اقدام روکنے کے لیے کوئی موثر ذریعہ نہیں رکھتی تھی، سوائے اس کے کہ بعض اہم ارکان کے پاس مسلح افواج اس فریضے کی انجام دہی کے لیے موجود تھی۔ البتہ لیگ کے پاس ایک تحقیقی کمیٹی (لیٹن کمیشن) موجود تھی۔ اس نے ممبر طاقتوں کو یہ بہانہ فراہم کیا کہ وہ موثر کارروائی کرنے میں لیت و لعل سے کام لیں۔ چنانچہ اس دوران جاپان نے منچوریہ پر قبضہ جمانے کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اس وقت جو بڑی طاقتیں تھیں ان میں

اٹلی کا مشرق بعید سے کوئی مفاد وابستہ نہ تھا۔ جرمنی اگرچہ چین کے ساتھ تجارتی اور فوجی بندھن میں بندھا ہوا تھا لیکن اس نے خاموش بیٹھا رہنا پسند کیا۔ پھر وہ اس بات کا بھی جائزہ لے رہا تھا کہ آیا جاپان کا "تنقیحی نظریہ" یورپ میں کوئی سود مند مثال بنتا ہے یا نہیں۔ سوویت یونین جاپان کی جارحیت سے فکرمند ضرور تھا، لیکن دوسری طاقتیں اس معاملے میں اس کا تعاون حاصل کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر اسے تنہا آگے بڑھ جانے کا مطلق خیال بھی نہ تھا۔ فرانس گومگو کے عالم میں تھا۔ وہ سرحدوں میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے حق میں نہ تھا اور نہ ہی لیگ کے ریزولیشن میں ترمیم کا حامی تھا۔ البتہ فرانسیسی حکومت جرمنی کے دوبارہ مسلح ہونے سے بہت زیادہ فکرمند تھی اور یہ چاہتی تھی کہ یورپ میں اسٹیٹس کو قائم رہے۔ بایں ہمہ فرانس اس بات سے بھی خوف زدہ تھا کہ مشرق بعید میں جس قسم کے پیچیدہ حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کے نتیجے میں ساری توجہ اور فوجی وسائل جرمنی سے بہت دور مرتکز ہو جائیں گے۔ اگرچہ پیرس لیگ کے اصول و ضوابط کا بھرپور انداز میں ساتھ دے رہا تھا، لیکن خفیہ طور پر اس نے ٹوکیو کو یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ چین میں جاپان کے مسئلے کو بخوبی سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس امریکی حکومت کے سیکرٹری آف اسٹیٹ، اسٹمسن نے جاپانی رویے سے اغماض نہیں برتا بلکہ اسے ساری دنیا کے لیے خطرے کا باعث قرار دیا۔ لیکن اسٹمسن نے جاپانی جارحیت کی جس انداز میں برائی کی تھی اس سے نہ تو ہوور متاثر ہوا جو نتیجے سے ہراساں نظر آتا تھا، نہ ہی برطانوی حکومت جو محاذ آرائی کے لیے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ بہرحال اس اقدام کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اسٹمسن اور ہوور دونوں نے اپنی یادداشتوں میں ایک دوسرے پر الزام تراشی کی۔ پھر اہم بات یہ ہوئی کہ واشنگٹن اور لندن کے درمیان عدم اعتمادی کی ایک ایسی لہر اٹھی جس کی باقیات مدتوں قائم رہیں۔ ان تمام باتوں نے حزن و اضمحلال کی جو مثال قائم کی اس کے متعلق ایک دانشور کی یہ رائے ہے: "خارجہ پالیسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"

۱۹۳۱ء میں جاپانی فوج جب منچوریہ میں داخل ہوئی تو اس کا علم وہاں کی حکومت کو تھا یا نہیں یہ اتنی اہم بات نہیں ہے جتنی یہ کہ پیش قدمی کامیاب ہوئی اور مغربی ممالک اس معاملے میں کچھ نہ کر سکے۔ ان واقعات سے جو اہم نتائج برآمد ہوئے وہ یہ کہ لیگ جارحانہ اقدامات روکنے میں سراسر ناکام رہی اور مغرب کے تینوں جمہوری ممالک مشترکہ کارروائی انجام دینے سے قاصر تھے انہی دنوں جنیوا میں بری اور ہوائی فوج میں تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں جو مباحثہ ہوا اس سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی اس موقع پر امریکہ غائب تھا۔ البتہ انگلستان اور فرانس کے درمیان اس بات پر اختلافات پیدا ہو گئے کہ آخر کس طرح جرمنی کے "ہم مساوی" ہونے کے مطالبے کو پورا کیا جائے۔ پھر انگلستان کسی طرح بھی فرانس کے خطرات کے ازالے کے لیے ضمانت دینے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس مباحثے کا حاصل یہ نکلا کہ ہٹلر کی نئی حکومت کا نمائندہ اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا اور بلا خوف و خطر موجودہ تمام معاہدوں کو منسوخ کر دیا۔

۱۹۳۳ء کے قریب جرمنی سے دوبارہ خطرات محسوس ہونے لگے تھے۔ ان سے انگلستان، فرانس اور امریکہ کے باہمی سفارتی تعلقات خاصے متاثر ہوئے۔ یہ صورت حال ایسے وقت میں پیدا ہوئی جبکہ عالمی اقتصادی کانفرنس ناکام ہو چکی تھی اور مذکورہ تینوں جمہوری ممالک اپنی کرنسی اور تجارتی بلاک بنانے میں مصروف تھے۔ اگرچہ فرانس کو جرمنی کے خطرات کا براہ راست سامنا تھا لیکن برطانیہ کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اسے عسکری اقدام کرنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ کابینہ اور اس کی ملحقہ دفاعی ضروریات کی کمیٹی نے یہ رائے قائم کی کہ اگرچہ جاپان سے فی الفور خطرات کا

خدشہ ہے، لیکن جرمنی آگے چل کر کہیں زیادہ خطرے کا باعث بنے گا۔ چونکہ دونوں کے خلاف مضبوط قسم کی مورچہ بندی ممکن نہ تھی لہٰذا کسی ایک کے ساتھ مفاہمت کی راہ اختیار کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اس وقت بعض حلقوں نے یہ مناسب سمجھا کہ جاپان کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی جائے تاکہ جرمنی کا مقابلہ کرنا آسان رہے۔ لیکن وزارت خارجہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ مشرق بعید میں انگلستان اور جاپان کے درمیان کسی قسم کی مفاہمت سے امریکہ کے ساتھ لندن کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔ دوسری جانب شاہی اور بحری فوج کے حلقوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ وہ جو اس بات کے خواہاں ہیں کہ مشرق میں برطانیہ کی فوجی پوزیشن مستحکم کی جائے تو انہیں معلوم ہو کہ جرمنی کے تسلیمی نظریے کی خاطر فرانس کو پیٹھ نہیں دکھائی جا سکتی اور پھر ۱۹۳۵ء کے بعد لفٹ ویف کے خطرات کو سرے سے نظرانداز کر دیا گیا۔ غرض اس پورے عشرے کے دوران وائٹ ہال کے منصوبہ ساز دنیا کے مخالف سرے پر موجود دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی حکمت عملی وضع کرنے سے گریزاں رہے، اس لیے کہ وہ گومگو کے عالم میں سرگرداں تھے۔

لیکن ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۵ء میں گومگو کی یہ کیفیت سوہان روح بنی رہی۔ اگرچہ ہٹلر کی حکومت ناپسندیدہ تصور کی جاتی تھی اس کے باوجود اس نے بذات خود پولینڈ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جرمنی فوجی لحاظ سے فرانس اور روس کے مقابلے میں کمزور تھا۔ علاوہ ازیں جب ۱۹۳۴ء میں ڈولفس کے قتل کے بعد جرمنی نے آسٹریا میں پیش قدمی کرنے کی کوشش کی تو مسولینی سخت برہم ہو گیا اور اس نے دھمکی کے طور "درہ برینر" کے مقام پر لشکر کشی کر دی۔ اس وقت اٹلی ان طاقتوں کے ساتھ تھا جو حالت قائمہ کے حق میں تھیں لیکن اس کا یہ طرز عمل فرانس کے مفادات سے متصادم ہو رہا تھا۔ چنانچہ فرانسیسی حکومت نے اپریل ۱۹۳۵ء میں جرمنی کے خلاف ایک اتحاد قائم کر لیا۔ اسی زمانے میں اسٹالن نے یہ عندیہ دیا کہ وہ امن پسند ریاستوں کے ساتھ مفاہمت کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ سوویت یونین نے ۱۹۳۵ء میں نہ صرف لیگ آف نیشنز میں شمولیت اختیار کر لی بلکہ پیرس اور پراگ کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھی کر لیا۔ اگرچہ ہٹلر نے مشرق میں ہونے والے "لوکارنو نزیٹی" کی کھل کر مخالفت کی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی ہر سمت پر سکون نظر آ رہا تھا۔ اور ادھر مشرق بعید میں جاپان بالکل خاموش تھا۔

بہرحال ۱۹۳۵ء کے نصف آخر میں یہ حوصلہ افزا سماں تیزی سے بدلنے لگا تھا حالانکہ ہٹلر نے کوئی اشارہ تک نہیں کیا تھا۔ دفاعی مسائل کے سلسلے میں انگلستان اور فرانس کے مابین جو اختلافی نظریہ تھا وہ اس وقت کھل کر سامنے آ گیا جب فرانسیسی حکومت نے دوبارہ روس کے ساتھ روابط بڑھائے اور لندن اس پر چیں بہ جبیں ہوا۔ ادھر انگلستان نے ۱۹۳۵ء میں جرمنی کے ساتھ بحری فوج کا ایک معاہدہ کر لیا جو فرانس کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ یہ دونوں اقدامات مزید تحفظات کے حصول کے خاطر اپنے اپنے طور پر کیے گئے تھے۔ فرانس اس بات کا خواہشمند تھا کہ روس کو ہم نوا بنا کر یورپ کے توازن کا حصہ بنا لیا جائے جبکہ برطانیہ یورپی سمندروں اور مشرق بعید میں اپنی بحریہ کی ضرورتیں پوری کرے۔ لیکن ان دونوں کا ہر قدم برلن کو غلط سگنل دینے کا محرک بنا۔ اگرچہ یہ تضادات ضرر رساں تھے لیکن مسولینی کے اس اقدام کی طرح تباہ کن نہ تھے جب اس نے حبشہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے کا حاصل یہ تھا کہ مذکورہ علاقے میں نہ صرف مسلسل جھڑپیں ہوتی رہیں بلکہ مسولینی کا نئی سلطنت روما قائم کرنے کا ارادہ بھی چکنا چور ہو گیا۔ بہرحال یہ بھی علاقائی جنگ و فساد کی ایک مثال تھی۔ ادھر فرانس کو یہ اضطراب تھا کہ جرمنی کے مد مقابل اس کا ایک طاقتور اتحادی خود اس کا شدید دشمن بن چکا ہے۔ پھر حبشہ کا واقعہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ

تھا۔ اس وقت لیگ کے اصول و ضوابط کو بروئے کار لانا بھی خطرے کی بات تھی کیونکہ مسولینی اپنے دست و بازو کو حرکت دے رہا تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں حملہ کر بیٹھے گا۔ دوسری طرف اگر اٹلی جرمنی کے کیمپ میں داخل ہو جاتا ہے تو سیاسی نقطہ نظر سے یہ نہایت احمقانہ اقدام ہوتا۔ لیکن آخرالذکر نظریاتی اساس کے حامل برطانیہ کو سرنگوں نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال وائٹ ہال میں گومگو کی کیفیت ہنوز طاری تھی۔ اٹلی نے لیگ کے اصول کی جو خلاف ورزی کی تھی اس سے برطانوی عوام میں بے چینی کی کیفیت طاری تھی جسے حکومت کنٹرول کرنے میں منہمک تھی۔ دوسرے برطانوی حکومت کو یہ بھی خدشہ لاحق تھا کہ اگر مغربی ممالک بحیرہ روم کے قضیے میں الجھ جاتے ہیں تو معلوم نہیں جاپان مشرق بعید میں کس قسم کی کاروائی کر گزرے۔ جہاں فرانس کو یہ خوف تھا کہ اگر اٹلی کے ساتھ محاذ آرائی کی گئی تو اس سے ہٹلر کو رھائن لینڈ پر چڑھ دوڑنے کی ترغیب مل جائے گی، وہاں برطانیہ کو یہ شک تھا کہ اس طرح جاپان کو ایشیا میں دور تک گھس آنے کا حوصلہ مل جائے گا، خصوصاً" ایسے وقت میں جبکہ ٹوکیو نیوی کے جملہ معاہدے منسوخ کر کے ایک بڑے بحری بیڑے بنانے میں لگ جائے گا۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو دونوں صحیح تھے۔ صرف مشکل یہ حائل تھی کہ درپیش مسئلے کو طویل المیعاد عملی مراحل سے ہم آہنگ نہیں کیا جا رہا تھا۔

فرانس کو جو خدشات تھے وہ سب سے پہلے صحیح ثابت ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں انگلستان اور فرانس نے شمال مشرقی افریقہ کے علاقے کا تصفیہ کرنے کے لیے اٹلی سے اس کے حق میں معاہدہ کیا تھا جسے ہور۔ لیول پیکٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے برطانیہ کے عوام میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ غرض لندن اور پیرس کی حکومتیں عوامی اشتعال کے نرغے میں آ گئیں اور متعدد حلقوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ اقتصادی اور فوجی حکمت عملی کے پیش نظر وہ اٹلی کے خلاف اعلان جنگ کیوں نہیں کرتیں۔ ایسے وقت میں ہٹلر نے یہ حکم نافذ کیا کہ رھائن لینڈ جہاں سے فوجیں ہٹا لی گئی تھیں، پر قبضہ کر لیا جائے (مارچ ۱۹۳۶ء) اگر فوجی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کوئی اہم ضرب کاری نہ تھی۔ اس وقت یہ بات بھی بعید از قیاس تھی کہ فرانس جرمنی پر دھاوا بول دے گا اور برطانیہ کے لیے بھی یہی کچھ کرنا نہایت ناممکن تھا۔ ان حالات میں نہ صرف ورسلز معاہدہ مجروح ہو رہا تھا بلکہ لوکارنو نزیٹی بھی مجموعی طور پر کالعدم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اب حالات قائمہ میں تبدیلی کی بین الاقوامی سطح پر بات ہونے لگی۔ چونکہ لیگ ۳۶۔۱۹۳۵ء کے دوران مسولینی کے جارحانہ عزائم کو نہ روک سکے، لہٰذا اب اس بین الاقوامی تنظیم کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ اس ادارے نے اسپین کی خانہ جنگی کے موقع پر یا ۱۹۳۷ء میں چین پر جاپان کے حملے کے وقت کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اگر سرحدوں میں کسی قسم کی تبدیلی کو روکا جا سکتا تھا یا کم از کم اس پر کنٹرول رکھا جا سکتا تھا تو اسے حالت قائمہ کی حامل ایسی اہم اور بڑی طاقتیں انجام دے سکتی تھیں جو "تنسیخ پسند" ریاستوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا بھرپور اور بیکراں جذبہ رکھتی تھیں۔

تاہم مذکورہ طاقتوں میں سے کسی کو بھی ایسا خطرہ درپیش نہ تھا کہ اسلحہ اٹھانے پر مجبور ہو جاتی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ان دنوں فاشسٹ طرز کے ممالک ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں جرمنی اور جاپان کے درمیان "اینٹی کمنٹرن پیکٹ" ہوا تھا۔ پھر مسولینی نے روم اور برلن کے معاہدے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن ان کی مخالف طاقتوں کا اتحادی شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اگرچہ امریکہ نے چین پر جاپانی حملے اور یو ایس ایس پنائے پر بمباری پر برہمی کا اظہار کیا تھا، اس کے باوجود ۱۹۳۷ء ایسا سال قطعاً" نہ تھا کہ صدر روز ویلٹ سمندر پار ملکوں کے معاملات میں دخل اندازی کرتا۔ وہاں کساد بازاری کی وجہ سے معیشت پر زد

پڑ رہی تھی پھر کانگریس سخت قسم کے غیر جانب دارانہ قانون منظور کیے چلی جا رہی تھی۔ روزویلٹ سوائے مذمت کے الفاظ استعمال کرنے کے کسی عملی اقدام کا وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس کی پالیسی بھی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ امریکہ کے پر اعتماد ہونے کے سلسلے میں انگلستان اور فرانس کے شبہات کو مزید تقویت پہنچ رہی تھی۔ ادھر اسٹالن بھی بالکل مختلف انداز میں ملکی مسائل کی جانب توجہ مبذول کر رہا تھا۔ ان دنوں اس کی گوشمالی اور سرزنش کا وطیرہ شباب پر تھا۔ اس نے اسپین کی جمہوریہ کو خانہ جنگی کے دنوں میں مالی امداد بھی فراہم کی تھی۔ ویسے وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ مغربی ممالک میں بے شمار لوگ "کالی قمیض" سے کہیں زیادہ "سرخ قمیض" والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ نیز اس کا یہ خیال تھا کہ محورائی علاقے کے ساتھ جنگ کرنے میں بہت زیادہ خطرات درپیش ہوں گے۔ ادھر مشرق بعید میں جاپانیوں کی کاروائی اور "اینٹی کمنٹرن پیکٹ" پر عمل درآمد کے نتیجے میں اسٹالن اور بھی محتاط ہو گیا تھا۔

۱۹۳۶-۷ کے دوران جو طاقت بہت زیادہ دگرگوں ہوئی وہ بلاشبہ فرانس کی تھی۔ نہ صرف اس کی اقتصادی حالت خستہ ہو چکی تھی بلکہ سیاسی منافرت بھی عام تھی۔ چنانچہ بعض مبصرین کا یہ خیال تھا کہ یہ ملک خانہ جنگی کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس ملک کو اس قدر دھچکے پہنچتے رہے تھے کہ یورپ میں اسے جو دفاعی نظام میسر تھا' وہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ رھائن لینڈ پر جرمنی کے دوبارہ قبضہ کر لینے کے بعد اب اس بات کا امکان نہیں رہا تھا کہ فرانسیسی فوج حملہ کر کے برلن پر اپنا دباؤ برقرار رکھ سکے۔ جرمنی کی عسکری طاقت (لفٹ ویف) کے مقابلے میں یہ ملک تشویشناک حد تک کمزور ہو چکا تھا۔ اسی طرح فرانس کی فضائیہ بھی آہستہ آہستہ اپنا بھرم کھو رہی تھی۔ حبشہ کے واقعہ اور روم و برلن اتحاد کے بعد اٹلی جو پہلے ایک طاقتور ساتھی تھا اب ایک ایسے دشمن میں تبدیل ہو چکا تھا جو فرانس کے لیے زیادہ خطرناک تھا۔ بلجیم کے علیحدہ ہو جانے کے بعد فرانس کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنی شمالی سرحدوں کی حفاظت کے منصوبوں پر عمل درآمد کر سکے۔ پھر ایسی کوئی صورت نہ تھی' خصوصاً" خاصی لاگت کی وجہ سے کہ میجینوٹ لائن کو وسعت دے کر اس خلا کو پر کر دیا جائے۔ اسپین کی خانہ جنگی کے نتیجے میں وہاں ایک ایسی فاشسٹ حکومت قائم ہوئی تھی جو فرانس کی عین پشت پر واقع تھی۔ ادھر مشرقی یورپ میں یوگوسلاویہ اٹلی کی جانب جھک رہا تھا اور اس طرح اتحاد صغیرہ پارہ پارہ ہو رہا تھا۔

ایسے جاں گسل ماحول اور پر آشوب دور میں برطانیہ کا کردار خاصی اہمیت کا حامل بن گیا۔ مئی ۱۹۳۷ء میں نیویل چیمبر لینڈ' بالڈون کی جگہ وزیراعظم مقرر ہوا۔ وہ ملک کی بدترین اقتصادی حالت اور فوجی کمزوری سے خاصا فکرمند تھا۔ پھر جنگ سے ذاتی طور پر وہ ہراساں تھا۔ چنانچہ چیمبرلین نے یہ فیصلہ کیا کہ مستقبل میں یورپ کے کسی بھی تنازع کے خاتمے کے لیے یہ زیادہ مناسب ہو گا کہ آمرانہ حکومتوں کی تسلی و تشفی کچھ دے دلا کر کر دی جائے۔ وہ سوویت یونین کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ روزویلٹ کی طول کلامی سے وہ متنفر تھا۔ وہ فرانس کی پیچیدہ سفارت کاری کو دیکھ دیکھ کر مضطرب ہو جاتا۔ پھر لیگ اس کی نگاہ میں غیر موثر ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ وزیراعظم نے قیام امن کے لیے اپنے طور پر حکمت عملی وضع کی۔ قبل ازیں لندن' جرمنی سے تجارتی اور نو آبادیاتی مراعات حاصل کرنے کے لیے چیخ و پکار کرتا رہا تھا۔ چیمبرلین نے اس تحریک کو مزید مہمیز کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ یورپ میں علاقے کی تبدیلی پر غوروخوض کرے گا۔ انہی دنوں وزیراعظم نے یہ محسوس کر لیا کہ جرمنی سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ چنانچہ اس نے اٹلی کے ساتھ تعلقات استوار کرنا چاہے تاکہ اس طرح اس ملک کو "محور" سے الگ کر دیا جائے۔ یہ

تمام باتیں متنازع تھیں۔ چنانچہ ان اقدامات کے نتیجے میں چیمبرلین کے خارجہ سیکرٹری (ایڈن) کو ۱۹۳۸ء کے اوائل میں مستعفی ہونا پڑا۔ اندرون ملک "تسلی تشفی کی تحریک" کے مخالفوں نے وسیع پیمانے پر تنقید شروع کر دی۔ پھر واشنگٹن اور ماسکو کے شکوک و شبہات میں بھی اضافہ ہو گیا بہرحال یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ سفارت کاری کی پرانی تاریخ ایسے متنازع اقدامات سے بھری پڑی ہے۔ یورپ کے معدودے چند لوگوں کا خیال ہے کہ چیمبرلین کی حکمت عملی میں خامی تھی۔ ہٹلر کسی طرح تسلی تشفی والی تحریک سے بنیادی طور پر متاثر ہونے والا شخص نہیں تھا۔ وہ مستقبل میں ایسے وسیع علاقے حاصل کرنے کا دھنی تھا جسے محض چھوٹے پیمانے کی زمینیں دے کر مطمئن نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ منطقی نتیجہ ۱۹۳۹ء اور سب سے زیادہ ۱۹۴۰-۱ء میں پوری طرح واضح ہو چکا تھا لیکن ۱۹۳۸ء کے بحرانی دور میں یہ ٹھوس حقائق نہ تو برطانیہ کے علم میں تھے اور نہ ہی فرانس کے! اسی سال موسم بہار میں آسٹریا پر ہٹلر کا قبضہ دراصل اس کے اعلان کیے بغیر کاروائی کرنے کے شوق کا مظہر تھا لیکن کیا جرمنوں کے جرمنوں کے ساتھ باہم مل جانے پر کوئی معترض بھی ہو سکتا ہے؟ اگر اس میں کوئی صداقت ہے تو اس سے چیمبرلین کے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے--- یعنی چیکوسلواکیہ میں جرمن زبان بولنے والی اقلیت کا مسئلہ حل کر دیا جانا چاہئے۔ قبل اس کے کہ بڑی طاقتیں اس معاملے کو رفع کرنے کے لیے آ دھمکیں' اور پھر جنگ چھڑ جائے۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سوڈیٹن لینڈ کا معاملہ کچھ زیادہ ہی گھمبیر تھا۔ اس پر چیکوسلواکیہ کا بھی حق تھا جسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اور اب ہٹلر کو خوش کرنے کے لیے مغربی طاقتوں کا رویہ محض منفی نوعیت کا خوف تھا۔ بہرحال اس زمانے میں فوہرری ایک ایسا لیڈر تھا جو محاذ آرائی کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ اس بات پر سخت طیش میں بھی تھا کہ اس نے میونخ کانفرنس کے موقع پر جو مراعات حاصل کی تھیں انہی کے ذریعے چیکوسلواکیہ کو دبانے کا امکان ہی ختم کر دیا گیا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی دو ملک بڑی طاقت کی جنگ کا سبب بن گئے۔ علاوہ ازیں ۱۹۳۸ء میں ہٹلر کی مخالفت کرنے والا کوئی موجود نہ تھا۔

چونکہ مغرب میں سیاسی اور عوامی سطح پر جنگ کرنے کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا لہٰذا یہاں اس بحث میں پڑنے کا کوئی حاصل نہیں کہ اگر برطانیہ اور فرانس چیکوسلواکیہ کی طرف سے محاذ آرائی کرتا تو کیا صورت حال پیدا ہوتی۔ البتہ یہاں اس حقیقت کا تذکرہ ضروری ہے کہ جرمنی کے لیے فوجی توازن اتنا حسب خواہ نہیں تھا جیسا بعض افراد کا خیال تھا۔ بہرحال یہ بات واضح ہے کہ میونخ کے صلح نامے کے تحت یہ توازن ہٹلر کے حق میں بہت زیادہ جھکا ہوا تھا۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں چیکوسلواکیہ کو جو یورپ کی درمیانے درجے کی طاقت تھی' ختم کر دیا گیا۔ وہاں کے تمام اسلحے' فیکٹریوں اور خام مال پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ ادھر اسٹالن مغرب کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ان حقائق سے لندن اور پیرس کے موقف کو تقویت پہنچی۔ برطانیہ میں اسلحہ خاصی مقدار میں تیار ہونے لگا تھا۔ پھر فرانس اور انگلستان میں دفاعی تعاون کو فروغ ملا۔ نیز ہٹلر کا مقابلہ کرنے کے لیے برطانیہ اور سلطنت فرانس کی رائے میں ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ اسی دوران چیمبرلین جنوری ۱۹۳۹ء میں اٹلی کو استوائی محور سے نکالنے میں ناکام ہو گیا اور بلکان میں اسے جارحانہ اقدامات سے باز بھی نہ رکھ سکا۔ ویسے مسولینی بعض اسباب کی بناء پر بڑی طاقت کی جنگ میں اپنے ہم عصر آمر کے شانہ بشانہ اب ممالک کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

ہٹلر نے ۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں پولینڈ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا' لہٰذا جنگ سے بچنے کے امکانات معدوم ہو گئے۔ پھر جنگ چھڑنے پر انگلستان اور فرانس کی فتح کی امید قدرے کم تھی۔ جرمنی نے مارچ ۱۹۳۹ء میں چیکوسلواکیہ جیسی چھوٹی سی ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ پھر ایک ماہ بعد اٹلی نے البانیہ کی جانب پیش قدمی کر دی۔ لہٰذا عوام کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت جمہوری ملکوں نے ہٹلر کی مزاحمت کی' پولینڈ' یونان' رومانیہ اور ترکی کو تحفظ کی ضمانت دی اور اس طرح مغربی یورپ کو مشرقی یورپ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ تاہم پولینڈ کو مغربی ملکوں سے کوئی امداد براہ راست نہیں مل رہی تھی۔ ویسے بالواسطہ جو بھی مدد اسے حاصل ہو رہی تھی وہ قدرے کم تھی وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ فرانسیسی فوج نے دفاعی حکمت عملی اختیار کر لی تھی اور برطانیہ ملک کے فضائی تحفظ کے لیے اپنے وسائل بروئے کار لا رہا تھا۔ البتہ پولینڈ کو اگر براہ راست مدد دی جا سکتی تھی تو وہ صرف مشرقی یورپ کی طرف سے۔ چیمبرلین کی حکومت ماسکو سے کوئی معاہدہ کرنے کو تیار نہ تھی اسی طرح پولینڈ بھی کسی طرح یہ نہیں چاہتا تھا کہ سرخ فوج اس کے علاقے میں داخل ہو جائے۔ ادھر اسٹالن جنگ سے بچنے کے لیے وقت گزاری کر رہا تھا اور ہٹلر مغربی ملکوں پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ پولینڈ سے دست بردار ہو جائیں۔ دونوں آمر وارسا کے خرچے پر سیکولر نوعیت کا معاہدہ کرنے میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے' حالانکہ دونوں متضاد نظریات کے حامل تھے۔ ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو مولوتوف اور ربن ٹروپ کے درمیان پیکٹ کا ناخوشگوار اعلان ہوا۔ اس سے نہ صرف جرمنی کی دفاعی پوزیشن بہتر ہو گئی بلکہ پولینڈ پر حملے کا امکان بھی بڑھ گیا۔ اس مرتبہ لندن اور فرانس کے لیے "ڈرے ولانے والا" معاملہ نہیں رہا تھا' تاہم اقتصادی اور فوجی حالات بڑی طاقت کے مابین جنگ کے لیے سازگار نہ تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے موقع پر برطانیہ اور فرانس دونوں جرمنی کی پھر مخالفت کرنے لگے تاآنکہ ۱۹۴۳ء میں ایک برطانوی مہم جو دستہ چینل کی دوسری جانب روانہ کیا گیا۔ بایں ہمہ انگلستان اور فرانس کی بحری فوج نے جہازی راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ بہت سی باتوں میں مذکورہ جنگ کی حکمت عملی سابقہ جنگ سے یکسر مختلف تھی اور اسی لیے اتحادیوں کے لیے موافق نہ تھی۔ ایک تو مشرق میں کوئی محاذ نہ تھا' دوسرے برلن اور ماسکو میں پولینڈ کے سلسلے میں جو سیاسی سمجھوتہ ہوا تھا' وہ کاروباری معاملات تک ہی محدود رہا۔ چنانچہ روس سے آنے والا خام مال جرمنی کی اقتصادی ناکہ بندی کی وجہ سے اس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جنگ کے پہلے برس جرمنی میں تیل اور دیگر خام اشیاء کا اسٹاک تشویشناک حد تک کم تھا لیکن سویڈن اور روس سے آنے والے مال نے اس خلا کو بڑی حد تک کم کر دیا۔ علاوہ ازیں مغربی محاذ پر اتحادیوں کے جمود کا مطلب یہ تھا کہ جرمنی کے پٹرول اور اسلحہ کے ذخیرے پر سرے سے کوئی قدغن نہ تھی۔ دوسرے ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ میں آسٹریا۔ ہنگری کا جو کردار تھا جرمنی کے لیے ایسا کوئی اتحادی نہ تھا۔ اگر ستمبر ۱۹۳۹ء میں اٹلی بھی جنگ میں شریک ہو جاتا تو اس کی اقتصادی بدحالی سے سلطنت جرمنی کی زوال حال معیشت پر خاصا دباؤ پڑ جاتا۔ نیز ۱۹۴۰ء میں مغربی محاذ پر جرمنی کے حملے کے امکانات معدوم ہو جاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اٹلی جنگ میں کود پڑتا تو بحیرہ روم کے علاقے میں انگلستان اور فرانس کی پوزیشن خاصی پیچیدہ ہو جاتی۔ ادھر روم کی غیر جانب داری ــــ جرمنی کی تجارت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ برلن کے منصوبہ سازوں نے یہ توقع قائم کر لی تھی کہ مسولینی الگ تھلگ رہے گا۔

اگرچہ اس جنگ سے جرمنی کی اقتصادی بدحالی کو مزید کوئی زد نہیں پہنچی' البتہ اس نے قومی دفاع کو بہتر بنانے کے لیے موقع ضرور فراہم کر دیا۔ چنانچہ حملے کے اصول وضع کیے گئے' مسلح افواج میں

اشتراک پر زور دیا گیا' فضائی طاقت کو جدید بنانے کا منصوبہ بنایا گیا اور جارحانہ جنگ کے طریقے اپنائے گئے۔ پولینڈ کی جنگ نے خصوصی طور پر "بلٹز کریگ" طریقہ جنگ کے اثرات واضح کر دیے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بہت سی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کر دی تھی (جنہیں اس وقت درست کیا جا سکتا تھا) اس سے جرمنی کے اس اعتماد کو تقویت پہنچی کہ وہ اپنے دشمن پر نہایت سرعت سے اور اچانک حملہ آور ہو سکتا ہے اور اسے اپنی فضائیہ اور بری فوج پر خصوصی توجہ حاصل ہے۔ چنانچہ ڈنمارک اور نیدرلینڈ پر اچانک حملہ کر کے انھیں تباہ کیا گیا۔ البتہ ناروے کی جغرافیائی صورت حال اور برطانیہ کی بحری طاقت کے اثرات نے جرمنی کو وہاں تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔ چنانچہ اس مہم میں کامیابی اسی وقت حاصل ہوئی جب لفت ویف کی برتری پوری طرح قائم ہو گئی۔ لیکن جرمنی کی اعلیٰ فوجی صلاحیت مئی۔ جون ۱۹۴۰ء میں اس وقت سامنے آئی جب فرانس کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی۔ اتحادیوں کی پیدل فوج اور ٹینک بردار دستے کو گوڈیرین کے ٹینکوں کے غول اور نہایت تیز رفتار پا پیادہ فوج نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ ان تمام محاذ آرائیوں کے دوران حملہ آور کو فضائی برتری حاصل تھی۔ واضح رہے کہ یہ ۱۶-۱۹۱۳ء والی جنگ نہ تھی جس میں کوئی فریق فنی لحاظ سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں ناکام رہا تھا۔ ۱۹۴۰ء کی اس جنگ نے جرمنی کی فوجی صلاحیت کا لوہا منوا لیا تھا اور کچھ اس طرح کہ اس کی طویل اقتصادی بدحالی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

اہم بات یہ کہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں فیصلہ کن فتح کی بدولت جرمنی کو تیل اور خام مال کے مزید ذخائر ہاتھ لگ گئے۔ نیز اس نے اپنے دشمنوں کو خوب تخت و تاراج کیا۔ فرانس اور برطانیہ کی طاقتیں اس طرح مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں کہ ان میں جوابی کاروائی کا حوصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جرمنی کے گوداموں پر کوئی آنچ نہیں آنے والی۔ اسپین سے خشکی کے راستے سامان منگوانے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ سویڈن کی قلزیات اتحادیوں کے قبضے سے اب محفوظ تھیں اور روس ہٹلر کی کامیابیوں سے مرعوب ہو کر خفیہ طور پر جرمنی کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سازوسامان فراہم کر رہا تھا۔ ایسے حالات میں فرانس کی طرح اٹلی کی جنگ میں شمولیت سے جرمنی کو اقتصادی طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ البتہ برطانوی وسائل کا رخ یورپ کی بجائے مشرق قریب کی جانب مڑ گیا۔ ویسے اٹلی کی ناکام محاذ آرائی کا سلسلہ ۱۹۴۰ء کے پورے عشرے میں اس کے لیے سوہان روح بنا رہا۔

اگر جنگ ان تین متحارب قوتوں کے درمیان جاری رہتی تو کہنا مشکل ہے کہ اس کا سلسلہ کتنے عرصے تک قائم رہتا۔ چرچل کی وزارت عظمیٰ کے تحت سلطنت برطانیہ نے جنگ برقرار رکھنے کا عزم کر رکھا تھا۔ چنانچہ بڑے وسیع پیمانے پر سپاہیوں اور فوجی سازوسامان کو محاذ پر پہنچایا جا رہا تھا۔ نیز یہاں ۱۹۴۰ء میں جرمنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعداد میں لڑاکا طیارے اور ٹینک بنائے جا رہے تھے۔ چونکہ ان دنوں برطانیہ کے پاس سونے اور ڈالر کے ذخائر اتنے کافی نہ تھے کہ امریکہ سے آئے ہوئے سامان کی ادائیگی کی جاتی لہٰذا صدر روزویلٹ نے کانگریس پر یہ دباؤ ڈالا کہ برطانیہ کا وجود خود اس ملک کے تحفظ و سلامتی کا ضامن ہے۔ بہرحال مجموعی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دونوں بڑی اور متحارب طاقتیں ایک دوسرے کو زک پہنچانے میں ناکام رہیں۔ اگرچہ برطانیہ کی اس جنگ نے چینل پار کر کے جرمنی پر حملے کرنے کے منصوبے کو ناممکن بنا دیا تھا' لیکن بری فوج کے عدم توازن کی وجہ سے یورپ میں برطانوی فوج کی پیش قدمی بھی ممکن نہیں تھی۔ جرمنی کے اوپر بمبار طیاروں کا حملہ اہل برطانیہ کے لیے یقیناً" جوش و خروش کا باعث بنا ہو گا لیکن اس موقع پر دشمن کو جتنا نقصان پہنچنا چاہیے تھے اتنا نہیں پہنچا۔ شمالی اوقیانوس پر ہوائی حملے کرتے رہنے کے باوجود

جرمنی کے بحری بیڑے برطانیہ کے شاہی بیڑے کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسری جانب یو۔ بوٹ کی کارکردگی پہلے کی طرح خوفناک تھی۔ یہ سب حربی تکنیک دراصل ڈونٹز کی مرہون منت تھی۔ ادھر برطانوی فوج شمالی افریقہ، صومالیہ اور حبشہ میں اطالوی مورچوں پر با آسانی قابض ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے لیے رومیل کی افریقی فوج یا یونان میں جرمنی کی حملہ آور فوج کے خطرناک طریقہ جنگ کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ بہرحال اس جنگ کا دوسرا سال "وقتی کامیابی" کا سال تو قرار دیا جاتا ہے لیکن اس میں فوائد نہایت مختصر سطح پر حاصل ہوئے تھے۔

جون ۱۹۴۱ء میں روس پر ہٹلر کے حملے کے فیصلے نے جنگ کا رخ ہی تبدیل کر دیا۔ فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے جرمنی اب کئی محاذوں پر جنگ کرنے کا خواہاں تھا اور ۱۹۴۲ء میں اسے جو کمزور پوزیشن حاصل تھی، اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن لفٹ ویف کے لیے یہ اقدام خاصا گراں ثابت ہوا، اس لیے کہ اس کی فضائیہ مغرب، مشرق اور بحیرہ روم میں منتشر تھی۔ دوسرے یہ بات بھی طے تھی کہ جس طرح اپنے جزائر میں سلطنت برطانیہ کی پوزیشن مستحکم تھی اسی طرح اس کی پوزیشن مشرق وسطیٰ میں بھی خاصی مضبوط تھی۔ اگر ہٹلر چاہتا تو اپنی فوج اور لڑاکا طیارے کا محض ایک چوتھائی حصہ اس علاقے میں بھیج کر برطانوی حکومت کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ روس کی جغرافیائی حدود کی وسعت اور میلوں میل پھیلے ہوئے علاقے کے اندر داخل ہو کر محاذ آرائی کرنا اہل جرمنی کو خاصا مہنگا پڑا۔ نیز دشمن پر اس حملے کی شدت پہلے جیسی نہیں رہی۔ گویا جرمنی کی وار مشین اب سست ہو چکی تھی۔ جرمنی اور اس کے اتحادیوں نے جون ۱۹۴۱ء میں صف اول کی طاقتور فوج کا جو مظاہرہ کیا تھا اسے تقویت دینے کے لیے وسائل بہت محدود تھے۔ خصوصاً سڑکوں کی خستہ حالی کی وجہ سے اور پھر موسم سرما کے دوران جنگ جاری رکھنے کے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ لڑائی تین ماہ کے اندر اندر ختم ہو جائے گی۔ ۱۹۴۱ء میں جرمنی میں لڑاکا طیارے بنانے کی رفتار برطانیہ اور روس کے مقابلے میں خاصی کم تھی۔ ایسے میں امریکہ سے کیا موازنہ! جرمن فوج کے پاس ٹینک بھی روس کی نسبت کم تھے۔ پھر وسیع محاذ آرائی کی وجہ سے پٹرول اور جنگی سازوسامان کی ترسیل بھی رک گئی۔ ویسے جرمن فوج میدان جنگ میں بظاہر کامیاب دکھائی دیتی تھی۔ شدید حملے کی صورت میں اسٹالن نے اپنی فوج کو جو ہدایت دے رکھی تھی اس پر عمل کرتے ہوئے جرمنوں نے جنگ کے ابتدائی چار مہینوں کے دوران تیس لاکھ روسیوں کو ہلاک کر ڈالا یا زندہ گرفتار کر لیا لیکن اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اگرچہ روس کے بے شمار افراد مارے گئے۔ سازوسامان کا نقصان ہوا اور اس کے لاکھوں مربع میل علاقے ہاتھوں سے نکل گئے، اس کے باوجود اسے شکست نصیب نہیں ہوئی۔ ماسکو پر قبضہ یا خود اسٹالن کی گرفتاری کے معنی یہ تو نہ تھے کہ وسیع و عریض ملک زیر نگیں آ گیا۔ المختصر یہ ایک وسیع جنگ تھی اور تیسری سلطنت جرمنی اپنی تمام تر کامرانیوں اور دفاعی صلاحیتوں کے باوجود اسے لڑنے کی اہل نہ تھی۔

کیا روس ماسکو کی دہلیز پر جرمن فوج کی یلغار سے بچ سکتا تھا یا دسمبر ۱۹۴۱ء میں سائبیریا پر جاپان کے شدید حملے کی تاب لا سکتا تھا، یہ ایک الگ معاملہ ہے جس پر قیاس کے گھوڑے تو دوڑائے جا سکتے ہیں لیکن جواب دینا کار دارد ہے۔ جاپان نے ستمبر ۱۹۴۰ء میں جرمنی اور اٹلی کے ساتھ سہ طرفہ معاہدہ کیا تھا۔ پھر اپریل ۱۹۴۱ء میں سوویت یونین اور جاپان کے درمیان غیر جانب داری کا معاہدہ عمل میں آیا تھا۔ اس طرح جاپان کو یہ امید تھی کہ وہ روس کی مزاحمت کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ بایں ہمہ جنوب کی جانب اپنے توسیعی اقدامات کو جاری بھی رکھ سکے گا۔ لیکن جب اہل جاپان کو یہ خبر ملی کہ جرمنی ماسکو کی جانب پیش قدمی

کر رہا ہے تو وہ روس کے ساتھ دوبارہ جنگ کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ اگر جاپانی فوج جنوبی سمت محاذ آرائی کی بجائے ایشیا میں اپنے روایتی دشمن پر حملہ کر دیتی تو صدر روزویلٹ کے لیے خاصا مشکل ہو جاتا کہ وہ امریکی عوام کو جنگ میں بھرپور شرکت کے لیے آمادہ کر سکتے۔ پھر برطانیہ روس کو مشرق بعید میں جو امداد دے رہا ہوتا وہ کم ہو جاتی۔ دوطرفہ ڈراؤنے محاذ پر سامنا کرنے کے برعکس اسٹالن نے ۱۹۴۱ء کے اواخر میں سائبیریا سے تجربہ کار اور سرد موسم جھیلنے والی آرمی کو بلا لیا تاکہ جرمنی کے جارحانہ عزائم کا قلع قمع کیا جا سکے اور پھر اس نے دشمن کو بھگا کر ہی دم لیا۔ بہرحال اگر ٹوکیو کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جنوبی سمت میں توسیع کا مقصد سراسر منطقی تھا۔ ادھر مغربی ممالک نے جاپان کے ساتھ تجارت پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور جولائی ۱۹۴۱ء میں اس کے اثاثے منجمد کر دیے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹوکیو نے فرانس کا انڈو چائنا کا علاقہ چھین لیا تھا۔ ان واقعات کو دیکھ کر بری اور بحری افواج نے پوری طرح یہ محسوس کر لیا کہ اگر اس نے امریکی سیاست دانوں کے مطالبے تسلیم نہ کیے یا جنوب مشرقی ایشیا کو بھیجے جانے والا تیل اور خام مال کو قبضے میں کر لیا تو چند ماہ میں اس کی اقتصادی تباہی لازمی ہے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۱ء سے روس کے ساتھ شمالی سمت میں محاذ آرائی ناممکن بن گئی، لیکن جنوبی محاذ پر جنگ ناگزیر ہو گئی۔ اس دوران جاپان کے رویے سے اہل امریکہ کو بری طرح صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے اپنے طور پر بورنیو، ملایا اور ولندیزیوں کے شرق الہند کی امداد شروع کر دی۔ نیز مغربی بحرالکاہل میں امریکیوں کی فوجی تنصیبات اور پرل ہاربر پر موجود ان کے بحری بیڑے کو بھی ملیامیٹ کرنا چاہا۔ جاپانی جرنیلوں نے محض چین کے واقعہ کی آڑ لے کر وسیع پیمانے پر فوجی کارروائی کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

دسمبر ۱۹۴۱ء میں عالمی جنگ نے ایک نیا پہلو اختیار کر لیا اسی مہینے روس نے ماسکو کے ارد گرد جوابی حملہ شروع کر دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ کم از کم اس علاقے میں تو جرمنی ناکام ہو چکا ہے اور اگرچہ بحرالکاہل کی جنگ کے ابتدائی چھ مہینوں میں جاپان کو مسلسل کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں اور وہ اتحادیوں کو زک پر زک پہنچاتا رہا تو اس سے یوں فرق نہیں پڑا کہ جو بھی علاقہ (چاہے سنگاپور ہو یا فلپائن) چھن گیا تو وہ فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے اتنی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جاپان کے اقدامات اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے خلاف ہٹلر کے اعلان جنگ نے دنیا کے سب سے طاقتور ملک کو محاذ آرائی میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ صنعتی پیداوار تنہا فوجی صلاحیت کی ضامن نہیں ہوا کرتی۔ پھر جرمنی کے حملہ آور ہونے کی تکنیک کا مدعا یہ رہا تھا کہ آدمی سے آدمی اور ڈالر سے ڈالر کا موازنہ ایک لایعنی سی بات ہے۔ لیکن "عظیم اتحاد" (جو چرچل کی پسندیدہ اصطلاح تھی) کے لحاظ سے جرمنی، اٹلی اور جاپان کے "اتحاد" سے کہیں زیادہ افضل و اعلیٰ تھا۔ اس کے صنعتی علاقے دشمنوں کی پہنچ سے بہت دور تھے۔ چنانچہ اسے اپنی فوجی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا وافر موقع مل گیا۔ ماضی میں فاشسٹ حکومتوں کے حملے سے تحفظ کے لیے ایسی فوجی صلاحیت کا تصور بھی کسی ملک نے نہیں کیا تھا۔ ڈی ٹوکویل نے ۱۸۳۵ء میں دو قطبی دنیا کے قائم ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ امریکی شخصیت کا مذکورہ خیال کہ آئندہ ایک سال کے اندر عملی جامہ پہنتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

دفاعی حکمت عملی اور اقتصادیات آج اور کل

۷

دو قطبی دنیا میں استحکام اور تبدیلی

۱۹۴۳ء --- ۱۹۸۰ء

جب جنگ میں امریکہ کے شامل ہونے کی خبر ونسٹن چرچل نے سنی تو اسے مسرت ہوئی اس کی نمایاں وجہ بھی تھی جیساکہ بعد میں اس نے اس کی وضاحت بھی کی تھی' "ہٹلر کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ مسولینی کی تقدیر بھی سر بہ مہر ہو گئی۔ رہ گئے جاپانی تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ بقیہ کام زبردست طاقت انجام دے لے گی" لیکن خود اعتمادی کی یہ بات ۱۹۴۲ء کے دوران اور ۱۹۴۳ء کے ابتدائی دنوں میں اتحادیوں کے بعض محتاط لوگوں کو بے وقت کی راگنی محسوس ہوئی تھی۔ پرل ہاربر کے واقعہ کے بعد متواتر چھ ماہ تک جاپانی فوجیں بحرالکاہل اور جنوب مشرقی ایشیاء میں دندناتی پھرتی رہیں اور یورپ کی نو آبادیاتی سلطنتوں کو تباہ و برباد کیے جاتی رہیں۔ انھوں نے جنوب کی سمت سے چین کا گھیراؤ کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستان' آسٹریلیا اور ہوائی کے لیے موجب خطرہ بن گئیں۔ ادھر روس اور جرمنی کے مابین جنگ کی صورت حال یہ تھی کہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے موسم سرما کو ختم ہوتے ہی جرمنی کی فوج نے پوری شدت کے ساتھ دوبارہ حملہ شروع کر دیا۔ پھر لڑائی کو کاؤکاس تک بڑھا دیا۔ ٹھیک انہی دنوں جرمنی کی مختصر ترین فوج رومیل کی سرکردگی میں شمالی افریقہ میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسکندریہ سے محض ۵۵ میل دور تک جا پہنچی۔ اتحادیوں کی کشتیاں جرمن آبدوزوں کا بری طرح نشانہ بن رہی تھیں۔ تباہ کن یوبوٹ کی زد میں آکر ۱۹۴۳ء کے موسم بہار میں تجارتی جہاز بری طرح تباہ و برباد ہوئے تھے۔ انگلستان اور امریکہ دونوں جرمنی کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کی خاطر بمباری پر بمباری کیے چلے جا رہے تھے' مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ الٹا ان کے طیارے کے عملے کو ہی جان کا نذرانہ دینا پڑ رہا تھا۔ اگر جرمنی اٹلی اور جاپان کی "اتحادی قوت" کے اختتام کا فیصلہ دسمبر ۱۹۴۱ء کے بعد معرض تحریر میں آ چکا تھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے اسے اس کا علم نہ تھا۔

زبردست طاقت کی کارکردگی

یہ امرواقعہ ہے کہ چرچل نے جو رائے قائم کی تھی وہ صائب تھی۔ یہ محاذ آرائی یورپ کی حدود سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر چھا گئی اور "جنگ عظیم" کا روپ اختیار کر گئی۔ اس طرح برطانیہ کی دفاعی شعبدہ بازی بقول مورخین اور بھی گھمبیر ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے سنگاپور محض اس لیے نکلا کہ اس نے اپنے لڑاکا طیارے اور تجربہ کار بری فوج بحیرہ روم کے محاذ پر تعینات کر رکھی تھی۔ پھر نئی متحارب قوتوں کے متحرک ہو جانے کے بعد طاقت کے توازن میں یکسر تبدیلی آ گئی۔ اس دوران جرمنی اور جاپان کی فوجیں فتوحات حاصل کیے چلی جا رہی تھیں۔ اگرچہ یہ میدان مار رہی تھیں' لیکن اتحادی فوجیں جس انداز سے لڑائی کی تیاری کر رہی تھیں ان سے نبرد آزما ہونا جرمنی اور جاپان کے بس کی بات نہ تھی۔

اس نوع کی پہلی کاروائی بحرالکاہل میں دیکھنے میں آئی۔ نمٹز کے لڑاکا بردار بحری جہاز نے مئی ۱۹۴۲ء میں بحرکورال کے علاقے میں جاپانیوں کی پیش قدمی روک دی تھی اور سمندر پر اپنی بالادستی ثابت کر دی تھی۔ سال کے اختتام پر جاپانی فوجیں گوادل کنال کے علاقے سے بے دخل کر دی گئی تھیں۔ ادھر آسٹریلیا اور امریکہ کی فوجیں نیوگنی کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ جب ۱۹۴۳ء کے اواخر میں بحرالکاہل کے وسطی علاقے میں جوابی حملے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت امریکہ کے دو طاقتور بحری بیڑے موجود تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے تیز رفتار ٹاسک فورس اور بااثر فضائیہ سرگرم عمل تھی۔ ادھر سلطنت برطانیہ کی کئی ڈویژن فوج نے اکتوبر ۱۹۴۲ء میں العالمین کے مقام پر جرمنی کے مورچے پر شدید حملہ کیا اور رومیل کے فوجی یونٹ کو تیونس کی جانب بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جب منٹگمری نے حملے کا حکم دیا تھا' اس وقت اس کے پاس دشمنوں کے مقابلے میں چھ گنا ٹینک' تین گنا فوجی دستے اور فضائی بالادستی حاصل تھی۔ اگلے مہینے آئزن ہاور کی برطانوی/ امریکی سپاہیوں پر مشتمل ایک لاکھ فوج شمالی افریقہ کے فرانسیسی علاقے پہنچ گئی۔ اس نے جرمنی اور اٹلی کی فوجوں کے خلاف مغربی سمت سے کاروائی شروع کر دی۔ چنانچہ مئی ۱۹۴۳ء میں دشمنوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اسی دوران ڈونٹز نے نہایت مجبور ہو کر شمالی بحراوقیانوس سے بھیڑیا صفت آبدوزیں واپس منگوا لیں۔ کیونکہ ان کشتیوں کو اتحادیوں کے جدید طرز کے "کنوائے" نے بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔ اتحادیوں کو یورپ کی حدود میں فضائی برتری حاصل کرنے میں کچھ وقت لگا تھا اور یہی صورت سمندری بالادستی کی تھی۔ چنانچہ اس کا حل مسینگ فائٹر کے ذریعے نکالا گیا جس کی ضرب کاری دور تک ہوتی تھی۔ اس نے دسمبر ۱۹۴۳ء میں امریکی طیاروں کے ساتھ اڑان کی۔ اگلے چند ماہ میں "لفٹ ویف" کی فوجی صلاحیت ماند پڑتی گئی۔ اب وہ تیسری سلطنت جرمانیہ کی فضائی نگرانی کرنے میں ناکام رہی تھی جس کی وجہ سے جرمن سپاہی کارخانے' شہری آبادی سب کچھ خطرے کی زد میں تھے۔

جرمنی کی فوجی ہائی کمان کے لیے نہایت تشویشناک بات یہ تھی کہ مشرقی محاذ پر حالات تبدیل ہو رہے تھے۔ اگست ۱۹۴۱ء میں بہت سے مبصرین نے یہ یقین کر لیا تھا کہ روس ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے قریب المرگ ہے۔ اس وقت جنرل ہالدر نے جنگ کی اسٹاف ڈائری میں یہ خیالات تحریر کیے تھے۔

> "ہمیں ابتدا میں دشمنوں کے ۲۰۰ ڈویژن کا سامنا تھا اب یہ تعداد ۳۶۰ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ سب ہمارے معیار کے مطابق نہ تو پوری طرح مسلح ہیں نہ ان کے پاس وافر فوجی سازوسامان ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم چند درجن روسی ڈویژن کو تباہ کر دیتے ہیں تو وہ اتنے ہی اور لے آتے ہیں۔ وقت ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ پھر وہ اپنے فوجی وسائل کے قریب تر ہیں' جبکہ ہم اپنے وطن سے دور ٹاپا کھاتے پھر رہے ہیں"

وسیع پیمانے پر ہونے والی اس خون ریز جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ پہلی جنگ عظیم کی ہلاکت اس کے مقابلے میں نہایت معمولی تھی۔ لڑائی کے ابتدائی پانچ ماہ کے دوران جرمنی نے تیس لاکھ سے زائد روسیوں کو ہلاک کرنے' زخمی کر ڈالنے اور زندہ گرفتار کر لینے کا دعویٰ کیا تھا۔ ان مخصوص حالات میں جبکہ اسٹالن اور استاوکا ماسکو کے اردگرد جوابی حملے کا منصوبہ بنا رہے تھے' سرخ فوج کے پاس اب بھی میدان جنگ میں لڑنے والے ۴۰۲ ملین سپاہی موجود تھے۔ واضح رہے کہ یہ فوج ٹینکوں اور

والا طیاروں کی جنگ میں خاصی مہارت رکھتی تھی۔ اس کے باوجود میدان اور فضا میں جرمن فوج کو جو پیشہ ورانہ مہارت حاصل تھی، سرخ فوج اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۹۴۳ء کے اواخر میں تو یہ صورت حال تھی کہ ایک جرمن سپاہی کے مقابلے میں پانچ چھ روسی سپاہی ہلاک ہو رہے تھے۔ اور جب ۴۲-۱۹۴۱ء کی شدید سردی کا موسم ختم ہو گیا تو ہٹلر نے دوبارہ جارحانہ حملہ شروع کر دیا۔ اس دفعہ اسٹالن گراڈ اس کا نشانہ تھا۔ پھر ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ اسٹالن گراڈ کو نشانہ بنانے کے بعد جرمن فوج نے ۱۹۴۳ء کے موسم گرما میں دوبارہ کاروائی شروع کی۔ اس نے اپنے سترہ ڈویژن یکجا کر کے کرسک کا محاصرہ کر لیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم کی سب سے خوفناک اور دہشت خیز ٹینکوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ اپنے ۳۴ ڈویژنوں کے ساتھ سرخ فوج میدان کارزار میں سرگرم ہو گئی۔ جرمنی کی ۲۷۰۰ فوجی گاڑیوں کے مقابلے میں اس کے پاس ۳۰۰۰ سواریاں تھیں۔ اگرچہ ایک ہفتے کے اندر نصف سے زیادہ سوویت ٹینک تباہ کر دیے گئے تھے، لیکن روسی فوج نے جنگ کے دوران ہٹلر کی "پینزر آرمی" کا خاصا حصہ تلف کر دیا تھا۔ اب وہ برلن پر جوابی حملہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ اسی دوران اٹلی میں اتحادی فوج کے اترنے کی خبر عام ہوئی۔ چنانچہ ہٹلر کو ایک اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا اور اس نے اپنی فوج کو تباہی سے بچانے کے لیے واپس بلا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جرمنی کے سب ہی دشمن اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

کیا یہ سب کچھ طاقتور فوج کا محض عملی اقدام تھا؟ یہ امر واقعہ ہے کہ فوجی کارکردگی پر اقتصادی طاقت کا ہی ہمیشہ عمل دخل نہیں رہا کرتا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کے دوران نہایت تکنیکی انداز میں ہونے والی جنگ عظیم کے زمانے میں بھی یہ نہیں رہا۔ کلاؤزوٹز کی رائے کے مطابق جنگ کے ساتھ اقتصادیات کا وہی رشتہ ہے جو شمشیر بنانے والے کا اپنے فن سے ہے۔ چنانچہ جرمنی اور جاپانی قیادت نے ۱۹۴۱ء کے بعد بے شمار سیاسی اور فوجی نوعیت کی غلطیاں کیں جن کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہ غلطیاں انھیں خاصی مہنگی پڑیں۔ جہاں تک جرمنی کا تعلق ہے ایسی غلطیوں کا سلسلہ چھوٹے پیمانے کے فوجی ڈویژنوں کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔ پھر ۱۹۴۳ء کے اوائل میں شمالی افریقہ میں نئی فوجی مہم کی روانگی اور سوویت یونین اور یوکرائن میں اقلیتوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک، حالانکہ وہ اسٹالن کے شکنجے سے بچ نکلنے پر خوش و خرم تھے کہ نازیوں کے سفاک چنگل میں پھنس گئے۔ پھر عورتوں کے اسلحہ کے کارخانوں میں ملازمت کا معاملہ تھا۔ یہ بات قدیم روایت کے خلاف تھی جسے بالآخر ختم کر دیا گیا۔ اس رویے سے جرمنی کے دشمنوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ خود جرمن فوج کے اعلیٰ عہدیداروں میں باہمی اختلافات تھے۔ وہ ہٹلر کے جنونی اقدامات سے سخت بدظن تھے، خصوصاً" اسٹالن گراڈ اور کرسک پر اس کے جارحانہ حملے سے! سب سے اہم بات یہ کہ بھانت بھانت کی وزارتیں اور محکمے تھے جن کے درمیان گمبھیر قسم کا اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کسی بھی مسئلے کے متعلق آپس میں رائے کا فقدان تھا اور وسائل کی دستیابی سوہان روح بن جاتی تھی۔ ایسے حالات میں اعلیٰ قسم کی فوجی حکمت عملی وضع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جنگ لڑنے کا یہ کوئی موزوں انداز تو نہ تھا۔

اگرچہ جاپانیوں کی دفاعی نوعیت کی غلطیاں اتنی سنگین نہ تھیں تاہم حیران کن ضرور تھیں۔ جاپان نے براعظم کی سطح پر حکمت عملی وضع کی تھی جس میں فوج کا عمل دخل خاصا وسیع تھا۔ اس کے باوجود بحرالکاہل جنوب مشرقی ایشیاء کے علاقے میں اس کی فوج کے کل گیارہ ڈویژن موجود تھے۔ اس کے مقابلے میں منچوریہ میں چھ اور چین میں بائیس ڈویژن فوج تعینات تھی۔ علاوہ ازیں مرکزی بحرالکاہل میں امریکہ جوابی

عظیم طاقتوں کا عروج و زوال

حملے میں مصروف تھا، لیکن جاپانی دستے اور ہوائی فوج اس علاقے میں نہایت قلیل تعداد میں موجود تھی۔ اس کے برعکس ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء کے دوران اس نے چین میں جارحانہ کاروائی کے لیے کہیں زیادہ وسائل استعمال کیے تھے۔ حیران کن معاملہ تو یہ تھا کہ جب ۱۹۴۵ء کے اوائل میں نمٹز کی فوجیں جاپان کا گھیرا تنگ کر رہی تھیں اور اس کے شہروں پر ہوائی حملے ہو رہے تھے، اس وقت جاپان کی دس لاکھ فوج تو چین میں تعینات تھی اور ۷۸۰۰۰۰ منچوریہ میں موجود تھی۔ اب انھیں واپس بلانا اس لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ امریکی سب میرین ہر طرف موثر کاروائیوں میں مصروف تھی۔

جاپان کی شاہی بحریہ کی غلطیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ بہت سی فوجی کاروائیاں نہایت غلط انداز میں کی گئی تھیں۔ اگرچہ اس کا طیارہ بردار بحری جہاز بحرالکاہل کی جنگ میں خاصی برتری قائم کر چکا تھا، لیکن یاماموتو کی موت کے بعد بہت سے جاپانی ایڈمرل ہنوز جنگی جہازوں سے چپکے ہوئے تھے اور یہ امید کر رہے تھے کہ تو سوشیما جیسی دوسری جنگ لڑنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ علاوہ ازیں جاپانی سب میرین اور اس کے خوفناک قسم کے تارپیڈو کا صحیح طریقے سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ حد تو یہ کہ جاپانی بحریہ خود اپنے ملک کے تجارتی جہازوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی وجہ دراصل اس کی فنی نوعیت کی خامیاں تھیں۔ حالانکہ جہاز سازی کے لیے جاپان، برطانیہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ صنعتی سامان درآمد کیا کرتا تھا۔ جنگی جہاز کی خامیوں کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ "یاماتو" جیسے بحری بیڑے کی تیاری پر بے شمار وسائل استعمال میں لائے گئے لیکن ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۳ء کے دوران جاپان نے تباہ کن قسم کے جہاز تیار نہیں کیے۔ حالانکہ امریکہ میں ایسے ۱۲۶ جہاز تیار کیے جا چکے تھے۔ نیز جنگ کے دوران جاپان سراغ رسانی، خفیہ پیغامات اور مذمت کرنے کے طریقے سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا۔ عظیم مشرقی ایشیا کے خطے کے وجود کے لیے یہ سب کچھ کرنا لازمی تھا۔ یہی غلطی جرمن قوم نے بھی کی تھی جب اس نے ہزار سالہ سلطنت جرمانیہ قائم کرنا چاہا تھا۔

بہرحال ان غلطیوں کے اسباب و عوامل کا پتہ لگانے کے لیے کوئی خاص کلیہ موجود نہیں۔ چنانچہ جرمنی، اٹلی اور جاپان کا اتحاد ثلاثہ کیا کچھ کارنامہ انجام دے چکا ہوتا۔ اگر اس سے یہ غلطیاں سرزد نہ ہوتیں، اگر اتحادی طاقتیں اپنے طور پر فوجی اور سیاسی نوعیت کی غلطیوں کا ارتکاب نہ کرتیں تو آگے چل کر ان کی صنعتی صلاحیت کیا کچھ کارنامہ انجام نہ دیتی۔ یہ بات واضح ہے کہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے ماسکو پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے جہاں روس کی حربی کوششوں کو نقصان پہنچا تھا وہاں اسٹالن کی حکومت پر بھی زد پڑی تھی۔ تو کیا ایسی صورت حال میں جب سوویت یونین کی آبادی کے مقدر کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا اس نے بے چوں و چرا شکست تسلیم کر لی تھی؟ آخر وہاں کے لوگ ایسا اقدام کیوں کرتے جبکہ مشرقی جانب ہزاروں میل پرے ان کی صنعتی اور فوجی یونٹ ہنوز موجود اور صحیح سالم تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسے "باربروسا آپریشن" کی وجہ سے وسیع پیمانے پر معاشی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کوئلہ کی پیداوار میں ۵۷ فی صد کمی آ گئی تھی، جبکہ کچے لوہے کی پیداواری شرح ۶۸ فی صد گھٹ گئی تھی۔ لیکن ان حقائق کے باوجود روس نے ۱۹۴۲ء میں جرمنی کے مقابلے میں ۴۰۰۰ لڑاکا طیارے زیادہ تیار کیے اور اگلے سال مزید دس ہزار تیار کر لیے۔ پھر یہ ساری تعداد صرف ایک محاذ کے لیے تھی جبکہ جرمنی کی تعداد تین محاذوں کے لیے مخصوص تھی۔ لڑائی کے دوسرے سال کے دوران سرخ فوج کو نفری ٹینکوں، توپوں اور لڑاکا طیاروں کی تعداد میں خاصی برتری حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ نقصانات برداشت کر لینے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتی تھی۔ نیز اس میں اکا دم

فہم تھا کہ وہ جرمن فوج کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ سکتی تھی۔ ۱۹۴۵ء کے اوائل میں یوکرائن جیسے کئی کئی محاذوں پر سوویت یونین کا پلہ بھاری تھا۔ اس کی افرادی قوت پانچ گنا زیادہ تھی۔ اسی طرح اسلحہ بھی پانچ گنا زیادہ' توپیں سات گنا زیادہ اور فضائی قوت بھی جرمنی کے مقابلے میں ستر گنا زیادہ تھی۔

چند ماہ قبل فرانس میں متعین انگلستان اور امریکہ کی مشترکہ فوجوں کو جرمن فوج پر خاصی بالادستی حاصل تھی۔ انھیں جرمنی کے ایک ٹینک کے مقابلے میں بیس ٹینک حاصل تھے جبکہ جرمنی کے ایک لڑاکا طیارے کے بالمقابل ۲۵ جہاز میسر تھے۔ اس کے باوجود یہ امر نہایت تعجب خیز ہے کہ جرمنی اتنی مدت تک نہایت کامیابی سے معرکہ آرا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۴ء کے اواخر میں جب جنگ اختتام کو پہنچ رہی تھی' جرمنی کے پاس مقبوضہ علاقے سلطنت جرمانیہ کے اپنے علاقے سے کہیں زیادہ تھے۔ یہی صورت حال ستمبر ۱۹۱۸ء میں بھی تھی۔ فوجی مورخین نے اس سوال کا یکساں جواب دیا ہے' یعنی جرمن فوج کے میدان جنگ میں لڑنے کا انداز' برطانوی' روسی اور امریکی فوجیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ والہانہ پرعزم اور پر جوش تھا۔ پھر جرمنی کے مجموعی لشکر کی کارکردگی کسی بھی ملک کی فوج کی کارکردگی سے کہیں افضل و اعلیٰ تھی۔ دوسرے یہ بات بھی تھی کہ فوج کے اسٹاف آفیسرز اور نان کمیشن آفیسرز' دونوں کا جذبہ اور تربیت اعلیٰ درجے کی تھی۔ یہ بات لڑائی کے اختتامی دور تک برقرار رہی تھی۔

جرمنی کی فوجی کاروائیاں اتنی اعلیٰ درجے کی ہیں کہ ان پر مسلسل کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔ مگر اس تعریف و تحسین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی دوسری غلطیوں سے صرف نظر کر لیا جائے۔ مثلاً یہ امر واقعہ ہے کہ ٹوکیو کی طرح برلن نے بھی خود کو بے طرح پھیلا دیا تھا۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں جنرل جوڈل کے تجزیے کے مطابق ۳ء۹ ملین جرمن سپاہی اور ۲۸۳۰۰۰ ہزار کے قریب اس کے اتحادیوں کے فوجی مشرقی محاذ پر ۵ء۵ ملین روسیوں کی پیش قدمی کو روکے ہوئے تھے۔ اسی طرح فن لینڈ میں ۱۷۷۰۰۰ اور ناروے اور ڈنمارک میں ۴۸۶۰۰۰ جرمنی کے فوجی دستے تعینات تھے۔ فرانس اور بیلجیم میں بھی تسلط قائم رکھنے کے لیے ۱۳۷۰۰۰۰ جرمن فوج موجود تھی۔ ادھر بلقان میں ۶۱۲۰۰۰ اور اٹلی میں ۴۱۲۰۰۰ جرمن سپاہی دھرنا دیے ہوئے تھے۔ غرض ہٹلر کی فوج یورپ میں ہر سمت پھیلی ہوئی تھی اور اس عالم میں کہ ہر محاذ پر دشمن کے مقابلے میں اس کی تعداد بھی کم تھی اور اس کے پاس جنگی سازوسامان کا بھی فقدان تھا۔ یہی بات جاپانی فوج کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ مشرق بعید میں برما سے الوتی جزائر تک تھوڑی تھوڑی تعداد میں پھیلی ہوئی تھی۔

مذکورہ فوجی کاروائیوں نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ ایسی صورت حال میں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اگر اتحادی فوجوں نے نہ سہی' جرمنی' اٹلی اور جاپان کے باہمی اشتراک نے ہی واقعات کا رخ موڑ دیا ہوتا۔ اگر مڈوے میں نمٹز کے ایک طیارہ بردار بحری جہاز کو نقصان پہنچتا تو اس کی جگہ اسی سال تین نئے جہاز آن موجود ہوتے۔ ساتھ ہی تین ہلکے پھلکے اور پندرہ محافظ بحری بیڑے بھی وہاں پہنچا دیے جاتے۔ جب ۱۹۴۳ء میں ایسی صورت حال پیدا ہوئی تھی پانچ بحری بیڑے' چھ ہلکے بحری بیڑے اور پچیس محافظ بیڑے آن کی آن میں مہیا کر دیے گئے تھے اور ۱۹۴۴ء میں تو یہ تعداد اور بھی بڑھ گئی تھی یعنی ۹ بحری بیڑے اور ۳۵ محافظ بیڑے نے ڈوبنے والے طیارہ بردار جہاز کی جگہ لے لی تھی۔ اسی طرح بحراوقیانوس کی جنگ میں ۱۹۴۲ء کے دوران اتحادیوں کے ۸ء۳ ملین ٹن وزنی جہاز اور ۱۹۴۳ء کے دوران ۳ ملین ٹن وزنی جہاز

تباہ و برباد کر دیے گئے تھے۔ لیکن جلد ہی ۷ ملین اور ۹ ملین ٹن وزنی تجارتی جہازوں کے ذریعے یہ کمی پوری کر دی گئی تھی۔ اس کی تمام تر وجہ امریکی جہاز سازی کی ترقی یافتہ صنعت تھی۔ ۱۹۴۳ء کے وسط میں وہاں ایسے بحری جہاز تیار کیے جا رہے تھے کہ جرمن آبدوز کشتیاں انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ چنانچہ ایک باثر شخصیت کو یہ تسلیم کرنا پڑا تھا: "دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی سب میرین کی کاروائی تو ختم کر دی گئی تھی' لیکن اس کا کوئی موثر نتیجہ برآمد نہیں ہوا"۔ اگر میدان جنگ کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یورپ میں دوسری جنگ عظیم سراسر بندوق اور توپ کی لڑائی کے مترادف تھی۔ لیکن اس معاملے میں جرمنی روس کے مقابلے میں پیچھے تھا۔ اول الذکر کے یہاں توپ کے کل پرزے بندوقیں اور ٹینک آخرالذکر کے مقابلے میں نہایت قلیل مقدار میں تیار ہو رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں اتحادیوں کے مجموعی اعداد و شمار کا ذکر ہی کیا۔ (دیکھیے جدول نمبر ۳۳)

جدول نمبر ۳۳: ۱۹۴۴ء میں ٹینک بنانے کی رفتار

جرمنی	۱۷۸۰۰
روس	۲۹۰۰۰
برطانیہ	۵۰۰۰
امریکہ	۱۷۵۰۰
	(۱۹۴۳ء میں: ۲۹۵۰۰)

لیکن لڑاکا طیارے بنانے کی رفتار زیادہ ہوش ربا رہی ہے' (دیکھیے جدول ۳۴) ہر کوئی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ جب تک فضائی بالادستی حاصل نہ ہو' بری اور بحری افواج کے لیے موثر کاروائی انجام دینا ممکن نہیں رہتا۔ فضائی طاقت کے بغیر نہ صرف جنگ میں فتح حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ دشمن کی اقتصادی حالت کو زیروزبر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جدول نمبر ۳۴: بڑی طاقتوں کے لڑاکا طیارہ بنانے کی رفتار
(۱۹۳۹ء --- ۱۹۴۵ء)

	۱۹۳۹ء	۱۹۴۰ء	۱۹۴۱ء	۱۹۴۲ء	۱۹۴۳ء	۱۹۴۴ء	۱۹۴۵ء
امریکہ	۵۸۵۶	۱۲۸۰۴	۲۶۲۷۷	۴۷۸۳۶	۸۵۸۹۸	۹۶۳۱۸	۴۹۷۶۱
روس	۱۰۳۸۲	۱۰۵۶۵	۱۵۷۳۵	۲۵۴۳۶	۳۴۹۰۰	۴۰۳۰۰	۲۰۹۰۰
برطانیہ	۷۹۴۰	۱۵۰۴۹	۲۰۰۹۴	۲۳۶۷۲	۲۶۲۶۳	۲۶۴۶۱	۱۲۰۷۰
برٹش کامن ویلتھ	۲۵۰	۱۱۰۰	۲۶۰۰	۴۵۷۵	۴۷۰۰	۴۵۷۵	۲۰۷۵
اتحادی (مجموعی)	۲۴۱۷۸	۳۹۵۱۸	۶۴۷۰۶	۱۰۱۵۱۹	۱۵۱۷۶۱	۱۶۷۶۵۴	۸۵۸۰۶
جرمنی	۸۲۹۵	۱۰۲۴۷	۱۱۷۷۶	۱۵۴۰۹	۲۸۸۰۷	۳۹۸۰۷	۷۵۴۰
جاپان	۴۴۶۷	۴۷۶۸	۵۰۸۸	۸۸۶۱	۱۶۶۹۳	۲۸۱۸۰	۱۱۰۶۶
اٹلی	۱۸۰۰	۱۸۰۰	۲۴۰۰	۲۴۰۰	۱۶۰۰	-	-
(مجموعی)	۱۴۵۶۲	۱۶۸۱۵	۱۹۲۶۴	۲۶۶۷۰	۴۷۱۰۰	۶۷۹۸۷	۱۸۶۰۶

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے یہ حقیقت واضح نہیں کہ انگلستان، امریکہ کے لڑاکا طیاروں کی مجموعی تعداد میں ۴ انجن والے وزنی بمبار جہاز بھی شامل ہیں یا نہیں چنانچہ انجنوں کی تعداد اور وزن کے تناسب سے اتحادیوں کو جرمنی، اٹلی اور جاپان کے اتحاد ثلاثہ پر فوقیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی فضائی طاقت کو مستحکم رکھنے کے باوجود جرمنی اس درجہ بے بس تھا کہ اس کے شہروں، کارخانوں اور ریلوے لائنوں پر اتحادی جہاز مسلسل بمباری کر رہے تھے۔ یہی صورت حال جاپان کی بھی تھی جو اتحادی طیاروں کے سامنے بالکل غیر محفوظ تھا۔ اتحادیوں کے بمبار طیاروں کی زد سے بچنے کے لیے ہی جرمن آبدوز کشتیاں سطح سمندر سے بہت نیچے چھپی رہتی تھیں اور یہاں کی نحیف و نزار فوج کو از سر نو چاق و چوبند کیا جا رہا تھا۔ امریکہ کے طیارہ بردار جہاز مغربی بحرالکاہل میں واقع جاپانی اڈوں پر مسلسل بمباری کر رہے تھے۔ اور جب اتحادی فوج کے راستے میں جرمن مزاحم ہوتے تو وہ اپنے لڑاکا طیاروں کو مدد کے لیے بلا لیتے۔ پھر تو دشمنوں کو صفایا ہو جاتا اور پیش قدمی جاری رہتی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وقت معینہ (۶ جون ۱۹۴۴ء) پر اتحادی فوج کے ۱۲۸۳۷ طیاروں کے مقابلے میں جرمنی اپنے ۳۱۹ لڑاکا جہاز ہی مغربی محاذ پر استعمال میں لا سکا تھا۔ یہاں کلاؤزوٹز کی یہ رائے دہرانی پڑے گی کہ فن جنگ کی طرح فن حرفت کے لیے بھی ہنر اور تجربے کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر محارب شخص کے پاس تلوار کا ذخیرہ نہ رہے تو پھر اس فن سے اسے کیا فائدہ؟ بہرحال شمشیر زنی کے میدان میں اتحادی فوجیں کامیابیاں حاصل کرتی چلی جا رہی تھیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جرمنی اور جاپان کی سلطنتوں کی توسیع کے بعد، ہر دو جانب اقتصادی اور پیداواری صلاحیتوں کا توازن پہلی جنگ عظیم کے مقابلے میں متزلزل تھا۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں جائزہ لے چکے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں عظیم جرمنی عالمی پیداوار میں ایک خصوصی حصے کا مالک تھا اور اس کی جنگی صلاحیت بھی اچھی خاصی تھی اور اس کی یہ دونوں خصوصیات برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ خوبیوں کے مساوی تھیں۔ لیکن برطانیہ اور فرانس کی سلطنتوں کے مجموعی وسائل اور دفاعی صلاحیتوں کے مقابلے میں جرمنی کی پوزیشن کمزور تھی۔ لیکن جب جنگ کا آغاز ہوا تو مذکورہ ممالک جرمنی کی طرح اتنے فعال نہ تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ فن حرب میں اتحادی اتنے آزمودہ کار اور مشاق نہ تھے۔ جب جرمنی نے ۱۹۳۹ء اور خصوصی طور پر ۱۹۴۰ء میں علاقے پر قبضہ کر لیا تو وہ چرچل کی زیر قیادت ملک سے کہیں آگے تھا۔ بہرحال فرانس کی شکست اور اٹلی کی جنگ میں شمولیت کے بعد فوجی لحاظ سے برطانیہ کی پوزیشن بہتر ہو گئی تھی۔ ویسے برلن اور روم کا اتحاد زمینی طور پر تو مستحکم تھا لیکن سمندروں پر اس کی پوزیشن کمزور تھی اور فضائی طاقت میں اسے مساوی درجہ حاصل تھا۔ ویسے برطانیہ نے یورپ کی بجائے شمالی افریقہ میں جنگ لڑنے کو ترجیح دی تھی۔ سوویت یونین پر جرمنی کے حملے سے طاقت کے توازن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ البتہ سرخ فوج کے سپاہی بری طرح ہلاک ہوئے تھے۔ اور اس تباہی میں مزید اضافہ روس کے علاقے کے ہاتھ سے نکل جانے اور پلانٹ کے نقصانات سے ہوا تھا۔

مذکورہ واقعات کے برعکس دسمبر ۱۹۴۱ء میں ہونے والی فیصلہ کن جنگ نے توازن کو یکسر متزلزل کر دیا۔ ماسکو پر روس کے جوابی حملے سے یہ بات واضح تھی کہ وہ بلٹزکریگ کی جنگ میں ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ ادھر جاپان اور امریکہ عالمی جنگ میں شامل ہو گئے تھے اور اس طرح ایک مضبوط صنعتی ملک "عظیم اتحاد" کا رکن بن گیا تھا۔ لیکن اس اقدام سے جنگی کاروائی پر فوری نوعیت کے اثرات اس لیے مرتب نہیں

ہوئے کہ جرمنی میں ابھی دم خم موجود تھا۔ پھر ۱۹۴۲ء کے موسم گرما میں اس نے روس پر دوبارہ حملہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ادھر جاپان کا مقابلہ امریکہ، ولندیز اور سلطنت برطانیہ کی ایسی افواج سے تھا جو پوری طرح تیار اور چوکس نہ تھیں۔ چنانچہ جنگ کے ابتدائی چھ مہینوں میں جاپان آسانی سے فتح پر فتح حاصل کرتا چلا گیا لیکن ان باتوں سے یہ حقائق مسخ نہیں ہو سکے تھے کہ اتحادیوں کی پیداواری صلاحیت دوگنا زیادہ تھی۔ ان کی جنگی استعداد تین گنا اور قومی آمدنی بھی تین گنا زیادہ تھی۔ اس میں فرانس کا جو حصہ تھا وہ جرمنی کے کل اعداد و شمار سے بھی زیادہ تھا۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں اس طاقت میں مزید اضافہ لڑاکا طیاروں، بندوقوں، ٹینکوں اور جنگی جہازوں کی تعداد میں اضافے سے ہو گیا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے مذکورہ برسوں میں امریکہ ہر روز ایک بحری جہاز تیار کر رہا تھا جبکہ ہر پانچ منٹ میں ایک لڑاکا طیارہ تیار ہو جاتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ اتحادی طاقتیں جدید طرز کے ہتھیار بنا رہی تھیں جبکہ جرمنی، اٹلی اور جاپان کا اتحاد ثلاثہ بہتر قسم کا ہتھیار تو بنا رہا تھا (مثلاً "جیٹ فائٹر" ٹائپ ۲۳ یوبوٹ) لیکن ان کی تعداد خاصی قلیل تھی۔

اہم محارب قوتیں جس رفتار سے اسلحہ تیار کر رہی تھیں ان کا اندازہ ویگن فر کے فراہم کردہ جدول سے ہو جاتا ہے۔ (دیکھیے جدول نمبر ۳۵)

جدول نمبر ۳۵: بڑی طاقتوں کے اسلحہ تیار کرنے کی رفتار

۱۹۳۰ء — ۱۹۴۳ء

(۱۹۴۴ء کے بلین ڈالر کے حساب سے)

	۱۹۴۰ء	۱۹۴۱ء	۱۹۴۳ء
برطانیہ	۳٫۵	۶٫۵	۱۱٫۱
روس	(۵)	۸٫۵	۱۳٫۹
امریکہ	(۱٫۵)	۴٫۵	۳۷٫۵
محارب اتحادیوں کی مجموعی تعداد	۳٫۵	۱۹٫۵	۶۲٫۵
جرمنی	۶	۶	۱۳٫۸
جاپان	(۱)	۲	۴٫۵
اٹلی	(۰٫۷۵)	۱	-
اتحاد ثلاثہ کی مجموعی تعداد	۶٫۷۵	۹	۱۸٫۳

گویا ۱۹۴۰ء میں برطانیہ میں اسلحہ کی تیاری کا گوشوارہ جرمنی کے مقابلے میں خاصا کم تھا۔ پھر بھی ترقی کی رفتار جاری تھی چنانچہ اگلے ہی سال اسلحہ بنانے کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی لیکن ۱۹۴۳ء میں اسٹالن گراڈ اور شمالی افریقہ کے فوجی حادثات کے تحت جرمنی میں اسلحہ تیار کرنے کی رفتار پھر خاصی تیز ہو گئی۔ جاپان میں بھی اسلحہ تیار کرنے کی رفتار دوگنی ہو گئی تھی۔ ان دو برسوں کے دوران برطانیہ اور روس میں

مجموعی طور پر جو اسلحے تیار ہوئے وہ اتحاد ثلاثہ کے حامل ملکوں کے اسلحے کے مساوی تھے۔ (برطانیہ/روس: ۲۰ بلین ڈالر تا ۱۹۴۳ء - ۱۹۴۳ء جرمنی' جاپان' اٹلی: ۹۸ء۸ بلین ڈالر) اس طرح ان تمام ممالک کو اسلحہ تیار کرنے میں بالادستی حاصل تھی۔ لیکن حیران کن تبدیلی اس وقت دیکھنے میں آئی جب ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۳ء کے دوران امریکہ میں آٹھ گنا زیادہ تعداد میں اسلحہ تیار کیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آخرالذکر سال میں اتحادیوں کی اسلحہ بنانے کی رفتار دشمنوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھی۔ اس طرح جنگی صلاحیت اور قومی آمدنی کے عدم توازن کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جنگ کے آخری مہینوں میں جرمن فوج نے مشرقی اور مغربی دونوں محاذوں پر نہایت ہوشیاری سے جوابی حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن اتحادیوں کے گولہ بارود کے سامنے بالآخر اسے سرنگوں ہو جانا پڑا۔ پھر تو ۱۹۴۵ء میں یہ نوبت آئی کہ انگلستان و امریکہ کے ہزاروں ہزار بمبار طیارے سلطنت جرمانیہ پر بم برسنے لگے۔ ادھر سرخ فوج کے سینکڑوں ڈویژن برلن اور ویانا کو تباہ و برباد کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہے تھے۔ ایک بار پھر یہ بات کہی جائے گی کہ پیچیدہ نوعیت کی اور مشترکہ طور پر لڑی جانے والی اس جنگ میں انہی ملکوں کو فتح نصیب ہوئی جو مالی طور پر مستحکم تھے۔

بحرالکاہل کی جنگ میں جاپان کی شکست کی وجہ بھی یہی کچھ تھی۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ۱۹۴۵ء میں ایٹم بم گرانے کا معاملہ دنیا کی فوجی تاریخ میں پن دھارا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اس شک و شبہ کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ یہ انسانیت اتنی حقیر و ذلیل ہو چکی ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کے ذریعے ایک دوسری جنگ عظیم کا آغاز کبھی نہ کبھی کر دے گی۔ بہرحال ۱۹۴۵ء کی محاذ آرائی کے دوران امریکہ نے یہ فوجی رویہ محض جاپانیوں کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ نیز امریکہ اپنی سب میرین کے استعمال سے جاپانیوں کو بھوکوں مرنے پر بھی مجبور کیے دے رہا تھا۔ پھر امریکی بمبار طیارے بی-۲۹ جاپان کے شہروں اور دیہاتوں پر بمباری کر کے ہر چیز خاک میں ملا رہے تھے۔ ۹ مارچ ۱۹۴۵ء کو ٹوکیو پر جس طرح آگ کے شعلے برسائے گئے اس کے نتیجے میں ۱۸۵۰۰۰ افراد لقمہ اجل بن گئے اور ۲۶۷۰۰۰ مکانات مسمار ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے منصوبہ ساز جاپان کے اندرونی حصے پر شدید حملہ کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ بعض لوگوں کے ذہنی تحفظات کے باوجود بالآخر "ایٹم بم" گرانے کا قطعی فیصلہ کر لیا گیا۔۔۔ اس کے پس پردہ مندرجہ ذیل محرکات کام کر رہے تھے۔ اتحادیوں کو جانی نقصانات سے محفوظ رکھنا تھا۔ اسٹالن کو دھمکی دینی تھی ایٹمی پراجیکٹ پر ہونے والے اخراجات کا جواز پیش کرنا تھا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو آج بھی موضوع بحث بنی ہوئی ہیں۔ لیکن یہاں یہ اہم نکتہ پیش کرنا ضروری ہے کہ اس وقت امریکہ ہی وہ واحد ملک تھا جو پیداواری صلاحیت اور تکنیکی لیاقت میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ وہی اس قابل تھا جس نے وسیع پیمانے پر نہ صرف روایتی قسم کی وہ جنگ لڑی تھی بلکہ جدید قسم کے ہتھیار بنانے کے سلسلے میں سائنس دانوں کو آمادہ کیا' خام مال فراہم کیے اور ۲ بلین ڈالر کی رقم بھی صرف کی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ہتھیار کام میں لائے جاتے یا نہ لائے جاتے۔ بہرحال ہیروشیما کی تباہی اور سرخ فوج کے ہاتھوں برلن کا زوال۔۔۔۔ یہ وہ دو عناصر ہیں جو آئندہ جنگ نہ ہونے کی علامت بن چکے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دنیا میں ایک نئے نظام کے معرض وجود میں آنے کی گواہی دے رہے ہیں۔

نئی فوجی حکمت عملی کا منظر نامہ

امریکہ کے فوجی منصوبہ سازوں نے نئے نظام کا خاکہ اسی وقت تیار کر لیا تھا جب جنگ پوری شدت سے لڑی جا رہی تھی۔ اس پالیسی پر مشتمل دستاویزات میں ایک جگہ یہ درج ہے:

> "ہمارے موجودہ دشمنوں کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کی کامیابی کے بعد ایک ایسی دنیا وجود میں آئے گی جو ملکی فوجی صلاحیت کے لحاظ سے بالکل ہی مختلف ہو گی۔ یہ تبدیلی گزشتہ پندرہ سو سال کے دوران ہونے والی تبدیلیوں کی مانند نہیں ہو گی بلکہ یہ دراصل زوال روم کے بعد معرض وجود میں آنے والی تبدیلی کی ہو بہو تصویر ہو گی۔۔۔۔۔۔ جاپان کی شکست کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین ہی دراصل صف اول کی دو فوجی طاقتیں ہوں گی اس کی وجہ ہر دو ملک کے جغرافیائی حدود اربعہ' وسعت اور بیکراں فوجی صلاحیت ہو گی"

اگرچہ مورخین اس بات پر بحث بہ جبیں ہوں گے کہ گزشتہ پندرہ سو سال میں ایسا کوئی معرکہ انجام نہیں پایا ہے جس کی مثال دی جائے' لیکن یہ بات تو طے ہے کہ جنگ کے بعد طاقت کا عالمی توازن گزشتہ دور کے برعکس بالکل بدل چکا تھا۔ فرانس اور اٹلی کی عظیم سابقہ طاقتیں روبہ زوال ہو چکی تھیں۔ جرمن قوم کا یورپ پر تسلط قائم کرنے کا خواب چکنا چور ہو رہا تھا۔ مشرق بعید اور بحرالکاہل کے علاقے میں جاپان کی حکمرانیت قائم کرنے کا جذبہ سرد پڑ چکا تھا۔ چرچل کی موجودگی کے باوجود برطانیہ میں وہ دم خم نہیں رہا تھا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں جس دو قطبی دنیا کی پیش گوئی کی جا رہی تھی وہ آخر وجود میں آ گئی۔ ڈیپورٹ کے بقول عالمی نظام اب تبدیل ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ امریکہ اور روس ہی اہمیت کے حامل رہ گئے ہیں اور ان دونوں میں امریکہ ہی سپر پاور کی حیثیت سے نمایاں تھا۔

مذکورہ حقیقت کی وجہ محض اتنی تھی کہ جہاں دنیا کے بقیہ ممالک جنگ کی وجہ سے تھک چکے تھے یا نو آبادیات کے معاملے میں پھنسے ہوئے تھے' امریکہ کی طاقت ۱۹۴۵ء میں بے حد زیادہ تھی۔ یہی صورت حال ۱۸۱۵ء میں برطانیہ کی تھی۔ تاہم امریکی طاقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اقتصادی حالات کو بہتر بنانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ مجموعی قومی پیداوار کی جو مالیت ۱۹۳۹ء میں ۸۸ء۶ بلین ڈالر تھی وہ ۱۹۴۵ء میں بڑھ کر ۱۳۵ بلین ڈالر ہو گئی اور فی الوقت تو یہ مالیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے یعنی ۲۲۰ بلین ڈالر۔ بہرحال اقتصادی بدحالی کو نیا معاہدہ دور کرنے میں ناکام رہا تھا۔ لیکن اب اس جانب بھرپور توجہ دی گئی۔ غیر استعمال شدہ وسائل اور افرادی قوت سے پوری طرح فائدہ اٹھایا گیا۔ جنگ کے دوران اندرون ملک صنعتی پلانٹ میں ۵۰ فی صد اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح مصنوعات میں بھی ۵۰ فی صد سے کچھ زیادہ اضافہ ہوا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء کے دوران ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صنعت کو حد سے زیادہ فروغ حاصل ہوا' یعنی یوں سمجھئے کہ سال میں ۱۵ فی صد اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی مثال نہ تو پہلے تھی اور نہ ہی اس کے بعد! اگرچہ اس صنعتی ترقی کی تمام تر وجہ جنگی ساز و سامان کی تیاری تھی (جو ۱۹۳۹ء میں فقط ۲ فی صد تھی اور ۱۹۴۳ء میں بڑھ کر ۴۰ فی صد ہو گئی) لیکن دیگر اشیائے صرف بھی خاصی مقدار میں بنائی جا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ میں عام آدمی کی ضروریات کی چیزیں تیار کرنے پر وہ

قدغن نہیں تھا جو دیگر متحارب ملکوں میں عائد تھا۔ امریکہ میں معیار زندگی دیگر ملکوں کے مقابلے میں خاصا بلند تھا۔ اس کی وجہ فی کس پیداوار کی بلند شرح تھی۔ بڑی طاقتوں کے درمیان امریکہ واحد ملک تھا جو جنگ کی وجہ سے غریب ہونے کی بجائے امیر ترین بن گیا۔ چنانچہ واشنگٹن میں ۲۰ بلین ڈالر کی مالیت کا طلائی ذخیرہ موجود تھا جو دنیا کے مجموعی سونے کے ذخائر (۳۳ بلین ڈالر) کا دو تہائی حصہ تھا۔ علاوہ ازیں دنیا کی مجموعی پیداوار کا نصف حصہ امریکہ کا مرہون منت تھا۔ چنانچہ دنیا کی جملہ اشیائے صرف کا تیسرا حصہ اس ملک میں تیار کیا جاتا تھا۔ انہی وجوہات کی بناء پر امریکہ جنگ کے اختتام کے فوراً" بعد اشیائے صرف کا بہت بڑا برآمد کنندہ بن گیا۔ پھر چند ہی سال بعد دنیا کی برآمدات کا ایک تہائی حصہ امریکہ کا دست نگر تھا۔ وہاں جہاز سازی میں بھی بے حد توسیع ہوئی تھی۔ چنانچہ دنیا میں مطلوبہ جہازوں کا نصف حصہ امریکہ مہیا کرتا تھا۔ غرض اقتصادی لحاظ سے پوری دنیا اس کے زیر نگیں تھی۔

یہی معاشی استحکام امریکہ کی فوجی طاقت کا مظہر بھی تھا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام کے وقت اس کی فوج میں ۱۲.۵ ملین فوجی کام کر رہے تھے ان میں سمندر پار ملکوں میں تعینات فوجی ملازمین کی تعداد (۷.۵ ملین) بھی شامل تھی۔ لیکن حالت امن میں اس تعداد میں کمی آ گئی۔ ۱۹۴۸ء میں فوجی ملازمین کی تعداد چار سال قبل کے مقابلے میں گھٹ کر صرف نواں حصہ رہ گئی تھی۔ یہ سیاسی حالات کا نتیجہ تھا نہ کہ فوجی صلاحیتوں کا جنگ کے اختتام کے فوراً" بعد سمندر پار ملکوں میں امریکہ کی کارکردگی محدود ہو گئی تھی۔ لیکن جدید قسم کے ہتھیاروں میں اس کی بالادستی سبھی ملکوں میں مسلّم تھی۔ ان دنوں امریکی بحریہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ بارہ ہزار اہم جنگی جہازوں پر مشتمل امریکی بیڑا برطانیہ کے شاہی بیڑے سے کہیں عظیم تھا۔ اس کے مقابلے میں کسی اور بحری طاقت کا وجود نہ تھا۔ اپنے طاقتور بحری بیڑوں کی بدولت امریکہ اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ دنیا میں کہیں بھی اپنی استعداد کا لوہا منوا لیتا۔ پھر امریکی فضائیہ کا کیا کہنا۔ اس کے پاس دو ہزار سے کہیں زیادہ وہ بمبار جہاز تھے جنہوں نے ہٹلر کے یورپ پر گولے برسائے تھے۔ پھر دور تک مار کرنے والے بی۔۲۹ جنگی جہاز تھے۔ جنہوں نے جاپان کے کئی شہروں کو نیست و نابود کر دیا۔ علاوہ ازیں بی۔۳۶ جیسے بمبار جہاز بھی تھے جن کی حربی کارکردگی نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ امریکہ کے پاس ایٹم بم تھے۔ انہیں ہیروشیما اور ناگا ساکی کی طرح دشمن کے کسی بھی علاقے کو تہہ و بالا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بعد کے تجربے سے یہ حقائق ثابت ہوئے کہ امریکہ کی فوجی صلاحیت اتنی نہ تھی جتنی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی تحویل میں چند ہی ایٹم بم تھے۔ پھر ان کے گرانے میں سیاسی قباحتیں تھیں۔ پھر روس جیسے دور دراز واقع ملک کو متاثر اور مرعوب کرنے کے لیے اس کا استعمال اتنا آسان نہ تھا۔ لیکن امریکہ کا یہ فوجی رعب داب قائم رہا تا آنکہ کوریا کی جنگ برپا ہو گئی۔ اور اس کے پس پردہ کئی ممالک امریکہ سے قرض لینے ہتھیار حاصل کرنے اور فوجی اعانت طلب کرنے کی درخواست کر چکے تھے۔

امریکہ کو غیر معمولی قسم کی اقتصادی اور فوجی صلاحیت حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے بعد اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے اس نے جس جذبے کا مظاہرہ کیا تھا وہ حیران کن بات نہ تھی ایسا واقعہ تو عالمی سیاست کی تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔ چونکہ روایتی قسم کی بڑی طاقتیں روبہ زوال ہو رہی تھیں لہذا امریکہ ان کی جگہ پر کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ اب یہ ملک صف اول میں تھا۔ لہذا اس کی کارکردگی کا دائرہ اپنے سواحل اور اپنے کرے تک محدود نہیں رہ سکا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ امریکہ کی طاقت اور اثرات کو فروغ دینے میں جنگ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر محاذ آرائی کے نتیجے میں ہی

۱۹۴۵ء کے دوران امریکی فوج کے ۶۹ ڈویژن یورپ میں ۲۶ ڈویژن ایشیا میں اور بحرالکاہل کے علاقے میں تعینات کیے گئے تھے۔ لیکن خود براعظم امریکہ میں ایک ڈویژن فوج بھی نہ تھی۔ یہ فوجی اقدام محض اس لیے کیا گیا تھا کہ امریکہ سیاسی طور پر جاپان، جرمنی اور آسٹریا کو زیر دام لانے کا پابند تھا۔ گویا اب امریکہ اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر کثیر فوج کے ساتھ ان علاقوں میں موجود تھا۔ پھر جزائر برطانیہ کے ساتھ مل کر اس ملک نے بحرالکاہل، شمالی افریقہ، اٹلی اور مغربی یورپ میں محاذ آرائی میں شرکت کی تھی۔ لہذا ان مذکورہ علاقوں میں بھی امریکی فوج موجود تھی۔ تاہم بہت سے امریکی جن میں فوجی جوان شامل تھے، یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ جلد ہی وطن واپس چلے جائیں گے۔ نیز بری فوج کے سپاہی ۱۹۴۱ء سے قبل کی پوزیشن سنبھال لیں گے، اگرچہ اس خیال سے چرچل جیسی ذہنیت کے لوگ چونک اٹھے اور ری پبلک پارٹی والوں کو یہ بات بھلی لگی لیکن اس تصور کو عملی جامہ پہنانا اب خاصا مشکل ہو چکا تھا۔ گھڑی کی سوئی کو پیچھے لے جانا ممکن تو نہ تھا۔ جس طرح ۱۸۱۵ء کے بعد برطانیہ کے ساتھ معاملہ پیش آیا تھا۔ اب بعینہ امریکہ کے ساتھ بھی پیش آ رہا تھا۔ یعنی اس نے مختلف ملکوں میں اپنے پاؤں پھیلا دیئے تھے اور اس طرح بے شمار مصیبتیں پال لی تھیں۔ اہل برطانیہ کی طرح جب بھی امریکی عوام نئے خطوط کھینچ کر کارکردگی کا مظاہرہ کرنا چاہتے نت نئے مصائب کی سرحد وا ہو جاتی۔ بہرحال امن امریکہ کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔

اس نئے نظام کے اقتصادی پہلو کے متعلق کچھ نہ کچھ آگاہی ہو چکی تھی۔ بین الاقوامی موضوعات کے ماہر کورڈل ہل نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں جو عالمی بحران پایا جاتا تھا اور جنگ کے جو بھیانک نتائج سامنے آ رہے تھے۔ ان تمام حقائق کی وجہ دراصل یہ تھی کہ عالمی معیشت کو غلط طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ یعنی ٹارف کو حد سے زیادہ تحفظ دیا گیا تھا۔ اقتصادی مسابقت سراسر نامناسب تھی، تمام مال تک رسائی ممکن نہ تھی اور حکومت خود کفالتی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے اس خوشگوار تصور کو کہ "تجارت کو امن کی حالت میں فروغ حاصل ہوتا ہے" میں قدیم طرز کے صنعت کاروں کی تشویش بھی شامل ہو گئی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ مابعد جنگ کے مندی کے رجحان سے امریکی حکومت کے اخراجات میں کمی آ جائے گی۔ اس کا ازالہ اسی وقت ہو سکے گا جب سمندر پار ملکوں میں نئی منڈیاں تلاش کی جائیں اور امریکی مصنوعات کو وہاں بہ طرز احسن کھپایا جائے۔ اسی دوران فوج کے شعبے نے یہ تشویش ظاہر کر دی کہ فوجی نوعیت کی اہم اشیاء مثلاً" تیل، ربڑ اور تانبے کے لین دین پر حکومت کا کنٹرول قائم ہونا چاہئے۔ غرض ان تمام اسباب و عوامل کے نتیجے میں امریکہ نے ایک نئے نظام کی تشکیل کی ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ تجویز مغربی سرمایہ داروں کے لیے کافی مفید ثابت ہوئی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ دار اور ترقی پذیر ریاستوں کے لیے یہ نظام طویل المیعاد سطح پر بے حد سود مند قرار پایا۔ آدم اسمتھ نے یقین دہانی کرائی تھی کہ "وسائل کی تقسیم جتنی موثر ہو گی اور تجارت جتنی کارگر ٹھہرے گی پیداوار میں اتنا ہی اضافہ ہو گا۔ نتیجتاً" ہر شخص کی قوت خرید بڑھ جائے گی" چنانچہ ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۶ء کے دوران بین الاقوامی نوعیت کے بینکنگ روبہ عمل آئے مثلاً" انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ (آئی ایم ایف) کا ادارہ وجود میں آیا۔ ترقی و تعمیر کا بین الاقوامی بینک قائم کیا گیا۔ بعد ازاں ٹارف اور تجارت کے ضمن میں ایک عام معاہدہ طے پایا۔ جو ممالک ان اقتصادی اقدامات کے تحت تعمیر و ترقی کے لیے رقم مخصوص کرانا چاہتے تھے وہ امریکہ کے مطالبات کے مد نظر حل پذیر کرنسی اور مکمل مسابقت کے لیے تیار ہو گئے۔ اہل برطانیہ نے بھی شاہی ترجیحات کے باوجود اس پر عمل کیا تھا۔ پھر روسیوں کی طرح اس سارے سسٹم کو واضح اور اچھے طور پر سمجھا گیا تھا۔

اس نوع کے پیکج کی پہلی خرابی یہ تھی کہ چھ سال کے عرصے پر محیط جنگ عظیم سے جو نقصانات ہوئے تھے ان کی تلافی کے لیے رقم ناکافی تھی۔ دوسرے سرکاری عدم مداخلت کی وجہ سے وہ ملک خاصے فائدے میں تھے جنہیں مسابقت کی پوزیشن حاصل تھی۔ اس معاملے میں امریکہ یوں فائدے میں تھا کہ اسے جنگ کے نقصانات برداشت نہیں کرنے پڑے تھے۔ نیز اس کی پیداواری صلاحیت نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ پھر وہ ممالک جو مسابقت کرنے کی بہتر پوزیشن میں نہیں تھے ان کے لیے سوائے محرومی کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ وہ ممالک تھے جو جنگ کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے' جن کی سرحدیں کچھ کی کچھ ہو گئیں' جہاں مہاجرین کا جم غفیر تھا' جہاں جلے ہوئے مکانات کے ملبے تھے' جہاں مشینیں جل کر خاک ہو گئی تھیں' جن پر قرض کا انبار تھا اور جن کی منڈیاں ویران ہو چکی تھیں۔ آگے چل کر جب امریکہ کو احساس ہوا کہ یورپ میں سماجی اضطراب وسیع پیمانے پر جنم لے رہا ہے اور روس کا اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے تو ان دو خطرات کے مد نظر اس نے مارشل پلان تیار کیا اور "آزاد دنیا" میں صنعتی ترقی کی خاطر رقم مہیا کی۔ بہرکیف ان دنوں امریکہ کے اقتصادی اثرات پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تمام دنیا میں اپنے فوجی اڈے قائم کر رہا تھا اور تحفظ کے حصول کے لیے معاہدے بھی کیے جا رہا تھا۔ امریکہ کا یہ رویہ برطانیہ ہی کی طرح کا تھا۔ وہ بھی ۱۸۱۵ء کے بعد یہی کچھ کرتا رہا تھا۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ برطانیہ دیگر ملکوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے سے گریزاں رہا تھا جبکہ امریکہ یہی سب کام انجام دے رہا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ امریکہ کے یہ سارے اقدامات سرد جنگ سے پیدا شدہ حالات کا نتیجہ تھے۔ اس حقیقت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ اپنی قدیم تاریخ کے برعکس امریکہ نے دنیا میں ہر طرف اپنے آپ کو ملوث کر لیا تھا۔

۱۹۴۵ء کے امریکی منصوبہ سازوں کو مذکورہ باتوں کی چنداں فکر نہیں تھی۔ ان میں بعض ایسے تھے جو اس نوع کے اقدامات کو عظمت و سربلندی کا پیش خیمہ قرار دیتے تھے۔ بایں ہمہ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو فریضہ بڑی طاقتیں انجام نہ دے سکیں' انہیں پورا کرنے کا سنہری موقع امریکہ کو میسر آیا ہے۔ لائف میگزین کے ہنری لیوس نے فخریہ انداز میں کہا تھا:

"امریکیوں کا تجربہ مستقبل کی کلید ہے۔ قوموں کی برادری میں امریکہ کو بڑے بھائی کا درجہ ملنا چاہیے۔"

چین سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن وہ بھی تیسری دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح امریکہ کا رطب اللسان بن گیا۔ اپنی مدد آپ کے امریکی نظریے' کارانداوزی' آزاد تجارت اور جمہوریت کا سبھی دم بھرنے لگے حتیٰ کہ کورڈل ہل جیسی شخصیت نے بہ بانگ دہل یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ تمام اصول اور منصوبے نہایت سودمند اور انصاف کے نقطہ نظر سے نہایت موثر ہیں جن سے ہر علاقے کے آزاد طبع لوگوں کے حقوق اور زندگی کی ضمانت ملتی ہے۔ چنانچہ چند برسوں کے اندر اندر تمام روئے عالم میں ہر کام نہایت تسلی بخش طور پر انجام پائے گا۔ کون ایسا کور چشم ہو گا جو ان حقائق کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ قدیم وضع کے برطانوی اور ولندیزی شہنشاہ ہوں' یورپ کے بائیں بازو کے سیاست داں ہوں یا اداس چہرے والا مولوتوف ہو------ یہ سب ہی "چھڑی اور گاجر" کے زیر اثر امریکہ کا گن گا رہے تھے۔ ایک امریکی افسر نے تو یہاں تک کہا تھا "اب ایشیا میں بلے سے کھیلنے کی ہماری باری ہے" بلکہ درحقیقت اسے تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اب دنیا میں ہر جگہ ہمارے کھیل کی باری ہے۔

البتہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں امریکہ کی دال نہیں گلتی تھی۔ اور وہ تھا سوویت یونین! وہ واحد ملک تھا جو ۱۹۴۵ء میں اور اس کے بعد بھی یہ دعویٰ کرتا رہا کہ فاشزم کے خلاف لڑائی میں وہی فاتح رہا ہے۔ سرخ فوج کے اعداد و شمار کے مطابق روس نے جرمن فوج کے ۵۰۶ ڈویژن تباہ و برباد کر دیے تھے۔ نیز دوسری جنگ عظیم میں اس کے ہاتھوں ۱۳ء۶ ملین جرمن باشندے ہلاک ہوئے یا قید کر لیے گئے۔ روسی فوج کے ہاتھوں صرف مشرقی محاذ پر دس ملین جرمن سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ تیسری سلطنت جرمانیہ ابھی روبہ زوال نہیں ہوئی تھی کہ اسٹالن درجنوں فوجی ڈویژن مشرق بعید روانہ کر رہا تھا۔ وہ منچوریہ میں مقیم جاپان کی کو آن تنگ فوج پر دھاوا کرنے کی تیاری مکمل کر چکا تھا------ اور یہ کام ہیروشیما کے واقعہ کے تیسرے روز انجام پا گیا تھا۔ مغربی محاذ پر روس نے جس شدت سے حملے کیے تھے وہ ۱۹۱۷ء کے بعد ہونے والے ناقص اور کمزور حملوں سے کہیں زیادہ موثر تھے۔ وسطی یورپ کے مشرقی حصے میں اس کی فوج نے اہم پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ روس کی سرحدیں پھیل چکی تھیں۔ شمال میں فن لینڈ پر قبضے کے بعد روسی علاقہ وسیع ہو گیا تھا۔ یہی صورت حال وسطی علاقے میں پولینڈ کو زیر نگیں کرنے کے بعد ہوئی تھی۔ ادھر جنوب میں رومانیہ پر تسلط قائم کرنے کے بعد بسارابیا بھی دوبارہ حاصل ہو چکا تھا۔ بالٹک کی ریاستیں ایستونیا' لٹویا اور لتھونیا روس میں ضم کر دی گئی تھیں۔ مشرقی پروشیا کا ایک حصہ اور مشرقی چیکوسلوواکیہ کے کچھ ٹکڑے بھی روسی سلطنت کی حدود میں شامل کر دیے گئے تھے۔ اس طرح ہنگری تک روس کی براہ راست رسائی ہو گئی۔ گویا مغرب اور جنوب مغربی سمت میں روس کی سلطنت کچھ اس طرح پھیل چکی تھی کہ پولینڈ' مشرقی جرمنی' چیکوسلوواکیہ' ہنگری' رومانیہ' بلغاریہ' یوگوسلاویہ اور البانیہ جیسی طفیلی ریاستیں اس کے زیر سایہ آ چکی تھیں۔ اس طرح ان ریاستوں اور مغرب کے درمیان "فولادی پردہ" حائل ہو چکا تھا۔ اس کے پس پردہ کمیونسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا اور خفیہ پولیس اس تمام علاقے کو اپنے نظریے کے تابع چاہتی تھی۔ اب کورڈل ہل کی ساری امیدیں خاک میں مل چکی تھیں۔ یہی صورت حال مشرق بعید میں بھی تھی۔ وہاں منچوریہ' شمالی کوریا اور سخالن پر قبضہ کر کے نہ صرف ۵-۱۹۰۴ء کی جنگ کا بدلہ لیا گیا تھا بلکہ ماؤ کے چینی کمیونسٹوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی جو عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کے نظریے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اگرچہ روس کے یہ بڑھتے ہوئے اثرات خیرہ کن معلوم ہو رہے تھے' لیکن اس کی اقتصادی حالت جنگ کی وجہ سے خاصی ابتر ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس امریکی معیشت روزافزوں ترقی کر رہی تھی کہ وہ جنگی اثرات سے محفوظ رہی تھی۔ روس کی آبادی کو بھی بری طرح نقصان پہنچا تھا۔ بری فوج کے ۷ء۵ ملین فوجی جوان ہلاک ہوئے تھے۔ ۶ سے ۸ ملین شہری جرمن فوج کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ پھر جنگ کے بالواسطہ اثرات کے نتیجے میں بھی انسانی جانیں تباہ ہوئی تھیں۔ مثلاً" غذائی قلت' جبراً" مزدوری' کام کا طویل دورانیہ غرض اس طرح ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء کے دوران ۲۰ سے ۲۵ ملین روسی شہری غیر فطری موت مر گئے تھے۔ چونکہ مرد زیادہ تعداد میں ہلاک ہوئے تھے' لہٰذا جنسی عدم توازن کی وجہ سے سماجی ہیئت بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ نتیجتاً" شرح پیدائش میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں جو مالی نقصانات مختلف علاقوں میں وقوع پذیر ہوئے وہ اس قدر زیادہ تھے کہ انسانی ذہن ان کا احاطہ بھی نہیں کر سکتا۔ ایک مورخ کے بقول:

"مقبوضہ علاقے میں ۱۱ء۶ ملین گھوڑے پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے

> ۷ ملین ہلاک کر دیے گئے یا پکڑ لے گئے۔ تیس ملین خنزیروں میں سے ۲۰ ملین کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۱۳۷۰۰۰ ٹریکٹرز' ۴۹۰۰۰ گودام' گئوشالے اور دیگر عمارتیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ مواصلاتی نظام جس طرح تباہ ہوا اس کا اندازہ یوں لگائیں: ۶۵۰۰۰ کلو میٹر ریلوے لائن تباہ و برباد ہو گئی۔ ۱۵۸۰۰ انجن ناکارہ ہو گئے۔ ۴۲۸۰۰۰ ویگنیں تس نہس ہو گئیں۔ ۴۲۸۰ کشتیاں غرقاب کر دی گئیں۔ نصف سے زیادہ ریلوے پل اڑا دیے گئے۔ مقبوضہ علاقے میں شہروں کے تقریباً" ۱۰۲ ملین مکانات اور دیہات کے ۳۰۵ ملین گھر اجاڑ دیے گئے۔ بے شمار شہر ویران کر دیے گئے۔ ہزاروں دیہات نیست و نابود ہو گئے۔ لوگ زمین میں سوراخ کھود کر رہنے پر مجبور ہو گئے۔"

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ جب روسی فوج جرمنی میں قبضہ کیے ہوئے علاقے میں داخل ہوئی تو وہاں کی تمام منقولہ جائیداد کو سمیٹنے لگی۔ مثلاً" فیکٹری کی مشینیں' ریلوے لائن وغیرہ علاوہ ازیں مشرقی یورپ کے مقبوضہ علاقوں سے تاوان ادا کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ اس ضمن میں رومانیہ سے تیل' فن لینڈ سے عمارت بنانے کی لکڑی اور پولینڈ سے کوئلہ حاصل کیا گیا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ سوویت یونین نے اسلحہ کی جنگ میں عظیم جرمنی کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ نیز محاذ پر بھی اسے شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ لیکن روس نے یہ سارا کارنامہ جنگی سازوسامان بنانے پر بھرپور توجہ دے کر ہی انجام دیا تھا۔ جبکہ دوسرے شعبے توجہ سے یکسر محروم رہے۔۔۔ مثلاً" اشیائے صرف' خوردہ فروشی اور غذائی فراہمی (اگرچہ جرمنی کی غارت گری کی وجہ سے زرعی پیداوار بے حد کم ہو گئی تھی) بہرحال کہنا یہ ہے کہ ۱۹۴۵ء میں روس فوجی لحاظ سے نہایت قد آور ضرور تھا' لیکن ساتھ ہی ساتھ اقتصادی طور پر بے حد کمزور اور غیر متوازن بھی ہوا تھا۔ وہاں قرض پٹہ کا معاملہ ختم کر دیا گیا تھا۔ پھر سیاسی اختلافات کی وجہ سے امریکی رقم لینے سے بھی انکار کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ روسی حکومت نے اپنے ۱۹۲۸ء کے پروگرام کی طرف مراجعت کی اور اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر معیشت کو بہتر بنانے کے اقدامات کیے۔ اسی طرح بھاری مشینیں' کوئلہ' بجلی' سیمنٹ جیسی مصنوعات پر بھی بھرپور توجہ دی گئی۔ نیز اشیائے صرف اور زرعی پیداوار کی ترسیل کے لیے ٹرانسپورٹ کو بھی فروغ دیا گیا۔ دفاعی اخراجات میں خاصی کمی کر دی گئی۔ اگرچہ ان اقدامات کے شروع میں دقتیں حائل رہیں' لیکن جلد ہی چھوٹے پیمانے پر اقتصادی معجزہ ظہور میں آ گیا۔ جہاں تک بھاری صنعتوں کا تعلق تھا' ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران ان کی پیداوار میں دو گنا کا اضافہ ہو گیا۔ اسٹالن کی حکومت ملکی معیشت کو فروغ دینے کے لیے پوری طرح کوشاں تھی۔ لیکن اس ضمن میں اسے نہ تو کسی مسئلے کا سامنا تھا نہ ہی عوام کے معیار زندگی کو انقلاب سے پہلے کی سطح پر لا کر کم کرنا چاہتی تھی۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ ۱۹۲۲ء کے بعد ہونے والی ترقی کی طرح اس بار بھی یہی کوشش تھی کہ صنعتی پیداوار کو جنگ سے پہلے کی پوزیشن میں لایا جائے اور مزید فروغ دیا جائے۔ مثال کے طور پر یوکرائن میں خام دھات کو صاف کرنے اور بجلی کی مصنوعات بنانے کی رفتار ۱۹۴۰ء کے مقابلے میں ۱۹۵۰ء میں کہیں زیادہ بڑھ

گئی تھی۔ یہ بات ایک بار پھر کہی جائے گی کہ جنگ کی وجہ سے روس اقتصادی ترقی میں ایک دہائی پیچھے چلا گیا تھا۔ سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ زرعی شعبے میں بھی مسلسل خسارہ ہو رہا تھا۔ جنگ کے دوران ایمرجنسی کے نفاذ اور سرمایہ کاری کے غلط استعمال کی وجہ سے زراعت میں ترقی نہیں ہو سکی تھی۔ پھر کسان ذاتی زمین کی جو طلب رکھتے تھے اسے اسٹالن اپنی موت تک نظر انداز کرتا رہا۔ چنانچہ ان اسباب و عوامل کی وجہ سے زرعی پیداوار میں کمی آتی رہی اور اس شعبے کی کارکردگی بھی غیر تسلی بخش رہی۔

جنگ کے بعد کے دنوں میں اسٹالن دفاعی تحفظ قائم رکھنے میں زیادہ کوشاں نظر آتا تھا۔ اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی غرض سے ۱۹۴۵ء کے بعد سرخ فوج کی تعداد میں دو تہائی کمی کر دی گئی۔ اس وقت بھی اس میں ۱۷۵ ڈویژن' ۲۵ ہزار ٹینک اور انیس ہزار لڑاکا طیارے تھے۔ چنانچہ دنیا کی بڑی فوج میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ سوویت یونین کی نظر میں اس کی اہمیت یوں تھی کہ آئندہ کوئی حملہ ہو تو اس کی مزاحمت کی جا سکے۔ نیز یورپ میں طفیلی ریاستوں کو اس فوج کے ذریعے کنٹرول کیا جا سکے اور مشرق بعید کی مقبوضات پر تسلط برقرار رکھا جا سکے۔ اگرچہ یہ بہت بڑی فوج تھی لیکن اس کے بہت سے ڈویژن خاصے کمزور سے تھے۔ پھر ان میں محافظ دستے بھی شامل تھے۔ پھر اس میں ایک عیب یہ بھی تھا کہ جب فوج پیش قدمی کرتی تو بہت سے حصے آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے فوج کے ڈویژن کی از سر نو تنظیم کی جاتی۔ نیز اسلحے کی فراہمی کے لیے معاشی اور سائنسی وسائل کام میں لائے جاتے۔ چنانچہ ۸-۱۹۴۷ء میں مگ-۱۵ لڑاکا جیٹ باقاعدہ کام کرنے لگا تھا۔ پھر امریکی اور برطانیہ کی نقل کرتے ہوئے دور تک مار کرنے والی فضائیہ بھی تیار کر لی گئی تھی۔ جرمنی کے گرفتار شدہ سائنس دانوں اور تکنیکی ماہرین سے میزائل بھی تیار کروائے گئے تھے۔ حتیٰ کہ دوران جنگ روس نے ایٹم بم بنانے کے لیے وسائل بھی مختص کر دیے تھے۔ روسی بحریہ جو جرمنی کے ساتھ محاذ آرائی میں محض ضمنی کردار ادا کرتی تھی۔ اسے بھی ترقی دی گئی۔ اس میں کروزر اور سب میرین کا اضافہ کیا گیا۔ ویسے متعدد اسلحے اخذ شدہ تھے اور مغربی معیار کے نہ تھے۔ بہرحال اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ روس کا جذبہ بہت بلند تھا اور وہ کسی سے پیچھے رہ جانا نہیں چاہتا تھا۔

روسی طاقت کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں اسٹالن نے نظم و ضبط پر خاصا زور دیا تھا اور ۱۹۳۰ء کی آخری دہائی کی صورت حال کا اعادہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ اس کی خبط الحواسی تھی یا اپنی آمرانہ پوزیشن کو مستحکم کرنے کا جذبہ! یا دونوں ہی وجوہات تھیں۔ بہرحال اس سلسلے میں حتمی جواب دینا مشکل ہے۔ لیکن وہاں کے واقعات خود منہ بولتی تصویر ہیں۔

بیرونی ملک سے تعلق رکھنے والوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جنگی قیدی جب واپس وطن آتے تو انھیں گولی مار دی جاتی۔ اسرائیل کے قیام اور یہودیوں کی اس سے وفاداری کے نتیجے میں روس میں سامیوں کے خلاف جذبات دوبارہ بھڑک اٹھے۔ فوج کی قیادت محدود کر دی گئی۔ مارشل زوکوف جیسے نامی گرامی کمانڈر کو ۱۹۴۶ء میں روس کی بری فوج کے اعلیٰ عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ خود کمیونسٹ پارٹی کے اندر ڈسپلن نہایت سخت کر دیا گیا۔ لینن گراڈ کی پارٹی لیڈر شپ جسے اسٹالن ہمیشہ ناپسند کرتا تھا۔ تبدیل کر دی گئی۔ سنسر شپ نہ صرف ادب اور تخلیقی آرٹ پر بلکہ سائنس' حیاتیات اور علم السنہ پر بھی عائد کر دی گئی۔ یہ جابرانہ نظام دراصل اس اجتماعی نوع کی کھیتی باڑی کے لیے ضروری تھا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ پھر مگر جنگ سے پیدا شدہ بحران میں ایسی سختی اختیار کرنا منطقی نظر آتا ہے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ ایسے ہی اقدامات روس کے زیر نگیں مشرقی یورپ کی ریاستوں میں اختیار کیے جائیں۔ چنانچہ وہاں مختلف پارٹیوں کا زور ختم کیا گیا' برسرعام مقدمے چلائے گئے' انفرادی حقوق اور نجی جائیدادوں کے اتلاف کے لیے

موثر کاروائی کی گئی۔ غرض یہ تمام باتیں آئے دن ظہور میں آنے لگیں۔ پھر پولینڈ اور بعد ازاں چیکو سلواکیہ میں جمہوریت ختم کر دی گئی۔ ان تمام جابرانہ اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت نظام کے لیے اہل مغرب میں جو تحسین آمیز جذبہ تھا' وہ سرد پڑنے لگا۔ پھر روس کے طبقہ علیا کی یہ عجیب و غریب منطق بھی کام کر رہی تھی کہ ان کی ماتحت طفیلی ریاستوں اور خود اپنے ملک کے عوام کو مغربی ممالک کے خیالات اور مال و متاع سے دور رکھا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اسٹالن کی یہ بھی ایک مجنونانہ حرکت تھی۔ بہرحال جو بھی وجہ ہو' یہ حقیقت ہے کہ روس ایک وسیع و عریض سلطنت تھی جو "امن امریکہ" کے تصوراتی اثرات سے بالکل محفوظ تھی۔ اور یہ بھی امرواقعہ ہے کہ سوویت یونین ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہم پایہ وہم رتبہ تھا۔

روسی سلطنت کی اس ترقی و کامرانی سے میکندر کی یہ پیش گوئی پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی کہ ایک عظیم الشان عسکری طاقت یوریشیا کے وسائل پر قابض ہو جائے گی۔ پھر اس کا یہ قول بھی سامنے آ رہا تھا کہ اگر مذکورہ سلطنت پھیلتی چلی گئی تو اس صورت میں سمندری علاقوں کی حامل ریاستوں کو اس کی مزاحمت کرنا ہو گی تاکہ طاقت کا عالمی توازن برقرار رکھا جا سکے۔ کوریا کی جنگ سے زخم خوردہ امریکی انتظامیہ کو اپنے پرانے تصور "واحد دنیا" کو بروئے کار لانے کا معاملہ کئی سال کے لیے موخر کرنا پڑا اور اس کی جگہ اقصائے عالم میں اپنے سپرپاور ہونے کی جدوجہد شروع کرنی پڑی۔ یہ صورت حال ۱۹۴۵ء کے حالات کے تحت منطقی بھی تھی۔ جیسا کہ ڈی ٹوکویل نے بہت پہلے کہا تھا' امریکہ اور روس ہی دو ایسے ملک تھے جو نصف دنیا کی قسمت تحریر کر سکتے تھے۔ لیکن دونوں "عالمی اقتدار" کے ہوس کا شکار ہو گئے۔ اس وقت روس دنیا کے نہایت طاقت ور ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بغیر دنیا کا کوئی بھی گمبھیر معاملہ طے نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۴۳ء میں جب امریکہ کو یہ خدشہ لاحق ہوا تھا کہ چرچل اور اسٹالن مشرقی یورپ کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر لیں گے تو مولوٹوف نے یہ دعوی کیا تھا: "سیاسی اور فوجی لحاظ سے ایسا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اس عالمی جنگ میں امریکہ دلچسپی نہ لے"۔ چنانچہ مفاد کی جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔

ان سابقہ بڑی طاقتوں کا کیا بنا جو اب درمیانی درجے کی قوت کی حامل بن چکی تھیں اور جن کا زوال سپرپاورز کے عروج کا نتیجہ ٹھہرا؟ اس کا فوری جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ جرمنی' جاپان اور اٹلی کی فاشسٹ ریاستیں برطانیہ عظمیٰ کے برعکس مختلف کیفیت و حالت سے دوچار تھیں اور ۱۹۴۵ء کے فوراً بعد کے عرصے میں فرانس کی صورت حال بھی ایسی ہی تھی۔ جب جنگ اختتام کو پہنچی تو اتحادی ملکوں نے آپس میں مل کر ایسا منصوبہ بنایا کہ آئندہ جرمنی اور جاپان عالمی نظام کے لیے خطرے کا سبب نہ بن پائیں۔ چنانچہ ان دونوں ملکوں پر طویل المیعاد قسم کے فوجی تسلط قائم کرنے کا پروگرام وضع کیا گیا۔ جہاں تک جرمنی کا معاملہ تھا' اسے چار مقبوضہ خطوں میں بانٹ دیا گیا۔ بعد ازاں' جرمنی کی دو علیحدہ علیحدہ ریاستیں تشکیل دے دی گئیں۔ جاپان کو اس کی سمندر پار کی مقبوضات سے بے دخل کر دیا گیا۔ یہی صورت ۱۹۴۳ء میں اٹلی کے ساتھ بھی پیش آئی۔ جرمنی کو یورپ اور مشرق میں اپنی پرانی مقبوضات (سلیسیا' مشرقی پروشیا وغیرہ) سے ہاتھ دھونا پڑا اور بمباری کی وجہ سے اسے بے پناہ نقصان پہنچا تھا۔ اس کے مواصلاتی نظام پر بھی اچھا خاصا دباؤ تھا

اور تعمیراتی سامان کا فقدان تھا۔ بہت سی مصنوعات کے لیے خام مال نہیں مل رہا تھا۔ بیرونی منڈیوں تک رسائی بھی ممکن نہیں رہی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ صنعت و حرفت پر اتحادیوں کا کنٹرول قائم ہو گیا تھا جس نے معاملے کو اور بھی گمبھیر بنا دیا تھا۔ ادھر جرمنی میں صنعتی پلانٹ کے ناکارہ ہو جانے سے معاشی حالت بگڑ گئی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں جرمنی کی قومی آمدنی ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں تین گنا کم ہو گئی تھی۔ یہ تشویشناک کی تھی۔ جاپان کی اقتصادی صورت حال بھی ایسی ہی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں اس کی قومی آمدنی ۱۹۳۴-۶ء کے مقابلے میں محض ۵۷ فی صد رہ گئی تھی۔ صنعتی کام انجام دینے کی اجرت بھی گھٹ کر کل ۳۰ فی صد رہ گئی تھی۔ بیرونی تجارت میں اس درجہ کمی آ گئی تھی کہ آئندہ دو سال کے دوران برآمدات کی شرح ۸ فی صد اور درآمدات کی شرح ۱۸ فی صد تھی۔ ۱۹۳۴-۶ء کے مقابلے میں یہ تجارتی اعداد و شمار بے حد خفیف ہو گئے تھے۔ جنگ کی وجہ سے جاپان کی جہاز رانی بھی تباہی کا شکار ہوئی تھی۔ اسی طرح ورکی کی کھانٹ کی پیداواری شرح ۱۲۰۲ ملین سے گھٹ کر فقط ۲ ملین رہ گئی تھی۔ کوئلے کی پیداوار بھی نصف ہو گئی تھی۔ دیگر شعبوں میں بھی یہی صورت حال تھی۔ اقتصادی اور فوجی لحاظ سے ان تمام ملکوں کے دن ختم ہو چکے تھے۔

اگرچہ اطالیہ نے ۱۹۴۳ء میں خود کو تمام بکھیڑوں سے علیحدہ کر لیا تھا' اس کے باوجود اس کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مسلسل دو سال تک اتحادی فوجیں اس کے علاقے سے گزر کر آبنائے پر حملہ کرتی رہیں اور ہر جگہ بم گراتی رہیں۔ اس طرح مسولینی کے ہاتھوں آئی ہوئی تباہی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں اٹلی کی مجموعی قومی پیداوار گھٹ کر ۱۹۱۱ء والی سطح تک پہنچ گئی تھی اور اس میں ۴۰ فی صد کمی آ گئی تھی۔ جنگ کے نتیجے میں ہونے والے جانی نقصان کے باوجود وہاں کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو نوآبادیاتی علاقوں سے آنے والوں کا ہجوم تھا' دوسرے ترک وطن پر پابندی عائد تھی۔ وہاں کا معیار زندگی انتہائی کم تھا۔ اگر امریکہ اور دیگر عالمی شہرت کے حامل ملکوں سے امداد نہ ملتی تو اٹلی کے عوام فاقے سے مرجاتے۔ ۱۹۴۵ء میں وہاں اجرت کی شرح گھٹ کر ۲۶٫۷ فی صد رہ گئی تھی۔ یہ امرواقعہ ہے کہ مذکورہ تمام ممالک امریکی امداد کے مرہون منت تھے۔ اس طرح مذکورہ عرصے میں ان کی حیثیت اقتصادی لحاظ سے طفیلی ملک کی تھی۔

اقتصادی لحاظ سے فرانس اور جرمنی کا موازنہ کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ مسلسل چار سال تک جرمنی فرانس کو تباہ و برباد کرتا رہا۔ پھر ۱۹۴۴ء میں وسیع پیمانے پر جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں بحری راستے اور بندرگاہیں مسدود ہو گئیں۔ بے شمار پل تباہ کر دیے گئے۔ حتیٰ کہ ریلوے کا نظام بھی کچھ عرصے کے لیے معطل ہو کر رہ گیا۔ فولن کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۴-۵ء کے عرصے میں فرانس کی برآمدات اور درآمدات کو فروغ دینے کی کوشش بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ ان دنوں وہاں کی قومی آمدنی ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں گھٹ کر نصف رہ گئی تھی۔ حالانکہ مذکورہ سال خود بھی پر آشوب تھا۔ فرانس کے پاس بیرونی کرنسی کا ذخیرہ موجود نہ تھا نہ ہی اسے بیرونی زرمبادلہ کی سہولت حاصل تھی۔ جب ۱۹۴۴ء میں ۵۰ فرانسیسی کرنسی کی قیمت ایک ڈالر کے مساوی طے کی گئی تو یہ محض عارضی ثابت ہوئی اور ایک سال کے اندر ایک ڈالر کے مقابلے میں اس کی قیمت ۱۱۹ تک پہنچ گئی۔ جب ۱۹۴۹ء میں حالات خاصے بہتر

ہوئے' اس وقت بھی ۴۲۰ فرانسیسی کرنسی ایک ڈالر کے مساوی تھی۔ اس ملک کی سیاسی جماعتوں خصوصاً کیمونسٹ پارٹی کا اقتصادی مسائل کو گمبھیر بنانے میں خاصا عمل دخل تھا۔

دوسری جانب صورت یہ تھی کہ آزاد طبع فرانسیسی "عظیم اتحاد" کے رکن تھے۔ یہ تحریک فاشزم کے خلاف تھی۔ ان لوگوں نے نہایت اہم قسم کی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ علاوہ ازیں' مغربی افریقہ' لیونٹ اور الجیریا میں وچی کی حمایتی فوج کے خلاف خانہ جنگی میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ جن دنوں فرانس پر جرمنی کا قبضہ تھا اور دوران جنگ وطن کے وفادار طبقے منقسم ہو گئے تھے' ڈیگال کی تنظیم انگلستان اور امریکہ کی امداد پر ہی گزارا کر رہی تھی لیکن ڈیگال نے اسے کمتر سمجھ کر جھگڑا کیا اور زیادہ سے زیادہ اعانت کا مطالبہ کیا تھا۔ تاہم اہل برطانیہ فرانس کو یورپ میں دوبارہ فوجی لحاظ سے طاقتور دیکھنا چاہتے تھے تاکہ یہ روس کی مزاحمت کر سکے۔ روبہ زوال جرمنی کے لیے وہ اس نوع کا جذبہ نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ فرانس کو بڑی طاقت کے درجے کی بہت سی سہولیات حاصل ہو گئیں۔ مثلاً" جرمنی میں اسے ایک علاقہ مل گیا۔ پھر اسے اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کا مستقل رکن بنا دیا گیا۔ ایسی ہی اور بھی مراعات اسے حاصل ہو گئیں۔ اگرچہ اسے شام اور لبنان میں پرانا وقار حاصل نہ ہو سکا' لیکن اس نے ہند چینی' تیونس اور مراکش میں خصوصی مقام حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ پھر سمندر پار کے علاقوں میں فرانس کے بہت سے دفاتر قائم تھے اور کئی علاقے اس کے قبضے میں تھے۔ لہٰذا اس وقت بھی دنیا میں بہت بڑی نوآبادیاتی سلطنت کے طور پر اسے دوسرا درجہ حاصل تھا اور وہ اسے ہر طرح برقرار رکھنے کا خواہشمند تھا۔ بہت سے بیرونی مبصرین' خصوصاً" امریکیوں کے خیال میں فرانس کا ناقص اقتصادی حالات کے باوجود اول درجے کا طاقتور ملک کا درجہ حاصل کرنا احمقانہ اقدام تھا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ ممکن ہے' یہ اقدام محض اس لیے ہو کہ کئی سال تک اپنے فوجی منظرنامے کو مخفی رکھا جائے تاآنکہ جنگ سے عالمی نظام کا نقشہ ہی تبدیل ہو کر رہ جائے۔

۱۹۴۵ء میں بہت سے اہل برطانیہ اس بات سے رنجیدہ ہو گئے کہ ان کا ملک اور سلطنت دونوں دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوتے رہے ہیں لیکن اب اپنے فوجی توازن کی تخفی رکھ رہے تھے۔ چنانچہ لندن کے منصوبہ سازوں کے لیے یہ معاملہ خاصا گمبھیر بن گیا تھا کہ نفسیاتی طور پر روبہ زوال سیاست سے کس طرح مطابقت پیدا کی جائے۔ یہ واحد سلطنت برطانیہ تھی جو دوسری جنگ عظیم میں ابتداء سے اختتام تک لڑتی رہی۔ چرچل کی زیر قیادت برطانیہ "تین بڑوں" میں شمار کیا جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے برعکس اس وقت انگلستان بحری' بری اور فضائی لحاظ سے اعلیٰ فوجی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اگست ۱۹۴۵ء میں تو یہ صورت حال تھی کہ شہنشاہ کے مقبوضہ علاقے' حتیٰ کہ ہانگ کانگ اہل برطانیہ کو واپس مل گیا۔ برطانیہ کا فوجی دستہ اور ہوائی اڈا شمالی افریقہ' اٹلی' جرمنی' جنوب مشرقی ایشیا میں قائم کیا جا چکا تھا۔ برطانیہ کے شاہی بحری بیڑے کو اگرچہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا' اس کے باوجود اس میں ایک ہزار جنگی جہاز' تین ہزار چھوٹے جنگی جہاز اور ۵۵۰۰ لڑاکا طیارے شامل تھے۔ برطانیہ کی شاہی ائرفورس فضائی طاقت کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود کوریلی برنٹ کے خیال میں حقیقت یوں تھی:

"برطانیہ نے جس طرح اپنی طاقت مستحکم کی تھی' اس لحاظ سے فتح بالکل

بے معنی تھی۔ ایسی صورت حال میں جرمنی اور اس کے اتحادیوں کو شکست محض ایک ادنیٰ مثال تھی۔ جرمنی کی شکست کے باوجود برطانوی اقتدار کو ختم ہونا تھا۔ بہرحال' اتنی ساری فتح کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ البتہ حصول فتح کے اسباب و عوامل اہمیت کے حامل ہیں' خصوصاً" وہ حالات جن سے انگلینڈ نبرد آزما تھا۔"

یہ امر واقعہ ہے کہ فتح حاصل کرنے کے لیے برطانیہ نے ہر طرح کے جتن کیے تھے۔ سونے اور ڈالر کے ذخائر کو پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ نجی مشینیں بہت زیادہ استعمال میں لائی گئی تھیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ملک کے وسائل اور افرادی قوت غیر معمولی طور پر مصرف میں لائے جا رہے تھے' برطانیہ یہ جنگ برقرار رکھنے کی خاطر امریکہ سے اسلحے' بحری جہاز' غذائی اشیاء اور دیگر ضروری چیزیں مسلسل منگوا رہا تھا۔ غرض ان اشیاء کی درآمدات سال بہ سال بڑھتی جا رہی تھیں جبکہ برآمدات میں بے انتہا کمی آ گئی تھی اور تجارت زبوں حال تھی۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں ۱۹۴۳ء میں برطانوی تجارت محض ۳۱ فی صد کی شرح تک آ پہنچی تھی۔ جب جولائی ۱۹۴۵ء میں لیبر پارٹی برسراقتدار آئی تو سب سے پہلے جو دستاویز اس کی نظر سے گزری وہ کینس کی چونکا دینے والی رپورٹ تھی۔ یہ ملک کے مالیاتی بحران کے بارے میں تحریر کی گئی تھی۔ اس میں یہ باتیں درج تھیں: "ملک میں تجارتی خلا تھا۔ صنعت غیر مستحکم تھی۔ سمندر پار بے شمار دفاتر پھیلے ہوئے تھے۔ گویا امریکی امداد کی سخت حاجت درپیش تھی تاکہ قرض پنجہ سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے۔ اس امداد کے حصول سے پہلے حد درجہ کفایت شعاری اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔" یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد فاتحین کے حسب لائق گھر سجانے کا جذبہ برقرار تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ یقین کرنا ممکن نہ تھا کہ برطانیہ کو عالمی سیاست میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔

ان حقائق کے باوجود بڑی طاقت ہونے کا زعم برقرار رہا۔ حتیٰ کہ لیبر پارٹی کے وزراء ایک فلاحی ریاست تشکیل دینے کے لیے کوشاں تھے۔ بہرکیف' آئندہ چند برسوں کی تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ناسازگار حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے برطانوی حکومت درج ذیل اقدامات کر رہی تھی: عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانا' ملی جلی معاشیات کو فروغ دینا' تجارتی خلا کو پر کرنا' جرمنی' مشرق قریب اور ہندوستان سے اپنے مفادات کو مستحکم کرنا اور روس کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو جانے کی صورت میں وہاں کثیر بری فوج تعینات کرنا۔ عظیم اٹلی کی انتظامیہ کا جائزہ لینے سے یہ باور ہوتا ہے کہ یہ کئی معنوں میں خاصی کامیاب رہی تھی۔ اس دور میں صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا' تجارتی خلا کو پر کیا گیا' سماجی اصلاحات نافذ ہوئیں اور یورپ کی صورت حال بہتر ہوئی۔ لیبر پارٹی کی حکومت نے ہندوستان سے واپس آ جانا مناسب سمجھا' فلسطین کے بحران سے خود کو نکال لینا ضروری قرار دیا اور یونان و ترکی کی حمایت سے دست برداری اختیار کر لی۔ اس طرح سمندر پار کے بہت سے مسائل سے برطانیہ کو گلو خلاصی حاصل ہو گئی۔ دوسری جانب اقتصادی حال بہتر بنانے کے لیے وافر مقدار میں قرض کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جون کینس نے اس ضمن میں ۱۹۴۵ء میں

واشنگٹن کی حکومت سے بات کی اور مزید مالی اعانت کے لیے گزارش کی۔ چنانچہ "مارشل پلان" کے تحت امدادی رقم موصول ہو گئی۔ حالانکہ برطانیہ کے کئی دشمن ممالک کی معاشی حالت اس سے بھی کہیں زیادہ گئی گزری تھی۔ بہرحال' اس طرح معاشی طور پر انگلستان کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کے مختلف علاقوں سے واپس آجانے کا عمل بھی طویل المدتی لحاظ سے مشکوک نظر آ رہا تھا۔ ویسے اس اقدام سے ناقابل برداشت بوجھ سے چھٹکارا ضرور ملا۔ لیکن بعض خطوں سے علیحدہ ہو جانے کے بعد دیگر علاقوں میں مفادات کے اسباب تلاش کیے گئے تاکہ شہنشاہیت کا سکہ چلتا رہے ----- چنانچہ فلسطین کو چھوڑا گیا تو نہر سویز پر تسلط قائم کر لیا گیا۔ ہندوستان سے واپسی ہوئی تو عرب کے تیل کو تحویل میں لے لیا گیا۔ اس موقع پر وائٹ ہال میں ایسی کوئی تدبیر اختیار نہیں کی گئی تھی کہ بقیہ آزاد سلطنت سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اب اقتصادی لحاظ سے برطانیہ کو ان علاقوں کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ تو بعد میں لگنے والے جھٹکے اور ہر جگہ تسلط قائم رکھنے کے بڑھتے ہوئے اخراجات کا نتیجہ تھا کہ برطانیہ دنیا میں اپنا مقام از سرنو طے کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس دوران یہ ملک اگرچہ وسیع و عریض بن چکا تھا' لیکن اپنے تحفظ اور دفاعی قوت کے لیے اپنے اتحادی ملک امریکہ کا مرہون منت تھا۔

برطانوی اور فرانسیسی حکومت کی کوششوں کے باوجود یورپ کے دن بہتر نہیں ہو پا رہے تھے۔ جنگ کے دوران امریکہ کی مجموعی قومی پیداوار میں ۵۰ فی صد اضافہ ہو چکا تھا' لیکن یورپ میں (روس کو چھوڑ کر) ۲۵ فی صد کمی آ گئی تھی۔ اس وقت عالمی پیداوار میں یورپ کا حصہ اس قدر کم تھا جو انیسویں صدی کے اوائل سے کبھی ایسا نہیں رہا۔ حتیٰ کہ ۱۹۵۳ء میں بھی جبکہ جنگ کے نقصانات کی کافی حد تک تلافی ہو چکی تھی' عالمی پیداوار میں مجموعی طور پر اس کا حصہ صرف ۲۶ فی صد تھا۔ اس کے مقابلے میں امریکہ کا حصہ ۴۴ء۷ فی صد تھا۔ دنیا کی مجموعی آبادی کے لحاظ سے یورپ کی آبادی تقریباً" ۱۵ / ۲۶ فی صد تھی۔ ۱۹۵۰ء میں اس کی فی کس پیداوار کی شرح امریکہ کی پیداوار کے نصف تھی۔ اہم بات یہ کہ سوویت یونین نے اس وقت معاشی خلا کو پر کر دیا تھا۔ جدول ۳۶ سے بڑی طاقتوں کے مجموعی قومی پیداوار کی شرح کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے:

جدول ۳۶ : بڑی طاقتوں کی مجموعی اور فی کس قومی پیداوار

(۱۹۵۰ء میں)

۱۹۶۴ میں ڈالر کی قیمت کے لحاظ سے

	مجموعی قومی پیداوار	فی کس پیداوار
امریکہ	۳۸۱ بلین	۲۵۳۶
روس	۱۲۶	۶۹۹
برطانیہ	۷۱	۱۳۹۳ (۱۹۵۱ء)
فرانس	۵۰	۱۱۷۲
مغربی جرمنی	۴۸	۱۰۰۱
جاپان	۳۲	۳۸۲
اٹلی	۲۹	۳۳۶ (۱۹۵۱ء)

یورپی طاقت کا زوال فوج اور اس کے اخراجات سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ نے ۱۹۵۰ء میں دفاع پر ۱۳ء۵ بلین ڈالر خرچ کیے تھے۔ اس وقت اس کے فوجی ملازمین کی تعداد ۱ء۳۸ ملین تھی۔ اس کے مقابلے میں روس نے تھوڑی زیادہ رقم خرچ کی تھی' یعنی ۱۵ء۵ بلین ڈالر۔ اس وقت اس کی فوج میں ۴ء۳ ملین افراد شامل تھے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ سپرپاورز برطانیہ' فرانس اور اٹلی پر فوقیت رکھتی تھیں۔ (برطانیہ کا دفاعی خرچ ۲ء۳ بلین ڈالر تھا جبکہ فوجیوں کی تعداد ۶۸۰۰۰۰ تھی۔ فرانس کا دفاعی خرچ ۱ء۴ بلین ڈالر تھا جبکہ فوجی ملازمین کی تعداد ۲۳۰۰۰۰ تھی۔) اس وقت جاپان اور جرمنی فوجی لحاظ سے اتنے مستحکم نہیں رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو اس بحران کے نتیجے میں یورپ کی دوسرے درجے کی طاقتیں دفاعی اخراجات میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو گئیں لیکن امریکہ اور روس کے اخراجات کے مقابلے میں ملکوں کے اخراجات خاصے کم تھے۔ امریکہ ۳۳ء۳ بلین ڈالر خرچ کر رہا تھا۔ جبکہ روس کا خرچ ۲۰ء۱ بلین ڈالر تھا۔ اس سال برطانیہ' فرانس اور اٹلی کے مجموعی دفاعی اخراجات امریکہ کے دفاعی خرچے کے پانچویں حصے سے بھی کم تھے اور روس کے کل اخراجات کے تیسرے حصے سے بھی قلیل تھے۔ ان ملکوں کے فوجی ملازمین کی تعداد امریکہ کے مقابلے میں نصف اور روس کے مقابلے میں ایک تہائی تھے۔ اقتصادی اور فوجی استحکام کے لحاظ سے یورپ کی ریاستیں روبہ زوال ہو چکی تھیں۔

مذکورہ حالات اور بھی گھمبیر ہو گئے جب نیوکلیئر ہتھیار اور دور تک مار کرنے والے اسلحے عالم وجود میں آ گئے۔ ریکارڈ سے بات ثابت ہے کہ وہ بے شمار سائنسدان جو ایٹم بم پر کام کر رہے تھے اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھے کہ وہ فن حرب کی تاریخ میں ایسے پڑھارا تک پہنچنے والے ہیں جہاں ہتھیاروں کا ایک نیا نظام ہو گا اور ہلاکت و برباد کر دینے والی انسانی قوت بروئے کار آئے گی۔ ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء

کو الموگوردو میں جو کامیاب ایٹمی تجربہ ہوا اس سے مبصرین پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اب ایک اور اہم نئی چیز عالم وجود میں آ گئی ہے جو بجلی یا کسی اور شے کی ایجاد سے کہیں اعلیٰ ہو گی۔ جب ہیروشیما اور ناگاساکی میں قیامت جیسا شور و غوغا بلند ہوا تو ایٹمی اسلحے کی بے پناہ طاقت میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔ اس کی ایجاد کے باعث مستقبل میں جو نتائج پیش آنے والے تھے ان سے امریکی منصوبہ ساز نبرد آزما ہوتے رہے۔ ان کے ذہنوں میں اس نوع کے سوال گونجتے رہے۔ روایتی طریقہ جنگ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ کیا اسے جنگ شروع ہوتے ہی استعمال کر لیا جائے یا آخری حربے کے طور پر مصرف میں لایا جائے؟ اگر بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے ایٹمی ہتھیاروں (مثلاً" ہائیڈروجن بم یا تدبیری طریقے) کو فروغ دیا جائے تو اس میں کیا پیچیدگیاں حائل ہوں گی اور ان کی کارکردگی کس درجے کی ہو گی؟ کیا اس کے بنانے کے راز سے دوسروں کو بھی آگاہ کیا جائے؟ اس ایٹمی تحریک سے سوویت یونین کو بھی ترغیب ملی کہ وہ نیوکلیر ہتھیاروں کو مزید فروغ دے۔ چنانچہ اسٹالن نے اپنے سیکورٹی چیف' بیریا کو ہیروشیما کی تباہی کے ٹھیک دوسرے دن ایٹمی پروگرام کا نگران نامزد کر دیا۔ اگرچہ روس بم اور دور تک مار کرنے والے ہتھیار بنانے کے معاملے میں بہت پیچھے تھا' لیکن امریکیوں کی توقع کے برعکس اس نے جلد میدان مار لیا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد کے عرصے میں امریکہ کو نیوکلیر ہتھیاروں میں جو برتری حاصل ہوئی اس سے یہ فائدہ ہوا کہ روس کی روایتی افواج کے مقابلے میں توازن کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیکن روس نے نہایت تیز رفتاری سے ایٹمی ہتھیاروں میں برتری حاصل کر لی اور اپنے اس دعوے کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا کہ اس ہتھیار پر امریکہ کی اجارہ داری محض وقتی تھی۔

ایٹمی ہتھیاروں کے عالم میں آ جانے سے فوجی حکمت عملی کا منظر نامہ ہی بدل گیا۔ ان ہتھیاروں کا حامل کوئی بھی ملک وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے اور انسانیت کو نیست و نابود کر دینے کا اہل بن گیا۔ ہتھیاروں کی نئی ٹیکنالوجی کی دریافت نے قدامت پرست یورپی ملکوں میں بھی تحریک پیدا کر دی کہ وہ ان ایٹمی ہتھیاروں کو حاصل کرنے کی جدوجہد کریں' بصورت دیگر ان کی حیثیت دوسرے درجے کی ریاستوں جیسی ہو گی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جرمنی' جاپان اور اقتصادی لحاظ سے کمزور ملک اٹلی میں نیوکلیر کلب کی رکنیت اختیار کرنے کا دم خم نہیں تھا لیکن انگلستان کی حکومت کی نظر میں یہ بات ناقابل فہم تھی کہ ایسے ہتھیار حاصل نہ کیے جائیں جو مزاحمت کیے لیے بھی ضروری ہیں اور جن سے سائنسی اور تکنیکی برتری کا تاثر نمایاں ہوتا ہے۔ اور ان ہی تفرد مباہات پر برطانیہ کی طاقت منحصر ہے۔ بادی النظر میں' انگلستان نے بڑی طاقت کہلانے کے لیے نہایت سستا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اور یہی اقدام فرانس کو بھی پسند آ گیا۔ بہرحال یہ منطق کیسی ہی موثر کیوں نہ معلوم ہوتی ہو' لیکن عملی طور پر یہ نقائص سے پر تھی۔ چنانچہ کئی سال تک دونوں ممالک ایٹمی ہتھیار اور دور تک مار کرنے والے اسلحے حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ دوسرے ان کے ایٹمی اسلحہ خانے سپر طاقتوں کے بارود خانے کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کے تھے۔ پھر ٹیکنالوجی کی مزید ترقی کے نتیجے میں ان کی بے مائیگی متوقع تھی۔ فرض لندن' پیرس' اور ازاں بعد چین نیوکلیر کلب میں شرکت کے لیے کوشاں تھے۔ ۱۹۴۵ء کے مابعد کے عرصے میں ان ملکوں کی یہ جدوجہد آسٹریا - ہنگری اور اٹلی کی جدوجہد کے بالکل مشابہ تھی۔ ۱۹۱۴ء سے قبل کی جنگوں میں یہ ممالک بھی خونیں طریقہ حرب استعمال کرنے کے جویا نظر

آتے تھے۔ بہرحال یہ سارے اقدامات' طاقت کے بجائے کمزوری کی علامت تھے۔

آخری رجحان یہ کار فرما تھا کہ عسکری اور سیاسی لحاظ سے دنیا کا از سرنو جائزہ لینا ضروری ہے اس لیے کہ سابقہ اور روایتی انداز کی کثیرالقطبین دنیا کے برعکس دو قطبی دنیا کو نظریاتی طور پر گمبھیر کردار ادا کرنا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ انیسویں صدی کی کلاسیکی سیاست کے دور میں بھی نظریاتی عوامل منصوبہ بندی کے دوران کارفرما رہے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال میٹرنخ' نیکولس اول' بسمارک اور گلیڈ اسٹون کے یہاں ملتی ہے۔ جنگ کے زمانے میں تو یہ رجحان شدت سے محسوس کیا جاتا رہا ہے' اس لیے کہ دائیں اور بائیں بازو کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے آخری عشرے میں تو کثیرالقطبین دنیا میں آپس کے اختلافات سنگین نوعیت اختیار کر گئے تھے۔ برطانیہ میں نوری جماعت کے لوگ نازی جرمنی کے برعکس کیمونسٹ روس سے اتحاد قائم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آزاد خیال امریکی یورپ میں انگلستان اور فرانس کی سفارت کاری کی حمایت کرتے تھے' ساتھ ہی ساتھ اس بات کے خواہشمند بھی تھے کہ بیرون یورپ برطانوی اور فرانسیسی سلطنت کے اثر و رسوخ کی بیخ کنی کی جائے۔ ان اسباب و عوامل کی بنا پر عالمی امور کو نظریاتی اصول کے تحت واضح کرنا خاصا مشکل تھا۔ حتیٰ کہ جنگ کے زمانے میں بھی فاشزم کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہوئے یہ سیاسی اور سماجی اصول و نظریات پیش نظر رہے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں اسٹالن نے کیمونسٹ انٹرنیشنل کو کچلنا شروع کیا تھا اور روس نے بار ہا آپریشن کی مزاحمت کی تھی۔ مغرب نے ان اقدامات کو سراہا تھا اور اس طرح ماضی کے شکوک و شبہات معدوم دکھائی دیتے تھے۔ اس معاملے میں امریکہ تو دو قدم اور بھی آگے تھا۔ ۱۹۴۳ء میں "لائف میگزین" نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ "روسی عوام امریکی عوام کی طرح دکھائی دیتے ہیں' انہی کی طرح لباس زیب تن کرتے ہیں اور ان ہی کی طرح سوچتے بھی ہیں۔" ایک سال بعد نیو یارک ٹائمز" نے یہ اعلان کر دیا کہ "روس میں مارکسی نظریے کا خاتمہ ہو چکا ہے"۔ سطحی قسم کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی یہ سمجھتے تھے کہ مابعد جنگ کی یہ دنیا ان کے بین الاقوامی ہم آہنگی کے نظریے کے عین مماثل ہے۔ مثال کے طور پر جب مارچ ۱۹۴۶ء میں چرچل نے اپنی تقریر کے دوران روس کے متعلق مشہور زمانہ اصطلاح "فولادی پردہ" استعمال کی تھی اس کے خلاف بے شمار لوگوں نے غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔

بہرحال' اگلے سال دو سال میں روس اور مغربی ممالک کے درمیان ہونے والی سرد جنگ کا تصور کھل کر سامنے آ گیا۔ پھر روس کے اقدامات منظر عام پر نمایاں ہونے لگے۔ وہ مشرقی یورپ میں پارلیمانی جمہوریت کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اپنی فوج کو خاصی حد تک وسیع بھی کر چکا تھا۔ یونان' چین اور دیگر علاقوں میں کیمونسٹوں اور ان کے مخالفین کے درمیان خانہ جنگی ہونے لگی تھی۔ "سرخ فوج" کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ جاسوسی کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ ان افعال و کردار کو دیکھ کر امریکیوں کی سابقہ سوچ میں تبدیلی آ گئی۔ یہ وہ تلخ حقائق تھے جن کا ذکر ٹرومین کی انتظامیہ نے نہایت دلخراش لہجے میں کیا تھا۔ اپنی مارچ ۱۹۴۷ء کی تاریخی بجٹ کی تقریر میں صدر نے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا کہ یونان اور ترکی کی حمایت سے برطانیہ کے دست بردار ہونے کے بعد طاقت کے خلا کو پر کرنے کے لیے روس آگے بڑھ جائے گا۔ پھر صدر ٹرومین نے دنیا کا ایک ایسا منظر پیش کیا جہاں دو مختلف نظریاتی اصول کارفرما ہوں گے:

"ایک نظام حیات وہ ہے جہاں اکثریتی طبقے کی خواہش کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں جمہوری ادارے آزادانہ کام کرتے ہیں' حکومت عوام کی منتخب شدہ ہوتی ہے' آزادانہ انتخابات ہوتے ہیں' شخصی آزادی کی ضمانت ہوتی ہے' اظہار خیال اور مذہب کی آزادی ہوتی ہے اور کسی قسم کا سیاسی دباؤ نہیں ہوتا۔ دوسرا نظام حیات وہ ہے جہاں اکثریت پر چند اقلیتی طبقے کے لوگ حاوی ہوتے ہیں اور ان سب کو اپنی خواہشات کا غلام بنائے رکھتے ہیں۔ وہاں ظلم و تشدد کی حکمرانی ہوتی ہے' پریس پر کنٹرول ہوتا ہے' انتخابات من مانے طریقے سے ہوتے ہیں اور شخصی آزادی کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔"

پھر اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے ٹرومین نے کہا:

"ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی یہ پالیسی ہو گی کہ وہ آزاد لوگوں کی مدد کرے تاکہ وہ جمہوری اداروں کو برقرار رکھ سکیں اور ان آمرانہ طاقتوں سے اپنی قومی سلامتی کو بچا سکیں جو ان پر جابرانہ حکومت مسلط کرنے کے درپے ہے۔"

گویا آنے والے دنوں میں عالمی امور شدت جذبات کی رو میں طے کیے جائیں گے۔ آئزن ہاور کے الفاظ میں: "خیر اور شر کی طاقتیں اکٹھا ہو گئی ہیں اور پوری طرح مسلح ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی اتنی شدید مخالف ہیں کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آزادی غلامی سے برسرپیکار ہے اور روشنی اندھیرے سے لڑ رہی ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سارے نعرے ملکی ضرورت کے تحت لگائے گئے تھے۔ یہ صورت حال صرف امریکہ ہی میں نہیں بلکہ برطانیہ' اٹلی' فرانس اور دیگر ملکوں میں بھی تھی۔ قدامت پرست اس نوع کے جملے استعمال کر کے اپنے مخالفین کے لتے لیتے یا کیمونزم کے لیے نرم گوشہ رکھنے پر حکومت کو لعن طعن کرتے۔ یہ امرواقعہ ہے کہ اس نوع کے اقدام سے اسٹالن مغربی ممالک کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ چنانچہ سوویت یونین کے اخبارات میں اس طرح کی خبریں شائع ہونے لگی تھیں: مشرقی یورپ میں روسی اثرات کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ سوویت یونین کو دشمن ہر طرف سے گھیرے میں لے رہے ہیں۔ اس ملک کے خلاف محاذ کھولے جا رہے ہیں۔ کیمونسٹوں کی مخالف سلطنتوں کی طرف داری کی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ کو جان بوجھ کر غیر موثر بنایا جا رہا ہے۔" ماسکو نے یہ بھی دعوی کیا کہ امریکہ کی نئی خارجہ پالیسی سوویت یونین کے ساتھ اس کی پرانی دشمنی کی تجدید ہے تاکہ جنگ کو ممکن بنایا جا سکے اور دنیا پر برطانیہ و امریکہ کی بالادستی قائم ہو۔ اس وضاحت کے بعد سوویت یونین کے لیے یہ جواز بن گیا کہ وہ اندرون ملک مخالفین کی بیخ کنی کرے' مشرقی یورپ پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لے' جابرانہ طور پر صنعت سازی کا رویہ اختیار کرے

اور حصول اسلحہ پر زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کرے۔ غرض اندرونی اور بیرونی طور پر سرد جنگ ہر ایک کی ضرورت بن گئی۔ اس کی محرک در حقیقت نظریاتی دشمنی بنی اور اسی کی بنیاد پر اپیل بھی کی گئی۔ چونکہ حریت پسندی اور کیمونزم ایک عالمی تصور تھا' اور دونوں ہی کا حلقہ اثر وسیع تھا۔ اس تحریک نے دونوں حلقوں کو یہ باور کرا دیا کہ دنیا میں نظریاتی جنگ کو طاقت و سیاست کے مفادات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ صورت حال تھی کہ انسانوں کا ایک طبقہ امریکی بلاک سے وابستہ تھا تو دوسرا روس کا رطب اللسان بنا ہوا تھا۔ درمیانی راستہ کوئی نہ تھا اور اسٹالن اور جان میکارتھے کے عہد میں ایسا سوچنا بھی بے سود تھا۔ یہ ایک ایسی ہی حکمت عملی تھی جس کے زیر اثر نہ صرف منقسم یورپ کے عوام بلکہ ایشیا' مشرق وسطی' افریقہ' لاطینی امریکہ اور دیگر علاقوں کے لوگ آ چکے تھے۔

سرد جنگ اور تیسری دنیا

اگلے دو عشروں کے دوران بین الاقوامی سیاست روسی۔ امریکی رقابت سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں معروف رہی اور بعد ازاں اس سے جزوی طور پر علیحدہ بھی ہو گئی۔ ابتدا میں سرد جنگ کا دائرہ اثر یورپ کی نئی سرحدوں کی تشکیل تک محدود تھا۔ پس پردہ جرمنی کے مسئلے کو حل کرنے کی جدوجہد بھی جاری تھی' اس لیے کہ اس کے حل ہو جانے کی صورت میں ہی اثر و رسوخ قائم ہو جانے کی توقع تھی اور ۱۹۴۵ء کے زمانے کی کامیاب طاقتیں یورپ پر اپنا تسلط قائم رکھ سکتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں جرمنی کے حملے اور ظلم وجور سے کسی بھی ملک کے مقابلے میں روسیوں کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ پھر نصف آخر میں بھی اسٹالن کی خودمانی کی بدولت انھیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہو سکا۔ کیمونسٹ انقلاب کو عالمی سطح پر فروغ دینے کا معاملہ اگرچہ ثانوی نوعیت کا تھا' مگر غیر متعلقہ بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ اس کی بدولت روس کی دفاعی اور سیاسی پوزیشن مزید بہتر ہو سکتی تھی۔ اور اگر مار کسی نظریے پر مبنی ریاستیں قائم ہو جاتیں تو انھیں ماسکو سے براہ راست ہدایت ملتی۔ گرم پانی کی بندگاہوں تک رسائی کی قدیم جدوجہد کے برعکس یہ خیالات زیادہ وقیع بن چکے تھے اور ۱۹۴۵ء کے بعد کے عرصے میں سوویت یونین کی پالیسی کی بنیاد قرار دیے جا چکے تھے۔ اس کے تحت بہت سے مسائل کے حل تجویز کیے جا رہے تھے۔ چنانچہ پہلی کاروائی یہ اختیار کی گئی کہ ۲۲-۱۹۱۸ء کے عرصے میں سرحدوں کا تصفیہ حل ہوا تھا' اسے کالعدم قرار دے دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بالٹک کی ریاستوں پر روس کا کنٹرول قائم ہو جائے' پولینڈ اور روس کی ملی ہوئی مغربی سرحد کو اور اندر تک وسیع کر دیا جائے' مشرقی پروشیا کا وجود ختم کردیا جائے اور فن لینڈ' ہنگری اور رومانیہ کے علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ ان اقدامات سے مغربی ممالک کو یوں صدمہ نہیں پہنچا کہ دوران جنگ ان میں سے بہت سے معاملات پر پہلے ہی سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ البتہ خدشے کی بات یہ تھی کہ روس یہ چاہتا تھا کہ مشرقی وسطی یورپ کی سابقہ آزاد ریاستیں ان حکومتوں میں ضم ہو جائیں جو ماسکو کی حمایتی ہیں۔

اس معاملے میں پولینڈ کی قسمت کا فیصلہ جس طرح کیا گیا تھا وہی صورت دوسری ریاستوں کے ساتھ بھی پیش آنے والی تھی۔ البتہ پولینڈ کا مسئلہ پیچیدہ بھی ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے اس ملک کی سلامتی برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر پولینڈ کی جلا وطن حکومت مغربی یورپ میں باقاعدہ اپنا کام کر رہی تھی۔ جب کیٹن میں پولینڈ کے افسروں کے اجتماعی مزارات کا پتہ چلا تو روس نے وارسا کے ہنگامے کو ناجائز قرار دے دیا اور جب اسٹالن پولینڈ کی سرحدوں کو تبدیل کرنے پر تل گیا اور لبلن میں ماسکو کی حمایتی ایک جماعت وجود میں آئی تب چرچل روس کی جانب سے مشکوک ہو گیا۔ پھر چند ہی سال میں پولینڈ میں ایک کٹھ پتلی حکومت کا قیام اور مغرب میں جلا وطن پولینڈ کی حکومت کے اقتدار و اختیارات سے انحراف جیسے اقدامات سے مذکورہ خدشات واضح ہو گئے۔

اب ماسکو پولینڈ کے ان معاملات کو حل کرنے پر تل گیا جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح جرمنی کے ساتھ تھا۔ مغربی سمت میں جرمنی سے ملنے والی سرحد کو اس طرح وسیع کر دیا گیا کہ اس ملک کے علاقے

محدود ہو گئے۔ یہی صورت مشرقی پروشیا کے ساتھ بھی پیش آئی تھی۔ اس طرح پولینڈ کو یہ ترغیب بھی دی گئی کہ وہ مستقبل میں جرمنی کی جانب سے سرحد میں تبدیلی لانے کی سخت مخالفت کرے۔ روس نے پولینڈ کو ایک محفوظ قسم کا بفر زون بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا' وہ دراصل فوجی اہمیت کا حامل تھا۔ سوویت یونین دراصل یہ چاہتا تھا کہ ۱۹۴۱ء کی طرح جرمنی کے حملوں کا اعادہ نہ ہو پائے۔ لہٰذا ماسکو کے لیے یہ بھی ایک منطقی جواز تھا کہ وہ جرمنی کے عوام کی قسمت کا فیصلہ بھی صادر کرے۔ ایک طرف تو وہ پولینڈ میں اپنے حمایتی دھڑے کی مدد کر رہا تھا تو دوسری جانب جلا وطن جرمن کیمونسٹوں کو تربیت دے رہا تھا تاکہ جب وہ اپنے وطن لوٹیں تو روس کے لیے کام کریں۔ پولینڈ اور مشرقی یورپ میں اس کے پڑوسی ممالک کو روس نے جس طرح معاشی طور پر تباہ و برباد کیا تھا' وہ جرمنی کے لیے بھی اقتصادی لحاظ سے لٹ جانے کا ایک اشارہ تھا۔ جب ماسکو کو یہ احساس ہو گیا کہ اہل جرمنی کی ہمدردی حاصل کرنا ممکن نہیں چاہے انھیں کوڑی کوڑی کا محتاج ہی کیوں نہ بنا دیا جائے تو ان کو کنگال بنانے کے سلسلہ روک دیا گیا۔ بعد ازاں' اہل جرمنی کے لیے مانوف کا لہجہ بھی ہمدردانہ ہوگیا۔ بہرحال جرمنی کے معاملے میں روس کے یہ اقدامات اتنے اہم نہ تھے جتنے اس کے یہ ارادے کہ جرمنی کے مستقبل کا فیصلہ سوویت یونین کرے گا۔

غرض پولینڈ اور جرمنی کے متعلق روس کی جو پالیسی تھی وہ مغربی یورپ سے متصادم ہوتی رہی۔ ادھر امریکہ' برطانیہ اور فرانس نے سیاسی اور اقتصادی اہمیت کے پیش نظر آزاد منڈی قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ تمام یورپ میں جمہوری انتخابات کے اصول کار فرما ہوں۔ (اگرچہ لندن اور پیرس کی یہ خواہش تھی کہ امریکیوں کے سرکاری عدم مداخلت کے رویے کے برعکس ان کی سلطنتوں کو زیادہ بااختیار حیثیت حاصل ہو۔) بہرحال' فوجی نقطہ نگاہ سے مغربی یورپ کے ممالک اور ماسکو یہ چاہتے تھے' کہ جرمنی کو دوبارہ عسکری طاقت بننے سے روک دیا جائے اور فرانس تو اس معاملے میں ۱۹۵۰ء کی وسطی دہائی تک تشویش میں مبتلا رہا۔ ان ممالک میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ جرمنی کا فوجی تسلط وہاں قائم ہو اور نہ ہی کسی جگہ سرخ فوج کا پرچم لہرانے لگے۔ اگرچہ ۱۹۴۵ء کے بعد فرانسیسی اور اطالوی حکومتوں نے کیمونسٹوں کو برداشت کیے رکھا' لیکن مارکسی نظریے کی جماعتوں پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا تھا اس لیے کہ وہ ہر جگہ اقتدار پر قبضہ جما رہی تھیں۔ یہ بات پایہ ثبوت کو اس وقت پہنچی جب مشرقی یورپ میں غیر کیمونسٹ پارٹیوں کا صفایا کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ روس اور مغربی یورپ میں مصالحت پیدا کرنے کے لیے کوششیں جاری تھیں اور لوگ پر امید بھی تھے' لیکن نظریاتی اختلافات نے راہ مسدود کر دی۔ اگر ایک کا پروگرام کامیاب ہو جاتا تو دوسرا اسے اپنی توہین ہی نہیں خطرے کی علامت سمجھتا۔ جب تک طرفین اپنے عالمی نظریات میں ایک دوسرے سے سمجھوتہ نہیں کر لیتے' سرد جنگ ناگزیر تھی۔

یہاں ایسے تمام بحران کا ایک ایک کر کے جائزہ لینا ضروری نہیں۔ بصورت دیگر گذشتہ باب میں میٹرنخ کی سفارت کاری کا جو تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے اس کی تکرار ہو جائے گی۔ بہرحال' ۱۹۴۵ء کے بعد کی سرد جنگ کی خاص خاص باتوں کا جائزہ لینا زیادہ سود مند ثابت ہو گا۔ اس لیے کہ ان کے اثرات آج تک قائم ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ یورپ میں ان دونوں بلاکوں کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا تھا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تقسیم ۱۹۴۵ء میں ایکا ایکی وجود میں نہیں آ گئی۔ اتحادیوں کی قابض فوجوں اور جماعتوں کے جانشینوں کے لیے جو جرمن فوج کی واپسی کے بعد خالی علاقوں اور جلا وطنی سے نمودار ہو گئے' کی سب سے اہم ذمہ داری انتظامی حالات کو سنبھالنا تھا ------- یعنی مواصلاتی نظام کی بحالی' شہروں تک اشیائے خوردنی کی فراہمی' مہاجروں کی آباد کاری اور جنگی مجرموں کا سراغ لگانا!۔ ان اقدامات کی وجہ سے نظریاتی پوزیشن واضح ہوتی رہی۔ جرمنی کے مقبوضہ خطے میں امریکی فرانسیسیوں اور روسیوں سے لڑتے بھڑتے رہے۔ یورپ میں جہاں کہیں بھی اسمبلی اور کیبنٹ تشکیل پاتی تو شوشلسٹ نظریے والے کیمونسٹوں کے پہلو بہ پہلو مشرقی جانب بیٹھتے اور مغربی سمت میں کیمونسٹ لوگ جمہوریت پسند عیسائیوں کے دوش بدوش تشریف فرما ہوتے۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے اواخر اور ۱۹۴۷ء کے اوائل میں یہ خلیج وسیع تر ہوتی رہی اور اس کی تشہیر بھی نہایت دھڑلے سے ہوتی رہی۔ جرمنی کے علاقوں میں جو رائے شماری اور انتخابات ہوئے ان سے مغربی جرمنی کی سیاسی پیچیدگی رونما ہوتی رہی جو ہر صورت میں مشرقی جرمنی سے مختلف شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ پولینڈ' بلغاریہ اور رومانیہ میں غیر کیمونسٹ عناصر کے خاتمے کا اندازہ اپریل ۱۹۴۷ء میں اس وقت ہوا جب فرانس میں اندرونی سیاست کے ہنگامے نے جنم لیا۔ اس وقت کیمونسٹوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت سے مستعفی ہو جائیں۔ ایک ماہ بعد یہی صورت حال اٹلی میں بھی پیش آئی۔ ادھر یوگوسلاویہ میں ٹیٹو کی سیاسی بالادستی قائم تھی حالانکہ دوران جنگ اتحادیوں کے ساتھ سمجھوتے میں یہ بات طے پائی تھی کہ اقتدار مشترک ہوگا۔ چنانچہ مغربی یورپ کے ممالک اس معاملے میں مداخلت کرتے رہتے تاکہ روس کی پیش قدمی کی مزاحمت ہو سکے۔ یہ ناراضگیاں /نہ رضا مندیاں تو جاری تھیں ہی' سوویت یونین نے آئی ایم ایف اور انٹر نیشنل بینک میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ ان اقدامات سے خصوصی طور پر ان امریکیوں کو صدمہ پہنچا جو جنگ کے خاتمے کے بعد روس کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کی امید کر رہے تھے۔

مغرب اسٹالن کے متعلق محض وہم و گمان میں مبتلا تھا کہ حالات سازگار ہوتے ہی وہ مغربی اور جنوبی یورپ پر اپنی بالادستی قائم کر لے گا۔ ایسا ہونا ممکن نہ تھا چاہے فوجی طاقت ہی کیوں نہ استعمال کی جاتی۔ اگرچہ ان دنوں ترکی پر روس کا بڑھتا ہوا دباؤ تشویشناک صورت اختیار کر گیا تھا اور واشنگٹن نے مجبور ہو کر ۱۹۴۶ء میں مشرقی بحیرہ روم میں بحریہ کی ٹاسک فورس تعینات کر دی تھی۔ ویسے جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اقتصادی ناہمواری اور سیاسی چپقلش سے روس کے کاسہ لیسوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال یونان میں کیمونسٹوں کی بغاوت تھی۔ فرانس میں کیمونسٹوں کے زیر حمایت ہونے والی ہڑتال ایک دوسری مثال تھی۔ ادھر' روس نے جرمن عوام کے خیالات کی جو پرزور تائید کی تھی وہ خاصی مشکوک نظر آتی تھی۔ اسی طرح شمالی اٹلی میں کیمونسٹوں کا زور بڑھ چکا تھا۔ ہر دو تحریک کے حامی مورخین اب منحرف ہو کر سوچنے لگے ہیں کہ وہ لوگ روس کے ماسٹر پلان کے جادو کے کس طرح اسیر ہو چکے تھے۔ بہرحال' یونان کے کیمونسٹوں' ٹیٹو اور ماؤزے تنگ عالمی مارکسی آرڈر کی بجائے اپنے مقامی دشمنوں کی جانب توجہ مبذول کرنے لگے تھے۔ لیکن مغربی یورپ کی کیمونسٹ جماعتیں اور ٹریڈ یونین والے اپنے

حامیوں کے مزاج کو سب سے پہلے اہمیت دینے لگے تھے۔ دوسری جانب' ان ملکوں میں کیمونزم کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا تو اس پر روس کلمہ تحسین بلند کرتا بشرطیکہ یہ کسی بڑائی جنگ کا پیش خیمہ ثابت نہ ہوتا۔ اور اب یہ بات باسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ان دنوں جارج کینن جیسے روسی ماہرین نے جب یہ بحث چھیڑی تھی کہ سوویت یونین کو "محدود" کر دیا جائے تو ان کی رائے کو ہموار انہ انداز میں سنا گیا تھا۔

دفاعی حد بندیوں کے سلسلے میں جو متنوع لائحہ عمل پیش کیے جاتے رہے' ان میں دو باقی رہنے والے حسب ذیل تھے: اول ماسکو پر یہ واضح کر دیا جائے کہ امریکہ دنیا کے چند علاقوں کو دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے کی اجازت ہرگز نہیں دے گا۔ لہٰذا ان ملکوں کو فوجی امداد فراہم کی جائے گی تاکہ وہ اپنی قوت مزاحمت کو فروغ دے سکیں اور اگر روس نے ان پر حملہ کیا تو اسے جنگ کا جواز سمجھا جائے گا۔ اس کا نہایت مثبت پہلو یہ تھا کہ امریکہ کے خیال میں روس کی مزاحمت کرنے کی صلاحیت دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ماند پڑ گئی ہے۔ لہٰذا حد بندی کی طویل المیعاد پالیسی کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ امریکہ ایک جامع پروگرام بنائے جس کے تحت اقتصادی امداد دی جائے اور یورپ اور جاپان کے جن شہروں' کارخانوں' اور فارموں کو جنگ سے نقصان پہنچا ہے ان کی از سر نو تعمیر کی جائے۔ اس طرح یہ ممالک کیمونسٹ نظریے کے تحت طبقہ واریت اور انقلاب کے سحر سے محفوظ رہیں گے اور طاقت کے توازن کو امریکہ کے حق میں جھکانے میں ممد معاون ثابت ہوں گے۔ کینن نے جیو پولٹیکل لحاظ سے دنیا میں صنعتی اور فوجی طاقت کے پانچ مراکز قرار دیے ہیں جو ہماری قومی سلامتی کے لیے نہایت اہم ہیں۔ ان میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ' اس کا دشمن ملک سوویت یونین' برطانیہ عظمیٰ' جرمنی اور وسطی یورپ اور جاپان ہیں۔ پھر اس کا یہ کہنا ہے کہ آخری تین ملکوں کو مغربی کیمپ میں رکھا جائے اور ان کی طاقت کو فروغ دیا جائے تو اس کے نتیجے میں ایسی مجموعی قوت کا تصور ہو گا جس کے سامنے سوویت یونین کی حیثیت ادنیٰ درجے کی ہو جائے گی۔ لیکن یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسی حکمت عملی اسٹالن کے روس کے لیے مشکوک بن جائے گی' خصوصاً اس لیے کہ اس بلاک میں اس کے حالیہ دو دشمن جرمنی اور جاپان بھی شامل ہوں گے۔

یہاں یہ بات پھر کہی جائے گی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہر دو فریق نے جو مختلف اقدامات کیے تھے ان کی تاریخی ترتیب اتنی اہمیت کی حامل نہیں جتنے قدر و قیمت کے حامل ان سے پیدا شدہ نتائج ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ نے برطانیہ کی جگہ یونان اور ترکی کی ضمانت اپنے سر لے لی۔ گویا اس طرح یہ ذمہ داری ایک پرانے عالمی پولیس مین کی جگہ ایک نئے اور ابھرتے ہوئی تھانیدار کے سپرد کر دی گئی۔ پھر جو منطقی رویہ کبھی لندن کا رہا تھا' اب وہ واشنگٹن اپنا رہا تھا۔ ٹرومین نے اس حقیقت کی یہ تصدیق بھی یہ کہہ کر پیش کر دی کہ یہ ایک ایسا سیاسی نظریہ ہے جو کسی بھی علاقے تک محدود نہیں۔ تاہم یورپی نقطہ نظر سے امریکہ کی یہ خواہش کہ وہ آزاد خیال لوگوں کی امداد کرے' مختلف تناظر میں دیکھی جانے لگی۔ یعنی بڑھتے ہوئے اقتصادی بحران کو کس طرح حل کیا جائے گا' غذائی اشیاء کی کمی کس طرح پوری کی جائے گی۔ اور پھر کوئلے کا فقدان کس طرح ختم ہو گا۔ یہ وہ مسائل تھے جو پورے براعظم کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے۔ امریکہ نے اس کا حل ایک مارشل پلان کی صورت میں نکالا جس کے ذریعے یورپ کو اقتصادی لحاظ سے مستحکم کرنا تھا۔

چنانچہ یہ امداد تمام یورپی ممالک کو دی گئی چاہے وہ کیمونسٹ ہو یا نہ ہو۔ اس امداد کی وصولیابی سے ماسکو میں جس قسم کا بھی تاثر ابھرا ہو' لیکن مغربی یورپ کے ساتھ باہمی تعاون کا رجحان ضرور پیدا ہو گیا۔ یہ صورت اس وقت سامنے آئی جب سوویت یونین کے معاشیات کو اشتراکی اور اجتماعی نظریے کے تابع کر دیا گیا تھا۔ کسی دانشور نے بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ پلان کی اصل روح یہ تھی کہ یورپ کے تمام باشندوں کو قائل کیا جائے کہ کیمونزم کے برعکس نج کاری ہی وہ واحد طریقہ ہے جو ان کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پلان کے سلسلے میں پیرس میں ہونے والی میٹنگ سے مولوتوف احتجاجاً" واک آؤٹ کر گیا اور سوویت یونین نے پولینڈ اور چیکو سلواکیہ کو امداد مانگنے سے منع کر دیا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ پہلے سے بھی کہیں زیادہ منقسم ہو گیا۔ ادھر مغربی یورپ کے بڑے بڑے ممالک مثلاً" برطانیہ' فرانس' اٹلی اور مغربی جرمنی کو امریکہ سے بلین ڈالروں کی امداد ملی۔ چنانچہ وہاں کی معاشیات کو خاصا فروغ حاصل ہوا اور شمالی بحراوقیانوس کے علاقے میں تجارت کا ایک مربوط نظام قائم ہو گیا۔ ادھر مشرقی یورپ پر کیمونسٹوں کی گرفت اور بھی سخت ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں "کومن فارم" قائم کیا گیا جو کیمونسٹ انٹرنیشنل کی تبدیل شدہ ہیئت تھی اور اسکے نصف کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ پراگ میں نظریہ تکثیریت کی حامی حکومت کو کیمونسٹوں نے ۱۹۴۸ء میں ایک انقلاب کے ذریعے ختم کر دیا۔ اگرچہ ٹیٹو کی قیادت میں یوگو سلاویہ اسٹالن کے عتاب سے بچ گیا' لیکن دوسری طفیلی ریاستیں نشانہ بننے کی منتظر تھیں۔ بالاخر ۱۹۴۹ء میں انھیں کمکون (باہمی اقتصادی امدادی کونسل) میں شرکت کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ سوویت یونین کا مارشل پلان تو قطعی نہ تھا البتہ طفیلی ریاستوں کو نچوڑنے کی ایک مشین ضرور تھی۔ جب چرچل نے ۱۹۴۶ء میں "فولادی چادر" کی اصطلاح استعمال کی تھی' اس وقت یہ بات قبل از وقت لگتی تھی' لیکن دو سال بعد ان الفاظ کی حقیقت سب پر آشکارا ہو گئی۔

مشرقی اور مغربی یورپ میں جو اقتصادی کھچاؤ تھا وہ فوجی نقطہ نظر سے اور بھی گمبھیر ہو گیا۔ اور جرمنی دوبارہ سارے جھگڑے فساد کا مرکز بن گیا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ اور فرانس نے ڈنکرک ٹریٹی پر دستخط کیے تھے۔ اس کی رو سے ہر ایک اس بات کا پابند تھا کہ جرمنی کے حملے کی صورت میں دوسرے کی بھرپور فوجی مدد کرے گا۔ ویسے انگلستان کی وزارت خارجہ نے یہ کہا تھا کہ یہ فوجی دستہ سراسر غیر عملی ہو گا اور اس کی تمام تر توجہ مغربی یورپ کی اندرونی خامیوں کو دور کرنے پر مبذول ہو گی۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں برسلز ٹریٹی کے ذریعے مذکورہ معاہدے میں توسیع کر دی گئی تاکہ بلجیم' ہالینڈ اور لکسمبرگ کو بھی شامل کیا جا سکے۔ آخر الذکر معاہدے میں جرمنی کا کہیں بھی نام نہیں تھا' لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ مغربی یورپ کے کئی سیاست دان جرمنی کے مسئلے سے تشویش میں مبتلا تھے لیکن ۱۹۴۸ء کے اختتام کے بعد ان کی تشویش اور بھی گمبھیر ہو گئی۔ جس مہینے میں برسلز ٹریٹی پر دستخط ہوئے تھے' انہی دنوں روس چہار طاقتی کنٹرول کونسل برائے جرمنی سے واک آؤٹ کر گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مذکورہ ملک کے مستقبل کی معاشی اور سیاسی صورت حال کے سلسلے میں مغربی یورپ والوں سے اس کا اختلاف ہے۔ تین مہینے بعد' مغربی یورپ پر کنٹرول رکھنے والی تین طاقتوں نے نیا جرمن سکہ جاری کرنے کا اعلان کیا تاکہ چور بازاری اور کرنسی کے بحران کو ختم

کیا جا سکے۔ اس اقدام کے جواب میں روس نے نہ صرف اپنے علاقے میں مغربی جرمنی کے نوٹ ممنوع قرار دیے بلکہ برلن اور اس کے سو میل کے اطراف میں مغربی اثرات کی بیخ کنی کے لیے پرزور انداز میں تحریک چلائی۔

اگر ملک کے لیے کوئی چیز شدید مخالفت کا سبب بن سکتی تھی تو وہ برلن کا ۴۹-۱۹۴۸ء کے عرصے میں پیدا ہونے والا بحران تھا۔ اس وقت واشنگٹن اور لندن میں سرکاری افسران اس امر کا جائزہ لے رہے تھے کہ یورپی ملکوں' سلطنتوں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ پر مشتمل ایسا گروپ قائم کیا جائے جو روس کے ساتھ محاذ آرائی کے موقع پر باہم ساتھ ہو۔ مارشل پلان کی طرح' امریکیوں کی یہ خواہش تھی کہ اہل یورپ فوجی تحفظ کے لیے بھی ایک منصوبہ بنائیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت امریکہ نے کتنی سنجیدگی سے روس کا چیلنج قبول کیا تھا۔ روس میں جو سرخی مائل خوفناک غبارہ چھوڑا گیا تھا' اس کے اثرات دور دور تک پھیل رہے تھے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں صدر ٹرومین نے کانگریس سے جبری بھرتی کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ "سلیکٹو سروس ایکٹ" مجریہ جون ۱۹۴۸ء کے تحت اس کی منظوری دے دی گئی۔ یہ سارے اقدامات اس لیے کرنے پڑے تھے کہ روس نے برلن تک جانے کے تمام خشکی کے راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ اس وقت امریکہ اور برطانیہ کی فضائی قوت اتنی بیکراں تھی کہ گیارہ مہینے تک برلن کو اشیائے صرف فراہم کی جاتی رہیں اور اسٹالن کا عزم دھرا کا دھرا رہ گیا۔ بالاخر خشکی کا راستہ کھل گیا۔ اس وقت بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ فوجی دستہ بھیج کر برلن تک پہنچنے کا راستہ بزور شمشیر حاصل کر لیا جائے لیکن مشکل سے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ کیا ایسی صورت میں جنگ چھڑ نہ جاتی؟ انہی دنوں امریکہ نے ایک نئے معاہدے کے تحت برطانیہ کے ہوائی اڈے کو بی-۲۹ بمبار جہاز فراہم کیے تھے۔ اس بات سے ان ملکوں کا ارادے کا پتہ چل جاتا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر لیے دیے رہنے والے سینیٹر حضرات بھی حرکت میں آ گئے اور نیٹو کی تشکیل کی مکمل حمایت کرنے لگے۔ ان کی رائے تھی کہ امریکہ کو اس کا سرگرم ممبر ہونا چاہیے۔ پھر یورپی ممالک کو شمالی امریکہ کی مدد کے درپردہ فوجی مقصد بھی کارفرما تھا۔ اپنے قیام کے ابتدائی برسوں میں نیٹو نے دفاعی اقدام کرنے کی بجائے سیاسی امور پر زیادہ توجہ دی تھی۔ اس طرح امریکی سفارت کاری کی روایت میں تبدیلی بھی آئی۔ اب برطانیہ کی جگہ امریکہ صف اول کی طاقت بن چکا تھا اور گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اب وہ براعظم یورپ میں توازن قائم کرنے کی دھن میں لگ چکا تھا۔ علاوہ ازیں' امریکی اور برطانوی حکومت کی نظر میں اب ضروری کام یہ انجام دینا تھا کہ معاہدہ برسلز کے دستخط کنندگان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ' کینیڈا کو ایک ڈوری میں باندھنا تھا۔ پھر ناروے اور اٹلی کو جو خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے' باہمی طور پر امداد دینے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ جب نیٹو کے معاہدے پر دستخط ہوئے تھے' اس وقت امریکی فوج کے ------ محض ۱۰۰۰۰۰ دستے ------ یورپ میں تعینات کیے گئے تھے جبکہ ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد تین ملین تھی۔ علاوہ ازیں' فرانس کے سات ڈویژن' برطانیہ کے دو ڈویژن' امریکہ کے دو ڈویژن اور بلجیم کے ایک ڈویژن وہاں موجود تھے۔ ان سب کی تعیناتی کا مقصد یہ تھا کہ اگر مغربی سمت سے روسی فوج پیش قدمی کرے تو اس کی مزاحمت کی جائے۔ حالانکہ اس وقت روسی فوج اتنی تعداد میں وہاں موجود نہ تھی

اور جو تھی وہ حملہ کرنے اور آگے بڑھنے کے قابل نہ تھی' لیکن مغربی یورپ اس کے برعکس واویلا کرتا رہا۔ اس طرح ہر بلاک میں فوج کا توازن بگڑ گیا تھا جو باعث تشویش تھا۔ تھوڑے عرصے بعد اس تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ لوگوں نے یہ باور کر لیا کہ کیمونسٹ شمالی جرمنی کے علاقے میں اسی طرح دندناتے گھس آئیں گے جس طرح وہ جنگ کوریا کے زمانے میں یالو پہنچ گئے تھے۔ گویا اس طرح نیٹو کی فوجی حکمت عملی کے تحت سوویت یونین کے حملے کا جواب دینے کے لیے دور تک مار کرنے والے بمبار جہازوں پر تکیہ کیا جانے لگا' ساتھ ہی ساتھ روایتی انداز کی بری فوج تیار کرنے کا منصوبہ بھی زیر عمل تھا۔ اس اقدام کے نتیجے میں صف اول کی تینوں طاقتیں' یعنی امریکہ' کینیڈا اور برطانیہ' براعظم یورپ میں فوجی مشن انجام دینے پر مجبور تھیں۔ ان کا یہ ایک ایسا عمل تھا جسے ۱۹۳۰ء کے عشرے کے فوجی منصوبہ ساز بھی دیکھ کر حیران رہ گئے ہوں گے۔

نیٹو کے اتحاد نے فوجی لحاظ سے وہی کچھ کر دکھایا جو مارشل پلان نے اقتصادی لحاظ سے انجام دیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں یورپ دو کیمپوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ نیٹو کے اثرات کی وجہ سے یہ تقسیم اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔ سوئٹزر لینڈ اور سویڈن جیسے روایتی قسم کے غیر جانب دار ملک الگ تھلگ رہے۔ فن لینڈ' آسٹریا اور یوگو سلاویہ کسی دھڑے میں شامل نہیں تھے۔ بعد میں سوویت یونین کی سرکردگی میں جو وارسا پیکٹ روبہ عمل آیا' اس نے صورت حال کو اور بھی گھمبیر بنا دیا۔ تقسیم کے دور رس اثرات کے نتیجے میں جرمنی کے دونوں حصوں کے آپس میں متحد ہو جانے کے امکانات معدوم ہو گئے۔ فرانس کی تشویش کے باوجود مغربی جرمنی ۱۹۵۰ء کے آخری عشرے میں نیٹو کے دائرہ کار کے تحت اپنی بری فوج کو مستحکم کرنے لگا۔ ویسے جرمنی کا یہ اقدام منطقی بھی تھا۔ البتہ یہ مغربی یورپ پر منحصر تھا کہ وہ فوجیوں کے درمیان حائل خلا کو پر کرنا چاہتا تھا یا نہیں؟ بہرحال اول الذکر اقدام کے نتیجے میں سوویت یونین مشرقی جرمنی کی افواج کو خصوصی انتظام و انصرام کے تحت مستحکم کرنے لگا۔ جرمنی کے ہر دو حصے کسی نہ کسی فوجی اتحاد سے وابستہ تھے۔ چنانچہ ہر بلاک کے لیے یہ ناگزیر ہو گیا کہ وہ مستقبل میں جرمنی کے غیر جانب دار ہو جانے کے معاملے میں چوکنا رہے' بصورت دیگر خود اس حمایتی ملک کے تحفظ و سلامتی کو زک پہنچ سکتی تھی۔ روس نے اس معاملے میں تو محتاط رویہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۵۳ء میں اسٹالن کی موت کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا گیا کہ جو بھی ملک کیمونسٹ بن چکا ہے وہ اس نظریے سے انحراف نہیں کرے گا۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کونسل نے پرائیویٹ نجی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ مشرقی یورپ کی طفیلی ریاستیں یا تو جنگ کے ذریعے ہی آزاد کرائی جا سکتی ہیں یا پھر روس انھیں خود آزادی کا پروانہ عطا کر دے"۔ لیکن بارٹ لٹ نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا: "دونوں صورت ممکن نہیں"۔ ۱۹۵۳ء میں مشرقی جرمنی میں ایک شورش بپا ہوئی تھی جسے فوراً" ہی کچل دیا گیا۔ جب روس کو یہ سن گن ملی کہ ہنگری نے وارسا پیکٹ سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اس نے ۱۹۵۶ء میں اپنی فوج دوبارہ وہاں بھیج دی اور اس ملک کی آزادی سلب کر لی۔ ۱۹۶۱ء میں خروشیف نے دیوار برلن تعمیر کرنے کا حکم نافذ کیا تاکہ ذہین لوگوں کو مغربی حصے میں جانے سے روکا جا سکے۔ ۱۹۶۸ء میں اہل چیکو سلواکیہ کے ساتھ بھی وہی ہوا جو بارہ سال قبل ہنگری والوں کے ساتھ ہوا تھا۔ ویسے خون خرابہ کم ہوا تھا۔ سرکاری پروپیگنڈہ کے باوجود روسی قیادت اتنی نااہل تھی کہ وہ مغربی یورپ کی نظریاتی اور اقتصادی اپیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی

تھی۔ البتہ اس نے دونوں بلاک کے درمیان تقسیم کو اور بھی گھمبیر بنا دیا۔

سرد جنگ جو یورپ سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیل گئی' کی دوسری خصوصیت حیران کن نہیں۔ دوران جنگ روس کی تمام تر توجہ جرمنی سے درپیش خطرات کی جانب مبذول رہی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ماسکو نے ترکی' فارس اور مشرق بعید سے وابستہ اپنی دلچسپیاں ختم کر دی تھیں۔ اگست ۱۹۴۵ء میں سوویت یونین نے اس کی باقاعدہ وضاحت کر دی تھی۔ لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ یورپی معاملات میں مغرب کے ساتھ روس کا جھگڑا جغرافیائی لحاظ سے محض براعظم تک ہی محدود رہتا۔ دوسرے یہ جھگڑا بھی اصولی طور پر عالمی اہمیت کا حامل تھا' یعنی خود مختار حکومت بمقابلہ قومی سلامتی' معاشی آزادی بمقابلہ سوشلسٹ منصوبہ بندی' وغیرہ وغیرہ! سب سے اہم بات یہ کہ اس جنگ کی وجہ سے بلقان سے لے کر شرق الہند تک سماجی اور سیاسی ابتری پھیل گئی تھی۔ حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جہاں فوج نے براہ راست حملہ نہیں کیا تھا' مثلاً ہندوستان یا مصر' افرادی قوت' وسائل اور خیالات تبدیلیوں کی زد میں تھے۔ پرانا سماجی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ نوآبادیاتی حکومتیں اپنی ساکھ کھو چکی تھیں۔ نیشنلسٹ جماعتیں زیر زمین پھل پھول رہی تھیں۔ مزاحمتی تحریکیں عروج پر تھیں۔ یہ سب فوجی لحاظ سے فتح کے حصول کے لیے کوشاں تھیں اور سیاسی تبدیلی لانے کی متمنی تھیں۔ گویا ۱۹۴۵ء میں تمام دنیا میں ایک سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ یہ تمام واقعات بڑی طاقتوں کے لیے باعث تشویش بن چکے تھے اس لیے کہ وہ تو جلد از جلد زمانہ امن کو دوبارہ بحال کرنے کی فکر میں مبتلا تھیں۔ لیکن یہ صورت حال سپرپاورز کے لیے سود مند بھی تھی جو عالمی سطح پر اپنے نظریات کو مشتہر کرنے کے آرزو مند تھے۔ وہ ان لوگوں کی حمایت حاصل کر سکتے تھے جو فرسودہ نظام کے نئس بوس ڈھانچے سے دوبارہ سر اٹھا رہے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جنگ کے دنوں میں اتحادی ملکوں نے ایسی تمام مزاحمتی تحریکوں کی امداد کی تھی جو اپنے جرمن اور جاپانی آقاؤں کے خلاف جدوجہد کر رہی تھیں۔ چنانچہ یہ فطری بات تھی کہ ایسی جماعتیں ۱۹۴۵ء کے بعد بھی مدد جاری رہنے کی متمنی تھیں' ویسے وہ مخالف گروپ سے بھی جوڑ توڑ کر رہی تھیں۔ ان جماعتوں میں بعض کیمونسٹ نظریے کی حامل تھیں اور بعض کیمونزم کی شدید مخالف تھیں۔ چنانچہ ماسکو اور واشنگٹن کے فیصلہ سازوں کے لیے ان میں امتیاز کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اپنی عالمی مصروفیات کے عالم میں علاقائی جھگڑوں کو نمٹانے میں الجھن محسوس کر رہے تھے۔ ادھر یونان اور یوگو سلاویہ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ مقامی نوعیت کا جھگڑا کس طرح تیزی کے ساتھ بین الاقوامی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔

روس اور مغرب میں غیر یورپی نوعیت کے جھگڑے دراصل جنگ کے باقیات میں تھے۔ ۱۹۴۱-۳ء میں ایران کو سہ رخی فوجی تحفظ کے نظام کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ اتحادیوں کے کیمپ سے وابستہ رہے۔ دوسرے کوئی بھی اتحادی ملک ایران کی حکومت سے ناجائز قسم کا معاشی فائدہ حاصل نہ کرے۔ جب ماسکو نے ۱۹۴۶ء کے اوائل میں اپنا فوجی دستہ واپس نہیں بلایا بلکہ شمال میں علیحدگی پسند اور کیمونزم کی حمایتی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگا تو برطانیہ نے اس پر اعتراض کیا اور روس کے اثرات کی بیخ کنی کرنی چاہی جس سے تناؤ خاصا بڑھ گیا۔ لیکن جب صدر ٹرومین کی انتظامیہ نے سخت

احتجاج کیا تو معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب روسی فوج واپس چلی گئی تو اس کے فوراً" بعد ایرانی فوج نے شمالی صوبوں اور تودہ پارٹی (جو کمیونزم کی ہم خیال تھی) پر سختی کرنا شروع کر دیا۔ اس سے واشنگٹن کو خاصا اطمینان ہوا اور صدر ٹرومین کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ روس سے سخت لہجے ہی میں بات کرنی چاہیے۔ یولیم کا خیال ہے کہ اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ نظریے کی توسیع سے پہلے مزاحمت ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ دنیا میں جہاں کہیں بھی روس کے عملی اقدامات کی خبر ملتی' واشنگٹن نفسیاتی طور پر رد عمل ظاہر کرنے کے لیے پوری طرح تیار رہتا۔ چنانچہ جب یونان میں خانہ جنگی جاری رہی' ماسکو ترکی پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنی سرحد سے ملحقہ علاقوں کو رعایت دے اور ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ مذکورہ دونوں ملکوں کی حمایت نہیں کر سکتا تو ٹرومین کے نظریے کے مطابق امریکی عوام معاملے کو ہاتھ میں لینے کے لیے متحرک ہو گئے۔ اپریل ۱۹۴۶ء سے ہی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ برطانیہ اور اس کی کامن ویلتھ کی مدد کی جائے۔ چنانچہ ان خیالات کی تکمیل اور بحیرہ روم اور مشرق وسطیٰ میں روسی عزائم کی مزاحمت کرنے والے ملکوں کے ساتھ واشنگٹن کے روابط پیدا کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ امریکہ کی خارجی پالیسی کتنی تیزی کے ساتھ مختلف النوع معاملات کو باہم مربوط کر رہی تھی۔

دنیا میں کمیونزم کے پھیلتے ہوئے اثرات کے تحت مغربی طاقتوں نے مشرق بعید میں ہونے والی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیا تھا۔ شرق الہند میں سوئیکار نو کی قومی تحریک کے زیر اثر ولندیزیوں کو وہاں سے نکالا جا رہا تھا۔ فرانسیسی ہوچی منہ کے حمایتی لوگوں سے محاذ آرائی میں ملوث ہو گئے تھے۔ ادھر ملایا میں برطانیہ جوابی حملے میں معروف تھا۔ اگر نہر سویز کے مشرق میں کمیونسٹوں کا وجود نہ ہوتا تو ان قدیم نوآبادیوں کا جواب بھی سخت ترین ہوتا۔ (دوسری طرف' ۱۹۴۰ء کے اواخر میں واشنگٹن کی ہمدردی کا حصول فائدے سے خالی نہیں رہا۔ فرانس کو تو باقاعدہ فوجی امداد بھی ملی۔ ان سب باتوں کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ماسکو ان شورش پسندوں کو ترغیب دے رہا ہے۔ لیکن چین کے ہاتھوں سے نکل جانے سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے مقابلے میں دور دراز جنوب میں پیدا ہونے والے خلفشار اتنے اہم نہ تھے۔ امریکہ نے انیسویں صدی میں عیسائیت کو فروغ دینے کے لیے سخت کوشش کی تھی۔ ثقافتی اور نفسیاتی (اس میں مالی امداد بہت کم تھی) لحاظ سے اس وسیع اور کثیر الآباد ملک میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے خاصا سرمایہ لگایا تھا اور یہ سب کچھ دوران جنگ چیانگ کائی شیک کی حکومت نے ہوا میں تحلیل کر دیا۔ امریکہ نے چین کے واقعہ کا جس طرح اثر لیا تھا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض مذہبی جذبہ نہ تھا' کچھ اور مشن تھا۔ اگرچہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسران اور امریکی فوج دونوں اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کومن تانگ رشوت اور نااہلی کا مجموعہ ہے' اس کے باوجود انھوں نے نہ تو اس جانب توجہ دی اور نہ ہی عوام کی رائے کو در خور اعتنا سمجھا' خصوصاً" ریپبلکن پارٹی کے حقوق سے صرف نظر کرتے رہے حالانکہ ۱۹۴۰ء کی آخری دہائی سے وہ عالمی سیاست کا غائر مطالعہ کر رہی تھی۔

مشرق میں سیاسی بے چینی کی جو کیفیت موجود تھی اس سے واشنگٹن کے کرتا دھرتا گومگو کے عالم میں تھے۔ ایک طرف امریکہ کے جمہوری مزاج عوام نہ تو حد سے زیادہ بگڑی ہوئی تیسری دنیا کی

حمایت کرنے پر آمادہ تھے اور نہ ہی زوال پذیر نوآبادیاتی سلطنتوں کو سہارا دینا چاہتے تھے۔ دوسری طرف یہ لوگ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ "انقلاب پسند جماعتیں" مزید وسعت اختیار کریں کیونکہ اس صورت میں ماسکو کے اثرات پھیل جانے کا خطرہ تھا۔ ویسے ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکمران کو ہندوستان چھوڑ دینے پر آمادہ کرنا سستا" آسان تھا اس لیے کہ یہاں معاملہ ایک پارلیمانی جمہوری ملک کو نہرو کی زیر قیادت اقتدار منتقل کرنے کا تھا☆۔ یہی سب کچھ ۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا میں ہوا جہاں ولندیزی حکومت کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ ویسے واشنگٹن وہاں ہونے والی کمیونسٹوں کی بغاوت سے بہت زیادہ فکر مند تھا۔ یہی صورت فلپائن میں بھی ہوئی تھی۔ (اسے ۱۹۴۶ء میں آزادی دے دی گئی تھی۔) ویسے ہر جگہ حالات گردش میں تھے۔ یہاں ایک مثال پیش کرنا مناسب رہے گا۔ امریکہ نے پہلے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جاپانی معاشرے کو سماجی طور پر ترقی دی جائے اور اس کی افواج کو کم کر دیا جائے۔ لیکن اس جانب بھرپور توجہ دینے کی بجائے واشنگٹن کے منصوبہ سازوں نے جاپان کی معیشت کو فروغ دینے کے لیے آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔ اس کے لیے بڑی بڑی فرمیں قائم کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ (مثلاً" زیباتسو)۔ حتیٰ کہ جاپان کو اپنی فوج رکھنے پر آمادہ کیا گیا۔ ان تمام اقدامات کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ پر جاپان کو اقتصادی اور فوجی امداد دینے کا جو بوجھ تھا وہ کم سے کم ہو' دوسرے یہ ملک کمیونسٹوں کے خلاف ایک قلعے کی حیثیت اختیار کر لے۔

واشنگٹن کی حکومت کو یہ اقدامات دو اسباب کی بنا پر کرنے پڑے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ٹرومین اور ایچیسن کی "مزاحمت والی پالیسی" پر ری پبلکن جماعت' ابھرتے ہوئے سیاست دان جو میکارتھے اور اس کی انتظامیہ سے وابستہ سخت مزاج لوگ جانسن' جان فوسٹر ڈلس' ڈین رسک اور پال نٹزے مسلسل تنقید کر رہے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ ----- صحیح قدم اٹھائیں اور اندرون ملک سیاسی ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ دوسری وجہ ۱۹۵۰ء میں شمالی کوریا کا ۳۸ ویں عرض بلد کے علاقے پر حملہ تھا۔ امریکہ نے یوں تو فوراً" اس معاملے میں مداخلت کی لیکن ایک ایسا حصہ جو جارحانہ لحاظ سے "ماسٹر پلان" کا درجہ

☆ فاضل مصنف نے صرف نہرو کا نام لے کر یہ باور کرانا چاہا ہے کہ انگریزوں نے جب ہندوستان چھوڑا تو یہ ملک مذکورہ سیاست دان کی زیر قیادت آزادی سے ہمکنار ہوا اور اسے ہی اقتدار منتقل کیا گیا۔ تعجب ہے کہ پروفیسر پال کینیڈی جیسے وسیع النظر مورخ اور عالمی امور کے ماہر یہاں پاکستان کا ذکر کرنے سے پہلو بچا گئے۔ انھوں نے اپنی اس معرکۃ الآرا تصنیف میں تو ایسے ایسے ملکوں کا نام لکھا ہے جو پاکستان کے پاسنگ بھی نہیں تھے' مثلاً" برونائی' سنگاپور' صومالیہ' کینیا' یمن وغیرہ! دلچسپ بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے پورے ہندوستان کو نہرو کی گود میں ڈال دیا اور قارئین کو پتہ بھی نہیں چلنے دیا کہ اس تقسیم کا کوئی اور بھی حقدار تھا (جو الحمد اللہ ہے اور رہے گا) وہاں اگلی ہی سطروں میں انڈونیشیا کی آزادی کا بڑے طمطراق سے ذکر کر دیا۔ حالانکہ اپنے ابتدائی دنوں میں پاکستان تمام اسلامی ممالک میں زیادہ عظمت و سربلندی کا حامل تھا۔(مترجم)

رکھتا تھا ماسکو کی دسترس میں چلا گیا۔ بایں ہمہ' ان دو عوامل نے امریکی حکومت کے' ان افراد کو جو یہ چاہتے تھے کہ ان مذموم واقعات کو روکنے کے لیے سخت اور مزاحمتی پالیسی اختیار کی جائے' خاصی تقویت فراہم کردی۔ اس زمانے کے بااثر صحافی اسٹیوارٹ السپ نے لکھا تھا: ایشیا نہایت تیزی سے ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ ادھر کریملن اس معاملے میں نہایت پر جوش بھی تھا اور سختی سے ضرب لگانے والا بھی۔ اس کا خیال تھا:

> ہماری راہ میں چین سب سے بڑی رکاوٹ ------ تھی جو پہلے ہی دور ہو چکی ہے۔ دوسری کمتر درجے کی رکاوٹ برما اور ہند چینی جیسے ملک ہیں۔ اگر یہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے تو سیام' ملایا اور انڈونیشیا کی شکل میں جو تین مزاحمتیں ہیں' وہ بھی کالعدم ہو جائیں گی۔ اسی طرح بقیہ ایشیا بھی قابو میں آگیا تو نفسیاتی' سیاسی اور اقتصادی کشش کے باعث نچلے درجے کے چاروں ممالک یعنی ہندوستان' پاکستان' جاپان اور فلپائن بھی ہماری جانب کھنچے چلے آئیں گے۔"

ذہنیت کی تبدیلی کے نتیجے میں پورے مشرقی ایشیا کے متعلق امریکی پالیسی متاثر ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کا پہلا اقدام یہ تھا کہ جنوبی کوریا کو زیادہ سے زیادہ امداد فراہم کی جائے۔ اس وقت وہ ایک معصوم قسم کا مظلوم نظر آتا تھا اور لڑائی چھڑ جانے کی صورت میں الزام بھی اسی پر آتا۔ شروع میں تو امریکہ نے فضائی اور بحری فوج بھیج کر اس کی مدد کی۔ بعد ازاں' بری فوج اور میرین ڈویژن بھی روانہ کیے۔ اس طرح میکارتھر کو اپنے جوابی حملے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ یہ صورت اس وقت تک رہی جب تک اقوام متحدہ کی فوجیں شمال کی جانب پیش قدمی نہ کر گئیں۔ لیکن ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ چین طیش میں آگیا اور اس نے اکتوبر / نومبر ۱۹۵۰ء میں بذات خود اس معاملے میں مداخلت کی۔ امریکی فوج کو ایٹم بم استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا' لیکن انھیں یہ تاکید ضرور کی گئی تھی کہ وہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی طرح جنگ خندق کے طریقے اپنائیں۔ جون ۱۹۵۳ء میں جنگ بندی ہو گئی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یہ جنگ لڑنے کے لیے ۵۰ بلین ڈالر خرچ کیے تھے۔ اس نے ۲ ملین فوجیوں کو محاذ پر بھیجا تھا جن میں ۵۴۰۰۰ ہلاک ہو گئے تھے۔ اگرچہ امریکہ شمالی کوریا سے متصادم ہوا تھا' لیکن اس نے جنوبی کوریا کو بھی فوجی امداد دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور اب اس وعدے سے منحرف ہونا ممکن نہیں۔

مذکورہ لڑائی کے نتیجے میں ایشیا کے متعلق امریکی پالیسی میں نہایت اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ ۱۹۴۹ء کے آتے آتے ٹرومین کی انتظامیہ کے بہت سے افراد نے بد دل ہو کر چیانگ کائی شیک کی حمایت کرنی ترک کر دی تھی۔ وہ تائیوان کی ادنیٰ و حقیر حکومت کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برطانیہ کی طرح امریکہ بھی ماؤ کی کیمونسٹ حکومت کو تسلیم کر لے۔ لیکن اگلے ہی سال امریکہ نے اپنا بحری بیڑا بھیج کر تائیوان کو تحفظ فراہم کیا۔ ساتھ ہی ساتھ چین کو سخت ترین دشمن سمجھ لیا گیا۔ چنانچہ میکارتھر کا خیال تھا کہ اس کے جارحانہ عزائم کو کچلنے کے لیے ایٹمی ہتھیار استعمال کیے جائیں۔ چونکہ انڈونیشیا سے امریکہ کو خام

مال اور غذائی اشیاء حاصل ہوتی تھیں' لہٰذا اس ملک کی قدر و اہمیت مسلم تھی۔ اسی خیال کے پیش نظر وہاں قائم ہونے والی نئی حکومت کو مالی امداد فراہم کی گئی تاکہ وہ کیمونسٹوں کی شورشوں کو دبا سکیں۔ رہا معاملہ ملایا کا تو اس سلسلے برطانیہ کو آمادہ کیا گیا کہ وہ بھی امریکی رویے کی پیروی کرے۔ ادھر فرانس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ ہند چین میں عوام کی نمائندہ حکومت تشکیل دے۔ اب امریکی حکومت پوری طرح تیار تھی کہ وہ ہوچی منہ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہند چین کو اسلحہ اور مالی امداد فراہم کرے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ امریکی عوام اخلاقی اور ثقافتی لحاظ سے کیمونزم کی بڑھتی ہوئی تحریک کی محض مزاحمت کرنا چاہتے تھے' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت ہر علاقے میں فوج بھیج کر اس کے تحفظ و سلامتی کی ضمانت دینے گی۔ یہ صورت حال خصوصاً" اس وقت پیدا ہوئی جب ڈلس سکریٹری آف اسٹیٹس مقرر ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اگست ۱۹۵۱ء میں ایک سمجھوتے کے تحت فلپائن میں امریکہ کو فضائی اور بحری اڈا بنانے کے حقوق مل گئے تھے۔ اس کے عوض امریکہ نے تمام جزائر کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ چند ہی دنوں بعد امریکی حکومت نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا تھا۔ پھر ایک ہفتے کے بعد جاپان کے ساتھ صلح و آشتی کا معاہدہ عمل میں آیا۔ اس سمجھوتے کے تحت بحر الکاہل کی جنگ کا خاتمہ ہو گیا اور جاپان کی مکمل بالادستی تسلیم کر لی گئی۔ لیکن اسی دن ایک تحفظاتی معاہدہ بھی ہوا جس کے تحت امریکی فوج جاپانی جزائر اور اوکی ناوا میں متعین رہتی تھیں۔ کیمونسٹ چین کے سلسلے میں امریکی پالیسی جارحانہ نوعیت کی تھی جبکہ تائیوان کے ساتھ ہمدردانہ اور تائیدی تھی۔

سرد جنگ کی تیسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ دونوں دھڑوں میں نہایت شدت سے اسلحے کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ فوجی حمایت و تعاون کے لیے اتحاد بھی قائم کیا جا رہا تھا۔ جہاں تک رقم خرچ کرنے کا سوال ہے یہ کسی طرح بھی یکساں نہیں تھا' جیسا کہ جدول نمبر ۳۷ سے واضح ہوتا ہے۔

جدول نمبر ۳۷: عظیم طاقتوں کے دفاعی اخراجات

۱۹۴۸ء لغایت ۱۹۷۰ء

(بلین ڈالر میں)

سال	امریکہ	روس	مغربی جرمنی	فرانس	برطانیہ	اٹلی	جاپان	چین
۱۹۴۸ء	۱۰٫۹	۳٫۱		۰٫۹	۳٫۳	۰٫۳		
۱۹۴۹ء	۱۳٫۵	۳٫۳		۱٫۲	۳٫۱	۰٫۵		۲
۱۹۵۰ء	۱۴٫۵	۱۵٫۵		۱٫۴	۲٫۳	۰٫۵		۲٫۵
۱۹۵۱ء	۳۳٫۳	۲۰٫۱		۲٫۱	۳٫۲	۰٫۷		۳
۱۹۵۲ء	۴۷٫۸	۳٫۹		۳	۴٫۳	۰٫۸		۲٫۷
۱۹۵۳ء	۴۹٫۶	۲۵٫۵		۳٫۳	۳٫۵	۰٫۷	۰٫۳	۲٫۵
۱۹۵۴ء	۴۲٫۷	۲۸		۳٫۶	۳٫۳	۰٫۸	۰٫۳	۲٫۵

۱۹۵۵ء	۳۰٫۵	۲۹٫۵	۱٫۷	۲٫۹	۳٫۳	۰٫۸	۰٫۳	۲٫۵
۱۹۵۶ء	۳۱٫۷	۲۶٫۷	۱٫۷	۳٫۶	۳٫۵	۰٫۹	۰٫۳	۵٫۵
۱۹۵۷ء	۳۳٫۵	۲۷٫۶	۲٫۱	۳٫۶	۳٫۳	۰٫۹	۰٫۳	۹٫۲
۱۹۵۸ء	۳۵٫۵	۳۰٫۲	۱٫۲	۳٫۶	۳٫۳	۱٫۰	۰٫۳	۵٫۸
۱۹۵۹ء	۳۶٫۶	۳۳٫۳	۲٫۶	۳٫۶	۳٫۳	۱	۰٫۳	۹٫۶
۱۹۶۰ء	۳۵٫۳	۳۶٫۹	۲٫۹	۳٫۸	۳٫۶	۱٫۱	۰٫۳	۹٫۷
۱۹۶۱ء	۳۷٫۸	۳۳٫۶	۳٫۱	۳٫۱	۳٫۷	۱٫۲	۰٫۳	۷٫۹
۱۹۶۲ء	۵۲٫۳	۳۹٫۹	۳٫۳	۳٫۵	۵	۱٫۳	۰٫۵	۹٫۳
۱۹۶۳ء	۵۳٫۲	۵۳٫۷	۳٫۹	۳٫۶	۵٫۲	۱٫۶	۰٫۳	۱۰٫۶
۱۹۶۴ء	۵۱٫۲	۴۸٫۷	۳٫۹	۳٫۹	۵٫۵	۱٫۷	۰٫۶	۱۲٫۸
۱۹۶۵ء	۵۱٫۸	۶۲٫۳	۵	۵٫۱	۵٫۸	۱٫۹	۰٫۸	۱۳٫۷
۱۹۶۶ء	۶۷٫۵	۶۹٫۷	۵	۵٫۳	۶	۲٫۱	۰٫۹	۱۵٫۹
۱۹۶۷ء	۷۵٫۳	۸۰٫۹	۵٫۳	۵٫۸	۶٫۳	۲٫۲	۱٫۱	۱۶٫۳
۱۹۶۸ء	۸۰٫۷	۸۵٫۳	۳٫۸	۵٫۸	۵٫۶	۲٫۲	۱٫۱	۱۷٫۸
۱۹۶۹ء	۸۱٫۳	۸۹٫۸	۵٫۳	۵٫۷	۵٫۳	۲٫۲	۱٫۳	۲٫۳
۱۹۷۰ء	۷۷٫۸	۷۲٫۰	۶٫۱	۵٫۹	۵٫۸	۲٫۳	۱٫۳	۲۳٫۷

۱۹۵۰ء کے بعد کئی برسوں تک امریکہ کے دفاعی اخراجات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ دراصل کوریا کی جنگ کا نتیجہ تھا۔ پھر واشنگٹن کا یہ خیال تھا کہ خطرات کے پیش نظر مذکورہ ملک کو مسلح کرنا بھی ضروری تھا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد اس خرچ میں کمی آتی چلی گئی۔ اس کی وجہ دراصل آئزن ہاور کا بروقت اقدام تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قبل اس کے کہ معاشرہ اور معاشیات دونوں تباہ ہو جائیں، دفاعی اخراجات پر کنٹرول کرنا ضروری ہے۔ ۶۳-۱۹۶۱ء میں اخراجات میں اضافے کا سبب دیوار برلن کا معاملہ اور کیوبا میں میزائل کا واقعہ تھا۔ ۱۹۶۵ء کے فوراً بعد ایک دم سے اخراجات بڑھ جانے کی وجہ جنوب مشرقی ایشیا کو امریکی تعاون کی پیشکش تھی۔ جہاں تک سوویت یونین کا معاملہ ہے تو یہ اعداد و شمار محض اندازے سے پیش کیے گئے ہیں اس لیے کہ ماسکو کی پالیسی ہمیشہ راز رہی۔ تاہم، یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء کے دوران روس میں فوجی تیاری کی وجہ دراصل مغرب سے خوف تھا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو روسی علاقوں پر تباہ کن بمباری ہو گی۔ لہٰذا لڑاکا طیارے اور میزائل کثیر تعداد میں تیار کیے گئے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک کے عرصے میں کمی کی وجہ دراصل خروشیف کی باہمی کشیدگی کو رفع کرنے کی پالیسی تھی۔ وہ دفاع کے برعکس اشیائے صرف پر خرچ کرنا زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ پھر ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء کے بعد اخراجات میں اضافے کا سبب مغرب سے انتہائی ناخوشگوار تعلقات تھے۔ پھر کیوبا کے بحران کی وجہ سے روس کی سبکی بھی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس نے یہ عزم کر لیا تھا کہ تینوں مسلح افواج کو مستحکم کرے گا۔ کیمونسٹ چین کے اخراجات نسبتاً کم تھے۔ اس کی وجہ

اقتصادی حالات تھے لیکن ۱۹۶۰ء کے عشرے دفاعی اخراجات میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماسکو سے تعلقات کشیدہ ہونے کے بعد چین اس سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جہاں تک مغربی یورپ کے ممالک کا تعلق ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ برطانیہ اور فرانس کے دفاعی اخراجات میں اضافہ کوریا کی جنگ کے دنوں میں ہوا تھا۔ پھر فرانس کے اخراجات میں ۱۹۵۴ء تک اضافہ ہوتا رہا اس لیے کہ وہ ہند چین میں الجھا ہوا تھا۔ بعد ازاں، مذکورہ دونوں ممالک مغربی جرمنی، اٹلی اور جاپان اپنے دفاعی اخراجات میں بہت معمولی اضافہ کر سکے اور اس میں بھی بسا اوقات کمی آ جاتی۔ البتہ چین میں دفاعی اخراجات بڑھتے رہے تھے۔ ویسے یہ اعداد و شمار نا درست ہیں۔ بہرحال ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں اسلحہ پر جس طرح رقم خرچ کی جا رہی تھی، اس سے یہی تاثر ملتا تھا کہ دو قطبی دنیا کا وجود ہنوز قائم ہے۔

اسلحہ کی دوڑ پوری شدت سے اور مختلف انداز میں جاری تھی۔ جب ۱۹۴۹ء میں روس کو ایٹم بم بنانے میں کامیابی حاصل ہو گئی تو اس سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ وہ نیوکلیر ہتھیاروں کی لڑائی میں روس کو زیادہ نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف قومی سلامتی کونسل کی یادداشت نمبر ۶۸، مجریہ جنوری ۱۹۵۰ء میں یہ واضح اشارہ دیا گیا تھا کہ "امریکی حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جہاں تک جلد ممکن ہو اور اتحادیوں کی فضائی، بری اور بحری طاقت کو فروغ دے۔ اور ایٹمی ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہونے کی کوشش کرے۔" یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۳ء کے دوران امریکہ کی جنگ میں محفوظ دستے کی روانگی بھی تھی۔ دوسرے نیٹو کی دفاعی قوت کو بہتر بنانے کا عزم بھی کیا گیا اور بری فوج کا اتحادیوں کی مدد سے اس قابل بنانے کا منصوبہ عمل میں آیا تھا کہ اگر روس نے مغربی یورپ پر حملہ کیا تو یہ مزاحمت کر سکے۔ اس وقت امریکہ اور برطانیہ کے منصوبہ ساز اس خطرے کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اگرچہ ان دنوں ۱۹۵۲ء کے لسبن معاہدے کے تحت اتحادیوں کے ۸۹ ڈویژن بنانے کے آثار ہویدا نہ تھے، تاہم یورپ کو مزید فوجی امداد دینے کا خیال زور پکڑ گیا تھا۔ اس رو سے امریکہ کو ۱۹۵۳ء تک ایک کی بجائے ۵ ڈویژن فوج مہیا کرنی تھی۔ اسی طرح برطانیہ جرمنی میں اپنی چار ڈویژن فوج متعین کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس طرح ۱۹۵۰ء کی وسطی دہائی میں نہایت مناسب حد تک فوجی توازن قائم ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں، اتحادیوں نے فضائیہ پر خاصی رقم خرچ کی تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں نیٹو کے پاس ۵۲۰۰ جہاز موجود تھے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ ان برسوں میں روسی فوج اور فضائیہ میں کس درجہ ترقی ہوئی تھی، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اسٹالن کے مرنے کے بعد ژوکوف انھیں فروغ دینے میں مصروف تھا۔ وہ فوج سے غیر تربیت یافتہ لوگوں کی چھانٹی کر رہا تھا۔ فوج کی جگہ میزائل استعمال کرنے کو فوقیت دے رہا تھا۔ غرض اپنی فوج کو اس قابل بنا رہا تھا کہ وہ ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں اب کہیں موثر انداز میں حملہ کر سکے۔ واضح رہے کہ مذکورہ برسوں میں مغربی حملے کا شدید خطرہ لاحق تھا۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ انہی دنوں روس اپنے دفاعی اخراجات میں اضافہ بھی کر رہا تھا۔

مشرق و مغرب کے مابین اسلحہ کی دوڑ ایک بالکل ہی نئے علاقے میں ہونے لگی تھی، یعنی سمندروں میں! لیکن یہ مقابلہ غیر منظم انداز میں ہو رہا تھا۔ امریکی بحریہ اپنی ٹاسک فورس اور سب میرینوں کی

بدولت بحر الکاہل میں نہایت شاندار کارنامے انجام دے چکی تھی۔ برطانیہ کے شاہی بیڑے نے بھی جنگ کے دوران اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور ۱۹۱۴۔۱۸ء کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں سمندری لڑائی میں فتح حاصل کی تھی۔ لیکن ایٹم بم اور دور تک مار کرنے والے بمبار جہازوں اور میزائلوں کے آجانے کی وجہ سے روایتی انداز کی بحری جنگ کی کارکردگی ماند پڑ گئی تھی۔ ۱۹۴۵ء کے بعد جب دفاعی اخراجات کم کیے گئے اور مختلف فوجی شعبوں کو وزارت دفاع کے ماتحت کر دیا گیا تو دونوں ملکوں کی بحریہ اچھے خاصے بحران سے دو چار ہو گئی۔ لیکن جنگ کوریا کی وجہ سے اس میں کسی حد تک کمی آ گئی۔

امریکی بحریہ اپنے اعلیٰ درجے کے کیریئرز' ایٹمی ہتھیاروں سے لیس اور دور تک مار کرنے والے بمبار جہازوں اور بلاسٹک میزائلوں' نیوکلیئر طاقت سے بھرپور سب میرینوں کی بدولت نیوکلیئر کلب میں شمولیت کے قابل ہو چکی تھی۔ البتہ برطانوی بحریہ جدید قسم کے کیریئرز رکھنے کی ابھی متحمل نہیں ہوئی تھی' لیکن "کمانڈو کیریئرز" کی ترمیم شدہ ساخت کو بحال کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور فرانس کی بحریہ کی طرح سب میرین پر مشتمل مزاحمتی اڈے بھی تیار کر چکی تھی۔ اگرچہ ۱۹۶۵ء میں مغربی ملکوں کی بحریہ کے پاس کے مقابلے میں کم تعداد میں جہاز اور کارکن تھے' لیکن طاقت اور کارکردگی کے لحاظ سے یہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔

مذکورہ ممالک کی بحریہ کو فروغ دینے اور ان پر خاصی رقم صرف کرنے کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ روس نے باقاعدہ بحری جہازوں کا وسیع بیڑا تیار کر لیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر روسی بحریہ کی کارکردگی ٹھیک نہیں تھی' حالانکہ اس کے پاس سب میرین خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ دراصل وہاں کی فوج کے زیادہ تر افراد نے زمینی جنگ میں حصہ لیا تھا یا دریا پار کرنے میں مدد دی تھی۔ ۱۹۴۵ء کے بعد اسٹالن نے جرمن ساخت کی سب میرین زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ ساحلی علاقوں کا دفاع کیا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بحریہ کو بھی فروغ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسٹالن نے ایسے جنگی جہاز بنانے کی ہدایت دی تھی جن میں لڑاکا طیاروں کے لیے باقاعدہ کیریئرز موجود ہوں۔ لیکن اس ولولہ انگیز اسکیم کو خروشیف نے معطل کر دیا۔ اس کے خیال میں نیوکلیئر میزائل کی موجودگی میں بڑے بڑے اور خاصے مہنگے جنگی جہاز بنانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس کے یہ خیالات مغرب کے بہت سے سیاست دانوں اور جرنیلوں کے خیالات سے مشابہ تھے۔ لیکن خروشیف کے ان خیالات کو اس وقت خاصا جھٹکا لگا جب روس کے زبردست دشمنوں نے بحری طاقت کا تواتر سے استعمال شروع کر دیا' مثلاً ۱۹۵۶ء میں انگلستان اور فرانس کے بحری اڈے سے سوئز لینڈ پر حملہ کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں امریکی فوج لبنان میں اتاری گئی جس کا مقصد روس کے زیر حمایت شام پر نظر رکھنی تھی' پھر ۱۹۶۲ء میں میزائل کے گمبھیر جھگڑے کے موقع پر امریکی جنگی جہاز کیوبا کے آس پاس لنگر انداز کر دیے گئے۔ ان تمام باتوں سے کریملن کے رہنماؤں نے یہی سبق حاصل کیا کہ جب تک روس کے پاس نہایت مضبوط قسم کی بحریہ نہیں ہو گی' وہ عالمی طاقت کے حصول میں ناکام رہے گا اور اسے مسلسل نقصان کا سامنا کرتے رہنا پڑے گا۔ اس نتیجے کو مزید تقویت امریکہ نے دی جب ۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں اس کی کئی میزائل بردار سب میرین متحرک ہو گئیں۔ چنانچہ "سرخ" بحریہ کو بہتر سے

بہتر انداز میں فروغ دیا گیا۔ بایں ہمہ' اس نے سمندر پار کے ملکوں میں بحری فوج کا عملہ خاصی تعداد میں تعینات کر دیا تاکہ بحیرہ روم یا بحر ہند میں مغربی بحریہ کے چیلنج کا جواب دیا جا سکے۔ واضح رہے کہ اس انداز میں تو اسٹالن نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

چیلنج کا یہ طریقہ کچھ روایتی انداز کا تھا۔ اس لیے مبصرین نے ایڈمرل گورشکوف کی حالیہ فوجی تیاری اور چار عشرے قبل ترپز کے عسکری انصرام کا جو جائزہ لیا تھا' اس کے مقابلے سے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اگر سوویت یونین بحریہ کی نئی دوڑ میں شامل ہونے کا ایسا ہی خوگر تھا تو امریکی بحری قوت کا پاسنگ بننے کے لیے ابھی اسے کئی دہائیاں درکار تھیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۴۵ء کے بعد اسلحے کی دوڑ نے ہر جگہ ایک "انقلابی عمل" کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ایٹمی ہتھیار اور دور تک مار کرنے والے میزائلوں کا حصول اس مقصد کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگا ساکی کی قیامت خیز تباہی کے بعد بھی کچھ منچلے لوگ انسانی ہلاکت پر آنسو بہانے کی بجائے ایٹمی ہتھیاروں کو اس کا نعم البدل قرار دینے کے لیے کوشاں تھے۔ علاوہ ازیں' ۱۹۴۶ء میں ایٹمی طاقت کو عام کرنے کے سلسلے میں جو بروچ پلان تیار کیا گیا تھا' وہ ناکام ہو چکا تھا۔ لوگوں کے ذہن میں امریکہ کے متعلق یہ شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے کہ اسے نیوکلیئر طاقت میں اجارہ داری حاصل ہو گئی ہے۔ نیز فضائی طاقت کو وسیع کرنے کی وجہ محض یہی ہے کہ سوویت یونین کی عظیم بری فوج کی بالادستی کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ مغربی یورپ کے ممالک نے یہ توقع کر لی تھی کہ روسی فوج کے حملے کا جواب امریکہ (اور بعد میں برطانیہ) ہی ایٹمی ہتھیاروں سے لیس بمبار جہازوں کے ذریعے دے سکتا ہے۔

تکنیکی تبدیلیوں' اور پھر سوویت یونین کی کارکردگی نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ چنانچہ جب ۱۹۴۹ء میں روس نے ایک ایٹمی دھماکہ کیا تو گویا اس نے امریکی اجارہ داری کے بت کو توڑ کر رکھ دیا۔ سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ روس نے دور تک تباہی پھیلانے والے بمبار جہاز تیار کر لیے تھے۔ ۱۹۵۰ء کی وسطی دہائی میں ان کے متعلق یہ بات عام ہو چکی تھی کہ یہ امریکہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ اتنی وافر تعداد میں موجود ہیں کہ ان کی وجہ سے بمبار جہازوں کا توازن قائم نہیں رہا ہے۔ بہرحال ان متضاد بیانات کی تصدیق کے لیے روس سے شواہد معلوم کرنے میں خاصی دشواریاں حائل تھیں۔ ادھر امریکی فضائیہ بھی ان کے بارے میں باتیں بڑھا چڑھا کر بیان کرتی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کچھ ہی سال بعد فضائی طاقت میں امریکہ کی کم مائیگی ختم ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں واشنگٹن کی حکومت نے حد سے زیادہ تباہ کن ہائیڈروجن بم بنانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس فیصلے سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو مزید فائدہ پہنچا۔ پھر ۱۹۵۰ء کی دہائی کے ابتدائی اور درمیانے عرصے میں فوسٹر ڈلس کی ولولہ انگیز تقریر اور امریکی فضائیہ کے اپنے جاندار منصوبے نے آئندہ جنگ کے حوالے سے روس اور چین کو لرزہ بر اندام کر دیا۔ امریکہ کے اس فیصلے نے کہ روایتی انداز کی فوج تیار کی جائے اور میدان جنگ میں بھی ایٹمی ہتھیار کے استعمال کو موثر بنایا جائے' ٹرومین اور آئزن ہاور کے دور میں عوام میں بے چینی کی لہر دوڑا دی۔ انتظامیہ کا مقصد یہ تھا کہ روسی "آرام گیڈون" کے اثرات کی بیخ کنی کی جائے۔ روس نے بھی ۱۹۵۳ء میں ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیا تھا۔ یہ واقعہ امریکی تجربے کے ٹھیک نو مہینے بعد پیش آیا تھا۔ علاوہ ازیں'

سوویت حکومت نے جرمنی کی راکٹ چلانے کی تکنیک کو ہتھیانے کے لیے بے دریغ رقم خرچ کی تھی۔ ۱۹۵۵ء
کے قریب سوویت یونین ایس ۔ ایس۔۳ نامی اور درمیانی فاصلے تک مار کرنے والا بلاسٹک میزائل نہایت کثیر
تعداد میں بنا رہا تھا۔ پھر ۱۹۵۷ء تک آتے آتے اس نے بین البراعظمی قسم کا بلاسٹک میزائل داغا تھا جس کی
مار کی حد پانچ میل تھی۔ اس میں وہی راکٹ انجن استعمال کیا گیا تھا جس نے اسی سال اکتوبر میں "اسپتنک"
کو مدار میں پھینکا تھا۔

روس کی اس سائنسی کارکردگی کو دیکھ کر اور یہ دھڑکا محسوس کر کے کہ
اچانک حملے سے امریکی شہر اور بمبار جہاز بری طرح نشانہ بن جائیں گے' واشنگٹن کی حکومت نے خود بھی بین
البراعظمی بلاسٹک میزائل تیار کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے تاکہ دنیا میں "میزائل خلا" نہ
رہے۔ لیکن ایٹمی ہتھیاروں کی یہ دوڑ محض اسی سسٹم تک محدود نہ تھی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے ہر فریق اس
کوشش میں معروف تھا کہ سب میرین سے بھی بلاسٹک میزائل چلایا جا سکے۔ نیز' اس عرصے میں' میدان
جنگ میں کام آنے والے نیوکلیر ہتھیار اور کم فاصلے تک مار کرنے والے راکٹ بھی تیار کیے گئے تھے۔ اس
عمل کے ساتھ ساتھ دفاعی منصوبہ سازوں اور سول مبصرین کے درمیان ذہنی آزمائش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔
وہ سب یہ سوچ رہے تھے کہ آخر ان روز افزوں دفاعی اسباب و عوامل کو کس طرح معرف میں لایا جائے گا۔
اگرچہ پیش نظر مسائل کے مختلف حل تجویز کیے گئے' لیکن کسی نے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ
روایتی انداز جنگ میں نیوکلیر ہتھیاروں کی آمیزش ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پھر جلد ہی اس حقیقت کی
تصدیق ہو گئی کہ میدان جنگ کا ایٹمی ہتھیار "نیوک" جرمنی کے خاصے علاقے کو بھک سے اڑا کر رکھ دیے۔
اگر ہائیڈروجن بم روس یا امریکہ کی سرزمین پر گرا دیا جاتا تو ہلاکت اور نقصان کا اندازہ کرنا بعید از قیاس
تھا۔ چرچل کے بقول واشنگٹن اور ماسکو دونوں پر خوف و دہشت کا غلبہ تھا اور دونوں بے پناہ تباہی پھیلانے
والے ہتھیاروں کے بنانے کو متروک نہیں کر سکتے تھے' لہٰذا ایٹمی جنگ کی تکنیک کے لیے اپنے سارے
وسائل معرف میں لا رہے تھے۔ اگرچہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں برطانیہ اور فرانس بھی اپنے اپنے طور پر ایٹم بم
بنانے اور ایٹمی ہتھیار کے فن کو فروغ دینے میں معروف تھے۔ لیکن جب لڑاکا طیارے میزائل اور ایٹمی بم کا
بغور جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اس میدان میں بھی سپر پاورز ہی چھائی ہوئی تھیں۔

اس دشمنی کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ روس اور مغربی یورپ دونوں اقصائے عالم میں اپنے
اپنے اتحادی بنا رہے تھے اور نئے نئے ساتھی تلاش کرنے کا مقابلہ جاری تھا۔ بایں ہمہ' تیسری دنیا کے ممالک
کو مخالف فریق کے کیمپ میں شامل ہونے سے روکا بھی جا رہا تھا۔ شروع شروع میں امریکہ اس معاملے میں
آگے آگے تھا۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ ۱۹۴۵ء میں اس کی پوزیشن بہت مضبوط تھی کیونکہ مغربی کرے
سے ماورا اس کے بہت سے قلعے اور ہوائی اڈے پہلے سے موجود تھے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ بہت سے
ممالک معاشی اور فوجی امداد کے لیے واشنگٹن کی جانب نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس' روس کو
مستحکم ہونے کے لیے خاصی ضرورت تھی۔ امور خارجہ کے معاملے میں اس کی تشویش بس یہی تھی کہ اس کی
اپنی شرائط کے مطابق سرحدوں کا تصفیہ طے ہو۔ اس کے پاس ایسے اقتصادی اور فوجی ذرائع بھی نہیں تھے جو

اس کی طاقت کا سرچشمہ قرار پاتے اور وہ مقابلے کے میدان میں دندناتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اگرچہ اسے
بالٹک' شمالی فن لینڈ اور مشرق بعید میں کچھ علاقے حاصل ہو گئے تھے' لیکن اس کے باوجود روس ہنوز زمین بند
برباد تھا۔ علاوہ ازیں' اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ بیرونی دنیا کے خصوصاً" مغرب کے متعلق اسٹالن کی
جو رائے تھی' اس میں احتیاط اور شک کے پہلو مزید نمایاں ہو گئے تھے۔ اسے خطرہ تھا کہ مغربی یورپ
کمیونسٹوں کے مفادات کو کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا مثلاً" ۱۹۴۷ء میں یونان میں اسے جو فوائد
حاصل تھے۔ اسی طرح وہ ٹیٹو اور ماؤ جیسے کمیونسٹ لیڈروں کی جانب سے محتاط تھا اس لیے کہ وہ سوویت یونین
کے پنو تو نہ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں کومن فارم تشکیل دیا گیا تھا' ساتھ ہی یہ پروپیگنڈا بھی کیا جاتا رہا کہ بیرونی
انقلابیوں کی مدد کی جائے گی۔ یہ سب کچھ ۱۹۳۰ء کے عشرے' بلکہ یوں کہیے کہ یہ پروپیگنڈا ۲۱-۱۹۱۸ء کے
زمانے سے سنائی دے رہا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مذکورہ دور میں ماسکو بیرونی معاملات میں ملوث ہونے
سے گریزاں رہا ہے۔

جیساکہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے' واشنگٹن کی حکومت کا یہ خیال تھا کہ دنیا میں
کمیونسٹوں کی بالادستی کے لیے ایک عظیم منصوبہ لمحہ بہ لمحہ روبہ عمل ہو رہا تھا' لہٰذا اس کی مزاحمت ضروری
تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں یونان اور ترکی کو جو ضمانت دی گئی تھی وہ اس تبدیلی کی پہلی مثال تھی۔
پھر ۱۹۴۹ء میں نیٹو کا قیام اس کا بین ثبوت تھا۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں نیٹو میں مزید ممبر ممالک شامل کیے
گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ یورپ اور مشرق قریب کے علاقوں کے تحفظ کے لیے خود کو پابند سمجھ رہا
تھا۔ چنانچہ وہ اسپٹز برگن سے دیوار برلن تک اور ترکی کی ایشیائی سرحدوں سے بھی ماورا' سلامتی کی فضا قائم
کرنا چاہتا تھا لیکن یہ سب کچھ امریکہ کی توسیع پسندی کی محض ابتداء تھی۔ ریوپیکٹ اور کینیڈا کے ساتھ
خصوصی معاملات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امریکہ پورے مغربی کرے میں خود کو دفاع کا ذمہ دار گردانتا تھا۔
"انزوز" معاہدے کے تحت جنوب مغربی بحر الکاہل میں اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ ۱۹۵۰ء کے ابتدائی
عشرے میں شرقی ایشیا میں مسلسل لڑائی ہوتی رہی جسے کے نتیجے میں متعدد دو طرفہ معاہدوں پر دستخط ہوئے۔
ان کی رو سے امریکہ' جاپان' جنوبی کوریا' تائیوان اور فلپائن کو امداد دینے کا پابند ہو گیا تھا۔ جب ۱۹۵۴ء میں
سیٹو کا قیام عمل میں آیا تو امریکہ نے اور بھی زور پکڑ لیا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں ریاست ہائے متحدہ
امریکہ اور برطانیہ' فرانس' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' فلپائن' پاکستان اور تھائی لینڈ اس تنظیم کے شرکاء قرار پائے۔
یہ سب ممالک اس وسیع خطے میں جارحیت اور حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کے معاون بن
گئے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکہ نے ایک اور گروپ تشکیل دیا تھا' یعنی ۱۹۵۵ء میں بغداد پیکٹ اور بعد ازاں
سینٹو عالم وجود میں آئے جن کے تحت برطانیہ' ترکی' عراق' ایران اور پاکستان تخریب کاری اور حملے کے خلاف
سینہ سپر ہو گئے۔ علاوہ ازیں' امریکہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے ساتھ نہایت گہرے روابط تھے' دوسرے
۱۹۵۷ء میں آئزن ہاور نے جو نظریہ پیش کیا تھا اس کے تحت عرب ممالک کو امریکی امداد سے نوازنا تھا۔
۱۹۷۰ء کے شروع میں ایک مبصر نے لکھا تھا:

"امریکہ کے دس لاکھ سپاہی تیس ملکوں میں موجود ہیں۔ وہ دفاع کے چار

علاقائی اتحاد کا رکن بھی ہے۔ اور پانچویں کا سرگرم کارکن! اس نے ۴۲
ملکوں کے ساتھ دفاعی معاہدے کر رکھے ہیں۔ وہ ۵۳ بین الاقوامی تنظیموں
کا ممبر ہے۔ وہ دنیا کے تقریباً ۱۰۰ ملکوں کو فوجی اور اقتصادی امداد فراہم
کر رہا ہے۔"

یہ پابندیوں کا ایک ایسا تسلسل تھا جسے دیکھ کر لوئس چہار دہم پامرسٹن کو جھرجھری سی آ جاتی۔ ایک ایسی دنیا میں جو سائز کے لحاظ سے سکڑ رہی تھی اور جس کا ہر حصہ دوسرے سے مربوط تھا' یہ لمحہ بہ لمحہ کی ذمہ داریاں منطقی جواز رکھتی تھیں۔ کیا واشنگٹن قطبی دنیا کے نظام میں کوئی لکیر کھینچ سکتا تھا اور کہاں؟ خصوصاً" اپنے اس دعوے کی روشنی میں کہ کوریا کی اتنی خاص اہمیت نہیں ہے ----- اور جس کے نتیجے میں اسی سال کمیونسٹوں نے اس ملک پر چڑھائی کر دی۔ ڈین رکس نے مئی ۱۹۶۵ء میں یہ کلیہ پیش کیا تھا:

"یہ ایک چھوٹے سے سیارے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس میں جو
کچھ بھی ہے ہمیں اس کی فکر کرنی ہے ----- اس کی زمین' اس کا پانی'
اس کی فضا' اس کے اردگرد کا ماحول' سبھی ہماری توجہ کی محتاج ہے۔"

بیرونی دنیا میں سوویت یونین کی طاقت اور اثر و رسوخ قدرے کم رہے ہیں۔ تاہم' اسٹالن کی موت کے کئی سال بعد اس میں قابل قدر پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ واضح رہے کہ خروشیف اپنے ملک کی تعریف و توصیف چاہتا تھا۔ اس کی یہ بھی تمنا تھی کہ لوگ روس سے ڈریں نہیں بلکہ اس سے محبت کریں۔ وہ ملکی وسائل کو دفاع پر خرچ کرنے کی بجائے زراعت اور اشیائے صرف میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خارجہ پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سرد جنگ کو کالعدم قرار دینا چاہتا تھا۔ مالوٹوف کے برعکس' اس نے آسٹریا سے روسی فوج کی واپسی کا حکم نافذ کیا۔ اس نے پورکالا بحری اڈا فن لینڈ کو آرتھر بندرگاہ چین کو واپس کر دیے۔ اس نے یوگوسلاویہ سے یہ کہہ کر بہتر تعلقات قائم کیے کہ وہاں سے بھی سوشلزم کو علیحدہ سے راستے جاتے ہیں۔ (اس کے اس قول نے نہ صرف اس کے ساتھیوں کو مایوس کر دیا بلکہ ماؤزے تنگ کو بھی صدمہ پہنچا۔) جب ۱۹۵۵ء میں وارسا پیکٹ وجود میں آیا جو دراصل نیٹو میں مغربی جرمنی کی شمولیت کا سبب تھا تو خروشیف بون کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا آرزو مند تھا۔ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ بھی روابط بڑھانا چاہتا تھا۔ لیکن روسیوں کے ناقابل اعتبار رویے کے باعث واشنگٹن نے اس سے پہلو تہی برتی۔ اسی سال خروشیف نے ہندوستان' برما اور افغانستان کا دورہ کیا۔ اب سوویت یونین نے تیسری دنیا کے متعلق نہایت سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ واضح رہے کہ اس وقت افریقہ اور ایشیا کی بہت سی ریاستیں آزادی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔

پرجوش طبع خروشیف کی خواہش کے باوجود معاملات نہایت سستی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں اسٹالن کے زیر کنٹرول رہنے والا "کومن فورم" ختم کر دیا گیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے

کہ دو ماہ بعد جب ہنگری میں فساد برپا ہوا تو اسے انسانی جذبے کے تحت کچل دیا گیا' اس لیے کہ وہاں سے کوئی راہ سوشلزم کو نہیں جاتی تھی۔ چین کے ساتھ جھگڑے میں اضافہ ہو گیا۔ جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ اس کی وجہ سے کمیونسٹوں میں کئی دھڑے قائم ہو گئے۔ مصالحتی کاروائیوں کی بنیاد ان واقعات پر رکھی گئی تھی: یو۔۲ کا واقعہ (۱۹۶۰ء)' دیوار برلن کا سانحہ (۱۹۶۱ء)' کیوبا میں سوویت میزائل کے سلسلے میں امریکہ سے جھڑپ (۱۹۶۲ء)۔ بہرحال ان میں سے کسی ایک نے بھی روس کو خارجہ پالیسی میں کسی تبدیلی پر آمادہ نہیں کیا۔ نئی نئی مملکتوں کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے اور اقوام متحدہ میں ان کے نمائندوں کے ساتھ روابط بڑھانے کی وجہ سے بیرونی دنیا میں روس کی ساکھ مستحکم ہونے لگی۔ علاوہ ازیں' خروشیف سوویت نظام کو سرمایہ دارانہ نظام پر مسلط کرنے کا خواہاں تھا' لہٰذا بیرون ملک نئے نئے دوست بنانا اس کے لیے ضروری ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء کے بعد خروشیف کے زیادہ محتاط جانشینوں نے اس سرخ فیتے کو کاٹ ڈالنا مناسب سمجھا جسے امریکہ نے روس کے اردگرد لپیٹ رکھا تھا۔ نیز' وہ چین کے اثر و رسوخ پر بھی کڑی نگاہ رکھنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں' اس وقت تیسری دنیا کے متعدد ایسے ممالک تھے "جو نئی قسم کی نوآبادیات" کے حصار سے نکل جانا چاہتے تھے اور سرکاری مداخلت سے آزاد اقتصادی نظام قائم کرنے کے متمنی تھے۔ اس کے نتیجے میں مغربی ممالک کی امداد سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن تھا۔ ان تمام باتوں نے روس کی خارجہ پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کیے اور بیرونی ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے جذبے کو متحرک کیا۔

اس جذبے کا آغاز دسمبر ۱۹۵۳ء میں اس وقت ہوا جب ہندوستان کے ساتھ تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے۔ حسن اتفاق کہ انہی دنوں امریکہ کے نائب صدر نکسن نئی دہلی آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں بھلائی کے مقام پر فولادی کارخانہ قائم کرنے کے سلسلے میں مدد فراہم کی گئی۔ بعد ازاں متعدد فوجی امداد سے ہندوستان کو نوازا بھی گیا۔ تیسری دنیا کی ایک اہم طاقت کے ساتھ تعلق استوار کیا گیا تھا۔ اس سے امریکہ اور چین دونوں ناراض ہو گئے۔ پھر پاکستان کو بغداد پیکٹ کے رکن ہونے کی وجہ سے سزا بھی ملی۔ انہی دنوں یعنی ۵۶-۱۹۵۵ء میں سوویت یونین اور چیکوسلواکیہ نے مصر کو مالی امداد دینا شروع کر دی۔ اس طرح دونوں اسوان ڈیم کی تعمیر میں امریکہ کی جگہ مالی تعاون کرنے لگے۔ سوویت یونین نے عراق' افغانستان اور شمالی یمن کو بھی قرض دینا شروع کر دیا۔ ماسکو افریقہ کی ان ریاستوں (گھانا' مالی اور گو آنیا) کی حوصلہ افزائی کرنے لگا جو سرمایہ دارانہ نظام کی مخالف تھیں۔ جب ۱۹۶۰ء میں کسترو کی ماتحتی میں قائم کیوبا کی حکومت کے ساتھ روس کا پہلا تجارتی معاہدہ ہوا تو لاطینی امریکہ کے لیے یہ ایک ہوش اڑا دینے والا واقعہ تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت کیوبا امریکہ کے ناروا رویے کی وجہ سے خاصا ہیجان میں مبتلا تھا۔ ان سب عوامل نے ایک ایسا نمونہ عمل قائم کر دیا جو خروشیف کے زوال کے بعد بھی تبدیل نہیں ہوا۔ چونکہ سوویت یونین نے سرمایہ داری کے خلاف سخت پروپگنڈا شروع کر دیا تھا' لہٰذا وہ "نوآبادیاتی نظام" سے چھٹکارا پانے والے ملک کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگا اور اسے تجارتی امداد' فوجی مشیر اور اسی طرح کا تعاون پیش کرنے لگا۔ چونکہ امریکہ اسرائیل کی مدد کر رہا تھا' لہٰذا روس اس سے فائدہ اٹھانے لگا۔ اس نے شام' عراق اور مصر کو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں خاصی امداد فراہم کی اور اس طرح مشرق وسطی تک اس کا اثر قائم ہو گیا۔

روس نے شمالی ویت نام کی فوجی اور معاشی اعانت کر کے خاصی مقبولیت حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ دور دراز واقع لاطینی امریکہ میں بھی اس نے حریت پسندوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اس طرح پوری دنیا میں اپنا اثر قائم کرنے کے لیے روس اسٹالن کے محتاط رویے کے حصار سے بہت دور نکل آیا تھا۔

دنیا میں اپنا تاثر قائم کرنے کے لیے واشنگٹن اور امریکہ کا یہ مقابلہ اور معاہدے' قرض اور اسلحہ کی برآمدات میں ایک دوسرے کو دھکا دینے کا یہ رویہ اس بات کا ثبوت تھا' ایک دو قطبی دنیا عالم وجود میں آ چکی تھی۔ اس لیے کہ نہایت اہم نوعیت کے عالمی امور دو متحارب قوتوں' یعنی امریکہ اور روس کے گرد ہی منڈلاتے تھے۔ گویا ڈلس اور مالوتوف کے خیال کے مطابق دنیا کو ایسا ہی ہونا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں بلاک اقصائے عالم میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے اور ایسی ایسی جگہ وارد ہو رہے تھے جو ۱۹۴۱ء میں ان کے لیے اجنبی تھی' اس کے ساتھ ہی وہ مختلف رجحانات سے بھی دو چار ہو رہے تھے۔ ان دنوں تیسری دنیا باشعور ہو رہی تھی۔ اس کے بہت سے ملکوں نے قدیم یورپی سلطنتوں کے تسلط سے چھٹکارا پا لیا تھا۔ اب وہ کسی اور سپر پاور کے طفیلی ملک کے دست نگر بننے کے خواہاں نہیں تھے چاہے وہ کیسی ہی اقتصادی اور فوجی امداد سے نوازے۔

اس زمانے میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ دراصل یہ تھا کہ بیسویں صدی کی سیاست اقتدار میں سپر پاورز کو عروج نصیب ہو' لہٰذا ایک دوسرے کے درمیان رسہ کشی ہوتی رہتی تھی۔ پھر ایک نیا رجحان یہ بھی تھا کہ سیاسی طور پر دنیا کو منتشر کر دیا جائے۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ڈارون کے سماجی اور بعد ازاں سرمایہ داری ماحول کی جو فضا قائم تھی' اس میں یہ تصور کرنا آسان تھا کہ تمام اقتدار دنیا کے چند سرمایہ داروں تک ہی محدود ہے۔ لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے اپنی تباہی کا خود سامان پیدا کیا تھا۔ اہالیان سیل رموزز' متحدہ سلافیوں اور آسٹریا - ہنگری کی افواج کے مبالغہ آمیز جذبہ حب الوطنی نے بوئر' پولستان' سربیا اور فن لینڈ کے باشندوں میں شدید ترین رد عمل پیدا کر دیا تھا۔ قومی خود مختاری کے نظریے ---- جسے جرمنی اور اٹلی کے اتحاد کے لیے جواز کے طور پر پیش کیا گیا تھا یا ۱۹۱۴ء میں اتحادی ملکوں نے بلجیم کی مدد کا جو فیصلہ کیا تھا' اس رجحان نے اب مشرق و جنوب کی جانب رخ کر لیا تھا۔ یعنی مصر' ہندوستان' ہند چینی! چونکہ برطانیہ' فرانس' اٹلی اور جاپان کی سلطنتوں نے ۱۹۱۸ء میں جس نئے عالمی نظام کا تصور پیش کیا تھا' اس کا جائزہ بھی لیتے رہے تھے' لہٰذا قومیت کے اس جذبے کی خاص خاص موقع پر پذیرائی کی جاتی تھی۔ مشرقی یورپ کے باشندوں کو خود مختاری کی نعمت سے نوازنا اس لیے بہتر عمل تھا کہ وہ یورپی تھے اور اسی لیے "مہذب" قرار دیے جاتے تھے۔ لیکن مشرق وسطیٰ' افریقہ یا ایشیا میں ان اصول و ضوابط پر عمل کرنا خوشگوار نہ تھا۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں شہنشاہیت نے علاقے پر علاقے فتح کیے تھے اور تحریک آزادی کو کچلا جاتا رہا تھا۔ ۱۹۴۱ء کے بعد مشرق بعید میں یہ سلطنتیں روبہ زوال ہونے لگی تھیں۔ جب جنگ میں شدت پیدا ہوئی تو ماتحت علاقوں کی معیشت کو بری طرح استعمال کیا گیا اور وہاں کی افرادی قوت کو مصرف میں لایا گیا۔ ادھر بحر اوقیانوس نامی چارٹر اپنا نظریاتی تاثر پھیلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ بھی ازوال سے دو چار ہو رہا تھا۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں جو تبدیلی ہوئی وہ "تیسری دنیا" کے نام سے موسوم ہوئی۔

واضح رہے کہ اسے "تیسرے درجے" کی دنیا کہا گیا' اس لیے کہ یہ امریکی اور روسی بلاک سے الگ اپنی شناخت کرانے پر مصر تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپریل ۱۹۵۵ء میں بنڈونگ میں افرو ایشیائی ممالک کی جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی' اس موقع پر تمام شرکاء سپر پاورز کے ساتھ تعلق اور ان کے احسانات سے آزاد تھے۔ مثال کے طور پر ترکی' چین' جاپان اور فلپائن مذکورہ کانفرنس میں شریک تھے اور ان کے لیے "غیر وابستہ" کی اصطلاح کا استعمال نامناسب ہو گا۔ دوسری جانب تمام شرکاء ممالک نے اس بات پر زور دیا کہ نوآبادیاتی نظام کو ختم کیا جائے' اقوام متحدہ سرد جنگ کے مذموم اثرات کی بجائے دیگر اہم معاملات پر توجہ مبذول کرے اور اس دنیا کو جس کی معیشت پر سفید فام افراد مسلط ہیں یکسر تبدیل کر دیا جائے۔ جب ۱۹۵۰ء کے آخری اور ۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں نوآبادیات کو ختم کرنے کا دوسرا مرحلہ پیش آیا تو اس موقع پر تیسری دنیا کے اراکین کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے نئے لوگ بھی شامل تھے جو عشروں نہیں بلکہ صدیوں پر محیط بیرونی تسلط پر اپنے دکھ کا اظہار کر رہے تھے۔ بایں ہمہ' وہ اس حقیقت سے بھی دو چار تھے کہ "آزادی" کے نتیجے میں انھیں ان گنت معاشی مسائل ودیعت ہوئے ہیں۔ اپنی کثیر تعداد کی بدولت یہ ممالک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں چھا جائیں گے۔ بنیادی طور پر یہ اسمبلی پچاس ملکوں پر مشتمل تھی ان میں یورپ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اب اقوام متحدہ میں آہستہ آہستہ ممبر ممالک کی تعداد بڑھ گئی ہے اور یہ سو سے کچھ زائد ہی ہے۔ ان اراکین میں نئے نئے افرو ایشیائی ممبران بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ اس کے باوجود بڑی طاقتوں کے عملی اقدامات پر کوئی پابندی عائد نہیں' اس لیے کہ یہ سیکورٹی کونسل کے مستقل ممبر ہیں اور انھیں "ویٹو" کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ واضح رہے کہ محتاط طبع اسٹالن نے یہ شرط عائد کرنے پر اصرار کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر سپر پاورز میں سے کوئی بھی عالمی رائے ہموار کرنا چاہتا' جیسا کہ ۱۹۵۰ء میں امریکہ نے جنوبی کوریا کی امداد کے لیے اقوام متحدہ کو راضی کرنا چاہا تھا' تو اس کے لیے اسے ایک ایسے ادارے کی رضامندی حاصل کرنی پڑی جس کی رکنیت پر محض واشنگٹن اور ماسکو کا ہی حصہ نہ تھا۔ چونکہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں نوآبادیوں کے خاتمے کا مسئلہ سرفہرست تھا اور بدحالی دور کرنے پر زور دیا جا رہا تھا' خصوصاً" روس اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا تھا' لہٰذا تیسری دنیا کے ممالک کی رائے مغربی ملکوں کے سراسر خلاف تھی۔ پھر نہر سویز کا واقعہ جو ۱۹۵۶ء میں پیش آیا' ویت نام کے حالیہ معاملات' مشرق وسطیٰ کی لڑائیاں' لاطینی امریکہ اور جنوبی افریقہ کے مسائل نے تیسری دنیا کو مغرب سے منحرف کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جب غیر وابستہ ممالک کی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں زیادہ تر زور نوآبادی کے خاتمے پر دیا گیا تھا۔ پھر ان کانفرنسوں کے مختلف جغرافیائی مقامات پر انعقاد - بلغراد - ۱۹۶۱ء' قاہرہ - ۱۹۶۴ء اور لوساکا - ۱۹۷۰ء) نے بھی موضوعات و مسائل کو یورپ سے کہیں دور پہنچا دیا تھا۔ اب عالمی سیاست کا ایجنڈا ---- ان طاقتوں کے ہاتھوں میں نہیں رہا تھا جو فوجی اور معاشی لحاظ سے خاصے قد آور تھے۔

غیر وابستہ تحریک کے نمایاں بہی خواہوں' مثلاً" ٹیٹو' ناصر اور نہرو نے اس تبدیلی کا خاکہ مرتب کیا تھا۔ یوگو سلاویہ نے اسٹالن سے ناطہ توڑ لیا تھا' (اسے کومن فارم سے ۱۹۴۸ء ہی میں نکال دیا گیا تھا)' اس کے باوجود وہ اپنی آزادی برقرار رکھے ہوئے تھا۔ لطف کی بات یہ کہ اس پر روس کا کوئی حملہ بھی

نہیں ہوتا تھا۔ یہ دراصل ایک پالیسی تھی جو اسٹالن کی موت کے بعد وضع کی گئی تھی اور اس پر سختی سے عمل بھی ہوتا تھا۔ غیر وابستہ ممالک کی پہلی سربراہی کانفرنس جو بلغراد میں منعقد ہوئی' بے سود ثابت ہوئی۔ ناصر کو ۱۹۵۶ء میں اس وقت پورے عرب ممالک میں مقبولیت حاصل ہوئی جب انھوں نے برطانیہ' فرانس اور اسرائیل سے ٹکر لے لی۔ وہ مغربی شہنشاہیت کے شدید مخالف تھا اور اس نے بہ رضا و رغبت روسی امداد قبول کر لی تھی۔ اس کے باوجود وہ ماسکو کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہ تھے۔ انھوں نے اپنے ملک کے کمیونسٹوں کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا تھا۔ نیز' ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء کے دوران ریڈیو اور پریس کے ذریعے سوویت یونین کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی تھی۔ چین۔ عرب اور خصوصاً" مسلم بنیاد پرستی کا دہریت کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں تھا' حالانکہ وہاں کے مقامی اور مارکسی نظریے کے حامل افراد نے دونوں کو باہم مربوط کرنے کی بڑی جدوجہد کی تھی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو یہ کہا جائے گا کہ غیر وابستہ ملکوں کے رہنماؤں میں یہ بھی ایک جدت پسند رہنما تھا۔ اسے سوویت یونین سے بارہا اقتصادی اور فوجی امداد حاصل ہوئی تھی۔ اس سے اس کا قد کاٹھ اونچا ہو گیا تھا۔ پھر چین اور پاکستان کے ساتھ اس کی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ ان سب باتوں کے باوجود نہرو روس کے رویے پر تنقید کرنے سے کبھی باز نہیں آیا۔ حتیٰ کہ وہ ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کو بھی شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ انھوں نے سویز کے متعلق برطانیہ کی پالیسی کو مذموم قرار دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بیرونی دنیا میں بڑی طاقتوں کی مداخلت کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں نئی نئی مملکتیں بین الاقوامی برادری میں شامل ہو رہی تھیں۔ روس کی یہی کوشش تھی کہ ان سبھوں کو مغربی ممالک کے زیر اثر نہ آنے دے۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ ان مملکتوں کے اندرونی معاملات سے پوری طرح واقف بھی نہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی سفارت کاری کامیاب نہیں جاری تھی۔ اس سلسلے میں چین بھی ایک مثالی ملک تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ اس کے علاوہ اور بھی ممالک تھے۔ جب ۱۹۵۸ء میں عراق میں نئی حکومت برسر اقتدار آئی تو روس نے اس عرب ملک کے ساتھ دوستی کا نعرہ لگایا اور اسے مالی امداد کی پیشکش کی۔ چار سال بعد' ایک مذہبی فرقے کی بغاوت کے نتیجے میں وہاں کی کیمونسٹ پارٹی کو جانی نقصانات سے گزرنا پڑا۔ ہندوستان کو روس سے مسلسل ملنے والی امداد کے نتیجے میں پاکستان کو سخت ناراضگی ہوئی۔ بہرحال' روس کے پاس ایسا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ کسی ایک کو ناراض کیے بغیر دوسرے کو خوش رکھتا۔ برما میں تمام غیر ملکیوں کی آمد پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس طرح وہاں امید افزا صورت کا آغاز ہو گیا۔ البتہ انڈونیشیا کے حالات بدتر تھے۔ روس اور مشرقی یورپ سے ڈھیروں امداد حاصل کرنے کے بعد سوئیکارنو کی حکومت نے اول الذکر سے منہ موڑ کر ۱۹۶۳ء میں چین کے ساتھ ناطہ جوڑ لیا۔ دو سال بعد' انڈونیشیا کی فوج نے وہاں کی کیمونسٹ پارٹی کو ظلم وجور کے ذریعے ختم کر دیا۔ گیسا نے ۱۹۶۱ء میں روسی سفیر کو اس لیے واپس کر دیا کہ وہ ایک مقامی ہڑتال میں ملوث پایا گیا تھا۔ جب کیوبا کا میزائلی بحران اٹھ کھڑا ہوا تھا تو اس ملک نے روسی جہازوں کو کوناکری ایئرپورٹ پر تیل لینے سے روک دیا تھا۔ جب ۱۹۶۰ء میں کانگو میں حالات خراب ہوئے تو روس نے لومبا کی مدد کی تھی جس سے

اس شخص کی پوزیشن مخدوش ہو گئی۔ چنانچہ اس کے جانشین موبوتو نے سوویت یونین سفارت خانہ بند کر دیا۔ لیکن روس کو ۱۹۷۲ء میں اس وقت سب سے بڑا دھچکا لگا اور اس کا اثر و رسوخ گھٹا گئے جب انور سادات نے اکیس ہزار روسی مشیروں کو مصر چھوڑنے کا حکم دے دیا تھا۔

بہرحال' تیسری دنیا اور پہلی دو دنیاؤں کے درمیان تعلقات پیچیدہ بھی رہے اور حقیر بھی! یہ امر واقعہ ہے کہ بعض ممالک روس کے کاسہ لیس تھے' مثلاً" کیوبا اور انگولا اور بعض امریکہ کے کڑ حامی تھے' مثلاً" تائیوان اور اسرائیل۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ ان ملکوں کو اپنے پڑوسی ممالک سے خطرہ رہتا تھا۔ بعض ایسے بھی تھے جو نہرو کی ابتدائی قیادت کی پیروی کرتے ہوئے غیر وابستہ رہنے کی کوشش کرتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو کسی ایک بلاک سے وابستہ رہ کر امداد کے حقدار بن جاتے اور بعد میں محسن ملک کے ناروا دباؤ سے تنگ آکر منحرف بھی ہو جاتے۔ علاوہ ازیں' تیسری دنیا میں مسلسل انقلاب آتے' خانہ جنگی ہوتی' حکومت بدلتی رہتی اور سرحد کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ان باتوں کو دیکھ دیکھ کر ماسکو اور واشنگٹن مسلسل حیران ہوتے رہتے۔ حتیٰ کہ سائپرس' اوگاڈن' ہند پاکستان کی سرحدوں پر اور کیمبوڈیا میں دشمنیاں رنگ لاتی رہتیں۔ یہ ممالک اپنی محاذ آرائی سے سپر طاقتوں کو پریشان رکھتے حالانکہ ان کی امداد کے بھی طالب رہتے۔ اپنی پیش رو بڑی طاقتوں کی طرح روس اور امریکہ کو بھی اس مسئلے کا سامنا تھا کہ ان کا بین الاقوامی نوعیت کا پیغام دوسرے معاشرے اور دیگر تہذیبی دنیا میں خود بخود تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

دو قطبی دنیا کا انتشار

جب ۱۹۶۰ء کی دہائی ختم ہوئی اور ۱۹۷۰ء کا عشرہ شروع ہوا تو اس وقت شدت سے یہ احساس جاگزیں تھا کہ واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان تعلقات عالمی امور کے لیے اشد ضروری ہیں۔ فوجی لحاظ سے سوویت یونین ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے بہت قریب تھا۔ لیکن دونوں مختلف جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً" ۱۹۷۰ء میں امریکہ دفاع پر ۸۵ بلین ڈالر خرچ کر رہا تھا جبکہ روس کے اخراجات اس مد میں ۱۰۹ بلین ڈالر تھے۔ یہ رقم چین کے دفاعی اخراجات بلین ڈالرز کے مقابلے میں تین چار گنا زیادہ تھی جبکہ یورپ کے ممتاز ممالک سے ۸ سے دس گنا فزوں تھی۔ (یعنی برطانیہ عظمیٰ کا دفاعی خرچ ۷ء۹۶ بلین ڈالر' فرانس کا ۹ء۱۰ بلین ڈالر مغربی جرمنی کا ۷ء۱۳ بلین ڈالر تھا۔) امریکہ اور روس کی بری فوج بالترتیب ۲ ملین اور ۳ ملین سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یورپی ممالک کی افواج سے یہ تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ نیز چین کے ۳ لاکھ فوجیوں سے کہیں زیادہ مسلح بھی تھی۔ دونوں سپرپاورز کے پاس پانچ ہزار لڑاکا طیارے تھے۔ سابق عظیم طاقتوں کے مجموعی ہوائی جہازوں کی تعداد سے یہ دس گنا زیادہ تھے۔ دونوں ممالک کے جنگی بحری جہاز بھی اپنی جسامت اور وزن کے حساب سے سب میں افضل تھے۔ امریکہ کے پاس ۲۰۸ ملین ٹن کے جنگی بحری جہاز تھے جبکہ روس کے پاس ۱۰۲ ملین کے جہاز موجود تھے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۷۴ء کے ہیں۔ گویا اس طرح دونوں اس معاملے میں برطانیہ (۳۷۰۰۰ ٹن)' فرانس (۲۰۰۰۰ ٹن)' جاپان (۱۸۰۰۰ ٹن) اور چین (۱۵۰۰۰ ٹن) سے بہت آگے تھے۔ لیکن ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد میں خاصا فرق رہا ہے' جیسا کہ جدول نمبر ۳۸ سے ظاہر ہے۔

جدول نمبر ۳۸: عظیم طاقتوں کے ایٹمی ہتھیار : ۱۹۷۴ء

	امریکہ	روس	برطانیہ	فرانس	چین	
بین البراعظمی بلاسٹک میزائل	۱۰۵۴	۱۵۷۵	-	-	-	
درمیانی بلاسٹک میزائل	-	۶۰۰	-	۱۸	ی ۸۰	
سب میرین میں نصب بلاسٹک میزائل	۶۵۶		۷۲۰	۶۴	۳۸	-
دور تک مار کرنے والے بمبار جہاز	۴۳۷	۱۴۰	-	-	-	
درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے بمبار جہاز	۶۶	۸۰۰	۵۰	۵۲	۱۰۰	

ہر سپرپاور ایک دوسرے (بلکہ کسی کو بھی) کو نقصان پہنچانے کے اس قدر قابل ہو گئی کہ اس صورت حال کو "میڈ" کے نام سے موسوم کیا گیا اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کو مختلف طریقے سے کنٹرول کرنے کے انتظامات ہونے لگے۔ کیوبا کے میزائلی بحران کے بعد ہاٹ لائن کی تنصیب عمل میں آئی تاکہ ہر فریق تشویشناک صورت حال میں دوسرے کو مطلع کر سکے۔ ۱۹۶۳ء میں ایٹمی دھماکہ کرنے کی پابندی کے سلسلے میں ایک معاہدہ روبہ عمل آیا جس پر برطانیہ عظمیٰ نے بھی دستخط کیے تھے۔ اس کی رو سے فضا میں' زیر آب اور خلا میں دھماکہ کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پھر ۱۹۷۲ء میں سالٹ نمبر ۱ کے نام سے ایک معاہدہ ہوا

جس کی رو سے بین البراعظمی بلاسٹک میزائل رکھنے کی تعداد محدود کر دی گئی اور روس میں تیار ہونے والے اینٹی بلاسٹک میزائل سسٹم کو روک دیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں ولادی ووستوک کے مقام پر مذکورہ معاہدہ میں توسیع کی گئی۔ پھر ۱۹۷۰ء کی آخری دہائی میں سالٹ نمبر ۲ کے معاہدے کے سلسلے میں گفت و شنید ہوئی۔ اس پر جون ۱۹۷۹ء میں دستخط کر دیے گئے تھے لیکن امریکی سینٹ نے اس کی توثیق نہیں کی ہے۔) ان متعدد معاہدوں' اقتصادی و سیاسی اور خارجہ پالیسی کی تحریکوں کے باوجود ہتھیاروں کی دوڑ میں کمی نہیں آئی۔ اگر ایک ہتھیار پر پابندی عائد کر دی گئی یا اس کی تعداد کو محدود کر دیا گیا تو وسائل کسی اور ہتھیار کی تیاری میں استعمال ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے بعد سے روس نے مسلح افواج کو بہتر بنانے کے لیے اخراجات میں اضافہ کیا۔ ادھر امریکہ نے ویت نام کی جنگ میں خاصی رقم خرچ ہو جانے کی وجہ سے دفاعی اخراجات میں کمی کر دی۔ اس میں عوام کا رد عمل بھی شامل رہا ہے۔ پھر بھی' طویل المیعاد پالیسی کے تحت اسلحہ میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ یعنی ہر چند سال بعد نئے ہتھیار بنائے گئے۔ ہر فریق کے راکٹوں میں متعدد وار ہیڈ نصب ہوئے۔ ہر فریق کی بحریہ میں میزائل بردار سب میرین کا اضافہ ہوا۔ امریکہ کے ایٹمی میزائل کی تباہی کے پیش نظر سارے یورپی باشندے خوف و دہشت کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر امریکہ نے دور تک مار کرنے والے میزائل استعمال کے لیے تو اس کے جواب الجواب میں دشمن بھی امریکی شہروں پر ایٹمی ہتھیار برسائے گا۔ چنانچہ اس تشویش کو مد نظر رکھتے ہوئے درمیانی فاصلے کے ایٹمی ہتھیار بنائے گئے' مثلاً" "پرشنگ دوم" اور کروز میزائل۔ یہ سب روس کے "ایس ایس-۲۰" کے توڑ کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلحہ کی دوڑ اور تخفیف اسلحہ کی بات' یہ سب ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ تاہم ہر دو معاملے نے واشنگٹن اور ماسکو کو مرکزی مقام پر براجمان کر دیا تھا۔

دوسرے میدانوں میں بھی ان کی رقابت حد سے زیادہ نمایاں تھی۔ جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے' ۱۹۶۰ء سے روس اپنے بحری بیڑوں کو فروغ دینے میں حد سے زیادہ کوشاں تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس معاملے میں اس نے خاصی کامیابی حاصل کی اور نہایت طاقت ور اور میزائل بردار جنگی جہاز اور کروزر تیار کیے۔ پھر جہازوں کو درمیانی سائز کا ہیلی کوپٹر بردار اور بعدازاں طیارہ بردار بنا دیا۔ اس کے بعد روسی بحریہ نے خاصی تعداد میں اپنے جنگی جہاز بحیرہ روم' بحر ہند' مغربی افریقہ' ہند چین اور کیوبا روانہ کیے جہاں ان کے لیے متعدد بحری اڈے بھی تیار کیے گئے۔ یہ آخرالذکر کار گزاری روس اور امریکہ کی رقابت کو "تیسری دنیا" میں ممیز کرنے کا باعث بنی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ماسکو ان علاقوں تک پہنچ گیا جہاں صرف مغربی ممالک کی اجارہ داری قائم تھی' ادھر مشرق وسطیٰ میں خاصا بحران پھیلا ہوا تھا۔ پھر ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی عرب - اسرائیل جنگ نے حالات کو مزید گمبھیر بنا دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں شام' لیبیا اور عراق جیسے بیشتر ممالک امداد کے لیے ماسکو کی جانب جھک گئے۔ جنوبی یمن اور صومالیہ کی حکومتوں نے روسی بحریہ کو اڈے کی سہولتیں فراہم کر دیں۔ اس طرح بحر احمر میں سوویت یونین کی بحری فوج کا قیام ممکن ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ ہوا کرتا ہے' اس پیش رفت کے دوش بدوش مزاحمتیں بھی تھیں۔ ماسکو نے ایتھوپیا کو واضح طور پر اولیت دی تھی۔ اس کارروائی کے نتیجے میں روسی عملے اور جہازوں کو ۱۹۷۷ء میں صومالیہ سے نکال باہر

کر دیا گیا۔ چند سال بعد' روس کے ساتھ ایسا ہی واقعہ مصر میں بھی ہوا۔ ادھر اس علاقے میں روس کے اثر و رسوخ مدھم ہو رہے تھے اور ادھر امریکہ عمان اور ڈیگو گارشیا میں استحکام حاصل کر رہا تھا۔ اس نے کینیا اور صومالیہ میں بحری اڈے قائم کرنے کا پروانہ بھی حاصل کر لیا۔ امریکہ نے ساتھ ہی ساتھ مصر' سعودی عرب اور پاکستان کو اسلحہ بھیجنا بھی شروع کر دیا۔ تاہم' جنوب کے دور دراز علاقے میں سوویت یونین کی پیش رفت جاری تھی۔ سوویت یونین اور کیوبا نے انگولا میں تحریک آزادی کے علمبرداروں کو فوجی اعانت سے نواز دیا۔ لیبیا کی روس نواز حکومت نے قذافی کی فرمانروائی میں مختلف جگہ انقلاب برپا کرنے کی مہم چلائی۔ ادھر ایتھوپیا' موزمبیق' گیمبیا' کانگو اور دیگر مغربی افریقہ کے ممالک میں مارکسی حکومت کا قیام اس بات کی شہادت تھی کہ ماسکو عالمی اقتدار حاصل کرنے کی جنگ میں فتح پر فتح حاصل کیے جا رہا تھا۔ پھر ۱۹۷۹ء میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرقی یورپ سے باہر توسیع پسندی کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ ادھر کیوبا نے نکاراگوا اور گریناڈا کی بائیں بازو کی حکومتوں کی سرپرستی جاری رکھی۔ ان حقائق سے یہ باور کرنا ناممکن نہ رہا کہ امریکہ اور روس کی دشمنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس رقابت کے نتیجے میں امریکہ کو اپنے دفاعی اخراجات میں خاصا اضافہ کرنا پڑا۔ ۱۹۸۰ء میں ریپبلکن حکومت برسر اقتدار آئی تو اس نے سوویت سلطنت کو تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا۔ اس کے خیال میں اس برائی کا ازالہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ دفاع میں مزید توسیع کی جائے اور روس کے حوالے سے سخت پالیسی مرتب کی جائے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جان فوسٹر ڈلس کے زمانے سے جو صورت حال چلی آ رہی تھی' اس میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔

غرض ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ء کے دوران امریکہ اور روس کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ اس کے علاوہ یہ رجحان بھی کارفرما تھا کہ طاقت کے عالمی نظام کو اس دو قطبی حصار سے نکالا جائے جس میں وہ گزشتہ عرصے کے دوران محدود رہا تھا۔ چنانچہ تیسری دنیا کے وجود نے اس معاملے کو بے حد پیچیدہ بنا دیا تھا۔ پھر ماسکو اور واشنگٹن کے زیر تسلط دو عالمی بلاکوں میں انتشار بھی پھیل گیا۔ اس کی نمایاں اور دور رس مثال سوویت یونین اور کمیونسٹ چین کی تقسیم ہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ اپنے سائنسی اور عالمگیر نظریے کے باوجود مارکسزم کے تمام دعووں کی بنیاد مقامی حالات' ملکی ثقافت اور اقتصادیات کی متنوع صورت حال کی سنگلاخ چٹانوں پر رکھی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لینن بھی اصول سرمایہ داری سے بارہا انحراف کرتا رہا تھا۔ محض اس لیے کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں اسے فتح حاصل ہو۔ بعض غیر ملکی مبصرین بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ماؤ اسٹالن کے اس غیر استدلالی رویے کا مخالف تھا جس کے تحت اس نے محنت کشوں اور کسانوں کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ ماؤزے تنگ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں کمیونسٹ تحریک کو فروغ دینے میں سرگرم رہا تھا۔ یہ مبصرین اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ ماسکو نے چین کی کمیونسٹ پارٹی کی بھرپور حمایت نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کے قریبی زمانے میں بھی اس نے چیانگ کائی شیک کی نیشنلسٹ پارٹی کے مدمقابل اسے متوازن رکھنے کی کوشش کی تھی۔ سوویت یونین نے یہ رویہ محض اس خیال سے اختیار کیا تھا کہ کہیں چین میں کمیونسٹ حکومت "سرخ فوج" کی مدد کے بغیر نہ قائم ہو جائے اور روس کی آبادی کے مقابلے میں تین گنا بڑا یہ ملک کمیونسٹوں کی عالمگیر تحریک سرخیل نہ بن جائے۔

بہرحال' حد سے بڑھتی ہوئی یہ تفریق بہت سے مبصرین کے لیے حیرت و استعجاب کا سبب بنی تھی۔ حتیٰ کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی نظروں سے بھی یہ معاملہ مدتوں اوجھل رہا جو دنیا میں کمیونسٹوں کی پھیلائی ہوئی سازشوں سے ہمیشہ تشویش میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جنگ کوریا اور تائیوان کے معاملے میں چین اور امریکہ کی جھڑپوں کے نتیجے میں ماسکو اور پیکنگ کے سرد رویے میں گرم جوشی پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسٹالن نے معمولی سی رقم چین کو بطور امداد فراہم کی۔ اسے ہمیشہ ان احسانات کا بدلہ قرار دیا گیا جن کی رو سے روس کو منگولیا اور منچوریا میں مراعات حاصل ہوئی تھیں۔ جب ۱۹۵۴ء میں روسیوں کے ساتھ ماؤ کی گفت و شنید ہوئی تھی تو اس نے حالات کی تلخی کو کم کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ البتہ کیموئے اور ماتسو جزائر کے حوالے سے وہ امریکہ کا سخت ترین مخالف ہو گیا تھا۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت میں بھی پیش پیش تھا۔ چنانچہ جب خروشیف نے باہمی کشیدگی رفع کرنے کی پالیسی اختیار کی تو وہ حد سے زیادہ مشکوک ہو گیا۔ ادھر ۱۹۵۰ء کے آخری عشرے میں روس کا یہ خیال تھا کہ امریکیوں کو طیش دلانا ایک احمقانہ عمل ہو گا۔ خصوصاً" ایسے وقت میں جب وہ نیوکلیر طاقت سے سرفراز ہو چکے تھے۔ پھر روس کی تیسری دنیا کی پالیسی کے حوالے سے ہندوستان بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں جب چین اور ہندوستان میں سرحد سے اول الذکر کی مدد پر لڑائی ہوئی تو روس نے سفارتی نقطہ نظر سے اول الذکر کی مدد کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ علاوہ ازیں' چین کے آزادانہ طرز عمل کے پیش نظر روس نے اسے ایٹمی پروگراموں میں مدد فراہم کرنا غیر دانشمندانہ قرار دیا' پھر ایسی صورت میں جب سوویت یونین کو ان منصوبوں پر کنٹرول کرنے کا حق بھی نہیں تھا۔ غرض ان تمام باتوں کو ماؤ کی غداری کے مترادف سمجھا گیا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں خروشیف نے پیکنگ کے ساتھ کیے گئے ایٹمی معاہدے کو منسوخ کر دیا۔ اس کے برعکس وہ ہندوستان کو ترجیح دینے لگا۔ چنانچہ قرض میں اسے اتنی رقم دی گئی جو چین کو کبھی بھی نہیں دی گئی تھی۔ اسی سال یہ تفریق اور بھی واضح ہو گئی جب ماسکو میں ورلڈ کمیونسٹ پارٹیز کا اجلاس منعقد ہوا۔ ۱۹۶۲-۶۳ء کے مقابلے میں اب حالات زیادہ ناساعد تھے۔ ماؤ نے کیوبا پر روسی تسلط کی سخت مذمت کی تھی۔ پھر این ٹی بی ٹی (ایٹمی دھماکے پر پابندی کا معاہدہ) پر امریکہ اور برطانیہ کے دوش بدوش دستخط کرنے پر بھی شدید اعتراض کیا تھا۔ چنانچہ روس نے چین اور اس کے اتحادی ملک البانیہ کو دی جانے والی تمام امداد منسوخ کر دی۔ اس کے برعکس ہندوستان کو بے انتہا نوازنا شروع کر دیا۔ پھر چین اور روس کے سرحدی جھگڑے شروع ہو گئے۔ (یہ پہلے اتنے شدید نہیں تھے جتنے ۱۹۶۹ء میں تھے۔) پھر ۱۹۶۴ء میں یہ اہم خبر گرم ہوئی کہ چین نے اپنے پہلے ایٹمی بم کا دھماکہ کیا ہے۔ اور اب وہ "ڈلیوری سسٹم" کی تیاری میں مصروف ہے۔

فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یہ تفریق ۱۹۴۵ء کے بعد کا نہایت اہم واقعہ تھا۔ جب ستمبر ۱۹۶۴ء میں روسی اخبار "پراودا" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ماؤ نے ان ایشیائی علاقوں کو واپس لینے کا دعویٰ کر دیا ہے جنہیں روس نے چینی سلطنت سے چھین لیا تھا اور کورائل جزائر' پولینڈ کے بعض حصے' مشرقی پروشیا اور رومانیہ کے ایک خطے پر روسی قبضے کو ناجائز قرار دیا ہے تو قارئین انگشت بدنداں رہ گئے۔ ماؤ کے خیال میں روس کی وسعت کو محدود کرنا ضروری تھا۔ چین کے دعوے کے مطابق روسی رقبے میں ۱۰۵ ملین مربع کلومیٹر

کی تخفیف ہونی چاہئے تھی۔ چینی لیڈر کے اس دعوے میں کہاں تک صداقت تھی' اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ سرحدی جھگڑے' ایٹمی ہتھیاروں میں چین کی پیش رفت اور دیگر باتوں نے کریملن کو چونکا دیا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں روس کی بری فوج کو مزید مستحکم کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی' اس کا ایک سبب تو مشرقی سمت سے لاحق نیا خطرہ تھا' دوسرے کینیڈی کی حکومت کی بڑھتی ہوئی دفاعی قوت کا مقابلہ بھی کرنا تھا۔ ادھر روس نے چین سے ملحقہ سرحدوں پر ۱۹۶۷ء میں جو پندرہ ڈویژن فوج تعینات کی تھی' اس میں مزید اضافہ کر دیا' یعنی ۱۹۶۹ء میں یہ تعداد بیس اور ۱۹۷۰ء میں تیس ہو گئی۔ آخر الذکر شدید اضافے کی وجہ مارچ ۱۹۶۹ء میں چن پاؤ جزیرے میں برپا ہونے والا ہنگامہ تھا۔ ۱۹۷۲ء تک آتے آتے یہ صورت ہوئی کہ چین سے ملحقہ ۴۵۰۰ میل لمبی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سوویت یونین کی ۴۴ ڈویژن فوج تعینات کر دی گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ روسی فضائیہ کا ایک چوتھائی حصہ مغرب سے مشرق تک کے علاقے کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا تھا۔ اب چین نے ہائیڈروجن بم بھی بنا لیا تھا۔ اس وقت اس بات کا اشارہ مل رہا تھا کہ روس' لوپ نور کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کرنے کا قطعی ارادہ کر چکا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے مجبور ہو کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پلان تیار کیے۔ اسے یہ قطعاً" گوارا نہ تھا کہ روس چین کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ وہ کسی صورت میں بھی سوویت یونین کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ ۱۹۶۳ء میں چین کو ایٹمی صلاحیت سے باز رکھنے کے لیے امریکہ سوویت یونین کے ساتھ ساز باز کر رہا تھا ------- اور اب وہ اس مقام مفاہمت سے بہت دور نکل آیا تھا۔

یہ کہنا مشکل تھا کہ ماؤ کی ماتحتی میں چین تیسری سپر پاور کی مکمل حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اسے معاشی طور پر بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ بحران میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو گیا جب اس کے قائد نے "ثقافتی انقلاب" کی داغ بیل ڈال دی۔ اس طرح غیر یقینی کی فضا اور بھی گمبھیر ہو گئی۔ اگرچہ چین کی فوج دنیا میں بہت بڑی سمجھی جاتی تھی لیکن عوامی ملیشیا روس کے رائفل بردار ڈویژن کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس کی بحریہ بھی روس کی بحری فوج کے مقابلے میں کمتر درجے کی تھی۔ اگرچہ چین کی فضائیہ کے ڈلیوری سسٹم میں وہ ابھی نو مشق تھا۔ اگر سوویت یونین امریکیوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کا خطرہ مول لے لیتا اور چین پر شدید حملہ کر کے دنیا والوں کی نظروں میں گر جاتا تو اس وقت معمولی درجے کی لڑائی بھی بے پناہ ہلاکت کا باعث بنتی۔ عجیب اتفاق کہ چین اس کے لیے تیار تھا' لیکن برژنیف کے عہد کے روسی سیاست دان اس کام پر آمادہ نہ تھے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ جب روس اور چین کے تعلقات خاصے کشیدہ ہو گئے تو ماسکو نے تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں نہ مغرب کے ساتھ گفت و شنید کی' بلکہ فیڈرل ریپبلک آف جرمنی جیسے ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں بھی مصروف ہو گیا۔ آخر الذکر ولی برلنٹ کی فرمانروائی میں باہمی کشیدگی رفع کرنے کے لیے زیادہ کوشاں تھا۔

چین اور روس کے درمیان یہ تفریق سیاسی اور سفارت کاری کے نقطہ نظر سے بھی کریملن کے لیے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ اگرچہ خروشیف ہمیشہ اس بات کے لیے رضا مند رہا کہ "سوشلزم کی دوسری شاہراہ" کو بھی برداشت کر لینا چاہئے' لیکن یہ حقیقت بھی تھی کہ روس مارکسی اصول کو نظر انداز بھی

کرتا رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی طفیلی ریاستوں کو مسلسل یہ ترغیب دی جاتی رہی کہ وہ روس کا طوق غلامی اتار پھینکیں۔ اور پھر تیسری دنیا کے ممالک میں اس کی سفارتی جدوجہد بیجنگ کی مالی امداد اور پروپگنڈے کی بدولت ناکام ہوتی رہی۔ روسی کمیونزم کے ناکام اثرات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ماؤ کا کمیونسٹ نظریہ کسانوں کی فلاح و بہبود پر منحصر تھا جبکہ روس اجتماعی صنعت کاری پر زور دے رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ چین کا ان قائدانہ اقدامات کی وجہ سے مشرقی یورپ میں سوویت سلطنت کو خطرہ لاحق تھا۔ صرف البانیہ کی حکومت موجب خطرہ بنی ہوئی تھی۔ البتہ ماسکو کے لیے یہ بات سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ ۱۹۶۸ء میں اس نے چیکو سلواکیہ کی تحریک آزادی کو جس طرح کچلا تھا اور ۱۹۶۹ء میں اس نے افغانستان میں جو عملی اقدام کیا تھا' ان تمام باتوں کے لیے چین اس کی سخت مذمت کرنے لگا تھا۔ علاوہ ازیں' تیسری دنیا میں روس کے اثرات کی بیخ کنی کرنے میں چین پیش پیش تھا۔ شمالی یمن میں بھی وہ روسی کمیونسٹوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس نے تنزانیہ میں ریلوے کی تعمیر کے سلسلے میں خاصا کام انجام دیا تھا۔ چین نے ماسکو پر شدید اعتراض کیا تھا کہ اس نے امریکیوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ویت منہ کانگ کی مناسب طور پر مدد نہیں کی تھی۔ جب جاپان کے ساتھ اس کے تعلقات دوبارہ بحال ہوئے تو اس نے ٹوکیو کو متنبہ کیا کہ وہ روس کے ساتھ سائبیریا میں اتنی وسعت کے ساتھ اقتصادی تعاون نہ کرے۔ یہ بات پھر دہرائی جائے گی کہ یہ یکساں سطح کی جدوجہد ہرگز نہ تھی ------ روس تیسری دنیا کے ممالک کو حسب معمول قرض اور اسلحہ فراہم کر رہا تھا۔ وہ کیوبا اور لیبیا کو اپنی نیابت کا درجہ دے کر زیادہ سے زیادہ اثر و رسوخ بڑھا رہا تھا۔ بایں ہمہ' اسے مارکسی نظریے کے حامل ایک ہم مشرب ملک اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ مسلسل مسابقت کرنا پڑ رہا تھا' لہٰذا تمام صورِ حال صبر شکن ثابت ہو رہی تھی۔ دو عشرے پہلے دشمنی کی یہ فضا موجود نہ تھی۔

بہرحال چین کے باعزم اور آزادانہ رویے نے سفارتی تعلقات کو زیادہ گمبھیر اور انوکھا بنا دیا تھا' خصوصاً" ایشیا میں! جب ماسکو نے ہندوستان کی جانب دست الفت دراز کیا تو اہل چین کو اس سے صدمہ پہنچا اور جب چین اور ہندوستان کے درمیان سرحدی تنازع پیدا ہوا اور نوبت جنگ تک آ پہنچی تو اس وقت روس نے آخرالذکر کی فوجی امداد کی تھی۔ اس سے چینی عوام اور بھی ناراض ہوئے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہوئی تو چین نے آخرالذکر کی مدد کی تھی۔ پھر افغانستان پر روسی حملے نے چین کو سخت طیش دلا دیا تھا۔ چین ماسکو سے اور بھی بیزار ہو گیا تھا' جب اس نے ۱۹۷۰ء کی آخری دہائی میں شمالی ویت نام کی توسیع میں مدد کی تھی' آخرالذکر کو کمیکون میں شامل کر لیا تھا اور ویت نام کی بندرگاہوں پر روسی جہاز لنگر انداز ہو گئے تھے۔ جب دسمبر ۱۹۷۸ء میں ویت نام نے کمبوڈیا پر حملہ کیا تو چین نے اپنے شمالی پڑوسی ملک کے ساتھ سرحدی تنازع کا آغاز کر دیا' لیکن یہ محاذ آرائی خونیں ضرور تھی لیکن کامیاب نہ تھی۔ ادھر متحارب ملک کو روس نے اسلحے سے بے اندازہ نواز دیا۔ انہی دنوں ماسکو تائیوان کی حکومت کے ساتھ پینگ بڑھانا چاہ رہا تھا۔ ادھر چین امریکہ سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ بحر ہند اور مغربی بحرالکاہل میں اپنی فوج میں اضافہ کر دے تاکہ روسی اسکواڈرن کا مقابلہ کیا جا سکے۔ محض بیس سال قبل چین سوویت یونین پر یہ اعتراض کر رہا تھا کہ وہ مغربی ممالک کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔۔ اور اب یہی چین نیٹو

پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنی دفاعی قوت کو فروغ دے۔ بایں ہمہ' وہ جاپان اور مشترکہ منڈی کے اراکین (بلجیم، فرانس، اٹلی، لکسمبرگ، ہالینڈ اور مغربی جرمنی) کو خبردار کر رہا تھا کہ وہ روس کے ساتھ اقتصادی تعلقات استوار نہ کریں۔

۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں اور اس کے بعد مغربی کیمپ میں جو انتظامی خلل واقع ہوا تھا' اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ڈیگال نے امریکی قیادت کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی تھی۔ اگرچہ یہ اتنی سنگین نہ تھی لیکن یہ تاثر ضرور پیدا ہوتا تھا کہ دونوں بلاک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے ہیں۔ ڈیگال کے ذہن میں دوسری جنگ عظیم کی یادیں ہنوز تازہ تھیں۔ اسے احساس تھا کہ اہل فرانس کے ساتھ امریکہ کا سلوک برابر کا نہیں' بلکہ ادنیٰ درجے کا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اس نے سویز کے قضیے کے دوران امریکی پالیسی کی سخت مزمت کی تھی۔ یہاں ڈلس کی اس عادت کا اظہار ضروری نہیں کہ وہ کیوبے جیسے معاملات پر ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دیا کرتا تھا۔ ۱۹۵۸ء کے بعد ڈیگال مسلسل اس بات کی کوشش میں مصروف رہا کہ فرانس الجیریا کا قبضہ چھوڑ دے۔ اس زمانے میں بھی اس نے مغربی یورپ کے اس رویے پر اعتراض کیا کہ وہ امریکی مفادات کی خاطر چاپلوسی میں لگے رہتے ہیں۔ برطانیہ کی طرح وہ بھی یہ سمجھتا تھا کہ بڑی طاقت کو اپنا مقام بحال رکھنے کے لیے ایٹمی ہتھیار کی ضرورت ہے۔ جب ۱۹۶۰ء میں فرانس نے اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تو جنرل ڈیگال نے خبر سنتے ہی کہا "فرانس کے لیے کلمہ تحسین! آج کی صبح کے بعد وہ اب زیادہ مضبوط اور فخرکناں ہو چکا ہے"۔ وہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ فرانس کی ایٹمی طاقت بالکل آزاد ہو گی۔ چنانچہ جب واشنگٹن نے "پولارس میزائل سسٹم" کی پیشکش کی تو اس نے نہایت برہم ہو کر اسے مسترد کر دیا۔ یہ بات واضح تھی کہ فرانس اپنے مجموعی دفاعی بجٹ میں سے وافر حصہ ہتھیار کے پروگرام پر خرچ کر رہا تھا (تقریباً" ۳۰ فی صد)۔ ڈیگال اور اس کے جانشینوں نے یہ بخوبی محسوس کر لیا تھا اس کی قیمت منافع بخش ہے۔ انہی دنوں اس نے فرانس کو نیٹو سے نکالنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ۱۹۶۶ء میں اس ادارے کا ہیڈ کوارٹر بھی پیرس سے ہٹا دیا۔ اس نے فرانس سے تمام امریکی اڈے ختم کر دیے۔ اس کے برعکس' ڈیگال نے ماسکو کے ساتھ فرانس کے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ روس میں اس کے ان اقدامات کو خاصا سراہا گیا۔ ڈیگال نے مسلسل اس بات پر زور دیا کہ یورپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔

ڈیگال کی مثالی کاروائی محض فرانسیسی نعروں اور ثقافتی افتخار تک محدود نہ تھی۔ امریکہ کے مارشل پلان کے تحت ملنے والی امداد اور دیگر مراعات' نیز ۱۹۴۰ء کے عشرے کے بعد یورپ کی سنبھلتی ہوئی اقتصادی حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرانس کی معیشت مسلسل دو عشرے تک ترقی کرتی رہی۔ اگرچہ نوآبادیاتی لڑائیوں (مثلاً" ہند چینی کی لڑائی جو ۵۴-۱۹۵۰ء تک جاری رہی اور الجیریا کا جھگڑا جو ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک چلتا رہا) کی وجہ سے فرانس کے وسائل وقتی طور پر وہاں استعمال ہوتے رہے لیکن بے مصرف نہ تھے۔ جب ۱۹۵۷ء میں یورپی اقتصادی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو فرانس نے قومی مفادات کے پیش نظر خاطر خواہ شرائط پر معاہدے کیے اور خاصے فوائد حاصل کر لیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی زراعت کو فروغ بھی دیتا رہا اور صنعت کو جدید خطوط پر ڈھالتا بھی رہا۔ ڈیگال ایک طرف تو واشنگٹن پر تنقیدوں کی بوچھاڑ کرتا رہا اور برطانیہ کو

اقتصادی کمیٹی میں شامل ہونے سے روک دیا تو دوسری طرف جرمنی کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں ڈرامائی طور پر تعلقات استوار کر لیے۔ اس تمام عرصے میں وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ یورپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانا چاہیے' اسے سپرپاور کے تسلط سے آزاد ہو جانا چاہیے' اسے اپنے شاندار ماضی کو یاد کرنا چاہیے اور بہتر مستقبل کے لیے فرانس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ یہ جوش آمیز الفاظ تھے جنھوں نے فولادی پردے کی دونوں جانب ارتعاش پیدا کر دیا۔ بایں ہمہ' ان تمام لوگوں کو متاثر کیا جو روس اور امریکہ کے سیاسی تھپڑ سے تنگ تھے۔

بہرحال' ۱۹۶۸ء میں طلبا اور مزدوروں کی بغاوت کے نتیجے میں ڈیگال کا اپنا کردار گردش میں آ گیا۔ اس بحران کا سبب ایک تو جدید کاری تھی' دوسرے فرانس کی معیشت ترقی یافتہ نہ تھی۔ ۱۹۶۳ء میں عالمی پیداوار میں اس کا حصہ محض ۳ء۵ فی صد تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملک وہ موثر کردار ادا نہیں کر سکا تھا جس کا ذکر جنرل ڈیگال نے بار بار کیا تھا۔ علاوہ ازیں' اس نے مغربی جرمنی کے ساتھ مخصوص نوعیت کے معاہدے تو کر لیے تھے' لیکن آخرالذکر نے امریکہ کے ساتھ اپنے مضبوط بندھن توڑے نہیں تھے اس لیے کہ بون کے سیاست دان یہ جانتے تھے کہ ان کا تمام تر انحصار ریاست ہائے متحدہ امریکہ پر ہی ہے۔ علاوہ ازیں' ۱۹۶۸ء میں روس نے چیکوسلواکیہ کی اصلاحات کو سختی سے ختم کر دیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہو گئی تھی کہ مشرقی سپرپاور کسی طرح بھی یہ بات برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے کرے کے ممالک اپنی پالیسیاں از خود وضع کریں چہ جائیکہ فرانس کی زیر قیادت یورپی فیڈریشن میں شامل ہو جائیں۔

ڈیگال نے لائحہ عمل مرتب کر کے اسے مہمیز بھی کر دیا تھا۔ اسے اب روکا نہیں جا سکتا تھا۔ مغربی یورپ کی افواج اگرچہ فنی اور عسکری لحاظ سے امریکی اور روسی فوج سے کمزور ضرور تھیں لیکن تعداد اور طاقت میں کم نہ تھیں۔ یوں کہیے کہ ۱۹۴۵ء میں ان کی جو پوزیشن تھی' اس سے وہ بدرجہا بہتر تھیں۔ دو یورپی ممالک کے پاس ایٹمی ہتھیار بھی تھے اور وہ ڈیلیوری سسٹم کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اقتصادی طور پر بھی یورپ نے شاندار ترقی کی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ۱۹۶۸ء میں چیکوسلواکیہ پر روسی حملے کے باوجود یورپ میں سرد جنگ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ولی برانٹ نے ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۳ء کے دوران اور اپنی مخصوص پالیسی کے تحت روس' پولینڈ' چیکوسلواکیہ اور مشرقی جرمنی کے ساتھ تعلقات استوار کیے۔ نیز سرحدوں کو ۱۹۴۵ء کے مطابق ہی مستقل تسلیم کر لیا اور مشرق و مغرب کے مابین خوشگوار تعلق کا آغاز کر دیا۔ مغربی سرمایہ کاری اور ٹیکنالوجی کی رو فولادی پردے سے پرے پہنچ گئی۔ اقتصادی روابط نے ثقافتی تبادلے کی راہ ہموار کی۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں انسانی حقوق سے متعلق ہلسنکی معاہدہ عمل میں آیا۔ پھر اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ مستقبل میں کسی قسم کی فوجی غلط فہمی نہ پیدا ہو اور باہمی رضامندی سے فوجی طاقت میں کمی کر دی جائے۔ سپرپاورز نے بھی مناسب وجوہات کی بنا پر اور ناگزیر حالات کے تحت ان سب باتوں کو صاد کر دیا۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ یورپی ممالک نے از خود مفاہمت کو بروئے کار لانے پر زور دیا۔ ادھر ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان تعلقات قدرے بہتر ہو رہے تھے۔ چنانچہ مستقبل میں امریکہ یا روس کو اس رو کو روکنا آسان نہیں ہو گا۔

مذکورہ دونوں ممالک میں اول الذکر روس کے مقابلے میں اس بات کی زیادہ صلاحیت رکھتا تھا کہ نئے اور اجتماعی بین الاقوامی ماحول سے مطابقت پیدا کر لے۔ ڈیگال نے امریکیوں کے متعلق کیسی ہی قیاس آرائی کیوں نہ کی ہو' لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ چین اور روس کے مابین ہونے والے سرحدی جھگڑے سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا' دو طرفہ تجارت کے خاتمے میں بھی ان کا ہاتھ نہ تھا' انھوں نے نظریاتی دشنام طرازی بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی دنیا میں کسی جگہ سفارتی طور پر دھکم پیل کی تھی۔ تاہم امریکہ کی کئی حکومتوں نے فرانس کے رویے کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ ان جھگڑوں کی بناء پر وہ اپنی مسلح افواج کو دوبارہ تعینات کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ بہرحال' نیٹو کو بالائی فضا سے گزرنے کا حق ہنوز دے دیا گیا تھا اور ایندھن کی لائن کو فرانس سے گزرنے کی اجازت تھی۔ پھر پیرس نے مغربی جرمنی کے ساتھ اپنا دفاعی معاہدہ برقرار رکھا۔ جس کی رو سے یہ طے تھا کہ اگر وارسا پیکٹ سے منسلک افواج نے مغربی سمت حملہ کر دیا تو مغربی جرمنی کی فوجیں مدد کے لیے حاضر ہوں گی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۴۵ء کے بعد امریکہ کی بنیادی پالیسی یہ رہی ہے کہ ایک مضبوط اور آزاد یورپ کا قیام خود امریکہ کے مفاد میں ہے اور اس کی بدولت اس کے دفاعی اخراجات کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے ممکن ہے یہ خیال رہا ہو کہ ایسا یورپ معیشت اور سفارت کاری میں مد مقابل بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے یورپ کے باہمی ارتباط کی ہر تحریک کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ نیز وہ برطانیہ پر زور دیتا رہا کہ وہ یورپی اقتصادی کمیٹی کی رکنیت اختیار کر لے۔ اگر یورپی ممالک کا ایک مضبوط کنفیڈریشن مغرب میں قائم ہو جاتا ہے تو اس صورت میں روس نہ صرف خود کو غیر محفوظ تصور کرے گا بلکہ اس بات کے لیے فکر مند ہو گا کہ اس کے طفیلی ملک رومانیہ' پولینڈ وغیرہ کے باشندوں پر اس ادارے کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ باہمی کشیدگی کو رفع کرنے کی پالیسی اور مغربی یورپ کے ساتھ روس کے اقتصادی تعاون کا معاملہ خاصا گمبھیر تھا۔ ایک تو یہ کہ اس کی بدولت تکنیکی اور تجارتی فوائد حاصل ہوں گے' دوسرے یورپی ممالک امریکہ سے خاصا دور ہو جائیں گے' تیسرے روس کو ایشیائی محاذ پر چین کے چیلنج کا سامنا ہو گا۔ بہرحال طویل المیعاد صورت میں ایک خوشحال اور ابھرتا ہوا یورپ روس کے لیے کبھی بھی سود مند ثابت نہیں ہو گا۔

اگرچہ امریکہ عالمی طاقت کے بدلتے ہوئے انداز سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا' لیکن یہ صفت ۱۹۷۰ء کے بعد کئی برسوں تک نمایاں نہیں ہوئی۔ اولاً تو بہت سے امریکیوں کی نگاہ میں ایشیائی کیمونزم لائق نفرت تھا۔ پھر ماؤ کی سرکردگی میں چین خروشچیف کی جگہ عالمی انقلاب کو ہوا دے رہا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں چین اور ہندوستان کے درمیان سرحد کے معاملے پر جنگ ہوئی تھی۔ آخر الذکر وہ ملک تھا جس کے ساتھ واشنگٹن ماسکو کی طرح خوشگوار تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ بہرحال اس سرحدی تصفیے نے ماضی میں کیوموے اور متسو کے حوالے سے پیش آنے والے جارحانہ واقعات کی یاد تازہ کر دی۔ پھر ۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور چین کے درمیان کشیدگی رفع ہونے کے امکانات معدوم تھے' اس لیے کہ ان دنوں ماؤ کی پروپگنڈا مشین روس کی مذمت کر رہی تھی محض اس لیے کہ کیوبا کے معاملے میں وہ سرد مہری کا ثبوت دے رہا تھا اور ایٹمی دھماکے کو محدود کرنے کے معاہدے پر مغربی ممالک کے ساتھ دستخط کر دیے تھے۔

آخری بات یہ کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۸ء کے دوران چین ماؤ کے ثقافتی انقلاب کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے ملک کا استحکام ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ پھر نظریاتی لحاظ سے اس تحریک نے واشنگٹن کی انتظامیہ پر اچھے اثرات مرتب نہیں کیے تھے' یہ ایسے حالات تھے جن میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم ہونا ممکن نہ تھا۔

مذکورہ باتوں کے علاوہ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ ان دنوں امریکہ بھی ویت نام کی جنگ کے باعث بے شمار مسائل سے دو چار تھا۔ بہت سے امریکیوں کے خیال میں شمالی ویت نام اور جنوب کا ویت کونگ ایشیائی کیمونزم کے حصار میں رہے تھے' لہٰذا قبل اس کے کہ وہ خطرے کا باعث بنے' اسے کچل دینا لازمی تھا۔ چین اور روس ان سب انقلابیوں کی مدد کر رہے تھے۔ یہ دونوں طاقتیں انتہا پسند مارکسی نظریے کی حامل تھیں اور "آزاد دنیا" کے مد مقابل صف آرا ہوئی تھیں۔ جانسن کی انتظامیہ نے ویت نام میں اپنی فوجی قوت خاصی بڑھالی تھی جبکہ امریکہ کے منصوبہ ساز مسلسل اس تشویش میں مبتلا تھے کہ چین کی مداخلت کے بغیر وہ لوگ کس طرح معاملہ سر کر سکتے ہیں۔ جنگ کوریا کی مثال ان کے سامنے تھی جس میں چین نے مداخلت کی تھی۔ ادھر ۱۹۶۰ء کے پورے عشرے کے دوران چین میں اس معاملے پر بحث جاری رہی کہ آیا شمال میں روسیوں کے ساتھ محاذ آرائی زیادہ ناخوشگوار ہے یا جنوب میں امریکیوں کی فوجی پیش قدمی اور فضائی حملہ نحوست کا باعث ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مختلف ویت نامی گروہوں کے ساتھ چین کے تعلقات قدیم زمانے سے معاندانہ چلے آ رہے تھے۔ پھر روس کی جانب سے ہنوئی کو جو فوجی ساز و سامان مل رہا تھا اسے وہ مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ تمام تلخ حالات کینیڈی اور جانسن کی حکومت کے دوران اہل مغرب کی نظر سے اوجھل رہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ویت نام اور جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف علاقوں میں ایک طویل عرصے تک امریکہ کی جو فوجی مہم جاری رہی' اس کے کیا اثرات بین الاقوامی طاقت اور امریکیوں کے نفسیات پر مرتب ہوئے۔ وہاں کے بعض افراد کا یہ خیال ہے کہ ان کا ملک دنیا میں اب بھی جنگ و جدال کے ذریعے اپنا تاثراتی کردار ادا کرتا رہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ یہ جنگ ایک "آزاد خیال سوسائٹی" نے لڑی تھی اور اسے پوری طرح مشتہر اور عام بھی کیا تھا ---- مثلاً" پینٹاگون کی دستاویزات' روزانہ ٹی وی اور اخبارات کی رپورٹنگ وغیرہ کے ذریعے! یہ پہلی جنگ تھی جس میں امریکہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ نے دوسری جنگ کے سارے فاتحانہ تجربے کو خاک میں ملا دیا۔ یہ وہ جنگ تھی جس نے چار ستاروں والے جرنیلوں اور ذہین و طباع دانشوروں کی شہرت و ناموری کو داغ دار کر دیا۔ اس جنگ سے امریکی معاشرے میں قومی نصب العین اور ترجیحات کے حوالے سے ذہنی انتشار پیدا ہو گیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں افراط زر' طلبا کا ہنگامہ' اندرون ملک گڑ بڑ اور پھر واٹر گیٹ جیسا بحران ظہور میں آیا۔ اس لڑائی کی بدولت امریکی موسوں کی تعلیمات کے خلاف لوگوں میں تلخ جذبات پیدا ہوئے۔ پھر یہ وہ جنگ تھی جس نے پوری دنیا میں امریکہ کو بدنام کر دیا اور جب اترے ہوئے چہرے اور زخموں سے چور امریکی فوجی جوان ویت نام سے ایک عشرے بعد واپس آئے تو عوام میں رد عمل کی جو کیفیت پیدا ہوئی' اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ان کے ذہنوں میں

جنگ کی یاد تازہ ہے اور ٹی وی دستاویزوں' جنگی جریدوں' کتابوں اور ذاتی المیہ تحریروں میں اس کا ذکر جاری رہے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ویت نام کی یہ جنگ جس میں جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا' امریکا عوام پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوئی تھی کہ جس طرح اہل یورپ پر پہلی جنگ کے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ ذاتی اور نفسیاتی سطح پر اس جنگ کے اثرات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس لڑائی کو امریکی تہذیب اور اس کے قانونی نظام میں ایک بحران سے تعبیر کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس جنگ کی آزاد حکمت عملی اور بڑی طاقت کا دائرہ کار بحث اہمیت کا حامل رہے گا۔

آخر الذکر عنصر ہمارے اس جائزے کے لیے بہت اہم ہے اور اس بات کا متقاضی کہ یہاں اسے مزید واضح کیا جائے۔ ہم بات اس طرح شروع کریں گے کہ فوجی سازو سامان اور اقتصادی ترقی سے فوج کی کارکردگی میں ایک دم اضافہ نہیں ہو جایا کرتا۔ اس بات کے ذکر سے زیر نظر کتاب پر حرف نہیں آتا کہ اس میں اقتصادیات اور ٹیکنالوجی کی اہمیت پر خاصا زور دیا گیا ہے' بڑی طاقتوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں (عموماً جھڑپوں) کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس صورت و کیفیت کو پوری طرح واضح کیا گیا ہے جب ہر متحارب فتح کے حصول پر پوری طرح یقین رکھتا تھا۔ اقتصادی لحاظ سے امریکہ شمالی ویت نام کے مقابلے میں پچاس کیا' سو گنا زیادہ ترقی یافتہ رہا ہو گا۔ فوجی لحاظ سے وہ اس قابل تھا کہ دشمن پر بمباری کر کے اسے حجری دور میں واپس دھکیل سکتا تھا۔ ہاں' وہ اپنے ایٹمی ہتھیاروں سے پورے جنوب مشرقی ایشیا کو حرف غلط کی طرح مٹا سکتا تھا لیکن یہ وہ جنگ نہ تھی جس میں اس نوع کی صلاحیتیں بروئے کار آتیں۔ عوامی رائے اور دنیا والوں کے رد عمل کے خوف سے امریکہ نے اپنے اس دشمن کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کیے جو کبھی بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لیے کسی اہم خطرے کا سبب نہیں بنا تھا۔ چونکہ امریکی عوام جنگ کے بھاری جانی نقصانات پر واویلا مچاتے اور اس اقدام کے قانونی جواز پر بڑے اعتراضات ہوتے' لہٰذا اس ڈر سے انتظامیہ نے روایتی فن حرب کا استعمال روا رکھا' بمباری پر پابندی عائد کر دی' غیر جانب دار لاؤس کی وساطت سے ہوچی منہ کو حراست میں نہ لینے کا فیصلہ کیا اور ہیپونگ کی بندرگاہ تک اسلحہ لانے والے روسی جہازوں کو نہ چھیڑنے کا حکم نافذ کیا۔ دو اہم کمیونسٹ ممالک کو جنگ میں ملوث ہونے پر نہ ابھارنا بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس طرح یہ جنگ محض جنگلوں اور کھیتوں تک محدود رہی۔ وہاں کے قطعہ زمین نے امریکہ کے گولہ برسانے اور فوج کے آگے بڑھنے کے معاملے کو ٹھپ کر کے رکھ دیا اس کے برعکس اس جنگ نے انتظامیہ کو یہ ضرور باور کرا دیا کہ جنگلاتی جنگ کی تکنیک اور فوجی یونٹوں کے ارتباط کو اہمیت دی جائے۔ اگرچہ جانسن نے میسنڈی کی پیروی کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فوجی دستے ویت نام روانہ کیے' (۱۹۶۹ء میں یہ تعداد ۵۴۳۰۰۰ تک پہنچ چکی تھی) لیکن یہ سب جنرل ویسٹ مورلینڈ کی ضرورت کے مطابق کافی نہ تھے۔ حکومت کا خیال تھا کہ یہ تو چھوٹے پیمانے کی جنگ ہے' لہٰذا اس نے محفوظ دستہ روانہ کرنے سے تو انکار کر دیا اور نہ ہی اس نے معیشت کو جنگ میں جھونک ڈالا۔

یہ جنگ امریکہ کی فوجی صلاحیتوں کے عین مطابق نہ تھی' اور اس طرح سیاسی مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ بقول کلاؤز وٹز کے' یہاں معاملہ ذرائع کے استعمال اور مقاصد کے حصول میں بین فرق کا تھا۔ شمالی

ویت نامی اور ویت کانگ جس بات کے لیے لڑ رہے تھے اس پر انھیں کامل یقین و اعتماد تھا۔ اور جو ایسے نہ تھے' وہ نظم و ضبط کے پابند اور قومی حکومت کے پرجوش حامی تھے۔ اس کے برعکس جنوبی ویت نام کی حکومت کرپٹ تھی۔ اسے عوام میں مقبولیت حاصل نہ تھی۔ بدھ مذہب والے موٹک جو اقلیت میں تھے' اس پر معترض رہتے۔ حتیٰ کہ خوف زدہ' استحصال شدہ اور جنگ سے تنگ آئے ہوئے کسان بھی اس حکومت کے خلاف تھے۔ وہ فوجی جوان جو حکومت کے وفادار تھے اور خوب لڑتے بھی تھے' وہ مخالفین کی اندرونی نفرت کو دبانے کے قابل نہ تھے۔ جب جنگ میں شدت پیدا ہوئی' اس وقت امریکیوں نے سائیگون میں لڑنے کے حکومتی انداز پر اعتراض کیا۔ پھر انھیں اس بات سے دکھ بھی پہنچا کہ ان کی تمام مذموم حرکتیں خود امریکی افواج کو بگاڑ رہی ہیں' یعنی ان کا مورال گر رہا ہے' ان میں کلیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے' ان میں اب نظم و ضبط کا فقدان ہو گیا ہے' وہ نشہ کے عادی ہو رہے ہیں' وہ بد فعلی کا شکار ہو گئے ہیں' ان میں نسلی امتیاز شدت سے پیدا ہو گیا ہے اور میدان جنگ میں تشدد کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار مقصود نہیں ہے کہ اس وقت امریکہ کی اپنی کرنسی تحلیل ہو رہی تھی اور اس کا فوجی قد کاٹھ سکڑ رہا تھا۔ ہوچی منہ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس کی فوج کے دس آدمی بھی ایک کے مقابلے میں مارے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں! اور جب وہ لوگ جنگلات سے دندناتے ہوئے نکلتے اور شہروں پر حملہ کرتے تو ایسا ہی ہوتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جانی نقصانات کے باوجود یہ لوگ لڑتے رہیں گے۔ اس قسم کی خود اعتمادی جنوبی ویت نامیوں میں نہ تھی' نہ ہی امریکیوں میں تھی۔ وہ تو بس جنگ کی تردید ہی سے پریشان ہو جاتے اور حصول فتح کی خاطر ہر چیز قربان کر دینے کو آمادہ رہتے۔ ان کی یہ بات قابل فہم تھی۔ معاملہ ہر متحارب کے اپنے نقصان کا تھا۔ البتہ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک جمہوری ملک کے لیے بے دلی سے لڑ کر جنگ فتح کرنا ممکن نہیں۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جسے نہ تو میکنامارا کا تجزیاتی سسٹم نہ ہی بی۔۵۲ بمبار طیارے تبدیل کر سکتے ہیں۔

اپریل ۱۹۷۵ء میں سائیگون کا سقوط ہوا تھا۔ اس کے ایک عشرے بعد بھی لڑائی کے جملہ عوامل پر مشتمل کتابیں ہنوز چھپ چھپ کر منظر عام پر آ رہی ہیں۔ اس کے باوجود اس بات کا اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے کہ جنگ کی وجہ سے دنیا میں امریکہ کی پوزیشن کس طرح متاثر ہوئی ہے۔ اگر خاصے فاصلے سے جائزہ لیا جائے' یعنی ۲۰۰۰ء یا ۲۰۲۰ء سے بہت پیچھے جا کر دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہو گا کہ امریکہ کا عالمی اعزاز داغدار ہو گیا ہے' لہٰذا اس ملک نے مجبور ہو کر اپنی سیاسی اور فوجی ترجیحات پر غور و خوض شروع کر دیا اور ایک ایسی دنیا سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنے لگا جو ۱۹۴۵ء کے بعد خاصی بدل چکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ روس نے جنگ کریمیا کی بدولت جو صدمہ برداشت کیا تھا' وہی صورت حال اب امریکہ کے پیش نظر تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ان تمام جنگوں کے نتیجے میں سود مند اصلاحات اور تجزیاتی معائنہ کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔

جنگ کا فوری اثر نقصانات کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ جنگ میں بے پناہ رقم خرچ کی گئی تھی' خصوصاً ایسے وقت میں جب جانسن کے "عظیم معاشرہ" پر بھی خاصے اخراجات ہو رہے تھے۔ چنانچہ ان مصارف کا امریکی معیشت پر نہایت برا اثر پڑا۔ (ان تمام باتوں کا آگے چل کر جائزہ لیا جائے گا۔) علاوہ

ازیں' جب امریکہ ویت نام پر اپنی رقم پانی کی طرح بہا رہا تھا' اس وقت روس اپنی ایٹمی صلاحیت کو فروغ دینے میں سرمایہ لگا رہا تھے۔ چنانچہ اس نے ایک طرح سے جنگی برتری حاصل کر لی۔ پھر وہ اپنی بحریہ کو فروغ دینے کے لیے بھی رقم خرچ کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوویت یونین کی بحری فوج "گن بوٹ ڈپلومیسی" میں ساری دنیا کی اہم طاقت بن گئی۔ یہ بڑھتا ہوا عدم توازن اور بھی گھمبیر ہوتا چلا گیا جب امریکہ کے عوامی نمائندوں نے ۱۹۷۰ء کے عشرے میں زیادہ تر دفاعی اخراجات کے خلاف واویلا مچایا۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء میں قومی سلامتی کے اخراجات کے لیے مجموعی قومی پیداوار کا کل ۵ فی صد مخصوص کیا گیا۔ تیس سال کے عرصے میں جو رقم اس کے لیے مختص کی جاتی رہی تھی' یہ اس لحاظ سے بہت کم تھی۔ چنانچہ دفاعی اخراجات میں کٹوتی اور جنگ کی ناکامی کی وجہ سے فوجیوں کا مورال پست ہو گیا۔ سی آئی اے اور دیگر ایجنسیاں جو برائیوں کے انسداد کے لیے ضروری ہیں' اپنی اثر پذیری میں کمی کر بیٹھیں۔ ویت نام پر امریکہ کی بھرپور توجہ نے اس کے اتحادیوں کو بھی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ایک کرپٹ حکومت کی حمایت میں لڑنے کے امریکی اندازے نے عوام کو برگشتہ کر دیا اور مغربی یورپ نیز تیسری دنیا تک میں اس ملک کے متعلق لوگوں کی رائے بدل گئی۔ اور اس پورے کرے میں امریکہ کی "بیگانگی" کا یہ اہم سبب تھا۔ اس کی وجہ سے امریکہ کی توجہ لاطینی امریکہ سے ہٹ گئی۔ پھر وہاں یہ رجحان پیدا ہوا کہ کینیڈی کے متوقع "اتحاد برائے ترقی" کی جگہ غیر جمہوری ملکوں اور غیر انقلابی تحریکوں کی فوجی امداد کی جائے (مثلاً" ۱۹۶۵ء میں جمہوریہ ڈومینیکا میں مداخلت)۔ ویت نام کی جنگ کے بعد ایک عام مباحثہ یہ ہوا کہ مستقبل میں دنیا کے دیگر علاقوں کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو لڑنا چاہئے یا نہیں! اس سے امریکہ کے اتحادی ملک تشویش میں مبتلا ہو گئے لیکن دشمنوں کو بلاشبہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ پھر دوستی کا ہاتھ دراز کرنے والے غیر جانب دار ممالک نے دوسری سمت رجوع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اقوام متحدہ کے جلسوں میں امریکی وفد سب سے الگ تھلگ رہتا۔ ہنری لیوس نے بہت پہلے یہ کہا تھا کہ انسانوں کی برادری میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حیثیت ایک بڑے بھائی کی ہو گی ------- لیکن معاملہ کہیں اور پہنچ چکا تھا۔

ویت نام کی جنگ کا ایک اہم سیاسی پہلو یہ بھی سامنے آیا کہ تقریباً" ایک عشرے بعد واشنگٹن کی حکومت نے چین اور سوویت یونین کی باہمی تفریق کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ اس معاملے کو طے کرنے کے لیے ایک پالیسی وضع کی گئی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت پیش کیا گیا جب جنوری ۱۹۶۹ء میں کیمونزم کے شدید ترین دشمن' رچرڈ نکسن ایوان صدارت میں داخل ہوئے لیکن نکسن' بقول پروفیسر گیڈس "نظریاتی طور پر سخت گیر اور سیاسی طور پر دخل در معقولات کرنے کے عادی تھے"۔ چنانچہ ان کی آخر الذکر خصوصیت بیرونی بڑی بڑی طاقتوں کے ساتھ معاملہ بندی میں نمایاں ہوتی رہی۔ اگرچہ نکسن چلی کے سوشلسٹ منصوبے کے خلاف اہل وطن کے اعتراض کو پسند نہیں کرتے تھے' لیکن جب عالمی ڈپلومیسی کا معاملہ درپیش ہوتا تو وہ نظریات سے یکسر منحرف ہو جاتے۔ وہ ان باتوں میں کسی قسم کا فرق محسوس نہیں کر سکے تھے جب ۱۹۷۲ء میں شمالی ویت نام پر شدید بمباری کا حکم دیا تھا' جب انھوں نے جنوبی ویت نام سے فوج واپس بلانے کے لیے ہنوئی سے سودے بازی کے لیے کہا تھا اور اسی سال چین کا دورہ کر کے ماؤزے تنگ کی

نفرت کو ختم کرنا چاہا تھا۔ سب سے اہم بات یہ بھی تھی کہ انھوں نے ہنری کسنجر کو اپنا سیکورٹی مشیر بنانا پسند کیا تھا اور بعد ازاں وہ سکریٹری آف اسٹیٹ بنا دیے گئے۔ کسنجر عالمی امور کو تاریخی اور علاقائی انداز میں دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ واقعات کو وسیع تناظر میں اور ایک دوسرے کے تعلق کے حوالے سے دیکھا جانا چاہئے۔ بڑی طاقتوں کے کام کو دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے نہ کہ ان کے مقامی تصورات و نظریات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ مکمل تحفظ کا معاملہ محض ایٹوپیائی ہے اس لیے کہ اس طرح ہر شخص بالکل غیر محفوظ ہو جائے گا۔ ہر کوئی علاقائی تحفظ کی خواہش رکھتا رہے اور اس کا دارو مدار عالمی امور میں متوازن طاقت پر ہے۔ دیگر دانشوروں کی طرح انھوں نے بھی میٹرنخ' کیسل ریغ اور بسمارک کے متعلق لکھا ہے۔ کسنجر کے خیال کے مطابق "جب انسان اور عالمی امور میں دانشمندی کا آغاز ہوا تو گویا اس وقت اس کا خاتمہ بھی محسوس کیا جا رہا تھا۔" انھوں نے پالمرسن کے اس قول کو نقل کیا ہے: "ہمارا کوئی مستقل دشمن نہیں!" بسمارک کی اس رائے کا حوالہ دیا ہے: "چین اور سوویت یونین کے درمیان ہونے والے تشدد کے واقعات سے ہمارا مقصد حل ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہر دو متحارب سے علیحدہ علیحدہ تعلقات استوار کریں"۔ امریکی سفارت کاری کے لیے یہ سب باتیں کینن کے بعد سے اب تک نہیں کی گئی تھیں۔ لیکن یہ حقیقت بھی ہے کہ کسنجر کو اپنے انیسویں صدی کے ممدوحین کے مقابلے میں پالیسی وضع کرنے کے بہتر مواقع حاصل تھے۔

کسنجر کو امریکی طاقت کی محدودیت کا احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ امریکہ ایک وقت جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں میں گھمبیر قسم کی جنگ لڑنے اور دوسرے مفادات کا تحفظ کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اس کی ایک وجہ ان کے اور نکسن کے خیال میں یہ بھی تھی کہ عالمی طاقت کے توازن میں تبدیلی آ رہی تھی اور نئی قوتیں دونوں سپر پاورز کی اب تک قائم شدہ بالادستی کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ دونوں عالمی طاقتیں فوجی لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکی تھیں لیکن ایک دوسرے نقطے کے لحاظ سے یہ دنیا کثیرالمحورائی صورت اختیار کر چکی تھی۔ کسنجر نے ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا:

اقتصادیات کے ضمن میں انھوں نے ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا۔ "معاشی لحاظ سے دنیا میں پانچ اہم گروپ ہیں۔ سیاسی طور پر اور بھی مراکز نمایاں ہوئے ہیں۔" کسنجر نے کینن کا حوالہ دیتے ہوئے پانچ اہم علاقوں کی نشان دہی کی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ' سوویت یونین' چین' جاپان اور مغربی یورپ۔ انھوں نے امریکیوں کے برعکس اور روسیوں کے مطابق اس تبدیلی کو سراہا ہے۔ ان کے خیال میں بڑی طاقتوں کا ایک ایسا گروپ ہونا چاہئے جو ایک دوسرے کو متوازن رکھے' ایک دوسرے پر بالادستی قائم نہ کرے' تب ہی ایک محفوظ اور بہتر دنیا کا وجود ممکن ہے۔ اس کے برعکس دو قطبی دنیا مناسب نہیں کہ اس میں ایک کا نقصان دوسرے کے لیے فائدہ مند قرار پاتا ہے۔ امریکی مفادات کے دفاع کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس کی ڈپلومیسی میں تبدیلی لائی جائے۔

۱۹۷۱ء کے بعد چین اور امریکہ میں مفاہمت ہو جانے کی وجہ سے ایک سفارتی انقلاب برپا ہو گیا اور عالمی طاقتوں کے باہمی تعلق پر اس کا خوشگوار اثر مرتب ہوا۔ واشنگٹن کے اس رویے سے جاپان کو اگرچہ حیرت ہوئی تھی' لیکن پھر وہ سوچنے لگا کہ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ وہ بھی تعلق قائم کر سکتا ہے۔

چنانچہ اس عمل کے نتیجے میں اس کی ایشیا میں ہونے والی تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ ویسے ایشیا میں سرد جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا ---- لیکن یہ کہنا شاید بہتر ہوگا کہ اب یہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہو گئی تھی۔ پاکستان نے واشنگٹن اور پیکنگ کے درمیان خفیہ پیغام رسانی کا کام انجام دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اسے دونوں ملکوں سے مدد ملی۔ ویسے ماسکو نے نئی دہلی کی بھرپور مدد کی تھی۔ یورپ میں بھی توازن میں تبدیلی آگئی تھی۔ چین کی جارحیت سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اور کسنجر کی سفارت کاری سے متاثر ہو کر کریملن نے سالٹ اول معاہدے پر دستخط کرنا ضروری سمجھے۔ اس نے اور بھی ایسے اقدامات کیے تاکہ "فولادی پردے" سے پرے تعلقات استوار ہوں۔ جب ۱۹۷۳ء میں عرب - اسرائیل جنگ وقوع پزیر ہوئی تو امریکہ کے ساتھ روس کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو گئے اور وہ دوستی سے پھر گیا۔ اس موقع پر کسنجر نے اپنی "شٹل ڈپلومیسی" کے ذریعے مصر اور اسرائیل میں مفاہمت کرا دی۔ اس طرح روس کو کسی اہم اقدام کرنے سے باز رکھا۔

یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ اگر واٹر گیٹ اسکینڈل کے نتیجے میں نکسن کو اگست ۱۹۷۴ء میں وائٹ ہاؤس سے بے دخل نہ ہونا پڑتا اور ان دونوں کی حکومت امریکیوں کی نظروں میں مشکوک نہ ہو جاتی تو کسنجر کب تک بسمارک کے انداز میں شعبدہ بازی کرتے رہتے۔ جب کہ سب جانتے ہیں' فورڈ کے عہد صدارت میں یہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدے پر برقرار ہے' لیکن کچھ کر دکھانے کی آزادی محدود تھی۔ مطلوبہ دفاعی بجٹ میں کانگریس بارہا کٹوتی کر دیتی۔ فروری ۱۹۷۵ء میں جنوبی ویت نام' کمبوڈیا اور لاؤس کو دی جانے والی تمام امداد بند کر دی گئی۔ "وار پاور ایکٹ" کے تحت صدر کی اس صوابدید پر مسلسل قدغن لگتی رہتی۔ وہ سمندر پار ملکوں میں تعینات امریکی فوج کی مدد کرتے۔ جب روس اور کیوبا نے انگولا میں مداخلت کی تو اس موقع پر یہ طے ہوا کہ سی آئی اے کے فنڈ اور اسلحے بھیج کر وہاں مغرب کی طرفداری کرنے والے دھڑے کی مدد کی جائے۔ لیکن کانگریس نے اس کی قطعاً اجازت نہیں دی۔ ریپبلکن جماعت والے اس بات پر سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ بیرون ملک امریکہ کی طاقت زوال پذیر ہو رہی ہے۔ انھوں نے ان تمام باتوں کا الزام کسنجر پر عائد کیا کہ ان کی وجہ سے قومی مفادات ختم ہوتے جا رہے ہیں' مثلاً" پانامہ کنال کا واقعہ یا تائیوان جیسے قدیم ساتھی کے ہاتھ سے نکلنے کا سانحہ! چنانچہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی پوزیشن فورڈ کے ۱۹۷۶ء کے الیکشن میں ناکامی کے بعد عہدہ صدارت چھوڑنے سے قبل ہی ڈانواں ڈول ہو گئی۔

۱۹۷۰ء کے تمام عشرے کے دوران امریکہ سماجی اور اقتصادی نوعیت کے اہم مسائل سے دو چار رہا۔ نیز' مختلف سیاسی جماعتوں نے ملک کی گرتی ہوئی بین الاقوامی ساکھ سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ کی خارجہ پالیسی گزشتہ پرامن دور کے مقابلے میں بہت زیادہ ڈانواں ڈول رہی۔ تاہم اگلے چند برسوں میں تبدیلی آئی جس کی وجہ سے پالیسی ہر طرح معیاری ثابت ہوئی۔ چونکہ صدر کارٹر کیڈ اسٹون اور ولسن کے اس اعتقاد سے بہرہ ور تھے کہ ایک صاف ستھرا عالمی نظام تشکیل دینے کی ضرورت ہے' چنانچہ وہ ایک بین الاقوامی سسٹم رائج کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن بہت سے ممالک یہودی اور عیسائی اصولوں کی وجہ سے اپنی پالیسی وضع کرنے سے قاصر رہے۔ ادھر تیسری دنیا میں امیر اور غریب ممالک کے درمیان اقتصادی خلا قائم تھا جس میں ۱۹۷۳ء کے تیل کے بحران سے اور بھی

وسعت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس موقع پر صدر کارٹر نے شمال اور جنوب کے درمیان تعاون کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔ انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ ۱۹۷۸ء میں مصر اور اسرائیل کے درمیان کیمپ ڈیوڈ معاہدہ مکمل کروایا۔ ویسے دیگر عرب ممالک میں اس بات سے سخت رد عمل پیدا ہوا تھا اور وہ کارٹر پر سخت معترض ہوئے تھے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں روس کو اس بات کا سنہرا موقع مل گیا کہ وہ مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرے۔ اپنی تمام گراں قدر ترجیحات کے باوجود کارٹر کی نہایت ابھی ہوئی دنیا کے چٹانوں پر کھڑی تھی۔ ایک ایسی دنیا جو امریکہ کی بات ماننے کو قطعاً" تیار نہیں تھی۔ پھر انھیں اپنی متضاد اور غیر مناسب پالیسیوں سے بھی ضعف پہنچا' خصوصاً" انتظامیہ کے باہمی جھگڑے سے! آمرانہ طرز کی حکومتیں دنیا میں قائم تھیں' انھیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے پر سخت سست کہا گیا' لیکن دوسری طرف واشنگٹن زائر کے صدر مبانو' مراکش کے شاہ حسن اور شاہ ایران کی حمایت بھی کرتا رہا۔ آخر الذکر کی پشت پناہی کا سلسلہ ۱۹۷۹ء میں ان کی وفات تک قائم رہا' تا آنکہ یرغمال کا بحران اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے نتیجے میں امریکیوں کو چھڑانے کی جو کوشش کی گئی وہ نقائص سے مملو تھی۔ دنیا کے دوسرے حصے میں مثلاً" نکاراگوا سے انگولا تک' جمہوری اور آزاد طاقتوں کی تلاش شروع ہوئی تاکہ امریکی حکومت ان کی مدد کر سکے۔ لیکن اس میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم' مارکسی انقلاب برپا کرنے والوں کے خلاف قدم اٹھانے میں امریکہ ہچکچاہٹ محسوس کرتا رہا۔ کارٹر نے دفاعی اخراجات کو کم کرنے کی خواہش کی تھی۔ انھیں اس بات پر تعجب بھی تھا کہ سوویت یونین کے ساتھ باہمی کشیدگی دور کرنے کے معاہدے کے باوجود اس نے یہ تو اسلحہ کے اخراجات کو روکا ہے اور نہ ہی تیسری دنیا میں اپنی کاروائی بند کی ہے۔ جب روسی افواج نے ۱۹۷۹ء کے اواخر میں افغانستان پر حملہ کیا' اس وقت واشنگٹن کی حکومت وسیع پیمانے پر دفاعی تیاری میں مصروف تھی۔ لیکن فوراً" ہی اس نے "سالٹ دوم" معاہدے سے علیحدگی اختیار کر لی' ماسکو کو خریدے ہوئے غلے کی ترسیل روک دی اور اس سیاسی طاقت کے توازن پر زور دینا شروع کیا جس کی چار سال قبل انھوں نے مزمت کی تھی۔ واضح رہے کہ آخر الذکر کا اصرار اس وقت سامنے آیا جب بریزنسکی چین اور افغانستان کے دورے پر تھے۔

جب کارٹر کی حکومت ۱۹۷۶ء میں برسر اقتدار آئی تھی' اس وقت اسے دنیا کے پیچیدہ مسائل کا سامنا تھا۔ لیکن ۱۹۸۰ء میں ان کے جانشین بننے والے صدر کو بھی کم پریشانیاں لاحق نہ تھیں' اگرچہ یہ مختلف نوعیت کی تھیں۔ جب ریگن نے صدارت کا عہدہ سنبھالا تو ان کے پیش نظر کئی عوامل تھے: گزشتہ دو عشروں میں جو کچھ ہوتا رہا اور جس طرح امریکہ کو نقصان پہنچا اس کا جذباتی رد عمل۔ ایران میں ذلت کا سامنا۔ پھر دنیا کا نظریاتی زاویے سے تجزیہ!۔ چنانچہ اپنے مشاہدات کے پیش نظر انھوں نے جہاز کو نئے رخ پر چلانے کا ارادہ کر لیا۔ باہمی کشیدگی دور کرنے والا منصوبہ ختم کر دیا گیا کہ یہ محض روس کے توسیعی عزائم کا ایک پردہ تھا۔ اسلحے کے اضافے کی جانب توجہ دی گئی۔ انسانی حقوق کی شق کو ایجنڈے سے حذف کر دیا گیا۔ آمرانہ قسم کی حکومتوں کی تائید کی گئی حیرت کی بات یہ کہ "چین کارڈ" کو شک کی نظر سے دیکھا گیا محض اس لیے کہ وہاں کی جمہوریہ تائیوان کی حمایت کر رہی تھی۔ جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی' یہ حکومت بھی بیرونی

گمبھیر مسائل سے دو چار ہو گئی تھی۔ واضح رہے کہ امریکی کانگریس اور عوام دونوں اگرچہ صدر کی حب الوطنی کے جذبے کو پسند کرتے تھے، لیکن سرد جنگ کے متعلق ان کی پالیسی کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لاطینی امریکہ یا ویت نام کی طرح جنگلات سے پر کسی بھی علاقے میں مداخلت کا سلسلہ رفتہ رفتہ بند کر دیا گیا۔ ایٹمی ہتھیار کی دوڑ میں جو شدت پیدا ہوئی اس سے خاصی بے چینی پھیلی۔ ہتھیاروں کی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ کیا گیا، خصوصاً" ایسے وقت میں جب انتظامیہ کے بہی خواہوں نے یہ اعلان کیا کہ روس کے ساتھ ایٹمی جنگ ہونے کی صورت میں امریکہ مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ منطقہ حارہ کی آمرانہ حکومتیں روبہ زوال ہو گئیں۔ امریکی حکومت کے ساتھ روابط کی وجہ سے وہ مقبولیت کھو بیٹھی تھیں۔ اہل یورپ اس منطق پر حیران تھے کہ انھیں سوویت یونین سے قدرتی گیس خریدنے سے تو منع کر دیا گیا ہے، لیکن امریکہ کے کسانوں کو اجازت ہے کہ وہ اس ملک کو غلہ فروخت کریں۔ ادھر مشرق وسطیٰ میں ریگن کی انتظامیہ اسرائیل پر دباؤ ڈالنے میں ناکام رہی تھی۔ چنانچہ اس کا یہ منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا کہ عرب دنیا کو روس کے خلاف صف آرا کر دے۔ اقوام متحدہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہلے سے کہیں زیادہ تنہا نظر آ رہا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں اس نے یونیسکو سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ وہ اقدام تھا جس پر فرینکلن روز ویلٹ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پانچ سال کے دوران امریکہ نے دفاعی بجٹ میں دو گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اس طرح اس ملک کے پاس ۱۹۸۰ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعداد میں فوجی سازو سامان مہیا ہونے کے امکانات تھے۔ لیکن کیا پینٹاگون کو ان اخراجات کے عوض کچھ حاصل بھی ہو رہا تھا، اس معاملے میں سوائے شک و شبہ کے کچھ نہ تھا۔ اسی طرح یہ سوال بھی اعتراض کی زد میں تھا کہ کیا وہ اپنی مسلح افواج کی رقابتوں پر کنٹرول بھی کر سکے گا یا نہیں۔ گرینیڈا پر حملے کو فتح و نصرت کی علامت بنا کر بہت ڈھول پیٹا گیا تھا، حالانکہ یہ گلبرٹ اور سلی کی نقل کے سوا کچھ نہ تھا۔ آخری اور اہم بات یہ کہ ریگن انتظامیہ کے ہمدرد مبصرین یہ سوچ رہے تھے کہ کیا یہ مستحکم پاشان فوجی حکمت عملی وضع کر سکے گی جبکہ اس کے اراکین آپس میں دست و گریباں تھے، جب کہ سربراہان افواج پیچیدہ معاملات پر بالکل توجہ نہ دے رہے تھے اور جب کہ وہ خود بیرونی دنیا کا نسل پرستانہ عینک لگا کر جائزہ لے رہی تھی۔

ایسے تمام معاملات کا آخری باب میں ازسرنو جائزہ لیا جائے گا۔ ویسے کارٹر اور ریگن کی حکومتوں کے متعدد مسائل کے ایک ساتھ ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ہی نے ان طاقتوں کا صحیح جائزہ نہیں لیا تھا جو دنیا کی سیاسی طاقت کا سانچہ بدل رہی تھیں۔ نیز، ان کی توجہ اس امر پر بھی نہیں تھی کہ کسنجر نے ــــــ دو قطبی دنیا کی کثیر المحورائی دنیا میں تبدیلی کی جانب بہت پہلے اشارہ کیا تھا، اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی۔ (جیسا کہ آگے چل کر آپ مفصل مطالعہ کریں گے، تین سیاسی و اقتصادی اہمیت کے مراکز وجود میں آئے، یعنی مغربی یورپ، چین اور جاپان! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں مسائل سے بے نیاز تھے۔ لیکن یہاں اس کا ذکر ضروری نہیں۔) ایک ضروری بات یہ رہ گئی ہے کہ نکاراگوا ایران، انگولا، لیبیا وغیرہ کے مسائل پر امریکہ کی بھرپور توجہ سے یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی کہ وہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں عالمی سیاست میں بدلتے ہوئے حالات، خصوصاً" سوویت یونین کے اقدامات

سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ یہ وہ معاملہ ہے جو مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔ لہٰذا اس باب کے اختتام سے پہلے اس کا تذکرہ ضروری ہے۔

اس میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں کہ مذکورہ مدت میں سوویت یونین نے اپنی فوجی صلاحیت میں خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ لیکن پروفیسر اولم کے خیال کے مطابق دیگر ترقیاتی عمل کے دوش بدوش اس دفاعی طاقت کے فروغ کا مطلب یہ تھا:

> "سوویت یونین کے حکمران اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ امریکہ کے متعدد افراد نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ایسی بہت سی چیزیں ایجاد کر لی تھیں جو سکون کو غارت کرنے والی تھیں۔ حد سے بڑھی ہوئی طاقت، وہ بھی اس ایٹمی دور میں، کسی بھی ملک ایکا ایکی تحفظ فراہم نہیں کیا کرتی۔ غرض ہر نقطہ نگاہ سے، چاہے وہ اقتصادی ہو یا فوجی، برژنیف کی ماتحتی میں روس اسٹالن کے عہد کی نسبت بہت زیادہ طاقتور بن چکا تھا۔ لیکن جہاں اس کی قوت میں اضافہ ہوا، وہاں بین الاقوامی سطح پر نئی نئی ترقیاں روبہ عمل آئیں اور خارجی سطح پر امداد و اعانت کے لیے وعدے کیے گئے۔ چنانچہ اس صورت حال میں روس نے بیرونی خطرات کی بو سونگھ لی اور عالمی سیاست کی اس دھماکہ خیزی کو بھی محسوس کر لیا جو اس سے پہلے (۱۹۵۲ء) نہ تھی۔"

یہ امر واقعہ ہے کہ کارٹر حکومت کے انتہائی دور میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ازسرنو دفاعی تیاری شروع کر دی تھی۔ یہ کیفیت بعد میں آنے والی ریگن حکومت میں بھی پوری شدت کے ساتھ جاری رہی۔ اس طرح امریکہ نے دنیا کو یہ باور کرا لیا کہ وہ ایٹمی ہتھیار میں بالادستی حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنی بحریہ کی فوجی قوت میں اضافے کا متمنی ہے اور جدید ٹیکنالوجی پر پہلے سے کہیں زیادہ دسترس حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ سوویت یونین نے جھنجلا کر جواب میں یہ کہا تھا کہ وہ بھی کسی طرح پیچھے نہیں رہے گا۔ اس جھگڑے کے پس پردہ یہ تلخ حقیقت موجود تھی کہ ان فوجی اقدامات کے نتیجے میں اقتصادی حالت پر خاصا دباؤ پڑے گا۔ چونکہ معیشت پہلے ہی سے زبوں حال تھی، لہٰذا اس ٹیکنالوجی کی دوڑ کی وہ کسی صورت میں بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۷۰ء کے آخری عشرے میں تو یہ حالت تھی کہ اسے دوسرے ممالک سے بہت بڑی مقدار میں غلہ برآمد کرنا پڑا تھا۔ ایسے میں ٹیکنالوجی کے حصول کا کیا سوال؟ مشرقی یورپ میں روس کی طفیلی سلطنت تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی۔ پولینڈ والوں کی ناآسودگی الگ ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں چیکوسلواکیہ پر دوبارہ حملے کے نتیجے میں بھی جس اعانت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ واجبی سی تھی۔ جنوبی سمت میں افغانستان کی بفر حکومت کے بیرونی اثرات کی لپیٹ میں آجانے کا خطرہ لاحق تھا (ممکن ہے چین کے)۔ اس کے نتیجے میں وہاں ۱۹۷۹ء میں ناگہانی انقلاب رونما ہوا جو نہ صرف فوجی دلدل کا سبب بن گیا بلکہ بیرونی دنیا میں

روسی ساکھ کو بری طرح دھچکا پہنچا۔ چیکو سلواکیہ' پولینڈ اور افغانستان میں روسی کارستانیوں کے سبب دوسروں کے لیے اب یہ ملک "نمونہ عمل" نہیں رہا۔ اس کی یہی صورت مغربی یورپ اور افریقہ میں بھی پیدا ہو گئی تھی۔ مشرق وسطی کے علاقوں میں مسلم بنیاد پرستی پریشان کن صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس اجمال کے تحت یہ تہیہ کر لیا گیا تھا کہ مقامی کیمونسٹوں اور امریکہ نواز جماعتوں کے خلاف اقدامات کیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں' چین کا جارحانہ رویہ بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ افغان اور ویت نام کے پیچیدہ معاملات کی وجہ سے ۱۹۷۰ء کے آخری عشرے میں اس میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں سپر پاورز میں سے کسی ایک کے ہاتھ سے چین نکل جاتا تو وہ روس تھا۔ بہرحال اپنے معمر حکمرانوں کے نسل پرستانہ اور محدود سطح کے تشکیک آمیز خیالات اور اشرافیہ کی مزاحمتوں کے باعث روس کے لیے نئے عالمی توازن سے مطابقت رکھنا امریکہ کی نسبت زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔

روس کی مذکورہ تمام کیفیتیں واشنگٹن کے لیے باعث طمانیت ٹھہریں ان کی رہنمائی میں خارجہ پالیسی کے مسائل کو حل کرنے میں خاصی مدد ملی۔ بعض معاملات خصوصاً" تائیوان کی امداد کے ابتدائی فیصلے میں تبدیلی وغیرہ میں ریگن انتظامیہ زیادہ با عمل اور مصالحت آمیز بن گئی۔ لیکن ۸۰-۱۹۷۹ء کے انتخابی عمل کے لہجے کو تبدیل کرنا آسان نہ تھا۔ یہاں معاملہ خالی مولی نعرہ بازی کا نہ تھا بلکہ عالمی نظام کے بنیادی خصائص اور اس میں امریکہ کے امتیازی مقام کا تھا۔ جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا تھا' اس نوع کے خیال نے ہر ملک کے لیے یہ امر مشکل بنا دیا کہ وہ بیرونی معاملات کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھے نہ کہ اپنے زاویہ نگاہ سے یہ باور کرلے کہ اسے تو ایسا ہونا چاہئے تھا' ویسا ہونا چاہئے تھا۔

اقتصادیات کا بدلتا ہوا توازن

۱۹۵۰ء ــــــــ ۱۹۸۰ء

جولائی ۱۹۷۱ء میں کیس کے مقام پر رچرڈ نکسن نے سینئر صحافیوں کے ایک وفد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> اقتصادی لحاظ سے اس وقت دنیا میں پانچ طاقتیں ہیں ـــــ یعنی "مغربی یورپ' جاپان' چین' روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ ایسی پانچ ممالک مستقبل کی معیشت کا تعین کریں گے۔ اور چونکہ اقتصادی قوت دیگر طاقتوں کا سرچشمہ ہو گی' لہٰذا دوسرے معنوں میں دنیا کا مستقبل اس صدی کی آخری تہائی سے وابستہ ہو گا۔"

یہ خیال کرتے ہوئے کہ اقتصادی قوت کی اہمیت کے متعلق صدارتی رائے وقعت کی حامل ہے' لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سرد جنگ کے ابتدائی دنوں سے عالمی معیشت میں جو تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے' اس کا بغور جائزہ لیا جائے۔ اگرچہ بین الاقوامی تجارت اور خوشحالی بعض نامساعد حالات کا شکار رہی ہے' خصوصاً" ۱۹۷۰ء کی دہائی میں تاہم ایسے طویل المیعاد رجحانات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جنھوں نے عالمی سیاست میں ایک تبدیلی پیدا کر دی۔

زیر نظر کتاب میں جس طرح عہد ماضی کے واقعات کو سمویا گیا ہے' اقتصادی گوشوارے کے تجزیے میں وہ حقیقت آمیز صورت یہاں پیدا ہونا ممکن نہیں۔ واضح رہے کہ مل ہال کی "ڈکشنری آف اسٹیٹسٹکس" کے بعد سے حکومتیں اور بین الاقوامی ادارے وافر تعداد میں تجربہ کار ماہرین شماریات کو ملازم رکھتے رہے ہیں اور اس فن کی نئی نئی تکنیک بھی ایجاد ہوتی رہی ہے' اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ صحیح صحیح شماریاتی تجزیہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ تنگ نظر معاشرے اپنے اعداد و شمار شائع کرنے سے ہچکچاتے ہیں' مختلف ممالک میں آمدنی اور پیداوار کے جانچنے کے جدا جدا معیار ہیں' اور زرمبادلہ کی شرح میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے' لہٰذا اقتصادی اعداد و شمار کے صحیح ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ بہرحال شماریاتی اشارے پورے یقین کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم بنایا جاتا ہے اور وقتاً" فوقتاً" پیدا ہونے والے رجحانات کی جانب اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

بیروچ کے بیان کے مطابق پہلی اور اہم اقتصادی خصوصیت دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ رہی کہ "دنیا کی صنعتی پیداوار میں ترقی کی شرح کبھی بھی توقع کے مطابق نہیں تھی۔" ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۵ء کے دوران یہ شرح اوسطاً" ۶ فی صد سالانہ رہی ہے (فی کس ۴ فی صد)۔ پھر ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۰ء کے دوران اس میں ۲ء۴ فی صد کا اضافہ ہوا ہے جو تاریخی لحاظ سے خاصا اہم سمجھا جاتا ہے۔ بیروچ نے دنیا کے صنعتی

اداروں کی پیداوار کے سلسلے میں جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں حیران کن اضافہ ہوا ہے۔ (دیکھئے جدول ۳۹)۔ واضح رہے کہ بیروچ کے پیش کردہ اعداد و شمار کی تصدیق رستو کے اس گوشوارے سے بھی ہو جاتی ہے جو "عالمی صنعتی پیداوار" کے تحت اس نے درج کیے ہیں۔

جدول نمبر ۳۹: دنیا کے صنعتی اداروں کی پیداوار

۱۸۳۰ ------ ۱۹۸۰ء

(۱۹۰۰ = ۱۰۰)

	مجموعی پیداوار	ترقی کی سالانہ شرح
۱۸۳۰ء	۳۴٫۱	(۰٫۸
۱۸۶۰ء	۴۱٫۸	۰٫۷
۱۸۸۰ء	۵۹٫۴	۱٫۸
۱۹۰۰ء	۱۰۰٫۰	۲٫۶
۱۹۱۳ء	۱۷۲٫۴	۴٫۳
۱۹۲۸ء	۲۵۰٫۸	۲٫۵
۱۹۳۸ء	۳۱۱٫۴	۲٫۲
۱۹۵۳ء	۵۶۷٫۷	۴٫۱
۱۹۶۳ء	۹۵۰٫۱	۵٫۳
۱۹۷۳ء	۱۷۳۰٫۶	۶٫۲
۱۹۸۰ء	۳۰۴۱٫۶	۲٫۴

بیروچ نے یہ بھی کہا ہے کہ "۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۳ء کے دوران ہونے والی دنیا کی مجموعی صنعتی پیداوار کا ڈیڑھ صدی کی پیداوار سے موازنہ کیا جا سکتا ہے' یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۳ء تک!" جنگ سے تباہ حال معیشت کی بحالی' نئی نئی ٹیکنالوجی کی دریافت' زراعت سے صنعت کی جانب پیش قدمی' منظم اقتصادیات کے تحت قومی وسائل سے استفادہ اور تیسری دنیا میں صنعت سازی کا فروغ ---- ان سب باتوں نے مذکورہ ڈرامائی تبدیلی بروئے کار لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس سے بھی کہیں زیادہ موثر انداز میں اور انہی اسباب و عوامل کے نتیجے میں دنیا کی تجارت ۱۹۴۵ء کے بعد مثالی طور پر آگے بڑھی ہے۔ واضح رہے کہ دنیا کی دو عظیم جنگوں کی وجہ سے دنیا میں جو تباہی و بربادی آئی' اس کے مقابلے میں یہ پیش رفت عدیم المثال ہے۔ (دیکھیے جدول نمبر ۴۰):

جدول نمبر ۴۰: عالمی مقدار تجارت

۱۸۵۰ء لغایتہ ۱۹۷۱ء

(۱۹۱۳ء = ۱۰۰)

۱۸۵۰ء	۱۰٫۱	۱۹۳۸	۱۰۳
۱۸۹۶ تا ۱۹۰۰ء	۵۷	۱۹۴۸ء	۱۰۳
۱۹۱۳ء	۱۰۰	۱۹۵۳ء	۱۴۲
۱۹۲۱ تا ۱۹۲۵ء	۸۲	۱۹۶۳ء	۲۶۹
۱۹۳۰ء	۱۱۳	۱۹۶۸ء	۴۰۷
۱۹۳۱-۵ء	۹۳	۱۹۷۱ء	۵۲۰

ایشورتھ کے خیال میں سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات تھی کہ ۱۹۵۷ء میں پہلی مرتبہ صنعتی اشیاء کی تجارت کو ابتدائی پیداوار کے مقابلے میں خاصا فروغ حاصل ہوا۔ یہ بات اس حقیقت کی بھی غماز تھی کہ ان عشروں میں مجموعی صنعتی پیداوار زرعی معدنی پیداوار سے جو یقیناً" اثر انگیز تھی کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ (دیکھئے جدول نمبر ۴۱)۔

یہ تفاوت کسی حد تک اس بات سے واضح ہو سکتی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں پیداوار اور تجارت میں بے حد ترقی ہوئی تھی' خصوصاً" یورپی اقتصادی کیونٹی سے وابستہ ممالک میں۔ لیکن ابتدائی پیداوار کے لیے ان کی بڑھتی ہوئی طلب اور تیسری دنیا کے مختلف ممالک میں صنعت کاری کے آغاز سے یہ حقیقت حترشح ہوتی ہے کہ وہاں کی معیشت بھی ان عشروں میں نہایت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ مغربی شہنشاہیت نے دنیا کے دوسرے حصے کے معاشرے کو بری طرح تباہ و برباد کیا تھا' لیکن جب صنعتی ممالک میں توسیع ہونے لگی تو ان معاشروں کی برآمدات میں اضافہ اور اقتصادی ترقی ان ہی ممالک کی بدولت عمل میں آئی۔ فورمین پیک کا یہ کہنا ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک انیسویں صدی میں اس وقت تیزی سے ابھرے جب برطانیہ وغیرہ کی کھلی معیشت مسلسل پھیل رہی تھی۔ اسی طرح جب ۱۹۳۰ء کے عشرے میں صنعتی دنیا کساد بازاری کا شکار ہوئی تو یہ کم ترقی یافتہ ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں ان کی ترقی کی رفتار پھر بڑھ گئی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ ترقی یافتہ ممالک میں گرم بازاری کی کیفیت تھی' خام مال کی طلب بڑھ رہی تھی اور صنعت کاری پھیل رہی تھی۔ بیروچ کی تحقیق کے مطابق دنیا کی صنعتی پیداوار میں تیسری دنیا کے حصے کی شرح میں اچھا خاصا اضافہ ہو رہا تھا۔ جو شرح ۱۹۵۳ء میں ۶٫۵ فی صد تھی' وہ بڑھ کر ۱۹۶۳ء ۸٫۵ فی صد' ۱۹۷۳ء میں ۹٫۹ فی صد اور ۱۹۸۰ء میں ۱۲ فی صد ہو گئی۔ سی آئی اے کے تخمینے کے مطابق مجموعی عالمی پیداوار میں بھی کم ترقی یافتہ ممالک کے حصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۹۶۰ء یہ شرح ۱۱٫۱ فی صد تھی جو ۱۹۷۰ء میں ۱۲٫۳ فی صد اور ۱۹۸۰ء تک ۱۴٫۸ فی صد ہو گئی۔

تاہم' تیسری دنیا کی آبادی کی کثرت کے پیش نظر عالمی پیداوار میں ان کے حصے کی شرح

ستا" کم تھی۔ اس کے برعکس ان کی غربت میں تشویشناک حد تک اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں صنعتی ممالک میں فی کس مجموعی قومی پیداوار کا اوسط ۱۰۶۶۰ ڈالر تھا۔ لیکن متوسط آمدنی والے ممالک مثلاً" برازیل میں فی کس اوسط ۱۵۸۰ ڈالر تھا۔ لیکن تیسری دنیا کے غربت زدہ ملکوں' مثلاً" زائر میں یہ شرح تکلیف دہ حد تک کم تھی' یعنی کل ۲۵۰ ڈالر فی کس! اس کی حقیقت یہ تھی کہ عالمی پیداوار اور صنعتی پیداوار میں ان کا حصہ بحیثیت مجموعی تو بڑھ رہا تھا' لیکن جو فوائد حاصل ہوتے وہ کم ترقی یافتہ ممالک کو متناسب انداز میں نہیں ملتے۔ منقطہ حارہ کے بہت سے ممالک میں دولت کی تقسیم مساوی نہیں تھی۔ نوآبادیاتی نظام ختم ہونے کے باوجود یہ فرق اسی طرح موجود تھا جیسا شنشاہی دور سے پہلے تھا۔ ارتکاز دولت کے فرق کی کئی وجوہات تھیں: کی مصنوعات کی غیر متناسب طلب' مختلف سطح کی امداد جسے ہر کوئی ہڑپ کر جانے کی کوشش میں لگا رہتا' آب و ہوا کی شدت' سیاست' ماحول کے اثرات' کسانوں کی زبردستی نئی جگہ آباد کاری ـــــــ ان سب وجوہات کی بنا پر زرعی پیداوار بھی کم ہو جاتی اور تجارت بھی سرد بازاری کا شکار ہو جاتی۔ اشیائے صرف کی گرتی ہوئی قیمت سے پیداواری شرح میں کمی آ رہی تھی۔ سود کی شرح بڑھی ہوئی تھی۔ پھر ڈالر کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ سب باتیں سوہان روح بنی ہوئی تھیں۔ مغرب میں میڈیکل سائنس نے بیماریوں کی روک تھام کے لیے جو دوائیں ایجاد کی تھیں' اس کے استعمال سے فوتگی میں کمی اور آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کا لامحالہ اثر غذائی اشیاء پر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ یہ خطرہ لاحق ہو چکا تھا کہ غلہ قومی آمدنی کا ذریعہ نہیں رہے گا۔ دوسری جانب ایسے ممالک بھی تھے جو "سبز انقلاب" لائے تھے اور کھیتی باڑی کے نئے طریقے استعمال کر کے زرعی پیداوار میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں' آمدنی میں اضافے کی وجہ سے وہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں تیل درآمد کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ اس طرح معاشی نظام میں اور بھی تیزی آئی۔ واضح رہے کہ جب ۱۹۸۰ء کے عشرے میں تیل کا بحران پیدا ہوا تھا تو یہ کم ترقی یافتہ ممالک بھی بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ آخری بات یہ کہ روزو کرینس کے بقول تیسری دنیا کے ممالک کی نہایت اہم خصوصیت یہ نمایاں ہوئی کہ وہ "تجارتی مراکز" بن گئے۔ جنوبی کوریا' تائیوان' سنگاپور اور ملائیشیا جیسے ممالک جاپان' مغربی جرمنی اور سوئٹزر لینڈ کی صف میں شامل ہو کر بیوپار میں سرگرمی دکھانے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ عالمی منڈیوں کے لیے صنعتی سامان بھی تیار کرنے لگے۔

کم ترقی یافتہ ممالک کا یہ تفاوت دراصل نتیجہ تھا گزشتہ چند عشروں میں ہونے والی معاشی تبدیلیوں کا! پھر دنیا کے کئی اہم ممالک میں پیداواری شرح مختلف حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ یہ بات نہ صرف بڑے بڑے صنعتی ممالک میں پائی جاتی تھی بلکہ چھوٹے چھوٹے ممالک میں بھی پیداواری شرح گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ چونکہ عالمی طاقت کے توازن پر اس رجحان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے' لہٰذا اس امر کا جائزہ لینا مناسب ہے کہ اہم ممالک پر یہ کس طرح اثر انداز ہوتی رہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۵ء کے بعد جاپان کی اقتصادی حال میں جو تبدیلی آئی اس نے مسلسل جدید کاری کی نہایت عمدہ مثال پیش کی ہے۔ تجارت اور ٹیکنالوجی میں سخت مقابلہ کر کے وہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے آگے نکل گیا۔ وہ ایشیا کے دیگر تجارتی ممالک کے لیے نمونہ عمل بن گیا۔ یہ امر واقعہ

ہے کہ ایک صدی قبل جاپان ایشیا کا پہلا ملک تھا جس نے معیشت' فوج اور سلطنت کے اسرار و رموز مغرب سے سیکھے۔ اگرچہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک کے دوران ہونے والی جنگ سے اسے خاصا نقصان پہنچا اور یہ ملک روایتی منڈیوں اور پرانے فراہم کاروں سے کٹ کر رہ گیا' لیکن اس نے اپنی صنعتی بائیں تعمیر کی از سرنو مرمت کرلی۔ پھر اس کے ذہین' پڑھے لکھے اور متحد عوام نے خود کو ترقی سے ہمکنار کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔ اس کے نتیجے میں تجارتی مہمیں سر ہوتی رہیں۔ ۱۹۴۵ء کے بعد کے چند برسوں تک جاپان کی حیثیت ایک مفلوک الحال مقبوضہ علاقے کی تھی اور وہ امریکی امداد پر گزارا کر رہا تھا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں اس وقت بڑے پیمانے پر تبدیلی رونما ہوئی جب امریکہ جنگ کوریا میں بے پناہ دفاعی اخراجات کرنے لگا۔ اس سے جاپان کی قدیم برآمد کار کمپنیوں کو آگے بڑھنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ مثال کے طور پر ٹویوٹا کمپنی خطرے سے دوچار تھی۔ لیکن جب اسے پہلی مرتبہ امریکہ کے محکمہ دفاع سے ٹرک تیار کرنے کا آرڈر ملا تو وہ سنبھل گئی۔ یہی صورت حال دیگر کمپنیوں کے ساتھ بھی پیش آئی۔

"جاپانی معجزہ" مذکورہ حقائق کا ہی مرہون منت نہ تھا۔ یہ ٹھیک ٹھیک بتانا مشکل ہے کہ اس ملک نے خود کو کس طرح بدل دیا اور دوسرے کس طرح اس کے کارناموں کی نقل کرنے لگے۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ جاپان صنعت میں ایک نمایاں اور مثالی مقام حاصل کر چکا تھا۔ اس ترقیاتی تبدیلی کی اہم وجہ تو یہ تھی کہ یہ ملک اعلیٰ درجے کی کوالٹی برقرار رکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اس نے مغرب سے انتظامی امور کے طریقے اور پیداواری ٹیکنالوجی حاصل کی اور اسے فروغ دیا۔ اس نے اعلیٰ درجے کی تعلیم رائج کی۔ پھر انجینئروں' الیکٹرونک اور آٹو موبائل کے ماہروں کی خدمات حاصل کیں۔ نیز' تنظیم کاری کے لیے ورکشاپس بھی منعقد کروائیں۔ سخت محنت کرنے' کمپنی کا وفادار رہنے اور انتظامیہ سے مطابقت کرنے کا ایک اخلاقی جذبہ ہر طرف کار فرما تھا۔ محنت کشوں کے جھگڑے باہمی صلاح مشورے اور مفاہمت کے ذریعے حل کر دیے جاتے۔ اقتصادی ترقی کے لیے کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی۔ یہ مسئلہ بھی یوں حل ہو گیا کہ جاپان جیسے غیر فوجی ملک کے دفاعی اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ پھر اسے امریکہ کی تحفظاتی چھتری بھی میسر تھی۔ مالیاتی سلسلے میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ لوگوں کو مختلف ذرائع کے تحت بچت کی ترغیب دی جاتی۔ چنانچہ ان کی یہ رقم سرمایہ کاری میں کام آجاتی۔ جاپان کی ترقی میں اس کی "وزارت برائے بین الاقوامی تجارت و صنعت" کا بھی خاصا اہم کردار رہا ہے۔ اس نے نئی نئی صنعت اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے مثالی خدمات انجام دیں۔ ساتھ ہی ساتھ قدیم اور فرسودہ حال کارخانوں کو جلا بخشی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب باتیں امریکہ کی "سرکاری عدم مداخلت" کی پالیسی سے سراسر مختلف تھیں۔

اگرچہ اس ضمن میں بہت سی باتیں بیان ہوتی رہیں گی اور جاپان کے موضوع پر مہارت رکھنے والے اس ملک کے ثقافتی و سماجی امور کو مزید روشن کرتے رہیں گے اور اس کے عوام کی خود اعتمادی اور عزم و حوصلے کی کہانی بیان کرتے رہیں گے ـــــــ لیکن اس نے معاشی لحاظ سے جو کامیابی حاصل کی ہے' اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۳ء تک کے عرصے میں اس کی قومی پیداوار نہایت ہوشربا تناسب سے آگے بڑھی ہے' یعنی سالانہ ۱۰.۵ فی صد کے حساب سے! یہ شماریہ کسی بھی صنعتی ملک سے کہیں

زیادہ تھا۔ حتیٰ کہ ۷۴-۱۹۷۳ء کے تیل کے بحران نے بھی جاپان کی پیداواری شرح کو متاثر نہیں کیا اور اس عرصے میں وہ اپنے اہم مدمقابل ممالک سے آگے ہی رہا۔ متعدد مصنوعات میں اسے عالمی پیداکار کی حیثیت سے افضلیت حاصل ہو گئی اور وہ سب پر چھا گیا۔ ان مصنوعات کی طویل فہرست میں کیمرے' باورچی خانے کے سامان' بجلی کے سامان' موسیقی کے آلات' اسکوٹر وغیرہ شامل ہیں۔ جاپان نے گھڑی سازی میں سوئٹزر لینڈ کو چیلنج کر دیا' جرمنی کی عینک سازی کو مدھم کر کے رکھ دیا اور برطانیہ و امریکہ کے موٹر سائیکل بنانے والے کارخانوں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ ایک عشرے کے اندر اندر جاپان کے شپ یارڈ نے دنیا کے نصف سے زیادہ بحری بیڑے سطح سمندر پر اتارے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں جاپان کے جدید فولادی کارخانے امریکی کارخانے کے برابر برابر لوہے کی مصنوعات فراہم کر رہے تھے۔ آٹو موبائل کی صنعت میں تو اس ملک نے معجزہ کر دکھایا۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۳ء کے دوران کار کی عالمی مصنوعات میں اس کا حصہ ایک فی صد سے بڑھ کر ۲۳ فی صد تک پہنچ گیا۔ چنانچہ اس پیش رفت کی وجہ سے جاپانی کاریں اور ٹرک ملین کے حساب سے دنیا بھر کو برآمد کی جانے لگیں۔ اپنی محنت کے بل بوتے پر یہ ملک ٹیکنالوجی کی مصنوعات میں بھی اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا۔ مثلاً کمپیوٹر' ٹیلی کمیونیکیشن' روبوٹ' بائیو ٹکنالوجی وغیرہ! اس کے تجارتی ذخائر بھی آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ عالمی پیداوار اور منڈیوں میں اس کے حصص میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح مالیات و صنعت میں جاپان ایک قد آور ملک کی حیثیت حاصل کر گیا۔

جب ۱۹۵۲ء میں اتحادی ممالک جاپان پر اپنے قبضے سے دست بردار ہوئے' اس وقت آخرالذکر کی مجموعی پیداوار فرانس اور برطانیہ کے مقابلے میں ایک تہائی سے کچھ زیادہ تھی۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے آخری عشرے میں یہ برطانیہ اور فرانس کی مجموعی قومی پیداوار سے کہیں زیادہ بڑھ گئی' جبکہ امریکہ کے مقابلے میں نصف تھی۔ ایک ہی نسل کے دوران جاپان عالمی پیداوار اور مجموعی قومی پیداوار میں اتنی ترقی حاصل کر گیا تھا کہ یہ شرح ۲/۳ فی صد سے بڑھ کر ۱۰ فی صد تک پہنچ گئی ------ اور پھر یہ ترقی رکنے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی! یہ صرف سوویت یونین تھا جس نے ۱۹۲۸ء کے بعد کے عرصے میں اس نوع کی ترقی حاصل کی تھی' لیکن جاپان نے یہ سارا کارنامہ کسی کو ایذا دیے بغیر' موثر انداز میں اور وسیع تر سطح پر انجام دیے تھے۔

اگر بڑی طاقتوں کی معاشی ترقی کا جاپان سے مقابلہ کیا جائے تو ہر بڑی طاقت جاپان کے مقابلے میں معاشی لحاظ سے کاہل دکھائی دیتی ہے۔ تاہم جب عوامی جمہوریہ چین نے ۱۹۴۹ء میں اپنے قیام کے فوراً بعد ------ خود کو سنبھالنا چاہا تو اس وقت کچھ ایسے مبصرین تھے جنھوں نے اس معاملے کو سنجیدگی سے ذہن نشین نہیں کیا۔ ان کا رویہ دراصل "زرد خطرہ" سے خوف کھانے کا مظہر تھا۔ لیکن مشرق کا یہ سویا ہوا جن بیدار ہو گیا۔ پھر جونہی اس نے اپنی ۸۰۰ ملین کی آبادی کو قومی مقاصد کے تحت منظم کیا تو عالمی امور میں اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس جمہوریہ نے اپنی تشکیل کے بعد بیرونی طاقتوں کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا اس نے بہتوں کو لرزہ بر اندام رکھا۔ کوریا کیموائے اور ماتسو کے حوالے سے چین کی امریکہ کے ساتھ مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چین کی افواج تبت میں پیش قدمی کر

گئیں۔ ہندوستان کے ساتھ اس کی سرحدی جھڑپیں ہوئیں۔ اس نے طیش میں آکر روس سے اپنا ناطہ توڑ لیا' اور متنازع طاقتوں کے لیے اس سے لڑائی بھی مول لے لی۔ شمالی ویت نام کے ساتھ بھی اس کی خون ریز جھڑپیں ہوئیں۔ پھر چینی پروپگنڈے میں محاذ آرائی کا لہجہ عموماً جاری رہا۔ وہ مغربی شہنشاہیت اور روسی قیادت کے خلاف نعرہ زنی کرتا رہا۔ علاوہ ازیں' وہ دنیا بھر کے عوام کے لیے تحریک آزادی جاری رکھنے پر اصرار کرتا رہا۔ اس طرح چین نے اقصائے عالم میں مقبولیت حاصل کر لی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ محتاط اور سنجیدہ جاپان کے برعکس عالمی معاملات میں اپنی تلون مزاجی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بہرحال' دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کا ملک ہونے کے ناطے اس کی سیاسی تلون مزاجی اور ایک رخ سے دوسرے رخ ڈانواں ڈول ہوتے رہنے کی کیفیت کو سنجیدگی سے دیکھنا ہو گا۔

اگر اقتصادی پیمانے سے جائزہ لیا جائے تو عوامی جمہوریہ چین اس معاملے میں خاصا پسماندہ نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۳ء میں عالمی پیداوار میں اس کا حصہ ۲ء۳ فی صد تھا۔ اس زمانے میں اس کی جو مجموعی صنعتی صلاحیت تھی وہ ۱۹۰۰ء میں برطانیہ کے محض ۷۱ فی صد کے مساوی تھی۔ اس کی آبادی میں ملین کے حساب سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس میں زیادہ تر غریب کسان تھے جن کی فی کس آمدنی تشویشناک حد تک کم تھی۔ وہ ریاست کے لیے سراسر "سود مند" نہ تھے۔ پھر سپہ سالاروں کی من مانیوں' جاپانی حملے اور ۱۹۴۰ء کے آخری عشرے میں ہونے والی خانہ جنگیوں کے نتیجے میں تباہیاں پھیلتی رہیں تا آنکہ کسانوں کے کمیون نے ۱۹۴۹ء کے بعد زمین داروں سے ساری ہی زمینیں لے لیں۔ تاہم معاشیات کی بہتری کے امکانات موجود تھے۔ چین کے پاس سڑکیں بھی تھیں اور ہلکی پھلکی ٹرینیں بھی! وہاں کپڑے کے کارخانے بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس کے شہر اور بندرگاہیں کاروبار کا مرکز تھیں۔ علاوہ ازیں' جاپانیوں نے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں خصوصی طور پر منچوریا کو ترقی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اس ملک کو صنعتی میدان میں داخل ہونے کے لیے محض دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک تو طویل مدتی ملکی استحکام' دوسرے سرمایہ!۔ یہ دونوں چیزیں کسی نہ کسی حد تک حاصل ہو گئیں۔ وہ یوں کہ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں کیمونسٹ پارٹی کی بالادستی قائم ہو گئی اور اس کے نتیجے میں روس سے مالی امداد آنے لگی۔ ۱۹۵۳ء میں پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ یہ دراصل اسٹالن کی ان ترجیحات کا چربہ تھا جن کے تحت وہ بھاری صنعتوں اور فولاد' لوہے اور کوئلہ کی پیداوار کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ ان اقدامات کی وجہ سے ۱۹۵۷ء ہی میں صنعتی پیداوار دوگنی ہو گئی۔ ادھر جو نقد سرمایہ صنعت کی سرمایہ کاری کے لیے ملکی سطح پر مہیا کیا گیا تھا' یا روس سے قرض لیا گیا تھا' وہ چین جیسے وسیع ملک کی معاشی ضرورت کے لیے ناکافی تھا۔ پھر جب چین اور روس کے درمیان تفرقہ پڑ گیا تو اس کے نتیجے میں آخرالذکر سے ملنے والی مالی اور تکنیکی مدد بھی موقوف ہو گئی۔ علاوہ ازیں' ماؤ نے آگے کی جانب زبردست جست لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے اس نے چھوٹی چھوٹی ہزاروں جھونپڑیوں میں فولادی صنعت قائم کر دی تھی۔ پھر "ثقافتی انقلاب" کی زبردست تحریک بھی چلائی جس سے تکنیکی ماہرین پیشہ ور منیجر اور تجربہ کار معاشیات دانوں کی توہین و تذلیل ہوئی۔ ان سب عوامل نے ترقیاتی عمل کو خاصا نقصان پہنچایا۔ آخری بات یہ کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں کے دوران عوامی جمہوریہ چین نے جارحانہ سفارت کاری کا انداز اختیار کیے رکھا اور اپنے سارے ہی

پڑوسی ممالک سے معرکہ آرائی کرتا رہا۔ اس کے نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ملک کے محدود وسائل کا خاصا حصہ افواج کی نذر ہوتا رہا۔

اگر معاشی لحاظ سے دیکھا جائے تو ثقافتی انقلاب اتنا برا بھی نہ تھا۔ اس کی وجہ سے دیہی علاقوں کی اہمیت واضح ہوئی۔ اس نے چھوٹے پیمانے کی صنعت کو فروغ دیا اور کھیتی باڑی کو بہتر بنایا۔ پھر اس کی وساطت سے طبی اور سماجی امداد گاؤں گاؤں پہنچنے لگی۔ بہرحال، قومی پیداوار میں اضافہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب صنعت سازی کو مزید فروغ دیا جاتا، بائیں تعمیر میں پیش رفت ہوتی اور طویل المدتی سرمایہ کاری ہوتی۔ چنانچہ ان تمام باتوں کے حصول کی خاطر ثقافتی انقلاب کی تحریک بند کر دی گئی۔ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جاپان اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ تجارت کو فروغ دیا گیا۔ چین میں کوئلے اور تیل کے ملکی وسائل کو کام میں لایا گیا اور قیمتی معدنی ذخائر سے بھی استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء تک اس کی فولادی صنعت اتنی بڑھ گئی کہ برطانیہ اور فرانس بھی اس معاملے میں پیچھے رہ گیا۔ چین میں جدید ذرائع سے پیدا ہونے والے ایندھن کا استعمال یورپ کے ممتاز ممالک سے دوگنا تھا۔ اس مدت میں، عالمی صنعتی پیداوار میں بھی چین کا حصہ ۵ فی صد تک پہنچ چکا تھا۔ (۱۹۷۳ء میں یہ شرح ۳ء۹ فی تھی۔) اس طرح وہ جرمنی سے آگے بڑھ چکا تھا۔

لیکن اس پرجوش پیداواری ترقی کے جلو میں مسائل بھی تھے۔ وہاں کے پارٹی لیڈر ملک میں چار قسم کی جدید کاری کا منصوبہ بنا چکے تھے اور اس ہدف کو پورا کرنے کے لیے پیداواری گوشوارے میں رد و بدل کرتے رہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ چین کی دولت اور پیداوار کے اعداد و شمار فی کس کے حساب سے پیش کیے جاتے ہیں تو اس صورت میں ملک کی پسماندہ معیشت ظاہر ہو جاتی ہے۔ تاہم ان نقائص سے قطع نظر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یہ ایشیائی جن حرکت میں آچکا تھا اور بڑی طاقت کا کردار ادا کرنے کے لے اپنی معیشت کو مستحکم کر رہا تھا۔

نکسن نے اپنی جولائی ۱۹۷۱ء والی تقریر میں جس پانچویں اقتصادی طاقت کا ذکر کیا تھا، وہ مغربی یورپ تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وہ جغرافیائی لحاظ سے چین، روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیسے متحد ملکوں سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ واضح رہے کہ "یورپ" کی اصطلاح مختلف لوگوں کے لیے مختلف معنی رکھتی ہے۔ یہ ایسے تمام ممالک پر بھی صادق آ سکتی ہے جو روسی دائرہ اختیار سے باہر واقع ہیں، مثلاً "اسکینڈی نیویا، یونان اور ترکی۔ یہ یورپی اقتصادی کمیٹی کے اصل یا توسیع شدہ ملکوں پر بھی لاگو ہو سکتی ہے جس کے پاس ایک لائحہ عمل ہے اور جسے مختلف طور پر سابق بڑی ریاستوں کا مجموعہ کہا جاتا ہے (یعنی برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی)۔ امریکہ کا اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ روس یا مشرق وسطیٰ کے لیے کوئی نئی پالیسی اختیار کرنا چاہے تو اس سے قبل اس "مجموعہ ہائے ممالک" سے مشورہ کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔ ویسے اس خطے کے متعلق متضاد اور پیچیدہ تصور زیادہ فروغ نہیں پا سکا بلکہ برطانیہ نے بارہا اس رائے کا اظہار کیا تھا "انگلش چینل کے اس پار جو یورپ" واقع ہے، وہ ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔ علاوہ ازیں، یورپ کی تشکیل کے ایسے متعدد پرجوش حامی تھے (اس میں جرمن قوم پرست کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے) جو یہ سمجھتے تھے کہ ۱۹۴۵ء کے

شروع میں اس براعظم کی جو تقسیم عمل میں آئی تھی، وہ محض عارضی تھی۔ چنانچہ دونوں جانب کے ممالک مستقبل میں ایک ہو جائیں گے۔ لہٰذا سیاسی اور آئینی طور پر "یورپ" یا مغربی یورپ کی اصطلاح استعمال کرنا مشکل ہوا کرتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک نحوی ترکیب سمجھ لیں یا پھر پیچیدہ قسم کا ثقافتی اور جغرافیائی تصور

بہرکیف، اقتصادی سطح پر یورپ میں جو بھی تجربے ان دنوں عمل میں آئے، ان میں بنیادی طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ معیشت میں مسلسل ترقی ہو رہی تھی۔ ۱۹۴۹۔۵۰ء تک کئی ممالک جنگ سے پہلے کی پیداواری سطح تک پہنچ چکے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو دوران جنگ غیر جانب دار رہے تھے، وہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ پھر ان ممالک میں صنعتی پیداوار میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا، برآمدات کی شرح بھی خاصی بڑھ گئی، لوگوں کو ملازمتیں بھی ملنے لگیں اور آمدنی اور سرمایہ کاری تاریخی لحاظ سے عدیم المثال تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ دنیا میں نہایت تیز رفتاری سے ترقی کرنے والا علاقہ قرار پایا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۷۰ء کے دوران یورپ کی مجموعی ملکی پیداوار میں اوسطاً ۵ء۵ فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا۔ اسی طرح فی کس کے حساب سے ۴ء۴ فی صد اضافہ عمل میں آیا۔ اس کے مقابلے میں دنیا میں اوسط شرح بالترتیب ۵ اور ۳ فی صد تھی۔ اسی طرح صنعتی پیداوار میں بھی ۷۱ء فی صدی کے حساب سے اضافہ ہوا۔ اس وقت دنیا میں صنعتی پیداوار کی شرح ۵ء۹ فی صد تھی۔ ۱۹۷۰ء میں فی کس پیداواری شرح ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں ڈھائی گنا زیادہ تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے اس پیداواری ترقی میں براعظم کے سبھی علاقوں کا حصہ تھا ـــ چاہے شمال مغربی یورپ کا صنعتی مرکز ہو، بحیرہ روم کے علاقے ہوں یا مشرقی یورپ کا خطہ ہو۔ حتیٰ کہ برطانیہ کی کمزور معیشت بھی اس عرصے میں نہایت تیزی سے مستحکم ہوئی۔ واضح رہے کہ اس صدی کے آغاز کے بعد دنیا کی اقتصادی حال زوال پذیر تھی لیکن یورپ کی معیشت سنبھلے لگی تھی۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۷۰ء کے دوران اشیائے صرف کی عالمی پیداوار میں یورپ کا حصہ ۲۷ سے ۳۱ فی صد تک بڑھ گیا تھا جبکہ صنعت میں یہ کہیں زیادہ تھا، یعنی ۳۹ سے ۴۸ فی صد! سی آئی اے کے اعداد و شمار سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں دنیا کی مجموعی پیداوار میں یورپی کمیونٹی کا بہت بڑا حصہ تھا جو امریکہ کے حصے سے کہیں زیادہ اور سوویت یونین کے حصے سے دوگنا تھا۔

یورپ کی معیشت کے سنبھلنے کے اسباب حیران کن نہیں ہیں۔ ایک طویل عرصے تک اس براعظم کا وافر حصہ حملوں، مسلسل لڑائیوں اور بیرونی تسلط کا نشانہ بنا رہا ہے۔ یہاں کے شہروں، کارخانوں، سڑکوں، ریلوں پر بم برسائے جاتے رہے ہیں۔ ناکہ بندی کی وجہ سے غذائی اشیاء اور خام مال کا حصول ممکن نہیں رہا ہے۔ پھر لاکھوں آدمیوں کی فوج میں طلبی اور اسی انداز میں جانوروں کی ہلاکت یہ سب ایک دلخراش منظر رہا ہے۔ جنگ سے پہلے یورپ کی معیشت ترقی کر رہی تھی۔ توانائی اور پیداواری وسائل کی وجہ سے ہر علاقہ اپنے اپنے طور پر ترقیاتی عمل میں مصروف تھا۔ (نئی نئی منڈیاں تلاش کی جاتی رہیں۔ نئی نئی ٹیکنالوجی پھیلتی رہی۔ لیکن حب الوطنی کی شائق جماعت "محبّان" نے اپنے عمل سے ان سب کارگزاریوں پر پانی پھیر دیا۔ حد سے بڑھتے ہوئے نرخناموں نے فراہم کاروں کو منڈیوں سے جدا کر دیا۔ سرکاری امداد نے ناکارہ

فرموں اور کسانوں کو غیر ملکی مسابقت سے محفوظ رکھا۔ قومی آمدنی کا وافر حصہ کاروبار میں لگانے کی بجائے اسلحہ کی خریداری پر خرچ ہوتا رہا۔ ایسے نامساعد حالات میں یورپ کی معیشت کا فروغ پانا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد مونٹ، اسپاک اور ہالسین جیسے نئے یورپی باشندوں نے یہ عزم کر لیا کہ ایک ایسا معاشی لائحہ عمل تیار کیا جائے جو ماضی کی غلطیوں کا اعادہ نہ کرے۔ پھر خوش قسمتی سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیسا ملک بھی موجود تھا جو مددگار اور مفید ثابت ہوا۔ مارشل پلان اور دیگر امدادی اسکیم کے ذریعے اس نے یورپ کی مالی اعانت کی تاکہ اس کی حالت بہتر ہو جائے۔

وہ یورپ جس کی اقتصادی صلاحیت کو جنگ اور سیاست نے تباہ کر دیا تھا اب اس پوزیشن میں تھا کہ ماضی کی تمام غلطیوں کا ازالہ کرے۔ براعظم کے مشرقی اور مغربی دونوں حصوں میں یہ عزم کر لیا گیا تھا کہ از سر نو تعمیر کی جائے گی اور ۱۹۳۰ء کے عشرے کی احمقانہ حرکتوں سے سبق لیا جائے گا۔ سرکاری منصوبہ بندی نے سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ ہموار کی۔ پرانے نظام کے خاتمے سے جدید کاری کا عمل آسان ہو گیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے مارشل پلان کے تحت یورپی ممالک کو نہ صرف ملیوں ڈالر بطور امداد عطا کیے بلکہ "دفاعی چھتری" بھی فراہم کی تاکہ انھیں تحفظ حاصل رہے۔ (یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ اور فرانس نے کوریا کی جنگ کے دوران دفاعی اخراجات میں خاصا اضافہ کر دیا تھا، نیز انھوں نے اپنی نو آبادیات ختم ہونے سے قبل بھی اس مد میں کثیر رقم خرچ کی تھی۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اگر مذکورہ ممالک اور ان کے پڑوسیوں کو امریکہ کا تحفظ حاصل نہ ہوتا تو وہ اپنے محدود قومی وسائل کا زیادہ سے زیادہ حصہ دفاع پر خرچ کر دیتے۔) چونکہ تجارتی بندشیں نہ تھیں، لہٰذا منڈی وسیع تھی اور فرمیں اور کاروباری افراد پوری طرح متمتع ہو رہے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ترقی یافتہ ممالک اور خود یورپی ریاستوں میں تجارت بہت زیادہ نفع بخش تھی اور طلب بھی بڑھی ہوئی تھی۔ ایسی صورت حال کہیں اور موجود نہ تھی۔ اگر مذکورہ دہائیوں میں یورپ کی تجارت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا تو اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ان کے پڑوسی ممالک میں خرید و فروخت کا اچھا خاصا رجحان تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد ایک ہی نسل کی موجودگی میں فی کس آمدنی میں جو اضافہ ہوا، وہ گزشتہ ڈیڑھ صدی میں بھی نہیں ہوا تھا۔ سماجی اور معاشی تبدیلی کی شدت بھی "یقیناً" قابل توجہ تھی۔ مغربی جرمنی میں زراعت، جنگلات اور ماہی گیری کے شعبوں میں کام کرنے والوں کی شرح جو ۱۹۵۰ء میں ۲۲٫۶ فی صد تھی، وہ ۱۹۷۳ء میں گھٹ کر ۷٫۵ فی صد رہ گئی۔ اسی مدت کے دوران فرانس میں بھی یہ شرح ۲۸٫۳ فی صد سے گھٹ کر ۱۲٫۲ فی صد ہو گئی۔ اور ۱۹۸۰ء میں تو یہ شرح ۸٫۸ فی صد تک آ گئی تھی۔ صنعت سازی کے فروغ پانے کی وجہ سے قابل تصرف آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں مغربی جرمنی میں فی کس آمدنی ۳۳۰ ڈالر تھی جو ۱۹۷۸ء میں بڑھ کر ۹۱۳۱ ڈالر ہو گئی۔ اٹلی میں جو آمدنی ۱۹۶۰ء میں ۶۳۸ ڈالر تھی، وہ ۱۹۷۹ء میں ۵۱۴۲ ڈالر تک پہنچ گئی۔ مغربی جرمنی میں ۱۹۴۸ء میں ایک ہزار آبادی کی شرح سے آٹوموبائیل کا ۶٫۳ فی صد استعمال تھا جو ۱۹۷۰ء میں بڑھ کر ۲۲۷ ہو گیا۔ اور فرانس میں یہی اعداد و شمار ۳۷ سے بڑھ کر ۲۵۲ ہو گئے تھے۔ بہرحال کوئی کسی طرح بھی اس پیمانے کو ناپے اور علاقائی تفاوت کیسا ہی نظر آئے، لیکن ترقی کی شہادتیں موجود ہیں۔

مشترکہ اقتصادی ترقی، شرح مبادلہ اور اس کے اثرات کی متنوع کیفیات کا جائزہ اسی وقت لیا جا سکتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ ماضی کی ان بڑی طاقتوں میں کیا کچھ ہو رہا تھا۔ کوہ الپس کے جنوب میں بقول صحافی حضرات "اطالوی معجزہ" رونما ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے بعد اس ملک کی مجموعی قومی پیداوار تین گنا بڑھ چکی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۶۳ء تک پیداواری شرح قدرے ست تھی، لیکن اٹلی کی معیشت بہت تیزی سے فروغ پاتی رہی تھی۔ یہ صورت حال جاپان اور مغربی جرمنی کے سوا کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی۔ پیداوار کی ست رفتاری بھی اچنبھے کی بات نہیں اگر ہم پیچھے مڑ کر اس ملک کی کیفیت کا جائزہ لیں۔ یورپ کے بڑے چار ملکوں میں اٹلی سب سے کم ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی پیداواری صلاحیت کا خاطر خواہ استعمال نہیں ہوا تھا۔ جب یہ ملک فاشسٹی نظام کی تباہ کن اقتصادی پالیسی کے شکنجے سے آزاد ہوا اور اسے امریکی امداد میسر ہوئی تو اٹلی کے صنعت کاروں نے ملک کی مروجہ اجرت کی کم شرح سے خاصا فائدہ اٹھایا۔ پھر انھوں نے اپنی مصنوعات کی برآمدات کو نہایت تیزی سے آگے بڑھایا۔ حتیٰ کہ کمیونسٹ ممالک کی منڈیوں میں بھی ان کا سامان پہنچنے لگا۔ چونکہ وہاں کوئلے کی کمی تھی، لہٰذا اسے پورا کرنے کے لیے ہائیڈرو الیکٹر۔سیٹی اور سستا تیل درآمد کیا گیا۔ وہاں موٹر گاڑیوں کی مانگ ملک میں بڑھ گئی تو موٹر سازی کی کمپنی "فیٹ" نے اس شعبے میں ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ اس نے کوہ الپس کو بھی یہ اپنی گاڑیاں خاصی تعداد میں برآمد کیں۔ جوتے اور کپڑے کی قدیم صنعت کے ساتھ ساتھ دیگر نئی صنعتیں بھی قائم ہوتی رہیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اٹلی کے بنے ہوئے ریفریجریٹر یورپ میں سب سے زیادہ فروخت ہوتے تھے۔ ان حقائق کے یہ معنی نہیں کہ ہر طرف کامیابی ہی کامیابی تھی۔ جنوبی اور شمالی اٹلی کے درمیان خلا خاصا گمبھیر تھا۔ اندرون شہر، خصوصاً" پسماندہ دیہی علاقوں میں سماجی حالات خاصے ناگفتہ بہ تھے۔ حکومت کے عدم استحکام "سیاہ معیشت" ۔بخیری کیفیت اور افراط زر کی بڑھتی ہوئی شرح نے لرا کی قیمت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ معیشت کی بحالی قدرے ست ہے۔ جب کبھی پورے یورپ کی سطح پر آمدنی، صنعت کاری وغیرہ کا تقابلی جائزہ لیا جاتا تو اٹلی اپنے ترقی یافتہ پڑوسیوں کے مقابلے میں کسی قابل نہ ٹھہرتا۔ لیکن جہاں تک پیداواری شرح کا معاملہ تھا تو اس کی صورت قدرے بہتر تھی۔ ان سب باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹلی نے تو بہت پیچھے کی سمت سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اگر یورپ کے بڑے بڑے ممالک سے موازنہ کیا جائے تو برطانیہ ۱۹۴۵ء میں خاصا آگے نظر آئے گا۔ لیکن اس کے بعد چار عشروں تک اس کی معیشت زوال پذیر رہی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح جنگ سے برطانیہ کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا نہیں پڑا تھا، لہٰذا اس کی پیداواری شرح اتنی تیزی سے نہیں بڑھی جتنی ان ممالک کی جو فوجی تسلط اور اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ برطانیہ کو شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ اب بھی تین بڑوں میں شامل تھا۔ پھر دنیا میں اس کی پھیلی ہوئی سلطنت قائم رہی۔ لہٰذا اس ملک کے عوام نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ وہ اپنے اقتصادی نظام میں کوئی بہت بڑی تبدیلی لائیں۔ اگرچہ جنگ کی وجہ سے

معاشرے کی ساخت بدلی تھی اور اس کے نئے نئے خطوط وضع کیے گئے تھے، لیکن روایتی ادارے ہنوز قائم تھے، مثلاً "ٹریڈ یونین، سول سروس، یونیورسٹیاں۔ اگرچہ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۱ء کے دوران لیبر پارٹی کی حکومت نے قومیانے اور فلاحی ریاست بنانے کے منصوبے تیار کیے تھے، لیکن اقتصادی اور محنت کے شعبے میں کسی بہتر کارکردگی کے لیے اقدامات نہیں کیے گئے تھے۔۔ چونکہ برطانیہ کو یہ اعتماد تھا کہ دنیا میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے، لہٰذا اس نے اپنی نوآبادیات کی محصور منڈیوں پر ہی قناعت کی۔ اس نے اسٹرلنگ کی قدیم مساواتی قیمت کو برقرار رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے سمندر پار ممالک میں وسیع پیمانے پر محافظ دستے تعینات کیے جس کی وجہ سے اس کی کرنسی ضائع ہوتی رہی۔ جب یورپی اتحاد کی تحریک چلی تو وہ کافی عرصے تک اس میں شمولیت سے انکار کرتا رہا۔ پھر اس نے دفاع پر اتنی رقم خرچ کر ڈالی جو نیٹو سے وابستہ دیگر طاقتوں نے بھی نہیں کی تھی سوائے امریکہ کے!

۱۹۴۵ء کے بعد برطانیہ کی بین الاقوامی پوزیشن اور معیشت کی کمزوریاں دوسرے ممالک کے اپنے نقائص کی وجہ سے چھپی رہیں۔ پھر اس کی ایک وجہ ہندوستان اور فلسطین سے دست برداری کے معاملات بھی تھے۔ علاوہ ازیں، اس کی برآمدات میں عارضی طور پر اضافہ ہو گیا تھا اور وہ مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں اپنی حکومت قائم رکھے ہوئے تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں نہر سویز کے قضیے سے اس کو سخت دھچکا لگا۔ اس طرح نہ صرف اسٹرلنگ کی قیمت کا انتشار ظاہر ہو گیا بلکہ یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ برطانیہ تیسری دنیا میں فوجی اقدامات امریکہ کی رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتا۔ تاہم برطانوی زوال کے حقائق ہنوز پردہ اخفا میں تھے۔ ۱۹۵۷ء کے بعد اس نے دفاع کے سلسلے میں یہ پالیسی وضع کی تھی کہ ایٹمی ہتھیار کے ذریعے مزاحمتی کاروائی بڑی بڑی فوج رکھنے سے کہیں زیادہ سستی ہے، لہٰذا اس نے اپنے بڑی طاقت ہونے کا زعم برقرار رکھا تھا۔ جہاں تک اقتصادی معاملات کا تعلق ہے تو یہ کہا جائے گا کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشرے میں اس نے بھی معیشت کے فروغ میں حصہ لیا تھا۔ اگر اس کی پیداواری شرح یورپ میں سب سے کم تھی تو بھی یہ ان توسیعی عزائم سے کہیں بہتر تھی جن کا برطانیہ گزشتہ دہائیوں میں مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میکیلن نے برطانوی رائے دہندگان سے مخاطب ہو کر کہا تھا: "اس طرح کی بہتر صورت حال پہلے آپ نے نہیں دیکھی ہو گی۔" اگر قابل تصرف آمدنی، لاتعداد واشنگ مشینیں اور موٹر گاڑیوں کو سامنے رکھتے ہوئے تجزیہ کیا جائے تو مذکورہ دعوی تاریخی لحاظ سے درست ہے۔

تاہم دنیا کے کسی بھی علاقے میں تیزی سے ہونے والی ترقی سے برطانیہ کا موازنہ کیا جائے تو اہل جرمنی کی زبان میں یہی کہا جائے گا کہ وہ "انگریزی بیماری" کا شکار تھا۔ وہاں جارحانہ انداز کی ٹریڈ یونینیں قائم تھیں، انتظامیہ کی کارکردگی ناقص تھی، سرکاری پالیسی ڈانواں ڈول رہتی اور محنت و مشقت اور کار اندازی کو روایتی قسم کے منفی انداز سے دیکھا جاتا۔ نئی خوشحالی نے یورپ کی اعلیٰ قسم کی مصنوعات اور ایشیا کے سستے سامان کی درآمد کے امکانات تو روشن کر دیے تھے، لیکن اس کے نتیجے میں توازن ادائیگی کی مشکلات، اسٹرلنگ کا بحران اور تخفیف قدر جیسی صورتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ سب عوامل افراط زر کا سبب بن گئے۔ ایسی حالت میں اجرت کی شرح کا بڑھ جانا ناگزیر تھا۔ برطانوی حکومت نے افراط زر کو گرفت

میں لانے اور ترقیاتی عمل کے لیے مالیاتی تفریط زر کے اصول وضع کیے۔ لیکن ان پر عمل محض مختصر مدت تک ہوا۔ آٹوموبائیل کی صنعت کو غیر ملکی مسابقت کاروں سے نقصان پہنچنے لگا۔ جہاز سازی کی صنعت جو ایک زمانے میں عروج پر تھی، اب امیرالبحر کے احکامات کی تابعدار تھی۔ بجلی کے سامان اور موٹر سائیکل بنانے والے صنعت کاروں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب وہ اس میدان میں مسابقت نہیں کر پائیں گے۔ البتہ شہر کا کاروبار خاصا منافع بخش تھا اور خوردہ فروشی مستحکم تھی۔ لیکن برطانیہ کے صنعتی مراکز کا تغیر و تبدل نامساعد تھا۔ ۱۹۷۱ء میں کامن مارکیٹ میں شمولیت کے باوجود متوقع اکسیراعظم مہیا نہ ہو سکا، بلکہ الٹا برطانیہ کی منڈیوں کو مصنوعات میں سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ مزید برآں، برطانیہ یورپی اقتصادی برادری کی حد سے بڑھی ہوئی مزارعی قیمت کی پالیسیوں پر بھی عمل کرنا پڑا۔ شمالی سمندر کا تیل ایک غیبی نعمت ثابت ہوا۔ اس سے برطانیہ کو وافر مقدار میں زرمبادلہ حاصل ہو گیا، لیکن اس کی وجہ سے اسٹرلنگ کی قیمت بڑھ گئی اور مصنوعات کی برآمد کو نقصان پہنچا۔

اقتصادی اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کی صنعت کو زوال آ گیا تھا۔ دنیا کی صنعتی پیداوار میں اس کا جو حصہ ۱۹۵۳ء میں ۸ء۶ فی صد تھا، وہ ۱۹۸۰ء میں گھٹ کر فقط ۴ فی صد رہ گیا تھا۔ عالمی تجارت میں بھی اس کا حصہ ۱۹ء۸ فی صد (۱۹۵۵ء) سے گھٹ کر ۸ء۷ فی صد رہ گیا تھا (۱۹۸۰ء)۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی مجموعی قومی پیداوار دنیا میں تیسرے نمبر پر تھی۔ لیکن یہ اعزاز پہلے جرمنی، پھر جاپان اور بعد ازاں فرانس نے حاصل کر لیا۔ برطانیہ کو فی کس قابل تصرف آمدنی میں جو امتیاز تھا وہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے اور امیر ترین ممالک نے حاصل کر لیے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں برطانیہ بجائے مغربی جرمنی، فرانس اور بینے لکس ممالک کے بحیرہ روم کی ریاستوں کے مماثل تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ عالمی تجارت اور عالمی پیداوار میں برطانوی حصص کے کم ہونے کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ مخصوص تکنیکی اور تاریخی مواقع نے ملک کو دنیا کی دولت سے غیر متناسب انداز میں مالا مال کر دیا تھا۔ اب چونکہ وہ مواقع ختم ہو چکے تھے اور دیگر ممالک اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر صنعت سازی سے فائدہ اٹھا رہے تھے، لہٰذا یہ فطری بات تھی کہ برطانیہ کی ساکھ گر جاتی۔ یہ ساکھ کس درجہ اور کتنی تیزی سے گری، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اور کیا یہ ساکھ برطانیہ کے پڑوسی ممالک کے مقابلے میں مزید گرتی رہے گی، یہ کہنا مشکل ہے۔ بہرحال ۱۹۸۰ء کے ابتدائی عشرے میں یہ اقتصادی بحران کم ہونے لگا۔ چنانچہ برطانیہ کو دنیا کی چھٹی عظیم معیشتی ریاست کا درجہ حاصل ہوا اور اس کے پاس مسلح افواج بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں لیکن اگر ان کا موازنہ لائیڈ جارج کے عہد سے یا کلیمنٹ اٹلی کے ۱۹۴۵ء کے دور اقتدار سے کیا جائے تو برطانیہ ایک بڑی طاقت کے بجائے محض ایک عام سا اور درمیانی درجے کی طاقت کا حامل ملک تھا۔

جہاں برطانیہ کی معیشت انحطاط پذیر تھی، وہاں جرمنی "اقتصادی معجزے" دکھا رہا تھا۔ البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ ترقی کس حد تک فطری تھی۔ اپنی کٹی چھنٹی صورت میں بھی اس وفاقی جمہوریہ کے پاس پورے یورپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیکل اساسی تھے۔ اس کے پاس کوئلہ سے لے کر مشینی پرزے کے پلانٹ تک موجود تھے۔ اس کی آبادی تعلیم یافتہ تھی۔ لوگ انتظامی امور، انجینئرنگ

اور سائنس میں مہارت رکھتے تھے اور مشرقی جرمنی سے نقل مکانی کرنے والے ذہین لوگوں کی وجہ سے اس طبقے میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ جرمن فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے گزشتہ نصف صدی تک اس کی اقتصادی قوت کو تہس نہس کیا جاتا رہا۔ اب چونکہ جاپان کی طرح تمام قومی توانائی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے پر مرکوز کر دی گئی تھی' لہٰذا سوال صرف یہ تھا کہ بازیافت کس حد تک ہو گی۔ بڑے بڑے جرمن تاجر جنہوں نے دوسری جرمانی حکومت' ویمار کے عہد اور نازی دور میں نہایت کامیابی سے خود کو ڈھال لیا تھا' اب نئے حالات سے مطابقت پیدا کر رہا تھا اور امریکہ سے نظم کاری کے تجربے بھی سیکھ رہے تھے۔ بڑے بڑے بینک بھی صنعتی ضروریات کے مطابق اپنا رول از سرنو ادا کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ بجلی اور کیمیکل کے کارخانے یورپ کے بڑے بڑے کارخانوں میں شمار ہونے لگے۔ بڑی بڑی آٹوموبائیل کمپنیوں مثلاً" وولکس ویگن اور مرسیڈیز نے بہت ترقی کی۔ ان کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی تقسیم کنندہ فرموں پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ جب برآمدات کو فروغ حاصل ہوا تو دنیا کی برآمدی تجارت میں جرمنی کو امریکہ کے بعد دوسری پوزیشن حاصل ہو گئی۔ اسی طرح اس ملک میں غیر ہنر مند محنت کشوں کی تربیت کے لیے بیرونی ممالک سے "مہمان مزدور" بلوائے گئے۔ یہ بات دہرا دی جائے کہ گزشتہ ایک سو سال میں تیسری مرتبہ جرمنی کی معیشت یورپ کی اقتصادی ترقی کا ذریعہ بنی تھی۔

اعداد و شمار کے لحاظ سے بھی یہ لگاتار کامیابی کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۲ء کے دوران جرمنی کی صنعتی پیداوار ۱۰ فی صد اور مجموعی قومی پیداوار ۶۷ فی صد تک بڑھ گئی تھی۔ پورے یورپ کے مقابلے میں یہاں سرمایہ کاری کی شرح بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ جرمن فرموں نے نقد سرمایہ کی فراہمی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۳۶ء میں یہاں فولادی صنعت موجود نہیں تھی۔ لیکن اپنے قیام کے بعد یورپ کی سب سے بڑی صنعت میں شمار ہونے لگی۔ ۱۹۶۰ء میں فولادی مصنوعات ۳۴ ملین ٹن سے بھی زیادہ تھی۔ یہی صورت حال دیگر صنعتوں کی بھی تھی۔ مجموعی قومی پیداوار میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا تھا۔

۱۹۵۳ء میں اس کی مجموعی قومی پیداوار کی مالیت محض ۳۲ ملین ڈالر تھی۔ لیکن ایک دہائی بعد یہی مالیت بڑھ کر ۸۹ بلین ڈالر ہو گئی جو یورپ میں سب سے زیادہ تھی۔ پھر ۱۹۷۰ء کے آخری عشرے میں یہی مالیت بڑھ کر ۶۰۰ بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہو گئی۔ ۱۹۶۰ء میں جرمنی کی قابل تصرف فی کس آمدنی بہت معمولی تھی' یعنی ۱۱۷۶ ڈالر! اس وقت امریکہ میں یہی آمدنی ۲۴۹۱ ڈالر تھی۔ لیکن ۱۹۷۹ء میں یہ آمدنی بڑھ کر حیران کن حد تک ۱۰۸۳۷ ڈالر ہو گئی ----- گویا امریکہ کی اوسط آمدنی (۹۵۹۵ ڈالر) سے بھی زیادہ! برآمدی توقیر میں سال بہ سال استحکام پیدا ہوتا گیا۔ اگرچہ جاپان کی موثر کارکردگی اور مسابقتی چیلنج کے باعث فطری طور پر تشویش لاحق رہتی تھی' پھر بھی مغربی جرمنی دنیا کے بڑے بڑے تجارتی ممالک میں دوسرے نمبر پر تھا۔ یہ بات یوں بھی موثر اور حیران کن ہے کہ اس ملک کا ۴۰ فی صد رقبہ علیحدہ کر دیا گیا تھا اور اسی طرح ۳۵ فی صد سے زیادہ آبادی جدا ہو گئی تھی۔ تاہم جرمنی نے جلد یہ بات ثابت کر دی کہ وہ مشرقی یورپ کے تمام ممالک مع سوویت یونین سے کہیں زیادہ بار آور ہے اور فی کس صنعتی پیداوار میں سب سے آگے ہے۔ واضح رہے کہ اس کے لاکھوں ذہین اور محنتی افراد مطرب کی نذر ہو چکے تھے۔ اگر ۱۹۳۷ء کی

سرحدوں کی یکجائی ممکن ہوتی تو متحدہ جرمنی اقتصادی لحاظ سے یورپ اور سوویت یونین پر چھا گیا ہوتا۔ چونکہ جرمنی کو شکست نصیب ہوئی تھی' اسے تقسیم کر دیا گیا تھا اور اس کے بین الاقوامی وقار کا تعین صلح کرانے والی طاقتیں کیا کرتی تھیں' لہٰذا ایسی صورت حال میں اس ملک کی اقتصادی قوت اپنی سیاسی ساکھ بحال نہ رکھ سکی۔ مشرقی جرمنی کے باشندوں کے ساتھ ذمہ دارانہ جذبہ رکھنے کے باعث فیڈرل ریپبلک نیٹو اور وارسا کے درمیان تعلقات کے معاملے میں خاصی حساس رہا کرتی تھی۔ مشرقی یورپ اور سوویت یونین کے ساتھ اس کی تجارت نہایت وسیع پیمانے پر ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی کسی متوقع جنگ کی صورت میں یہی ملک محاذ پر ہوتا۔ روس اور کسی حد تک فرانس فکر مند رہتے تھے کہ جرمنی کا عسکری عنصر دوبارہ تازہ نہ ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ملک اس طرح ایٹمی طاقت بن جائے گا۔ یہ ملک پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کے معاملے میں خود کو قصور وار سمجھتا تھا' روس سے اپنے آپ کو کم تر گردانتا تھا اور امریکہ پر حد سے زیادہ بھروسہ کیے ہوئے تھا۔ جب ڈیگال نے فرانس اور جرمنی کے مابین تعلقات استوار کرنے کی پیشکش کی تو اس ملک نے خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے فرانس کی تحکمانہ پالیسیوں کے خلاف اپنی بے پناہ معاشی طاقت کو استعمال میں لانے کا سوچا تک نہیں! ذہنی طور پر ماضی کی تلخ یادوں سے نبرد آزما رہنے کے باعث مغربی جرمنی کے لوگ کھیلوں میں شرکت سے خوشی محسوس کرنے لگے' لیکن عالمی امور میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے یہ بے نیاز رہے۔

جرمنی کے مقابلے میں فرانس نے ما بعد جنگ اور ۱۹۵۸ء کے بعد عالمی امور میں نمایاں کردار انجام دیا۔ اس وقت ڈیگال نے ملک کی قیادت سنبھال لی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے' جین مونٹ اور اس کے ہمراہی منصوبہ سازوں نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ ۱۹۴۵ء کے بعد معاشی استحکام حاصل ہو جائے گا۔ لیکن نوآبادیاتی جنگ' سیاسی عدم استحکام اور فرانک کی تقلیل القدری کی وجہ سے یہ امید پوری نہ ہو سکی۔ تاہم ہند چینی اور الجیریا میں درپیش مہمات کے باوجود فرانس کی اقتصادی حال نہایت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ کئی عشروں کے بعد اس ملک کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا تھا اور اس طرح اشیائے صرف کی طلب بھی بڑھنے لگی تھی۔ فرانس ایک امیر اور متنوع خصوصیات کا حامل ملک تھا' لیکن یہ پورے طور پر ترقی یافتہ ملک نہیں بن سکا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی عشرے سے اس کی معیشت جمود کا شکار رہی تھی۔ تاہم امن و سکون بحال ہو جانے' امریکی امداد وصول ہونے' افادہ عامہ کے قومیانے اور وسیع منڈی کے محرکات کے باعث ترقی کے امکانات روشن ہوئے۔ فرانس میں بھی اٹلی ہی کی طرح فی کس صنعتی پیداوار کی شرح کم تھی۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ وہاں کے شہر چھوٹے چھوٹے تھے اور معیشت کا انحصار زیادہ تر زراعت پر تھا۔ البتہ' آخرالذکر عنصر کی وجہ سے اقتصادی حالت میں روز افزوں ترقی ہوئی تھی۔ یہ شرح ۱۹۵۳ء میں ۹۵ فی صد تھی جو ۱۹۶۳ء میں ۱۶۷ اور ۱۹۷۳ء میں ۲۵۹ ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ترقی کی سالانہ اوسط شرح ۴۰۶ فی صد تھی جو ۱۹۶۰ء کے عشرے میں "کامن مارکیٹ" کی رکنیت کی وجہ سے ۵۰۸ فی صد تک پہنچ گئی۔ مذکورہ مارکیٹ نے نہ صرف فرانس کی زرعی پیداوار کو عالمی منڈی کی قیمتوں کے معاملے میں تحفظ فراہم کیا' بلکہ یورپ میں اسے ایک وسیع منڈی بھی فراہم کی۔ مغرب میں اقتصادی فروغ سے فرانس کے روایتی اور اعلیٰ

درجے کے سامان' مثلاً "کپڑا' جوتا' شراب' جواہرات وغیرہ کی برآمدات میں اضافہ ہوا۔ بعد ازاں' ان مصنوعات میں جہاز اور موٹریں بھی شامل ہو گئیں۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۶۹ء کے دوران موٹر گاڑیاں دس گنا زیادہ بنائی گئیں' الیومینیم کے سامان چھ گنا زیادہ تیار کیے گئے' ٹریکٹر اور سیمنٹ میں چار گنا اضافہ ہوا اور لوہے اور فولاد کی مصنوعات ڈھائی گنا زیادہ بڑھ گئیں۔ اگرچہ صنعت سازی پوری طرح فروغ پر نہیں تھی' اس کے باوجود ملک کئی دوسرے لحاظ سے امیر تھا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں تو اس کی امارت اور بھی بڑھ گئی اور فرانس مزید "فیشن ایبل" ملک بن گیا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ رائن کے اس پار واقع اپنے پڑوسی ممالک کے مقابلے میں فرانس کی معیشت کبھی بھی کلی طور پر صنعت سازی کی مرہون منت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ صدر پومپیڈو کی اس امید پر پانی پھر گیا کہ اس کا ملک جلد ہی مغربی جرمنی پر سبقت لے جائے گا۔ بجلی' آٹوموبائیل اور ہوائی جہاز کی چند کمپنیوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام فرمیں بہت چھوٹی اور قلیل سرمایہ کی حامل تھیں۔ علاوہ ازیں' ان سب کے مال کی مقرر کردہ قیمتیں بھی جرمنی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ زراعت کی "معقول تنظیم" کے باوجود چھوٹی اراضی ہنوز موجود تھیں۔ انھیں "کامن مارکیٹ" کی امدادی پالیسیوں کے تحت سہارا ملتا رہتا تھا۔ تاہم اس کا فرانس کے دیہی علاقوں پر خاصا دباؤ رہا کرتا تھا۔ پھر جدید صنعت سازی کے سماجی اثرات بھی رونما ہوئے تھے' مثلاً "لوہے کے قدیم کارخانے بند کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ اس سے محنت کش طبقے میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی اور ان میں شورش پھیلتی رہی تا آنکہ ۱۹۶۸ء میں فساد برپا ہو گیا۔

چونکہ فرانس میں ایندھن کی کمی تھی' لہٰذا اسے تیل کی برآمدات پر بہت زیادہ انحصار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ تیل کی عالمی قیمت کے اتار چڑھاؤ کے تحت توازن ادائیگی بھی متاثر ہوتا رہتا۔ (واضح رہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب فرانس نے ایٹمی توانائی کا ایک جامع منصوبہ بنایا تھا۔) مغربی جرمنی کے ساتھ اس کی ہونے والی تجارت خسارے کی زد میں تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ فرانک کے شرح مبادلہ میں تخفیف کی جاتی۔ اس طرح فرانس کی معیشت کو استحکام حاصل ہوتا۔ جن دنوں دیگر ممالک کی معیشت میں استحکام پیدا ہو رہا تھا' فرانس کی اقتصادی حالت میں غیر یقینی کی کیفیت تھی۔ چنانچہ اس وجہ سے بورژوائی طبقے کے لوگ نقل مکانی کر کے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔

ان حقائق کے باوجود کہ فرانس جیسے ملک کو جس کی پیداواری شرح محض ۴ فی صد تھی' دنیا میں ایک موثر مقام حاصل تھا۔ اور یہ خصوصیت ڈیگال کی صدارت کی مرہون منت نہ تھی بلکہ اس کی وجہ اس ملک کی تہذیبی و ثقافتی شان تھی۔ پھر اس خصوصیت کی اہمیت ایسے وقت میں اور بھی دو چند ہو گئی جب انگلستان و امریکہ کے اثرات ماند پڑ رہے تھے' روس اپنا تاثر کھو چکا تھا اور جرمنی عجز و انکسار کا حامل تھا۔ اگر مغربی یورپ کو ایک صحیح قائد اور ترجمان کی ضرورت ہوتی تو فرانس اس کے لیے برطانیہ اور جرمنی سے کہیں زیادہ موزوں ثابت ہوتا۔ مزید برآں' فرانس کی آنے والی حکومتوں نے اس امر کا بخوبی ادراک کر لیا تھا کہ اس ملک کی طاقت میں اسی وقت اضافہ ہو سکتا ہے جب "کامن مارکیٹ" پر ان باتوں کے حصول کے لیے دباؤ ڈالا جائے۔ زرعی پیداوار کا صحیح نرخنامہ' اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی' سمندر پار ممالک کی امداد' اقوام متحدہ

میں باہمی تعاون' عرب - اسرائیل جھگڑے کے تصفیے کے لیے مناسب پالیسی' وغیرہ۔ اس طرح تجارتی نقطہ نظر سے فرانس کی پوزیشن مستحکم ہوئی اور "مشترکہ منڈی" دنیا میں کاروبار کا سب سے بڑا بلاک بن گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ عشروں میں یورپ کی چار بڑی ریاستیں اور ان کے چھوٹے پڑوسی ممالک دولت اور پیداوار کے لحاظ سے کافی ترقی کر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ دائمی مسرت کی ضمانت نہ تھا۔ ڈیگال کی فرماں روائی میں فرانس نے اور بعد ازاں برطانیہ' ڈنمارک اور یونان نے سیاسی مفاہمت اور قانونی ارتباط کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس کی بنیاد یورپی ریاستوں کے جذبہ حب الوطنی پر قائم تھی۔ لیکن معاشی جھگڑوں خصوصاً "زراعتی اخراجات کی پالیسی کے سلسلے میں ہونے والے قضیے نے برسلز اور اسٹرا سبرگ کے معاملات کو گھمبیر بنا کر رکھ دیا۔ چونکہ آئیرلینڈ بھی اس برادری کا ایک رکن تھا' لہٰذا ایک مشترکہ دفاعی پالیسی کو بروئے کار لانا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس معاملے کو نیٹو پر چھوڑنا ضروری سمجھا گیا۔ واضح رہے کہ فرانس نے اس دائرہ اثر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں پیدا ہونے والے تیل کے بحران نے یورپ کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ چنانچہ پہلے کی قائم شدہ تمام امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ تشویش بے طرح پھیلی ہوئی تھی' ساتھ ہی ساتھ برسلز میں مناسب منصوبہ بندی بھی کی گئی تھی۔ تاہم جاپان اور امریکہ کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی کا منصوبہ وضع کرنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ ان متعدد مشکلات کے پیش نظر اور یورپی اقتصادی برادری کی معاشی حال کے جائزے سے یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو رہی تھی کہ اب عالمی منظر نامہ ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۸ء سے بالکل مختلف ہو چکا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ یورپی اقتصادی برادری (ای ای سی) کو عالمی برآمدات اور درآمدات میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ ۱۹۷۳ء میں اس کے پاس بین الاقوامی کرنسی اور سونے کے سب سے زیادہ ذخائر موجود تھے۔ اس کی آٹوموبائیل کی صنعت ۳۲ فی صد تھی جو جاپان (۲۳ فی صد) اور امریکہ (۲۳ فی صد) کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اس کی سیمنٹ کی پیداوار بھی دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ فولادی صنعت میں بھی اسے روس کے بعد دوسرا درجہ حاصل تھا۔ ۱۹۸۳ء میں اس کی مجموعی آبادی ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے خاصی زیادہ اور روس کے برابر تھی۔ دس اراکین پر مشتمل یہ برادری (ای ای سی) مجموعی قومی پیداوار میں بھی آگے تھی اور دنیا کی صنعتی پیداوار میں بھی اس کا حصہ روس یا دیگر ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ اگر سیاسی اور فوجی لحاظ سے یورپی برادری ناپختگی کی منزل میں تھی تو عالمی معیشت میں اسے ایک مستحکم مقام تو حاصل تھا اور ۱۹۵۶ء کے مقابلے میں دنیا کا اقتصادی توازن اسی کا دست نگر بن چکا تھا۔

جب روس ۱۹۵۰ء کے عشرے کے بعد ۱۹۸۰ء کے عشرے میں داخل ہو چکا تھا تو وہاں صورت حال یورپی برادری کے بالکل برعکس نظر آتی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے' ان عشروں میں روس کے پاس نہ صرف مضبوط سپاہ موجود تھیں بلکہ اس نے ایٹمی طاقت میں امریکہ کی ہمسری اختیار کر لی تھی' اپنی بحریہ کو خاصا فروغ دیا تھا اور دنیا کے کئی علاقوں میں اپنا اثر قائم کر لیا تھا۔ لیکن اگر ہم اقتصادی نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو مذکورہ ملک امریکہ کے مساوی درجہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔ المیہ یہ ہے کہ اس ملک نے کہاں تو یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ دنیا کی اصل کمیونسٹ ریاست ہے' لیکن حالت یہ تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ

اس کے معاشی مسائل بھی بڑھتے جا رہے تھے۔

یہاں روس کی اثر انگیز اقتصادی ترقی کی تردید مقصود نہیں ہے۔ معاشی ترقی کی یہ رفتار سوویت یونین کے زیر سایہ سبھی حصوں میں تھی، خصوصاً" اسٹالن کے آخری زمانے میں! یہ امر واقعہ ہے کہ ان عشروں میں اس علاقے میں مغربی یورپ سے کہیں زیادہ تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ ترقی کے آغاز سے قبل یہ ملک حد سے زیادہ غریب اور کم ترقی یافتہ تھا۔ بہرحال، اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پیش رفت بہت بہتر تھی۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی فولادی پیداوار محض ۱۲،۳ ملین ٹن تھی جو ۱۹۶۰ء میں بڑھ کر ۶۵،۳ ملین ٹن ہو گئی۔ اور ۱۹۸۰ء میں جب یہ تخمینہ ۱۴۸ ملین ٹن ہو گیا تو روس فولادی صنعت سازی میں دنیا میں سب سے آگے بڑھ گیا۔ اسی مدت کے دوران بجلی کی پیداوار بھی ۴۳،۲ ملین کلوواٹ فی گھنٹے سے بڑھ کر ۲۹۲ ملین، پھر ۱۲۹۴ ملین کلوواٹ فی گھنٹہ ہو گئی۔ اسی طرح آٹوموبائیل کا پیداواری تخمینہ ۷۵۰۰۰ یونٹ سے بڑھ کر ۵۲۴۰۰۰ یونٹ اور پھر ۲،۲ ملین یونٹ ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں مجموعی صنعتی پیداوار کا اوسط دس فی صد سے زیادہ تھا جو ۱۹۵۳ء میں ۱۰۰ اور ۱۹۶۴ء میں ۴۲۱ ہو گیا۔ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ اسی طرح اسپتنک، خلائی دریافت اور فوجی سازو سامان بھی اس ملک کی اعلیٰ کارکردگی کا نمونہ تھے۔ خروشیف کے سیاسی زوال کے وقت اس ملک کی اقتصادی حالت اسٹالن کے عہد سے بہت زیادہ مستحکم اور عمدہ تھی۔ پھر اس میں بتدریج ترقی ہوتی رہی۔

تاہم ایسی دو خرابیاں بھی تھیں جو ان کارناموں کو دھندلاتی رہیں۔ پہلی یہ کہ ترقی کی شرح میں آہستہ آہستہ کمی آتی رہی۔ ۱۹۵۹ء کے بعد صنعتی پیداوار کی سطح بھی گرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں یہ ۳/۴ فی صد سالانہ کے حساب سے کم ہوتی چلی گئی۔ اگر اس کے پس منظر کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ سراسر فطری عمل معلوم ہوتا تھا۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ابتدا میں جو موثر انداز میں ترقی ہوتی رہی، اس کی وجہ مزدوروں کی وسعت اور سرمائے کی کثرت تھی۔ لیکن بعد ازاں، مسلح افواج کی ضروریات اور زراعت کے فروغ کی خاطر موجود مزدوروں کو بے پناہ استعمال کیا گیا، لہٰذا ترقی کی رفتار میں کمی آ گئی۔ اسی طرح سرمایہ بھی طویل المدت والی صنعت میں کھپایا گیا اور دفاعی سامان کی تیاری میں بے دریغ صرف کیا گیا۔ اس طرح بہت سے اقتصادی شعبے سرمایہ کاری سے محروم رہ گئے۔ اگرچہ خروشیف اور اس کے جانشینوں نے اوسطاً" روسی باشندے کا معیار زندگی بلند کیا تھا، تاہم صارفین کی طلب نے پیداواری عمل کو مطلق مہمیز نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قومی وسائل بے دردی سے بھاری صنعتوں اور فوجی وسائل میں استعمال کیے جا رہے تھے اور عوام کی ذاتی ضروریات کو اس خیال کے پیش نظر کم سے کم کیا جا رہا تھا۔ مزید برآں، خراب آب و ہوا کے مضر اثرات بھی زرعی پیداوار پر مرتب ہوتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کے تمام عشرے میں جو پیداوار سالانہ ۴،۸ فی صد تھی وہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ۳ فی صد اور ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ۱،۸ فی صد ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ روسی منصوبہ سازوں اور وزیروں نے اس شعبے پر خاصی توجہ مبذول کی اور سرمایہ بھی لگایا تھا۔ سوویت یونین کے زرعی سیکٹر کے سائز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور ۱۹۵۰ء کے بعد تین عشروں میں ۸۳ ملین آبادی کے اضافے کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ فی کس کے حساب سے قومی پیداوار خاصی

کم تھی۔ اس کے برعکس صنعتی پیداوار زیادہ تھی اور اس کے "پیچھے" مزدوروں سے جبراً" کام لینے کا پہلو نمایاں ہے۔

دوسری اہم خرابی سوویت یونین کے اقتصادی استحکام میں تھی۔ جب ۱۹۵۰ء کے تمام عشرے اور ۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں عالمی صنعتی پیداوار اور عالمی تجارت میں روس کا حصہ بڑھنے لگا تو خروشیف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ مارکسی طریقہ پیداوار افضل ہے اور ایک دن یہ سرمایہ دارانہ نظام کو دفن کر دے گا۔ اس کا یہ قول بظاہر معقول معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے بعد صورت حال کریملن کے لئے سوہان روح ہو گئی۔ یورپی برادری جن نما صنعتی ملک مغربی جرمنی کی قیادت میں سوویت یونین سے آگے بڑھ کر امیر ترین اور نمایاں پیداکار بن گیا۔ جاپان جیسا چھوٹا سا جزیرہ آناً" فاناً" ترقی کر کے روس کی مجموعی قومی پیداوار کو بھی مات کر گیا۔ اپنے صنعتی زوال کے باوجود امریکہ بھی مجموعی قومی پیداوار اور دولت میں روس سے آگے ہی رہا۔ روس اور اس کے طفیلی مشرقی یورپ کے باشندوں کا معیار زندگی مغربی یورپ والوں کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کا رہا حالانکہ مارکسی معیشت کے علمبردار آخرالذکر کو نفرت و عداوت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کمپیوٹر، روبوٹ، ٹیلی کمیونیکیشن جیسی نئی نئی ٹکنیک میں روس اور اس کے طفیلی ملک مقابلے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ پھر پیداواری لحاظ سے زراعت پہلے کی طرح کمزور تھی۔ ۱۹۸۰ء میں ایک امریکی کسان اتنا اناج پیدا کر رہا تھا کہ اس سے ۶۵ آدمیوں کی غذائی ضرورت پوری ہو رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں روسی کسان صرف آٹھ بندوں کی ضروریات پوری کر رہا تھا۔ اس کے نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں غذائی اشیاء کی مانگ بڑھ گئی اور روسی حکومت کو وافر مقدار میں غلہ درآمد کرنا پڑا۔

روس کے معاشی مسائل کا اندازہ اس کے طفیلی ممالک سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ وہاں بھی ۱۹۵۰ء کی دہائی اور ۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں پیداواری شرح کافی بلند تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں "مغرب" میں پیداواری شرح اس سے بہت زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں، مشرقی یورپ کے ممالک کے درمیان خوشحالی اور پیداواری ترقی میں بھی خاصا تفاوت تھا۔ وہاں صرف یہ رجحان کارفرما تھا کہ ابتدا میں تو سبھی عزائم اپنا جلوہ دکھائیں، اور پھر جذبات مدھم پڑ جائیں۔ نتیجتاً" مارکسی منصوبہ ساز ترجیحات کے شکنجے میں جکڑے رہے۔ ادھر روس میں ناکارہ زمینوں کو کھیتی باڑی کے مصرف میں لایا گیا۔ لیکن شمال کے برفانی موسم اور جنوب کے ریگستان نے اس مہم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ تب ایسے میں لوگوں کو یہ خیال آیا کہ خروشیف نے بھی تو اس طرح کی ناکارہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے کا مصمم ارادہ کیا تھا اور اس کا کیا حشر ہوا؟ اسی طرح خام مال کو الٹے تلٹے میں استعمال کیا گیا۔ اس کی وجہ سے تیل کے اسٹاک کے ختم ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ جب زیر سطح اور منجمد زمینوں والے علاقے میں کان کنی کا کام شروع کیا گیا تو استخراجی اخراجات خاصے بڑھ گئے۔ اسی طرح صنعت اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم استعمال کی گئی، لیکن اس کے لیے دفاعی اخراجات کم کیے گئے حالانکہ سوویت حکومت نے اس مد کو ہمیشہ ترجیح دی تھی۔ پھر اشیائے صرف پر خرچ ہونے والے سرمایہ کو بھی مذکورہ کاموں میں خرچ کیا جاتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضرورت کی چیزیں کم ہو گئیں اور حکومت کا یہ رویہ عدم مقبولیت کا باعث بنا۔ یہی تکلیف دہ صورت مشرقی یورپ میں بھی پیش آئی

جب مد مقابل مغربی یورپ میں مواصلات کے اعلیٰ انتظام کی وجہ سے خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ بہرکیف' روس اور اس کی زیر قیادت کیمونسٹ حکومتوں نے کئی اصلاحات نافذ کی تھیں۔ ان کے ذریعے انہوں نے نہ صرف رشوت ستانی کا سلسلہ ختم کیا اور افسر شاہی کی لعنت دور کی' بلکہ خود نظام حکومت میں بھی تبدیلی لائی تھی۔ ان اقدامات کو موثر بنانے کے لیے ہر شخص کو ترغیب دی گئی' قیمت متعین کرنے کے لیے ایک خاص طریقِ کار وضع کیا گیا' نجی کاشت کاری کو فروغ دینے کی اب عام اجازت تھی اور نئی نئی ٹکنالوجی کے استعمال کے سلسلے میں عام بحث و مباحثہ اور کار اندازی کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ بادی النظر میں یہ سرمایہ دارانہ نظام پر حملہ کرنے کی کوشش تھی۔ یہی رویہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ہنگری کی حکومت نے بھی اپنایا تھا۔ جیسا کہ چیکو سلوواکیہ کے ۱۹۶۸ء والے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے' اس حکمت عملی میں مشکل یہ حائل تھی کہ حریت پسند بنانے کے اقدامات سے خود کیمونسٹ حکومت اعتراضات کی زد میں آ گئی تھی۔ چنانچہ بریژنیف کے دور میں پارٹی کے کٹر اصول پسند افراد اور فوجی افسران اس بات پر پیچ و تاب کھاتے رہے۔ چنانچہ اقتصادی بحران کو دور کرنے کے لیے نہایت ہوشمندانہ طریقے اپنائے گئے۔ ان اقدامات کی بدولت کامیابی سے ہمکنار ہونا ایسا ناممکن بھی نہیں رہا۔

اہل کریملن یہ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دیتے رہے کہ ان کے سب سے "بڑے دشمن امریکہ کو بھی ۱۹۶۰ء کے عشرے سے اقتصادی بحران کا زبردست سامنا ہے۔ چنانچہ ان اسباب کی بنا پر عالمی دولت' پیداوار اور تجارت میں اس کا اب وہ حصہ نہیں رہا جو ۱۹۴۵ء میں تھا۔" یہاں مذکورہ سال کا ذکر اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے امریکہ کے متعلقہ زوال کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے' تاریخ کے اس موڑ پر امریکہ کی جو اقتصادی حالت اتنی حسب خواہ اور مستحکم تھی وہ غیر متوقع بھی تھی اور مصنوعی بھی! اسے دنیا میں سب سے ارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا تھا' اس کی ایک وجہ تو خود اپنی پیداواری صلاحیت تھی' دوسرے دیگر ممالک کی کمزوریوں نے بھی امریکہ کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا تھا۔ لیکن جب جنگ سے ما قبل کے عرصے میں یورپ اور جاپان کی پیداواری سطح بلند ہو گئی تو امریکہ کی سابقہ صورت حال تبدیل ہو گئی۔ پھر جب ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان دنیا کی صنعتی پیداوار میں تین گنا زیادہ اضافہ ہو گیا تو امریکہ کی یہ کیفیت اور بھی حقیر ہوتی چلی گئی۔ ایسی صورت میں جب تمام دنیا میں نئی نئی فیکٹریاں نصب ہو رہی تھیں اور نئے نئے صنعتی پلانٹ لگ رہے تھے' امریکہ کے لیے اپنی ۱۹۴۵ء والی اس پوزیشن کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا جب کل عالمی مصنوعات میں اس حصہ "تقریباً" نصف تھا۔ بیروچ کے حساب کے مطابق ۱۹۵۳ء میں امریکی شرح کم ہو کر ۴۴٫۷ فی صد رہ گئی تھی اور ۱۹۸۰ء میں یہ کل ۳۱٫۵ فی صد تھی!۔ اور پھر شرح کم ہونے کا سلسلہ چلتا ہی رہا۔ شاید یہی وجوہات تھیں کہ سی آئی اے کے اقتصادی مظاہروں نے یہ حساب لگایا تھا کہ دنیا کی مجموعی قومی پیداوار میں امریکہ کا جو حصہ ۱۹۶۰ء میں ۲۵٫۹ فی صد تھا' وہ ۱۹۸۰ء میں گھٹ کر محض ۲۱٫۵ فی صد رہ گیا تھا۔ (ویسے ڈالر کی قیمت میں جو عارضی اضافہ ہوا تھا' اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اگلے چند سالوں میں امریکہ کا حصہ بڑھ جائے گا۔) بہرحال' یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ اہل امریکہ

نہایت قلیل تعداد میں مصنوعات تیار کر رہے تھے جبکہ دوسرے ممالک بہت زیادہ سامان بنا رہے تھے۔ آٹوموبائل ہی وہ آسان نسخہ ہے جس کے ذریعے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں امریکہ نے ۶٫۷۵ ملین گاڑیاں تیار کی تھیں۔ اس وقت دنیا میں موٹریں تیار کرنے کی مجموعی شرح ۱۲٫۸ ملین تھی۔ اس لحاظ سے اس صنعت میں امریکہ کا حصہ ۵۲ فی صد بنتا ہے جو حد درجہ وقیع نظر آتا ہے۔ لیکن ۱۹۸۰ء میں امریکہ کی یہی شرح ۲۳ فی صد تھی۔ واضح رہے کہ اس وقت عالمی سطح پر ۳۰ ملین گاڑیاں تیار ہوئی تھیں۔ اس لحاظ سے امریکہ میں ۶٫۹ ملین گاڑیاں بنائی گئی تھیں جو یقیناً" ایک اضافہ تھا۔

یہ طفل تسلی بالکل اسی طرح ہے جیسے اہل برطانیہ نے آج سے ستر سال پہلے عالمی صنعتی پیداوار میں اپنا حصہ کم ہو جانے پر اپنے آپ کو دینا شروع کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ترقی کی رفتار تشویشناک تھی۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کیا امریکہ واقعی پیداواری لحاظ سے روبہ زوال تھا؟ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اسے اتنی تیز رفتاری سے زوال آشنا ہونا پڑا؟ یہ امر واقعہ ہے کہ جب امریکہ کی امن تحریک زوروں پر تھی' اس وقت بھی اس کی فی کس پیداوار کی سالانہ شرح تشویشناک حد تک کم تھی' حالانکہ گزشتہ عشروں میں ایسی کوئی صورت حال نہ تھی۔ (ملاحظہ کیجئے جدول ۳۲):

جدول نمبر ۳۲: فی کس پیداوار کی سالانہ اوسط شرح

	(۱۸۳۰ء - ۱۹۱۳ء)	۱۹۱۳ء - ۱۹۳۸ء
امریکہ	(۱٫۷)	۱٫۶
برطانیہ	(۱٫۳)	۲٫۳
بلجیم	(۰٫۷)	۲٫۲
فرانس	(۰٫۷)	۳٫۳
جرمنی/وفاقی جمہوریہ جرمنی	(۰٫۳)	۵٫۹
اٹلی	۰٫۶)	۵٫۶

یہاں یہ بات پھر کہی جائے گی کہ تاریخی لحاظ سے ترقی کی یہ پیش رفت فطری تھی۔ جیسا کہ مائیکل بال فور کا خیال ہے' ۱۹۵۰ء سے قبل کے عشروں میں امریکی پیداوار کی شرح دوسرے ممالک کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے کثیر اور معیاری پیداوار کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ چنانچہ انسانی ضروریات کے لیے وافر مقدار میں چیزیں مہیا کی گئیں جو کسی اور ملک میں دستیاب نہ تھیں۔ ان حقائق کے باوجود امریکی معیشت میں کچھ خرابیاں بھی تھیں۔ ماحولیاتی اور محصولاتی پالیسیوں کی وجہ سے اخراجات میں اضافہ ہوا' جبکہ نجی بچت کی شرح کم ہو گئی۔ دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہاں سرمایہ کاری کا رجحان بھی نہ تھا۔ پھر وفاقی اخراجات قومی پیداوار کے تناسب سے زیادہ تھے۔ ایسی صورت حال مغربی ممالک میں نہ تھی۔ علاوہ ازیں' امریکی باشندے بڑی کثرت سے صنعت روزگار چھوڑ چھوڑ کر حکومتی ملازمت کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ گویا وہ کم پیداواری شعبے سے منسلک ہو رہے تھے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں یہ سارے عیوب و نقائص ڈھکے چھپے رہے۔ جن کی وجوہات حسب ذیل تھیں: ٹیکنالوجی میں امریکہ کی ترقی (خصوصاً" ہوائی جہاز بنانے میں) نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ عمدہ کاروں اور رنگین ٹی وی سیٹ کی طلب بہت بڑھ گئی تھی۔ بیرونی امداد کے طور پر غریب ممالک کو بے دریغ ڈالروں سے نوازا جا رہا تھا۔ دفاع پر خاصی رقم صرف کی جا رہی تھی۔ بینک اور کمپنیاں سرمایہ کاری میں معروف تھیں۔ یہاں ۱۹۶۰ء کے عشرے کے وسط میں پھیلتے ہوئے خطرات کا ذکر ناگزیر ہے۔ یورپ اور دیگر ممالک میں امریکہ کثرت سے سرمایہ کاری کر رہا تھا تاکہ یہ ممالک اقتصادی لحاظ سے اس کے طفیلی بن جائیں۔ ایکسن اور جنرل موٹرز جیسی بڑی بڑی قومی کمپنیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ امریکہ کا کاروباری نظریہ انتظامی امور پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ ان میں سے بعض معاشی نقطہ نظر سے سرمایہ کاری اور پیداوار کی ترسیل کے لیے بہتر تھیں۔ اس وجہ سے محنت کی اجرت کم ہو گئی اور نیتجتاً" سمندر پار ممالک کی منڈیوں تک رسائی میں اچھا خاصا اضافہ عمل میں آیا۔ بعض اوقات تو یہ گردشی سرمایہ اتنا زیادہ ہوتا کہ اس توقیری رقم سے بھی بڑھ جاتا جو مصنوعات اور غذائی اشیاء کی برآمدات اور دیگر غیر مرئی خدمات کے عوض حاصل ہوتی۔ ادائیگی کی اس بڑھتی ہوئی ۔غیر کی وجہ سے اسے ۱۹۵۰ء کے عشرے کے آخر میں نکاس طلا کا سامنا کرنا پڑا' پھر بھی بہت سے ممالک سونا طلب کرنے کی بجائے ڈالر ہی رکھنا پسند کرتے تھے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے کے بعد یہ سکوں بخش صورت حال ختم ہو گئی۔ کینڈی اور جانسن دونوں نے سمندر پار ممالک میں دفاعی اخراجات میں اضافہ کر دیا۔ اس کی ایک اہم وجہ ویت نام کا مسئلہ بھی شامل تھا جہاں ڈالر سیلاب کی طرح بہائے جا رہے تھے۔ یہ دونوں یہ بھی چاہتے تھے کہ ملکی مصنوعات میں بھی اضافہ ہو۔ یہ آخرالذکر رجحان ۱۹۶۰ء سے پہلے بھی موجود تھا' دونوں کی انتظامیہ نے کبھی بھی افراط زر کی کمی کے لیے ٹیکسوں میں اضافہ مناسب نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سال بہ سال خسارے کا سامنا کرتی رہی' جس سے مختلف چیزوں کی قیمتیں چڑھ گئیں اور امریکی صنعت میں مسابقت کا رجحان کم ہوتا چلا گیا۔ اس صورت حال میں ادائیگی کا توازن خاصا بگڑ گیا' جانسن کی حکومت نے امریکی فرموں کو بیرون ملک سرمایہ کاری کرنے سے زبردستی روک دیا اور آخرالذکر "یورو ڈالر" کی نئی ہیئت کی جانب مراجعت کرنے لگیں۔ اسی زمانے میں امریکہ کے طلائی محفوظات ۶۸ فی صد (۱۹۵۰ء) سے گھٹ کر ۲۷ فی صد (۱۹۷۳ء) رہ گئے۔ ان مسائل کے پیش نظر اور ڈیگال کی اس دھمکی کے رد عمل میں کہ امریکہ تو محض افراط زر برآمد کرتا ہے' نکسن کی حکومت نے نجی منڈیوں میں سونے کے ساتھ ڈالر کے تعلق کو ختم کر دیا۔ پھر دوسری کرنسیوں کے مقابلے میں ڈالر ہی کو رواں کر دیا۔ جب امریکہ مالی طور طرنہایت مستحکم تھا' ان دنوں بریٹن ووڈ سسٹم قائم کیا گیا تھا' وہ اب ختم ہو چکا تھا۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں جب ڈالر آزادی سے رواں دواں تھا' اس کی قیمت میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ اس کی مفصل کہانی یہاں بیان کرنا مناسب نہیں۔ بعد میں آنے والی حکومتوں نے بھی سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے افراط زر کو روکنے اور پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ امریکہ میں اوسط سے بھی زیادہ افراط زر کی وجہ سے ۱۹۷۰ء کے عشرے میں جرمنی اور جاپانی کرنسی کے مقابلے میں ڈالر کی قدر

گھٹ گئی تھی۔ تیل کے بحران دنیا کے مختلف حصوں میں سیاسی خلفشار اور امریکی سود کی بڑھتی ہوئی شرح کی بدولت ڈالر کی قیمت فزوں ہو گئی۔ یہی صورت حال ۱۹۸۰ء کے ابتدائی عشرے میں بھی تھی اور ارتعاش کی یہ موسمی عالمی معیشت کو غیر مستحکم بنانے کے مترادف ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے موضوع کے لیے اتنی اہم نہیں ہیں جتنے طویل المیعاد قسم کے مضبوط رجحانات' لیکن ان میں اضمحلال پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیداواری شرح بھی گر رہی تھی۔ چنانچہ نجی شعبے میں پیداواری ترقی جو ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۲ء کے دوران ۲۰۳ فی صد تھی' وہ ۷۷-۱۹۷۲ء میں ۱۶ء۱ فی صد اور ۸۲-۱۹۷۷ء میں ۲۰ء۰ فی صد رہ گئی۔ وفاق کی بڑھتی ہوئی خسارے کی حالت کے پیش نظر معیشت کی بہتری کے لیے کیس کا طریقہ کار استعمال میں لایا گیا' یعنی بیرونی ممالک سے زیادہ سے زیادہ سرمایہ کا حصول! اس طرح ڈالر کی قیمت عارضی طور پر بڑھ گئی' لیکن ملک قرض دہندہ کی بجائے قرض خواہ بن گیا۔ علاوہ ازیں' امریکی صنعت سازوں کو برآمد شدہ کاروں' الیکٹرونک کے سامان' باورچی خانے کے برتنوں اور دیگر مصنوعات میں مسابقت کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ان وجوہات کی بناء پر امریکہ کی فی کس قومی پیداوار جو کبھی دنیا میں عروج پر تھی' اب روبہ زوال ہو رہی تھی۔

وہ لوگ جو امریکی معیشت اور اس کی ضروریات کو وسیع تناظر میں دیکھ رہے تھے اور ان باتوں کا سوئٹزر لینڈ کی آمدنی اور جاپان کی پیداواری صلاحیت سے مقابلہ پسند نہیں کرتے تھے' ان کے لیے ہنوز تسلی و تشفی کا سامان موجود تھا۔ جیسا کہ کیلیو نے نشاندہی کی ہے' "۱۹۴۵ء کے بعد امریکہ کو اپنی پالیسی کے تحت بنیادی اور اہم نوعیت کے مقاصد حاصل ہوئے تھے: ۱۹۳۰ء کے عشرے جیسی مندی کی کیفیت کے برعکس ملک خوشحالی سے ہمکنار ہوا تھا۔ بغیر جنگ کیے روس کے توسیعی عزائم کی مزاحمت کی گئی تھی۔ مغربی یورپ کی معیشت اور جمہوری اقدار کو بحال کیا گیا تھا۔ بعد میں جاپان کو بھی شامل کر کے مستحکم قسم کا اقتصادی بلاک بنانے میں پیش رفت ہوئی تھی۔ قدیم نوآبادیاتی سلطنتوں کو آزادی عطا کی گئی تھی"۔ مختصراً" یہ کہ امریکہ نے آزاد عالمی نظام قائم کر دیا تھا۔ اگرچہ عالمی پیداوار اور دولت میں اس کا حصہ بہت تیزی سے گھٹا تھا' تاہم دنیا کے اقتصادی توازن نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جو امریکہ کی اپنی کھلی منڈی اور سرمایہ دارانہ روایات کے منافی نہیں تھی۔ اگر یورپی ممالک کے مقابلے میں امریکہ کی پیداواری صلاحیت میں کمی آئی تھی' اس کے باوجود سوویت یونین پر کئی لحاظ سے فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے انتظامی امور اور تکنیکی پیش رفت میں جو امتیازی مقام حاصل کیا تھا اسے مارکسی نظریے کے دشمن تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

ان اقتصادی محرکات کا اگلے باب میں تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔ تاہم یہاں یہ ضروری ہو گا کہ مذکورہ بالا سطور میں جن رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے' انھیں اعداد و شمار کے آئینے میں بھی پرکھا جائے۔ (دیکھئے جدول ۴۳)۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان باتوں کا تعلق عالمی معیشت کے توازن سے ہے' یعنی غیر ترقی یافتہ ممالک کا عالمی پیداوار کے کچھ نہ کچھ حصے پر دسترس! جاپان اور پھر چین کی بے مثال ترقی۔ دنیا میں یورپی اقتصادی برادری کے بہت بڑے معاشی بلاک ہونے کے باوجود اس کے حصص میں کمی! روس کے حصص میں استحکام کا رجحان اور پھر آہستہ آہستہ کمی کی کیفیت! امریکہ کے حصص میں بہت زیادہ کمی' مگر معاشی

طور پر اس کا ازحد استحکام!

جدول نمبر ۳۳: مجموعی عالمی پیداوار میں حصص

۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء

(فی صد)

	۱۹۶۰ء	۱۹۷۰ء	۱۹۸۰ء
کم ترقی یافتہ ممالک	۱۱٫۱	۱۲٫۳	۱۴٫۸
جاپان	۴٫۵	۷٫۷	۹٫۰
چین	۳٫۱	۳٫۴	۴٫۵
یورپی اقتصادی برادری	۲۶	۲۴٫۷	۲۲٫۵
امریکہ	۲۵٫۹	۲۳	۲۱٫۵
دیگر ترقی یافتہ ممالک	۱۰٫۱	۱۰٫۳	۹٫۷
روس	۱۲٫۵	۱۲٫۴	۱۱٫۴
دیگر کمیونسٹ ممالک	۶٫۸	۶٫۲	۶٫۱

یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں جو مذکورہ جدول کا آخری سال ہے' عالمی بینک کے اعداد و شمار کے مطابق آبادی' فی کس مجموعی پیداوار اور خود مجموعی قومی پیداوار سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ عالمی معیشت کا توازن کثیر المحورائی تقسیم پر منحصر تھا۔ اس کی وضاحت جدول ۳۴ میں کی گئی ہے۔

جدول نمبر ۳۴: آبادی' فی کس قومی پیداوار' مجموعی قومی پیداوار

(۱۹۸۰ء میں)

	آبادی (ملین)	فی کس قومی پیداوار (ڈالر)	مجموعی قومی پیداوار (بلین ڈالر)
امریکہ	۲۲۸	۱۱۳۶۰	۱۵۹۰
روس	۲۶۵	۴۵۵۰	۱۲۰۵
جاپان	۱۱۷	۹۸۹۰	۱۱۵۷
یورپی اقتصادی برادری (۱۲ ممالک)	۳۱۷		۲۹۰۷
مغربی جرمنی	۶۱	۱۳۵۹۰	۸۲۸
فرانس	۵۴	۱۱۷۳۰	۶۳۳
برطانیہ	۵۶	۷۹۲۰	۴۴۳
اٹلی	۵۷	۶۴۸۰	۳۶۹
مغربی اور مشرقی جرمنی (مشترکہ)	۷۸	-	۹۵۰
چین	۹۸۰	۲۹۰ یا ۳۵۰	۲۸۳ یا ۳۴۱

آخر میں اس بات کا دہرانا مناسب ہوگا کہ پیداوار کے توازن میں طویل المیعاد تغیر خود ان ممالک کے لیے اتنا اہم نہ تھا جتنا ان کی سیاسی طاقت کے اثر و نفوذ کے لیے ضروری تھا! جیسا کہ ۱۹۱۷ء میں لینن نے لکھا: "ممالک کی ناہمواری معاشی ترقی کی وجہ سے مخصوص طاقتوں کو تو عروج نصیب ہوا' لیکن بعض کے لیے یہی صورت زوال کا سبب بنی۔" آگے چل کر وہ رقمطراز ہے:

> نصف صدی قبل' جرمنی ایک مصیبت زدہ اور غیر اہم ملک تھا۔ جہاں تک اس کی مالیاتی طاقت کا تعلق ہے تو اس کا مقابلہ اس زمانے کے انگلستان کی قوت سے کیا جا سکتا تھا۔ روس کے مقابلے میں جاپان بھی نہایت غیر اہم ملک تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ دس بیس سال کی مدت میں سرمایہ دار قوتوں کی متعلقہ طاقت جوں کی توں رہی ہو گی۔ یہ بات یقیناً ناقابل فہم ہے۔"

سرمایہ دار اور شہنشاہی ریاستوں پر یقین کی تمام تر توجہ کے باوجود یہ اصول تمام قومی یونٹوں پر صادق آتا ہے۔ ان کی پسندیدہ سیاسی معیشت کیسی ہو' لیکن اگر اس کی ترقی کی شرح ناہموار دکھائی دے تو اس صورت میں عالمی سیاست اور فوجی توازن میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ گزشتہ چار صدیوں میں بڑی طاقتوں کی ترقی کا یہی انداز رہا ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گزشتہ دو تین عشروں میں عالمی پیداوار کے مراکز میں جو تبدیلی آئی' اس کے اثرات موجودہ رہنما طاقتوں کے دفاعی مستقبل پر مرتب ہونا ناگزیر ہیں۔ لہٰذا اس کے مطالعہ کے لیے ایک آخری اور حتمی باب ضروری ہے۔

اکیسویں صدی کی جانب

تاریخ اور قیاس آرائی

مذکورہ بالا عنوان سے نہ صرف واقعہ نگاری میں تبدیلی رونما ہوتی ہے بلکہ ضابطہ پرستی
بھی یکسر بدل جاتی ہے۔ ماضی قریب بھی تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ گزشتہ عشروں کے مورخین کے لیے
طرفداری کے رجحان اور واقعات کے وسائل تک رسائی نے خاصی مشکل پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ ان کے
لیے عارضی باتوں کو بنیادی حقائق سے جدا کرنا خاصا دشوار رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہنوز تاریخ نگاری کے
لگے بندھے اصول پر کاربند ہیں۔ لیکن وہ تحریریں جن میں یہ اظہار کیا گیا ہو کہ زمانہ حاضر کس طرح مستقبل
میں ضم ہو جائے گا۔ اور موجود رجحانات کی نشاندہی بھی کی گئی ہو' تاریخی شواہد ہونے کا دعوی نہیں کر
سکتیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہر تحریر کی افادیت بھی ایک مخصوص عرصے کے بعد بدل جاتی ہے۔ اگر واقعات کو
بیان کرنے میں ضابطہ پرستی کا عمل دخل رہا ہوتا تو پھر آرک ڈیوک کے قتل یا فوجی شکست کے واقعہ کے ظہور
پذیر ہونے پر آخر کس طرح یقین کیا جاتا؟ کوئی شخص بھی مستقبل کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔
انہونے واقعات' شدید حادثات' اور کسی خاص رجحان کا خاتمہ پیش گوئی کی صداقت کو یکسر جھٹلا سکتا ہے۔
لیکن اگر ایسی صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہو تو پھر پیش بینی کرنے والا یقیناً" خوش نصیب ہے۔

بہرحال' جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ محض عارضی ثابت ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ دراصل اس
حقیقت پر مبنی ہوا کرتا ہے کہ عالمی معیشت اور فوجی حکمت عملی کے سلسلے میں سردست کیا رجحانات پائے
جاتے ہیں۔ لیکن اس امر کی کوئی بھی ضمانت نہیں کہ جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے وہ سچ ثابت ہو گا۔ گزشتہ چند
برسوں کے دوران' اور خصوصاً" ۱۹۸۳ء کے فوراً" بعد تیل کی قیمت کم ہو جانے سے ڈالر کی بین الاقوامی قیمت
جس انتشار کا شکار رہی اور روس' جاپان اور "اوپیک" پر اس کے جو مختلف اثرات مرتب ہوئے ان سے
ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اقتصادی رجحانات کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے۔ اور پھر سیاست اور
سفارت کاری کی دنیا وہ دنیا ہے جہاں "صراط مستقیم" نہیں ہوا کرتی۔ ایسی بہت سی تصانیف سے جو حالات
حاضرہ کا جائزہ لیتی ہیں' آخری باب محض چند سال کے بعد تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

مستقبل کی باتوں کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ پیچھے کی سمت مڑ کر یہ دیکھا جائے
کہ گزشتہ پانچ صدیوں میں بڑی طاقتیں کس طرح عروج و زوال سے آشنا ہوئیں۔ زیر نظر کتاب میں یہ نکتہ
پیش کیا گیا کہ صورت حال کی تبدیلی کے لیے کوئی نہ کوئی جذبہ محرک ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی معاشی اور تکنیکی
ترقی کے نتیجے میں رونما ہوتی ہے۔ پھر اس کے اثرات سماجی حالات' سیاسی نظام' فوجی طاقت' ملک کے استحکام
اور سلطنت کے عروج پر مرتب ہوتے ہیں۔ عالمی سطح پر یہ معاشی تبدیلی کبھی یکساں انداز میں نہیں آئی ہے۔
اس کی وجہ محض یہ ہے کہ خود تکنیکی ایجاد اور اقتصادی ترقی کی رفتار کبھی یکساں نہیں رہی ہے۔ موجد اور

۴۴۸

کار انداز کا ماحول' موسم' بیماری' جنگ' جغرافیہ' سماجی اقدار وغیرہ بھی اس عدم یکسانیت کا سبب ہوا کرتی
ہیں۔ اسی طرح' دنیا کے مختلف علاقے اور معاشرے میں ترقی کی شرح گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ اس کا انحصار
تمام تر ٹیکنالوجی کے استعمال' پیداوار اور تجارت کے بدلتے ہوئے انداز پر ہوا کرتا ہے۔ نیز' وہاں کے لوگوں
کے اس جذبے کو بھی دخل ہے کہ وہ کس حد تک پیداوار میں اضافہ کرنے اور اپنی دولت بڑھانے کے خواہاں
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے بعض علاقے ترقی سے ہمکنار ہوئے وہاں بعض بہت پیچھے رہ گئے۔ کوئی
ایک بات بھی حیران کن نہیں ہے۔ چونکہ آدمی اپنی حالت کو بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے فطری طور پر
کوشش کرتا ہے' لہذا دنیا کبھی بھی جائے سکون نہیں رہی ہے۔ پھر نشاۃ الثانیہ کے بعد ذہنی ارتقاء عمل میں
آیا۔ ثقافتی تحریک اور معنتی انقلاب کے دوران سائنس کی ایجادات سے متمتع ہونے کے امکانات روشن
ہوئے۔ ان سب حقائق سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تبدیلی کی لہر پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر
اور طاقت ور ہوا کرتی ہے۔

اس کتاب میں دوسرا اہم نکتہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ ناہموار معاشی ترقی متعلقہ فوجی طاقت'
دفاعی حکمت عملی اور ریاستی نظام پر بری طرح اثر انداز ہوا کرتی ہے۔ یہ بھی تعجب انگیز بات نہیں۔ اسے
پہلے بھی بارہا دہرایا جا چکا ہے۔ ویسے بحث کا انداز اور پیشکش کا طریقہ یقیناً" مختلف رہا ہے۔ دنیا کو اسکز کے
وقت کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا جب انھیں یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ معاشی حالت پر کسی بھی چیز کا انحصار اتنا
زیادہ نہیں ہوا کرتا جتنا بری اور بحری فواج کا ہوا کرتا ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے دور سے لے کر موجودہ پیسٹاگون
تک' سبھوں کو اس بات سے اتفاق ہے کہ فوجی طاقت کا انحصار دولت کی فراوانی پر ہوا کرتا ہے۔ اور دولت
پیداوار کے متنوع ذرائع' مستحکم مالی حالات اور اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ
سطور بالا میں اسکز کے قول کا حوالہ دیا گیا ہے' معاشی خوشحالی کے نتیجے میں فوجی استحکام ہمیشہ اور "آنا" فانا"
حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اس کے اور بھی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ان میں جغرافیہ اور قومی کردار کے اثر کے
ساتھ ساتھ فوجی قیادت اور فنی صلاحیت کا بھی دخل ہوا کرتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ دنیا
میں فوجی طاقت کا توازن پیداواری توازن کے تغیرات پر ہی منحصر رہا ہے۔ اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے
کہ دنیا کی مختلف سلطنتوں اور ریاستوں کا عروج و زوال بھی بڑی طاقتوں کی آپس کی محاذ آرائیوں کا نتیجہ رہا
ہے۔ فتح اسی متحارب ملک کو حاصل ہوئی ہے جس کے مالی وسائل بے پناہ تھے۔

بہرکیف' ان باتوں کے پیش نظر جو حقیقت مترشح ہوتی ہے' وہ تاریخ نہیں' قیاس آرائی
ہے۔ لہذا اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ پانچ صدیوں پر مشتمل رجحانات آئندہ بھی برقرار رہیں
گے۔ یہ عالمی نظام' جس پر چاہے چھ بڑی طاقتوں کا تسلط رہا ہو یا دو کا' ہمیشہ نزاعی رہا ہے------ یعنی
بالادست' انا پسند ملکی ریاست سے بڑھ کر کسی کی حاکمیت نہیں ہوتی! مخصوص وقتوں میں اس نوع کی ریاستیں
سیکولر طاقت میں اپنے متعلقہ حصے کی بدولت ہی عروج پاتی رہیں یا پھر سکڑتی رہیں۔ دنیا ۱۹۷۰ء یا ۱۸۶۰ء میں
اتنی منجمد نہیں ہو گی جتنی وہ ۱۹۷۰ء یا ۱۸۶۰ء میں تھی۔ اس کے رد عمل میں بہت سے ماہرین معاشیات یہ
دلیل پیش کریں گے کہ بین الاقوامی پیداوار کا طریقہ کار پہلے کی نسبت بہت تیزی سے بدل رہا ہے------

یعنی زرعی پیداوار اور خام مال کی قیمتیں گھٹتی چلی جا رہی ہیں' صنعتی پیداوار کارخانے کے ملازمین سے ہم آہنگ نہیں' ہر ترقی یافتہ ملک میں معلومات افزا سامان کی ریل پیل ہے اور دنیا کا رواں سرمایہ تجارت کے مروجہ طریقہ کار سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ مذکورہ تمام باتوں کے علاوہ سائنس کی بے پناہ ترقی بھی بین الاقوامی امور پر اثر انداز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مختصراً" یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی آسمانی آفت نہ آئی یا نیو کلیائی جنگ کی وجہ سے تباہ کن آتش زنی نہ ہوئی تو عالمی طاقت کا جادو چلتا رہے گا اور اس کے پیچھے تکنیکی اور اقتصادی ترقی اپنا اثر دکھاتی رہے گی۔ کمپیوٹر' روبوٹ' ٹیکنالوجی وغیرہ کے اثرات کے متعلق جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں' اگر وہ سچی ہیں اور اسی طرح تیسری دنیا کے بعض ممالک میں سبز انقلاب" رونما ہونے کے متعلق جو قیاس آرائی کی جا رہی ہیں (یعنی ہندوستان اور چین ہی وہ ملک ہوں گے جو غلہ برآمد کریں گے) وہ صحیح ثابت ہوتیں ہے' تب تو پوری دنیا اکیسویں صدی کے اوائل میں امیر ترین ہو جائے گی۔ اگر تکنیکی ترقی میں کوئی اہم پیش رفت نہ بھی ہوئی' تاہم اقتصادی ترقی جاری رہے گی۔ پیدائش اور موت کے اعداد و شمار بھی مطلب" پر اثر انداز ہوتے رہیں گے اور اسی طرح خام مال کا بے دردی سے استعمال بھی اپنا رنگ دکھاتا رہے گا۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ ترقی یکساں نہیں ہو گی' یعنی کہیں بہت تیز اور کہیں سست! اس کا انحصار حالات کی تبدیلی پر ہو گا۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ترقی کو عارضی بنا دیتی ہے۔ مثلاً" جاپان کی شاندار معیشت جو گزشتہ چار دہائیوں سے قائم ہے' آئندہ برقرار رہے گی یا نہیں' اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ نہ ہی اس بات کی ضمانت دی جا سکتی ہے کہ روس میں اقتصادی پالیسی اور میکانزم میں جو تبدیلی رونما ہو رہی ہے' اس کی وجہ سے روس کی پیداواری شرح جو ۱۹۶۰ء کے عشرے سے گر رہی ہے' وہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں پھر بڑھ جائے گی۔ تاہم' جو حالات ہیں ان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں صورتوں کے وقوع پذیر ہونے کے امکانات نہیں! اسے دوسرے انداز میں لیجئے۔ اگر اس وقت سے لے کر اکیسویں صدی کے اوائل تک کے عرصے میں جاپان پر جمود طاری رہتا ہے اور روس کی معیشت بہت بہتر ہو جاتی ہے تو ایسی صورت حال محض حالات اور پالیسیوں کی تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہو گی۔ اور یہ کیفیت زیادہ پیچیدہ ثابت ہو گی۔ یہ اندازہ کہ گزشتہ پندرہ یا پچیس سال میں دنیا کیسی ہو گی' غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ موجودہ ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب توقعات کی بجائے ناموزوں نتائج اخذ کیے جائیں۔

مثال کے طور پر یہ توقع کرنا بے جا نہیں رہے گا کہ آج کی دنیا کا نہایت اہم معاملہ یعنی بحرالکاہل کے علاقے میں ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ وہاں ترقیاتی عمل وسیع بنیادوں پر انجام دیا جا رہا ہے۔ اس میں صرف جاپان کا معاشی "پاور ہاؤس" ہی شامل نہیں ہے بلکہ نہایت تیزی سے بدلتا ہوا قد آور عوامی جمہوریہ چین بھی ہے۔ اس میں صرف اور مستحکم صنعتی ملک آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ ہی نہیں ایشیا کے کامیاب اور نئے نئے صنعتی ممالک' یعنی تائیوان' جنوبی کوریا' ہانگ کانگ اور سنگاپور بھی شامل ہیں۔ نیز جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی تنظیم سے وابستہ علاقے۔۔۔۔۔ ملائیشیا' انڈونیشیا' تھائی لینڈ اور فلپائن۔۔۔۔ بھی اس میں شامل ہیں۔ اگر اس میں توسیع کر دی جائے تو پھر بحرالکاہل کی امریکی

ریاستیں اور کینیڈا کے صوبے بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اس وسیع و عریض علاقے میں اقتصادی ترقی مختلف اسباب و عوامل کے نتیجے میں فروغ پاتی رہی ہے' مثلاً" روایتی اور قدیم برآمد کنندگان نے صنعتی سامان کو کثرت سے تیار کروایا تھا۔ اس کی وجہ بیرونی تجارت میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ پھر جہاز بھی اسی کثرت سے بنائے گئے اور مالیاتی ادارے بھی خوب بہرہ مند ہوئے۔ نئی نئی ٹیکنالوجی استعمال کرنے کا رجحان بڑھتا گیا۔ سستے اور پرجوش کارکنوں کی ریل پیل ہو گئی۔ پھر اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ آبادی کی بڑھتی ہوئی شرح سے کہیں زیادہ غلے' چارے اور مال مویشی مہیا کیے جائیں۔ اس معاشی وسعت و ترقی میں ہر عنصر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھا۔ اس بے مثال ترقی کے سامنے مغربی طاقتوں اور موجودہ کو میکون کی وقعت گھٹ کر رہ گئی۔

مثال کے طور پر ۱۹۶۰ء میں ایشیا اور بحرالکاہل کے ممالک کی مجموعی پیداوار (امریکہ کو چھوڑ کر) دنیا کی مجموعی قومی پیداوار کے مقابلے میں صرف ۷ء۸ فی صد تھی۔ ۱۹۸۲ء تک یہ دوگنی ہو گئی' یعنی ۱۶ء۴ فی صد۔ پھر اس کے بعد سے اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نیز پیداواری شرح یورپ' امریکہ اور روس کی پیداواری شرح سے کہیں زیادہ ہے۔ اس بات کی توقع ہے کہ ۲۰۰۰ء میں یہاں دنیا کی مجموعی قومی پیداوار کا ۲۰ فی صد حصہ ہو گا۔۔۔۔۔۔ جو یورپ اور امریکہ کے مساوی ہو گا۔ اور یہ ترقی پیداوار کی مختلف اور کم ہوتی ہوئی سطح کے باوجود ہو گی۔ اس مدت کے دوران امریکہ میں بھی بحرالکاہل کی پرجوش فعالیت بخوبی محسوس کی گئی ہے اور وہاں کے بدلتے ہوئے اقتصادی توازن پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ایشیا اور بحرالکاہل کے ممالک کے ساتھ امریکی تجارت کی شرح یورپ کے ساتھ ہونے والی تجارت کا صرف ۴۸ فی صد تھی' لیکن ۱۹۸۳ء میں امریکہ و یورپ کی تجارت سے ۱۲۲ فی صد زیادہ ہو گئی۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ بحرالکاہل کے حوالے سے امریکہ کی آبادی اور آمدنی کی بھی ازسرنو تقسیم عمل میں آئی ہے۔ اگرچہ بعض ممالک کی پیداوار کم رہی ہے اور کسی خاص صنعت کو مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے' اس کے باوجود مذکورہ رجحانات ہر جگہ فروغ پاتے رہے ہیں۔ لہٰذا ایک ماہر معاشیات کی اس پیش گوئی پر ذرا بھی حیران نہیں ہونا چاہئے کہ بحرالکاہل کا سارا علاقہ جو اس وقت دنیا کی مجموعی پیداوار کے صرف ۴۳ فی صد حصے کا مالک ہے' ۲۰۰۰ء میں ۵۰ فی صد حصے کا حامل ہو گا۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے: "اقتصادیات کا مرکز نہایت تیزی سے ایشیا اور بحرالکاہل کی سمت منتقل ہو رہا ہے۔ اب بحرالکاہل دنیا کی معاشی طاقت کا اہم مرکز بن چکا ہے۔" اس قسم کی باتیں انیسویں صدی سے سنی جا رہی ہیں لیکن یہ تو ۱۹۶۰ء کے بعد سے ہی پورے یقین کے ساتھ پیش گوئی کی جا رہی ہے کہ اپنے وسیع کاروبار اور اعلیٰ درجے کی پیداوار کی وجہ سے یہ علاقہ امتیازی مقام حاصل کر لے گا۔

اسی طرح یہ قیاس آرائی بھی کی جا سکتی ہے کہ اگلے چند عشروں میں بدلتے ہوئے رجحانات اتنے موثر تو نہ ہوں گے لیکن وسیع ضرور ہوں گے۔ مثلاً" اسلحے کی دوڑ کے بڑھتے ہوئے اخراجات! اس کی تمام تر وجہ نئے نئے قیمتی ہتھیار اور بین الاقوامی سطح کی دشمنی ہو گی۔ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ تاریخ کی مستقل خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ دفاعی اخراجات ہمیشہ بڑھتے رہے ہیں۔ اگر یہ بات اٹھارھویں

صدی پر صادق آتی ہے جب اسلحے کی تکنیک میں نہایت آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے باوجود جنگ کا سلسلہ قائم تھا' تو موجودہ دور اس سے مستثنیٰ نہیں! اس عہد میں لڑاکا طیارے' جنگی جہاز اور ٹینک کی تیاری کے اخراجات پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ بایں ہمہ' افراط زر کی کیفیت بھی طاری ہے۔ سیاست دانوں کا خیال ہے کہ ۱۹۱۴ء سے قبل جنگ کے اخراجات ۲۰۵ ملین پونڈ ہوا کرتے تھے۔ اور اب صرف برطانوی بحریہ کا خرچ ۱۱۰ ملین پونڈ ہو چکا ہے۔ امریکی مجلس قانون ساز کے اراکین نے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ہزاروں بی۔۱۷ بمبار جہازوں کی تیاری کے لیے رقم کی منظوری دے دی تھی' لیکن اب یہ معلوم کر کے انہیں جھرجھری آنے لگی ہے کہ آج صرف ایک سو بی۔۱ بمبار طیاروں پر ۲۰۰ بلین ڈالر کی رقم خرچ ہو گی۔ الغرض ہر شعبے میں خرچ کا تخمینہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ بقول کیلڈور:

> "دوسری جنگ عظیم میں ایک بمبار طیارے پر جتنا خرچ آتا تھا' اب اس کا دو سو گنا خرچ ہوتا ہے۔ اسی طرح لڑاکا طیارے پر دوسری جنگ عظیم کے مقابلے میں اب سو گنا زیادہ خرچ آتا ہے۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے مقابلے میں طیارہ بردار جنگی جہاز پر بیس گنا زیادہ اور ٹینک پر پندرہ گنا زیادہ خرچ آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں گاٹو ساخت کی سب میرین پر ۵۵۰۰ ڈالر فی ٹن کے حساب سے خرچ اٹھتا تھا۔ اب اس کے مقابلے میں ٹرائیڈنٹ آبدوز پر ۱۶۰۱ ملین ڈالر فی ٹن کے حساب سے خرچ اٹھتا ہے۔"

ان پیمانہ مسائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب اسلحہ سازی کی صنعت کاروباری طریقے اور آزاد منڈی سے انحراف کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ کاروباری لحاظ سے یہ چند بڑی بڑی فرموں پر مشتمل ہے جن کا محکمہ دفاع کے ساتھ خصوصی تعلق قائم ہے۔ یہ بات امریکہ' برطانیہ' فرانس اور روس میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس صنعت کو حکومت کی جانب سے خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ پھر مصنوعات کے سلسلے میں یہ ضمانت بھی ہوتی ہے کہ مذکورہ ملک اور اس کے دوست ممالک دفاعی سامان خرید لیں گے۔ آئی بی ایم اور جنرل موٹرز جیسی بڑی بڑی کمپنیوں کی موجودگی میں اسلحہ کی صنعت کا خاصا مقابلہ درپیش ہوتا ہے۔ نیز فوجیوں کی ضروریات کے پیش نظر اس نوع کے اسلحے بنائے جاتے ہیں کہ جنگ کے دوران ان کا استعمال خاصا کارگر رہے' لہٰذا ان پر اخراجات بھی بہت بڑھ جاتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے نئی نئی ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے دفاعی سامان تیار کرنے والے صنعت کار اپنی اپنی حکومتوں سے لازماً قریب ہو گئے۔ چنانچہ اس رویے کی وجہ سے "آزاد منڈی" کے تصور سے انحراف کیا جانے لگا۔ اور یہ رجحان حد سے زیادہ تشویش ناک نظر آتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں متعدد قسم کی "فوجی اصلاحات" کی جو تجاویز پیش کی جا رہی ہیں ان سے ممکن ہے وہ صورت حال نہ پیدا ہو جس کی پیش گوئی کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ ۲۰۲۰ء میں پینٹاگون کا سارا دفاعی بجٹ صرف ایک جنگی طیارے کے بنانے میں صرف ہو جائے گا۔ لیکن یہ ساری کوششیں اس رجحان کو بدلتی ہوئی دکھائی نہیں دیتیں کہ تھوڑے سے اسلحے کی تیاری پر زیادہ

سے زیادہ خرچ کیا جائے۔

بہرحال ان بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات کی بنیادی وجہ اسلحے کی تیاری کا اعلیٰ معیار ہے' مثلاً "موجودہ لڑاکا طیارا ایک لاکھ پرزوں پر مشتمل ہو گا۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اب اسلحہ کی دوڑ میدانوں میں' سمندروں کے اوپر اور ان کی تہوں میں' فضاؤں میں اور خلاؤں میں نہایت تیز رفتاری سے جاری ہے۔ نیٹو اور وارسا پیکٹ سے وابستہ بڑے بڑے ممالک کے درمیان شدید قسم کی دشمنی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ تمام ممالک دنیا کی مجموعی سرمایہ کاری کا ۸۰ فی صد حصہ اسلحہ سازی پر صرف کر دیتے ہیں اور ان کے پاس دنیا کے مجموعی لڑاکا طیاروں اور جنگی جہازوں کا ۶۰ تا ۷۰ فی صد حصہ موجود ہے۔ ان ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اسلحہ کی دوڑ لگی ہوئی ہے' مثلاً "مشرق وسطیٰ' افریقہ' لاطینی امریکہ اور ایشیا میں ایران سے کوریا تک کے علاقوں میں! چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تیسری دنیا میں دفاعی اخراجات بہت بڑھ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ غریب ممالک بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہیں۔ ان تمام ممالک میں نہایت وسیع پیمانے پر اسلحہ کی خرید و فروخت جاری ہے۔ ۱۹۸۴ء میں دنیا میں مجموعی طور پر ۳۵ بلین ڈالر کے اسلحے برآمد کیے گئے تھے' جبکہ اس کے مقابلے میں غلے کی برآمد محض ۳۳ بلین ڈالر کی ہوئی تھی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مذکورہ سال میں دنیا کے مجموعی فوجی اخراجات کا تخمینہ ۹۴۰ بلین ڈالر تھا۔ یہ رقم دنیا کی نصف آبادی کی مجموعی آمدنی سے کہیں زیادہ تھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ عالمی معیشت کے تناسب سے اسلحہ کے اخراجات بہت زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک ۲۵۰ بلین ڈالر سالانہ سے بھی زیادہ دفاع پر خرچ کر رہا تھا اور اس مد میں ۳۰۰ بلین ڈالر تک خرچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ بہت سے ممالک میں تو یہ حالت تھی کہ سرکاری بجٹ اور مجموعی قومی آمدنی کا وافر حصہ مسلح افواج پر خرچ کیا جا رہا تھا۔ اس پر کنٹرول صرف جاپان اور لکسمبرگ میں کیا گیا تھا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ معیشت کمزور ہو رہی تھی اور سکے کی کمی واقع ہو گئی تھی۔ وگرنہ تخفیف اسلحہ کے لیے بذات خود کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق عالمی معیشت کو جس طرح دفاعی ضروریات کے لیے استعمال کیا گیا ہے' اس میں مزید شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی صورت حال ایک نسل پہلے تک موجود نہیں تھی۔

گویا دو نوعیت کے رجحانات کار فرما تھے۔ ایک تو ترقی کی یکساں سطح مفقود تھی' اور عالمی پیداوار کا توازن بحرالکاہل کے علاقے کی طرف جھک رہا تھا۔ دوسرے دفاعی سازو سامان اور مسلح افواج پر ہونے والے اخراجات میں اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ سب ایک نئی افتاد تھی۔ بہرحال' یہ رجحانات ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ ٹیکنالوجی اور صنعتی تبدیلی کی بدولت یہ رجحانات منظر عام پر آئے تھے۔ پھر ان کے پس پردہ سیاسی اور سماجی عوامل بھی کار فرما تھے۔ دونوں ہی باتیں ملک کی معیشت پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ پہلی صورت تو یہ تھی کہ پیداوار اور دولت میں یا تو شدید اضافہ ہو رہا تھا یا کمی واقع ہو رہی تھی اور اس طرح بعض معاشرے خوشحال ہو رہے تھے اور بعض ویسے ہی زبوں حال تھے۔ دوسری صورت ملکی وسائل کے استعمال کی تھی۔ یعنی اس طرح نہ صرف سرمایہ اور خام مال صرف ہو رہا تھا بلکہ سائنس دانوں اور انجینئروں کی خدمات بھی اسی کام کے لیے وقف تھیں' حالانکہ ان صلاحیتوں کو تجارت کے فروغ اور پیداوار

کی برآمدات میں مستعمل ہونا چاہیے تھا۔ اگرچہ یہ دعویٰ کیا جاتا رہا ہے کہ دفاعی اخراجات کے سبب تجارت اور معیشت کو فروغ حاصل ہوتا ہے' لیکن یہاں اس کج بحثی کا کوئی حاصل نہیں کہ اسلحہ پر بے دریغ خرچ سے معیشت زبوں حال ہو جاتی ہے۔ موجودہ دور کے وہ معاشرے جو فوجی لحاظ سے خاصے قد آور ہیں' مختلف مشکلات و مصائب سے نبرد آزما ہیں۔ انھیں جن تجربات کا سامنا ہے' انھیں دیکھ کر فلپ دوم کے عہد کے اسپین' نیکولس دوم کے زمانے کے روس اور ہٹلر کے دور کی جرمنی یاد آ جاتی ہے۔ کسی بڑی یادگاری عمارت کی طرح فوج کا کروفر بھی دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔ لیکن اگر اس کی بنیاد مضبوط نہیں' (یعنی معیشت مستحکم نہ ہو) تو پھر اس کے زمیں بوس ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

اپنی وسعت و اہمیت کے لحاظ سے مذکورہ دونوں رجحانات سماج' معیشت اور سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب کسی ملک میں پیداوار کی شرح گر جاتی ہے تو لوگوں کی ہمت پست ہو جاتی ہے' بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور قومی اخراجات کے سلسلے میں ترجیحی معاملات پر گفتگو ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح نہایت تیز رفتار تکنیکی اور صنعتی ترقی کے بھی خاص نتائج سامنے آتے ہیں' خصوصاً" غیر صنعتی ممالک میں! بڑے پیمانے پر اسلحے کے استعمال کی وجہ سے کسی ملک کی قومی صنعت فروغ تو پا سکتی ہے' لیکن معاشرے کے دوسرے وسائل بھی اسی میں کھپ جاتے ہیں۔ پھر تو صورت یہ ہوتی ہے کہ مذکورہ ملک کاروباری اور تجارتی معاملے میں دیگر ممالک کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ کسی ملک کے دروازے پر دشمن کے موجود نہ ہونے کے باوجود دفاع پر حد سے زیادہ خرچ نے اس صدی میں "بندوق اور مکھن" کے درمیان تنازعہ کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اور اسی لحاظ سے اس نے مستحکم معیشت اور دفاعی قوت کے درمیان ہم آہنگی کے موضوع پر بحث و مباحثہ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

آج فوجی و سیاسی ماحول میں زندگی گزرنے کا رجحان جس طرح حکومتی تسلط سے آزاد معیشت میں زندہ رہنے کے جذبے سے متصادم ہو رہا ہے' وہ تاریخ کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ دفاعی تحفظ کی کوششیں جاری ہیں' اسلحے کے جدید نظام میں نہایت زوروں پر سرمایہ کاری کی جا رہی ہے اور قومی سرمائے کو مسلح افواج پر بے دریغ خرچ کیا جا رہا ہے تو دوسری جانب معیشت کو تحفظ دینے کی جدوجہد بھی کی جا رہی ہے تاکہ ملک خوشحال ہو۔ اور اس امر کا دارو مدار پیداوار کے فروغ اور اندرون ملک اور بیرون ملک طلب میں اضافے پر ہے۔ یہ ساری خصوصیات دفاعی سازو سامان پر بے انتہا اخراجات کے باعث کالعدم ہو جائیں گی۔ یہ بھی واضح رہے کہ فوج کو بہت زیادہ وسعت دینے سے اقتصادی ترقی کی شرح میں کمی واقع ہو جائے گی اور مجموعی عالمی پیداوار میں ملک کا حصہ گھٹ کر رہ جائے گا۔ اس کے نتیجے میں دولت اور طاقت دونوں لحاظ سے ملک کم تر درجے پر ہوگا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قلیل المیعاد تحفظ میں ایک توازن قائم ہو اور اسے افواج کی حمایت حاصل رہے۔

بیسویں صدی کے اواخر میں ان متضاد مقاصد میں اور بھی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متعدد متبادل نمونوں کی موجودگی کے متعلق خاصا چرچا کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو نہایت کامیاب قسم کے تجارتی ممالک ایشیا میں موجود ہیں' مثلاً" جاپان اور ہانگ کانگ۔ اسی طرح سوئٹزر لینڈ'

سویڈن اور آسٹریا بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ تمام ممالک ۱۹۴۵ء سے عالمی پیداوار کی بے مثال ترقی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور تجارت میں ایک دوسرے کے شریک کار بھی رہے ہیں۔ ان سب کی خارجہ پالیسی یہ رہی ہے کہ دیگر ممالک کے ساتھ خوشگوار تجارتی تعلقات قائم ہوں۔ ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مذکورہ ممالک نے اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کر کے اسے اپنے ملک کے دفاع تک محدود رکھا۔ چنانچہ اس رجحان کی وجہ سے تمام وسائل ملکی ضروریات میں کام آنے لگے اور سرمایہ کاری قومی فلاح و بہبود کے منصوبوں کے لیے مختص ہو گئی۔ دوسری جانب ایسے ممالک ہیں جہاں کی معیشت عسکری نظام کے زیر اثر ہے۔ ان میں ویت نام' ایران اور عراق شامل ہیں جو اپنی طویل جنگوں میں الجھے رہتے ہیں۔ اسرائیل اور اسکے حسد پڑوسی ممالک ہیں۔ پھر بذات خود روس ہے۔ یہ سب اپنی مجموعی قومی پیداوار کا دس فی صد (اور کبھی تو اس سے بھی زیادہ) حصہ ہر سال دفاعی اخراجات پر لگا دیتے ہیں۔ چونکہ ان تمام ممالک کو یہ یقین ہے کہ اس نوع کا فوجی تحفظ کے لیے ضروری ہے' لہٰذا قومی وسائل کا رخ پیداواری کاموں سے موڑ کر اسلحے کی جانب لگا دیتے ہیں اور اس طرح خمیازہ بھگتتے ہیں۔ دو قطبین کے درمیان جو تجارتی اور جنگجو فطرت کے ممالک واقع ہیں' ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے ہیں جو دنیا کو ایک محفوظ مقام نہیں سمجھتے' لہٰذا جاپان کی طرح دفاعی اخراجات کم کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ' دفاع کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے معیشت اور سماجی زندگی جس طرح متاثر ہو رہی ہے' اسے بھی یہ ملک پسند نہیں کرتے۔ وہ اس امر سے بھی واقف ہیں کہ قلیل المیعاد فوجی تحفظ اور طویل المیعاد اقتصادی تحفظ کے درمیان بعض تجارتی رکاوٹیں بھی ہیں۔ جاپان کے بالکل متضاد ایسے ممالک بھی ہیں جن کی سمندر پار ممالک میں فوجی نوعیت کی ذمہ داریاں ہیں اور ان سے فرار بھی ممکن نہیں۔ وہ بے شمار گمبھیر مسائل میں مبتلا ہیں۔ علاوہ ازیں' دنیا کے کئی بڑے بڑے ممالک کے منصوبہ ساز اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انھیں اسلحے کی روز افزوں قیمت میں توازن پیدا کرنا ہوگا تاکہ پیداواری عمل میں سرمایہ کاری ممکن ہو اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری ہوں۔ (خصوصاً" جب ان کی آبادی میں افزائش ہو رہی ہو)۔ ایسی صورت حال میں یہ خاصا مشکل ہو جاتا ہے کہ خرچ کے معاملے میں کس ضرورت کو دوسری پر ترجیح دی جائے۔

زیادہ تر ممالک کے سربراہوں کو اکیسویں صدی کے حوالے سے یہ تین کارنامے انجام دینے ہیں: اول' قومی مفادات کے تحفظ کے لیے فوج کی خدمات۔ دوم' شہریوں کی سماجی و معیشتی ضرورتوں کی تکمیل۔ سوم' مسلسل ترقی کے عمل کی ضمانت! آخرالذکر کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ موجودہ وقت میں "بندوق اور مکھن" کی فراہمی ضروری ہے اور مستقبل میں اقتصادی زبوں حالی کو روکنے اور لوگوں کے عدم تحفظ کے امکانات کا ازالہ بھی لازمی ہے۔ تاہم' ان تینوں کارناموں کی انجام دہی آسان نہیں! اس کی ایک وجہ تو آئے دن کی تکنیکی اور کاروباری تبدیلی ہے' دوسرے بین الاقوامی سیاست کی غیر متوقع الٹ پھیر! اگر مذکورہ تینوں کارناموں میں دو یا پھر کوئی ایک مکمل کر لیا جاتا ہے' مگر تیسرا ادھورا رہ جاتا ہے تو آگے چل کر اس کے مضر اثرات رونما ہوں گے۔ پھر ان سست رفتار ممالک جیسی حالت ہو گی جو عالمی طاقت سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکے۔ جیسا کہ ایک ماہر معاشیات نے نہایت سنجیدہ انداز میں کہا ہے: "اس حقیقت کا تصور

مشکل ہے۔ تاہم اگر کسی ملک کی پیداواری شرح دوسرے ممالک کے مقابلے میں ایک فی صد سے بھی کم رہتی ہے اور یہ صورت حال پوری ایک صدی تک برقرار رہتی ہے تو وہ انگلستان کی طرح ممتاز صنعتی ملک کے درجے سے گر کر ادنیٰ سطح کا ایک اقتصادی ملک بن جائے گا' جیسا کہ وہ آج ہے۔"

دنیا کی رہنمائی کرنے والے ممالک کس طرح اس فرض کو انجام دیتے ہیں' اسی موضوع کو زیر نظر باب میں مفصل بیان کیا جا رہا ہے۔ چونکہ دفاعی اخراجات اور فوجی تحفظ' سماجی اور اشیائے صرف کی ضرورت اور ترقیاتی کاموں کی سرمایہ کاری میں وسائل کا استعمال ترجیحی بنیادوں پر ہوتا ہے' لٰہذا اس بحران کا کوئی مناسب حل ممکن نہیں! بہتر یہی ہے کہ مذکورہ تینوں مقاصد کو آپس میں مربوط و ہم آہنگ رکھا جائے۔ لیکن اس میں توازن قائم رکھنے کے لیے ملکی حالات کو خاصا دخل ہو گا نہ کہ نظریے کو! ایک ایسا ملک جسے جارحیت پسند پڑوسیوں سے واسطہ ہو' وہ دفاعی قوت کو بہتر بنانے کے متعلق سوچے گا۔ لیکن جس ملک کے شہریوں کو کوئی خوف لاحق نہیں' وہ اس ضمن میں دفاعی اقدام نہیں کریں گے۔ اگر کوئی ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے تو وہ لوگوں کو "بندوق اور مکھن" جیسی دونوں چیزیں بہ آسانی فراہم کر سکتا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ دوسروں کی طرح امتیازی مقام حاصل کرنے کے لیے اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں معروف ہے تو جنگ کے موقع پر اس کی ترجیحات بھی مختلف ہوں گی۔ جغرافیہ' سیاست اور کلچر' تینوں اس بات کے شاہد ہیں کہ ہر ملک کے معاملات حل ہونے کے طریقے یکساں نہیں ہوا کرتے۔ تاہم' یہ بات اپنی جگہ برقرار ہے کہ جب تک دفاع' اخراجات اور سرمایہ کاری میں توازن قائم نہیں ہوتا' اس وقت تک بڑی طاقت اپنا انفرادی مقام بحال نہیں رکھ سکتی۔

چین کے متوازن اقدامات

اسلحے کے نظام کو جدید بنانے' عوام کی سماجی ضروریات پوری کرنے اور تمام دستیاب شدہ وسائل کو غیر عسکری پیداواری کاموں میں صرف کرنے کا رجحان جس شدت سے عوامی جمہوریہ چین میں پایا جاتا ہے' وہ کہیں بھی نہیں ہے! حالانکہ یہ ملک دیگر بڑی طاقتوں کے مقابلے میں کم تر درجے کا ہے اور فوجی لحاظ سے اتنا توانا بھی نہیں! اگرچہ چین کو بعض گمبھیر مشکلات کا سامنا ہے' تاہم اس کی موجودہ قیادت ایسی حکمت عملی وضع کر رہی ہے جو مستحکم مربوط اور دور رس ہے اور ماسکو' واشنگٹن اور ٹوکیو سے قطعاً" مختلف ہے۔ یہاں مغربی یورپ کا ذکر ہی کیا؟ چونکہ چین میں مادی اشیاء کا خاصا بحران ہے' لٰہذا اس کی کمی معیشت کی وسعت اور فروغ سے پوری کی جاتی ہے۔ اور اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو امید کی جاتی ہے کہ چند عشروں میں اس ملک کی قسمت بدل جائے گی۔

اس ملک کی کمزوریاں مشہور زمانہ ہیں' لٰہذا چند ایک کا یہاں اجمالاً" ذکر مناسب رہے گا۔ سفارت کاری اور عسکری لحاظ سے بیجنگ نے خود کو تنہا اور محصور تصور کیا ہے۔ اگر اس کی ایک وجہ اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ ماؤ کا طرز عمل رہا ہے تو دوسرا سبب ایشیا کے دیگر ممالک کی دشمنی بھی ہے۔ ماضی میں جاپان نے جو ظلم و تشدد کیے تھے' ان کی تلخ یادیں اہل چین کے ذہن سے ہنوز نہیں نکلی ہیں۔ چنانچہ حالیہ

برسوں میں اہل جاپان نے جس برق رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں' اس سے بیجنگ کے سیاست دانوں میں تشویش اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں واشنگٹن کے ساتھ تعلقات بحال ہو جانے کے باوجود ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بھی شک بھری نظروں سے دیکھا جاتا ہے' خصوصاً" ری پبلک حکومت کے دور میں! اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی حکومت روس کے خلاف ایک زبردست بلاک بنانے میں سرگرم عمل تھی' تائیوان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیے ہوئے تھی' تیسری دنیا کے ممالک کے خلاف اقدام کرنے کو تیار رہتی اور بیجنگ کی حمایت میں ہونے والی انقلابی تحریکوں کی مزاحمت کیا کرتی۔ تائیوان اور دیگر چھوٹے چھوٹے جزائر کا مستقبل ایک خار دار مسئلے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ عوامی جمہوریہ چین کے تعلقات پہلے خوشگوار تھے' لیکن اب ہر دو کے پاکستان اور روس کے ساتھ روابط بڑھ جانے کی وجہ سے خاصے پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ماسکو نے چین کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی ہے اس کے باوجود آخرالذکر روس کو اپنے لیے بیرونی خطرہ تصور کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ روس نے چین سے ملحقہ اپنی سرحدوں پر کثیر تعداد میں فوج متعین کر دی ہے اور لڑاکا طیارے بھی کھڑے کر دیئے ہیں' بلکہ افغانستان پر روسی حملے اور اپنے زیر حمایتی جنوبی ویت نام میں فوجیوں کی توسیع بھی اس کے اسباب ہیں۔ رواں صدی کی ابتدا میں جو کیفیت جرمنی کی تھی' بعینہ چین کی بھی ہے۔ یہ ملک خود کو زیادہ محصور سمجھتا ہے' اس کے باوجود خود کو دنیا میں ایک طاقتور ملک کا درجہ دلوانے کے لیے کوشاں بھی ہے۔

بہرحال یہ ہمہ رنگ سفارتی فرائض ایک ایسے ملک کو انجام دینے ہیں جو اپنے دشمنوں کے مقابلے میں عسکری اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط بھی نہیں! عددی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو چینی فوج وسعت میں اپنا جواب نہیں رکھتی' لیکن جدید اسلحے سے پوری طرح لیس بھی نہیں ہے۔ چین کے پاس زیادہ تر ٹینک' بندوق' طیارہ اور جنگی جہاز روسی ساخت کے ہیں یا مغربی ماڈل کے۔ یہ سب بہت پہلے اس ملک کو ملے تھے اور موجودہ طرز کے اسلحہ سے کم تر درجے کے ہیں۔ زرمبادلہ کی کمی اور دوسرے ممالک پر زیادہ انحصار نہ کرنے کے رجحانات سے بیرونی اسلحے کی خریداری خاصی کم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں' چینی رہنماؤں کو اس بات نے زیادہ فکر مند کر دیا ہے کہ چینی افواج عسکری صلاحیت کے اعتبار سے کمزور ہیں اور اس کی تمام تر وجہ ماؤ کا فوجی پیشے سے انحراف اور کسانوں کی ملیشیا پر انحصار تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۹ء میں جب ویت نام کے ساتھ سرحد کے معاملے میں جنگ برپا ہوئی تو یہ "ماؤ پائی حل" کچھ کام نہ آیا۔ بلکہ ویت نامیوں کی سخت اور تجربہ کار فوج نے ۲۶ ہزار چینی سپاہیوں کو ہلاک اور ۳۷ ہزار کو زخمی کر ڈالا۔ اقتصادی لحاظ سے بھی چین ہنوز بہت پیچھے ہے۔ وہاں مجموعی قومی پیداوار میں فی کس آمدنی مشکل سے ۵۰۰ ڈالر ہو گی جبکہ ترقی یافتہ اور سرمایہ دار ممالک میں یہ تیرہ ہزار ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ روس میں بھی یہ شرح ۵ ہزار ڈالر سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ آج چین کی آبادی ایک بلین سے زیادہ نفوس پر مشتمل ہے جو اضافے کی موجودہ شرح کی بنیاد پر ۲۰۰۰ء میں ۱۲ء۱ بلین یا ۱ء۳ بلین ہو جائے گی۔ لٰہذا ایسی صورت میں فی کس آمدنی میں کسی بہت غیر متوقع اضافے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حتیٰ کہ اگلی صدی میں چینی عوام دیگر ترقی یافتہ اور مستحکم ممالک کے باشندوں کے مقابلے میں اوسطاً" غریب رہیں گے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اتنی وسیع آبادی والے ملک کا

انتظام و انصرام' پارٹی' فوج' نوکر شاہی اور کسان کے متنوع طبقوں کے درمیان مفاہمت اور سماجی قدروں اور نظریاتی اصولوں کو مجروح کیے بغیر پیداوار میں اضافہ ------ یہ وہ اسباب و عوامل ہیں جو لچک دار اور ذہین قیادت کے لیے بھی آزمائش کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ چین کی گزشتہ ایک صدی کی تاریخ نے کبھی بھی یہ مثال پیش نہیں کی کہ یہاں طویل المیعاد ترقیاتی عمل کی حوصلہ افزائی کی گئی ہو۔

تاہم' چین میں گزشتہ چھ سے آٹھ برسوں کے دوران جو اصلاحات اور ترقی روبہ عمل آئی ہے' وہ شاندار ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈنگ ژیاؤپنگ کی قیادت کا یہ زمانہ ایک دن اسی طرح دیکھا جائے گا جس طرح مورخوں نے کولبرٹ کے فرانس کو' فریڈرک اعظم کے ابتدائی زمانے کو اور میجی کی اصلاحات کے بعد کے جاپان کو دیکھا تھا۔ چین اپنے تمام موثر ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ترقی کی طرف گامزن ہے۔ وہ صنعت و حرفت کی حوصلہ افزائی کرنے' ترغیب و تحریص دینے اور ضروری تبدیلی لانے کے لیے پوری طرح کوشاں ہے تاکہ جہاں تک جلد ممکن ہو' قومی ترقی کے مقاصد پورے ہوں۔ اس طرح کی حکمت عملی وضع کرنے کا مقصد یہ دیکھنا بھی ہے کہ حکومت کے مختلف اور جدا جدا منصوبے ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط ہیں۔ چنانچہ اس طرح توازن برقرار رہتا ہے اور عمل کی رفتار کا صحیح جائزہ ممکن ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قومی وسائل قلیل المیعاد ضرورتوں کے برعکس طویل المیعاد منصوبوں پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ نیز' ملک کی اندرونی اور بیرونی ضرورتوں میں ایک طرح کی ہم آہنگی بھی ہے۔ اور آخر میں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ تبدیل شدہ مارکسی نظام کے حامل اس ملک میں نظریہ اور عمل میں کس طرح موافقت پیدا کی جائے۔ اگرچہ مشکلات پیش آ رہی ہیں اور مستقبل میں اور بھی آئیں گی' لیکن اس ملک کی کارکردگی کا ریکارڈ اب تک خاصا موثر رہا ہے۔

یہ کارکردگی اب مختلف صورتوں میں نمایاں ہو رہی ہے۔ مثلاً" ۱۹۶۰ء کے عشرے میں جو انقلابی تبدیلی عمل میں آئی تھی اس کے نتیجے میں چین کی مسلح افواج خود کو نئے سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ "پیپلز لبریشن آرمی" جس میں بحری اور ہوائی فوج شامل ہے' سے وابستہ سپاہیوں کی تعداد اب ۴.۲ ملین سے گھٹا کر ۳ ملین کر دی گئی ہے۔ اس طرح طاقت کا صحیح توازن پیدا ہو گا' اس لیے کہ ان میں زیادہ تر امدادی دستے شامل تھے جو ریلوے اور دیگر سول کاموں میں استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ اب مسلح افواج میں شامل افراد یقیناً" اعلیٰ استعداد کے حامل ہوں گے۔ اب ان کے پاس نئی نئی وردیاں ہوں گی۔ وہ فوجی عہدے (رینک) جو ماؤ نے ختم کر دیے تھے اب دوبارہ بحال کر دیے گئے ہیں۔ اب بڑی تعداد میں والنٹیئر فوج میں بھرتی کیے جائیں گے اور ایسے لوگوں کو منتخب کیا جائے گا جو اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہوں گے۔ فوجی چھاؤنیوں میں نئے سرے سے تنظیم کی جا رہی ہے اور اسٹاف کو خاصی فوقیت دی جانے لگی ہے۔ فوجی اکیڈمیاں منظم کی گئی ہیں جہاں افسروں کو تربیت دی جاتی ہے۔ ماؤ کے زمانے میں یہ ساری کی ساری نظرانداز کر دی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلحے کو جدید خطوط پر ڈھالنے کا منصوبہ بھی زیر عمل ہے۔ چین کی بحریہ میں نئے نئے تباہ کن جہاز' ہراول کشتیاں' تیزی سے مار کرنے والے لڑاکا طیارے اور دور مار میزائل وغیرہ شامل کیے گئے ہیں۔ اس نے مروجہ قسم کی کئی آبدوزیں بھی تیار کر لی ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں اس قسم کی ۱۰۷ آبدوزیں

تھیں۔ اس طرح عالمی سطح پر چین کو اس شعبے میں تیسرا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ اب اس کے ٹینکوں میں بھی ایک ٹینک تعین کرنے والے لیزر بھی نصب کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بحری جہاز اب ہر موسم میں استعمال کے قابل ہیں۔ پھر جدید قسم کے راڈار بھی وہاں موجود ہیں۔ اب چین میں عسکری تعلیم کے لیے خاصا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال ۱۹۸۷ء کی ایک جنگ آزمائی سے ملتی ہے جب جنگی فوج کی پشت پناہی طیارے کر رہے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں ویت نام کے ساتھ ہونے والی جنگ میں ایسی صورت نہ تھی۔ علاوہ ازیں روس کے ساتھ ملنے والی طویل سرحدوں پر دشمن کے حملے کے توڑ کے لیے نئی نئی حکمت عملی بھی وضع کی گئی ہے۔ چین کی بحریہ بھی بیڑے بنانے پر تجربے کر رہی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں آٹھ جنگی جہازوں پر مشتمل ایک "ٹاسک فورس" نے جنوبی بحرالکاہل میں آٹھ ہزار میل بحری فاصلہ طے کرنے کا مشن پورا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چین نے بین البراعظمی بلاسٹک میزائل کا تجربہ بھی کیا تھا۔ (یہ سب دیکھ کر تعجب سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ پندرھویں صدی کے اوائل میں چنگ ہونے جو بحری گشت کا بندوبست کیا تھا' اس کے بعد کیا چین کی بحری طاقت کا یہ پہلا مظاہرہ تھا؟)

فوجی لحاظ سے چین کے بڑی طاقت ہونے کے سلسلے میں نمایاں پہلو نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں اس کی پیش رفت بھی ہے۔ اگرچہ چین میں پہلا ایٹمی تجربہ ماؤ کے زمانے میں کیا گیا تھا' تاہم اس نے کھلے عام ایٹمی ہتھیاروں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا اور اس کے برعکس عوامی طاقت کو اہمیت دی تھی۔ ماؤ کے مقابلے میں ڈنگ اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ جہاں تک جلد ہو سکے' چین کو جدید عسکری صلاحیت کے حامل ممالک کی صف میں کھڑا کر دے۔ چین نے ۱۹۸۰ء ہی میں آئی سی بی ایم کا تجربہ کیا تھا جس کے مار کرنے کا فاصلہ سات ہزار بحری میل تھا۔ اس کی زد میں نہ صرف پورا روس تھا' بلکہ امریکہ کے بعض علاقے بھی آتے تھے۔ اس کے ایک سال بعد چین کے ایک راکٹ نے خلا میں تین سیٹلائٹ روانہ کیے تھے۔ یہ دراصل متعدد وار ہیڈ سے لیس راکٹ کی تکنیک کا عملی مظاہرہ تھا۔ چین کی زیادہ تر نیوکلیئر طاقتیں زمینی سطح اور درمیانی فاصلے کے ہیں۔ اب ان میں آئی سی بی ایم کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ میزائل بردار سب میرینیں بھی تیار کی جا چکی ہیں۔ چین میں ۱۹۸۲ء سے سب میرین میں نصب شدہ بلاسٹک میزائل کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے دور تک مار کرنے اور نشانہ لگانے کی صلاحیت کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس بات کی بھی رپورٹس ملی ہیں کہ چین نے تکنیکی قسم کے ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وسیع پیمانے پر ایٹمی تحقیق بھی کی جا رہی ہے۔ تخفیف اسلحہ کا جو بین الاقوامی معاہدہ ہوا ہے' اس کو یہ کہہ کر چین نے ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ اس سے صرف بڑی طاقتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ چین اپنے ایٹمی ہتھیاروں کو "منجمد" کرنے پر راضی نہیں!

چین کی ان فوجی اور تکنیکی صلاحیتوں کے باوجود کچھ کمزوریاں بھی ہیں جن کی نشاندہی کوئی مشکل نہیں۔ کسی ہتھیار کی تیاری' اس کی دیکھ بھال' اس کی جانچ پڑتال' اس کا تجربہ------ یہ سارے مراحل جب پورے ہو جاتے ہیں تو فوجیوں کے درمیان اس اسلحے کی کھیپ پہنچائی جاتی ہے۔ اس کاروائی میں خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ پھر یہ صورت حال ایسے ملک کی ہے جس کے پاس نہ کثیر سرمایہ ہے نہ ہی سائنسی وسائل میسر ہیں۔ نیز ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے میں ناکامیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے'

مثلاً "چینی آبدوزوں کا دھماکا" یا میزائل کی ترسیل! ہتھیاروں کے پروگرام کی شروعات میں تاخیر! دھات کی تکنیک کے استعمال میں مہارت کا فقدان! اعلیٰ درجے کے جیٹ انجن' راڈار' جہاز سازی اور مواصلات کے ضروری سازو سامان کی بے پناہ کمی!۔ یہ وہ مسائل ہیں جو چین کے فوجی لحاظ سے سوویت یونین اور امریکہ کے ہم پلہ بننے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ چین کی بحریہ نے اگرچہ بحرالکاہل میں اچھے خاصے تجربے کیے ہیں' لیکن یہ کھلے سمندروں میں جہاز رانی کے قابل نہیں! اس ملک کی میزائل بردار آبدوزیں "دونوں بڑی طاقتوں" کی سب میرینوں سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ مذکورہ ممالک "اوہیو" اور "الفا" جیسی ساخت کی شاندار آبدوزوں کی تیاری میں رقم پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ پہلے کی بنی ہوئی کسی سب میرین کے مقابلے میں یہ دونوں آبدوزیں سمندر کی تہہ میں دور تک اتر جائیں گی اور نہایت برق رفتاری سے آگے بڑھیں گی۔ آخر میں یہ بات دہرائی جائے گی کہ ان تمام امور میں مالیات کو اچھا خاصا دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ جب تک چین دفاع کے مد میں بڑی طاقتوں کے اخراجات کا آٹھواں حصہ خرچ کرتا رہے گا تو وہ کسی بھی طرح ان کا ہم پلہ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا چین نہ تو ہر نوع کا اسلحہ حاصل کرنے کی سکت رکھتا ہے نہ ہی ہر خطرے کے مقابلے کی تیاری کر سکتا ہے۔

تاہم چین کی موجودہ صلاحیت حد درجہ اثر انگیز ہے جو اس سے قبل نہیں دیکھی گئی تھی۔ وہاں کی "پیپلز لیبریشن آرمی" کی اس طرح تربیت سازی کی گئی ہے اور اسے اعلیٰ سطح پر منظم کیا گیا ہے اور یوں سازو سامان سے لیس کیا گیا ہے کہ وہ دو عشرے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور موثر انداز میں ویت نام' تائیوان اور ہندوستان جیسے اپنے دشمن ممالک کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کا فوجی توازن بھی سوویت یونین کے مقابلے میں بے ڈول نہیں ہو پائے گا۔ اگر مستقبل میں ایشیا کے کسی تنازع کے حوالے سے چین اور روس میں جنگ چھڑ جاتی ہے تو ماسکو اول الذکر پر ایٹمی حملہ کرنے سے گریزاں رہے گا اس کی وجہ سیاسی ہی نہیں ہوگی' بلکہ عالمی رد عمل بھی سامنے آئے گا اور امریکہ کی غیر متوقع مداخلت کا اندیشہ بھی رہے گا۔ اور اگر چین کو پوری طرح ایٹمی طاقت حاصل ہو جاتی ہے تو اس بات کی کم ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ روسی افواج چین کے زمینی اور سمندری میزائل سسٹم کو تباہ کر دیں۔ اور اگر رسمی قسم کی لڑائی ہوتی ہے تو روس کا وہی گوگو کا عالم ہوگا۔ علاوہ ازیں' یہ حقیقت کہ روس جنگ کے امکانات کو نہایت سنجیدگی سے محسوس کرتا ہے' اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنی فوج کے پچاس ڈویژن (ان میں چھ۔ سات ٹینک ڈویژن بھی شامل ہیں) یورال کے مشرقی علاقے میں تعینات کر دیے ہیں اور اور یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ روسی فوج چین کی اس ستر ڈویژن فوج کا مقابلہ کر لے گی جو سرحدوں پر تعینات ہے' پھر بھی فاتحانہ حملہ کا امکان نہیں!۔۔۔۔۔۔ خصوصاً" ایسی صورت میں جب چین عارضی طور پر تجارتی معاہدہ کر لیتا ہے' اور اس طرح روس کے فوجی اثرات کو کمزور بنا دیتا ہے۔ بہت سے مبصروں کا خیال ہے کہ اب وسطی ایشیا میں "برابر برابر کا معاملہ" اور "طاقت کا توازن" پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور اگر یہ حقیقت ہے تو ایسی حکمت عملی کی صدائے بازگشت منگولیا سے بھی آگے تک سنائی دے گی۔

چین کی طویل المیعاد فوجی طاقت کا راز کچھ اور بھی ہے' یعنی اس کی روز افزوں معیشت! گزشتہ چند عشروں کے دوران چین نے اقتصادی طور پر بہت ترقی کی ہے اور یہ سلسلہ مستقبل میں جاری رہتا

نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں' کیمونسٹ حکومت کے قیام سے قبل چین باقاعدہ ایک صنعتی ملک تھا۔ اس وسیع و عریض ملک کی آبادی کا زیادہ حصہ زراعت پیشہ تھا۔ پھر جنگ اور خانہ جنگی کا سلسلہ بھی چلتا رہتا۔ جب وہاں مارکسی نظام قائم ہوا اور امن و امان کی فضا بحال ہوئی تو پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا۔ حکومت بھی زرعی اور صنعتی پیداوار کی حوصلہ افزائی کرنے لگی۔ البتہ ماؤ کے زمانے میں یہ طریقہ کار عجیب و غریب اور غیر بار آور ہوا کرتا تھا۔ ۳۔۱۹۸۲ء میں ایک مبصر نے لکھا تھا: "چین میں ۱۹۵۲ء سے صنعت اور زراعت کی سالانہ پیداواری شرح بالترتیب ۱۰ فی صد اور ۳ فی صد رہی ہے۔ اسی طرح مجموعی قومی پیداوار بھی سالانہ ۵ سے ٦ فی صد تک رہی ہے۔" اگرچہ یہ اعداد و شمار سنگاپور اور تائیوان جیسے برآمد کار ممالک کے پاسنگ بھی نہیں ہیں' تاہم چین جیسے وسیع رقبے اور کثیر آبادی والے ملک کے لیے یہ اعداد و شمار بے مایہ بھی نہیں! کیونکہ ان سے اس کی کچھ بہتر اقتصادی حالت کا اندازہ بھی تو ہو جاتا ہے۔ نیز ایک جائزے کے مطابق' ۱۹۷۰ء کے عشرے کے آخر میں چین کی صنعت ۱۹۲۱ء میں روس اور جاپان کی صنعت سے کہیں بہتر تھی۔ یہاں پھر یہ بات دہرائی جائے گی کہ یہ پیداواری شرح ۹۔۱۹۵۸ء کے دور کی ہے جب چین میں آگے کی سمت جست لگانے کی تحریک چل رہی تھی۔ انہی دنوں روس سے ناچاقی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے میں سوویت یونین نے اپنے فنڈز' سائنس دان حتیٰ کہ بلیو پرنٹ بھی واپس لے لیے تھے۔ اسی زمانے میں "ثقافتی انقلاب" کا دھماکہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں صنعتی پروگرام ٹھپ ہو گیا تھا اور تعلیمی و سائنسی نظام پوری ایک نسل تک ابتر رہا۔۔۔۔۔۔ اگر یہ سب واقعات رونما نہ ہوتے تو چین کی پیداواری شرح بہت زیادہ ہوتی۔ اس بات کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ ڈنگ کی زیر قیادت گزشتہ پانچ برسوں میں زراعت میں ۸ فی صد اور صنعت میں ۱۲ فی صد اضافہ ہوا تھا۔ چین کا زرعی شعبہ سود مند بھی ہے اور ناقص بھی! مشرقی ایشیا کے اصول کے مطابق وہاں چاول کی کاشت کھڑے پانیوں میں ہوتی ہے۔ اس طرح فی ایکڑ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ کار خاصا محنت طلب ہے۔ اس وسیع ملک میں بڑے پیمانے پر اور میکینکی انداز میں زراعت نہیں ہوتی۔ چین کی مجموعی قومی پیداوار میں زراعت کا حصہ ۳۰ فی صد سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس پیشے سے وہاں کی ۷۰ فی صد آبادی وابستہ ہے۔ اگر کسی ناگہانی آفت کے باعث زراعت کے شعبے میں کوئی سقم واقع ہو جائے یا کام کی رفتار سست ہو جائے تو ملک کی پوری معیشت ڈانواں ڈول ہو جائے گی۔ اس طرح کی صورت حال پہلے روس میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ بہرحال' زراعت چین کے لیے ایک چیلنج ہے اور آبادی کے "ٹائم بم" نے اسے اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ چین اپنے ۲۵۰ ملین ایکڑ قابل کاشت رقبے کے بل بوتے پر ایک بلین آبادی کو کھانا کھلا رہا ہے۔ (اس کے مقابلے میں امریکہ ۴۰۰ ملین ایکڑ قابل کاشت رقبے کے سہارے ۲۳۰ ملین باشندوں کو غذا فراہم کر رہا ہے۔) کیا چین کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ ۲۰۰۰ء میں وہ ۲۰۰ ملین کی اضافی آبادی کو روزی مہیا کر سکے جبکہ وہ غلہ بھی درآمد نہیں کر سکتا کہ اس میں ادائیگی کا توازن اور زر مبادلہ کا مسئلہ حائل ہوتا ہے؟ اس سوال کا واضح جواب دینا مشکل ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ گزشتہ تین عشروں کے دوران چین میں غلہ برآمد کرنے کا قدیم سلسلہ تقریباً" بند ہو چکا ہے۔ اور ۱۹۸۰ء سے تو وہ محض درآمد کنندہ بنا رہا ہے۔ دوسری جانب وہاں کی حکومت

ہندوستان کے "سبز انقلاب" کے نمونے کے مطابق زرعی کامیابی کے لیے جملہ سائنسی وسائل بروئے کار لا رہی ہے۔ ڈنگ نے بھی منڈی کی قدیم روایت میں اصلاحات نافذ کی ہیں۔ زرعی سامان کی قیمت خرید میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ان سب اقدامات کی وجہ سے گزشتہ نصف عشرے میں غذائی پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۳ء کے دوران عام طور پر تمام دنیا میں کساد بازاری رہی' لیکن چین کے ۸۰۰ ملین دیہی عوام نے اپنی آمدنی میں ۷۰ فی صد اضافہ کر لیا تھا۔ ان کی کارکردگی برازیل اور ملائیشیا کے باشندوں کی طرح نہایت اعلیٰ تھی۔ اہل چین نے ۱۹۸۵ء میں ۱۰۰ ملین ٹن زیادہ غلہ پیدا کیا۔ یہ صورت حال ایک عشرہ پہلے بالکل نہ تھی۔ ترقی کی یہ شرح نہایت شاندار تھی۔ چونکہ وہاں کی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے لہٰذا عوام معارف کو پورے کرنے کے لیے ہمہ تن مشغول بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن اس سے زراعت پر خاصا دباؤ پڑے گا۔ اور فی ایکڑ پیداوار اپنی جگہ محدود رہے گی۔ پھر کھاد کے بے دریغ استعمال سے زمین کی قوت نمو کم ہو جائے گی۔ تاہم چین نے اس معاملے کو بحسن و خوبی حل کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔

صنعت سازی میں چین نے جو پیش رفت کی ہے وہ مستقبل کے لحاظ سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ تاہم' اندرونی طور پر اس میں کچھ پیچیدگیاں بھی ہیں' مثلاً" صارف کی قوت خرید کی کمی نے اس کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ دوسرے روس اور مشرقی یورپ کے بعض پیچیدہ اور خرچیلے منصوبوں پر کئی سال تک عمل درآمد ہونے کی وجہ سے بھی اسے نقصان پہنچا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں کے دوران جو جمہوری اصلاحات روبہ کار آئی ہیں' ان کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے' مثلاً" ملکی صنعتوں کو کوالٹی' قیمت اور بازار کی ضرورت کو مد نظر رکھنے کے لیے کہا گیا' چھوٹے چھوٹے نجی کارخانوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور بیرونی تجارت کو فروغ دیا گیا۔ اس طرح صنعتی پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا۔ بایں ہمہ' مذکورہ اقدامات کی بنا پر بہت سے مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں' یعنی نجی کاروبار ہزاروں کی تعداد میں شروع ہو گئے۔ اس اقدام سے پارٹی کے انتہا پسند تشویش میں مبتلا ہو گئے اور اشیاء کی قیمت بڑھ جانے سے دیہی کارکنوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اس لیے کہ کسانوں اور کاروباری طبقے کے مقابلے میں ان کی آمدنی میں اتنی تیزی سے اضافہ نہیں ہوا تھا۔ علاوہ ازیں' بیرونی تجارت کے فروغ کے نتیجے میں صنعتی اشیاء کی برآمدات بڑھ تو گئی لیکن تجارتی خسارے کا مسئلہ سوہان روح بن گیا۔ ۱۹۸۶ء میں وہاں کے وزیراعظم ژاہو ژیانگ نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ حالات کسی نہ کسی حد تک قابو سے باہر ہو گئے ہیں' پیداوار کی شرح بھی کم ہو چکی ہے اور مقررہ اہداف پورے نہیں ہو سکے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چین میں اندرونی اور نظریاتی مسائل ہنوز برقرار ہیں۔

تاہم' یہ بات قابل ستائش ہے کہ وہاں پیداواری شرح کو فروغ دینے کے منصوبے بنائے گئے ہیں اور آئندہ ۷.۵ فی صد سالانہ اضافہ کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ دس سال سے کم عرصے میں چین کی مجموعی قومی پیداوار دوگنی ہو جائے گی۔ نیز اقتصادی ماہرین کا خیال ہے کہ کئی اسباب کی بنا پر یہ ہدف پورا ہو جائے گا۔ ایک تو یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد سے چین میں بچت اور سرمایہ کاری کی شرح مجموعی قومی پیداوار سے ۳۰ فی صد زیادہ رہی ہے۔ اگرچہ اس کے نتیجے میں کچھ مسائل بھی پیدا ہوئے' تاہم اس

بات کا تیقن بھی ہوا کہ ملک میں اتنی کثیر رقم موجود ہے جس سے پیداواری کاموں میں سرمایہ کاری کی جا سکے۔ دوسرے' معارف کو کم کرنے کے مواقع بھی موجود ہیں۔ چین دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جہاں توانائی کا بے دریغ استعمال ہوتا رہا ہے' جس کی وجہ سے تیل کے ذخائر میں بے حد کمی واقع ہو گئی لیکن ۱۹۷۸ء کے بعد توانائی کے شعبے میں جو اصلاحات عمل میں آئی ہیں' ان کے نتیجے میں کارخانوں کے معارف میں کمی آ گئی ہے۔ اس طرح یہ بچی ہوئی رقم کسی اور شعبے میں کام آ گئی۔ علاوہ ازیں' چین اب "ثقافتی انقلاب" کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہاں کی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے ایک عشرے سے بھی زیادہ عرصے تک بند رہے یا پھر انھیں کوئی اور کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اب ان کے دوبارہ کھلنے کے بعد' یہ توقع کی جاتی ہے کہ دوسرے ممالک میں جو سائنسی اور تکنیکی تحقیق و ترقی ہوئی ہے' وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انھیں کچھ وقت لگے گا۔ اسی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے' چند سال پہلے یہ کہا گیا تھا:

> کوئی بھی شخص ان ہزاروں سائنس دانوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتا ہے جو ۱۹۷۰ء کی آخری دہائی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور مغرب کے دیگر ممالک گئے تھے۔ ان کا قیام عموماً" سال دو سال کے لیے ہوتا تھا' لیکن کبھی کبھار وہ طویل مدت کے لیے بھی ٹھہر جاتے تھے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۸۵ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۹۰ء تک چین میں ایسے ہزاروں سائنس دان اور تکنیکی ماہرین مہیا ہو جائیں گے جو اپنے اپنے شعبے میں طاق ہوں گے۔ نیز' ہزاروں ایسے افراد جنھوں نے اپنے ملک میں یا بیرون ممالک میں تربیت پائی ہے' تعلیمی اداروں اور کاروباری شعبوں میں ملازم ہو جائیں گے۔ پھر یہ سب لوگ چین کو صنعتی ترقی میں عالمی مقام عطا کرنے کے لیے پروگرام کے مطابق سرگرم عمل ہو جائیں گے۔"

اسی طرح ۱۹۷۸ء کے بعد چین نے بیرونی تاجروں اور سرمایہ کاروں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ چنانچہ انتظامی افسران اور کاروباری افراد کو اس بات کا وافر موقع ملا کہ وہ مغربی حکومتوں اور کمپنیوں کے فراہم کردہ تکنیکی اوزار' پیٹنٹ اور اور پیداواری سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ نتیجتاً" چین کی منڈیوں میں ان مصنوعات کی ریل پیل ہو گئی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بیجنگ کی انتظامیہ نے سمندر پار ممالک کی سطح اور مال پر کچھ پابندی عائد کی ہوئی ہے' پھر بھی اس بات کا امکان ہے کہ درآمدی سامان کو خاص طور پر منتخب کیا جائے گا تاکہ معیشت فروغ پائے۔

چین کی ترقیاتی تگ و دو کا آخری اور امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہاں کے دفاعی اخراجات پر سخت کنٹرول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلح افواج ان ملکی وسائل کو اپنے مصرف میں نہیں لاتیں' جن کی کمی

اور شعبے میں ضرورت ہے۔ ڈنگ ژیاؤپنگ کے خیال میں چین کی جدید کاری کے چار ستونوں میں دفاع چوتھا ستون ہے۔ بقیہ تین زراعت' صنعت اور سائنس ہیں۔ چین کے دفاعی اخراجات کا صحیح تخمینہ بتانا خاصا مشکل ہے۔ اس کی وجہ جائزے کے مختلف طریقے ہیں۔ تاہم' یہ بات واضح ہے کہ وہ گزشتہ پندرہ برسوں میں نیچے ہی کی جانب آتا رہا ہے۔ بعض ذرائع کے مطابق ۱۹۷۱ء میں دفاعی اخراجات کے لیے جو حصہ مختص کیا گیا تھا' وہ ۱۷٫۴ فی صد تھا' لیکن ۱۹۸۵ء میں یہ گھٹ کر صرف ۷٫۵ فی صد رہ گیا تھا۔ اس سے فوج میں یقیناً بے چینی پیدا ہوئی ہو گی۔ پھر اقتصادی ترجیحات اور پالیسیوں کے متعلق بحث و مباحثہ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہو گا۔ اور جب شمالی یا جنوبی سرحدوں پر جھڑپیں شروع ہوئی ہوں گی تو دفاعی اخراجات میں پھر اضافہ ہو گیا ہو گا۔ بہرحال' چین کا یہ عزم صمیم کہ دفاعی اخراجات کی چنداں اہمیت نہیں ہو گی' معیشت کو بھرپور انداز میں فروغ دینے کی غمازی کرتا ہے۔ چین کا یہ رویہ روس اور امریکہ کے بالکل برعکس ہے۔ جہاں اول الذکر "فوجی تحفظ" کی بات کرتا ہے' وہاں آخرالذکر ریگن حکومت کی سرپرستی میں مسلح افواج پر بے دریغ رقم خرچ کر رہا ہے۔ چین کی موجودہ مجموعی قومی پیداوار' قومی بچت اور سرمایہ کاری کی رقم کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض ماہرین نے یہ کہا ہے کہ چین فی الحال دفاع پر جو ۳۰ بلین ڈالر کی رقم خرچ کر رہا ہے' اگر اس میں مزید اضافہ کر دیتا ہے تو چنداں فکر کی بات نہیں! اس کے باوجود وہ ایسا کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس سے چین کا یہ اعتماد ظاہر ہوتا ہے کہ طویل المیعاد تحفظ اسی وقت حاصل ہو گا جب موجودہ پیداوار اور دولت میں کئی گنا اضافہ ہو جائے۔

مختصر یہ کہ ترقی کی یہ رفتار اسی وقت رک سکتی ہے جب سوویت یونین کے ساتھ جنگ چھڑ جائے یا "ثقافتی انقلاب" کی طرح کوئی اور سیاسی بھونچال آ جائے۔ اس میں کلام نہیں کہ چین کو انتظامی' توانائی اور زرعی شعبوں میں نہایت اہم مسائل کا سامنا ہے' لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت حال ہر اس ملک میں پیدا ہوتی ہے جو اپنی پیداوار کو بڑھانے میں کوشاں ہوتا ہے اور پھر کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ "اکونومسٹ" کے حالیہ جائزے کے مطابق اگر چین ۸ فی صد سالانہ کے حساب سے اپنی پیداوار میں اضافے کو برقرار رکھتا ہے تو وہ ۲۰۰۰ء سے پہلے برطانیہ اور اٹلی کی مجموعی قومی پیداوار پر سبقت لے جائے گا۔ اور ۲۰۲۰ء تک تو یہ نوبت آئے گی کہ وہ یورپ کی کسی بھی طاقت سے بڑھا ہوا ہو گا۔

لیکن یہ قیاس کر لینا بہت بڑی غلطی ہو گی کہ اس نوع کی کارگزاری اور اس کے بدلتے ہوئے عوامل حد درجہ فعال ثابت ہوں گے۔ بہرحال' عمومی نکتہ اپنی جگہ قائم ہے' یعنی چین مختصر سی مدت میں اپنی مجموعی قومی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ کر لے گا اور اہم مشکلات پر قابو پا لے گا۔ اور اگرچہ چین فی کس آمدنی کے لحاظ سے "نسبتاً" غریب رہے گا' لیکن وہ آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ امیر کبیر بھی ہو گا۔

چارٹ ۲: چین' ہندوستان اور مغربی یورپ کے بعض ممالک کی مجموعی ترقیاتی پیداوار

☆ ۱۹۸۰ء - ۱۹۸۵ء کے دوران ممکنہ ۷ فی صد پیداوار - بعد ازاں' ۸ فی صد۔

۲ ۱۹۸۰ء - ۱۹۸۵ء کے دوران ممکنہ ۵٫۵ فی صد پیداوار - بعد ازاں ۷ فی صد۔
دیگر ممالک میں اوسط سالانہ شرح ۱۹۷۰ء - ۱۹۸۲ء کے مطابق ہو گی۔
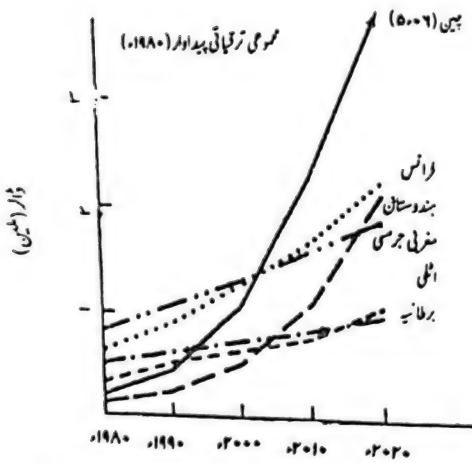
ماخذ = اکونومسٹ / آئی ایم ایف

یہاں چین کے حوالے سے ایسے مزید تین عوامل کا ذکر مقصود ہے جو مستقبل میں عالمی منظر نامے پر اثر انداز ہوں گے۔ اول یہ کہ اگرچہ اس کی اقتصادی ترقی کے نتیجے میں غیر ملکی تجارت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہو گا' لیکن اسے مغربی جرمنی یا جاپان کا مقام دینا ممکن نہیں! براعظم جیسے وسیع ملک چین کی بڑی بڑی منڈیوں' ملک کی کثیر آبادی اور خام مال کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے یہ قرین قیاس نہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے اور "جہازی تجارت" والے ممالک کی طرح سمندر پار کے کاروبار پر انحصار کرے گا۔ اس کے زرعی شعبوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا بے پناہ ہجوم اور درآمدی اشیائے خوردنی پر حکومتی قدغن کے پیش نظر بیرونی تجارت پھلتی پھولتی نظر آئی۔ البتہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ چین کپڑے جیسی سستی صنعت

میں امتیازی مقام حاصل کر لے گا اور اس کے ذریعے وہ مغربی ممالک یا روس سے درآمد شدہ ٹیکنالوجی کی قیمت ادا کر سکے گا لیکن بیجنگ نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ نہ تو غیر ملکی سرمایہ' بیرونی مصنوعات اور بدیسی منڈیوں پر انحصار کرے گا اور نہ ہی کسی ملک یا مال فراہم کرنے والے علاقے کو اپنا سہارا بنائے گا۔ غیر ملکی ٹیکنالوجی آلات اور پیداواری طریقے چین کے توازن ادائیگی کے تحت ہی حاصل کیے جائیں گے۔ ورلڈ بینک یا آئی ایم ایف میں چین کی شمولیت سے مذکورہ باتوں کی تردید نہیں ہوتی۔ نہ ہی مستقبل میں گیٹ یا ایشیائی ترقیاتی بینک کے رکن بن جانے سے کوئی فرق پڑے گا۔ علاوہ ازیں' ان باتوں سے یہ عندیہ قطعاً نہیں ملتا کہ چین "آزاد دنیا" کا رکن بن رہا ہے۔ اس کے اپنے سخت ترین تجربے کے مطابق کسی بڑی طاقت یا نجی بینک سے معاملہ کرنے کے بجائے بیرونی منڈیوں تک رسائی حاصل کرنا طویل المیعاد قرض لینا کہیں بہتر ہے۔ بادی النظر میں ایسے تمام اقدامات چین کے مقام و مرتبے اور اس کی آزادی کی پاسداری کرتے ہیں۔ دوسری بات پہلی سے علیحدہ بھی ہے اور مربوط بھی! وہ یہ کہ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ماؤ کی حکومت سرحدی تنازعہ سے لطف اٹھایا کرتی تھی' لیکن اب بیجنگ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ پرامن تعلقات بحال رکھنا چاہتا ہے' چاہے ان پر شک ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے "امن" ڈنگ کی اقتصادی پالیسی کا مرکزی نقطہ ہے۔ جنگ چاہے علاقائی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو' تمام وسائل کو دفاعی ضروریات کی تکمیل میں صرف کر دے گی۔ اور جیسا کہ حال میں کہا گیا ہے' یہ معاملہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب چین روس کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں سکون محسوس کرتا ہے اس لیے کہ وسطی ایشیا میں اس کی فوجی طاقت نے ایک توازن قائم کر دیا ہے۔ طاقت کے حصول اور اعلیٰ دفاعی صلاحیت کی موجودگی کے باعث اب چین اقتصادی ترقی کی جانب زیادہ توجہ مبذول کرے گا۔

اگرچہ چین امن و سکون کا جویا ہے' پھر بھی وہ ہر صورت میں اپنی آزادی برقرار رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ جب بھی دونوں سپرپاورز میں سے کوئی کسی بیرونی ملک میں فوجی مداخلت کرتی ہے تو یہ ملک اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ جاپان کو بھی اہل چین تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ درآمد برآمد کا سلسلہ متروک کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں' ٹوکیو کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ سائبیریا کے ترقیاتی کاموں میں حد سے زیادہ دخل اندازی نہ کرے۔ اسی طرح واشنگٹن اور ماسکو پر چین کی گہری نظر ہے اور تنقید کرنے سے بھی وہ نہیں چوکتا۔ سوویت یونین چین کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا خواہاں ہے اور اسی جذبے کے تحت اس نے ۱۹۸۶ء کے اوائل میں اپنے انجینئر اور سائنس دان چین کو واپس بھیج دیے تھے۔ اس کے باوجود بیجنگ کے بنیادی نظریے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے' یعنی ماسکو کے ساتھ تعلقات اس وقت تک خوشگوار نہیں ہوں گے جب تک وہ تین اہم معاملات کو سلجھاتا نہیں ہے: افغانستان پر اس کا حملہ' ویت نام کی بے جا حمایت اور وسطی ایشیا کی سرحدوں اور ان کے تحفظ کا دیرینہ قضیہ! دوسری جانب' امریکہ نے لاطینی امریکہ اور مشرق وسطی کے سلسلے میں جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے' اس پر بھی بیجنگ مسلسل اعتراض کرتا رہا ہے۔ اور گمان اغلب ہے کہ وہ منطقہ حارہ کے علاقوں میں روس کی مہم جوئی پر بھی معترض رہا ہوگا۔ چونکہ چین "نہایت کم ترقی یافتہ ممالک" کا اقتصادی دست راست ہے اور دنیا پر سفید فام قوموں کی حکمرانی کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتا رہا ہے' لہٰذا وہ سپرپاورز کی دخل اندازی پر اعتراض فطری جذبے کے تحت کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ "تیسری دنیا" کا باقاعدہ رکن بھی نہیں! پھر ان اعتراضات میں اب وہ شدت بھی نہیں جو ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ماؤ کے جارحانہ بیانات میں ہوتی تھی۔ وہ

پہلے کی طرح اب بھی ایشیا میں روس کی دخل اندازی پر سخت معترض ہے۔ اسی طرح امریکیوں کے اس رجحان کو بھی شک و شبے کی نظر سے دیکھتا ہے کہ "چین کا کارڈ کب اور کس طرح کھیلا جائے۔" بیجنگ کی حکومت پہلے تو روس کی جانب مائل تھی اور اب روس۔ چین جھگڑے تواتر کے ساتھ ہونے لگے تو وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف جھک گئی۔ پھر چین امریکہ کے ساتھ مل کر روس کے ایٹمی تجربے کی مانیٹرنگ بھی کرنے لگا اور افغانستان و ویت نام کے متعلق معلومات بھی دونوں ایک دوسرے کو بھیجنے لگے۔ لیکن نظریاتی طور پر دونوں ممالک ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں۔ اس کے باوجود امریکہ کی چین سے خوشگوار تعلقات بحال کرنے کی تمنا برقرار ہے۔

موجودہ زمانے کے بین الاقوامی سسٹم میں چین جیسے آزاد ایکٹر کی اہمیت خاصی بڑھ گئی ہے اور مستقبل میں بھی یہی صورت حال رہے گی۔ اس کی وجہ سے اس ملک کا طرز عمل ہے جس کے تحت وہ دیگر بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیتا ہے۔ جوناتھن پولیک نے چین کی ان خصوصیات کا ذکر اتنی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ اس کے بیان کا مکمل حوالہ دیے بغیر چارہ نہیں:

> "ہتھیار' بہتر اقتصادی حالت اور طاقت ہی عالمی سطح پر چین کی بے پناہ اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی نہیں! اگر اس کی فوجی صلاحیت کو معمولی تصور کیا جاتا ہے اور اس کی اقتصادی کارگزاریوں کو غلط ملط کر دیا جاتا ہے تو اس طرح واشنگٹن اور ماسکو چین کی قرار واقعی قدر و اہمیت کا اندازہ نہیں لگا پائیں گے۔ نہ ہی عالمی سطح پر اس کے سرمایے کی وقعت کا تخمینہ لگایا جا سکے گا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ خوف و دہشت کا نشانہ بننے والے اس زخم خوردہ ملک نے اپنی تعمیر آپ کی ہے۔ اس نے اپنے سیاسی' معاشی اور فوجی وسائل کو بروئے کار لایا ہے۔ سپرپاورز کے ساتھ بیجنگ کے تعلقات کی کیفیت متنوع حکمت عملی پر مبنی رہی ہے۔ بارہا جھڑپ اور عسکری محاذ آرائی ہوتی رہی ہے۔ کبھی ہم آہنگی بھی رہی ہے۔ کبھی سمجھوتہ بھی ہوا ہے۔ اور کبھی سخت اور جارحانہ الفاظ کا تبادلہ بھی ہوتا رہا ہے۔ اس طرز عمل کے نتیجے میں مختلف ممالک کے لیے چین مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ بعض تو اس کے طویل المیعاد تعلقات کے ارادے سے ہی بدکتے رہے ہیں۔
>
> یہ امر واقع ہے کہ اس نوع کی غیر معین حکمت عملی سیاسی اور فوجی خطرات سے مملو رہی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی چیز نے چین جیسی ابھرتی ہوئی اہم طاقت کی پوزیشن اور وقار کو مستحکم بھی کیا ہے۔ چین نے بڑی طاقتوں کی ترجیحات اور مطالبات کے برعکس اقدامات کیے ہیں۔ بعض اوقات تو اس نے دوسروں کی توقعات کے سراسر خلاف قدم اٹھایا ہے۔ دنیا میں چین بظاہر تو بے مایہ اور کمزور نظر آتا ہے' اس کے باوجود وہ نہ تو واشنگٹن کے آگے جھکا ہے نہ ہی اس نے ماسکو کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر چین نے عالمی سطح

پر ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مابعد جنگ' اس نے متعدد عالمی سیاست اور فوجی نزاع میں حصہ لیا ہے۔ اور جب بھی اس کے نظریات و سیاسیات کو تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو چین نے اس کی سخت مخالفت بھی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ چین اپنے طور پر ایک سپرپاور کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے اسی طرح دیکھنا چاہیے نہ کہ اسے سوویت یونین یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا کاسہ لیس سمجھنا چاہیے۔ عالمی سیاست میں بیجنگ کا اپنا انفرادی مقام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ طویل المیعاد سطح پر چین ایک ایسی طاقتور سیاسی اور فوجی ریاست بن کر ابھر رہا ہے جسے ماسکو یا واشنگٹن کا ایک لازمی جزو تسلیم کرنا ہوگا' بصورت دیگر اس کی اپنی درمیانی حیثیت تو ہے ہی!"

آخر میں اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ سردست چین دفاعی اخراجات پر حد سے زیادہ کنٹرول کیے ہوئے ہے' لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مستقبل میں وہ فوجی لحاظ سے سبک بار رہنا چاہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چین اپنی اقتصادی حالت کو جس طرح مستحکم کر رہا ہے' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ طاقت اور سیاست دونوں متاثر ہوں گے۔ اس بات کی صداقت کا اندازہ یوں بھی ہو جاتا ہے کہ چین اپنے سائنسی اور تکنیکی اداروں کو وسیع کر رہا ہے اور جب یہ ادارے محض چھوٹے چھوٹے تھے' اس وقت بھی راکٹ اور ایٹمی ہتھیاروں میں موثر پیش رفت ہوئی تھی۔ بہرحال اسلحہ پر سرمایہ لگانے کے برعکس ملکی معیشت کو فروغ دینے کا یہ رجحان چین کے جرنیلوں کو مشکل سے ہی مطمئن کر پائے گا۔ دیگر ممالک کے فوجی افسران کی طرح وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ دفاع کے لیے قلیل المیعاد اور طویل المیعاد دونوں منصوبے بروئے کار لائے جائیں۔ اس ضمن میں "اکونومسٹ" نے بڑے خوبصورت انداز میں تبصرہ کیا ہے:

> "چین کے فوجی افسران نہایت صبر و تحمل سے اقتصادی اصلاحات کا نفاذ دیکھتے اور تنخواہیں پاتے رہیں گے۔ اگر جناب ڈنگ کے خیال کے مطابق تمام معاشی منصوبے بروئے کار آتے رہے اور چین کی پیداوار ۱۹۸۰ء اور ۲۰۰۰ء کے دوران چوگنی ہو جاتی ہے' تو پھر دس پندرہ سال کے عرصے میں ملی معیشت اتنی توانا ہو جائے گی کہ وہ فوجی سیکٹر کو نہایت تیزی سے کھینچتی رہے گی۔ تب چینی فوج' پڑوسی ممالک اور بڑی طاقتیں کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گی۔"

یہ ایک قدرتی بات ہے۔

جاپان کا تذبذب

مشرقی ایشیا میں رونما ہونے والے واقعات کو بیجنگ کی حکومت جس انداز میں دیکھ رہی ہے' اس کا لامحالہ اثر جاپان پر پڑے گا جو بزعم خود جمہوریت کا علمبردار ہے یا پھر "ہر چیز۔ سب کے لیے" کا مظہر بنا ہوا ہے۔ جاپان کے تذبذب کا اجمالاً" ذکر اس طرح کیا جا سکتا ہے:

۱۹۴۵ء سے اس کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے اس ملک کو عالمی معیشت اور طاقت کے سیاسی نظام میں ایک بے مثال مقام حاصل ہے۔ تاہم' جاپانیوں کا خیال ہے کہ یہ حد سے زیادہ پیچیدہ پوزیشن ہے۔ اور اگر بین الاقوامی حالات بدل جاتے ہیں تو یہ پوزیشن بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ لہٰذا ان کے نقطہ نظر کے مطابق وہ سارے سلسلے جاری رہنے چاہئیں جن کی بدولت جاپان نے پہلی مرتبہ معجزہ دکھایا تھا۔ چونکہ یہ ایک نزاعی دنیا ہے جہاں "غیر مطمئن طاقتیں" "مطمئن" طاقتوں سے پیچھے رہ جاتی ہیں اور جہاں تکنیکی اور کاروباری تبدیلیاں تیزی سے رونما ہو رہی ہیں' لہٰذا اس بات کا قوی امکان ہے کہ موافق حالات باقی نہ رہیں یا بالکل ہی ختم ہو جائیں۔ چونکہ جاپان کو یقین ہے کہ اس کی پوزیشن ادنیٰ اور پیچیدہ ہے' لہٰذا وہ تبدیلیوں کے دباؤ کا کھلم کھلا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس وہ سفارتی مفاہمت کے ذریعے اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں' یہ ملک بین الاقوامی مسائل کو پرامن طریقے سے حل کرنے پر اصرار کرتا ہے اور جب دوسرے ممالک کے ساتھ سیاسی نوعیت کی چپقلش پیدا ہو جاتی ہے تو یہ ملک چوکنا بھی ہو جاتا ہے اور پریشان بھی! اور جیسے جیسے یہ امیر ترین بنتا جاتا ہے' ویسے ویسے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات قائم ہوں۔

اقتصادی شعبے میں جاپان کی بے مثال کامیابی کی وجوہات کا تو پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ تقریباً" چالیس سال تک جاپانیوں کے وطن کی حفاظت امریکہ اپنی ایٹمی اور مروجہ طاقتوں کے ذریعے کرتا رہا اور وہاں کے سمندری علاقوں پر امریکی بحریہ پہرہ دیتی رہی۔ چنانچہ جاپان کو اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ ملکی توانائی اور قومی وسائل کو دفاعی قوتوں کو فروغ دینے کی بجائے اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں استعمال کرے اور خصوصی طور پر اپنی برآمدی تجارت کو وسعت دے۔ اس کامیابی میں وہاں کے عوام کی کار اندازی' مصنوعات کی کوالٹی اور سخت محنت کو بھی خاصا دخل ہے۔ اس کے علاوہ ترقی کے حصول کے اور بھی اسباب ہیں: برآمدات کو فروغ دینے کے لیے کئی عشروں تک ین کی قیمت کم رکھی گئی۔ باہر سے درآمد کی ہوئی مصنوعات کی خریداری پر پابندی عائد رہی۔ البتہ صنعت کے لیے ضروری خام مال پر ایسی کوئی بندش نہ تھی۔ عالمی تجارت کا ایک آزادانہ نظام قائم کیا گیا جس کی وجہ سے جاپانی مال کی فروخت میں کم دشواریاں حائل ہوتی تھیں۔ امریکی دباؤ کے باوجود جاپان نے اس تجارتی نظام کو "کھلا" رکھا تھا۔ گزشتہ ربع صدی کے دوران اس نے تمام مواقع سے خاطر خواہ فائدے اٹھائے اور عالمی سطح پر ایک قد آور اقتصادی ملک بن گیا۔ اس ترقی میں کسی قسم کی سیاسی پابندیاں اور علاقائی جھگڑے بھی حائل نہ تھیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جاپان اس صورت حال کو جوں کے توں قائم رکھنے کا آرزو مند دکھائی دیتا ہے۔

چونکہ جاپان کی موجودہ کامیابی کی بنیاد اقتصادی شعبے پر قائم ہے' لہٰذا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ ٹوکیو کو اسی شعبے سے بہت زیادہ تشویش لاحق ہے۔ ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ تکنیکی اور اقتصادی ترقی کی وجہ سے ملک کو خاطر خواہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ آنے والی اکیسویں صدی میں جاپان مالیاتی لحاظ سے

اہم پوزیشن کا حامل ہوگا۔ چند ہی ایسے لوگ ہیں جو اس خیال سے متفق نہیں! دوسری طرف' جاپان کی بہت زیادہ کامیابی کی وجہ سے برآمدات کی توسیع میں کمی آگئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایشیا کے نئے صنعتی ممالک نے جاپانی مصنوعات کا چربہ تیار کر لیا ہے۔ ان میں جنوبی کوریا' سنگاپور' تائیوان' تھائی لینڈ وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں چین کا ذکر اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ وہ پارچہ بافی کی مصنوعات میں ویسے بھی بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ ان تمام ممالک میں محنت کی اجرت جاپان کے مقابلے میں بہت کم ہے یہی وجہ ہے کہ جاپانی فرمیں بھی وہاں کارخانے تعمیر کر رہی ہیں۔ چنانچہ وہ سب اس کے لیے ایک چیلنج بن گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ کپڑے' کھلونے' گھریلو سامان' جہاز سازی' فولادی مصنوعات اور آٹو موبائل میں یہ ممالک جاپان کے مقابلے میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جاپان میں جہاز' کار' ٹرک اور فولاد کی مصنوعات ماند پڑ گئی ہیں۔ اب تو وہ ضرورت کے تحت اعلیٰ سامان بڑی بڑی منڈیوں کے لیے تیار کرنے لگا ہے۔ اب اہل جاپان پہلے کے مقابلے میں مسابقت کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ جاپان میں بیرونی تجارت اور صنعت کی وزارت نے نہایت اہم کام یہ بھی کیا ہے کہ جو صنعتیں مسابقت نہیں کر سکتیں' انھیں بند کیا جا رہا ہے تاکہ صنعتی تنزل کو مزید گمبھیر ہونے سے روکا جا سکے اور وہاں کے سرمائے اور کارکنوں کو کہیں ایسی جگہ کھپایا جائے جہاں بین الاقوامی اقتصادیات کا مقابلہ بہ طریق احسن ہوتا ہو۔

جاپان کی ترقی کی رہ میں جو دوسری بڑی رکاوٹ حائل ہو رہی ہے وہ یہ کہ امریکہ اور یورپ کے بازاروں میں جاپانی مصنوعات کی ریل پیل ہے۔ اس بات نے وہاں کے باشندوں کو سخت کبیدہ خاطر بنا دیا ہے۔ ان منڈیوں میں ہر سال لوگ جاپان کے بنے ہوئے فولادی سامان' مشینی اوزار' موٹر سائیکل' کاریں' ٹی وی سیٹ اور بجلی کے سامان خریدتے ہیں۔ ہر سال یورپی اقتصادی برادری اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جاپان کی تجارتی توقیر فزوں ہوتی رہتی ہے۔ اس معاملے میں یورپ کا رد عمل کچھ زیادہ شدید ہے۔ چنانچہ اس نے درآمدی کوٹا مقرر کر رکھا ہے۔ نیز افسر شاہی نے بھی رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں' مثلاً" فرانس نے یہ قدغن لگا رکھی ہے کہ جاپان کی بجلی کی مصنوعات کسٹم ہاؤس کے توسط سے آئیں گی۔ دلچسپ بات یہ کہ وہاں کا عملہ ہی بہت مختصر ہے۔ چونکہ امریکہ آزاد قسم کی عالمی تجارت کا داعی سمجھا جاتا ہے' لہٰذا اس نے جاپانی مال کی درآمدات پر کوئی قدغن تو نہیں لگائی البتہ رضاکارانہ طور پر کہیں کہیں بندش لگا دی ہے۔ امریکہ کے وہ لوگ جو سرمایہ کاری عدم مداخلت کے ترجمان سمجھے جاتے رہے ہیں وہ اس بات پر کبیدہ خاطر ہیں کہ ان کی حکومت جاپان کو غذائی اشیاء اور خام مال برآمد کرتی ہے اور اس کے عوض وہاں کی مصنوعات درآمد کرتی ہے۔ ان کے خیال میں اس طرح کا تجارتی نظام نوآبادیاتی دور کی عکاسی اور غیر ترقی یافتہ عمل ہے۔ امریکہ ڈیڑھ صدی تک اس نوع کی تجارت سے آشنا بھی نہ تھا۔ علاوہ ازیں' ۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء کو ختم ہونے والے مالی سال میں امریکہ کو جاپان کے ساتھ لین دین میں ۴۳ بلین ڈالر کا تجارتی خسارہ ہوا ہے۔ دوسرے' امریکہ کے صنعت کاروں پر جاپان کے ساتھ مسابقت کی وجہ سے خاصا دباؤ پڑا ہے۔ چنانچہ حکومت پر زور دیا گیا ہے کہ وہ عدم توازن کو کم کرے' یعنی ین کے مبادلتی قدر میں اضافہ کرے' جاپان کے لیے امریکی برآمدات کو فروغ دے' وغیرہ وغیرہ! چونکہ مغربی دنیا تحفظ تجارت کی طرف مائل ہے' لہٰذا وہ درآمد شدہ کپڑے کی مصنوعات اور ٹیلیویژن پر کچھ پابندی عائد کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ گویا اس طرح ایشیا میں جاپان کے حریفوں کو بھی تجارت میں حصہ دار بننے کا موقع مل جائے گا۔

اس میں تعجب کی بات نہیں کہ بعض جاپانی ترجمان حالات کے بہتر ہونے سے انکار کرتے

ہیں۔ انھیں تشویش ہے کہ عالمی منڈی میں ان کے حصص کو خطرہ لاحق ہے' اور اس طرح ان کی خوشحالی زد میں ہے۔ ایشیا کے نئے نئے صنعتی ممالک بہت سی مصنوعات میں جاپان کے لیے چیلنج بن گئے ہیں۔ ادھر مغربی ممالک نے جاپان کی درآمدات پر پابندی عائد کر دی ہے۔ جاپان پر یہ بھی دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اپنے ہاں کے ٹیکس کے قوانین میں تبدیلی پیدا کرے' رقم کی بچت کرنے کی بجائے اسے مصرف میں لائے اور درآمدات کو زیادہ سے زیادہ فروغ دے۔ پھر ین کی قیمت میں اضافہ کرے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ اس طرح برآمدات کی بنیاد پر قائم ہونے والی جاپان کی ترقی کا خاتمہ ہو جائے گا' ادائیگی کی توقیر کم ہو جائے گی اور اس کی پیداواری شرح گر جائے گی۔ اس ضمن میں جاپان کو یہ فکر بھی لاحق ہے کہ نہ صرف اس کی معیشت نشو و نما کی انتہائی منزل کو پہنچ رہی ہے بلکہ آبادی کی اوسط عمر کے مطابق ۲۰۱۰ء تک اس کے پاس کارکنوں کی نہایت قلیل تعداد رہ جائے گی' یعنی ۱۵ سے چونسٹھ سال تک کی عمر کے لوگ! دنیا کے ممتاز صنعتی ممالک کے مقابلے میں یہ شرح نہایت ادنیٰ ہو گی۔ اس کے نتیجے میں سماجی تحفظات کی ضرورت بڑھ جائے گی اور جوش و جذبے کا فقدان ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں' جاپان کے صارفہ کو بیرونی مصنوعات خریدنے پر مائل کرنے کی ہر کوشش سیاسی بحران کو جنم دے گی۔ اس طرح بہت ممکن ہے اس "سیاسی ہم خیالی" کا خاتمہ ہونے لگے جو جاپان کی برآمدی توسیع کا مرکز و منبع رہی ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی کمنگی کے باعث جاپان کی اقتصادی ترقی کچھ دھیمی پڑ گئی ہے' نیز دیگر ممالک یہ نہیں چاہتے کہ یہ ملک اپنی برآمدات کے ذریعے معاشی طور پر مستحکم ہو جائے۔ تاہم' ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آئندہ بھی یہ ملک اہم طاقتوں کے مقابلے میں نہایت تیزی سے عروج حاصل کرے گا۔ پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ جاپان کو اپنی صنعت کے لیے تمام تر بیرونی خام مال پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ وہ ۹۹ فی صد تیل' ۹۲ فی صد لوہا' صد فی صد تانبا وغیرہ درآمد کرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ خاصے فائدے میں رہتا ہے' اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ جاپان تجارت کے بدلتے ہوئے رخ کو پہچانتا ہے اور اس طرح فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ چنانچہ اس طرز عمل کی بنا پر جاپان میں قلزیات ایندھن اور غذائی اشیاء کی قیمت کافی کم ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد اس نے تیل کی عالمی قیمت میں کمی کی بدولت ہر سال بلین ڈالرز کا زر مبادلہ بچا لیا ہے۔ یہی ایک عنصر درآمدی خام مال اور اشیائے خوردنی کی قیمت میں حد درجہ کمی کا باعث بنا ہے۔ علاوہ ازیں' ین کی بیش قدری کی وجہ سے ملک کی بعض برآمدی اشیاء میں کٹوتی ہو جائے گی' اس کے ساتھ ہی درآمدات کے اخراجات میں بھی کمی واقع ہو گی۔ اس طرح یہاں کے کارخانے مسابقت کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے اور افراط زر میں بھی کمی آ جائے گی۔ یہ بھی زیر غور ہے کہ جب ۱۹۷۳ء میں تیل کا عالمی بحران پیدا ہوا تھا' جاپانیوں نے ہر قسم کی توانائی کا سراغ لگا لیا تھا۔ چنانچہ اس کارکردگی کی بدولت وہاں کی صنعت اب تک مستفیض ہو رہی ہے۔ یہ صرف اکیلا جاپان تھا جس نے گزشتہ عشرے کے دوران تیل پر انحصار کو ۲۵ فی صد کم کر دیا تھا۔ اسی بحران سے مجبور ہو کر جاپان نے خام مال کے نئے وسائل دریافت کیے اور ان میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کی۔ یہی صورت حال انیسویں صدی میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب برطانیہ نے سمندر پار ممالک میں سرمایہ کاری کی تھی۔ تاہم' یہ بات طے نہیں کہ جاپان کو سستے داموں خام مال مسلسل ملتا رہے گا۔ بہرحال آغاز تو اچھا ہے۔

یہ بات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ جاپانی صنعت کار اب سود مند کاروبار کی جانب توجہ دے رہے ہیں تاکہ اکیسویں صدی کے اوائل میں ملک کی پیش رفت اچھی

رہے۔ بادی النظر میں' جاپان اب آہستہ آہستہ پارچہ بافی' جہاز سازی' فولادی مصنوعات سے اپنا ہاتھ کھینچ رہا ہے اور انھیں ایسے ممالک کے لیے چھوڑ رہا ہے جہاں مزدوری خاصی قلیل ہے۔ اس کے برعکس' وہ سائنسی مصنوعات میں اپنا ایک مقام پیدا کرنے کا آرزو مند ہے۔ کمپیوٹر کے شعبے میں اس نے پہلے ہی بے مثال ترقی کر لی ہے۔ اس نے امریکی ٹیکنالوجی سے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے۔ پھر جاپان کے صنعت کاروں نے دستیاب شدہ مواقعوں سے خوب استفادہ کیا' یعنی انھیں ملک کی محفوظ منڈی میسر تھی' وزارت تجارت کی پشت پناہی حاصل تھی' مصنوعات کی کوالٹی پر کنٹرول قائم تھا اور ین اور ڈالر کے باہمی تبادلہ کی شرح بھی حسب لائق تھی۔ پھر اشیاء کی کم قیمت ہونے کی وجہ سے امریکی کمپنیاں میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔

امریکہ میں کمپیوٹر کے صنعت کاروں کو جاپان کے دو نئے اور سود مند شعبوں کی وجہ سے فکر لاحق ہے۔ ایک تو نہایت قیمتی "ففتھ جنریشن" نامی سپر کمپیوٹر ہے جو موجودہ آلات سے سو گنا زیادہ تیزی سے کام کرے گا اور اپنے مالک کو ہر طرح کی معلومات فراہم کر سکے گا۔ ان میں "کوڈ" الفاظ کی تفصیل سے لے کر لڑاکا طیارے کی ساخت تیار کرنے کا مرحلہ بھی شامل ہوگا۔ اس شعبے میں جاپان کی شاندار کارکردگی کو دیکھ کر امریکی ماہرین حیران و ششدر ہیں۔ پھر انھیں اس بات پر بھی تعجب ہو رہا ہے کہ جاپان کی وزارت تجارت اور ہٹاچی اور فوجسو جیسی بڑی بڑی کمپنیاں مذکورہ شعبے میں تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لیے مالی امداد فراہم کر رہی ہیں۔ کمپیوٹر کا سامان تیار کرنے والے شعبے میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔ یہ وہ شعبہ ہے جس میں ۱۹۸۰ء کے اوائل تک امریکی اور چند یورپی کمپنیوں کی اجارہ داری تھی اور ان کے چیلنج کا مقابلہ کوئی بھی ملک نہیں کر سکتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سپر کمپیوٹر اور کمپیوٹر کے ہلکے پھلکے سامان کی تیاری ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور جاپان کے موجدوں کی سخت آزمائش بھی ہے۔ اس دوران امریکہ اور یورپ کی کمپنیاں اس کاروباری چیلنج کا مقابلہ کرنے کی پوری تیاری کر رہی ہیں۔ آخرالذکر کو تو حکومت کا تعاون بھی حاصل ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا شعبہ دفاع اس بات کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے کہ امریکی کمپنیاں سپر کمپیوٹر میں جاپان سے آگے بڑھ جائیں۔ بہرحال یہ سارے ادارے اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ جاپان کو اس شعبے میں مات دے دی جائے گی۔

یہ واضح رہے کہ "اکونومسٹ" "دی وال اسٹریٹ جرنل" "دی نیو یارک ٹائمز" اور دیگر اخبارات و جرائد اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی میں جاپان کی پیش رفت کے متعلق مضامین شائع کرتے رہے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں! امشوبی شی فرم نے واشنگٹن کے ساتھ جو تعلقات قائم کیے ہیں ان کے پیش نظر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ جاپان نیوکلیئر طاقت کی صنعت میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ بائیو۔ ٹیکنالوجی سے بھی اس ملک کو اچھی خاصی رغبت ہے' اس لیے کہ اس کی مدد سے زرعی پیداوار کو فروغ دینا ممکن ہے۔ یہی صورت حال کوزہ گری کی بھی ہے۔ یہ اطلاع ہے کہ جاپان کی ہوائی ترقیاتی کمپنی نے بوئنگ طیارے بنانے والی کمپنی کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا ہے تاکہ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے لیے نئے جہاز تیار کیے جائیں۔ ایک امریکی ماہر نے اسے سودا بازی قرار دیا ہے۔ تاہم' اس معاہدے کے تحت جاپان تھوڑا بہت سرمایہ فراہم کرے گا جبکہ امریکہ اسے ٹیکنالوجی اور تجربہ سے بہرہ یاب کرے گا۔ یہ

مستقبل میں بڑی اہمیت کی حامل ہو گی لیکن سب سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل صنعت روبوٹ کی ہے۔ چنانچہ اس میں جاپان نے پہلے ہی سبقت حاصل کر لی ہے۔ ایسے تمام کارخانے جہاں یہ مصنوعات تیار ہوتی ہیں' کمپیوٹر' لیزر اور خود روبوٹ سے کنٹرول کیے جاتے ہیں۔ ملک میں محنت کشوں کی جو کمی واقع ہو رہی ہے' اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ تازہ ترین اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ جاپان نے صنعتی روبوٹ اس کثرت سے متعارف کرائے ہیں کہ وہ ساری دنیا کے مجموعی روبوٹ کے مساوی ہیں اور امریکہ سے تو کئی گنا زیادہ ہیں۔ ایک دوسرے سروے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل جاپان امریکیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے سے اپنے روبوٹ استعمال کرتے ہیں۔

اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی کی مہم جوئی کے پس منظر میں وسیع قسم کے تعمیری اسباب و عوامل ہیں جن کی وجہ سے جاپان کو اپنے حریفوں پر سبقت حاصل ہے۔ وہاں کی وزارت صنعت و تجارت ایک طرح سے پروشیا کے مشہور زمانہ جنرل اسٹاف کی مانند ہے۔ اس کی کارکردگی کو اگرچہ غیر ملکیوں نے مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا ہے' لیکن اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ یہ وزارت جاپان کی معیشت کو ترقی دینے کے سلسلے میں مفید ہدایات دیتی ہے' تحقیقی کاموں کا بندوبست کرتی ہے' نئی نئی صنعتوں کی مالی معاونت کرتی ہے اور جو روبہ زوال ہو رہی ہیں' انھیں مناسب سہارا دیتی ہے۔ بہرحال جاپان کا یہ طریقہ کار امریکہ کے سرکاری عدم مداخلت کے رویے سے کہیں زیادہ فعال اور کارآمد ثابت ہوا ہے۔ جاپان کی دوسری اہم خصوصیت اس کا مالی استحکام ہے۔ یہ ملک تحقیقی اور ترقیاتی اسکیموں میں کثرت سے سرمایہ لگاتا ہے۔ مجموعی قومی پیداوار کے مطابق جو رقم تحقیق و ترقی کے لیے مختص ہوتی ہے' وہ اس عشرے میں دوگنی ہو جائے گی' یعنی ۱۹۸۰ء میں جو شرح ۲ فی صد تھی' اب وہ ۱۹۹۰ء میں ۳۰۵ فی صد ہو جائے گی۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جاپان کے زیادہ تر تحقیقی و ترقیاتی کاموں میں صنعت کار سرمایہ لگاتے ہیں۔ یہ صورت حال یورپ اور امریکہ میں نہیں پائی جاتی۔ وہاں یہ سارا کام یا تو حکومت کرتی ہے یا پھر یونیورسٹیاں انجام دیتی ہیں۔ جاپان میں اس نوع کے تحقیقی کاموں کا محور کاروباری علاقے ہیں۔ سائنس الگ تھلگ رکھ دی جاتی ہے۔ اور جب کاروباری معلومات بہم ہو جاتی ہیں تو پھر سائنسی آلات انھیں ریکارڈ کرنے کے لیے حرکت میں آ جاتے ہیں۔

جاپان کی تیسری اہم خصوصیات نہایت اعلیٰ درجے کی قومی بچت ہے۔ اور جب اس کا امریکہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ طریقہ کار بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس بچت اور امریکہ میں ٹیکس کے نظام میں فرق ہے۔ وہاں اس سسٹم نے انفرادی طور پر قرض خواہی اور اشیائے ضرورت کے صرف کی حوصلہ افزائی کی ہے جبکہ جاپان میں انفرادی بچت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جاپان کا ہر شخص چاہے عورت ہو یا مرد' اپنے بڑھاپے کے لیے رقم بچا کر رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پنشن کا نظام اتنا سود مند نہیں! ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جاپان کے بینکوں اور بیمہ کمپنیوں میں پیسے کی ریل پیل ہے۔ جاپان کی قومی آمدنی میں انکم ٹیکس اور تحفظاتی منصوبوں کی ادائیگی کی رقم کی شرح دیگر بڑے بڑے سرمایہ دار اور فلاحی مملکتوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اور اہل جاپان اس نظام کو اسی طرح رکھنا چاہتے ہیں تاکہ رقم راس المالی سرمایہ کاری میں لگائی جا سکے۔ اہل یورپ اگر جاپان کے طریقہ کار کو اپنانا چاہیں تو انھیں سب سے پہلے فلاحی کاموں پر

اخراجات کم کرنا ہوں گے۔ اگر اہل امریکہ اس معاملے میں جاپان کی پیروی کرنا چاہیں تو انھیں دفاعی اور سماجی دونوں اخراجات میں کمی کرنی ہو گی۔ نیز انھیں اپنے ٹیکس کے نظام کو بھی پوری طرح بدلنا ہو گا۔

جاپان کی چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کی فرموں کو ملکی بازار تک رسائی حاصل ہے۔ یہ سہولت امریکی اور یورپی فرموں کو میسر نہیں۔ جاپانی مصنوعات کو ملکی منڈی میں پوری طرح تحفظ دینے کے سلسلے میں افسر شاہی نے بھی خصوصی قوانین وضع کیے ہیں۔ چنانچہ اس ملک کا صارف "غیر ملکی مال" خریدنے سے اجتناب برتتا ہے' سوائے اس کے کہ غیر ملکی خام مال اور اشیائے خوردنی کی خریداری "مجبوراً" کی جاتی ہے۔ خریداری کا یہ قومی رجحان برقرار رہے گا۔ اس کی وجہ جاپانی مصنوعات کی اعلیٰ معیار اور ان کی مقبولیت ہے۔ پھر وہاں قومی فخر کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ نیز' اندرون ملک مال کی تقسیم اور فروخت کا بہترین نظام کار فرما ہے۔

آخری بات یہ کہ جاپانی محنت کشوں کا معیار کارکردگی نہایت اعلیٰ ہے۔ یہ صفت انھیں مکتب و مدرسے ہی میں ودیعت نہیں ہوئی ہے' بلکہ کمپنیوں نے بھی ان کی بہتر انداز میں تربیت سازی کی ہے۔ اس ملک کا یہ عالم ہے کہ پندرہ سالہ نوجوان حساب کے مضمون میں مغربی ممالک کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ باصلاحیت ہے' لیکن اعلیٰ ترین علم و ادب کے معاملے میں خاصا فرق ہے۔ جاپان میں نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں کی کمی ہے۔ اس کے باوجود اس ملک نے کسی بھی مغربی ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ انجنیر پیدا کیے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہ شرح امریکہ سے ۵۰ فی صد زیادہ ہے۔ جاپان میں سات لاکھ (۷۰۰۰۰۰) افراد تحقیقی و ترقیاتی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ یہ تعداد برطانیہ' فرانس اور مغربی جرمنی کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔

جاپان کی مذکورہ بالا پانچ خصوصیات کی مجموعی کارکردگی کا اندازہ دیگر ممتاز ممالک کے حالات کے پیش نظر لگانا ممکن نہیں۔ بہرحال بحیثیت مجموعی' ان خصوصیات نے جاپانی صنعت کو بنیادی استحکام بخشا ہے۔ اسی طرح جاپان کے محنت کشوں نے ملک کو عروج سے ہمکنار کیا ہے۔ پھر کارخانوں کے ماحول میں ہم آہنگی اور یکجہتی کا رجحان سونے پر سہاگہ ہے۔ وہاں سب کے سب کمپنی کے کارکن ہیں' ان میں ذہنی ربط ہے اور ہڑتال کا نام و نشان نہیں! پھر بھی وہاں ناسازگار صورتیں موجود ہیں۔ کام کا دورانیہ خاصا طویل ہوتا ہے۔ کمپنی کے اصول و ضوابط کی سختی سے پیروی کرنی پڑتی ہے' مثلاً "صبح سویرے جسمانی ورزش لازمی ہے۔ وہاں آزاد قسم کی تجارتی انجمنوں کا نام و نشان نہیں! رہائشی مکانات نہایت خستہ حال ہوتے ہیں۔ مذہبی عقائد اور بڑوں کی اطاعت پر خاصا زور دیا جاتا ہے۔ جاپان میں فیکٹریوں کے دروازے پر حساب کتاب سے آشنا طلبا کا ایک مجمع لگا رہتا ہے۔ جاپانی معاشرے میں اس نوع کے جو حالات ملتے ہیں ان پر مغربی مبصرین نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں براعظم یورپ میں کارخانے کا جو نظام تھا اور جس ظلم و جور سے کارکن گزرتے تھے' خصوصاً" برطانیہ میں' ان تمام حقائق کی جھلکیاں جاپان میں نظر آ جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچھی پیداوار اور حصول زر کے معاملے میں کارکن اور وہاں کا معاشرہ جو فعال کردار ادا کر رہے ہیں وہ اقدار و روایات کے سراسر منافی ہیں۔ جاپان کا صنعتی

جزو دراصل مختلف ممالک کے لیے ٹیکنالوجی اور انتظامی امور کا تجربہ اتارنے کا محرک بن چکا ہے۔ بایں ہمہ' وہاں کی تہذیب و ثقافت کی نقل کا رجحان بھی کار فرما ہے۔ بقول ایڈ ہال برسمز: "امریکہ کے لیے یہ بالکل ہی نیا اور مشکل ترین چیلنج ہے جس سے وہ پوری صدی نبرد آزما ہوتا رہے گا۔ یہ مقابلہ سوویت یونین کے ساتھ ہونے والے سیاسی اور فوجی مقابلے سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کے لیے یہ صنعتی ترقی ناکافی تھی۔ چنانچہ اب وہ نہایت تیزی سے دنیا کا سب سے بڑا دائن ملک بن چکا ہے جو ہر سال بلیوں ڈالر بیرونی ممالک کو بھیجتا ہے۔ یہ تبدیلی دراصل ۱۹۶۹ء میں اس وقت آئی تھی جب جاپان کی وزارت تجارت نے رقم بیرون ملک بھیجنے اور سمندر پار ممالک میں سرمایہ کاری کرنے کے کنٹرول کو ختم کر دیا تھا۔ اس اقدام کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس ملک میں نجی طور پر بچت کا شدید رجحان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ اپنی بچت کا ۲۰ فی صد حصہ بچا لیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۵ء میں بچت کی اوسط شرح آمدنی کی اوسط شرح سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ مالیاتی اداروں کے پاس پیسوں کی ریل پیل ہو گئی اور انھوں نے زیادہ منافع کمانے کی غرض سے یہ سرمایہ باہر بھیجنا شروع کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جاپان کو اپنی برآمدات کی بدولت خاصا منافع حاصل ہوا اور اس کے تجارتی ذخائر بے حد وسیع ہو گئے۔ وہاں کی وزارت مالیات کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ ان ذخائر کی وجہ سے کہیں جاپان میں افراط زر کی صورت نہ پیدا ہو جائے' لہٰذا اس نے بڑے بڑے بینکوں کو ترغیب دی کہ وہ سمندر پار ممالک میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کریں۔ چنانچہ ۱۹۸۳ء میں ۱۷ء۷ بلین ڈالر باہر کے ممالک کو بھیجا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں یہ شرح بڑھ کر ۴۹ء۷ بلین ڈالر اور ۱۹۸۵ء میں ۶۵ء۳ بلین ڈالر ہو گئی۔ اس طرح جاپان دنیا کا سب بڑا دائن ملک بن گیا۔ اقتصادیات کے بین الاقوامی ادارے کے ڈائریکٹر نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ۱۹۹۰ء تک ساری دنیا جاپان کے ۵۰۰ بلین ڈالر کی مقروض ہو جائے گی۔ نیز' نومارا کے تحقیقاتی ادارے نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ ۱۹۹۵ء تک سمندر پار ممالک میں جاپان کا مجموعی اثاثہ کروڑ کھرب کی مالیت کا ہو گا۔ اس میں ذرا بھی تعجب نہیں کہ جاپان کے بینک اور مالیاتی ادارے نہایت تیزی سے دنیا میں عروج پا رہے ہیں اور کامیابی سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔

جاپان کے بیرون ملک وسیع سرمایہ کاری کے نتائج عالمی معیشت کے لیے تشویش ناک بھی ہیں اور فائدہ مند بھی! اور یہی صورت حال جاپان پر بھی صادق آتی ہے۔ دنیا میں اس فنڈ کا معتدبہ حصہ بائیں تعمیر میں لگایا جا رہا ہے' مثلاً" "انگلش چینل" کی سرنگ میں' یا دھات کی کانوں کی کھدائی میں' مثلاً" برازیل میں! اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ٹوکیو کو فائدہ پہنچے گا۔ دیگر رقوم جاپانی کمپنیوں کے توسط سے بھیجی جاتی ہیں اور میزانیہ بیرونی مراعات کے حصول میں کام آجاتا ہے (خصوصاً" پیداواری شعبے کے لیے)۔ علاوہ ازیں' جاپانی مصنوعات ایسے ممالک میں تیار کرائی جاتی ہیں جہاں مزدوروں کی اجرت کم ہے اور اس طرح ان کی مسابقت آسان ہو جاتی ہے۔ پھر امریکہ یا یورپی اقتصادی برادری کے ممالک میں پلانٹ نصب کیا جاتا ہے' اور اس طرح تامینی تعرفہ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ مذکورہ سرمائے کا زیادہ تر حصہ قلیل المیعاد بونڈز (مثلاً" امریکی ٹریژی بونڈز) کی خریداری میں صرف کیا گیا ہے۔ اور اگر جاپان یہ سرمایہ واپس منگوا لیتا ہے تو ۱۹۲۹ء کی طرح

دنیا کا مالیاتی نظام ڈانواں ڈول ہو جائے گا۔ اس کے مضر اثرات امریکی ڈالر اور امریکی معیشت پر مرتب ہوں گے۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ ریگن حکومت کے عہد میں بجٹ کا جو گمبھیر خسارہ ہوا تھا اس کے ازالے کے لیے جاپان کی یہی رقم کام آ رہی ہے۔ بہرحال' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹوکیو اپنا سرمایہ واپس لانے کی بجائے سمندر پار ممالک کے متعدد منصوبوں پر لگاتا رہے گا۔

گزشتہ چند برسوں میں جہاں جاپان دنیا کا سب سے بڑا دائن ملک بن کر ابھرا ہے' وہاں امریکہ بڑے دائن ملک کے درجے سے گھٹ کر مقروض ملک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ بات اتنی تیزی سے نمایاں ہوئی ہے کہ اس کے اسباب و عوامل کا صحیح ادراک کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ دنیا میں معاشی ترقی کے ہر دور میں دائن ملک نے تاریخی لحاظ سے پیداواری سلسلے کو فروغ دیا ہے۔ اور جاپان کا یہ عہد شروع ہو چکا ہے۔ لہٰذا ٹوکیو ایک بہت بڑے عالمی بینکار کی حیثیت سے بین الاقوامی تجارت اور مالیات کو فروغ دینے کے لیے طویل المیعاد اور قلیل المیعاد منصوبے پر عمل درآمد کرے گا' بالکل اسی طرح جیسے ماضی میں نیدرلینڈ' برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ اس موقع پر جو بات قابل غور ہے' وہ یہ کہ جاپان کا غیر مرئی مالیاتی کردار تو خاصا نمایاں ہے' لیکن اس کی صنعتی بالادستی کا مرئی زوال ابھی اس طرح شروع نہیں ہوا ہے جیسا برطانیہ میں ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ تبدیلی نہایت تیز رفتاری سے آ جائے بشرطیکہ ین کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگے' جاپان تکمیل کے آخری مراحل کو چھو لے' اس کی صنعت سازی سست پڑ جائے اور اس کی پیداوار کی شرح گر جائے۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوتی بھی ہے' اور جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے' جاپان کا یہ زوال سست رفتاری سے آئے گا' پھر بھی ایک بات طے ہے: پیش گوئی کے مطابق ۲۰۰۰ء میں دنیا بھر میں جاپان کا کثیر اثاثہ پھیلا ہوا ہو گا۔ لہٰذا اس کے موجودہ سنگ حساب میں بیرونی منافع کی بدولت رقم کا اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ غرض ہر طرح جاپان کے امیر ترین بننے کے امکانات روشن ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کے اوائل میں اقتصادی لحاظ سے جاپان کس درجہ مستحکم ہو گا؟ اگر وسیع پیمانے پر جنگ نہ ہوئی' ماحولیات کی تباہ کاری سامنے نہ آئی' ۱۹۳۰ء کی دہائی کی مانند کاروبار مندا نہ ہوا اور تاسیست کی کیفیت پیدا نہ ہوئی تو ایسی صورت میں جواب ہو گا: بہت زیادہ طاقتور! کمپیوٹرز' روبوٹ' ٹیلی کمیونیکیشن' آٹوموبائل' ٹرک' پانی کے جہاز اور ممکن ہے بائیو ٹیکنالوجی اور ہوائی جہاز جیسی مصنوعات میں جاپان سرفہرست ہو گا یا دوسرے نمبر پر' تاہم مالیاتی شعبے میں تو وہ اپنی مثال آپ ہو گا۔ یہ بات قبل ازیں بتائی جا چکی ہے کہ جاپان کی مجموعی قومی پیداوار ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور مغربی یورپ کے مقابلے میں پہلے ہی سے بہت زیادہ ہے۔ اس طرح وہاں معیار زندگی روئے زمین کے کسی بھی خطے سے کہیں اعلیٰ و افضل ہے۔ دنیا کی صنعتی پیداوار یا مجموعی قومی پیداوار میں آئندہ جاپان کا کیا حصہ ہو گا' یہ کہنا مشکل ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر مناسب ہو گا کہ ۱۹۵۱ء میں جاپان کی مجموعی قومی پیداوار برطانیہ کا ایک تہائی اور امریکہ کا بیسواں حصہ تھی۔ تاہم تین دہائیوں کے اندر اندر اس کی پیداوار برطانیہ کے مقابلے میں دوگنی اور امریکہ کے نصف کے برابر ہو گئی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مذکورہ عشروں میں جاپان کی پیداوار خلاف معمول بہت عروج پر تھی۔ اس کی خصوصی وجوہات تھیں۔ کئی اندازوں کے مطابق جاپان کی معیشت میں ڈیڑھ سے

دو فی صد تک سالانہ ترقی ہو گی۔ ایسی صورت حال' چین کو چھوڑ کر کسی اور ملک کی معیشت میں پیدا نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہرمین کاہان اور عذرا ووگل جیسے دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ اکیسویں صدی کے اوائل میں جاپان کو اقتصادی لحاظ سے پہلی پوزیشن حاصل رہے گی۔ اور یہ بات باعث حیرت نہیں کہ بہت سے جاپانی اس خوش آئند مستقبل کے تصور سے سرشار ہیں۔ ایک ایسا ملک جس کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کا محض ۳ فی صد ہو اور جہاں قابل سکونت اراضی صرف ۰ء۳ فی صد ہو' وہاں کے کارنامے ناقابل یقین نظر آتے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کے امکانات کے پیش نظر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ جاپان اپنے عوام اور زمین کی صلاحیتوں کو انتہائی حد تک استعمال کر چکا ہے' لہٰذا دیگر چھوٹے چھوٹے ممالک اور جزائر مثلاً" پرتگال' وینس' نیدرلینڈ اور برطانیہ کی طرح یہ بھی ایسے ممالک سے مات کھا جائے گا جن کے پاس حد سے زیادہ وسائل و اسباب ہیں اور جنہیں صرف جاپان کے طریق کار اپنانے کی ضرورت ہے۔

اس سے قطع نظر کہ جاپان کی اقتصادی قوت اس وقت کیا ہے اور آئندہ کیا ہو گی' دو باتیں قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ جاپان حد سے زیادہ بار آور اور خوشحال ہے' اور اس خصوصیت میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ دوسرے' بین الاقوامی معیشت میں اس ملک کا جو مقام ہے' اس کے مقابلے میں اس کی فوجی طاقت اور دفاعی اخراجات کم تر درجے کے ہیں۔ اس کے پاس اوسط درجے کی بحریہ ہے۔ اس میں اکتیس تباہ کن جہاز اور اٹھارہ "فریگیٹ" شامل ہیں۔ نیز' ملک کا دفاع کرنے والی فضائیہ اور ایک متوسط درجے کی بری فوج ہے۔ دوسرے ممالک کے مقابلے میں جاپان فوجی لحاظ سے کم حیثیت کا حامل ہے' حالانکہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے عشروں میں ایسی صورت حال نہ تھی۔ یہ موضوع مسلسل زیر بحث رہا ہے کہ جاپان دفاع پر کیوں اتنی قلیل رقم خرچ کرتا ہے۔ "دی ملٹری بیلنس" کے جائزے کے مطابق ۱۹۸۳ء میں جاپان نے دفاع پر کل ۱۰۶ بلین ڈالر خرچ کیے تھے۔ اس کے مقابلے میں فرانس' مغربی جرمنی اور برطانیہ نے ۲۱ سے ۲۴ بلین ڈالر خرچ کیے تھے جبکہ امریکہ کا دفاعی خرچ ۲۳۹ بلین ڈالر تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مذکورہ سال میں ہر جاپانی باشندے کو دفاع پر فقط ۹۸ ڈالر خرچ کرنے پڑے تھے۔ اس کے مقابلے میں برطانوی باشندے کو ۴۳۹ ڈالر اور امریکی باشندے کو ۱۰۲۳ ڈالر صرف کرنے پڑے تھے۔ اس وقت جاپان اس قدر خوشحال ملک ہے کہ اس کے لیے یہ دفاعی اخراجات چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کی اور بھی وجوہات ہیں۔ اسے امریکہ کی تحفظاتی چھتری میسر ہے۔ دوسرے دفاعی اخراجات کم ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ صنعت و حرفت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگا دیتا ہے۔ اور یہی بات اس کے امریکی اور یورپی حریفوں کو کھلتی ہے۔

اگر جاپان امریکی حکومت اور دیگر یورپی ناقدین کے دباؤ کے تحت اپنے دفاعی اخراجات میں اضافہ کر دیتا ہے اور نیٹو کے ممبران کے طے شدہ اصول کے مطابق اپنی مجموعی قومی پیداوار کا ۳ سے ۴ فی صد حصہ اس کے لیے مختص کر دیتا ہے تو یہ تبدیلی حد درجہ ڈرامائی ہو گی اور اس طرح یہ ملک (چین کے ساتھ ساتھ) دنیا کی تیسری بہت بڑی فوجی طاقت بن جائے گا۔ اس وقت دفاع پر اس کا سالانہ خرچ ۵۰ بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہو گا۔ جاپان کے تکنیکی اور پیداواری وسائل کے پیش نظر یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ ملک ٹاسک فورس بردار بحری جہاز بھی تیار کر سکتا ہے اور مزاحمتی کارروائی کو روکنے کے لیے

دور تک مار کرنے والے میزائل بھی بنا سکتا ہے۔ اس سے "مٹسوبشی" جیسی ملکی فرموں کو فائدہ پہنچے گا۔ پھر مشرق بعید میں روسی طاقت کا ازالہ ممکن ہو جائے گا۔ اس ساری کارروائی سے دنیا میں بے پناہ پھیل جانے والے امریکہ کا بھی فائدہ ہے۔

بہرحال جو بات متوقع ہے' وہ یہ کہ ٹوکیو بیرونی دباؤ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرے گا پھر دفاعی اخراجات کم کر دے گا جس سے امریکہ سے بگاڑ کی صورت نہ پیدا ہو۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ جاپان کو قاعدے کے مطابق قومی مجموعی پیداوار کا ایک فی صد دفاع پر خرچ کرنا چاہیے۔ نیز تو اس اصول کو پہلے ہی توڑ دیا تھا۔ اس نے ۱۹۵۰ء کے عشرے کے شروع میں تو اپنی مجموعی قومی پیداوار کا معتدبہ حصہ اس مد میں خرچ کیا تھا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں امریکہ اور جاپان کے ساتھ جو دفاعی معاہدہ ہوا تھا اس کی شرائط سے کوئی واسطہ بھی نہیں رکھنا چاہیے کہ یہ تو جاپان میں امریکی فوج کی موجودگی کا قانونی جواز ہے اور اسی وجہ سے ٹوکیو قوت دفاع کی بجائے تجارت کے فروغ کی جانب زیادہ متوجہ ہے۔ اب ۱۹۸۰ء کے عشرے میں حالات جنگ کوریا جیسے نہیں رہے ہیں۔ جاپانی حکومت کا یہ کہنا ہے کہ دفاعی اخراجات بڑھانے اور بیرونی ملک فوج اور اسلحہ بھیجنے پر قانونی بندش کو ختم کرنے میں ملکی اور علاقائی سطح پر بڑے اعتراضات ہوں گے۔ جاپانیوں کے ذہنوں میں ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ہونے والی فوجی توسیع' جنگ کے زمانے کے نقصانات اور خاص طور پر ایٹم بم کی تباہی کی یادیں ہنوز تازہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف جنگ بلکہ آلات جنگ کو بھی نفرت اور شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا یہ احساس اتنا ہی قوی ہے جتنا قوی پہلی جنگ کے بعد اہل مغرب کا جنگ کے خلاف نفرت کا جذبہ تھا۔ جاپان والوں کا یہ جذبہ وقت کے ساتھ ساتھ ہی بدل سکے گا۔ خصوصاً" نئی ذہنیت کی نسل آنے کے بعد! بہرحال مستقبل قریب تک صورت حال یہ ہو گی کہ لوگ اس نام نہاد خرچ کو کم سے کم کرنے پر زور دیں گے۔

مذکورہ اخلاقی اور نظریاتی اسباب و عوامل میں معیشت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ جاپان کے کاروباری طبقے اور سیاست دان قومی اخراجات میں اضافے پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ (حالانکہ دیگر ممالک کی نسبت جاپان میں یہ شرح خاصی کم ہے)۔ ان کا خیال ہے کہ دفاعی اخراجات بڑھانے سے حکومت خسارے سے دوچار ہو گی اور اسے ٹیکس عائد کرنے پڑیں گے اور یہ دونوں باتیں عوام کو ناقابل قبول ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں اتنی کثیر بری اور بحری فوج نہ تو جاپان کا تحفظ کر سکی اور نہ ہی اس کی معیشت کو مستحکم کر سکی۔ اور فی الحال یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ دفاعی اخراجات میں اضافے سے عرب سے آنے والے تیل کے بحران کو کس طرح روکا جا سکے گا۔ یہ مسئلہ تو جاپان کی فوجی صلاحیت کے لیے نوکلیئر جنگ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جبکہ مشرق وسطیٰ کے کسی بحران کے سلسلے میں جاپان چپکا بیٹھا رہتا ہے۔ کیا یہ جاپان کے لیے بہتر نہ ہو گا کہ وہ طاقت کے استعمال سے گریز کرے اور تمام قضیے پرامن طور پر حل کرے؟ چونکہ موجودہ دور کی جنگ اتنی گراں قیمت ہوتی ہے اور اس کے جواب میں جو اقدامات کیے جاتے ہیں وہ بھی مہنگے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اہل جاپان پرامن سفارت کاری کو ترجیح دینا چاہیں گے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جاپان کے مذکورہ خیال کے پس پردہ یہ تصور کار فرما ہے کہ اگر وہ وسیع

پیمانے پر اپنی فوجی طاقت کو بڑھاتا ہے تو اس کے بہت سے پڑوسی ہوشیار ہو جائیں گے اور رد عمل کے لیے مناسب اقدامات کرنے لگیں گے۔ ان میں روس پیش پیش ہو گا۔ یہ وہی ملک ہے جس کے خلاف امریکہ جاپان کو فوجی نئی بنانا چاہتا ہے۔ پھر اہل روس ہوکائیدو کے شمال میں واقع جزائر کے سلسلے میں اب تک ٹوکیو سے جھگڑا کر رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ مشرق بعید میں چینی قوت کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی مضبوط ہے۔ علاوہ ازیں' رد عمل کی صورت میں وہ ممالک بھی سامنے آئیں گے جو پہلے جاپان کے ماتحت تھے' مثلاً" کوریا' تائیوان' فلپائن' ملائیشیا' انڈونیشیا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ۔ جاپانی قومیت کے فروغ سے انھیں تشویش لاحق ہوتی رہی ہے اور ان سبھوں نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ ادھر جاپان اپنی امن پسند ذہنیت کی وجہ سے لڑائی جھگڑے کی بجائے پیداواری صلاحیت کو اہمیت دیتا ہے تاکہ جنوب مشرقی ایشیا میں سکون و سلامتی کی فضا قائم ہو۔ پھر ایک گمبھیر معاملہ بھی جاپان کو درپیش ہے۔ حساس طبیعت کے چینی اس ظلم و جور کو اب تک نہیں بھول پائے ہیں جو جاپان نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء کے دوران ان پر کیے تھے۔ لہٰذا اہل چین جاپانیوں کے اقدامات کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیجنگ نے جاپان کو تنبیہ کی ہے کہ وہ ترقی پذیر سائبیریا کے معاملے میں دخل اندازی نہ کرے اور تائیوان کی حمایت سے باز آ جائے۔

جاپان کی اقتصادی ترقی' روز افزوں سرمایہ کاری ملنے والی ترقیاتی امداد اور ملکی سیاحت ـــــ ان تمام چیزوں نے اس کے بہت سے پڑوسی ممالک کو شک و شبہ میں ڈال دیا ہے۔ انھیں شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ ایک بار پھر "عظیم مشرقی ایشیا کا خوشحال خطہ" کے نئے تصور کے سحر میں اسیر کیے جا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جاپان ان ممالک سے سوائے خام مال کے بہت قلیل مقدار میں اشیاء درآمد کرتا ہے' لیکن اس کے برعکس اپنی مصنوعات بے دریغ ان کے ہاں فروخت کرتا ہے۔ اس معاملے میں چین بھی خوب بولنے لگا ہے۔ ویسے ۱۹۷۰ء کے آخری عشرے میں وہ جاپان کی روز افزوں تجارت اور سرمایہ کاری کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ پھر ایک دم سے رخ بدل کر اس ملک کی مذمت کرنے لگا۔ اس کی ایک وجہ تو چین کی "غیر توازن ادائیگی تھی' دوسری وجہ کسی بھی بیرونی ملک پر اقتصادی انحصار سے اس کا گریز تھا تاکہ وہ اس کا غلط فائدہ نہ اٹھا پائے۔ ڈنگ نے ۱۹۷۹ء میں زور دے کر کہا تھا کہ چین کے ساتھ امریکی تجارت اسی سطح پر ہونی چاہیے جس سطح پر جاپان کے ساتھ ہوتی ہے۔ غرض اس طرح اس لیڈر نے جاپان کو "آزاد تجارت کی شہنشاہیت" حاصل کرنے کے مواقع سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

اس وقت تو ان حقائق کی حیثیت ہوا کے سامنے چند تنکوں سے زیادہ نہیں' تاہم جاپان کے سیاست دان متفکر ضرور ہیں اور چاہتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے موقع پر اس ملک کی ایک مربوط اور جامع خارجہ پالیسی ہو۔ اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ اپنی روز افزوں اقتصادی قوت کے بل بوتے پر جاپان ایک دوسرا وینس بن جائے گا۔ اس کی وجہ محض اس کی وسیع پیمانے کی تجارت نہیں ہو گی بلکہ اس کے بحری جہازوں کے محفوظ سمندری راستے ہوں گے۔ پھر وہ سمندر پار ممالک کے لیے نیم ـ انحصاری مرکز کی حیثیت حاصل کر لے گا۔ بہرحال' اندرون ملک اور بیرونی ممالک میں ایک مضبوط اور مستحکم قسم کے

جاپان کی اتنی شدید مخالفت ہو رہی ہے کہ وہ نہ صرف قدیم شہنشاہوں کی طرح علاقے فتح کرنے سے گریزاں رہے گا بلکہ اپنی دفاعی طاقت میں بھی مزید اضافہ نہیں کرے گا۔ آخرالذکر قیاس آرائی سے امریکی حلقہ سخت ناراض ہو جائے گا' اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ مغربی بحرالکاہل کے دفاعی معاملات میں جاپان کی شرکت بھی ہو اور وہ بھی اس نوع کی ذمہ داری پوری کرے۔ بہرحال جاپان کے لیے یہ گوگو کی کیفیت ہو گی۔ اگر وہ اپنی افواج پر معتدبہ رقم خرچ نہیں کرتا ہے تو تنقید کا نشانہ بنتا ہے' بصورت دیگر معتوب قرار دیا جاتا ہے۔ ہر دو صورت کی تعبیر کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ "جاپان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو اور خارجہ پالیسی کم سے کم خطرے کا سبب بنے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتصادی ترقی کی رفتار تیز تر ہو جانے کے باوجود جاپان کی یہ ترجیحات ہوں گے کہ جہاں تک ممکن ہو مشرقی ایشیا کے فوجی اور سیاسی معاملات میں کم سے کم تبدیلی رونما ہو۔ اس طرح گوگو کی کیفیت اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ ایک غیر مارکسٹ بھی یہ سوچ کر حیران رہ جائے گا کہ ایشیا کی اقتصادی تبدیلی دیگر ممالک کی دور رس تبدیلی سے کس طرح محفوظ رہ سکے گی۔

اہل جاپان کو حد سے زیادہ تشویش اس بات کی ہے کہ مستقبل میں مشرقی ایشیا کے اندر طاقت کا کیا توازن ہو گا۔ سردست "پر امن سفارت کاری" خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت یہ کیا کام آئے گی جب امریکہ ایشیا کے ساتھ پابندی نبھانے سے باز آ جائے یا عرب ممالک سے یوکوہاما تک تیل کی پائپ لائن کا تحفظ اس کے لیے ممکن نہ رہے؟ اس وقت یہ سفارت کاری کیا کام آئے گی اگر ایک دوسری جنگ کوریا چھڑ جاتی ہے؟ اور اگر چین اس علاقے پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دے تو پھر یہ سفارت کاری کیا کام آئے گی؟ یہ پرامن سفارت کاری اس وقت کتنی مفید ثابت ہو سکے گی جب روبہ زوال اور حزل سوویت یونین جارحانہ اقدام کرنے پر اتر آئے؟ یہ حقیقت ہے کہ ایسے فرضی سوالوں کا کوئی جواب نہیں! تاہم ایک سراسر تجارتی ملک' جس کی دفاعی قوت محدود ہو' کسی نہ کسی دن اس سوال کا جواب فراہم کر دے گا۔ جیسا کہ ماضی میں بعض ممالک کے ساتھ یہ تجربہ پیش آتا رہا ہے کہ کاروباری مہارت اور دولت کا انبار بسا اوقات سیاسی طاقت کی اس نراجی دنیا میں کافی نہیں ہوا کرتا۔

یورپی اقتصادی برادری ــــــــ صلاحیتیں اور مسائل

آج اقتصادی اور عسکری لحاظ سے دنیا میں پانچ طاقتی مراکز ہیں۔ ان میں صرف ایک یورپ ہے جہاں شہنشاہیت نہیں۔ یہی وہ عنصر ہے جو اکیسویں صدی کے اوائل میں بڑی طاقت کے حوالے سے اس کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اگر ہم براعظم کے مستقبل کے امکانات کا مطالعہ کرتے ہوئے مشرق میں کمیونزم کے زیر تسلط حکومتوں کو علیحدہ کر دیں' تو بھی چند ایسے ممالک باقی رہ جاتے ہیں جو اقتصادی و سیاسی تنظیم (ای ای سی) کے رکن تو ہیں' لیکن عسکری اتحاد (نیٹو) کے ممبر نہیں! پھر بعض ممالک ایسے ہیں جو نیٹو سے تو منسلک ہیں مگر یورپی اقتصادی برادری سے وابستہ نہیں! نیز' ایسے غیر جانب دار مگر نہایت اہم ملک بھی ہیں جن کا دونوں میں کسی ایک سے بھی تعلق نہیں! یورپ کی اس بے ربط و بے قاعدہ صورت حال کے پیش نظر کتاب کے زیر نظر حصے میں یورپی اقتصادی برادری (ای ای سی) کا بھرپور جائزہ لیا جائے گا۔ نیز' اس برادری کے چند ممتاز ممبران کی پالیسیوں کا بھی تذکرہ ہو گا۔ اس ضمن میں تمام غیر کیمونسٹ یورپ کا ذکر مناسب نہیں ہو گا۔ ہمارے اس اقدام کی وجہ محض یہ ہے کہ "ای ای سی" ہی ایک ایسی تنظیم اس وقت موجود ہے جس میں پانچویں عالمی طاقت بننے کی بھرپور صلاحیت ہے۔

چونکہ ہم ای ای سی کی صلاحیتوں کا جائزہ لے رہے ہیں' لہٰذا یہ سوال کہ ۲۰۰۰ء یا ۲۰۲۰ء میں اس خطے کی کیا صورت ہو گی' لامحالہ اس تجزیے میں شامل ہو جاتا ہے۔ بعض معاملات میں یہ صورت حال انیسویں صدی کے وسط کی جرمن فیڈریشن کے ممبر ممالک سے کسی نہ کسی حد تک ملتی ہے۔ وہاں ایک "کسٹم انجمن" قائم تھی۔ تجارت و صنعت کو نہایت تیزی سے فروغ دینے میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی' اس سے متاثر ہو کر نئے ممبران اس میں شامل ہو گئے۔ پھر اس وقت یہ حقیقت بالکل حرج تھی کہ اگر یہ وسیع کاروباری طبقہ ایک طاقتور ریاست کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے تو بین الاقوامی سسٹم میں یہ ایک اہم کردار بن جائے گا۔ نتیجتاً" اس وقت کی بڑی طاقتیں اس سے سمجھوتہ کر لیں گی۔ لیکن یہ صورت حال پیدا نہ ہو سکی۔ "کسٹم انجمن" کے اراکین کے درمیان اس بات پر تفرقہ پڑ گیا کہ مزید اقتصادی' سیاسی اور فوجی تکمیلات کی جائیں یا نہیں! پھر ان میں اس بات پر جھگڑا ہونے لگا کہ کون ملک فرماں روائی اور قیادت کا مستحق ہے۔ اس سے وابستہ مختلف جماعتیں اور "پریشر گروپ" نفع و نقصان کے معاملے میں بھی آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ بہرحال' جب تک یہ انجمن قائم رہی' بنی رہی۔ یہ اپنی صلاحیت سے "کفا" نا آشنا تھی۔ یہ دیگر بڑی طاقتوں کے ساتھ کبھی بھی برابری کی سطح پر معاملہ نہ کر سکی۔ گزشتہ صدی میں جرمنی کا جو معاملہ تھا' وہ وقت اور حالات کی تبدیلی کے باوجود موجودہ دور کے یورپ کا بھی اہم معاملہ بنا ہوا ہے۔

جہاں تک "ای ای سی" کی صلاحیت کا سوال ہے تو واضح رہے کہ یہ حقیقت اس بات سے عیاں ہے کہ اس کا رقبہ وسیع ہے' اس کے پاس دولت کا انبار ہے' اس کی پیداواری استعداد اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اور ان خصوصیتوں کی بنا پر اسے ایک بڑی طاقت کا درجہ حاصل ہے۔ اسپین اور پرتگال کو ملانے کے بعد اس کے بارہ اراکین پر مشتمل آبادی ۳۲۰ ملین کے قریب ہے۔ جو سوویت یونین کی آبادی سے ۵۰

ملین اور امریکی آبادی سے نصف زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں' یہاں کے لوگ خاصے تجربہ کار ہیں۔ تمام یورپ میں سینکڑوں یونیورسٹیاں اور کالج موجود ہیں۔ سائنس دان اور انجینئر لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ اگرچہ یورپی برادری کی فی کس اوسط آمدنی اور مغربی جرمنی اور پرتگال کی فی کس آمدنی میں خاصا فرق ہے' پھر بھی مجموعی طور پر روس سے بہت زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ اس برادری کے بعض ممالک میں فی کس آمدنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے بھی زیادہ ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے' یورپی اقتصادی برادری دنیا میں تجارت کا بہت بڑا بلاک ہے' اگرچہ یہ یورپی ممالک کے درمیان ہی گردش کرتی رہتی ہے۔ یہاں کی مستحکم معیشت کا دارومدار برآمدی پیداوار پر ہے۔ مثلاً" آٹوموبائل' فولاد' سیمنٹ وغیرہا اور یہی چیز اسے امریکہ' جاپان اور روس سے ممتاز کرتی ہے۔ سالانہ اعداد و شمار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور گزشتہ چھ سال کے دوران یورپی کرنسیوں کی مناسبت سے ڈالر کی شرح مبادلہ کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۶ء میں یورپی برادری کی مجموعی قومی پیداوار امریکہ کی مجموعی قومی پیداوار کے مساوی تھی' جبکہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں دو تہائی زیادہ تھی۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ دنیا کی مجموعی قومی پیداوار یا برآمدی صنعت میں یورپی برادری کا حصہ روس' جاپان اور چین کے حصص سے کہیں زیادہ ہے۔

عسکری لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو یورپی برادری کے ممبر ممالک قطعاً" بے مایہ نہیں! صرف چار بڑے ممالک (مغربی جرمنی' فرانس' برطانیہ اور اٹلی) کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت حیرت ہو جائے گی کہ ان کی مشترکہ باقاعدہ فوج میں ایک ملین سے بھی زیادہ نفری موجود ہے جبکہ محفوظ دستے ۷ملین سپاہیوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روسی اور چینی افواج کے مقابلے میں یہ تعداد خاصی قلیل ہے' لیکن امریکی فوج کی نسبتاً" خاصی زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں' ان چاروں ممالک کے پاس بڑے بڑے سینکڑوں جنگی جہاز اور سب میرین' ہزاروں ٹینک' توپ اور لڑاکا طیارے موجود ہیں۔ پھر فرانس اور برطانیہ دونوں کے پاس ایٹمی ہتھیار اور ڈلیوری سسٹم ہیں جو سمندروں اور زمین میں نصب کیے گئے ہیں۔ ان فوجی طاقتوں کی کارکردگی اور اثرات کے متعلق باتیں آگے بیان کی جائیں گی۔ یہاں صرف یہ نکتہ واضح کرنا ہے کہ جب یہ طاقتیں کبھی اکٹھا ہو جائیں تو پھر ان کی کارکردگی اور اثرات کی کوئی حد نہیں! پھر یہ بات بھی مد نظر رہے ایک اندازے کے مطابق مذکورہ ملکوں کی مجموعی قومی پیداوار کا ۴ فی صد حصہ ان کی افواج پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر یورپی برادری کے سارے ممبر ممالک اپنی مجموعی قومی پیداوار کا صرف ۷ فی صد حصہ دفاع پر خرچ کرتے ہیں' جیسا کہ آج امریکہ کر رہا ہے' تو یہ رقم سینکڑوں بلین ڈالر کے مساوی ہو گی جتنی دو سپر طاقتیں فوج پر خرچ کر رہی ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اپنی اقتصادی اور عسکری قوت کے باوجود دنیا میں یورپ کی صحیح طاقت اور موثر کارکردگی کا احساس خاصا کم ہے۔ اس کی تمام تر وجہ محض نااتفاقی ہے۔ مثال کے طور پر مسلح افواج کو متعدد زبانوں کا مسئلہ درپیش رہتا ہے۔ واضح رہے کہ جرمن فیڈریشن سے وابستہ ممالک کو یہ دشواری نہ تھی۔ پھر ان کے پاس مختلف طرح کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ ان کے معیار اور تربیت میں نمایاں فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مغربی جرمنی اور یونان کی بری فوج کی مثال دی جا سکتی ہے' یا پھر انگلستان کی شاہی

بحریہ اور ہسپانوی بحریہ کا فرق واضح کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ نیٹو نے ان مشترکہ افواج کا عسکری معیار بلند کرنے کی خاصی کوشش کی تھی' اس کے باوجود بری' بحری اور فضائیہ کے درجنوں فوجیوں کی کارکردگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ بہرحال یہ مسائل اتنے اہم نظر نہیں آتے جتنی شدید وہ رکاوٹیں ہیں جو سیاسی سطح پر حائل ہیں۔ جن کی وجہ سے یورپ کی خارجی اور دفاعی پالیسی کی ترجیحات ڈانواں ڈول رہتی ہیں' مثلاً" آئرلینڈ شروع سے جانب دار رہا ہے۔ اس کی خاطر یورپی برادری دفاعی مسائل پر بحث و مباحثہ کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ بفرض محال ایسا کرنا بھی پڑے تو یونان کے اعتراضات کی وجہ سے بس کچھ فت ربود ہو جاتا ہے۔ ترکی' جس کے پاس بہت بڑی فوج ہے' یورپی برادری کا رکن نہیں ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ترکی اور یونان کی افواج ایک دوسرے کی جانب سے متفکر رہتی ہیں انہیں وارسا پیکٹ کا چنداں خیال نہیں آتا۔ فرانس کا آزاد پسند رویہ فوجی لحاظ سے فائدہ مند بھی ہے اور نقصان دہ بھی! اس طرح دفاعی اور خارجہ پالیسی کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ برطانیہ اور فرانس دونوں اپنے اپنے علاقے سے دور مقبوضات کی ہوس میں مبتلا رہے ہیں اور اب بھی سمندر پار ممالک میں ان کے اڈے اور فوجی دستے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ مغربی جرمنی میں دفاع کا معاملہ خاصا اہم بنا ہوا ہے اور اس کی مسلح افواج اسی لحاظ سے چاق و چوبند رکھی گئی ہیں۔ اس کی تمام تر توجہ ملک کی مشرقی سرحد کا دفاع ہے۔ یورپ میں مشترکہ طور پر کسی خارجی پالیسی کا نفاذ خاصا مشکل کام ہے۔ چاہے فلسطین کا معاملہ ہو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا مسئلہ' برادری کے ارکان کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہوتے۔ اس کی تمام تر وجہ ان ممالک کی مختلف النوع دلچسپی' مفادات اور تہذیبی اقدار ہیں۔

یورپی اقتصادی برادری کاروباری سالمیت اور قانونی و اداری تنظیم کے معاملے میں سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ معیشت کو فروغ دینے کے سلسلے میں جو فیصلے ہوتے ہیں ان پر عمل درآمد کے لیے مناسب انتظامات موجود ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "اقتصادی برادری" ہونے کے باوجود وہ خود مختار ریاستوں سے زیادہ متزلزل ہے۔ سیاسی نظریات اقتصادی پالیسی اور ترجیحات پر ہمیشہ اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ رابطہ کاری اگرچہ ناممکن نہیں' تاہم مشکل ضرور ہے' خصوصاً" ایسے حالات میں جب برادری کے بعض ممبر ممالک میں سوشلسٹ حکومت قائم ہو اور بعض میں قدامت پسند جماعت برسر اقتدار ہو۔ اگرچہ برادری سے وابستہ ممالک میں کرنسی کا مبادلہ پہلے کی نسبت زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے' لیکن بسا اوقات بدل پذیری میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں (خصوصاً" جرمن مارک کے سلسلے میں)' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سبھوں کا مالیاتی نظام جدا جدا ہے۔ اسی طرح لین دین کا طریق کار بھی مختلف ہے۔ اگرچہ یورپی کمیشن نے ہوائی جہاز سے لے کر مالیاتی نظام تک' ہر موضوع پر اپنی تجاویز پیش کر دی ہیں' تاہم ان پر عمل درآمد میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے اور یورپی برادری کی یکساں پالیسی ہنوز تشنہ تکمیل ہے۔ حالانکہ ان ممالک کی سرحدیں عام ہیں' اس کے باوجود مختلف مقامات پر ناکے / چیک پوسٹیں موجود ہیں جہاں سامان کی اچھی خاصی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اس طویل دورانیے سے ٹرک ڈرائیوروں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ زراعت اس برادری کے اخراجات کی کفیل ہے اور معیشت کے ذرائع میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔ نیز اس کی منڈی بھی ممبر

ممالک میں مشترک ہے۔ اس کے باوجود یہ بنائے فساد بنی ہوئی ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ دنیا میں غذائی اشیاء کی پیداوار میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک بیرونی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ ایسی صورت میں "ای ای سی" پر دباؤ ڈالا جائے گا کہ وہ اپنی قیمت سازا پالیسی میں اصلاح کرے۔ نتیجتاً" یہ معاملہ دوبارہ شدید مخالفت آرائی کا پیش خیمہ بن جائے گا۔

آخری بات یہ کہ بعد از جنگ کے عشروں میں یورپ نے اقتصادی استحکام اور ترقی حاصل کی تھی۔ لیکن اب مسلسل یہ تشویش لاحق ہے کہ وہ ترقی کرنے کے بجائے سکڑنے لگا ہے اور شاید عنقریب روبہ زوال ہو جائے۔ ۱۹۷۹ء میں تیل کے بحران سے مسائل اور بھی پیچیدہ ہوئے ہیں۔ یعنی ایندھن کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، توازن ادائیگی بگڑ گیا، عالمی سطح پر طلب، برآمد اور تجارت میں کمی آ گئی۔ لیکن ان اسباب و عوامل سے اہل یورپ کو دنیا کے دیگر باشندوں سے کہیں زیادہ نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حقیقت کا اظہار جدول ۳۵ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

جدول نمبر ۳۵: مجموعی قومی پیداوار کی شرح ترقی

۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۳ء

(فی صد)

	۱۹۷۹ء	۱۹۸۰ء	۱۹۸۱ء	۱۹۸۲ء	۱۹۸۳ء
امریکہ	۲٫۸	-۰٫۳	۲٫۶	-۰٫۵	۲٫۳
کینیڈا	۳٫۳	۱	۳	-۳٫۲	۳
جاپان	۵٫۱	۴٫۹	۴	۳٫۲	۳
چین	۷	۵٫۲	۳	۷٫۳	۹
یورپی اقتصادی برادری (۱۰)	۳٫۵	۱٫۱	-۰٫۳	۰٫۵	۰٫۸

اس کساد بازاری سے یورپ کو جو نقصان پہنچے، ان میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری بھی ہے۔ حالیہ برسوں میں مغربی یورپ میں بے روزگار ہونے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے جو ۱۹۴۵ء کے بعد کے زمانے میں کبھی بھی نہیں تھی۔ مثلاً" ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک کے عرصے میں صرف یورپی اقتصادی برادری سے وابستہ ممالک میں بے روزگاروں کی تعداد ۵٫۹ ملین سے بڑھ کر ۱۰٫۲ ملین ہو گئی۔ اس میں کمی کے آثار نہیں! اس صورت حال کے نتیجے میں معاشرے کے وہ اخراجات جو پہلے ہی بہت زیادہ تھے، ان میں مزید اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ سرمایہ کاری کی شرح خاصی گر گئی۔ نئی ملازمتوں کی فراہمی اس سطح پر نہیں ہو پا رہی جس سطح پر امریکہ میں ہوئی ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بتائی جائے کہ کاروبار کے لیے کوئی ترغیبی عمل نہیں، محنت بازار کی اونچی قیمت اور حرکت نا پذیری، نوکر شاہی کے حد سے زیادہ قاعدے قانون (جیسا کہ دائیں بازو

والے چاہتے ہیں)، مناسب سرمایہ کاری کے سلسلے میں حکومت کی ناکامی وغیرہ۔ بعض نقادوں کی رائے ہے کہ مستقبل کے حوالے سے اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی میں اپنے امریکی اور جاپانی مسابقتوں سے کافی پیچھے رہ گیا یورپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی کمیشن نے اپنی سالانہ اقتصادی رپورٹ بابت ۸۴-۱۹۸۳ء میں خبردار کیا تھا:

"اب برادری کو اپنی کم مائیگی کے چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اسے صنعتی صلاحیت اور تیزی سے فروغ پاتی ہوئی نئی نئی ٹیکنالوجی کے سلسلے میں امریکہ اور جاپان کے ساتھ اپنی کارکردگی کا موازنہ کرنا ضروری ہے۔ برادری کمپیوٹرز، بجلی کے سامان اور دیگر اشیاء کی عالمی سطح کی تجارت میں خاصی ناکام ہو چکی ہے اور یہ بات عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے۔"

ایسا لگتا ہے یورپ کی زبوں حالی اور قنوطیت کی یہ تصویر کچھ زیادہ ہی مایوسانہ انداز میں پیش کی گئی ہے، حالانکہ اس ملک کی دیگر خصوصیات بھی ہیں۔ اعلیٰ درجے کا آٹو موبائل کا کام، تجارتی اور ہوائی طیارے کی صنعت، سٹیلائٹ کی تیاری، کیمیکل کے کارخانے، مواصلات کا عمدہ نظام، مالیاتی ادارے ---- یہ سب عوامل اس کے استحکام کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ تاہم، دو اہم معاملات خاصے مشکوک نظر آتے ہیں۔ کیا یورپی اقتصادی برادری اپنے متنوع سیاسی و تمدنی مزاج رکھنے والے اراکین کی موجودگی میں سمندر پار حریفوں کے مقابلے میں روزگار کے بدلتے ہوئے طریق کار میں نمایاں تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ کیا یہ برادری بدلتے ہوئی معاشی حالات کے اثرات سے زراعت پارچہ بافی، جہاز سازی، کوئلہ اور لوہے کی معدنیات کو محفوظ رکھ سکتی ہے؟ کیا اپنے قلیل المیعاد مقاصد کی خاطر طویل المیعاد منصوبوں کی نقصان پہنچا سکتی ہے؟ کیا یہ سائنسی تجربات اور سرمایہ کے وسائل کو متحرک کر سکتی ہے تاکہ اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی میں اسے نمایاں مقام حاصل ہو؟ کیا وہ ایسے اقدامات ان حالات میں کر سکتی ہے جبکہ اس کی اپنی کمپنیاں امریکی اور جاپانی فرموں کی پاسنگ بھی نہیں؟ کیا اس سے وابستہ بارہ حکومتیں اور خود یورپی اقتصادی برادری کا کمیشن مختلف ترجیحات کے باوجود ایک جیسی صنعتی حکمت عملی پر صاد کر سکتا ہے؟

اگر یورپی اقتصادی برادری کے جملہ معاملات سے توجہ ہٹا کر یورپ کے تین فوجی اور سیاسی اہمیت کے حامل ممالک پر نظر دوڑائی جائے اور ان کے حالات کا محاکمہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ بھی ویسے ہی مسائل سے دوچار ہیں اور ان کی صلاحیتیں بھی معرض خطر میں ہیں۔ مستقبل کے حوالے سے دلگرفتگی کی یہ کیفیت وفاقی جمہوریہ جرمنی کے سوا کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ اس کی تمام تر وجہ ماضی کی باقیات ہیں۔ پھر یورپ کی موجودہ ہیئت محض عارضی نوعیت کی ہے۔

بہت سے جرمن باشندے اکیسویں صدی کے آغاز میں اپنے ملک کی بہتر اقتصادی حالت کے متعلق فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن دوسرے معاشروں کے حالات کو دیکھتے ہوئے ان کی یہ تشویش اتنی گمبھیر معلوم نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس کی افرادی قوت برطانیہ اور فرانس کے مقابلے میں کچھ ہی زیادہ ہے، لیکن یہ مجموعی قومی پیداوار میں ان سے بہت آگے ہے۔ اس ملک کی طویل المیعاد پیداواری ترقی ہمیشہ موثر

رہی ہے۔ یورپی اقتصادی برادری میں جرمنی لوہا، کیمیکل، بجلی کے سامان، آٹوموبائیل اور ٹرکنگ میں ایک ممتاز صنعت کار کی حیثیت رکھتا ہے اور برطانیہ کی جہاز سازی اور کوئلے کی کان کنی میں تنزل کے بعد یہی ملک ان دونوں چیزوں میں نمایاں مقام حاصل کر گیا ہے۔ چونکہ جرمنی میں افراط زر اور تنازعات محنت کا کوئی مسئلہ شدت کا حامل نہیں، لہٰذا اس نے اپنے برآمدی سامان کی قیمت مسابقتی رکھی ہے، حالانکہ مارک کی قیمت ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کارکردگی کے باعث دیگر ممالک نے مغربی جرمنی کی بہتر اقتصادی حالت کو سراہا ہے۔ جرمنی نے اپنی روایت برقرار رکھتے ہوئے انجینئرنگ اور ڈیزائن کو خاصی اہمیت دی ہے (جبکہ امریکہ مالیات پر زور دیتا ہے)۔ چنانچہ دنیا بھر میں اس کی اعلیٰ مصنوعات کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ہر سال، جرمنی کے تجارتی توازن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ ملک جاپان کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ جاپان کے بعد یہ واحد ملک ہے جس کے بین الاقوامی ذخائر ہر ملک سے زیادہ ہیں۔ اہم بات یہ کہ مارک کو دیگر ممالک کے لوگ بھی محفوظ کرنسی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود کچھ ایسے معاملات ہیں جو جرمنوں کے لیے باعث تشویش ہیں، مثلاً یورپی برادری کا زراعت کا سبسڈی نظام اہل جرمن پر خاصا بوجھ بنا ہوا ہے۔ اس سسٹم کے تحت اہم مسابقتی معیشت کی بجائے کم مسابقتی معیشت میں قومی وسائل صرف کیے جاتے ہیں۔ یہ معاملہ محض وفاقی جمہوریہ جرمنی ہی میں نہیں جہاں بے شمار چھوٹے چھوٹے زراعتی فارم ہیں، بلکہ جنوبی یورپ کے کسان بھی اس سے دو چار ہیں۔ اگرچہ یہ طریقہ سماجی اہمیت کا حامل ہے، لیکن یہ سراسر بوجھ بھی ہے۔ امریکہ اور جاپان کے کسانوں کو جو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے، اس کے مقابلے میں یہ یورپی طریقہ بے مایہ لگتا ہے۔ علاوہ ازیں، وفاقی جرمنی میں بے روزگاری کا مسئلہ بھی اس ملک کی معیشت پر ایک بوجھ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ مجموعی قومی پیداوار کا ایک معتدبہ حصہ سماجی تحفظ پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بے روزگار نوجوانوں کی تربیت اور کار آموزی وسیع پیمانے پر کی جا رہی ہے اور آبادی کے معمر ہونے سے بھی مسئلہ حل ہوتا جا رہا ہے، لیکن آخرالذکر رجحان نے خاصی بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اگر یہ مبالغہ آمیز انداز میں سوچا جا رہا ہے کہ جرمن نسل ختم ہو جائے گی تو شرح پیدائش کی کمی بھی جرمنی کی معیشت پر مضر اثرات مرتب کرے گی، اس لیے کہ آبادی کا کثیر حصہ پنشن وصول کرنے والا ہو گیا۔ پیدائش و موت کے اس تشویشناک اعداد و شمار کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی فکر انگیز ہے کہ آنے والی نسل اس جوش و جذبے کے ساتھ کام نہیں کرے گی، جس طرح اس کے بزرگوں نے خدمت انجام دی اور جنگ کی راکھ سے جرمنی کی تعمیر نو کی تھی۔ پھر یہ بات بھی تشویش کا باعث ہے کہ معقول اجرت اور فی ہفتہ کام کا مختصر دورانیہ جو جاپان میں بھی نہیں، جرمنی کی پیداوار کو قطعاً فروغ نہیں دے سکتا۔ اور اس طرح بحرالکاہل کے ممالک کا چیلنج قبول کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

مذکورہ کوئی بھی مسئلہ لاینحل نہیں۔ اس سلسلے میں جرمنی کو ایک پروگرام کے تحت قلیل افراط زر مصنوعات کی گرانی، نئی ٹیکنالوجی میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری، اعلیٰ درجے کی ایڈوائزنگ، فروش کاری اور امن محنت کی جانب توجہ دینی ہو گی۔ یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر مذکورہ مسائل جرمن

معیشت پر اثر انداز ہوتے ہیں تو اس ملک سے کم تر درجے کے سابق پڑوسیوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ یہاں اس بات کی پیشن گوئی کرنی سخت مشکل ہے کہ ۱۹۹۰ء کے آخری عشرے سے جرمنی کی جو پیچیدہ صورت حال رہی ہے، کیا وہ اکیسویں صدی میں بھی ایسی ہی رہے گی۔ بادی النظر میں یوں کہیے کہ کیا اس وقت بھی جرمنی کے دو حصے ہوں گے۔ باہمی یگانگت کے باوجود جابر اتحادی اس صدی میں بھی اسے الگ تھلگ رکھیں گے۔ کیا نیٹو جس کا وفاقی جرمنی ایک سرگرم رکن ہے، اس ملک کے علاقے کی مدافعت کر سکے گا۔ کیا یہ اہل جرمن کو تباہی سے بچا لے گا، جب مشرق و مغرب کے تعلقات حد سے زیادہ کشیدہ ہو جائیں گے اور نوبت خانہ جنگی تک پہنچ جائے گی۔ اگر امریکہ کی طاقت میں تخفیف ہو جائے اور یورپ میں تعینات امریکی فوج میں کمی کر دی جائے تو کیا اس صورت میں جرمنی اور اس کے اہم اور شریک یورپی اقتصادی برادری اور نیٹو امریکہ کی اس عسکری چھتری کا نعم البدل مہیا کر لیں گے جس نے چالیس تک اس ملک کی حفاظت کی ہے۔ اگرچہ ان مربوط مسائل کے فوری حل کی چنداں ضرورت نہیں، پھر بھی یہ مبصرین کے لیے لمحہ فکریہ ضرور ہے۔

دونوں جرمنی کے درمیان تعلقات کا معاملہ سربستہ مفروضوں کا پلندہ نظر آتا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں وضاحت کی جا چکی ہے، یورپ کے ریاستی نظام میں جرمن قوم کے صحیح مقام کا معاملہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے سیاست دانوں کے لیے سوہان روح بنا رہا ہے۔ اگر تمام جرمن زبان والوں کی اپنی ریاست ہو تو اس کے نتیجے میں مجموعی آبادی اور صنعتی طاقت مل کر جرمنی کو وسطی یورپ کی ایک اہم اقتصادی قوت بنا دیں۔ لیکن یہ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ یہ ملک اپنی گزشتہ قیادت کے تجربے کی بناء پر یورپ کی عسکری قوت بن جائے اور سب پر بالادستی حاصل کر لے۔ ایک ایسی دو قطبی دنیا میں جہاں فوجی لحاظ سے واشنگٹن اور ماسکو کی بالادستی قائم ہے، اور ایک ایسے دور میں جب اہم بڑی طاقت کی جارحیت ایٹمی جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے، یورپ پر جرمنی کے تسلط کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بفرض محال، جرمنی ایسی کوشش کرے بھی تو یورپ کی مجموعی طاقت اسے ایسا کرنے سے بالکل روک دے گی۔ بہرحال، اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مغربی جرمنی کے ۶۲ ملین اور مشرقی جرمنی کے ۱۷ ملین باشندوں کو یکجا ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ واضح رہے کہ ہر دو جانب کی آبادی قدرتی طور پر یہ سوچتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے کہیں زیادہ مماثلت رکھتے ہیں بہ نسبت اس سپرپاور کے جو ان کی چوکسی کر رہا ہے۔

مذکورہ مسئلے کا حل خاصا مشکل نظر آتا ہے۔ نیز، ہر دو جرمنی کے لوگ نظریاتی خلیج کے باوجود اپنی مشترکہ میراث اور تہذیب کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ موجودہ سیاسی حقائق اس بات کے منافی ہیں۔ اور جیسا کہ تجویز کی جا رہی ہے کہ انیسویں صدی کی طرز پر جرمنی کی ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن قائم کر دی جائے تو بھی امکان ہے کہ بات نہیں بنے گی۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ مشرقی جرمنی سوویت یونین کے مشرقی یورپ کے بفر زون پر قبضہ کرنے کی راہ میں حائل ہے اور فوجی مورچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادھر کریملن کے فرماں روا شاہی سیاست کے انداز میں سوچتے ہیں۔ لہٰذا جرمنی کے دونوں حصوں کے مدغم ہو جانے سے سوویت یونین کو سخت دھچکا پہنچے گا۔ ایک باوثوق ذریعے نے اس حقیقت کی نشاندہی کی

ہے کہ جرمنی کے دونوں حصوں کے باہمی اتحاد کی بدولت ۶۲۰۰۰۰ مستقل فوجی دستے اور ۱٫۵ ملین ہیرا ملٹری اور محفوظ دستے میدان جنگ میں صف آرا ہو سکتے ہیں۔ اور سوویت یونین یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ جرمن قوم متحد ہو جائے اور اس کی مشترکہ ۲ ملین فوج روس کے مغربی محاذ پر تعینات ہو جائے۔ دوسری جانب' یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ پرامن طور پر متحد ہو جانے والی جرمن قوم کو اتنی بڑی فوج رکھنے کی کیا ضرورت لاحق ہو گی جبکہ یہ موجودہ دور میں ناقابل یقین ہے کہ کہاں تو جرمنی میں دوسری جنگ عظیم سے سبق لینے کا خیال جاگزیں ہے اور کہاں انتقام لینے اور نازی تحریک کو جنم دینے کا پروپیگنڈا بھی جاری ہے۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ سوویت یونین کسی جگہ سے بھی اپنی فوج ہٹانے کا روا دار نہیں۔ اسے یہ فکر بھی لاحق ہے کہ جرمنی کے باہم متحد ہو جانے سے سیاسی نقشہ کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔ وہ اقتصادی لحاظ سے نہایت زبردست طاقت بن جائے گا۔ اس کی مجموعی قومی پیداوار روس کے برابر ہو جائے گی۔ پھر وہ مشرقی یورپ کے پڑوسیوں کے لیے تجارت کا پرکشش مرکز بھی بن جائے گا۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ روس مشرقی جرمنی سے علیحدگی تو اختیار کر لے' مگر اس طرح چیکو سلواکیہ' ہنگری اور پولینڈ چھوڑنے کا سوال بھی اٹھ کھڑا ہو گا۔ پھر اس کے نتیجے میں سوویت یونین کو پولینڈ/ یوکرین کی وہ سرحدی پٹی بھی چھوڑنی پڑے گی جس کے قریب ہی ۵۰ ملین اہل یوکرین آباد ہیں۔

فی الحال فضا کچھ ایسی امید افزاء نہیں تاہم اس کے آثار موجود ہیں۔ دونوں جرمن ممالک کی تجارت کے فروغ پانے کے روشن امکانات ہیں۔ (البتہ سپرپاورز کی آپس کی چپقلش سے مضر اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔) ہر جرمن ملک اپنے پڑوسی ممالک کی نسبت زیادہ بار آور اور دولت مند بن سکتا ہے۔ ہر ایک ریاست جہاں اپنے فوجی سرپرست ادارے' نیٹو اور وارسا پیکٹ نیز اقتصادی تنظیموں (ای ای سی/ کومیکون) سے وفاداری کا ثبوت دے گی وہاں اپنی جڑواں حکومت کے ساتھ بھی تعلقات استوار کرے گی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر سوویت یونین زوال پزیر ہو جاتا ہے تو اس صورت میں بون کا کیا رد عمل ہو گا۔ اور کیا جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک میں پیدا ہونے والی شدید بے چینی سے مطابقت ہو سکے گی؟ یہ بھی قبل از وقت کہنا مشکل ہے کہ اگر وارسا پیکٹ کے تحت مغربی جرمنی پر جارحانہ حملہ ہوتا ہے تو مشرقی جرمنی کس رد عمل کا اظہار کرے گا۔ چونکہ ڈیموکریٹک ریپبلک جرمنی کی فوج پر سوویت یونین کا خصوصی کنٹرول ہے اور وہاں کے ہر ڈویژن کے اوپر روسی ڈویژن مسلط ہے' لہٰذا کریملن کی حکومت کا ہر شخص دونوں جرمن ریاستوں کے باہمی جھگڑے کے تصور سے ہی لرزہ براندام رہے گا۔

وفاقی جمہوریہ جرمنی کو اپنے قیام کے بعد سے ہی ایک اہم مسئلہ درپیش رہا ہے جو اب بھی موجود ہے' یعنی اگر یورپ میں جنگ چھڑ جاتی ہے تو اس صورت میں اس کی مناسب پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ اسے ابتداء سے ہی یہ خدشہ لاحق رہا ہے کہ اگر اعلیٰ درجے کی سرخ فوج بلا کسی مزاحمت کے مغربی سمت میں

محاذ آرائی شروع کر دیتی ہے تو ایسی صورت حال میں دونوں جرمن ریاستوں اور ان کے ساتھی یورپی ممالک کو لامحالہ امریکہ کی ایٹمی طاقت کا سہارا لینا پڑے گا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ روس نے اپنے آئی سی بی ایم میزائلوں کے ذریعے اتنی ایٹمی قوت حاصل کر لی ہے کہ وہ براہ راست امریکہ کی سرزمین کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ تو کیا امریکہ ایسی صورت میں جرمنی کے علاقے پر روسی حملے کا جواب دے سکتا ہے؟ یہ سوال بھی اسی سے ملتا جلتا ہے کہ کیا امریکہ روس کے خلاف وسیع پیمانے پر ایٹمی جنگ کرنا پسند کرے گا جبکہ سوویت یونین یورپی اہداف پر محض گولی چلانے پر اکتفا کرے گا یا درمیانی مار کرنے والے میزائل (ایس ایس 20) پھینکے گا؟ یہ امر واقعہ ہے کہ ایسے ناسازگار حالات کا سامنا کرنے کے لیے مناسب مزاحمتی طریقے اپنانے کی تجویزیں پیش کی جاتی رہی ہیں ----- مثلاً "پرشنگ دوم" اور دیگر کروز میزائل سسٹم والے آلات کی تنصیب تاکہ روس کے ایس ایس-20 کے حملے کا جواب دیا جا سکے۔ اعلیٰ درجے کی تابکاری کے بم (نیوٹران بم) بنائے جائیں تاکہ جب بھی وارسا پیکٹ کے فوجی دستے حملہ کریں تو ان پر پھینکا جائے۔ اس طرح حملہ آور تو ہلاک ہو جائیں گے لیکن عمارات اور کارخانوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ فرانس کے معاملے میں یہ صورت اختیار کی جائے کہ وہاں ایک ایسی دفاعی فوج ہو جس پر پیرس کا مکمل کنٹرول ہو۔ یہ دراصل امریکی فوج کے غیر یقینی دفاعی نظام کی صورت میں نعم البدل ثابت ہو گی۔ یہ سارے مسائل توجہ طلب ہیں۔ ان سے سیاسی رد عمل کا اظہار نہیں ہو گا۔ نیز ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایٹمی ہتھیار کے سسٹم میں متضادات قسم کی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کے رخ تبدیل ہونے کے امکانات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ جس چیز کا دفاع مقصود ہوتا ہے وہی تباہ و برباد کر دی جاتی ہے۔

یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ مغربی جرمنی کی بعد میں آنے والی انتظامیہ نے نیٹو کی ایٹمی مزاحمت کی حکمت عملی کی صرف زبانی کلامی حمایت کی تھی' اور خود اپنے لیے ایٹمی ہتھیار حاصل نہ کرنے کے لیے پہلے ہی قسم کھا لی تھی' لیکن مروجہ دفاعی نظام تشکیل دینے کے سلسلے میں وہ سب سے آگے آگے تھا۔ جیسا کہ واضح ہے جرمن ریاستوں کی مشترکہ کونسل کے پاس یورپ کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں نیٹو کی سب سے کثیر فوج موجود ہے' یعنی ۳۳۵۰۰۰ فوجی دستے اور ۴۳۵۰۰۰ تربیت یافتہ محفوظ دستے۔ لیکن یہ سب کے سب اعلیٰ عسکری صلاحیتوں کے حامل ہیں اور ان کے پاس نہایت عمدہ قسم کے ہتھیار موجود ہیں۔ اگر اس کی فضائیہ کی صلاحیت برقرار رہتی ہے تو پھر یہ مشترکہ کونسل اپنی مثال آپ ہو گا۔ لیکن شرح پیدائش میں مسلسل اور شدید کمی پیدا ہونے کے باعث اسے اپنی بھرپور قوت کو تادیر قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ادھر حکومت اپنی مجموعی قومی پیداوار سے دفاعی اخراجات کو ۲٫۵ سے ۴ فی صد کم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلح افواج کے لیے ضروری فوجی سامان نہیں خریدا جا سکے گا۔ ممکن ہے کہ بعد میں یہ کمی پوری ہو جائے جس طرح مغربی جرمنی میں تعینات اتحادی فوجیوں کی وہ کمی پوری ہو گئی تھی جو ناقص عسکری سامان کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ بہرحال اس کے لیے سیاسی جذبہ درکار ہے۔ مختصر یہ کہ جرمن باشندے ہنوز اس ذہنی کرب میں مبتلا ہیں کہ اگر وسطی یورپ میں وسیع پیمانے پر تشدد و بربریت کے واقعات شروع ہو جاتے ہیں تو اس کے نتیجے میں نہ صرف بے پناہ خون ریزی ہو گی بلکہ شدید مالی نقصان بھی پہنچے گا

اور یہ سب کچھ ان کی سرزمین پر ہی رونما ہوگا۔

لہٰذا اس امر میں ذرا بھی تعجب نہیں کہ ولی برانڈٹ کی چانسلر شپ کے آغاز ہی سے بون کی حکومت یورپ میں باہمی کشیدگی کو رفع کرنے کی جدوجہد میں پیش رہی ہے' اور صرف اپنی جڑواں ریاست کے ساتھ ہی نہیں بلکہ مشرقی یورپ کے ممالک اور سوویت یونین کے ساتھ بھی تعلقات استوار رکھنے کی آرزو مند ہے۔ اس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ بہت ہی طاقتور جرمنی کا خوف ان سبھوں کے ذہن سے دور ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے نیٹو ساتھیوں سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر مشرقی و مغربی جرمنی کے درمیان تجارت کو فروغ دینے میں حصہ لیا ہے۔ اس کے پیش نظر مشہور ماہر اقتصادیات' رچرڈ کوپڑین کا یہ مقولہ رہا ہے کہ "آپس کے اقتصادی تعلقات کی وجہ سے جنگ کے امکانات باقی نہیں رہتے"۔ پھر اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مغربی جرمنی کے بینک اور صنعتیں اس کاروبار سے پوری طرح مستفیض بھی ہو رہی ہیں۔ لیکن اس اقدام کے یہ معنی نہیں کہ جرمنی کے دونوں حصوں کو "غیر جانب دار" بنانے کی کوئی تحریک چل رہی ہے۔ ویسے بائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹ اور گرین پارٹی کے لوگ اس نوع کی تجویز پیش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں اہم رکاوٹ یہ بھی ہے کہ مشرقی جرمنی کو غیر جانب داری اختیار کرنے کے لیے ماسکو سے اجازت لینی ہوگی جو ظاہراً ممکن نہیں۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مغربی جرمنی کا دفاعی مسئلہ محض یورپ تک محدود ہے' اور اس میں علاقے سے باہر کا کوئی خطرہ حائل نہیں۔ واضح رہے کہ فرانس اور برطانیہ دونوں بیرون یورپ عسکری اقدامات میں ہنوز ملوث ہیں۔ بہرحال مغربی جرمنی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنے پاؤں پھیلائے اور مشرق قریب اور اس سے بھی دور دراز علاقے میں اپنا کوئی مقام حاصل کرے۔ اس حتمی رویے کے نتیجے میں اسے امریکی حکومت سے جھگڑا بھی کرنا پڑا ہے جو یہ چاہتی ہے کہ مغربی ممالک کے تحفظ کا معاملہ وسطی یورپ تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ ایک طرف تو مغربی جرمنی کے تعلقات ماسکو اور مشرقی برلن کے ساتھ ہیں اور دوسری جانب غیر یورپی معاملات کے ساتھ اس کا لگاؤ بھی قائم ہے' ایسی صورت میں اس کے لیے دو طرفہ سفارت کاری بحال رکھنا خاصا مشکل ہے۔ اس کے برعکس اسے واشنگٹن اور پیرس کے رد عمل کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ اس کی تمام تر وجہ طاقت کے بین الاقوامی نظام میں مغربی جرمنی کا کمزور ترین مقام ہے۔

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے لیے اقتصادی چیلنج اتنا پیچیدہ نہیں جتنا پیچیدہ خارجہ پالیسی اور دفاعی پالیسی کے مسائل ہیں۔ لیکن یہی بات برطانیہ عظمیٰ پر صادق نہیں آتی۔ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ چنانچہ خارجہ پالیسی پر اس کی یہ پوزیشن خاصی اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں مطالعہ کر چکے ہیں' یہ بھی ان سابقہ بڑی طاقتوں میں شامل ہے جن کو ۱۹۴۵ء کے بعد کے عشروں میں بدلتی ہوئی ٹیکنالوجی اور معیشت کی وجہ سے اپنی اقتصادی اور سماجی حالت میں کوئی تغیر پیدا کرنا خاصا مشکل رہا ہے۔ یہ صورت حال مذکورہ عشروں سے پہلے بھی کسی نہ کسی حد تک رہی تھی۔ اس بدلتی ہوئی عالمی کیفیت کا سب سے زیادہ مضر اثر برطانیہ کی صنعت پر پڑا ہے' حالانکہ ایک زمانے میں یہ ملک "دنیا کی ورکشاپ" کہلاتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ دنیا کی متعدد ترقی یافتہ معیشت میں؟ برآمد اور ملازمت کی صنعتی

شرح آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی ہے۔ جبکہ دوسرے شعبوں میں ترقی ہوئی ہے۔ لیکن برطانیہ میں یہ شرح کچھ زیادہ تیزی سے گرتی رہی ہے۔ عالمی صنعتی پیداوار میں اس ملک کا تناسب کافی کم رہا ہے۔ زیادہ تشویشناک بات یہ رہی ہے کہ برطانیہ کی بیرونی تجارت میں مصنوعات کو بے ڈھنگے پن سے بدلا گیا ہے۔ تاہم اس ضمن میں "اکانومسٹ" کے اس سخت تبصرے کو ثابت کرنا خاصا مشکل کام ہے' جس کے مطابق "۱۹۸۳ء سے مصنوعات میں برطانیہ کا تجارتی توازن سراسر خسیری رہا ہے۔ برطانیہ پر رومنوں کے حملے کے بعد یہ صورت حال پہلی مرتبہ پیدا ہوئی ہے۔" لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں مصنوعات کی برآمدات' درآمدات کی نسبت تین گنا زیادہ تھیں۔ اب وہ توقیر ختم ہو چکی ہے۔ بلکہ حد تو یہ ہے کہ نہ صرف پرانے کارخانوں میں ملازمت کی تعداد کم ہو چکی ہے بلکہ اعلیٰ ٹکنالوجی کی حامل شہرت یافتہ فرموں میں بھی یہی صورت حال ہے۔

اگر برطانیہ اپنی مصنوعات میں دیگر ممالک کے ساتھ مسابقت کرنے میں اس لیے ناکام رہا ہے کہ اس کا طریقہ کار خاصا قدیم ہے تو دوسری جانب اس نے بحر شمالی میں تیل کے ذخائر دریافت کر کے اپنا معاشی مقام بلند بھی کر لیا ہے۔ اس طرح اس ملک نے اپنے تجارتی خسارے کو کم کر لیا ہے' نیز تیل کے ان ذخائر کی وجہ سے اسٹرلنگ نے کثیر القدر حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس کے برعکس جب تیل کے ذخائر دریافت نہیں ہوئے تھے اور اسٹرلنگ کی قیمت گھٹ جاتی ہے' لیکن اس صورت سے بھی صنعت سازی میں تبدیلی کا رجحان نمایاں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صنعتی پلانٹ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اور بیرونی منڈیاں ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہیں اور عالمی مسابقت کی وجہ سے لاگت محنت بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ البتہ برطانیہ میں متنوع ملازمتیں کافی حوصلہ افزا نظر آتی ہیں۔ لیکن اس شعبے میں بھی کم و بیش وہی حالت ہے جو امریکہ میں ہے' یعنی کھڑکیوں کی صفائی سے لے کر کھانا تیار کرنے تک کے کام تاہم ان کاموں سے نہ تو زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے اور نہ یہ بار آور ہوتے ہیں۔ پھر زیادہ تنخواہ والی ملازمتیں جو عموماً بین الاقوامی بینکوں' سرمایہ کاری کے محکموں' اشیاء کا لین دین کرنے والے اداروں میں ملتی ہیں وہ سخت مقابلے کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گزشتہ تیس برسوں میں دیگر ممالک کی نسبت برطانیہ میں ملازمتوں میں ۷ فی صد سے ۱۸ فی صد تک کی آ چکی ہے۔ بینکاری اور مالیاتی شعبہ عالمی سطح پر پھیل چکا ہے۔ اس پر امریکی اور جاپانی فرموں کی مخصوص اجارہ داری ہے۔ انھوں نے نیویارک' لندن اور ٹوکیو میں کثیر سرمایہ لگا رکھا ہے۔ لہٰذا خدشہ ہے کہ آئندہ اس شعبے میں برطانیہ کا لگایا ہوا حصہ کم سے کم ہوتا چلا جائے گا۔ آخری بات یہ کہ ٹیلی کمیونیکیشن اور دفتری سازو سامان کی تیاری مستقبل میں اتنی وسیع ہو جائے گی کہ تنخواہ دار ملازمین' محنت کش طبقے کی پیروی کرنے لگیں گے۔

بہرحال' مذکورہ حالات کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ثابت نہیں ہوں گے۔ دنیا کی پیداوار اور تجارت میں عمومی طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سے برطانیہ کی معیشت فروغ پائے گی چاہے عالمی پیداوار میں اس کی حصہ کم ہی کیوں نہ ہو جائے اور فی کس قومی پیداوار میں اٹلی اور سنگاپور اس ملک پر سبقت ہی کیوں نہ لے جائیں۔ لیکن اگر آنے والی حکومت پیداواری شعبے میں سرمایہ کاری کرنے کی بجائے

سماجی اور فلاحی کاموں پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے لگے، ٹیکس کی شرح میں اضافہ کر دے، کاروباری طبقہ کا اعتماد کھو بیٹھے اور اسٹرلنگ سے فرار حاصل کرلے تو ایسی صورت میں تنزل کا یہ عمل شدید ہو جائے گا اور اگر ایک ایسی حکومت اقتدار میں آئے جو سخت قسم کی مالیاتی پالیسی اختیار نہ کرے بلکہ یکساں صنعتی حکمت عملی اختیار کرے اور یورپی ممالک کے ساتھ غیر معیاری کاروبار میں شرکت کرے تو زوال کی صورت اور بھی شدید ہو جائے گی۔ ایک ماہر معاشیات کے خیال کے مطابق یہ بات بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ برطانیہ کی صنعت اب زیادہ قابل بھروسہ، موزوں و مناسب اور مسابقتی بن چکی ہے اور اس میں انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ لیکن اصل نتائج اتنے حوصلہ افزا نظر نہیں آتے۔ محنت مارکیٹ کی غیر متحرک کیفیت اور تربیت کی کمی، یونینوں کی چڑھتی ہوئی قیمتیں اور بڑی بڑی فرموں کی نہایت غیر معیاری کارکردگی۔۔۔۔۔ یہ تمام عوامل سد راہ بنے ہوئے ہیں۔ انجینئروں اور سائنس دانوں کی برآمد خاصی کم ہے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ تحقیق و ترقی کے کاموں میں سرمایہ کاری کا فقدان ہے۔ ۱۹۸۰ء کے ابتدائی عشرے میں جہاں برطانیہ میں اس کام کے لیے مثال کے طور پر ایک ڈالر خرچ کیا گیا، وہاں جرمنی ڈیڑھ ڈالر، جاپان میں تین ڈالر اور امریکہ میں آٹھ ڈالر خرچ کیے گئے۔ پھر برطانیہ نے مذکورہ رقم کا پچاس فی صد دفاعی اخراجات جیسے غیر برآمدی کام میں لگا دیا۔ اس کے مقابلے میں جرمنی نے ۹ فی صد اور جاپان نے برائے نام رقم صرف کی تھی۔ اگر برطانیہ کے اہم حریفوں سے ۔ جن میں امریکہ شامل نہیں)، مقابلہ کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ برطانوی تحقیق و ترقی صنعتی ضرورتوں کے بالکل مطابق نہیں اور وہاں کے صنعت کار اس کام کے لیے بہت قلیل رقم صرف کرتے ہیں۔

برطانیہ نے دفاع سے متعلق تحقیقی کام میں جو خاصا سرمایہ صرف کر دیا، اسے دیکھ کر اس ملک کے تذبذب کی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ملک واقعتاً" پرجوش نہیں اور سب سے الگ تھلگ رہنے والا ہے تو بھی اس کی ادنیٰ درجے کی صنعتی کارکردگی قابل افسوس ہے۔ اسطرح برطانیہ کے خصائص عالمی طاقت کے نظام کے لائق نہیں! اس کے باوجود وہ عہد وکٹوریہ کے آشین خمار سے اب بھی سرشار ہے اور خود کو دنیا کی متوسط درجے کی طاقت تصور کرتا ہے۔ اس کا دفاعی بجٹ دنیا میں تیسرے یا چوتھے نمبر پر ہے۔ اس کی بحریہ کو دنیا میں چوتھا مقام حاصل ہے۔ اس کی فضائیہ بھی چوتھے درجے پر فائز ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ سارے لوازمات اس کی بساط سے بڑھ کر ہیں۔ اس کا جغرافیائی حدود اربعہ محض ۲۴۵۰۰۰ مربع کلومیٹر، آبادی ۵۶ ملین اور عالمی قومی پیداوار میں اس کا حصہ کل ۳٫۳۸ فی صد (۱۹۸۳ء کے حساب سے) ہے۔ علاوہ ازیں، شہنشاہیت کے زوال کے باوجود اس نے بیرونی دنیا میں عسکری بساط بچھا رکھی ہے۔ اس نے نیٹو کے معاہدے کے تحت ساڑھے چھ لاکھ بری اور ہوائی فوج جرمنی میں تعینات کر دی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں قلعے اور بحری اڈے تعمیر کر لیے ہیں، مثلاً" بیلز، سائپرس، جبرالٹر، ہانگ کانگ، ناکلینڈ، برونائی اور بحر ہند جیسے علاقوں میں!

ایک طرف تو برطانیہ کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے اور دوسری جانب اس نے دنیا بھر میں فوجی جال بچھا رکھا ہے۔ یہ صورت حال ایسی ہے جس نے روس کے سوا دیگر بڑی طاقتوں کو بھی متاثر کر

رکھا ہے۔ برطانیہ کے لیے یہ بات سوہان روح بنی ہوئی ہے کہ افراط زر کے مقابلے میں ہتھیاروں کی قیمت ٦ سے ۱۰ فی صد تک بڑھ چکی ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ پرانے ہتھیاروں کی جگہ جو نئے نئے ہتھیار بنائے جاتے ہیں وہ سابقہ اسلحوں سے تین سے پانچ گنا زیادہ مہنگے ہوتے ہیں۔ پھر اس ملک کے لیے یہ بات بھی باعث تشویش ہے کہ دفاعی اخراجات پر عوام اور سیاست دان دونوں تنقید کر رہے ہیں۔ اگرچہ کنزرویٹو پارٹی کی حکومت فوجی ساز و سامان پر خرچ کرنا ضروری سمجھتی ہے تاکہ خسارے کو کم کیا جا سکے، لیکن دوسری آنے والی حکومت ممکن ہے ان تمام اخراجات کو ہی غت ربود کر دے۔ بہرحال، اس سیاسی تذبذب سے ہٹ کر برطانیہ کو جلد ہی یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ یا تو مسلح افواج کے بجٹ میں سرے سے تخفیف کر دی جائے یا پھر عوام کو دفاعی بوجھ سے تھوڑا بہت چھٹکارا دے دیا جائے۔

جب تک یہ اقدامات نہیں کیے جاتے، مصیبتیں بڑھتی ہی چلی جائیں گی۔ اس ملک میں فضائیہ کو حد سے زیادہ اولیت دی گئی ہے اور رائل ایئر فورس کا بجٹ بھی وافر ہے۔ پھر لڑاکا طیاروں کی قیمت بھی بے پناہ بڑھتی جا رہی ہے۔ سمندر پار ممالک میں برطانیہ کی سب سے زیادہ فوجی ذمہ داریاں جرمنی اور برلن میں ہیں۔ اور جہاں ۴ بلین ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود ۵۵۰۰۰ فوجی دستے، ٦۰۰ ٹینک اور ۳۰۰۰ فوجی گاڑیاں بے سرو سامانی کے عالم میں ہیں اور ان کی پوری طرح دیکھ بھال نہیں ہو رہی ہے۔ برعکس، رھائن کے علاقے میں تعینات برطانوی فوج میں تخفیف کر دی جاتی ہے یا نصف فوج جرمن قلعوں میں رکھنے کی بجائے برطانوی قلعوں میں مامور کر دی جاتی ہے تو اس سے سیاسی خلفشار پیدا ہو گا اور اس سے نہ صرف جرمنی اور بلجیم کو دکھ پہنچے گا بلکہ امریکہ بھی ناراض ہو جائے گا۔ ایک دوسری متبادل صورت یہ بھی ہے کہ بحری بیڑے کا سائز کم کر دیا جائے جیسا کہ اس مقصد کے لیے ۱۹۸۱ء میں وزارت دفاع نے ایک اسکیم بنائی تھی= اگرچہ اس متبادل تجویز کے کئی حامی وائٹ ہال میں موجود ہیں، لیکن حقیقتاً" یہ بے وقت نظر آتی ہے خصوصاً" ایسی صورت میں جبکہ روس کی بحریہ چیلنج بن چکی ہے اور نیٹو پر امریکہ کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے جو اپنے علاقے کی حد سے تجاوز کرنے کا آرزو مند ہے۔ اور یہ بات ان لوگوں کے لیے جو یورپ میں نیٹو کی روایتی فوج میں اضافے کی حمایت کرتے ہیں، باعث تذبذب ہو جائے گی کہ بحر اوقیانوس میں اتحادیوں کے دوسرے عظیم بحری بیڑے میں کمی کر دی جائے۔ جزائر ناکلینڈ بھی اس کٹوتی کی زد میں آئیں گے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں برطانیہ کی ذمہ داریاں بھی بے پناہ ہیں اور اخراجات بھی بہت زیادہ اور یہ بات قرین از قیاس ہے کہ یہ تخفیف محض چند برسوں تک محدود رہے گی۔ آخری بات یہ کہ وہاں ٹرائیڈنٹ سب میرین پر مشتمل بلاسٹک میزائل سسٹم موجود ہے جس میں کثیر سرمایہ صرف ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ کنزرویٹو پارٹی کی حکومت اعلیٰ قسم کا آزاد دفاعی نظام ہر صورت میں قائم رکھنے کی حامی ہے، لہٰذا اس میں تبدیلی کے امکانات حکومت کی تبدیلی پر ہی منحصر ہیں بعد ازاں ہی یہ اندازہ ہو سکے گا کہ برطانیہ کی دفاعی پالیسی کیا رخ اختیار کرتی ہے۔

بہرحال، یہ تو آخر ہی میں پتہ چلے گا کہ صورت حال کتنی خراب ہو چکی ہے۔ "سنڈے ٹائمز" کے بقول:

"اگر جلدی ہی کوئی مناسب قدم نہ اٹھایا گیا تو اس ملک کی دفاعی پالیسی محض پرانی روایات دہراتی رہے گی اور ان پر عمل درآمد کے لیے وافر رقم موجود نہ ہو گی۔ یہ صورت حال برطانیہ اور نیٹو' دونوں کے لیے مضر ہو گی۔"

ایسے حالات میں ہر سیاست دان کے لیے چاہے وہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو' یہ کوشش کرنا ضروری ہو گا کہ ملک کی بعض بیرونی ذمہ داریوں کو کم کیا جائے اور کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نتائج پر قابو پایا جائے' مثلاً" دفاعی اخراجات میں مزید توسیع نہ کی جائے۔ برطانیہ اس وقت مجموعی قومی پیداوار کا کچھ نہیں تو ۵.۵ فی صد حصہ اس مد میں خرچ کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اس نوع کے بجٹ کے لیے برطانیہ نیٹو سے وابستہ یورپی ممالک (یونان مستثنیٰ ہے) سے کہیں زیادہ رقم مختص کرتا ہے۔ چنانچہ پیداآور نمو میں کم سے کم سرمایہ کاری ہوتی ہے اور اقتصادی حالت کو بحال کرنے کے سلسلے میں طویل المدتی منصوبوں پر چنداں عمل درآمد نہیں ہوتا۔ برطانیہ کی نہایت تیزی سے گھٹتی ہوئی طاقت کے پیش نظر نہایت سخت اقدامات اختیار کرنا از بس ضروری ہیں۔

تذبذب کی یہی کیفیت برطانیہ کے اس پڑوسی ملک کی بھی ہے جو انگلش چینل کے اس پار واقع ہے------ یعنی فرانس! اگرچہ اس کی دفاعی پالیسی پر عوام کی تنقید نہ ہونے اور ۱۹۵۰ء کے عشرے کے بعد معیشت میں بہتری پیدا ہونے کے باعث' یہ ناسازگار صورت حال "سبتاً" چھپ گئی ہے تاہم بالآخر پیرس کو بھی لندن کی طرح یہ مسئلہ درپیش ہو گا کہ اس کی بیرونی ذمہ داریاں اور قومی مفادات کا جال تو بے پناہ پھیلا ہوا ہو گا' لیکن خود اس کی پوزیشن ایک "متوسط طاقت" جیسی ہو گی۔ ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی قیمت کی وجہ سے فرانس کے دفاعی اخراجات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس ملک کی آبادی کا تناسب برطانیہ جیسا ہی ہے' لیکن مجموعی قومی پیداوار اور فی کس آمدنی کچھ زیادہ ہے۔ یہ ملک برطانیہ کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں کاریں اور فولادی سامان تیار کرتا ہے۔ نیز' اس کے ہاں ہوائی جہاز تیار کرنے کے بڑے بڑے کارخانے موجود ہیں۔ برطانیہ کے بالکل برعکس' فرانس کو درآمد شدہ تیل پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف وہاں غذائی اشیاء بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں اور ان کے فالتو ذخائر یورپی اقتصادی برادری خرید لیتی ہے۔ اعلیٰ تکنیکی شعبے میں بھی فرانس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ ٹیلی کمیونیکیشن' خلائی سیاروں' لڑاکا طیاروں' ایٹمی طاقت جیسی اہم تکنیکی صنعت میں اس ملک نے بہت ترقی کی ہے اور عالمی سطح پر مسابقت کرنے کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔ اگرچہ ۱۹۸۰ء کے ابتدائی عشرے میں سوشلسٹ حکومت کی مخصوص پالیسی کے نتیجے میں وہاں کی معیشت بری طرح متاثر ہوئی تھی' لیکن بعد میں سخت ترین پالیسی وضع کی گئی۔ جس کا یہ مثبت اثر یہ ہوا کہ افراط زر میں کمی آ گئی' تجارتی خلا پر ہو گیا اور فرانک کی بیش قدری مستحکم ہو گئی۔ ان تمام باتوں کے نتیجے میں فرانس کی معیشت بہتر ہوتی چلی گئی۔

لیکن جب کبھی فرانس کی اقتصادی حال کا مقابلہ رھائن کے اس پار واقع اس کے طاقتور

پڑوسی ملک ------- یا پھر جاپان------- سے کیا جاتا ہے تو اس کے غیر یقینی حالات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اگرچہ فرانس کو لڑاکا طیارے' شراب اور اجناس برآمد کرنے میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے' لیکن وہاں کی ملوں میں تیار ہونے والی مصنوعات کی برآمدات میں اس کی پوزیشن "سبتاً" کمزور ہے۔ اس ملک کے زیادہ تر گاہک تیسری دنیا کے غیر مستحکم ممالک میں جو ڈیم یا میراج جیسی چیزوں کا آرڈر دیتے ہیں اور پھر ان کی قیمت ادا کرنے میں خاصی دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اگر فرانس کی درآمدات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں صنعتی سامان' آٹوموبائیل اور بجلی کے آلات ہیں۔ یہ وہ اشیاء ہیں جن کی صنعت کے لیے خاصا وسیع میدان ہے' اور پھر مسابقت کا خطرہ بھی نہیں! مغربی جرمنی کے ساتھ اس کا تجارتی خسارہ ہر سال بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چونکہ فرانس میں جرمنی کی نسبت چیزوں کی قیمتیں بڑھتی رہتی ہیں' لہٰذا فرانک کی تخفیف قدر میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ فرانس کے شمالی خطے میں کوئلہ' لوہا' فولاد اور جہاز سازی کی صنعت ہنوز تنزل کا شکار ہے۔ آٹوموبائیل کی زیادہ تر صنعت کو بھی اسی صورت حال کا سامنا ہے۔ اگرچہ فرانس میں نئی نئی ٹیکنالوجی روبہ کار ہو رہی ہے' لیکن ملک کے بہت سے بے روزگار افراد کو وہاں کھپانے کے آثار نمایاں نہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ جاپانی' جرمنی اور امریکی ٹیکنالوجی کا بہ طرز احسن مقابلہ کرنے کے لیے حکومت ملکی ٹیکنالوجی میں بھرپور انداز سے سرمایہ کاری بھی نہیں کر رہی ہے۔ پھر یہ بات بھی باعث تشویش ہے کہ فرانس اقتصادی لحاظ سے زراعت پر انحصار کرتا ہے' لیکن عالمی سطح پر غلے' پھل اور ڈیری فارم کی اشیاء کی وافر برآمدی سے ایک بحران پیدا ہو گیا ہے اور اس کا اثر اس ملک پر بھی پڑ رہا ہے۔ اگر زراعت کو سہارا دینے والی قیمت بحال رکھی جاتی ہے تو نہ صرف بجٹ پر دباؤ پڑتا ہے' بلکہ تخفیف قیمت کی وجہ سے سماجی بے اطمینانی کی لہر بھی پھیل سکتی ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے زراعت کو سنبھالا دینے کی خاطر فرانس کو یورپی اقتصادی برادری سے موصول شدہ فنڈ پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ اب اس فنڈ کا معتدبہ حصہ اسپین' پرتگال اور یونان کے کسانوں میں تقسیم ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ اس اقدام کے نتیجے میں فرانس کے پاس مالی وسائل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ وہ وسیع پیمانے پر ایسے تحقیقی کاموں کو جاری نہیں رکھ سکے گا جن کی بدولت آئندہ دو عشروں میں تکنیکی نوعیت کی صنعت فروغ پا سکے۔

اس وسیع تناظر میں اور فرانس کی آئندہ ترجیحات کا تعین کرتے ہوئے یہ ضروری ہو گا کہ وہاں کی دفاعی پالیسی کا جائزہ لیا جائے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حالیہ دنوں میں فرانس کی فوجی حکمت عملی اور اس کے فوجی اقدامات خاصے موثر رہے ہیں۔ چونکہ اسے یہ خدشہ ہے کہ امریکہ کی ایٹمی قوت مدافعت اتنی باا ثر نہیں' لہٰذا اس نے اپنے طور پر "ڈیلیوری سسٹم" نصب کیا ہے تاکہ روسی حملے کے وقت اسے استعمال کیا جا سکے۔ اس ملک میں ایٹمی ہتھیار کی تیاری سے لے کر اس کے تجربے تک سارے مراحل حکومت کی نگرانی میں طے ہوتے ہیں۔ اسے یہ فکر بھی لاحق ہے کہ اگر روسی حملے کے وقت نیوکلیئر کا مزاحمتی نظام ناکام ہو جاتا ہے تو اس صورت میں میزائل بردار ساری فوج ہلاک ہو جائے گی۔ چنانچہ فرانس نے کریملن کا مقابلہ کرنے کے لیے اور بھی تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنی بری فوج میں خاصی توسیع کر دی ہے۔ پھر جنوب مشرقی جرمنی میں محافظ دستے کافی تعداد میں تعینات کر دیے ہیں۔ نیز اس نے وفاقی جمہوریہ جرمنی کے

ساتھ ایک معاہدہ بھی کر لیا ہے کہ آڑے وقت میں فرانس اس ملک کی مدد کرے گا۔ اگرچہ فرانس نیٹو کے دائرہ تعمیل سے باہر ہے اور اس طرح فوجی مسائل کے سلسلے میں آزادانہ طور پر یورپ کی حمایت میں آواز بلند کر سکتا ہے' تاہم اس نے روسی حملے کی صورت میں مرکزی محاذ کی فوجی اہمیت کو مطلق نظرانداز نہیں کیا ہے۔ فرانسیسی حکومت بیرون یورپ بھی اپنا اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ وہ سمندر پار ممالک میں گاہے بہ گاہے فوجی مداخلت کرتی رہتی ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں اس کے فوجی دستے تعینات ہیں اور وہاں کی حکومت کو صلاح مشورہ دینے کے لیے فرانسیسی مشیر موجود ہیں۔ ان علاقوں میں اس کا اسلحہ بھی کامیابی کے ساتھ فروخت ہو رہا ہے۔ اس طرح فرانس نے بیرون یورپ روس اور امریکہ کے دوش بدوش اپنا اثر و رسوخ بھی قائم کر لیا ہے اور اشیائے ضرورت کی فراہمی کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ لیکن فرانس کے ان اقدامات نے امریکہ کو سخت ناراض کر دیا ہے۔ مزید برآں' جنوبی بحرالکاہل کے علاقے میں اس نے جو ایٹمی دھماکے کیے اس سے مذکورہ خطے کے ممالک بھی سخت طیش میں آ گئے۔ خدشہ ہے کہ کہیں روس بھی فرانس کے اس آزادانہ رویے پر اپنے رد عمل کا اظہار نہ کر دے۔ اس ملک کے حسب لائق بات یہ بھی ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتیں بیرون ملک فرانس کے ممتاز و نمایاں کردار کی بھرپور حمایت کرتی ہیں۔ چنانچہ وہاں ملکی سطح پر اس طرح کی تنقیدیں نہیں ہوتیں جو دیگر مغربی معاشرے میں اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی مبصرین اور خود فرانس کے لوگ اس ملک کی پالیسی کو منطقی' موزوں اور حقیقت آمیز قرار دیتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فرانسیسی پالیسی کے پہلو میں مسائل بھی ہیں۔ اس کا اعتراف اس ملک کے بعض ناقدوں نے علی الاعلان کیا ہے۔ ڈر ہے کہ تاریخ سے باخبر لوگوں کو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء سے قبل کا وہ زمانہ نہ یاد آ جائے جب فرانس میں ایسی دفاعی پالیسی مرتب کی گئی تھی جس میں نظریاتی اور عملی لحاظ سے خاصا فرق تھا۔ اگر ٹھنڈے دماغ سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ فرانس کی یہ ساری اکڑفوں اور آزادی دراصل امریکہ کی پشت پناہی اور ایٹمی تعاون کی یقین دہانی کی مرہون منت ہے۔ جیسا کہ ر۔منڈ ایرون نے کہا ہے کہ فرانس کی اس آزاد پالیسی کی وجہ سے صرف یہ ہے کہ رواں صدی میں پہلی مرتبہ اسے اول درجے کا مقام حاصل نہیں رہا ہے۔ اور اگر یہ تحفظ ختم ہو جائے تو؟ یعنی امریکہ کے ایٹمی ہتھیاروں کی مزاحمتی قوت برقرار نہ رہے تو پھر کیا ہو گا؟ اور اگر امریکہ اپنے فوجی دستے' ٹینک اور لڑاکا طیارے یورپ سے واپس منگوا لے تو پھر کیا صورت حال ہو گی؟ بعض صورتوں میں ان اقدامات کو سراہا جائے گا۔ لیکن' فرانسیسیوں کے بقول' روس کی حالیہ پالیسیوں کے نتیجے میں ان کی یہ تہی دامنی مضر ثابت ہو گی۔ سوویت یونین نئے منصوبے کے تحت ایٹمی قوت کو فروغ دے رہا ہے اور یورپ میں تعینات اپنی روایتی فوج میں خاصی توسیع بھی کر رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے مشرقی یورپ میں واقع اپنی طفیلی ریاستوں پر گرفت مضبوط کر دی ہے۔ پھر "صلح" اور "امن و آشتی" کی تشہیر کے ذریعے مغربی جرمنی کے عوام کو نیٹو سے بدظن کرنے اور غیر جانب دار رہنے پر مسلسل اکسا رہا ہے۔ فرانس کے "نئے اوقیانوسی نظریے" کی بہت سی علامتیں سوویت یونین کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہیں۔ ادھر جرمنی کے سوشل ڈیموکریٹس میں غیر جانب داری کے رجحان کے خلاف جذبات بھڑک رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ فرانس اور جرمنی میں

ایک معاہدہ بھی ہوا ہے کہ اول الذکر کے علاقے میں ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح "فورس ڈی ایکشن رپیڈ" تعینات کرے گا۔ پھر نیٹو کے ساتھ روابط میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ غرض' یہ تمام عوامل مستقبل کے لیے تشویش کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ جب تک ماسکو میں تبدیلی نہیں آتی' پیرس کو یہی دھڑکا لگا رہے گا کہ کب سوویت یونین کی فوج یورپ کی جانب پیش قدمی کر لے اور امریکہ کی امدادی فوج اس وقت تک پہنچے گی بھی کہ نہیں!

بفرض محال یہ دھڑکا صحیح ثابت ہو جاتا ہے تو فرانس ایسی صورت میں کون سا عملی قدم اٹھائے گا؟ فطری بات ہے کہ وہ اپنی روایتی افواج میں مزید توسیع کرے گا۔ پھر فرانس اور جرمنی کی مشترکہ فوج کو اتنا زیادہ مضبوط بنائے گا کہ وہ روسی حملے کو روک سکے' چاہے امریکی فوج آئے نہ آئے۔ ہیلمٹ سمتھ جیسے دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ نہ صرف پیرس اور بون کے درمیان دو سلطنتوں کا معاہدہ ہے بلکہ اس سے بین الاقوامی رجحان کا اندازہ بھی ہوتا ہے' یعنی امریکہ کی صلاحیتوں میں کمی کا اظہار! بہرحال' مذکورہ منصوبے کی راہ میں بہت سی سیاسی اور تنظیمی مشکلات حائل ہیں۔ ان میں جرمن انتظامیہ کے رویے سے لے کر سپہ سالاری' فوجیوں کی زبان' ان کی بھرتی کا مسئلہ اور فرانس کے حد سے زیادہ حساس ایٹمی ہتھیار شامل ہیں۔ بہرحال' کسی بھی صورت میں یہ فوجی حکمت عملی پیسے کی کمی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس وقت فرانس اپنی مجموعی قومی پیداوار کا محض ۳ء۲ فی صد دفاع پر خرچ کر رہا ہے جبکہ امریکہ نے اس کام کے لیے ۴ء۷ فی صد اور برطانیہ نے ۵ء۵ فی صد مخصوص کر رکھا ہے۔ پھر یہ بات بھی طے ہے کہ فرانس کی خراب معیشت کی وجہ سے اس شرح میں اضافے کا امکان بھی نہیں۔ علاوہ ازیں' فرانس جس طرح اپنے ہاں ایٹمی ہتھیاروں کو فروغ دے رہا ہے' اس کے پیش نظر یہ بات قرین قیاس ہے کہ جدید طرز کی افواج پر اس کے دفاعی بجٹ کا نصف حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ یہ شرح کسی بھی ملک میں اتنی نہیں! بہرحال' دفاعی بجٹ سے جو کچھ بچ رہتا ہے وہ "اے ایم ایکس" ٹینک' اعلیٰ قسم کے طیارے' طیارہ بردار بحری جہاز' میدان جنگ کے بہتر اسلحے وغیرہ کے لیے ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ فرانس کی مسلح افواج میں اس نوع کے سامان کے اضافے کی توقع ہے' لیکن ان سے تمام ضروریات پوری ہونے کے امکانات نہیں! برطانیہ ہی کی طرح فرانس بھی اس مسئلے سے دوچار ہے کہ آیا وہ ایٹمی ہتھیار کے بعض نظام کو بالکل ہی ختم کر دے یا پھر اپنی پوری معیشت ہی ان پر صرف کر دے۔

یہ بات باعث تشویش ہے کہ فرانس کے ایٹمی ہتھیاروں کی اعلیٰ کارکردگی کے بارے میں شک و شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ وہاں کے ایٹمی ہتھیار' زمین میں نصب میزائل اور خصوصی طور پر لڑاکا طیارے میں آئے دن نقص پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ ان کو بہتر بنانے پر اچھی خاصی رقم خرچ کی جا رہی ہے' پھر بھی یہ نئے تکنیکی ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نیز' یہ بھی خدشہ ہے کہ امریکہ کی دفاعی ٹیکنالوجی میں اہم پیش رفت ہونے یا روس کے بلاسٹک میزائل سسٹم کے فروغ پا جانے کی وجہ سے فرانس کا مسئلہ اتنا پریشان کن نہیں جتنا باعث تشویش یہ معاملہ ہے کہ دونوں سپرپاورز اپنی غیر ضرر رساں صلاحیتوں کو تو فروغ دے رہی ہیں لیکن یورپ خطرے سے دوچار ہے۔ بہرحال' اس صورت حال کے برعکس فرانس نے آبدوزوں سے

بلاسٹک میزائل پھینکنے کا سسٹم تیار کر لیا ہے۔ تاہم' ایک اصولی بات اپنی جگہ برقرار ہے: ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے وجہ سے موجود سارے ہتھیار بے کار ہو جائیں گے۔ پھر ان کی جگہ نئے اسلحے کا حصول خاصا مہنگا پڑے گا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ فرانس بھی دیگر ایٹمی طاقت کے حامل ممالک کی طرح اعتبار و یقین کے جال میں پھنس گیا ہے۔ اگر پیرس اس بات کو بعید از قیاس سمجھتا ہے کہ جرمنی کی سرحد پر حملہ ہونے کی صورت میں امریکہ سوویت یونین پر جوابی ایٹمی حملہ کرے گا تو خود اس کا یہ وعدہ کیا قرین قیاس ہے کہ دفاقی جمہوریہ جرمنی پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ ایٹمی جنگ کے لیے تیار ہو جائے گا۔ مغربی جرمنی کے عوام مشکل ہی سے اس بات پر یقین کریں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اہل فرانس روس پر تمام میزائل داغ دینے کے برعکس اس کا خاتمہ روایتی جنگ کے ذریعے کرنا پسند کریں گے۔ یہ کہاوت ہمیشہ دہرائی جاتی رہی ہے کہ "روسی ریچھ کا بازو توڑ دو" لیکن یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ روس آدمی کو کھا بھی جاتا ہے۔ پھر روس کا میزائل شکن دفاعی نظام اسے حملے کے نقصان سے بچا بھی لے گا۔ یہ بات واضح ہے کہ فرانس میں ایٹمی طاقت کی حکمت عملی میں عنقریب کوئی تبدیلی پیدا ہونے کا امکان نہیں! پھر' یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر مشرق و مغرب کے درمیان توازن بگڑ گیا اور امریکہ کی طاقت کمزور پڑ گئی تو پھر کیا ہو گا؟

فرانس کا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس کے قومی وسائل پر بے پناہ بوجھ ہے۔ پیدائش و موت کی شرح اور معاشی اسباب کے پیش نظر قومی آمدنی کا معتدبہ حصہ سماجی تحفظات پر صرف ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال نہ صرف جاری رہے گی بلکہ اس خرچ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ پھر زرعی شعبے کے لیے بھی وافر رقم کی ضرورت پڑے گی۔ نیز' مسلح افواج کو نئے خطوط پر ڈھالنے کے لیے بھی کثیر سرمایہ درکار ہوگا۔ چنانچہ ان تمام ضروریات کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہو گی جب تحقیق و ترقی جیسے اہم کام اور صنعتی ترقی کے منصوبوں سے رقم کاٹ لی جائے۔ اور اگر فرانس آخرالذکر شعبے کے لیے ضروری سرمایہ مختص نہیں کرتا تو گویا وہ دفاع' سماجی تحفظ اور دیگر اہم امور کی قدر و قیمت کو بالکل ہی نظر انداز کر رہا ہے۔ بہرحال' تذبذب کی یہ کیفیت تنہا فرانس میں نہیں' لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ یہ فرانس ہی ہے جس نے بین الاقوامی معیشت اور دفاع کے معاملے میں یورپ کو تمام ممالک پر مقدم رکھنا چاہا تھا اور وہی یورپ کی فکر میں گھلا بھی جا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نئی نئی پالیسی وضع کرنے میں وہی آگے آگے ہے----- مثلاً" جرمنی اور فرانس کے درمیان عسکری تعلق کو مستحکم کرنا' ایئر بس اور سیٹلائٹ تیار کرنا وغیرہ' وغیرہ! فرانس کی افسر شاہی جس انداز میں منصوبہ سازی کرتی ہے اور اپنے ملک کے وقار کو بلند کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اسے دیکھ کر پڑوسی ممالک شک و شبہ میں پڑ گئے ہیں۔ انھیں یہ بھی شک ہے کہ یورپی امداد سے چلائے جانے والے پراجیکٹ میں فرانس کی کمپنیوں کو خاطر خواہ منافع حاصل ہوگا۔ دوسری اسکیموں سے بھی خاصا فائدہ پہنچا ہے اور آئندہ بھی ان سے متمتع ہونے کے امکانات روشن ہیں۔

یورپ کے مسائل جس طرح یہاں پیش کیے گئے ہیں وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ ان میں بوڑھوں کی کثیر تعداد' قدیم کارخانے' اندرون شہر فرقہ واریت کا احساس' خوشحال شمالی اور پس ماندہ جنوبی علاقے کا تفاوت؛ بلجیم' السٹر اور شمالی اسپین میں سیاسی اور لسانی تناؤ وغیرہ! رجائیت پسند مبصرین بھی بسا

اوقات یہ خدشہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ ڈنمارک' مغربی جرمنی وغیرہ یورپی ممالک کا حشر بھی فن لینڈ جیسا ہوگا۔ پھر یہ سب کے سب ماسکو کے کاسہ لیس بن جائیں گے' چونکہ یہ صورت حال متعلقہ ممالک میں بائیں بازو کی سیاست کی وجہ سے رونما ہوگی' لہٰذا اس کی ترجیحات کا اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے۔ اگر یورپ کو اسی طرح دیکھا جائے جیسا ہے' اگر اسے یورپی اقتصادی برادری کے روپ میں دیکھا جائے' اگر اسے عالمی نظام میں طاقت و سیاست کے اہم مرکز کی حیثیت سے دیکھا جائے----- تو اس کے جو بھی مسائل سامنے آئیں گے' بس وہی ہوں گے جن کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے----- یعنی کس نوع کی دفاعی پالیسی وضع کی جائے جو آنے والی صدی کے لیے موزوں ثابت ہو۔ نیز' نئی نئی ٹکنیک اور نئے کاروباری طبقے کے پیش کردہ چیلنجوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ اس باب میں جن چار علاقوں اور معاشروں کا تجزیہ کیا گیا ہے' اس کے پیش نظر یہ رائے ظاہر کی جا سکتی ہے کہ ان کی موجودہ پوزیشن میں کس نوعیت کی تبدیلی پیدا ہونے کا احتمال ہے' مثلاً" جاپان اور چین کا مقام دنیا میں بلند ہوگا جبکہ روس اور امریکہ کی پوزیشن کمزور رہے گی۔ لیکن یورپ بالکل ایک معمہ بنا رہے گا۔ اگر یورپی برادری نے باہم مل کر جدوجہد جاری رکھی تو دنیا میں اس کا مقام بلند ہو جائے گا----- فوجی لحاظ سے بھی اور معاشی طور پر بھی!۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو زوال اس کا مقدر ہوگا!

سوویت یونین اور اس کا تضاد

مارکسی اصطلاحات میں لفظ "تضاد" خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے عموماً" وہ بحران تصور کیا جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں پہلے سے چلا آرہا ہے اور پیداواری شعبے میں ہنوز موجود ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اس بحران کی وجہ سے پیداوار میں مزید کمی واقع ہو گی۔ یہ بات بھی کچھ عجیب سی معلوم ہو گی کہ دنیا کے اولین کیمونسٹ ملک سوویت یونین کی صورت حال کی وضاحت کے لیے مذکورہ اصطلاح کا استعمال ناگزیر ہے۔ بہرحال، آئندہ سطور میں یہ حقیقت واضح کی جائے گی کہ روس کے نصب العین اور انھیں پورا کرنے کے طریقہ کار میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ملک زیادہ سے زیادہ زرعی اور صنعتی پیداوار کی ضرورت کا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے لیکن اجتماعی کاشتکاری اور ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے مذکورہ مقاصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ ایک طرف تو سوویت یونین عالمی امن کا نعرہ لگاتا رہتا ہے، لیکن دوسری جانب اپنے افواج میں توسیع کرکے اور انقلابی ریاستوں کے ساتھ پینگیں بڑھا کر دنیا میں خوف و ہراس بھی پھیلاتا ہے۔ کہاں تو وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی وسیع سرحدوں کا تحفظ قائم رہے، اور کہاں اپنے پڑوسیوں کے تحفظ و سلامتی سے بے رخی برتتا ہے۔ یہ باتیں ماسکو کے ساتھ تعلقات میں حارج ہوتی ہیں۔ چنانچہ مغربی اور مشرقی یورپ، مشرق وسطیٰ کے عوام، جاپان، چین ------ غرض سبھی سوویت یونین کے رویے سے نالاں اور بدظن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی عوام خود کو بے حد "محصور" اور "غیر محفوظ" سمجھتے ہیں۔ اس کا فلسفہ تو اس بات کی حمایت کرتا ہے کہ تکنیک اور نئے پیداواری ذرائع کے نتیجے میں عالمی امور میں منطقی تبدیلی کا آنا ناگزیر ہے اور سیاسی و سماجی تغیر اس کا لازمی نتیجہ ہے لیکن خود اس کا عمل یہ ہے کہ آمرانہ اور نوکر شاہی رجحان عام ہے۔ پارٹی کے سربرآوردہ لیڈروں کو بے پناہ مراعات حاصل ہیں۔ باہمی تبادلہ خیال پر قدغن ہے۔ انفرادی ترغیب سرے سے ناپید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک جاپان اور کیلی فورنیا کی طرح اتنی اہلیت نہیں رکھتا کہ مستقبل کے صبر آزما دور کا مقابلہ کر سکے۔ عجیب سی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو وہاں کے قائدین اس خیال پر کاربند ہیں کہ اب سوویت یونین فوجی لحاظ سے کسی طرح بھی کم تر درجے کا حامل نہیں ہو گا، اور دوسری جانب عوام کو مسلسل یہ تلقین بھی کر رہے ہیں کہ وہ پیداوار بڑھائیں۔ چنانچہ ان دو متضاد رجحانات نے اچھی خاصی الجھن پیدا کر دی ہے۔ پھر، اس بات پر بھی نظر رکھی جا رہی ہے کہ روایتی طور پر ملکی وسائل کا معتدبہ حصہ مسلح افواج پر نہ خرچ ہو جائے اور روس اقتصادی لحاظ سے دوسرے ممالک کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہے۔ ممکن ہے ان مسائل کے پیدا ہونے کی کچھ اور وجوہات بھی ہوں، لیکن ان پر "تضاد" کی اصطلاح چسپاں ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

مارکسی نظریے میں زندہ رہنے کے لیے مادی ضرورت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ سوویت یونین کو آج جس گھمبیر مسئلے کا سامنا ہے، وہ معیشت ہے۔ مغربی ماہرین کی رائے کے مطابق وہاں یہ صورت حال موجود ہے۔ اس امر کی تصدیق روسی قیادت نے بھی خود کی ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں خروشیف نے نہایت اعتماد کے ساتھ یہ کہا تھا کہ سوویت یونین

اقتصادی لحاظ سے امریکہ پر بالادستی حاصل کر لے گا اور "سرمایہ داری" کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے گا۔ لیکن وہ گورباچوف کی اس تقریر کے متعلق کیا کہیں گے جو اس نے ۱۹۸۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ۲۷ ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی اور جس میں انھوں نے برملا یہ اعتراف کیا تھا:

"ملک کی معیشت ۱۹۷۰ء کے عشرے میں زبوں حالی کا شکار ہونے لگی تھی۔ پیداوار کی شرح حد سے زیادہ گر چکی تھی۔ چنانچہ کیمونسٹ پارٹی کے پروگرام کے تحت اقتصادی ترقی کے جو اہداف مقرر کیے گئے تھے وہ پورے نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ کم تر درجے کے نویں اور دسویں پانچ سالہ منصوبے بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ ہم سماجی بہبود کے پروگرام کو بھی عملی جامہ پہنانے میں قاصر رہے۔ سائنس، تعلیم، حفظان صحت، ثقافت اور ملازمتوں کے شعبے میں ترقی کا امکانات معدوم رہے۔ اگرچہ بعد میں ہم نے اس سلسلے میں مناسب کوشش کی، لیکن حالات کی بے چینی کو یکسر ختم کرنے میں ہنوز ناکام رہے ہیں۔ انجینئرنگ کے شعبے، تیل اور کوئلے کی صنعت، بجلی کی صنعت، دھات اور کیمیکل کی صنعت میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ نہ تو اہداف کے مطابق کارکردگی بہتر ہوئی ہے نہ ہی عوام کا معیار زندگی بلند ہوا ہے۔

اس وقت ہمیں جن مسائل کا سامنا ہے، ان میں سب سے نمایاں ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی کا مسئلہ ہے۔ بہرحال، یہ سارے مسائل فوری نوعیت کے بھی ہیں اور طویل المدتی بھی، اقتصادی بھی ہیں اور سماجی بھی، سیاسی بھی ہیں اور نظریاتی بھی، اندرونی بھی ہیں اور بیرونی بھی!"

مذکورہ بیان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی حکومت آخری دنوں میں ایسا ہی بیان دیا کرتی ہے۔ لیکن اقتصادی مسائل کا محض تذکرہ ان کے حل ہونے کی ضمانت نہیں ہوا کرتا ہے۔

سوویت یونین کی پوری تاریخ میں اس وقت اقتصادی لحاظ سے سب سے زبوں حال شعبہ زراعت کا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ صرف ایک صدی پہلے یہ ملک غلہ برآمد کرنے میں دنیا کا دوسرا سب سے بڑا مرکز تھا۔ پھر صورت حال یہ ہوئی کہ ۱۹۷۰ء کے ابتدائی عشرے سے ہی روس لاکھوں ٹن گندم اور مکئی ہر سال درآمد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر دنیا میں غذائی اجناس کی پیداوار اسی طرح برقرار رہی تو روس اور مشرقی یورپ کی سوشلسٹ ریاستیں افریقہ اور مشرق قریب کے بعض علاقوں کی طرح یہ اعزاز حاصل کر لیں گی کہ وہ غلے کی بہت بڑی برآمد کنندگان کی بجائے بڑی درآمد کنندگان بن چکی ہیں۔ جہاں تک روس کا معاملہ ہے تو زرعی پیداوار میں یہ کمی کسی عدم توجہی یا سعی و عمل کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے۔ اسٹالن کی

وفات کے بعد سے ہی ہر روسی لیڈر غذائی پیداوار میں اضافے پر زور دیتا رہا ہے تاکہ صارفین کی مانگ پوری ہو اور حکومتی وعدے کے مطابق ملک میں لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو سکے۔ یہ قیاس کر لینا غلط ہو گا کہ مذکورہ معیار میں چنداں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ہر روسی ۱۹۵۳ء کے برعکس' جب اس کی حالت افسوس ناک تھی' اس وقت خوشحال ہے۔ لیکن جو بات سوہان روح بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ چند عشروں تک مغرب سے قریب رہنے کے بعد اب یہاں کا معیار زندگی پھر گرتا جا رہا ہے' حالانکہ حکومت زراعت کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لا رہی ہے۔ مجموعی سرمائے کا ۳۰ فی صد اس شعبے کے لیے مختص کر دیا گیا ہے جبکہ محنت کش طبقے کے ۲۰ فی صد حصے کو روزگار فراہم کیا گیا ہے۔ بہرحال' عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی خاطر سوویت یونین کو تقریباً ۷۸ بلین ڈالر ہر سال زراعت پر صرف کرنا ہو گا۔ نیز' غذائی اشیاء کی فراہمی کے لیے مزید ۵۰ بلین ڈالر خرچ کرنے ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ ایک بہت بڑے برآمد کنندہ کا سابقہ مقام حاصل نہیں کر پائے گا۔ بلکہ غلہ درآمد کرنے کے لیے اسے مزید کئی بلین ڈالر خرچ کرنے پڑیں گے۔ علاوہ ازیں' اسے زرعی پیداوار میں کمی کو پورا کرنے کے لیے بھی مسلسل جتن کرتے رہنا پڑے گا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ سوویت یونین میں زراعت کی غیر یقینی کیفیت کی فطری وجوہات بھی ہیں۔ اور یہی وہ سبب ہے کہ امریکہ کے مقابلے میں اس ملک کی زرعی پیداوار ساتویں درجے پر ہے۔ اگرچہ سوویت یونین جغرافیائی لحاظ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ملتا جلتا ہے' یعنی دونوں ملک براعظم کے لحاظ سے وسیع و عریض ہیں' دونوں ہی شمالی کرے میں واقع ہیں' لیکن روس شمال میں بہت دور واقع ہے۔ پھر یوکرین بھی جنوبی کینیڈا کی طرح ایک ہی طول البلد پر واقع ہے۔ اس طرح غلے کی کاشت خاصی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر روس میں جہاں گندم کی کاشت ہوتی ہے' وہ علاقہ سخت سردیوں کی لپیٹ میں رہتا ہے۔ اس وجہ سے خشک سالی بھی رہتی ہے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۲ء تک کا چار سالہ عرصہ ان اسباب کی بنا پر نہایت خراب گزرا تھا۔ حکومت اس صورت حال سے اس درجہ بوکھلا گئی تھی کہ اس نے زرعی پیداوار کے متعلق تفصیلات فراہم کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ تاہم ہر سال یہ ملک جو ۳۵ ملین ٹن غلہ درآمد کرتا رہا' اس سے کچھ نہ کچھ تو اشارہ مل ہی جاتا ہے۔ ویسے ۱۹۸۳ء کا سال روس کے لیے قدرے بہتر تھا۔ بد قسمتی سے اگلے سال ملک پھر سخت سردی اور خشک سالی کی لپیٹ میں رہا۔ علاوہ ازیں' یہ کوشش بھی کی گئی کہ خالی زمینوں پر گندم کی بوائی ہو تاکہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہو لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ شمالی علاقے برفباری کی لپیٹ میں رہے اور جنوب میں خشکی کا دور دورہ رہا۔

واضح رہے کہ بیرونی مبصرین یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ روس میں زرعی پیداوار کی کمی کا واحد سبب ناموافق آب و ہوا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ یہ سنگین مسئلہ وہاں کی زراعت کو "اشتراکی خطوط" پر ڈھالنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ روسی عوام کو خوش رکھنے کی خاطر حکومت نے غذائی اشیاء کی قیمت بہت کم رکھی ہے اور اپنے طور پر فراہم کنندگان کو مراعات دے دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک پونڈ گوشت کی اصل قیمت ۳ ڈالر ہے جبکہ یہ ۸۰ سینٹ میں فروخت ہوتا ہے۔ چنانچہ کھانے پینے کی چیزیں اتنی سستی ہیں کہ کسان

بھی اپنے مال مویشی کو چارہ کھلانے کی بجائے روٹی اور ٹماٹر خرید کر کھلاتے ہیں۔ وہاں زرعی شعبے کے فروغ کے لیے حکومت زیادہ تر سرمایہ ڈیم اور نالیوں کی تعمیر میں صرف کرتی ہے' حالانکہ عام کسان کے لیے اسے غلہ بھرنے کا کوٹھا بنانا چاہئے اور چھوٹے چھوٹے ٹریکٹر فراہم کرنے چاہئیں کہ ان چیزوں کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ کاشت کاری' سرمایہ کاری اور دیگر زراعتی امور کے سلسلے میں جو بھی فیصلہ ہوتا ہے وہ کھیتوں پر کام کرنے والے تو نہیں کرتے' بلکہ منیجر اور دفتری حاکم یہ فریضہ انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ کسانوں کی ذمہ داری اور انہیں ترغیب دینے سے جو اغماض برتا جاتا ہے وہی دراصل مایوس کن پیداوار' ناقص کارکردگی اور چیزوں کے ضیاع کا نمایاں سبب ہے۔ ویسے غذائی اشیاء کی بربادی کی اور بھی وجوہات ہیں' مثلاً" ذخیرہ کی عدم سہولت' ہر موسم میں کام آنے والی سڑکوں کا فقدان وغیرہ۔ ان اسباب کی بناء پر تقریباً" ۲۰ فی صد غلہ' پھل اور سبزیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ٹماٹر کی ۵۰ فی صد پیداوار مذکورہ وجوہات کی بناء پر برباد ہو جاتی ہے۔ اگر اس نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں تو اس سلسلے میں کیا کرنا ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اجتماعی کھیتی باڑی کی جگہ انفرادی طور پر کاشت کاری کرنے کے طریقے کو اپنانا ہو گا۔ اس حقیقت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ روس کی جتنی زرعی پیداوار ہے اس کا ۲۵ فی صد حصہ ایک عام کسان اپنے کھیت میں باسانی پیدا کر لیتا ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ملک کی قابل کاشت مجموعی زمین کا محض ۴ فی صد حصہ کسان کی ذاتی ملکیت میں ہوتا ہے۔

روس میں زرعی اصلاحات کا ڈھنڈورا تو بہت پیٹا جا رہا ہے' لیکن قرائن کچھ ایسے ہیں کہ وہاں کی حکومت ڈنگ کے وسیع و عریض زرعی اقدامات کو نہ اپنا رہی ہے اور نہ چین کے آزاد زراعت کے اصول پر کاربند ہوتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ روس کی زرعی پیداوار میں تو کمی آتی جاری ہے جبکہ اس کا ہمسایہ جو پڑوسی ملک چین اس معاملے میں بہت آگے نکل چکا ہے۔

اگرچہ کریملن علی الاعلان یہ نہیں بتا سکے گا کہ وہ آخر کیوں اجتماعی کھیتی باڑی کے نظام کو ترجیح دیتا ہے جبکہ اس کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہے' تاہم دو وجوہات قابل غور ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ذاتی زمین میں توسیع' نجی منڈی کے قیام اور قیمتوں میں اضافے سے کسانوں کی آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس سے شہری آبادی میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو گی اور صنعتی سرمایہ کاری پر بھی مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ دوسرے معنوں میں نکولائی بخارین کی پالیسی کامیاب ہو جائے گی اور اسٹالن کی بے جا مخالفت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دوسرے' دفتری حاکموں اور منیجروں کے اختیارات کم ہو جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو روس میں زراعت کے شعبے کی نگرانی کرتے ہیں اور فیصلہ سازی کے سارے امور انجام دیتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے ہر کسان اپنی کارکردگی کے لحاظ سے دفتری حاکموں سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ وہ منڈی کے حالات پر نظر رکھتا ہے' بدلتے ہوئے موسم کو محسوس کر لیتا ہے اور اپنی فصل کی حالت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ یہ وہ صلاحیتیں ہیں جو دفتری حاکموں اور ان کے عملے کے پاس نہیں ہوتیں۔ پھر ایسی افسر شاہی کا کیا فائدہ؟ اگر یہ صحیح ہے کہ سوشلزم اور غذائی اشیاء کے بحران میں چولی دامن کا ساتھ ہے تو گمان اغلب ہے' کہ یہ بات "پولٹ بیورو" کے اراکین کے علم میں یقیناً" رہی ہو گی۔ بہرحال' روس کے اپنے نظریے کے مطابق اجتماعی

چارٹ - ۳

متحدہ روس اور چین کی غذائی پیداوار (۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۴ء)
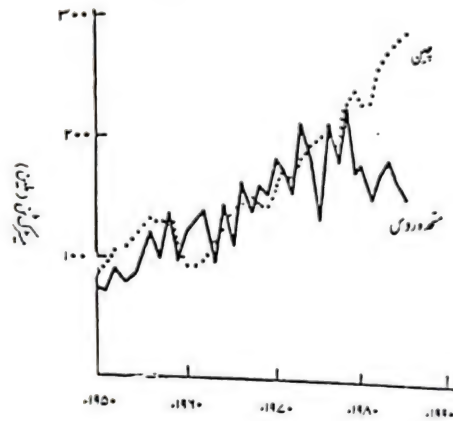
ماخذ: امریکی محکمہ زراعت

کھیتی باڑی کا نظام بہتر بھی ہے اور محفوظ بھی! اس طرح زراعت کا سوشلسٹ سسٹم برقرار رہتا ہے' چاہے غذائی اشیاء باہر سے کیوں نہ درآمد کرنا پڑیں۔ بہرحال' وہاں کیمونسٹ نظام کی ناکامیوں کا نہ تو اعتراف ہو گا اور نہ ہی معاشرے کی اتنی بڑی زراعت پیشہ آبادی پر سے کنٹرول ختم ہو گا۔

سوویت یونین زراعت ہی کی طرح صنعتی شعبے میں بھی کوئی ردو بدل نہیں کر سکے گا۔

بعض مبصرین کے خیال میں یہ ضروری بھی نہیں! اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۴۵ء سے سوویت یونین کی معاشی حالت خاصی بہتر رہی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ روس مشینی اوزار' فولادی سامان' سیمنٹ' کھاد' تیل اور دیگر صنعتوں میں امریکہ پر سبقت لے گیا ہے۔ تاہم ایسے آثار موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ روس کے کارخانے سست رفتاری سے کام کر رہے ہیں۔ ان کو سنبھالا دینے کے لیے جو بھی اقدامات کیے گئے تھے' اب وہ تعطل کا شکار ہو چکے ہیں۔ صنعتوں کی زبوں حالی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ محنت کشوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے اور توانائی کا بھی فقدان ہے۔ ان باتوں کی وضاحت آگے کی جائے گی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ روس کی مصنوعات کو نقصان پہنچانے میں دفتری حاکموں کی منصوبہ بندی' بھاری صنعتوں پر بہت زیادہ انحصار' صارف کی پسند سے اغماض اور منڈی کی طلب سے بے توجہی جیسے عناصر بھی شامل ہیں۔ ضروری شعبے میں سرمایہ کاری کرنے کے برعکس سیمنٹ کی صنعت پر بے دریغ خرچ کرنا اور خاصی مقدار میں یہ چیز تیار کرنا بالکل بے معنی سی بات ہے۔ پھر اتنی زیادہ سیمنٹ تیار کرنے میں توانائی کا ضیاع بھی ہوتا ہے اور دور دراز کے مقامات پر اس کی ترسیل میں ریلوے پر غیر ضروری دباؤ بھی پڑتا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ سیمنٹ ان تعمیری پراجیکٹس میں تقسیم کیا جاتا ہے جنہیں روسی انجینیروں نے منظور تو کر لیا ہوتا ہے' لیکن ان عمارات کو مکمل کرنے کی کبھی نوبت نہیں آتی۔ یہی بات وہاں کے فولادی کارخانے پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کی مصنوعات بھی زیادہ تر برباد ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بہت سے دانشور یہ طنز کرتے ہیں کہ غریب صارفین کے بالمقابل صنعتی سامان کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود روسی صنعت کے بعض شعبے نہایت موثر کارکردگی کے مظہر ہیں' مثلاً" دفاعی سازو سامان کی صنعت جس میں کثیر سرمایہ لگایا جاتا ہے اور وہ ہر طرح مغرب کے مقابلے میں بہتر مقام کی حامل ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ صنعت کی مجموعی حالت قابل تسلی نہیں! اس کی وجہ یہ ہے کہ سامان تیار کرنے سے پہلے نہ تو بازاری قیمت طے کی جاتی ہے اور نہ ہی صارفین کی طلب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ چونکہ سوویت یونین کے کارخانے بند بھی نہیں کیے جا سکتے (جیسا کہ مغرب میں ہو چکا ہے)' لہٰذا کام کا جذبہ اور بہتر کارکردگی کی امنگ بھی موجود نہیں! اگرچہ ایسے کارکن موجود ہیں جو صنعت کو فروغ دینے میں مدد دے سکتے ہیں' تاہم اس بات کا خدشہ ہے کہ روس کی موجودہ "اقتصادی منصوبہ بندی" کے پیش نظر کوئی پیش رفت ممکن نہیں!

اگر آج روس کی موجودہ صنعتی کارکردگی سے سمجھوتہ کر لیا جاتا ہے تو پھر اس بات کا خطرہ ہے کہ اس نظام پر مزید تین باتوں سے اور بھی دباؤ پڑے گا۔ پہلی فکر انگیز بات توانائی کی فراہمی ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ۱۹۳۰ء کے عشرے کے بعد روسی صنعت کو فروغ دینے کے لیے کوئلہ' تیل اور قدرتی گیس کی سپلائی پر بے پناہ انحصار کیا گیا تھا' لیکن ان چیزوں کے بے جا اسراف پر نظر نہیں

رکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویت یونین اور اس کی طفیلی ریاستوں میں توانائی بھی ضائع ہوئی اور لوہا بھی برباد ہوا۔ اگر اس ضیاں کا مغربی یورپ سے مقابلہ کیا جائے تو بربادی کی یہ شرح روس میں کچھ زیادہ ہی نظر آئے گی۔ مثال کے لیے دیکھیے جدول ۳۶۔

جدول نمبر ۳۶: مجموعی ترقیاتی پیداوار میں کوئلہ اور فولاد کا استعمال

(ایک ہزار ڈالر کی مالیت کی پیداوار کے لحاظ سے)

۱۹۷۹ء ------ ۱۹۸۰ء

	کوئلہ	فولاد
سوویت یونین	۱۳۹۰	۱۳۵
مشرقی جرمنی	۱۳۵۶	۸۸
چیکو سلوواکیہ	۱۲۹۰	۱۳۲
ہنگری	۱۰۵۸	۸۸
برطانیہ	۸۲۰	۳۸
مغربی جرمنی	۵۶۵	۵۲
فرانس	۵۰۲	۴۲
سویٹزرلینڈ	۳۷۱	۲۶

جہاں تک روس کا سوال ہے وہاں "در آمد" کا بے جا مصرف اس لیے قابل برداشت رہا کیونکہ اس کے مقابلے میں توانائی کی فراہمی بہت زیادہ بھی تھی اور آسان بھی۔ لیکن تشویش ناک بات یہ ہے کہ مذکورہ صورت حال تا دیر قائم نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۷ء میں سی آئی اے نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ سوویت یونین میں تیل کی پیداوار انتہا کو پہنچ جائے گی اور پھر نہایت تیزی سے زوال پذیر ہونے لگے گی۔ بہرحال' یہ بات قبل از وقت تھی۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد' پہلی مرتبہ روس میں تیل کی پیداوار میں تھوڑی کمی آئی تھی۔ ایک تو ۱۹۸۳ء میں' پھر ۱۹۸۵ء میں! تاہم یہ حقیقت ہنوز فکر انگیز ہے کہ روس میں تیل کا جو بھی ذخیرہ موجود ہے' وہ یا تو منجمد زمین کی نچلی سطح میں ہے یا سائبیریا جیسے انتہائی سرد اور برف پوش علاقوں میں! جیسا کہ ۱۹۸۵ء میں گورباچوف نے انکشاف کیا تھا کہ گزشتہ ایک عشرے سے تیل نکالنے کی لاگت میں فی ٹن ۷۰ فی صد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ بعد ازاں' یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہوتا چلا گیا۔ ادھر روس نے یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنی ایٹمی طاقت کو وسعت دے دے گا۔ گویا اس طرح ۱۹۹۰ء تک وہ بجلی کی پیداوار میں دس سے بیس گنا اضافہ کر لے گا۔ ویسے یہ حقیقت بھی جلد معلوم ہو جائے گی کہ چرنوبائل پلانٹ کی تباہی سے روس کے منصوبوں پر کیا مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مذکورہ پلانٹ کے چار ری ایکٹر ایٹمی توانائی کے ذریعے پیدا کی جانے والی مجموعی بجلی کا ساتواں حصہ فراہم کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے بند ہو جانے سے توانائی کے دیگر ذخائر کا بے دریغ استعمال ہوا۔ بہرحال' جو بات اس تباہی کے نتیجے میں سامنے آئی ہے وہ یہ کہ اس طرح مصنوعات کی لاگت بڑھ جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ کارخانوں میں پیداواری رفتار بھی مدھم پڑھ جائے گی۔ علاوہ ازیں' یہ بھی فکر انگیز حقیقت ہے کہ صنعتی سرمایہ کا کچھ نہیں تو تیس فی صد حصہ توانائی کے شعبے میں کھپ جاتا ہے۔ پھر' موجودہ حالات کے تحت اس میں مزید سرمایہ صرف ہونے کا احتمال ہے۔ بہرحال' حال ہی میں شائع ہونے والی اس رپورٹ پر مشکل سے یقین کیا جائے گا کہ روس میں تیل' کوئلہ اور بجلی میں سرمایہ کاری کا رجحان برقرار ہے۔ بایں ہمہ' قدرتی گیس میں بھی مقررہ اہداف کے بموجب سرمایہ کاری میں اضافہ کیا جائے گا۔ اس طرح ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۵ء کے دوران روسی صنعت کے لیے مختص تمام سرمایہ ان کاموں میں صرف کر دیا جائے گا۔ بہرحال' جو حقیقت واضح ہے' وہ یہ کہ معیشت کو سہارا دینے کے لیے توانائی کے شعبے میں مجموعی قومی پیداوار کا معتدبہ حصہ صرف کیا جائے گا۔

روسی قائدین کے خیال میں نہایت سنگین قسم کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ روبوٹ' سپر کمپیوٹرز' روشنی کی تابش بڑھانے والا شیشہ اور نیلی مواصلات جیسی اعلیٰ ٹیکنالوجی میں اس ملک کو بڑا چیلنج در پیش ہے۔ اس اہم شعبے میں سوویت یونین کے مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ جانے کا خدشہ ہے۔ نیز' فوجی لحاظ سے بھی اس امر کا خطرہ درپیش ہے کہ میدان جنگ میں کام آنے والے جدید اسلحے اور ترقی یافتہ سراغ رساں آلات کہیں روس کے بے پناہ فوجی سازو سامان کو بے وقعت نہ بنا دیں۔ پھر یہ بھی خدشہ لاحق ہے کہ سپر کمپیوٹرز کے ذریعے روس کے اشاری نظام کا راز معلوم کر لیا جائے گا' سطح سمندر سے نیچے چھپی ہوئی آبدوزوں کا ٹھکانا واضح ہو جائے گا' تیز رفتاری سے ہونے والی جنگ کی نگرانی کی جا سکے گی اور پھر امریکہ کے ایٹمی تنصیبات کا تحفظ بھی ممکن ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں' اعلیٰ درجے کے راڈار' روشنی کی تابش بڑھانے والے شیشے اور رہنمائی کرنے والی ٹیکنالوجی کی بدولت مغرب کے لڑاکا طیارے اور توپ و راکٹ کے حامل فوجی یا سانی دشمن (روس) کے طیاروں اور ٹینکوں کا پتہ چلا لیں گے اور انھیں بالکل ہی نیست و نابود کر دیں گے۔ یہی صورت حال شام میں بھی ہے جہاں کے روسی ساخت کے ہتھیاروں کو اسرائیل آئے دن نشانہ بناتا رہتا ہے۔ لہٰذا اعلیٰ درجے کی اس ٹیکنالوجی سے بہرہ مند ہونے کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ روس اپنے دفاعی شعبے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں سائنسی اور فنی وسائل کو بروئے کار لائے۔

غیر فوجی شعبے کا مسئلہ بھی ویسا ہی سنگین ہے۔ محنت اور سرمایہ کاری کے محدود در آمدی حالات کے پیش نظر اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی روس کی برآمدگی کو بڑھانے کے لیے ازحد ضروری ہے۔ یہاں اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جائے گی۔ اعلیٰ پیمانے پر کمپیوٹرز کے استعمال سے تحقیق' پیداوار اور توانائی میں آئے دن ہونے والے نقصانات میں کمی آ جائے گی۔ لیکن اس نئی ٹیکنالوجی کو استعمال میں لانے کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت پڑے گی (جو آخر کہاں سے آئے گا؟)۔ پھر' روس میں جس طرح کا پراسرار' نوکر شاہی اور مرکزیت پر مبنی نظام رائج ہے' اس کے لیے یہ ٹیکنالوجی سراسر چیلنج بن جائے گی۔ کمپیوٹرز' فقط کار

مشین، ٹیلی مواصلات ------ یہ سب معلومات افزا آلات ہیں۔ روس جیسے ملک کے لوگ جو تکنیک میں ویسے بھی تجربہ کار ہیں، ان ایجادات سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ وہاں کے عوام کو ان آلات کے آزادانہ استعمال کا موقع دیا جائے تاکہ وہ نئے نئے خیالات و استدلال سے ممکنہ حد تک مستفیض ہو سکیں۔ کیلی فورنیا اور جاپان میں یہ رجحان پوری طرح کارفرما ہے، لیکن روس میں ایسا ممکن ہوتا نظر نہیں آتا کہ وہاں اطلاعات پر حکومت کی جو اجارہ داری ہے وہ غت ربود ہو جائے گی۔ سوویت یونین میں جب سینئر سائنس دانوں اور دانشوروں کو اس بات کی قطعاً" اجازت نہیں کہ وہ بذات خود کاپی مشین استعمال کریں، وہاں یہ بات کس طرح ممکن ہو سکے گی کہ لوگوں کو لفظ کار مشین، خود کار کمپیوٹر، بجلی کے ذریعے ڈاک کی ترسیل کے نظام کو اپنانے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ جس ملک کے نقل نویسی کے شعبے میں کے جی بی کا عملہ تعینات ہو، وہاں پولیس کی نگرانی اور سنسر شپ کے بغیر مذکورہ آلات کا استعمال خاصا محال ہے۔ بہرحال، حکومت نے یہ وعدہ تو کر لیا ہے کہ وہ (کم از کم) زرعی شعبے کو جدید کاری کے اصول پر فروغ دے گی اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ اور افرادی قوت کام میں لائے گی، لیکن وہاں کے اونٰی سطح کے اقتصادی نظام اور سیاسی نظریات میں تبدیلی کے کوئی آثار نہیں ------ اور یہی اتیں ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت مترشح ہو گی کہ سوویت یونین زیادہ تر درآمد شدہ تکنیک اور مشین پر انحصار کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سب چیزیں باقاعدہ تجارتی معاہدے کے تحت منگوائی گئی ہیں یا مغرب سے غیر قانونی طور پر اسمگل کی گئی ہیں۔ بہرحال، یہ بھی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ صنعتی اور سائنسی لحاظ سے سوویت یونین کی یہ جاسوسی (چاہے فوجی نوعیت کی ہو یا کاروباری) اس کے لیے طرہ امتیاز نہیں بلکہ اس کے تیزی سے روبہ زوال ہونے کی نشانی ہے۔ روس اپنے قدیم تجارتی طریقہ کار کے تحت مغربی ممالک سے تکنیک درآمد کرتا ہے اور مشرقی یورپ سے مصنوعات منگواتا ہے اور ان سب چیزوں کے عوض خام مال برآمد کیا کرتا ہے۔ اس طرح وہ تجارتی خلا کو پر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صورت حال ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۳ء تک کے زمانے میں پیش آئی تھی۔ پھر ۱۹۳۰ء کے عشرے میں تجارت کی یہی کیفیت تھی۔ بہرحال تبدیلی محض اتنی ہوئی ہے کہ درآمد شدہ سامان تمام تر جدید سائنسی نوعیت کا ہے، یعنی تیل کی کھدائی کرنے والی مشین، فولادی چادر، مشینی اوزار، کیمیکل اور پلاسٹک کے کارخانے کا سازو سامان وغیرہ۔ روسی منصوبہ سازوں کے لیے اہم مسئلہ یہ بھی بنا ہوا ہے کہ درآمد شدہ ٹیکنالوجی پر عمل درآمد کا مرحلہ خاصا طویل ہوتا ہے۔ پھر دوران استعمال اس کی کارکردگی اتنی موثر نہیں ہوتی جتنی مغربی ممالک میں ہوتی ہے۔

بیرونی ممالک سے ٹیکنالوجی اور دیگر سائنسی سامان منگوانے میں کمیاب کرنسی کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ بہرحال، اس مسئلے کو یوں حل کیا جا سکتا ہے کہ "کومیکون" سے وابستہ ممالک سے مصنوعات منگوائی جائیں۔ اس میں کمیاب کرنسی کے ضائع ہو جانے کا خدشہ بھی نہیں رہے گا۔ لیکن دقت یہ ہے کہ مذکورہ ممالک کا تیار شدہ مال مغرب کی مصنوعات کی بہ نسبت" غیر معیاری ہوتا ہے۔ اگرچہ روس مغرب کی زیادہ تر درآمدی اشیاء کی باقاعدہ قیمت بدل بیوپار کے ذریعے یا اپنا فالتو تیل براہ راست فروخت کر کے ادا کر دیتا

ہے، لیکن اس ملک کی خوشحالی مشرقی یورپ کی طرح غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار رہے گی۔ اس کی تمام تر وجہ تیل کی قیمت میں کمی بیشی، ایندھن کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور اعلیٰ درجے کی صنعت کے پیش نظر خام مال کی تجارت میں مسلسل تبدیلی ہے۔ بایں ہمہ، تیل اور خام مال کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی کم ہو جانے سے مختلف درآمدی اشیاء کی ادائیگی خاصی گراں ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان اخراجات کی وجہ سے سرمایہ کاری کے لیے رقم نہیں بچتی ہے۔

روس کی آئندہ بہتر معیشت کے حوالے سے نہایت فکر انگیز بات وہاں کی پیدائش و موت کا مسئلہ ہے۔ یہ صورت حال نہایت مایوس کن ہے۔ ایک محقق نے حال ہی میں اپنی سروے رپورٹ بہ عنوان "آبادی اور محنت کش طبقہ" میں یہ حقیقت یوں بیان کی ہے:

"اس صدی کے آخر تک سوویت یونین کی آبادی اور محنت کش طبقے کی ترقی کے آثار نمایاں نظر نہیں آتے۔ تمام حفظ ماتقدم کے باوجود وہاں پیدائش کی شرح بے حد کم اور موت کے اعداد و شمار انتہائی زیادہ ہیں۔ محنت کش طبقے کے لیے نئی ملازمتوں اور پیشوں کا سراسر فقدان ہے۔ اس میں علاقائی تقسیم کی پیچیدگیاں بھی حائل ہیں اور لوگوں کی ڈھلتی ہوئی عمر بھی! لہٰذا حکومت اس مسئلے کے حل ہونے کے سلسلے میں زیادہ پر امید نہیں!"

یہ تمام اسباب و عوامل اپنی جگہ خاصے سنگین ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ فکر انگیز بات یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے سے قبل ہی سے زندگی کی اوسط شرح کم ہوتی رہی ہے اور دوران طفولیت اموات میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ شفاخانے کی کمی، حفظان صحت کے فقدان، صفائی کے ناقص انتظامات، اصول صحت سے عوام کی عدم واقفیت اور نشہ آور اشیاء کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے سوویت یونین میں شرح اموات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، خصوصاً" محنت کش مردوں میں! روس میں ۱۹۶۰ء کے عشرے کے وسط میں لوگوں کی اوسط عمر ۶۶ سال ہوا کرتی تھی جبکہ آج یہ گھٹ کر ۶۰ سال رہ گئی ہے۔ اسی طرح بچوں کی شرح اموات کا معاملہ بھی خاصا سنگین نظر آتا ہے۔ روس واحد صنعتی ملک ہے جہاں عالم طفولیت میں ہونے والی اموات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ اس ملک میں ڈاکٹر کثیر تعداد میں موجود ہیں، پھر بھی یہاں بچے امریکہ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ مرتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ روس کی آبادی جس تیزی سے موت کا شکار ہو رہی ہے اس کے مقابلے میں بچوں کی شرح پیدائش میں کمی آتی جا رہی ہے۔ گمان اغلب ہے کہ شہروں کی توسیع، محنت کش طبقے میں زیادہ سے زیادہ مرد حضرات کی شمولیت، رہائش کا ناقص نظام اور دیگر ترغیبات کے فقدان کے سبب پیدائش کی شرح میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ صورت حال ملک کے ان علاقوں میں زیادہ ہے جہاں خالص "روسی" باشندے آباد ہیں۔ ان اسباب و عوامل کے نتیجے میں روس میں مردوں کی آبادی میں بالکل اضافہ نہیں ہو پا رہا ہے۔

مذکورہ حالات نے روسی قائدین کو خاصا پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ خاندان میں اضافہ کرنے کے لیے مناسب اقدامات کرنے لگے۔ چنانچہ نشہ آور اشیاء کے استعمال کے خلاف زبردست تشہیر کی گئی اور فیکٹریوں میں بوڑھے کارکنوں کو رات کے وقت رہنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ بات طے ہے کہ حفظان صحت' سماجی تحفظ اور بوڑھوں کی دیکھ بھال کے لیے ملک کو وسائل کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ دیگر صنعتی ممالک کی طرح روس کی ضروریات بھی یہی ہیں۔ البتہ وہاں اموات کی شرح حد سے زیادہ ہے۔ یہاں سوال ترجیحی بنیاد پر خرچ کرنے کا بھی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مزدوروں کی بے تحاشا موت کے مضر اثرات سوویت یونین کی صنعت اور مسلح افواج پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ بہرحال زیر عمل منصوبے کے تحت ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے دوران محنت کش طبقے میں ۵۹۹۰۰۰۰ افراد کا اضافہ ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ گذشتہ دس سال کے عرصے میں ۲۴۳۱۷۰۰۰ محنت کش افراد کا اضافہ ہوا تھا۔ فوج کا مسئلہ کچھ دیر کے لیے الگ رکھ دیتے ہیں تو ان اعداد و شمار سے ہمیں یاد آتا ہے کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عشروں میں روسی صنعت میں جو معتدبہ اضافہ ہوا تھا وہ محنت کش طبقے کا نتیجہ تھا نہ کہ کسی اور سہولتوں کا! بہرحال اب وہاں کی اقتصادیات صنعتی شعبوں میں کام کرنے والے لاتعداد کارکنوں سے محروم رہے گی۔ اس دگرگوں صورت حال پر اسی وقت قابو پایا جا سکتا ہے اگر تنومند جسم کے لوگوں کو زراعت سے ہٹا کر صنعتی شعبے سے وابستہ کر دیا جائے لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ سلافی علاقے کے زیادہ تر نوجوان کیمون چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آباد ہو گئے ہیں جو افراد غیر سلافی جمہوریتوں میں موجود ہیں وہ غیر تعلیم یافتہ اور روسی زبان سے ناواقف ہیں۔ انھیں صنعتی کاموں کی تربیت دینے کے لیے الگ سرمایہ درکار ہو گا۔ اسی ضمن میں ایک اور مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے جس سے ماسکو کے منصوبہ ساز سخت تشویش میں مبتلا ہیں۔ وسطی ایشیاء کی ریاستوں مثلاً" ازبکستان میں بار آوری کی شرح سلافی اور بالٹک کے علاقے سے تین گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ آبادی کثرت سے مذکورہ زرخیز علاقوں کی جانب مراجعت کر رہی ہے۔ لٰہذا خدشہ ہے کہ اس ملک کی آبادی میں روسی نسل کے لوگ جو ۱۹۸۰ء میں ۵۲ فی صد تھے' ۲۰۰۰ء میں محض ۳۸ فی صد رہ جائیں گے۔ سوویت یونین کی تاریخ میں یہ صورت حال پہلی مرتبہ پیدا ہو گی کہ خود روسی لوگ اکثریت میں نہیں ہوں گے۔

بعض ناقدین کے لیے مشکلات و مسائل کی یہ فہرست سوہان روح بن جائے گی۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ سوویت یونین کے وہ شعبے جو فوج کی تحویل میں ہیں وہاں کی پیداواری شرح عموماً" بہتر اور موثر رہی ہے اور مزید ترقی کی جانب پیش قدمی جاری ہے۔ اس کی تمام تر وجہ فوجی جوانوں کا بے پایاں جوش و خروش ہے۔ ایک مورخ نے (غالباً" ۱۹۸۱ء میں) یہ لکھا تھا کہ سوویت یونین کا منظرنامہ اتنا تاریک بھی نہیں ہے۔ اگر گذشتہ نصف صدی میں ہونے والی اقتصادی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو منفی رجحانات کالعدم ہو جاتے ہیں۔ ویسے مغربی مبصرین کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ ایک دور میں تو روس کی صلاحیتوں کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرتے ہیں جبکہ کسی اور عہد میں اس کی کمزوریوں کا بڑھ چڑھ کر اعلان کرتے ہیں۔ بہرحال یہ بات

تسلیم شدہ ہے کہ لینن کے زمانے سے سوویت یونین نے خاصی ترقی کی ہے۔ البتہ یہ صورت حال باعث تشویش ہے کہ یہ ملک مغرب کی ہم سری نہیں کر سکا۔ بریژنیف کے عہد حکومت سے معیار زندگی میں جو خلا پیدا ہوا تھا' وہ بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔ اس ملک کی فی کس آمدنی اور صنعتی کارکردگی جاپان اور دیگر ایشیائی ممالک کے مقابلے میں فروتر رہی ہے۔ اگرچہ سوویت قیادت ملک کی عظمت و خوشحالی کے گن گاتی رہی ہے لیکن امرواقعہ یہ ہے کہ وہاں پیداوار کی شرح گرتی چلی گئی ہے۔ آبادی تیزی سے معمر ہوتی رہی ہے۔ آب و ہوا اور موسم کی خرابی سد راہ رہی ہے' ایندھن کے ذخائر نابود ہوتے رہے ہیں اور زراعت کے شعبے میں پے در پے مشکلات کا سامنا رہا ہے۔

یہی وہ پس منظر تھا جس کو مد نظر رکھتے ہوئے گورباچوف نے یہ اعتراف کیا تھا:

"ہمارے جملہ مسائل کے حل کے لیے ملک میں سماجی اور اقتصادی ترقی ناگزیر ہے"

برفباری جیسی قدرتی آفات کے قطع نظر چین کے طرز پر آگے چھلانگ لگانے میں دو سیاسی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اول تو پارٹی کے اعلیٰ کارکن' دفتری حکام اور طبقہ علیا کے افراد ہیں جنھیں ہر طرح کی سہولت میسر ہے جو روزمرہ زندگی کے مصائب و آلام سے بے نیاز ہیں جو اثر و رسوخ کے حامل ہیں اور جن کی اقتدار تک رسائی ہے۔ اگر منصوبہ بندی اور قیمت گری کے نظام میں عدم مرکزیت ہو' کسانوں کو علاقائی حاکموں کے کنٹرول سے آزاد کر دیا جائے' فیکٹریوں کے مینیجروں کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دے دیا جائے' ہر شخص کو پارٹی کا وفادار رہنے کی بجائے کاروبار میں شرکت کرنے کی ترغیب دی جائے' فرسودہ پالیسی کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔ گھٹیا درجے کے مال کو منسوخ کر دیا جائے اور اطلاعات نشر کرنے پر کوئی پابندی عائد نہ ہو تو ایسی صورت میں ارباب اقتدار کو اپنی پوزیشن معرض خطر میں پڑتی نظر آئے گی۔

وعظ و نصیحت' لچک دار منصوبہ بندی' کسی نہ کسی شعبے میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری' نشہ کے خلاف موثر اقدامات اور راشی انتظامیہ کے خلاف تادیبی کاروائی۔۔۔۔۔۔ ایک علیحدہ بات ہے لیکن وہ تمام مجوزہ تبدیلیاں جن پر سوویت پارٹی کے افسران زور دیتے رہے ہیں' سائنسی انداز میں آنی چاہئیں اور اس ضمن میں منڈی کی معیشت اور نجی کاروبار میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ حال میں روس کا دورہ کرنے والے ایک شخص کا خیال ہے: "سوویت یونین کو اس نااہلیت کی اس لیے ضرور ہے کہ وہ "سوویت" رہنا پسند کرتا ہے" اگر یہی صورت حال ہے تو گورباچوف کے اس اصرار کے باوجود کہ نظام میں بھرپور تبدیلی ضروری ہے' ترقی کی طویل المدتی شرح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

سوویت یونین نے دفاع کے لیے مجموعی قومی آمدنی کا معتدبہ حصہ مخصوص کر رکھا ہے جو سیاسی لحاظ سے ترقی میں نہایت اہم رکاوٹ ہے۔ بہت سے تجزیہ نگاروں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغربی ممالک کے دفاعی اخراجات کے مقابلے میں وہاں کے مجموعی اخراجات کتنے ہیں اور کس نوعیت کے ہیں اس ضمن میں ۱۹۷۵ء کی سی آئی اے کی رپورٹ کے مطابق گذشتہ دنوں روسی اسلحے کی جو قیمت روبل

کے حساب سے تھی' اس میں دوگنا اضافہ ہو چکا ہے اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ روس اپنے دفاعی بجٹ پر اپنی قومی آمدنی ۶ ۲ سے ۸ فی صد کے بجائے ۱۱ تا ۱۳ فی صد حصہ خرچ کر رہا ہے! اس طرح مذکورہ ملک کی صورت حال معمہ بن جاتی ہے۔ تاہم اصل اعداد و شمار جو روسی منصوبہ سازوں کو بھی نہیں معلوم ہوں گے' اتنی اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ اگرچہ وہاں ۱۹۷۶ء کے بعد اسلحہ پر اخراجات میں کمی آ گئی ہے' لیکن پھر بھی کریملن نے ملکی پیداوار کا بیشتر حصہ اس مد میں اسی طرح صرف کیا ہے جس طرح امریکہ نے ریگن کے عہد حکومت میں فوجی طاقت کو مستحکم کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس اقدام کے نتیجے میں روسی افواج افرادی قوت' انجینئرز' مشین اور نقد سرمایہ اپنے مصرف میں لائیں جو عوام کی معیشت کو بہتر بنانے میں کام آ سکتا تھا۔ بعض اقتصادی ماہرین کے خیال میں اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دفاعی اخراجات میں بہت زیادہ کمی کر دینے سے روس کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ نہایت سرعت سے ہو جائے گا۔ اس کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ ٹی۔۷۲ جیسی توپ ڈھالنے والی فیکٹریوں کو کسی اور کام کے لائق بنانے میں ایک عرصہ درکار ہو گا۔ اگر دوسری طرح سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ موجودہ صدی کے بقیہ عرصے کے دوران نیٹو کے ساتھ ہونے والی اسلحے کی دوڑ میں روس اپنے دفاعی اخراجات میں ۱۴ سے ۱۷ فی صد تک کا اضافہ کرے گا اور ۲۰۰۰ تک قومی پیداوار کا معتدبہ حصہ بھی اسی کام میں صرف کر دے گا۔ پھر صورت یہ ہو گی کہ صنعتی ساز و سامان زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوجیوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہو جائے گا اور بقیہ صنعت میں لگایا جانے والا سرمایہ بھی دفاعی شعبہ ہتھیا لے گا۔ ماہرین اقتصادیات کے خیال میں یہ صورت حال روس کے منصوبہ سازوں کے لیے نہایت سنگین ہو گی' اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دفاعی اخراجات میں اضافے کی شرح مجموعی قومی پیداوار میں اضافے کی شرح سے کہیں زیادہ ہو گی۔ اس کے نتیجے میں ملک کی خوشحالی گہنا کر رہ جائے گی اور اخراجات میں کمی آ جائے گی۔

بہرحال دیگر بڑی طاقتوں کی طرح سوویت یونین کو بھی قومی وسائل کو بروئے کار لانے میں مندرجہ ذیل ترجیحات کو پیش نظر رکھنا ہو گا:

(۱) فوجی ضروریات= اس ضمن میں ملکی تحفظ کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ہو گا اور عسکری صلاحیت بھی مد نظر رکھنی ہو گی۔

(۲) عوامی مطالبہ= اشیائے صرف کی فراہمی زندہ رہنے کے لیے مناسب و موزوں حالات اور روزگار کے مواقع۔ یہاں موت اور بیماری کی روز افزوں شرح پر کنٹرول کرنے کی بات نہیں کی جا رہی ہے۔

(۳) زراعت اور صنعت میں سرمایہ کاری= تاکہ اقتصادی حالت کو جدید خطوط پر ڈھالا جا سکے' پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے' دیگر ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہوا جا سکے اور طویل المیعاد سطح پر دفاعی اور سماجی ضروریات پوری کی جا سکیں۔

دیگر ممالک کی طرح روس کے منصوبہ سازوں کو بھی ترجیحات کے انتخاب میں دشواری پیش آئے گی۔ بہرحال ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ روسی صارفین کی ضروریات اور ملک کی جدید کاری کی اہمیت

کے تقاضے کتنے ہی لازمی' وسیع اور منطقی کیوں نہ ہوں' لیکن ماسکو کے خیال میں روایتی قسم کا فوجی ہوا کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ اسے دیکھ کر اس کی بنیادی ترجیح معلوم ہو جاتی ہے۔ جب تک گورباچوف کی حکومت حالات میں تبدیلی نہیں لاتی' بندوق کو مکھن پر فوقیت حاصل رہے گی اور وہ ملک کی اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی رہے گی۔ روس کی اس خصوصیت نے اسے جاپان مغربی یورپ' چین اور امریکہ سے بالکل مختلف حیثیت کا ملک بنا کر رکھ دیا ہے۔

تاریخی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کریملن آج زار روس اور خود اسٹالن کی باقیات کی پیروی کر رہا ہے اور انھی کی طرح یہ چاہتا ہے کہ دیگر طاقتوں کے مقابلے میں اس کی مسلح افواج کو برتری حاصل رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت سوویت یونین کی عسکری طاقت خاصی مرعوب کن ہے۔ بہرحال روس کے دفاعی اخراجات کے متعلق صحیح اعداد و شمار پیش کرنا بعید از قیاس ہو گا۔ ایک جانب ماسکو کے سرکاری اعداد و شمار ہیں جو حد درجہ کم ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بہت سے دفاعی اخراجات کو کسی اور ہی کھاتے میں ڈال کر پردہ پوشی کر دی گئی ہے مثلاً" سائنس' خلائی پروگرام' اندرون ملک حفاظتی اقدام' سول ڈیفنس اور تعمیرات دوسری جانب مغربی ممالک نے جو اندازے لگائے ہیں وہ تمام تر ڈالر اور روبل کے شرح مبادلہ پر منحصر ہیں۔ پھر انھیں روس کے میزانیاتی طریقہ کار کا جزوی علم بھی نہیں۔ علاوہ ازیں سی آئی اے نے جو گوشوارہ پیش کیا ہے اس کا انحصار زیادہ تر روسی ساخت کے ہتھیار یا افرادی قوت کی لاگت کو ڈالر کے حساب سے پیش کرنے کی کوشش پر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساری باتیں قیاس پر مبنی ہیں اور جو چاہے اپنی مرضی سے رائے قائم کر لے لیکن جو بات طے ہے وہ یہ ہے کہ روسی افواج کے ہر شعبے کو چاہے وہ ایٹمی ہو یا روایتی' بری ہو' یا بحری یا فضائی' جدید خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے۔ روس میں بری اور بحری میزائل سسٹم کی تنصیب ہزاروں لڑاکا طیارے' لاکھوں ٹینک' جنگی جہازوں اور آبدوزوں کی غیر معمولی کارکردگی' جنگ کے مختلف طریقے' سراغ رسانی کا نظام اور دشمن کے متعلق "غلط بیانی" کا انداز ـــــ یہ تمام عوامل حد درجہ متاثر کرنے والے ہیں۔ ممکن ہے روس نے ان تمام دفاعی چیزوں پر اتنی رقم خرچ نہ کی ہو جتنی پینٹاگون کیا کرتا ہے' تاہم ان سے سوویت یونین کی عسکری صلاحیت کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صلاحیت ہے جو صرف اس کے حریف ملک امریکہ کو ہی حاصل ہے۔ یہ ملک بیسویں صدی کا عسکری گاؤں ـــ "پوٹم کن" نہیں ہے جو پہلے ہی دھماکے میں اڑ جائے۔

مذکورہ حقائق کے باوجود روس کے عسکری نظام میں خامیاں بھی ہیں اور اس کے ان گنت مسائل بھی ہیں۔ چنانچہ اس کی فوج اتنی اعلیٰ پائے کی بھی نہیں ہے کہ کریملن کے احکامات کے تحت تمام آپریشن کو کامیابی کے ساتھ انجام دے دے۔ چونکہ اس باب میں دنیا کی دیگر طاقتوں کے منصوبہ سازوں کے تذبذب کی کیفیت کو بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا مناسب ہو گا کہ روس کی فوجی قیادت کو جن اہم مسائل کا سامنا ہے انھیں بیان کر دیا جائے۔ بہرحال یہاں ایک دم سے یہ مخالف رائے قائم کر لینا بعید از عقل ہو گا کہ سوویت یونین طویل عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔

روس کے فوجی قائدین کو جن مشکلات کا سامنا ہے وہ دراصل اقتصادی اور آبادیات کے

مسائل کا نتیجہ ہیں۔ سطور بالا میں ان کا تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔ پہلا عسکری مسئلہ ٹیکنالوجی کا ہے۔ پیٹراعظم کے زمانے سے روس کو فوجی لحاظ سے مغرب پر برتری حاصل رہی ہے۔ اس زمانے میں اسلحہ کے نظام میں جدیدیت کا فقدان تھا۔ لیکن جب ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی میں کمیت کی بجائے کیفیت پر زور دیا گیا تو روس کی فوجی بالادستی برقرار نہیں رہی۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ زار روس کے زمانے سے سوویت یونین اور مغرب کے درمیان جو تکنیکی خلا تھا اسے اول الذکر نے پر کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کی فوج کو سائنسی اور پیداواری وسائل تک رسائی حاصل ہے۔ پھر بھی تکنیکی صلاحیتوں کو اپنانے میں خاصا وقفہ بھی رہا ہے۔ اس کی مثال مشرق وسطیٰ اور دیگر علاقوں میں ہونے والی لڑائیوں کے دوران پیش آئی جب سوویت یونین کا اسلحہ امریکہ کے فوجی سازوسامان کے سامنے بے وقعت ثابت ہوا۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ شمالی کوریا' مصر' شام اور لیبیا کے پائلٹ اور توپچی اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل نہ تھے اور اگر تھے بھی تو اس بات میں شک و شبہ ہے کہ وہ امریکی اسلحہ' راڈار' ہدایت کے سائنسی نظام وغیرہ کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتے ہوں گے۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر روسی فوجی کے مغربی ماہرین کے بقول سوویت یونین میں فوجی صلاحیت کو فروغ دیا جا رہا ہے اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ چند برسوں کے اندر امریکہ کے اسلحے کے جدید نظام کو اپنا لیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں روسی منصوبہ سازوں کو اسی خلجان سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے جس سے مغرب والے دوچار ہیں۔ اعلیٰ درجے کے فوجی سازوسامان کی تیاری میں خاصا طویل وقت درکار ہو گا۔ پھر ان کی دیکھ بھال کا ایک طویل نظام الاوقات مرتب کرنا پڑے گا۔ ان ہتھیاروں کے بنانے کے لیے نہایت مہنگے آلات کی ضرورت بھی درپیش ہو گی۔ پھر یہ اسلحے نہایت قلیل تعداد میں ہوں گے۔ چنانچہ ایک ایسے ملک کے لیے جو روایتی ہتھیاروں کا زبردست ذخیرہ رکھتا ہو اور جس سے وہ معرکہ بھی سر کرتا رہا ہو' جدیدیت کا یہ انداز سکون آمیز نہیں ہو سکتا۔

امریکی صدر ریگن کی انتظامیہ نے دفاعی حکمت عملی کے سلسلے میں جو اقدامات کیے ہیں وہ بھی سوویت یونین کی بے اطمینانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ سردست اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ کیا واقعی امریکہ اس حکمت عملی کی بدولت نیوکلیئر حملے سے محفوظ رہے گا۔ اس لیے کہ اگر نہایت نچلی سطح پر کروز میزائل اڑ رہا ہو تو یہ جدید نظام اس کے تدارک نہیں کر پائے گا۔ بہرحال اس کی بدولت وہ علاقے یقیناً محفوظ رہیں گے جہاں میزائل نصب ہیں یا پھر ایئربیس کی حفاظت ہو گی۔ بایں ہمہ اس نظام کی وجہ سے روس کے دفاعی بجٹ پر بھی دباؤ پڑے گا اور وہ ایس ڈی آئی کے نظام کو ناکارہ بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ راکٹ اور وار ہیڈز تیار کرے گا۔ یہ بات کریملن کے لیے کسی طرح بھی خوش آئند نہیں ہو گی۔ چونکہ اب روایتی جنگ بھی سراسر تکنیکی نوعیت کی ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی روس کے لیے باعث تشویش بنی ہوئی ہے۔ ایک نقاد کے بقول:

> "روس کے ۹۹ فی صد ایٹمی ہتھیاروں کے ذخائر سے بچاؤ کی تمام تدبیریں ناکافی ہوں گی۔ اس کی وجہ ایسے اسلحوں کی تباہ کاریاں ہیں۔ لیکن اگر امریکہ ٹیکنالوجی میں ایسی مہارت حاصل کر لیتا ہے جو سوویت یونین کے

> مروجہ لڑاکا طیارے' ٹینک اور جنگی جہازوں کو تباہ و برباد کر دے تو اس صورت میں روس کی عددی برتری بے مایہ ثابت ہو گی اور امریکی فوجیوں پر اس کا خوف باقی نہیں رہے گا۔ پھر ایس ڈی آئی کا کارنامہ غیر ایٹمی جنگ میں بھی کچھ کم نہیں رہے گا"

مذکورہ حقائق کے نتیجے میں روس اپنے فوجی سازوسامان میں لیزر' آلہ بصر' سپر کمپیوٹرز' ہدایتی سسٹم اور جہازی آلات کے اضافے کی خاطر بے دریغ رقم خرچ کر رہا ہے۔ چنانچہ ایک روسی ترجمان کا کہنا ہے کہ "اب اعلیٰ ٹیکنالوجی کی سطح پر اسلحے کی نئی دوڑ شروع ہو گی" ۱۹۸۴ء میں روسی افواج کے سپہ سالار مارشل اوگارکوف نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر ہمارا ملک مغربی ٹیکنالوجی میں ہمسری حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اس کے نہایت مضر اثرات نمایاں ہوں گے" اس قول پر "سرخ فوج" عمل درآمد کرتے ہوئے خود کو اس قابل سمجھ رہی ہے کہ وہ اس دوڑ میں فتح حاصل کر لے گی۔

روس کو ہر لحاظ سے جو عددی برتری حاصل رہی ہے اسے آبادیات کے سنگین مسئلے سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ یعنی افرادی قوت میں کمی آتی جا رہی ہے۔ جیساکہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس کی دو وجوہات ہیں: ایک تو وہاں کی شرح پیدائش میں کمی آتی جا رہی ہے' دوسرے غیر روسی علاقوں میں یہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر سوویت یونین کی افرادی قوت کو زراعت اور صنعت میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں آگے چل کر فوجی بھرتی میں خاصی دشواری پیش آئے گی۔ اگرچہ ۲ء۱ ملین مرد جوانوں میں سے ہر سال ۱ء۳ تا ۱ء۵ ملین رنگروٹ بھرتی کرنا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہو گا۔ لیکن اصل دقت یہ ہو گی کہ رنگروٹوں کی زیادہ تعداد ترکستان کے ایشیائی جوانوں پر مشتمل ہو گی جن میں زیادہ افراد روسی زبان سے نابلد ہیں۔ انھیں مکینک کا کام بھی نہیں آتا۔ (بجلی کے کام کا تو سوال ہی نہیں) اور یہ لوگ اسلام سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ روسی افواج میں مختلف النسل افراد کا سروے کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں زیادہ تر جوان اور نان کمیشن افسر سلافی نسل کے ہیں۔ یہی صورت حال فضائیہ' بحریہ' راکٹ بردار فوج اور تکنیکی عملے میں پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ "سرخ فوج" کے اول درجے کے افسران بھی سلافی نسل ہیں۔ البتہ دوسرے اور تیسرے درجے کے فوجی' دیگر عملے کے افراد وغیرہ سلافی نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نیٹو کے ساتھ جنگ چھڑ جاتی ہے تو یہ نوع بنوع ڈویژن کیا کارکردگی دکھائے گا؟ اور اگر اول درجے کے لیے مزید بھرتی کی ضرورت پڑ گئی تو؟ بہت سے مغربی نقاد "عظیم روس" کے "نسل پرستانہ" اور "وطن پرستانہ" تضاد پر حرف گیری کرتے ہیں حالانکہ فوجی اصول کے مطابق یہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ یہ بات تشویش ناک ہے کہ روس کا اسٹاف زیادہ تر افرادی قوت کو ناقابل بھروسہ اور نااہل قرار دے دیتا ہے۔ یہ فیصلہ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اگر رپورٹ کا جائزہ لیا جائے تو جنوبی روس کے تمام

علاقے میں "مسلم بنیاد پرستی" کے اثرات قائم ہیں اور وہاں کے فوجی دستے افغانستان پر حملہ کرنے میں پس و پیش کرتے رہے ہیں۔☆

دوسرے معنوں میں روسی قیادت کو وطن پرستی کے مسئلے کا اسی طرح سامنا ہے جس طرح اسی(۸۰) سال قبل آسٹریا۔ ہنگری کی سلطنت کو یا پھر حکومت زار کو سامنا کرنا پڑا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ روس میں وطن پرستی کا یہ مسئلہ مارکسی نظریے سے بے اثر نہیں ہوا ہے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ کنٹرول کرنے کی طاقت ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں اب کہیں زیادہ ہے۔ اور اس دعوے کی کڑوی گولی بادل نخواستہ نگلنی پڑے گی کہ یوکرین سیاسی بے چینی اور اطاعت سے انحراف کا ایک زبردست "اڈا" بنا ہوا ہے۔ بہرحال ذہنوں میں یہ بات تازہ ہے کہ کس طرح ۱۹۴۱ء میں اہالیان یوکرین نے جرمن حملہ آوروں کا استقبال کیا تھا اور اب اس طرح کی رپورٹیں موصول ہو رہی ہیں کہ بالٹک کے صوبوں میں بے چینی کی لہر پھیل چکی ہے اور جارجیا میں اس بات پر سخت احتجاج ہوا ہے کہ روسی زبان کو اس جمہوریت کی درجہ اول کی زبان قرار دی جائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ چین اور روسی سرحد کو پار کر کے ہزاروں کازک اور یوگر باشندے ترک وطن کر چکے ہیں اور ترکی' ایران اور افغانستان سے ملحقہ سرحدوں پر ۴۸ ملین مسلمان اکٹھے ہو چکے ہیں۔ ان تمام باتوں سے روسی قائدین کا ذہن بوکھلا گیا ہے اور وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ انھیں اس بات کی فکر ہے کہ "قابل اعتبار" سلافی جوانوں کو کہاں کھپایا جائے۔ کیا انھیں مسلح افواج میں شامل کیا جائے' کیا اول درجے کے فوجی افسران کی صف میں سمویا جائے' کیا دوسرے معزز پیشے سے وابستہ کیا جائے' کیا انھیں صنعت اور زراعت کے شعبے میں مامور کر دیا جائے جہاں تجربہ کار اور قابل اعتبار افراد کی شدید ضرورت ہے؟ کیا غیر سلافی افراد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں "سرخ فوج" میں بھرتی کیا جائے' قطع نظر اس کے کہ ان کی وجہ سے عسکری کارکردگی معرض خطر میں پڑ جائے گی؟ کیا غیر سلافیوں کی جگہ روسیوں اور سلافیوں کو سول ملازمت دے دی جائے؟ چونکہ روس میں یہ روایت رہی ہے کہ وہاں "حفظ ما تقدم" زیادہ ضروری ہے' لہٰذا پہلی بات کو غالباً" ترجیح دی جائے گی۔ بہرحال تذبذب کی اس کیفیت کو ختم کرنے کے دوران کسی نہ کسی ایک برائی کا انتخاب کرنا ہوگا۔

☆ فاضل مصنف نے اپنی اس تحقیقی کتاب میں کوئی بھی بات بغیر کسی مستند حوالے کے نہیں کہی ہے اور اگر ذاتی رائے بھی دی ہے تو کسی معتبر حوالے کی بنیاد پر! لیکن مسلم بنیاد پرستی کے سلسلے میں یہ لرزہ خیز بات بغیر کسی حوالے کے کہی گئی ہے۔ اگر واقعی جنوبی روس میں مسلم بنیاد پرستوں کا دور ہے اور وہ افغانستان پر حملہ کرنے سے ہچکچاتے رہے ہیں تو اس اہم بیان کی بنیاد ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پال کینیڈی صاحب اسلام کے خلاف اپنے متعصبانہ جذبے پر قابو نہ رکھ سکے اور بین السطور ایسی بات کہہ گئے جو تحقیق کے منافی ہے۔ دوسرے ناقابل بھروسہ اور نا اہل قرار دیئے جانے والے افراد کا اطلاق بادی النظر میں مسلم بنیاد پرستوں پر ہی ہو رہا ہے مگر اس کا بھی کوئی حوالہ موجود نہیں (مترجم)

اگر سوویت یونین میں اقتصادیات کی اجزائے ترکیبی کو جنھیں بعض روسی ماہرین "طاقتوں کا ارتباط" کہتے ہیں' "پولٹ بیورو" تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے تو وہی قائدین دنیا میں طاقت کے توازن میں تیزی سے ہونے والی تبدیلی سے کوئی سبق بھی حاصل نہیں کرتے۔ بہرحال غیر ملکی مبصرین کی نظر میں سوویت یونین کا عسکری شعبہ کیسا ہی مرعوب اور چونکا دینے والا کیوں نہ دکھائی دیتا ہو' لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیگر افواج کے مقابلے میں روسی افواج اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بخوبی اہل ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ مروجہ طریقہ جنگ اور ایٹمی جنگ کو علیحدہ کر کے جائزہ لیا جائے۔ تو یہ واضح ہوتا ہے کہ کئی اسباب کی بناء پر عسکری توازن ہمیشہ بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے۔ جن میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین پیش پیش ہیں۔ دونوں میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ دنیا کو تہہ و بالا کر دیں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ "بین الاقوامی ادارہ برائے دفاعی مطالعہ" نے ۱۹۸۶ء میں دونوں کے ایٹمی وار ہیڈز کی گنتی کی تھی جسے یہاں پیش کرنا نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے (دیکھئے جدول نمبر ۳۷)

جدول نمبر ۳۷: ایٹمی وار ہیڈز کا تخمینہ

	امریکہ	روس
آئی سی بی ایم ساخت کے وار ہیڈز	۲۱۱۸	۴۳۲۰
ایس ایل بی ایم ساخت کے وار ہیڈز	۵۵۳۶	+۲۷۸۷
لڑاکا طیاروں میں نصب وار ہیڈز	۲۵۲۰	۶۹۰
میزان=	۱۰۱۷۴	+۹۹۸۷

اگر کوئی ان اعداد و شمار کے متعلق اپنے رد عمل کا اظہار کرتا ہے تو وہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ لوگ جو اعداد یا ان کے غلط اظہار کے متعلق محتاط رہتے ہیں' ان کے لیے نہ صرف ذیلی میزان کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے بلکہ یہ بتانا بھی مقصود ہوتا ہے کہ ہر سپرپاور کے پاس پیچیدہ اور فنی قسم کے نیوکلیئر ہتھیاروں کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ غیر سرکاری تجزیہ نگاروں اور عوام کے خیال میں ان دونوں سپر پاورز کے اسلحہ خانوں میں تباہ کن قسم کے ایٹمی ہتھیار خاصی تعداد میں موجود ہیں وہ سیاسی نا اہلی اور خر دماغی کی علامت ہیں۔ یہ سارے مہلک ہتھیار اس کرے پر بسنے والوں کے لیے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو انھیں نیست و نابود کر دیا جائے یا ان کی تعداد میں خاصی کمی کر دی جائے۔ لیکن دوسری جانب دانش گاہوں اور جامعات میں نقادوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ملکی دفاع کی خاطر ان ایٹمی ہتھیاروں کو ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنی ذہنی توانائی یہ معلوم کرنے میں صرف کر دیتے ہیں کہ ہر ہتھیار کا خود کار نظام کیسا ہے۔ جنگ کے اثرات کو وسیع کرنے کی کتنی صلاحیت ہے' تخفیف اسلحہ کے مثبت اور منفی پہلو کیا ہیں' "تھروویٹ" اور "فٹ پرنٹ" سے کیا مراد ہے' "میگاٹن کے مساوی" کے کیا معنی ہیں' انداف کی پالیسی کیا چیز ہوتی ہے اور دوبارہ وار کرنے کا منظر کیا ہوتا ہے؟

پانچ صدیوں پر مشتمل اس تجزیے میں ایٹمی مسئلے سے متعلق کچھ کہنا خاصا مشکل نظر آتا ہے۔ کیا یہ بات نہیں ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں اور ان کے وسیع استعمال کے پیش نظر جنگ، حکمت عملی، معیشت وغیرہ کا معاملہ روایتی نقطہ نظر سے کھٹائی میں پڑ گیا ہے؟ کیا ان ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے مرتب ہونے والے اثرات سے جنوبی کرے اور شمالی کرے میں بسنے والا انسان بالکل محفوظ رہے گا؟ کیا بڑی طاقتوں کے درمیان پائی جانے والی روایتی دشمنی وقتاً" فوقتاً" کھلی جنگ کی صورت میں نمایاں نہیں ہوئی تھی، تاآنکہ ۱۹۴۵ء میں اپنے اختتام کو پہنچی؟

بہرحال ایسے سوالات کا جواب یقین کے ساتھ دینا بظاہر بہت مشکل ہے۔ تاہم ایسے شواہد موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کی بڑی طاقتیں قدیم روایات کو اپناتے ہوئے اپنی طاقت کے مظاہرے کی طرف راغب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کی تمام تر وجہ ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ فی الوقت (اور کچھ عرصہ پہلے بھی) دونوں سپرپاورز کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کے معاملے میں ایک توازن رہا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہر دو پاورز کو مواقع بھی حاصل ہیں اور اول اول ضرب لگانے کی صلاحیت بھی موجود ہے، نہ تو واشنگٹن اور نہ ہی ماسکو اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ وہ خود کو نقصان پہنچائے بغیر اپنے دشمن کو تباہ کر دے گا۔ پھر "اسٹار وار" کی تحریک بھی اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ بات خصوصی طور پر ذہن نشین رہے کہ ہر فریق کے پاس کثیر تعداد میں ایسی سب میرین موجود ہیں جن پر بلاسٹک میزائل نصب ہیں اور جو پانی کی تہہ میں یوں پوشیدہ ہیں کہ ان کا سراغ لگانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں کوئی بھی فریق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے دشمن کے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخائر کو آناً" فاناً" ختم کر دے گا۔ بہرحال فیصلہ ساز ایسے انتہائی اقدام سے گریز کریں گے تاوقتیکہ انھیں ناسازگار حالات کے تحت مجبور نہ ہو جانا پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فریق "ایٹمی زچ" میں گھر کر رہ گیا ہے اور اس سے واپس بھی نہیں ہو سکتا۔ دونوں سپرپاورز نہ تو نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں نئی ایجاد کرنے سے باز آ سکتی ہیں اور نہ ہی ہتھیاروں سے کنارہ کشی اختیار کر سکتی ہیں۔ پھر اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہو گا اس لیے کہ ایک فریق کی نئی ایٹمی تحریک کا دوسرے نے "توڑ" تیار کر لیا ہے، یا پھر اس کا چربہ اتار لیا ہے۔ بہرحال ہتھیاروں کا استعمال بذات خود خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔

ہم بادی النظر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر سپرپاور کا اسلحہ خانہ موجود رہے گا۔ البتہ ہتھیاروں کا استعمال ممکن نظر نہیں آتا۔ ویسے اس دور میں قدیم تصور باقی نہیں رہا کہ دیگر چیزوں کی طرح جنگ میں بھی اقدام و انجام کے مابین توازن ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس ایٹمی جنگ میں جو تباہی اور بربادی ہوتی ہے اور انسانیت اور انسانوں کو جس طرح نقصان پہنچتا ہے اس سے نہ نظریاتی، نہ سیاسی اور نہ ہی اقتصادی مقصد پورا ہو گا۔ اگرچہ بڑے بڑے دماغ ایٹمی جنگ لڑنے کی حکمت عملی مرتب کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں تاہم جروز کی اس رائے پر بحث کرنا بے حد مشکل ہے کہ "ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے سلسلے میں ایک معتدل حکمت عملی وضع کرنا اصول سے انحراف ہے" جونہی پہلا میزائل داغا جاتا ہے تو پھر ایک دوسرے کے لیے پناہ گاہیں نہیں ہوں گی۔ تب نتائج اتنے بھیانک ہوں گے کہ کوئی معقول سیاسی رہنما اس

معاملے میں پہل نہیں کرے گا۔ کسی انسانی غلطی یا تکنیکی غلط کاری کی بدولت اگر ایٹمی جنگ نہیں چھڑتی تو ہر فریق کو مجبور کرتا ہو گا کہ وہ "نیوکلیئرائی" نہ ہونے پائے اور اگر محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے تو سیاسی اور فوجی قائدین دونوں اس ایٹمی جنگ کو اسی انداز سے روکنے کی کوشش کریں گے جس طرح روایتی جنگ روکی جاتی تھی۔

بہرحال یہ حقیقت بالکل واضح نہیں ہوتی ہے کہ اگلی صدی میں دونوں متحارب سپرپاورز کو کن مسائل کا سامنا ہو گا، خصوصاً" ایسی حالت میں جبکہ دنیا کے متلون مزاج ممالک۔۔۔۔۔ مشرق قریب، برصغیر☆ ہند، جنوبی افریقہ، لاطینی امریکہ میں ایٹمی پھیلاؤ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔۔۔ چونکہ مذکورہ ممالک بڑی طاقت کے نظام کا حصہ نہیں ہیں لہٰذا علاقائی جھگڑوں میں ان کے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کا معاملہ یہاں زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ بہرحال ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ امریکہ اور روس دونوں کی مشترکہ دلچسپی ایٹمی پھیلاؤ کے روکنے میں ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس نیوکلیئر توسیع کی وجہ سے عالمی ست پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے۔

ماسکو نقطہ نظر سے ایک مختلف طبقے میں نہایت تیز رفتاری سے ایٹمی ہتھیاروں میں توسیع ہو رہی ہے۔ ان میں چین، برطانیہ اور فرانس شامل ہیں۔ کچھ ہی عرصے پہلے تک یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ مذکورہ تینوں ممالک ایٹمی طاقت میں محض واجبی حیثیت رکھتے ہیں اور اس نیوکلیئر جنگ میں انھیں کوئی خاص مہارت بھی نہیں۔ چنانچہ وہ روس کو نہایت معمولی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ ممالک کے متعلق یہ رائے جلد ہی تبدیل ہو جائے گی۔ ماسکو کے لیے یہ سراسر لمحہ فکریہ ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کی ایٹمی صلاحیت خاصا فروغ پا چکی ہے۔ ویسے سوویت یونین گذشتہ پچیس سال سے چین کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہے۔ اگر چین آئی سی بی ایم سسٹم کو زمین پر نصب کر لیتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق دور تک مار کرنے والا میزائل سب میرین میں فٹ کر دیتا ہے اور سوویت یونین سے اس کا جھگڑا ختم نہیں ہوتا تو اس صورت میں روس کو یہ فکر دامن گیر رہے گی کہ کہیں آئندہ سرحدوں پر فوجی جھڑپ نہ ہو جائے جو بعد ازاں ایٹمی جنگ کی صورت اختیار کر لے۔ اس وقت جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ چین کو بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔ ویسے ماسکو کو یہ خدشہ بھی ہے کہ کہیں چین ۱۹۹۰ء کی دہائی میں میزائلوں سے سوویت یونین پر حملہ نہ کر دے۔

ادھر برطانیہ اور فرانس میں بھی ایٹمی ہتھیاروں میں پیش رفت ہوئی ہے۔ دونوں ممالک میں ڈلیوری کے نظام اور وار ہیڈز کی صلاحیت کو فروغ دیا گیا ہے۔ اگرچہ سیاسی طور پر یہ بات اتنی فکر انگیز نہیں، تاہم تکنیکی لحاظ سے ضرور باعث تردد ہے۔ ان دونوں طاقتوں کے اسلحہ کی کارکردگی حالیہ دنوں تک

☆ اس برصغیر میں پاکستان بھی شامل ہے جسے مصنف نے نظرانداز کر دیا ہے (مترجم)

قابل اعتنا نہ تھی۔ اگر مذکورہ ممالک سوویت یونین کے ساتھ ایٹمی جنگ کا آغاز کر دیتے ہیں اور امریکہ غیر جانب دار رہتا ہے تو اس صورت میں وہ اپنے ڈلیوری سسٹم کے ذریعے روس کو تو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچائیں گے البتہ اپنی مکمل تباہی کا سامان پیدا کر لیں گے۔ لیکن آئندہ چند برسوں میں یہی درمیانے سائز کی طاقت کے حامل ممالک روس کو جو نقصان پہنچائیں گے وہ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گا۔ اس کی تمام تر وجہ بلاسٹک میزائل سے لیس آبدوزوں کا ترقی یافتہ نظام ہو گا۔ مثال کے طور پر برطانیہ نے ایسی سب میرین حاصل کی ہے جس میں ٹرائیڈنٹ دوم میزائل سسٹم نصب ہے جسے "اکانومسٹ" نے نیوکلیئر میزائل کا "رولز رائس" قرار دیا ہے۔ اس کی قیمت بھی بہت زیادہ ہے اور مار کرنے کی صلاحیت بھی بے پناہ ہے۔ اس طرح ان کی شمولیت سے برطانیہ کی دفاعی قوت میں خاصا اضافہ ہو جائے گا اور وہ موجودہ ۲۶ روسی اہداف کی بجائے ۳۵۰ اہداف کو نشانہ بنا سکے گا۔ اسی طرح فرانس کی "ایل انفلیکسیبل" سب میرین ہے اس میں متنوع وار ہیڈز والا ایم۔۴ میزائل نصب ہے جس کو دور تک مار کرنے کی صلاحیت حاصل ہے۔ یہ آبدوز روس کے ۹۲ اہداف پر حملہ کر سکتی ہے۔ گویا اس طرح مذکورہ سب میرین کو فرانس کی سابقہ پانچوں سب میرین پر مجموعی فوقیت حاصل ہے اور جب وہاں کی بقیہ آبدوزوں میں بھی ایم۔۴ میزائل نصب کر دیے جائیں گے تو فرانس کے عسکری وار ہیڈز کی طاقت پانچ گنا بڑھ جائے گی۔ پھر تو وہ ہزاروں میل دور سے روس کو نشانہ بنا سکتا ہے۔

حقیقی معنوں میں ان سب باتوں کے کیا اثرات رونما ہوں گے' اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ برطانیہ کی کئی ممتاز شخصیتوں کا یہ خیال ہے کہ ان کا ملک اگر روس کے خلاف ایٹمی ہتھیار آزادانہ طور پر استعمال کرے گا تو۔ اس کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ لیکن یہ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ روس پر پہلے کی نسبت شدید حملہ ہو گا چاہے وہ خود کشی کے مترادف ہی کیوں نہ ہو۔ فرانس میں بھی لوگوں کی اور خصوصاً فوجی ماہرین کی یہ رائے ہے کہ اس ملک کی مزاحمتی طاقت مشکل سے معیاری ثابت ہو گی۔ دوسری طرف روس کے فوجی منصوبہ ساز جو ایٹمی جنگ کے امکانات کو بخوبی محسوس کرتے ہیں۔ نئی پیش رفت سے قدرے بوکھلائے ہوئے ہیں۔ اب انھیں صرف امریکہ کا ہی نہیں دیگر چار ممالک کا بھی سامنا کرنے پڑے گا۔ ان میں اتنی صلاحیت ہو گی کہ وہ روس کے مرکزی مقامات پر حملہ کر کے غیر معمولی نقصان پہنچائیں پھر انھیں یہ بھی احساس ہے کہ اگر وہ کسی ایک طاقت (مثلاً" چین) سے نبرد آزمائی کرتے ہیں تو بقیہ ممالک غیر جانب دار رہ کر محض تباہی و بربادی کا منظر ملاحظہ کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ تخفیف اسلحہ کی پالیسی کے ضمن میں روس امریکہ پر یہ دباؤ ڈال رہا ہے کہ انگلستان اور فرانس کے ایٹمی اسلحے پر بھی پابندی عائد کرنی ہو گی اور روس کو ایٹمی طاقت کے سلسلے میں اتنی رعایت ضرور ملنی چاہیے کہ وہ چین سے دو دو ہاتھ کر لے۔ بہرحال کریملن کے نقطہ نظر سے یہ سارے ایٹمی ہتھیار معتدل عسکری پالیسی کے ناقابل اعتنا عناصر ہیں۔

اگر موجودہ صورت حال میں مروجہ ہتھیار ہی روس کی فوجی صلاحیت کا معیار قرار پاتے ہیں اور سوویت یونین ریاست کے سیاسی مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ٹھہرتے ہیں تو یہ یقین کرنا مشکل ہو گا

کہ وہاں کے عسکری منصوبہ ساز فوج کے بین الاقوامی توازن کی حمایت کر دیں گے۔ یہ بیان ایسی صورت میں جرات مندانہ قرار دیا جائے گا جبکہ امریکہ و روس کے مابین "فوجی توازن" قائم کرنے کے لیے خصوصی اہمیت کا تخمینہ لگایا گیا ہے اور جس کی اچھی خاصی تشہیر بھی کی گئی ہے۔ اس گوشوارے میں روس کے طیارے' ٹینک' توپ' پیدل فوج وغیرہ کی تعداد بہت بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہے۔ یہاں اس قیاس آرائی کا اظہار مقصود نہیں کہ نیٹو کی فوجیں جو یورپ میں روایتی جنگ کی اب متحمل نہیں ہو سکتیں' وہ بھی جلد ہی "نیوکلیئر طاقت" اپنانے پر مجبور کر دی جائیں گی۔ ابھی حال ہی میں طاقت کے توازن کے سلسلے میں جو متعدد تحقیقی مضامین منظر عام پر آئے ہیں ان کے تجزیے کے مطابق کسی ایک بھی فریق کے پاس اتنی مجموعی طاقت نہیں کہ وہ فتح حاصل کر لے۔ اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے تجزیہ نگاروں نے تفصیل سے امریکہ اور روس کے مختلف فوجی عوامل کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ بایں ہمہ اس ضمن میں چین کے عسکری کردار اور وارسا پیکٹ کے قابل اعتماد ہونے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ان مباحث کا خلاصہ ہی یہاں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ مشاہدات جزوی طور پر صحیح ہیں۔ اس کے باوجود روسی منصوبہ سازوں کے لیے تلخ ثابت ہوں گے۔

یہاں پہلا نکتہ یہ پیش کیا جائے گا کہ روایتی قسم کی طاقت کے توازن کا تجزیہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ دشمنوں کے اتحادی ساتھیوں کو جانچا پرکھا جائے۔ خصوصاً" ان کے یورپی تناظر میں! اس طرح یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نیٹو کے غیر امریکی رکن ممالک وارسا پیکٹ سے وابستہ غیر روسی رکن ممالک سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں برطانیہ کے محکمہ دفاع نے جو قرطاس ابیض شائع کیا تھا اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ یورپی ممالک نے نیٹو کی فوج میں جو یورپ میں تعینات تھی' اپنے سپاہی زیادہ تعداد میں شامل کیے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے: ۹۰ فی صد افرادی قوت' ۸۵ فی صد ٹینک' ۹۵ فی صد توپ اور ۸۰ فی صد لڑاکا طیارے۔ علاوہ ازیں بحر اوقیانوس اور یورپی سمندروں میں ۷۰ فی صد بحری جنگی جہاز کھڑے کر دیے تھے۔ غرض یورپی فوج کی تعداد ۷ ملین تھی جبکہ امریکی سپاہی کل ۳ء۵ ملین تھے" یہ بھی امر واقعہ ہے کہ امریکہ نے جرمنی میں ۲۵۰۰۰۰ (اڑھائی لاکھ) سپاہی تعینات کر دیے تھے۔ پھر اس نے یہ بھی طے کر رکھا تھا کہ یورپ میں جنگ چھڑ جانے کی صورت میں کئی ڈویژن فوج اور فضائی اسکوڈرن بحر اوقیانوس کے اس پار روانہ کرے گا۔ جو یقیناً" اہم نوعیت کی فوجی مہم ہوتی۔ پھر یہ بات بھی واضح رہے کہ نیٹو بہ حیثیت مجموعی امریکہ کی ایٹمی قوت اور بحری طاقت پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ شمالی بحر اوقیانوس کا اتحاد "محراب" کے دو ستونوں کے درمیان خاصا متوازن ہے۔ اس کے برعکس "وارسا پیکٹ" کا پلڑا تمام تر ماسکو کی طرف جھکا ہوا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے اتحادی جو نیٹو سے وابستہ ہیں' وہ ان روسی اتحادیوں سے جو "وارسا پیکٹ" میں شامل ہیں' چھ گنا زیادہ رقم دفاع پر خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ برطانیہ' فرانس اور مغربی جرمنی علیحدہ علیحدہ جتنی رقم خرچ کرتا ہے۔ وہ "وارسا پیکٹ" میں شامل ممالک کی مجموعی رقم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

اگر ہر دو اتحادیوں کی مجموعی قوت کا جائزہ لیا جائے اور خامیوں اور خوبیوں کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو فوجی لحاظ سے دونوں میں خاصی مماثلت پائی جائے گی۔ اگر کہیں وارسا پیکٹ کے ممالک کو کچھ

نہ کچھ عددی برتری حاصل بھی ہے تو اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر ہر دو اتحادیوں کی بری فوج یکساں تعداد میں یورپ میں موجود ہے۔ پھر دونوں کی بری فوج اور محفوظ دستے کی مجموعی تعداد بھی ایک جیسی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو وارسا پیکٹ کے ۱۳۰۹ ملین فوجی' نیٹو کے ۱۰۹ ملین فوجی جوانوں سے تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں۔ پھر یہ بات بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ وارسا پیکٹ کی فوج کا زیادہ تر حصہ سرخ فوج کے تیسرے درجے کے سپاہیوں اور محفوظ دستوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ مرکزی محاذ پر نیٹو کی فوج سے کہیں زیادہ تعداد میں روسی زرہ بکتر اور موٹر۔ رائفل ڈویژن موجود ہے۔ لیکن وارسا پیکٹ کی یہ برتری بے سود ہے' اس لیے کہ جرمنی کے پراژدحام میدان جنگ میں نہایت تیزی سے جارحانہ لڑائی خاصی مشکل ہو گی اور روس کے باون ہزار بھاری بھرکم ٹینک آگے کا راستہ ہی مسدود کر دیں گے۔ چونکہ نیٹو کے پاس گولہ بارود' ایندھن اور اسلحے کا خاصا ذخیرہ موجود ہے لہٰذا یہ ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں کہیں بہتر پوزیشن میں ہے اور روس کے روایتی حملے کا تدارک کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر دو فوجی اتحاد میں سالمیت اور تعلق کے بے شمار عوامل موجود ہیں۔ یہ بات بھی ناقابل تردید ہے کہ نیٹو پیکٹ میں کئی کمزوریاں ہیں۔ ذمہ داری کے اشتراک سے لے کر نیوکلیئر میزائل داغنے تک بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے رکن ممالک میں اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ غیر جانب دار اور نیٹو کے خلاف عناصر مغربی جرمنی' برطانیہ' اسپین اور یونان کی بائیں بازو کی جماعتوں میں موجود ہیں جو گاہے بگاہے پریشانی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ اگر مستقبل میں کسی ایسے ملک کو جو وارسا پیکٹ سے وابستہ ممالک کی مغربی سرحد پر واقع ہے (خصوصی طور پر مغربی جرمنی) اسے "فن لینڈ" بنا دیا جائے۔ اس سے سوویت یونین کو فوجی اور اقتصادی دونوں لحاظ سے فائدہ پہنچے گا۔ اگر ایسی صورت حال ممکن ہوئی تو اس کا مقابلہ روس کی اس پریشان کن حالت سے نہیں کہ کیا جا سکتا جو اسے مشرقی یورپ میں اپنی سلطنت کے حفاظت درپیش ہے۔ ان باتوں کے علاوہ اور بھی حقائق ہیں جو روسی قیادت کے لیے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً" پولینڈ میں باہمی اتحاد کی مقبول عام تحریک' مشرقی جرمنی کے عوام کی بون کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کی خواہش' ہنگری میں سرمایہ دارانہ رجحان کی آبیاری' پولینڈ' رومانیہ اور مشرقی یورپ میں معاشی بحران کے اثرات وغیرہا یہ وہ معاملات نہیں ہیں جنھیں سرخ فوج کے ذریعے دبا دیا جائے۔ نہ ہی اس بات کا امکان ہے کہ "سائنسی سوشلزم" کی تازہ خوراک مشرقی یورپ والوں کی تسلی و تشفی کر دے گی۔ اگرچہ کریملن نے حال ہی میں یہ اعلان کیا ہے کہ مارکس کے اقتصادی اور سماجی نظریات میں از سر نو تبدیلی پیدا کی جائے گی اور انھیں جدید خطوط پر استوار کیا جائے گا' تاہم ایسا نظر آتا ہے کہ روس مشرقی یورپ پر اپنے کنٹرول کی گرفت ڈھیلی نہیں کر پائے گا۔ علاوہ ازیں ان سیاسی بے چینیوں اور اقتصادی پریشانیوں کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وارسا پیکٹ سے غیر رسمی افواج کے وابستہ ہونے کا کیا جواز ہے۔ مثال کے طور پر پولینڈ کی مسلح افواج سے پیکٹ کی طاقت میں کسی اضافے کا امکان نہیں لیکن اگر دوسرے انداز سے دیکھا جائے تو بات صحیح بھی ہے۔۔ جنگ کے دنوں میں پولینڈ کی فوجوں' وہاں کی سڑکوں اور ریل کی پٹڑیوں کی نگرانی کے لیے سرخ فوج کی ضرورت پڑے گی۔ اسی طرح یہ تصور کرنا خاصا مشکل ہے کہ آخر کس طرح چیکوسلوواکیہ اور ہنگری کی فوجیں ماسکو کے ایک حکم پر نیٹو کے محاذ پر حملہ آور ہو جائیں گی۔ حتیٰ کہ مشرقی جرمنی کی فوج جو

روس کی نہایت کارآمد ساتھی ہے' مغربی جرمنی پر حملہ کرنے کے حکم سے ہی چونک اٹھے گی اور اس کی کارکردگی پر مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ وارسا پیکٹ کی فوج میں زیادہ تر روسی افراد شامل ہیں (۵/۴ حصہ)۔ پھر مغرب کے ساتھ ہونے والی کسی بھی روایتی جنگ میں روسی ڈویژن ہی قیادت کرے گا۔ بایں ہمہ سرخ فوج کے سپہ سالاروں کی یہ بڑی اہم ذمہ داری ہو گی کہ وہ اس نوع کی جنگ کو نہ صرف صحیح طریقے سے لڑیں بلکہ مشرقی یورپ کے لاکھوں لاکھ سپاہیوں پر بھی نظر رکھیں' اس لیے کہ ان میں زیادہ تعداد ایسے افراد کی ہے جو نااہل بھی ہیں اور ناقابل اعتبار بھی! اگرچہ اس بات کا امکان بعید از قیاس ہے پھر بھی خدشہ ہے کہ نیٹو وارسا پیکٹ کے جارحانہ عزائم کی بیخ کنی کے لیے اس کے خلاف ایک تحریک چیکوسلوواکیہ میں چلائے۔ اس طرح سیاسی اور فوجی سطح پر انتشار پھیل جانے کا احتمال ہے۔

روس کے منصوبہ ساز ۱۹۶۰ء کے ابتدائی عشرے سے ایک نہایت اہم مسئلے سے دوچار ہیں' وہ یہ کہ نیٹو اور چین کے ساتھ کہیں ان کی وسیع پیمانے پر محاذ آرائی نہ ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ایک محاذ سے دوسرے محاذ تک فوجیوں کی منتقلی بہت مشکل ثابت ہو گی اور اگر جنگ صرف ایک محاذ پر ہوتی ہے تو اس صورت میں کریملن کے لیے اس علاقے سے فوجیوں کے بھرتی کرنے کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا جس کی سرحد پر دشمن کی طاقت ور فوج کثیر تعداد میں موجود ہے۔ لہٰذا روس کو بہ حالت مجبوری پچاس ڈویژن فوج اور تیرہ ہزار ٹینک ہر وقت تیار رکھنے ہوں گے تاکہ چین کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں یہ فوری متحرک ہو جائیں۔ اگرچہ روسی فوج چینی فوج کے مقابلے میں زیادہ جدید اور تیزی سے حرکت کرنے والی ہے' تاہم روس کی کامیابی مشکوک ہے اس لیے کہ اس کے مدمقابل چین کی فوج چار گنا زیادہ بڑی ہے۔ بہرحال ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ جنگ روایتی قسم کی ہو گی۔ لیکن روس کی اس دھمکی کے پیش نظر کہ وہ چین کو ملیامیٹ کر دے گا' یہ قیاس غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے اور اگر روس و چین کے درمیان ایٹمی جنگ چھڑ جاتی ہے تو سوویت یونین کے کرتا دھرتاؤں کو اس بات پر حیرانی ہو گی کہ ان کا ملک غیر جانب دار اور اہم مغربی ممالک کے مقابلے میں اتنے بے مایہ مقام کا حامل ہے۔ اسی طرح نیٹو کے ساتھ روایتی یا ایٹمی جنگ کرنے میں بھی ہتک کا خطرہ موجود ہے۔

اگرچہ سوویت یونین کے لیے نیٹو کے ساتھ ساتھ چین بھی تشویش کا باعث بنا ہوا ہے' لیکن پورے ایشیائی بلاک سے اسے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر جغرافیائی اور سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایشیائی علاقے میں مقبوضات حاصل کرنے کا قدیم روسی منصوبہ ترک کیا جا چکا ہے۔ پھر چین کا دوبارہ عروج ہندوستان کی آزادی اور بڑھتی ہوئی قوت جاپان کا اقتصادی استحکام۔۔۔۔ ان تمام باتوں نے انیسویں صدی کے روس کا یہ خوف زائل کر دیا ہے کہ وہ تمام براعظم پر قابض ہو جائے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان باتوں کے باوجود ماسکو چھوٹے چھوٹے فوائد حاصل کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس کی تازہ مثال افغانستان پر اس کا حملہ ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ روس نے اس خطے میں جہاں کہیں بھی محاذ آرائی کی ہے اور تشدد کا بازار گرم کیا ہے اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ سلطنت کی مزید توسیعی عزائم میں اسے فوجی اور سیاسی لحاظ سے خاصی گراں قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ ایک صدی پہلے کریملن نے نہایت

اعتماد کے ساتھ "ایشیائی مشن" پورا کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ اس کے برعکس اب صورت حال یہ ہے کہ روسی حکمران اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ مشرق وسطیٰ سے مسلم بنیاد پرست اس کی جنوبی سرحدوں کے راستے داخل ہو رہے ہیں' چین نے انھیں دھمکی دے رکھی ہے اور افغانستان' کوریا اور ویت نام کی صورت حال نہایت پیچیدہ ہے۔ سوویت یونین نے ایشیاء کے اندر اپنی ڈویژن فوج چاہے کتنی ہی تعداد میں کیوں نہ تعینات کر دی ہو' لیکن اس وسیع و عریض کرے میں ان سے حفاظتی اقدام کی توقع عبث ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ ماورائے سائبیریا کا ریلوے نظام دشمن کے راکٹی حملے کے نتیجے میں تہس نہس ہو جائے اور اس طرح مشرق بعید میں موجود روسی افواج بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔

روسی حکومت کو ملک کے تحفظ و سلامتی کے ضمن میں جو خدشات لاحق ہیں ان کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اب سمندروں اور سمندر پار ہونے والی عالمی جنگ میں روس کی اہلیت اتنی وقیع ثابت نہیں ہو گی۔ اس اظہار سے قطعاً یہ جھٹلانا مقصود نہیں ہے کہ گزشتہ ربع صدی سے "سرخ بحریہ" میں نہایت اثر انگیز توسیع ہوئی ہے۔ اس میں مختلف قسم کی آبدوزیں' سطح سمندر پر چلنے والے جنگی جہاز اور طیارہ بردار بحری جہاز شامل کیے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا رہا ہے کہ روس میں تجارتی جہاز اور مچھلیاں پکڑنے والی کشتیوں میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے۔ یہ سب کے سب بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ تاہم سوویت یونین کی بحریہ میں امریکی بحریہ کی ٹاسک فورس کی طرح حملہ آور ہونے کی صلاحیت مفقود ہے۔ علاوہ ازیں' اگر دو سپر طاقتوں کے برعکس دو اتحادی طاقتوں کی بحریہ کا موازنہ کیا جائے تو نیٹو سے وابستہ غیر امریکی بحری قوتیں خاصی ممتاز نظر آئیں گی۔

اگر چین کو الگ کر کے دیکھا جائے تو وارسا پیکٹ کے مقابلے میں مغربی اتحادیوں کے پاس دو گنا زیادہ بری طاقت اور تین گنا زیادہ بحری اور ہوائی طاقت موجود ہے۔ پھر نیٹو کے پاس سب میرینیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ جدول نمبر ۳۸ سے بخوبی ہو جائے گا۔

جدول نمبر ۳۸: نیٹو اور وارسا پیکٹ کی بحری قوت

	وارسا پیکٹ			نیٹو پیکٹ		
	غیرروسی	روسی	میزانیہ	امریکی	غیرامریکی	میزانیہ
نیوکلیئر آبدوزیں	-	۱۰۵	۱۰۵	۸۵	۱۲	۹۷
ڈیزل بردار آبدوزیں	۶	۱۶۸	۱۷۴	۵	۱۳۲	۱۳۷
اہم جنگی بحری جہاز	۳	۱۸۳	۱۸۷	۱۳۹	۲۲۷	۳۷۶
طیارہ بردار جنگی جہاز	۵۲	۷۵۵	۸۰۷	۲۲۵۰	۲۸۳	۲۵۳۳

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ وارسا پیکٹ کے زیادہ تر جنگی جہاز اور سب میرینیں بیس سال پرانی ہیں اور ان میں دشمن کی آبدوزوں کا پتہ چلانے کی صلاحیت بھی محدود ہے۔ علاوہ ازیں سرخ فوج

کے ۷۵ فی صد جوان زبردستی لشکر میں بھرتی کیے گئے ہیں جبکہ نیٹو کے فوجی طویل عسکری ملازمت کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ مستقبل میں سوویت یونین سمندروں پر کس طرح فوجی بالادستی حاصل کر سکے گا۔

اگر روسی بحریہ میں بڑے بڑے جنگی جہاز شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کھلے سمندر پر سوویت یونین ایک فصیل کھڑی کر دے تاکہ ایٹمی میزائل سے لیس سب میرینوں کو اتحادیوں کے حملے سے بچایا جا سکے اور اس نصب العین کی خاطر ان جہازوں کو خصوصی طور پر مدافعت آمیز بنایا جائے تو اس صورت میں اسے اتنی قوت حاصل ہو جائے گی کہ وہ نیٹو کے مواصلاتی نظام میں رکاوٹ پیدا کر دے۔ لیکن مغرب کے ساتھ بڑے پیمانے کی لڑائی شروع ہو جانے کے نتیجے میں روس اپنے سمندر پار پھیلے ہوئے فوجی اڈوں اور متعین فوجیوں کی بھرپور امداد کرنے سے قاصر رہے گا۔ تیسری دنیا میں روسی مداخلت کی بے حساب تشہیر کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ سمندر پار کے علاقوں میں اس کی فوج اتنی زیادہ تعینات نہیں ہے سوائے مشرقی یورپ کے بیرونی علاقوں اور افغانستان میں! البتہ ویت نام' ایتھوپیا' جنوبی یمن اور کیوبا میں اس کے فوجی اڈے ضرور قائم ہیں۔ لیکن یہ بات بھی واضح رہے کہ انھیں کثیر امدادی رقم کی ضرورت ہے اور اس معاملے میں روسی حکومت سخت جھنجلائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چین کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں ماورائے سائبیریا ریلوے کی اہمیت باقی نہ رہی ہو' لہٰذا بحر ہند کے راستے روس مشرق بعید میں اپنی مقبوضات سے مواصلاتی رابطہ قائم کرنا چاہتا ہو۔ لیکن موجودہ صورت حال کے پیش نظر یہ راستہ خاصا مخدوش نظر آتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں امریکہ' برطانیہ اور فرانس کے فوجی اڈے' عسکری دستے' بحری جہاز وغیرہ موجود ہیں' ان کے مقابلے میں روس کا اثر و رسوخ بے معنی نظر آتا ہے اور جو تھوڑی بہت پوزیشن اس نے سمندر پار کے علاقوں میں قائم کر رکھی ہے وہ مغربی ممالک کے ساتھ ہونے والی جنگ میں اتنی کارآمد ثابت نہیں ہو گی۔ اگر چین' جاپان اور بعض چھوٹے چھوٹے ممالک جو مغرب کے حامی ہیں' آپس میں متحد ہو گئے تو ایسی صورت میں منظر کچھ بھیانک ہی نظر آئے گا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر روس تیسری دنیا کے ممالک سے بے دخل ہو جاتا ہے تو اس صورت میں وہاں کی معیشت کو کوئی خاصا دھچکا نہیں لگے گا۔ اس کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کے برعکس روس نے اس خطے میں نہایت محدود سطح پر سرمایہ کاری کی ہے اور قرض دیے ہیں۔ البتہ یہ حقیقت طشت ازبام ہو جائے گی کہ وہ عالمی طاقت کے معیار پر کماحقہ پورا نہیں اترتا ہے۔

اگرچہ یہ سب عجیب و غریب باتیں سوویت یونین کے سراسر خلاف معلوم ہوتی ہیں' مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خود وہاں کے پالیسی ساز صورت حال کی پیچیدگی سے بخوبی آشنا ہیں۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ جب بھی تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں امریکہ سے بات چیت ہوتی ہے تو روس ہتھے سے اکھڑ جاتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اس کی فوجیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی افواج کے مساوی رہیں۔ وہ اپنی فوج میں زیادہ گنجائش کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ اسے چین کے حملے سے تحفظ کا مسئلہ درپیش ہے نیز اسے اپنی آٹھ ہزار میل وسیع سرحد کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ کسی بھی معقول سوچ سمجھ کے بیرونی مبصروں کے خیال میں روس

کے پاس اپنی سلامتی کو محفوظ بنانے کے لیے ویسے ہی بہت کافی فوج موجود ہے۔ ایسی صورت میں روس کے نئے نئے ہتھیار بنانے کا عزم دوسروں کی سلامتی کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ چونکہ کریملن کے ارباب بست و کشاد روایتی طور پر جنگجویانہ مزاج رکھتے ہیں اور مالیخولیا کے شکار ہیں' لہٰذا ان کے خیال میں روس کی سرحدیں محفوظ اور مستحکم نہیں۔۔۔ خصوصاً" مشرقی یورپ' مشرق وسطیٰ کی شمالی پٹی اور چین کے ساتھ ملنے والے طویل علاقوں میں! یہ عجیب بات ہے کہ اپنے اس خیال کے پیش نظر وہاں کے حکمرانوں نے بے شمار فوجی ڈویژن اور فضائی اسکوڈرن ان سرحدوں کی حفاظت کے لیے تعینات کر رکھے ہیں لیکن اس اقدام کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ اگر سوویت یونین مشرقی یورپ سے ملحقہ سرحد سے اپنی فوج واپس بلا لیتا ہے یا چینی سرحد پر تعینات فوج میں کمی کر دیتا ہے تو اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ نہ صرف مقامی طور پر اس کے مذموم اثرات رونما ہوں گے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ماسکو کی ہمت جواب دے گئی۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ جہاں ایک طرف کریملن اپنے وسیع و عریض سرحدی علاقے کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے جدوجہد جاری رکھے گا وہاں راکٹ سیارچوی ہتھیار اور خلائی تحقیق میں امریکہ سے ہمسری کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ گویا سوویت یونین یا یوں کہیے کہ مارکسی نظام کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے عالمی طاقت کے حصول میں آزمائش سے گزر رہا ہے۔۔۔۔ اور یہ عدم مساوات کو یوں بھی پسند نہیں کرتا۔

یہ عدم مساوات اسی صورت میں بہتر ہو گا اگر معیشت مستحکم ہو۔ اس طرح ہم پھر روس کے طویل المعیاد مسئلے کی جانب توجہ مبذول کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ روسی فوج کے لیے بھی اقتصادی معاملہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں ہے کہ وہ مارکسی نظریے کے حامل ہیں ان کے اسلحے اور تنخواہوں کا دارومدار بھی اسی پر ہے بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ بڑی طاقتوں کی مشترکہ جنگ کے نتائج بھی اسی پر منحصر ہوتے ہیں۔ "سوویت ملٹری انسائیکلوپیڈیا" نے ۱۹۷۹ء میں اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مشترکہ طور پر لڑی جانے والی عالمی جنگ میں اگر نیوکلیئر ہتھیار استعمال کیے گئے تو اس کا دورانیہ نہایت مختصر ہو گا" تاہم متحارب ممالک کی فوجی اور اقتصادی صلاحیتوں کے پیش نظر جنگ طویل بھی ہو سکتی ہے۔ اگر جنگ طویل ہو جاتی ہے تو اس کا لامحالہ اثر ان ممالک کی معیشت پر پڑے گا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا ماضی میں بڑی بڑی مشترکہ جنگوں کی وجہ سے ہوتا رہا ہے۔ یہ بات سوویت یونین کے لیے کسی طرح بھی باعث طمانیت نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ دنیا کی مجموعی قومی آمدنی میں اس کا حصہ محض ۱۲-۱۳ فی صد ہے۔ (اور اگر وارسا پیکٹ سے وابستہ طفیلی ریاستوں کو شامل کر لیا جائے تو ۱۷ فی صد بن جاتا ہے) اس طرح روس نہ صرف مجموعی قومی آمدنی کے لحاظ سے امریکہ اور مغربی یورپ سے بہت پیچھے ہے' بلکہ جاپان سے بھی فروتر ہے اور اگر اس کے طویل المعیاد ترقیاتی عمل کا یہی انداز رہا تو تیس سال کے اندر اندر چین بھی اس کی ہمسری کرنے لگے گا۔ اگرچہ یہ دعویٰ کچھ غیر معمولی سا محسوس ہوتا ہے تاہم اس کی صداقت کے لیے "اکانومسٹ" کا ایک معتدل تجزیہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "۱۹۱۳ء میں فی آدمی فی گھنٹہ کے حساب سے سلطنت روس کی پیداوار جاپان کے مقابلے میں ساڑھے تین گنا زیادہ تھی۔ لیکن اس نے اپنے کامل ستر سال سوشلسٹ نظریے کے تحت اس طرح گزار دیے کہ اب وہ تیزی سے روبہ زوال ہو چکا ہے۔ چنانچہ ترقی کی شرح کے لحاظ سے وہ جاپان کے چوتھائی کے برابر ہے"

سوویت یونین کی عسکری طاقت کا کوئی کیسا ہی تجزیہ کیوں نہ پیش کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اکیسویں صدی کے اوائل میں بڑے بڑے پیداوار مراکز کے مابین اس کا چوتھا یا پانچواں درجہ ہو گا۔ روسی قیادت کے لیے یہ بات یقیناً" سوہان روح ثابت ہو گی اس لیے کہ ملک کی طویل المعیاد طاقت پر مضر اثرات مرتب ہوں گے۔

ان باتوں کا یہ مطلب بھی نہیں کہ روس ختم ہونے کے قریب ہے۔ بہرصورت اسے مافوق الفطرت طاقت کا حامل ملک سمجھنا پڑے گا۔ البتہ یہ مطلب ضرور ہے کہ اس کی ترجیحات سراسر ناموزوں ہیں۔ جیسا کہ ایک روسی ماہر نے اظہار خیال کیا ہے:

> "برژنیف کی حکومت کی بنیاد دراصل بندوق' مکھن اور ترقی کے اصول و نظریے پر استوار تھی۔ یہ تا دیر قائم نہ رہ سکی' حتیٰ کہ رجائیت پسند ماحول میں بھی یہ سازگار ثابت نہ ہو سکی۔ بہرحال سوویت یونین کو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سنگین معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑے گا"

یہ توقع کی جاتی ہے کہ روسی معیشت کو فروغ دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش عمل میں آئے گی۔ لیکن یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ ماسکو کی پر جوش حکومت بھی معیشت کو فروغ دینے کے لیے "سائنسی سوشلزم" سے سراسر انحراف کر لے گی یا دفاعی اخراجات میں خاصی حد تک کمی کر دے گی۔ چونکہ یہ تمام باتیں سوویت یونین کے عزائم سے فرار کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے یہ قابل قبول نہیں ہوں گی۔ پھر فوجی طاقت کے بغیر دنیا میں روس کا بھرم ہی کیا رہ جائے گا۔ بہرحال یہ ملک اپنے وسیع و عریض عسکری نظام سے اوروں کو تو عدم تحفظ کا احساس دلاتا ہی ہے بلکہ خود اپنی معیشت کو بھی تس نس کرتا رہتا ہے۔ اس کے تذبذب کی یہ عجیب و غریب کیفیت ہے۔

بہرحال یہ بات اہل مغرب کے لیے خوش آئند نہیں۔ روس کا نہ تو یہ مزاج ہے نہ روایت کہ وہ اپنے زوال کو بخوشی قبول کر لے۔ اس تصنیف میں جن وسیع اور مختلف النسل سلطنتوں کا جائزہ لیا گیا ہے مثلاً" عثمانیہ' ہسپانیہ' نپولین' برطانیہ ان میں سے کوئی بھی اپنے بنیادی مرکز کی طرف اس وقت تک واپس نہیں لوٹی جب تک کسی بڑی طاقت کی جنگ میں اسے شکست کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ یا پھر وہ سلطنت اتنی کمزور ہو گئی کہ سیاسی لحاظ سے اس کا وجود باقی نہیں رہا۔ جو لوگ سوویت یونین کی موجودہ پریشان حالی پر بغلیں بجا رہے ہیں اور جو عنقریب اس سلطنت کو زمین بوس ہوتا ہوا دیکھنا چاہیں گے ان کی اطلاع کے لیے بڑی عرض ہے کہ اس طرح کی تبدیلی بہت بری قربانی کے بغیر عمل میں نہیں آتی اور نہ ہی پیشن گوئی کرنے کے انداز میں وقوع پذیر ہوا کرتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ : زوال کی پیچیدہ صورت حال

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی موجودہ اور آئندہ کی صورت حال کا تجزیہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ سوویت یونین کی مشکلات کو ذہن میں رکھا جائے۔ اس کی دو اہم وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو

یہ کہ جہاں عالمی طاقت میں امریکہ کی شمولیت کا زور روس کی نسبت زیادہ تیزی سے کم ہوتا رہا ہے وہاں اس کے مسائل اپنے حریف کے مقابلے میں اتنے سنگین بھی نہیں۔ علاوہ ازیں' امریکہ صنعت اور تکنیک کے شعبوں میں سوویت یونین سے کہیں زیادہ مستحکم نظر آتا ہے۔ دوسرے امریکی معاشرے میں سرکاری عدم مداخلت کا جو رجحان کارفرما ہے وہ اپنی کمزوریوں کے باوجود بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ خصوصیت ورشت رویے کے حامل ممالک میں نہیں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس خصوصی رجحان کا انحصار ایک ایسی ملکی قیادت پر منحصر ہے جو دنیا کے موجودہ حالات کو بخوبی سمجھتی ہو اور اسے امریکہ کے مضبوط اور کمزور دونوں پہلوؤں کا ادراک ہو۔ جب ہی دنیا کے لیے بدلتے ہوئے حالات سے کماحقہ مطابقت پیدا کی جا سکے گی۔

اگرچہ امریکہ اقتصادی اور عسکری لحاظ سے ایک امتیازی مقام کا حامل ہے لیکن اسے ایسی دو آزمائشوں سے صرف نظر نہیں کرنا ہو گا جو طویل اقتدار و عروج کی حامل بڑی طاقت کے لیے چیلنج بن جاتی ہیں۔ اول اسے فوجی حکمت عملی کے شعبے میں ملک کی دفاعی ضروریات اور دستیاب شدہ وسائل کے درمیان توازن برقرار رکھنا ہو گا۔ دوسرے عالمی پیداوار کے بدلتے ہوئے رجحانات کے تحت اپنی معاشی اور تکنیکی طاقت کی بنیاد کو متزلزل ہونے سے بچانا بھی ہے۔ امریکی صلاحیت کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۶۰۰ء کی سلطنت ہسپانیہ اور ۱۹۰۰ء کی سلطنت برطانیہ کی طرح اس ملک کو بھی ورثے میں متعدد نوعیت کی ذمہ داریاں ودیعت ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف کئی عشرے پہلے اس وقت ہو گیا تھا جب امریکہ اپنی سیاسی' اقتصادی اور فوجی صلاحیت کی بدولت عالمی امور پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے اسے ایسے خطرے کا احتمال ہے جسے بڑی طاقتوں کے عروج و زوال سے آشنا مورخین بخوبی جانتے ہیں۔ اسے سیدھے سادے لہجے میں "سلطنت کا بے طرح پھیلاؤ" کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال عرض مدعا یہ ہے کہ واشنگٹن کے فیصلہ سازوں کو یہ تلخ حقیقت تسلیم کر لینی چاہئے کہ آج عالمی سطح پر امریکہ کے مفادات کچھ اس طرح پھیلے ہوئے ہیں اور اس نے اس قدر وعدے وعید کر رکھے ہیں کہ ان سب کا تحفظ اس کے بس سے باہر ہے۔

ماضی میں بڑی بڑی طاقتوں نے فوجی لحاظ سے خود کو اتنا پھیلا دیا تھا کہ یہ ان سبھوں کے لیے ایک ایسا مسئلہ بن گیا جس سے وہ مسلسل دو چار ہوتی رہیں۔ امریکہ بھی ایٹمی تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ واضح رہے کہ ایٹمی طاقت نے آج دنیا میں سیاسی طاقت کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اگر بڑے پیمانے پر نیوکلیئر ہتھیار حرکت میں آ جاتے ہیں تو ایسی صورت میں امریکہ کا منظرنامہ تبدیلی سے بچ نہیں سکے گا اور حالات دگرگوں ہو جائیں گے۔ اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ دفاعی نظام اور جغرافیائی حدود اربعہ کی بدولت امریکہ کی پوزیشن دوران جنگ فرانس اور جاپان کی نسبت زیادہ محفوظ رہے گی۔ دوسری جانب ۱۹۴۵ء کے بعد ہونے والی ہتھیاروں کی دوڑ سے یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ نیوکلیئر ہتھیار جہاں مشرق و مغرب دونوں کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں وہاں اس کا استعمال اتنا ممکن بھی نظر نہیں آتا۔ شاید اسی وجہ سے بڑی طاقتیں اپنی روایتی انداز کی فوجوں پر زیادہ رقم خرچ کر رہی ہیں۔ بہرحال اگر اس بات کا امکان موجود ہے کہ بڑے بڑے ممالک کسی نہ کسی روز علاقائی سطح پر یا بڑے پیمانے پر نیوکلیئر جنگ کا آغاز کر دیتے ہیں تو اس صورت میں امریکہ کی عسکری پوزیشن ویسی ہی ہو گی جو کبھی سلطنت اسپین یا ایڈورڈ کے عہد کے برطانیہ کی تھی۔ ہر صورت میں زوال پذیر طاقت کو چاہے وہ اول درجے کی ہی کیوں نہ ہو' مصائب سے دوچار تو ہونا پڑے گا'

لیکن ملک کی سالمیت کو بہت زیادہ خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ (جہاں تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سوال ہے تو اس پر کسی حملہ آور ملک کا فتح پا لینا بہت دور کی بات ہے) البتہ یہ بات ضرور ہے کہ بیرونی دنیا میں کسی بھی ملک کے مفادات کو خطرہ درپیش ہو گا' خصوصاً" ایسی صورت میں جبکہ یہ بے پناہ وسیع و عریض ہوں۔ تب ان کی نہ کماحقہ حفاظت ہو سکتی ہے اور نہ ہی مزید خطرہ مول لیے بغیر ان سے کنارہ کشی اختیار کی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ بات کہے بغیر چارہ نہیں کہ امریکہ نے بیرونی ممالک میں جو دلچسپی لی وہ وقت کا تقاضا بھی تھا اور اس کے مساعد اسباب بھی تھے۔ اور اب بھی بعض ممالک میں امریکہ کی موجودگی کی اہمیت کالعدم نہیں ہوئی ہے۔ اس وقت دنیا کے بعض علاقوں سے جو امریکی مفادات وابستہ ہیں وہ واشنگٹن کے فیصلہ سازوں کی نظر میں کئی عشرے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اگرچہ اس بات پر بحث ہو سکتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی ذمہ داریاں اچھی خاصی ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جس کے مغرب میں مراکش ہے تو مشرق میں افغانستان! یہاں امریکی حکومت کو لاتعداد مسائل کا سامنا ہے اور بے شمار قضیوں سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔ ایک مبصر کے بقول "ان مسائل و خلفشار کی فہرست سازی سے ہی دم گھٹنے لگتا ہے۔" یہ وہ علاقہ ہے جہاں دنیا بھر سے زیادہ تیل کے ذخائر موجود ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جس پر تصرف جمانے کے لیے سوویت یونین ہمیشہ بے چین رہا ہے۔ جہاں اندرونی طور پر ایک ایسی مضبوط لابی فعال بنا دی گئی ہے جو الگ تھلگ مگر فوجی لحاظ سے اہمیت کے حامل اسرائیل کی مستقل حمایت کرنے پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ جہاں مغرب سے وابستگی رکھنے والی عرب حکومتیں مثلاً" مصر' سعودی عرب' اردن' خلیجی ریاستیں' مسلم بنیاد پرستوں کے دباؤ کا شکار ہیں۔ پھر انہیں لیبیا جیسے بیرونی ملک سے دھمکی بھی ملتی رہتی ہے۔ پھر یہی وہ علاقہ ہے جہاں کی عرب حکومتیں اپنی باہمی دشمنیوں کے باوجود فلسطین کے حوالے سے اسرائیل کی پالیسی کی سخت مخالفت کرتی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ پورا خطہ امریکہ کے لیے نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بایں ہمہ معمولی نوعیت کی پالیسی پر اسے مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ مزید برآں یہ دنیا کا وہ علاقہ ہے جہاں اکثر مقامات پر لڑائی کا بازار گرم رہتا ہے۔ آخری بات یہ کہ اس کا صرف ایک حصہ یعنی افغانستان ایسا ملک ہے جسے روس فتح کرنے کے درپے ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ مشرق وسطیٰ کو امریکہ کی مسلسل مدد کی ضرورت پڑتی رہتی ہے چاہے عسکری شکل میں ہو یا سفارت کاری کے انداز میں! تاہم ایسے حالات و واقعات بھی رونما ہوتے رہے ہیں جن کی وجہ سے امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں ایک مربوط اور طویل المیعاد پالیسی وضع کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے---- مثلاً" ۱۹۷۹ء میں ایران کا واقعہ ۱۹۸۳ء میں لبنان کا سانحہ' اسرائیل کے علم میں لائے بغیر سعودی عرب کی امداد کا معاملہ اور عربوں میں امریکہ کی عدم مقبولیت!

لاطینی امریکہ میں بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قومی مفادات کو متعدد چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اگر دنیا کے کسی بھی علاقے میں بین الاقوامی نوعیت کے قرض کا بحران پیدا ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے اعتبار کے عالمی نظام اور خصوصاً" امریکی بینکوں کو دھچکا پہنچتا ہے تو اس دگرگوں صورت حال کا آغاز اسی خطے سے ہوا کرتا ہے۔ جیساکہ سب کو معلوم ہے' لاطینی امریکہ کے اقتصادی مسائل کی وجہ سے کئی بینکوں کے قرض کی شرح میں کمی آ گئی ہے اور امریکی مصنوعات کی اس ملک میں درآمد بہت زیادہ گھٹ گئی ہے۔ مشرقی ایشیاء کی طرح اس خطے کو بھی یہ خطرہ درپیش ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ اور خوشحال ممالک کم

لاگت والی در آمد شدہ مصنوعات کے قرضہ میں اضافہ کر دیں گے اور سمندر پار ممالک کے امدادی پروگراموں
میں وہ تخفیف بھی کریں گے۔ چنانچہ یہ بات اس علاقے کے لیے باعث تشویش ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ
گذشتہ چند عشروں سے لاطینی امریکہ میں معاشی اور سماجی لحاظ سے نمایاں تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ بایں ہمہ
وہاں آبادیات کا مسئلہ دستیاب وسائل پر دباؤ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ پیدائش و موت کا یہ معاملہ اس
خطے کی قدیم اور اعتدال پسند حکومت کے لیے بھی لمحہ فکریہ بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے اور قانون
میں اصلاحات نافذ کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر تحریکیں چلائی گئیں اور "انقلاب" لانے کا عزم بھی کیا گیا۔
ازالذکر معاملہ دراصل کیوبا اور نیکاراگوا کی انتہا پسند حکومت کا شاخسانہ ہے' بہرحال ان تحریکوں کے نتیجے میں
قدامت پرستوں کے خلاف ردعمل کا اظہار ہوا ہے اور انقلابی حکومتیں اندرونی سطح پر کیمونزم کے نشانات کو
ختم کرنا ضروری قرار دے رہی ہیں۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر امریکہ سے مدد بھی مانگی جا رہی ہے۔
یہاں کے سماجی اور سیاسی دھڑے امریکہ پر اکثر و بیشتر یہ دباؤ ڈالتے رہتے ہیں کہ وہ لاطینی امریکہ میں جمہوری
حقوق میں اضافہ کرے اور مارکسزم کا بیج جڑ سے اکھاڑ دے۔ واشنگٹن پہ یہ دباؤ بھی ڈالا جاتا ہے کہ وہ یا تو
سیاسی اور معاشی ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے یہ مقاصد پورے کرے یا پھر گرینیڈا کی طرح فوجی اقدامات
کرے۔

سب سے زیادہ تشویش ناک صورت حال امریکہ کے جنوبی حصے کی ہے۔ اس کے مقابلے
میں سوویت یونین کو درپیش پولینڈ کا بحران کچھ بھی نہیں ہے۔ آج میکسیکو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے
درمیان جس قسم کے تعلقات ہیں دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ میکسیکو اقتصادی تباہی کے کنارے کھڑا
ہے۔ وہ کنگال ہو چکا ہے۔ وہ نادھندہ ہے۔ معاشی بحران کی وجہ سے ہزاروں ہزار باشندے ہر سال غیر قانونی
طور پر شمالی علاقے میں چلے جاتے ہیں۔ امریکہ کے ساتھ میکسیکو کی تجارت بہت بار آور ہوا کرتی تھی۔ لیکن
اب منشیات کے کاروبار کا ایک اہم ذریعہ بن گئی ہے۔ اس قسم کی جملہ راہداری کے لیے سرحد قابل نفوذ بنی
ہوئی ہے۔

اگر مشرقی ایشیاء کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہاں امریکہ کے مفادات کو درپیش چیلنج
ابھی خاصے فاصلے پر ہیں۔ تاہم اس وسیع و عریض علاقے کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ دنیا کی مجموعی آبادی کا بہت
بڑا حصہ وہیں رہتا ہے۔ امریکہ کی روز افزوں تجارت زیادہ تر بحرالکاہل کے علاقے میں بسنے والے ممالک کے
ساتھ ہوتی ہے۔ مستقبل کی دو عظیم عالمی طاقتیں' یعنی چین اور جاپان وہیں ہے۔ سوویت یونین بھی وہیں ہے
اور ویت نام بھی وہیں ہے۔ ایشیاء کے نئے نئے صنعتی ممالک بھی وہیں آباد ہیں اور وہ نیم جمہورتیں بھی وہیں
بستی ہیں جنہوں نے ایک طرف تو سرکاری عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام اپنا رکھا ہے اور دوسری
جانب کپڑے سے لے کر بجلی کے سامان پر مبنی امریکی مصنوعات کو کم دام پر فروخت کرتی ہیں۔ اسی ایشیاء میں
امریکہ نے اپنی فوجی ذمہ داریاں بھی پھیلا رکھی ہیں ---- سرد جنگ کی باقیات کے طور پر!

ان ذمہ داریوں کی فہرست سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس خطے سے امریکہ کے وسیع
مفادات وابستہ ہیں۔ چند سال پہلے امریکہ کے محکمہ دفاع نے مشرقی ایشیاء سے وابستہ امریکی مفادات کی ایک
مختصر روداد شائع کی تھی۔ اس میں فوجی ذمہ داریوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے:

"ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نزدیک مشرقی ایشیاء اور بحرالکاہل کے
تحفظ و سلامتی کی جو اہمیت ہے اس کا اظہار جاپان' کوریا اور فلپائن کے
ساتھ ہونے والے دو طرفہ معاہدے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ پھر منیلا کا
معاہدہ ہے جس کے تحت تھائی لینڈ ہمارا شریک کار بن گیا ہے۔ پھر ہم
نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ بھی معاہدہ کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں'
ہم نے کوریا اور جاپان میں بری اور فضائی فوج بھی تعینات کر رکھی ہے۔
نیز مغربی بحرالکاہل میں ہمارا ساتواں بحری بیڑا موجود ہے۔

مذکورہ علاقے کے دوستوں کے ساتھ مل کر ہم
مندرجہ ذیل مقاصد پورا کرنے کے آرزو مند ہیں:

☆ اپنے بحری راستے اور اس خطے سے وابستہ امریکی مفادات کا
تحفظ!

☆ معاہدے کے تحت بحرالکاہل اور مشرقی ایشیاء میں اپنی ذمہ داریاں
پوری کرنے کے لیے بھرپور صلاحیت کا استعمال!

☆ سوویت یونین' شمالی کوریا اور ویت نام کو دوسروں کے معاملات
میں مداخلت کرنے سے باز رکھنا!

☆ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ مستقل بنیاد پر فوجی تعلقات استوار
کرنا!

☆ دوست ممالک کے استحکام اور آزادی کو برقرار رکھنے میں مدد
دینا!

نہایت احتیاط سے تیار کی جانے والی اس رپورٹ کی عبارت نے بہت سے اہم نوعیت
کے سیاسی اور دفاعی معاملات کو سرے سے مخفی رکھا ہے مثلاً" تائیوان کو نظرانداز کیے بغیر عوامی جمہوریہ چین
کے ساتھ کیوں کر تعلقات استوار ہوں گے؟ دوست ممالک کے استحکام اور آزادی کو برقرار رکھنے میں کیوں
کر مدد کی جا سکے گی جبکہ امریکہ کی منڈیوں میں ان کے سامان کی ریل پیل پر ہی پابندی عائد کر دی گئی ہو؟
جاپان کے متعدد پڑوسی ممالک کو تشویش میں مبتلا کیے بغیر کس طرح اسے مغربی بحرالکاہل کے علاقے میں وسیع
پیمانے پر دفاعی اقدامات کرنے پر آمادہ کیا جا سکے گا؟ مقامی طور پر عوام کو مشتعل کیے بغیر امریکی حکومت وہاں
اپنا فوجی اڈا کس طرح برقرار رکھ سکتی ہے؟ شمالی کوریا کو مغالطے میں رکھے بغیر جنوبی کوریا میں امریکی افواج کی
تعداد کو کس طرح کم کیا جا سکے گا؟

اگر مختلف ممالک میں امریکی فوج کی تعیناتی کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو مغربی
یورپ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ بہت بڑے خطرے سے دوچار ہے' اگرچہ وہاں کا دفاع منطقی لحاظ سے

صائب نظر آتا ہے۔ امریکہ کی بری، فضائی اور بحری فوج کی اس خطے میں موجودگی فوجی نقطہ نظر سے بے جواز بھی نہیں! یہ امرواقعہ ہے کہ امریکہ کی نہایت ضروری فوج کا ۵۰۔ ۶۰ فی صد حصہ نیٹو کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ بقول نقادان کرام یہ وہ ادارہ ہے جس کی دفاعی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیگر رکن ممالک بہت کم سرمایہ صرف کرتے ہیں حالانکہ یورپ کی مجموعی آبادی اور آمدنی امریکہ سے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ اس بحث کو دھرایا جائے جو نیٹو کے ضمن میں ذمہ داریاں باہم تقسیم کرنے کے حوالے سے ہوتی رہی ہیں مثلاً" زبردستی بھرتی کیے جانے والے فوجیوں کو تنخواہ دینے کے معاملے میں فرانس اور مغربی جرمنی کو اپنے طور پر جو رقم خرچ کرنی پڑ رہی ہے یا پھر یہ مباحث از سر نو پیش کیا جائے کہ اگر مغربی جرمنی کو "مفن لینڈ" کی شکل دے دی جاتی ہے تو امریکہ کو اس کے دفاع کے لیے اب سے کہیں زیادہ رقم خرچ کرنی پڑے گی۔ اگر امریکہ کی فوجی حکمت عملی کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس خطے پر جاپان کے مقابلے میں روس کا زیادہ دباؤ رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یورپ کوئی جزیرہ نہیں ہے دوسرے اس کی سرزمین سے ملحقہ روسی سرحد پر سوویت یونین نے بڑی تعداد میں اپنی بری اور ہوائی فوج تعینات کر دی ہے۔ اس کے باوجود روس مغربی یورپ کو تہ و بالا نہیں کر سکتا۔ تاہم اس حقیقت کو بنیاد بنا کر امریکی فوج کو وہاں سے ہٹانا غیر ضروری ہو گا۔ پھر عام طور پر یہ بات بھی محسوس کی جا رہی ہے کہ اب دنیا کی صنعتی پیداوار پر سب سے زیادہ توجہ روس کے زیر اثر خطے میں دی جائے گی۔ لہٰذا پینٹاگون کے لیے یہ بات ضروری ہو گئی ہے کہ وہ مغربی یورپ کی حفاظت کرے کہ اسی میں امریکہ کی سلامتی بھی مضمر ہے۔

فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یورپ کی ذمہ داریاں قبول کرنے کا امریکی اقدام کیسا ہی منطقی کیوں نہ ہو، لیکن اس بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں کہ فوجی اور سیاسی لحاظ سے کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہیں ہو گی۔ اگرچہ نیٹو کی بدولت امریکہ اور مغربی یورپ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے ہیں، لیکن بادی النظر میں یورپی اقتصادی برادری جاپان ہی کی طرح اقتصادی شعبے میں اس کی زبردست حریف بھی ہے۔ مثلاً" زرعی پیداوار کی منڈیوں میں! اب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک طرف یورپ کی سرکاری پالیسی اس حقیقت پر بہت زور دیتی ہے کہ اس ملک کو امریکہ کی "ایٹمی چھتری" میسر ہے، لیکن دوسری جانب جب یہاں کے عوام اپنی سرزمین پر کروز میزائل، پرشنگ دوم، ٹرائیڈنٹ بردار سب میرین جیسے ایٹمی ہتھیار دیکھتے ہیں تو ان میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اگر دونوں سپرپاورز یہ طے کر لیتی ہیں کہ آئندہ عالمی جنگ برپا ہونے کی صورت میں یہ ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے سے گریز کریں گی تو اس صورت میں بھی روایتی فوج کے ذریعے مغربی یورپ کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ایک تو خرچ بہت ہی زیادہ ہو گا۔ دوسرے اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ وارسا پیکٹ سے وابستہ بری اور ہوائی فوج پر کڑی نگرانی کی جائے گی تو اس کے لیے نیٹو کی موجودہ فوجی طاقت میں اضافہ بھی تو کرنا ہو گا۔ اگر اس تناظر میں یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ یورپ سے امریکی فوج یا تو واپس بلائی جائے یا اس میں تخفیف کر دی جائے تو ہر دو صورت بہت زیادہ تشویش ناک ہو گی۔ اس اقدام کے لیے یہ جواز بھی موثر ہو گا کہ ایسا معاشی اسباب کی وجہ سے کیا جا رہا ہے یا امریکی فوج کو دنیا کے کسی اور علاقے میں تعینات کرنا ہے۔ ایسی صورت میں، جب امریکہ کی مسلح افواج کا ایک کثیر حصہ مخصوص علاقے میں تعینات ہو، عالمی نوعیت کی ایک لچک دار پالیسی وضع کرنا سخت مشکل ہے۔

یہ بات تعجب خیز نہیں کہ امریکہ کی بیرونی ذمہ داریوں اور اس کی موجودہ طاقت کے

درمیان پائے جانے والے فرق پر سب سے زیادہ تشویش خود دفاعی شعبے کے افسران کو ہے۔ اس کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ اگر جنگ چھڑ جانے کی صورت میں دفاعی طاقت کمزور پڑ گئی تو اس کا خمیازہ سب سے پہلے انہی کو بھگتنا ہو گا۔ جب کوئی نئی افتاد پیدا ہوتی ہے تو پینٹاگون کو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ "پریشان کن" جگہ سے فوج کو ہٹا کر کہیں اور لے جائے اور عالمی سطح پر کرتب دکھاتا رہے۔ اس بات پر امریکہ کے اس دفاعی شعبے نے سخت احتجاج کیا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں یہ صورت حال بہت زیادہ سنگین تھی۔ امریکہ کی اضافی فوج کو وسطی امریکہ، گرینیڈا، چاڈ اور لبنان میں تعینات کیا گیا تھا۔ اس وقت کے مسلح افواج کے سربراہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ امریکی افواج اور سرکاری حکمت عملی میں مناسب ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ویسے اس مسئلے کی نشاندہی بہت پہلے سے کی جا رہی تھی۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ امریکہ کی مسلح افواج کے متعلق انتباہ کا یہ شدید انداز اس نقشے سے بھی واضح ہوتا ہے جس میں انہیں دنیا کے مختلف خطوں میں تعینات دکھایا گیا ہے۔ بعض مورخین کے خیال میں یہ صورت حال برطانیہ عظمیٰ کے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب ایک بڑی طاقت ہونے کے ناطے اس نے تمام دنیا میں اپنے جنگی جہازوں اور محافظ دستوں کا ایک جال پھیلا دیا تھا۔

اگر دوسرے انداز سے دیکھا جائے تو اس بات کا قطعاً" امکان نہیں کہ امریکہ سمندر پار ممالک سے وابستہ اپنے تمام مفادات کی حفاظت بیک وقت کرے گا، نیز اسے اپنے متعدد اتحادیوں کی مدد کی بھی ضرورت درپیش نہیں ہو گی۔۔۔۔۔ مثلاً" مغربی یورپ میں نیٹو کے ممبران کی مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی اور بحرالکاہل کے علاقے میں جاپان، آسٹریلیا اور چین کی! پھر دفاعی لحاظ سے ان تمام علاقوں کی نوعیت بھی امریکہ کے لیے سازگار نہیں رہی ہے۔ مثلاً" جنوبی کوریا کے غیر متوقع حملے کا امکان رہا کرتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں پیکنگ کو یہ بات ناگوار گزرے گی۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ شمالی کوریا کے مقابلے میں جنوبی کوریا کی آبادی دوگنی ہو گئی ہے اور اس کی مجموعی قومی پیداوار میں چار گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح مشرق بعید میں روسی فوج کی کثرت واشنگٹن کے لیے باعث تشویش بنی ہوئی ہے۔ تاہم چین نے سوویت یونین کے بری اور بحری راستوں میں جو مزاحمتیں پیدا کر دی ہیں ان سے تھوڑا بہت توازن قائم ہو گیا ہے۔ ابھی حال میں امریکہ کے سیکرٹری دفاع نے نہایت معقول بات کہی ہے یعنی "ہم اپنی تمام ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے" لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ روس کی مخالفت میں بروئے کار آنے والے مجموعی وسائل جو امریکہ، مغربی یورپ، جاپان، چین، آسٹریلیا وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، سوویت یونین اور اس کے اتحادی ممالک کے وسائل سے بہت ہی زیادہ ہیں۔

مذکورہ تسلی بخش حقیقت کے باوجود عسکری لحاظ سے خاصا تذبذب پایا جاتا ہے۔ آج بھی اقصائے عالم میں امریکی ذمہ داریاں ویسی ہی ہیں جیسی ربع صدی پہلے تھیں، حالانکہ اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی قومی پیداوار صنعتی پیداوار فوجی اخراجات اور فوجیوں کی تعداد اب سے کہیں زیادہ تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۸۵ء میں بھی جب دوسری جنگ عظیم میں اسے فتح حاصل کیے پورے چالیس سال ہو چکے تھے اور ویت نام سے واپسی کو ایک دہائی گزر چکی تھی، اس کی ۵۲۰۰۰۰ فوج بیرون ملک تعینات تھی۔ سلطنت برطانیہ نے اپنے عروج کے زمانے میں سمندر پار جتنی فوجیں تعینات کر رکھی تھیں، امریکی فوج کی یہ تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ بہرحال مسلح افواج کے سربراہوں اور بہت سے سول ماہرین کی فکر آمیز آرا کافی نہیں ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے سے امریکہ کے دفاعی بجٹ میں سہ گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ مسلح افواج

کی تعداد بھی پانچ فیصد بڑھا دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ فرانس اور برطانیہ کے عہد عروج میں وہاں کی فوج نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ جس ملک کی سمندر پار کے علاقوں میں حد سے زیادہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں اسے افرادی قوت کے سنگین مسئلے سے دوچار بھی ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جو حکومت اپنی فوج کو ملکی دفاع تک محدود رکھتی ہے اسے ایسی مشکل پیش نہیں آیا کرتی۔ لیکن ایک ایسا معاشرہ جو سیاسی لحاظ سے آزاد خیال ہو، معاشی لحاظ سے سرکاری عدم مداخلت کا حامی بھی ہو اور اسے فوج میں زبردستی بھرتی کرنے کے نتائج معلوم ہوں، اسے اوروں سے کہیں زیادہ مسائل کا سامنا کرنا ہو گا۔

دنیا میں امریکہ کے پھیلے ہوئے مفادات اور اس کی صلاحیتوں کے درمیان جو خلا حائل ہے اس کے متعلق اتنی تشویش نہ ہوتی اگر اس نوعیت کے شبہات ظاہر نہ کیے جاتے، خصوصاً جنگ ویت نام کے زمانے سے اس کی کارکردگی کے بارے میں! چونکہ ان شبہات کا اظہار دیگر تجزیاتی مطالعہ میں بھی کیا گیا ہے، لہٰذا ان کا اجمالاً ذکر یہاں نامناسب نہیں رہے گا۔ ویسے دفاعی اصلاحات کے حساس موضوع کے متعلق اسے کوئی مضمون نہ سمجھا جائے۔ بہرحال قابل اعتراض بات یہ ہے کہ تینوں مسلح افواج کے درمیان خاصی رقابت پائی جاتی ہے۔ ویسے دنیا کی تمام مسلح افواج کے درمیان یہ بات عموماً پائی جاتی ہے، لیکن امریکہ کے عسکری نظام میں یہ چیز کچھ زیادہ ہی ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے چیئرمین کے اختیارات واجبی قسم کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی ایک وجہ ہو کہ فوج کی فراہمی پر جتنا سرمایہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اتنا عسکری نوعیت کے حساس اور اہم معاملات پر نہیں کیا جاتا۔ پھر حالت امن میں نوکر شاہی سیاست کی وجہ سے یہ تمام باتیں غت ربود ہو جاتی ہیں۔ لیکن جنگ چھڑنے کی صورت میں یا یوں کہئے کہ ایمرجنسی کے عالم میں چاروں افواج پر مشتمل ٹاسک فورس جب روانہ کی جاتی ہے، اس موقع پر رابطہ کاری کا فقدان نظر آتا ہے۔

فوج کی بھرتی کے سلسلے میں عموماً مختلف قسم کی شکایات سننے میں آتی ہیں۔ علاوہ ازیں نہایت مہنگے قسم کے مگر ناقص ہتھیاروں کی خریداری کے سلسلے میں مختلف قسم کے اسکینڈلز بھی سامنے آئے ہیں جو عوام کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ اور بھی عوامل کار فرما تھے، مثلاً بولی دینے کے سلسلے میں بولی دینے والوں میں باقاعدہ مقابلہ نہ تھا۔ فوجی صنعت میں منڈی کی قوتوں کا فقدان تھا۔ ہتھیاروں کی خریداری کے نظام میں ذاتی منفعت حاصل کرنے کا رجحان بھی تھا۔ بہرحال ان تمام نقائص کی علیحدہ علیحدہ نشان دہی مشکل نظر آتی ہے، خصوصاً نئی نئی تکنیک کی ایجاد کی وجہ سے فن حرب پر آئے دن جو اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تکنیک کے شعبے میں سوویت یونین کی کارکردگی فروتر نظر آتی ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر یہ کہا جاتا ہے کہ امریکی ہتھیار جو "کیفیت" کے لحاظ سے بدرجہا بہتر ہیں، روس کی دفاعی "کمیت" یعنی ٹینک، طیارہ وغیرہ پر بالادستی حاصل کر سکتے ہیں۔ دونوں سپرپاورز کی اسلحے کی خریداری کو کیسپر وینبرگر نے "محاذ آرائی کی حکمت عملی" قرار دیا ہے۔ بہرحال، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ریگن کی انتظامیہ نے اپنے پہلے دور میں نئے نئے جہازوں کی خریداری کے لیے جو رقم خرچ کی تھی وہ کارٹر کی حکومت کے اس نوع کے اخراجات سے ۷۵ فی صد زائد تھی، لیکن اس نے مزید ۹ جہاز بھی حاصل کیے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر میں فوجی سازوسامان کے حصول میں کس نوع کے مسائل حائل تھے۔ تکنیکی ترقی کے زیر اثر کم سے کم ہتھیار پر زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کرنے کا جو رجحان کارفرما ہے، کیا اس طرح امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے پاس نہایت اعلیٰ درجے کے اور بہت مہنگے ہوائی

طیارے اور ٹینک کافی تعداد میں موجود ہوں گے؟ کیا ان ہمیوں کی صلاحیت ماضی میں لڑی جانے والی روایتی جنگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہو چکی ہے؟ اگر بحراوقیانوس میں لڑی جانے والی تیسری جنگ میں بہت زیادہ نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کیا اس صورت میں امریکی بحریہ کے پاس دوبارہ حملے کے لیے سب میرین خاصی تعداد میں موجود ہوں گی؟ اگر نہیں تو پھر نتائج نہایت تباہ کن ہوں گے۔ اس کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ آج ہتھیاروں کا جو پیچیدہ نظام ہے اس میں مطلوبہ اسلحے اتنی جلدی فراہم نہیں کیے جا سکتے جتنی تیزی سے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر مہیا کر دیے جاتے تھے۔

امریکہ کی موثر دفاعی پالیسی وضع کرنے میں تذبذب کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس میں دو اسباب و عوامل کی وجہ سے مزید سنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلی وجہ تو میزانیاتی دباؤ ہے۔ چونکہ بیرونی حالات زیادہ سے زیادہ تشویش ناک ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا سیاسی طور پر یہ زور دیا جا رہا ہے کہ دفاعی اخراجات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے یعنی قومی پیداوار کا ۵ء۷ فی صد! دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حکومت اخراجات میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت کو پہلے ترجیح دیتی ہے۔ لیکن اگر دفاعی اخراجات میں کمی کر دی جاتی ہے یا بالکل ہی بند کر دیا جاتا ہے اور اسلحے کی قیمت جوں کی توں بڑھتی رہتی ہے تو یہ صورت حال پینٹاگون کے لیے نہایت سنگین ہو جائے گی۔

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ امریکہ جیسی سپر طاقت کو مختلف نوعیت کی فوجی منصوبہ بندی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ سے مسلح افواج کے مطالبے اور اسلحے کی ضروریات پر مختلف اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ تاریخ میں سپرپاورز کے حوالے سے ایسی مثالیں ملتی ہیں مثلاً برطانوی فوج کو بارہا یہ حکم ملتا رہا کہ وہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حملہ کرے یا بیلجیم میں بھی یہ کاروائی انجام دے۔ لیکن آج اول درجے کی طاقت کو جن ذمہ داریوں کا سامنا ہے، اس کے نتیجے میں یہی طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ اگر آج امریکہ کا نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ روسی حملے کی مدافعت کے لیے اپنی ایٹمی طاقت کو فروغ دے تو اس فیصلے کے نتیجے میں اس ملک کی رقم ایم ایکس میزائل، بی اول اور اسٹیلتھ بمبار جہاز، پرشنگ دوم، کروز میزائل اور ٹرائیڈنٹ بردار سب میرین کی خریداری پر خرچ ہوتی رہے گی اور اگر وارسا پیکٹ کے ساتھ وسیع پیمانے پر روایتی جنگ چھڑنے کے امکانات ہیں تو پھر یہی رقم کسی اور سمت میں خرچ ہونے لگے گی ـــــ یعنی فنی نوعیت کے جہاز، میدان جنگ کے مخصوص ٹینک بڑے بڑے کریئر فریگیٹ، حملہ کرنے والی سب میرین اور نقل و حمل کے ذرائع وغیرہ کے حصول پر! اس بات کا امکان ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین دونوں براہ راست تصادم سے گریز کریں گے۔ لیکن یہی دونوں تیسری دنیا میں سرگرم بھی ہو جائیں گے اور اس کے نتیجے میں اسلحے تقسیم ہونے لگیں گے۔ پھر تو ہلکے ہتھیار، ہیلی کاپٹر، ہلکے پھلکے کیریئرز اور امریکی بحریہ کی خدمات وغیرہ امریکہ میں تیار ہونے والی فہرست میں نمایاں ہوں گی۔ یہ بات واضح ہے کہ دفاعی اصلاحات کے سلسلے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے وہ دراصل اس بات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ آئندہ امریکہ جنگ لڑنے کے لیے کون سا طریقہ اپنائے گا؟ اور اگر اہل اقتدار جنگ کا غلط طریقہ استعمال کر لیں تو کیا ہو گا؟

دفاعی نظام کی کارکردگی کے متعلق ایک اہم تشویش یہ بھی پائی جاتی ہے کہ کیا موجودہ منصوبہ ساز یہ بات پسند کرتے ہیں کہ اعلیٰ قسم کی عسکری قوت برقرار رہے۔ واضح رہے کہ ایک مضبوط لابی امریکہ کی طاقت قائم رکھنے کے حق میں آواز بلند کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان اقدامات کے نتیجے میں عسکری

پالیسی میں باہمی ربط پیدا ہو جانے کا امکان ہے اور اس طرح بحری جنگ کی حکمت عملی اور مشترکہ جنگ کے طریقہ کار میں ربط و آہنگی پر حرف گیری نہیں ہو سکے گی۔ لیکن کیا اس طرح یہ ممکن ہو گا کہ امریکہ کے طویل المیعاد سیاسی' اقتصادی اور قومی مفادات بھی اس پالیسی کا حصہ بن جائیں اور اس ضمن میں نوکر شاہی کے اثرات ختم ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ایک مثال بار بار دی جاتی رہی ہے اور وہ یہ کہ عوامی سطح پر یہ مباحثہ اکثر و بیشتر ہوتا ہے کہ قومی مفادات کی خاطر امریکی حکومت کو بیرون ملک کہاں کہاں اپنی فوجیں تعینات کرنی چاہئیں۔ ساتھ ہی ساتھ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ پر یہ زور بھی دیا جاتا ہے کہ جو لوگ ان مفادات کی راہ میں مزاحم ہوں انھیں بروقت سختی سے کچل دیا جائے۔ لیکن مذکورہ شعبہ لبنان کے واقعہ کے بعد سمندر پار کے علاقوں میں مداخلت کرنے سے گریز کرتا ہے۔ تاآنکہ کوئی ایسی ایمرجنسی نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اس کے برعکس بھی مثال موجود ہے۔ پینٹاگون نے اپنے خاص اتحادی ممالک سے صلاح مشورہ کے بغیر روس کے ساتھ اسلحہ کی دوڑ میں شامل ہونے کا یک طرفہ فیصلہ کر لیا اور اس طرح اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔ نیشنل سیکورٹی کونسل کے کردار اور خصوصاً" قومی تحفظ کے مشیروں کی کارکردگی میں غیر یقینی کی سی کیفیت پائی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ کے سلسلے میں جو بھی پالیسی وضع کی گئی اس میں کسی ربط کا شائبہ نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ فلسطین کے مسئلے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا' دوسرے امریکہ نے اپنے دفاعی مفادات کی خاطر مغرب کی حمایت کرنے والی اور قدامت پسند عرب ریاستوں کو روس کے خلاف ایک زبردست مورچہ بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح اسرائیل کی پشت پناہی کرنے والی زبردست امریکی لابی حکومت کی مخالفت پر اتر آئی۔ پھر اس ملک میں معاشی ذرائع کو سفارتی مفادات کے لیے استعمال کرنے پر مختلف محکموں کے درمیان جھگڑا بھی ہوتا رہا ہے---- مثلاً" تجارتی بائیکاٹ' بیرونی ملک کو ٹیکنالوجی فراہم کرنے کی ممانعت' غیر ملکی امداد کی بندش' ہتھیاروں اور اجناس کی فروخت پر قدغن! اس اقدام کے نتیجے میں تیسری دنیا' جنوبی افریقہ' روس' پولینڈ' یورپی اقتصادی برادری کے متعلق امریکی پالیسی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ سب کچھ بغیر کسی باہمی ربط کے طے ہوتا رہا ہے اور بسا اوقات متنازعہ بھی محسوس ہوا ہے۔ کوئی بھی ذی شعور شخص یہ رائے قائم نہیں کر سکتا کہ امور خارجہ کے متعدد مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں گے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جب اندرون ملک منصوبہ سازی کے دوران بارہا اختلافات رونما ہوتے رہتے ہوں تو ایسی صورت میں امریکہ کے طویل المیعاد مفادات کا تحفظ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کو دیکھ کر منفی رجحان رکھنے والے نقاد ایسے سیاسی کلچر کے متعلق استفسار کرتے ہیں جس میں رہ کر واشنگٹن کے ارباب اختیار کوئی منصوبہ وضع کریں گے۔ یہ نہایت وسیع اور پیچیدہ معاملہ ہے جس کی وضاحت یہاں آسان نہیں! تاہم یہ تجویز دی جاتی رہی ہے کہ ایک ایسا ملک جو دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اپنی فوجی حکمت عملی میں وسیع پیمانے پر اصلاح کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اسے ایسے انتخابی نظام سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا جو ہر دو سال بعد خارجہ پالیسی وضع کرنے کے سلسلے کو ہی کالعدم قرار دے دے۔ علاوہ ازیں مختلف لابیوں' سیاسی کمیٹیوں اور دوسرے مفاد پرست گروہوں کے حد سے زیادہ دباؤ کی صورت میں بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اس لیے کہ اپنی ترجیحات کے پیش نظر یہ سب پالیسی میں کوئی تبدیلی لانے پر رضا مند نہیں ہو سکیں گے۔ نیز اہم اور پیچیدہ نوعیت کے بین الاقوامی اور عسکری معاملات کی ابلاغ عامہ کے ذریعے وضاحت بھی بے سود رہے گی' اس لیے کہ ان کے پاس ایسی چیزوں کے لیے نہ وقت ہوتا ہے اور نہ جگہ! ان کا مقصد محض روپے کمانا اور سامعین کو مسحور کرتے

رہنا ہے۔ ان کے نزدیک اطلاعات بہم پہنچانا ایک ثانوی چیز ہے۔ حقائق سے فرار اختیار کرنے والوں سے بھی جو محض امریکہ کے سوشل کلچر پر زور دیتے ہیں اور آج کی پیچیدہ دنیا اور دیگر تمدنوں اور نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہوتے' فائدہ پہنچنے کی کوئی امید نہیں! آخری بات یہ کہ دو صدی پہلے جب یہ ملک باقی دنیا سے علیحدہ تھا اس وقت قانون سازی اور فیصلہ سازی کے اختیارات میں جو تقسیم عمل میں آئی تھی اس عنصر سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ واضح رہے کہ ماضی میں ایسے چند ہی خارجہ امور ہوتے تھے جنھیں حل کرنے کے لیے اس ملک کے پاس خاصا وقت ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب جب کہ اسے سپرپاور کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے تمام خارجہ امور سے نمٹنا آسان نہیں رہا ہے۔ پھر اسے بیرونی ممالک کے حوالے سے فوری نوعیت کا فیصلہ کرنا بھی ناگزیر ہو چکا ہے۔ کوئی بھی ملک امریکہ کی طویل المیعاد اور نہایت اعلیٰ قسم کی فوجی حکمت عملی کے نفاذ میں مزاحم نہیں ہوا کرتا ہے۔ لیکن اگر ان ممالک کے مفادات کو زک پہنچے تو رد عمل ظاہر ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے امریکہ کی پالیسی کا موثر ہونا ضروری ہو گا۔

امریکہ کے عالمی مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں آخری سوال ان معاشی چیلنجوں سے متعلق ہے جن سے ملک دوچار ہے۔ یہ اتنے ہمہ گیر ہیں کہ قومی سطح کی پالیسی بنانے والوں کے لیے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔ امریکہ کی معیشت خاصی وسیع و عریض ہے۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہے کہ اس کی صورت حال کس جگہ کیسی ہے۔ تاہم گزشتہ باب میں اس موضوع کے حوالے سے جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں!

امریکہ کو درپیش چیلنجوں میں سے پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالمی پیداوار کے مقابلے میں امریکی صنعت روبہ زوال ہے۔ یہ تشویش ناک صورت حال پارچہ بافی' لوہا' فولاد' جہاز سازی اور کیمیکل کی صنعت میں ہی نہیں پائی جاتی' بلکہ روبوٹ' ہوائی جہاز' موٹر کار' مشینی اوزار اور کمپیوٹر کی صنعت بھی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ ان دونوں صورتوں کی وجہ سے خاصی مشکلات کا سامنا ہے' خصوصاً" بنیادی اور روایتی صنعت کے شعبے میں پھر اس صورت حال کی وجہ سے امریکہ اور دیگر نئے صنعتی ممالک کے درمیان اجرت کی شرح میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ اتنا سنگین نوعیت کا ہے کہ کسی موثر کاروائی کے ذریعے بھی اسے دور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو مستقبل میں تکنیک کے شعبے میں مقابلہ کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اسی کا نتیجہ اور بھی مہلک ثابت ہو گا۔ اس کی کیفیت کا کچھ اندازہ کانگریس کی ایک رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو ۱۹۸۰ء کے اواخر میں پیش کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اعلیٰ ٹیکنالوجی کے تیار مال کی تجارتی توفیر ۱۹۸۰ء میں ۲۷ ملین ڈالر تھی جو ۱۹۸۵ء میں کم ہو کر محض ۴ ملین ڈالر رہ گئی۔ پھر اس میں مزید تغیر پیدا ہوتی رہی۔

امریکہ کو درپیش دوسرا چیلنج زراعت کے شعبے سے متعلق ہے۔ یہاں توقع کے خلاف تنزل کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ صرف ایک عشرہ پہلے زرعی ماہرین اس بات کا خدشہ ظاہر کر رہے تھے کہ غذائی ضروریات اور زرعی پیداوار کا عالمی توازن بگڑ جائے گا۔ آنے والی تباہی اور قحط سالی کے تدارک کے لیے دو اقدامات کیے گئے۔ اول ۱۹۷۰ء کے عشرے سے ہی امریکہ زرعی شعبے میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانے لگا۔ اسے یہ بھی توقع تھی بیرون ملک غلے کی تجارت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا۔ دوسرے تیسری دنیا کے ممالک میں زراعت کو فروغ دینے کے لیے سائنسی بنیاد پر تحقیق ہوئی اور پیداوار کو بڑھانے کے ذرائع دریافت کیے گئے۔ یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا۔ چنانچہ وہاں کے ممالک زرعی پیداوار میں اتنے خود کفیل ہو گئے کہ غلہ باہر

پہنچ گئے۔ اس طرح وہ براہ راست امریکہ کے مسابق بن گئے۔ مذکورہ دونوں باتیں یورپی اقتصادی برادری کی صورت حال سے مختلف ہونے کے باوجود مطابقت بھی رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ برادری نہایت تیزی سے اجناس میں توفیری پیداوار کا اہم مرکز بن گئی ہے۔ اسے یہ فضیلت قیمت کے بہتر نظام کی وجہ سے بھی حاصل ہوئی ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دنیا میں غلے کی ریل پیل ہو گئی۔ اس کا لامحالہ اثر امریکہ پر پڑا۔ چنانچہ وہاں اجناس کی قیمت ارزاں ہو گئی اور اس کی برآمدات میں کمی ہونے لگی۔ اس زرعی تنزلی سے دل برداشتہ ہو کر بہت سے کسانوں نے زراعت کا پیشہ ہی ترک کر دیا۔

مذکورہ معاشی مسائل کے نتیجے میں امریکہ کے اقتصادی ماہروں' تاجروں' یونینوں' کسانوں اور کانگریس کے ممبروں میں تامینی ذہنیت پیدا ہو گئی۔ جس طرح ایڈورڈ کے دور میں برطانیہ کے اندر "تعرفہ کی اصلاحات" کے خلاف شورش برپا ہوئی تھی' اسی طرح امریکہ کے تامین پسندوں نے نامناسب غیر ملکی تجارت' امریکی منڈیوں میں سستے سامانوں کی بھرمار اور بیرونی کسانوں کو بے طرح دی جانے والی مراعات کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت تجارت کے سلسلے میں اپنی "سرکاری عدم مداخلت" کی پالیسی ترک کر دے اور تلافی کے لیے سخت قدم اٹھائے۔ ویسے لوگوں کے اعتراضات اپنی جگہ صحیح بھی تھے۔ تامین پسندی کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کی ایک نمایاں وجہ یہ بھی تھی کہ ماضی میں امریکہ کو مصنوعات میں جو فوقیت حاصل تھی وہ اب باقی نہیں رہی۔ برطانیہ کے عہد وکٹوریہ کی وسطی مدت کے باشندوں کی طرح اہل امریکہ نے بھی ۱۹۴۵ء کے بعد آزاد تجارت اور عام مسابقت کے رویے کو سراہا تھا۔ ان کی نظر میں اس اقدام کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اس طرز عمل کی وجہ سے عالمی سطح پر معیشت کو فروغ حاصل ہو گا اور خوشحالی آئے گی۔ دوسرے تامینیت کے ختم ہونے سے وہ بہت زیادہ منافع میں رہیں گے۔ چالیس سال بعد اس اعتماد کو جھٹکا لگا ہے۔ چنانچہ اب امریکہ کے کچھ باشندے ملکی منڈیوں اور دیسی صنعت کاروں کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں۔ جیسا کہ برطانیہ کے مذکورہ معاملے کے دوران ہوا تھا۔ اس نظام کی حمایت کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ تعرفہ کے اضافے سے جہاں گھریلو مصنوعات بین الاقوامی سطح پر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہیں گی وہاں بیرون ملک بھی انھیں نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مثلاً "تعرفہ کی عالمی مسابقت' امریکی برآمدات کی شرح میں کمی' بعض نئے صنعتی ممالک کی کرنسی کی تقلیل القدری اور ۱۹۳۰ء کے عشرے کے اقتصادی بحران کے اعادے کا احتمال!

امریکہ کی صنعت اور زراعت پر اثر انداز ہونے والی ان مشکلات کے علاوہ ملک کے مالیاتی نظام میں پائی جانے والی غیر یقینی کیفیت بھی ہے۔ چونکہ امریکی مصنوعات بیرون ملک مسابقت کے قابل نہیں رہیں اور زرعی پیداوار کی برآمدات میں بھی کمی آ چکی ہے' لہذا تجارت خسارے میں جا رہی ہے---- یعنی مئی ۱۹۸۶ء تک بارہ مہینے کے عرصے میں ۱۶۰ بلین ڈالر کا خسارہ ہو چکا ہے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ خلا امریکہ کی غیر مرئی آمدنی سے پر بھی نہیں ہو سکا۔ چنانچہ دنیا میں ادائیگی کے سلسلے میں امریکہ کو اپنا کثیر سرمایہ برآمد کرنا ہو گا۔ واضح رہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا لین دار ملک تھا' لیکن چند سال کے اندر اندر وہ دنیا کا بہت بڑا مقروض ملک بن گیا ہے۔

بہت سے نقادوں کے خیال میں اس پیچیدہ صورت حال کی نمایاں وجہ خود امریکی حکومت کی میزانیاتی پالیسی ہے۔ مثلاً "۱۹۶۰ء کے عشرے میں بھی واشنگٹن کے ارباب اقتدار دفاع اور سماجی بہبود کے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے خسارے کے مالیاتی نظام پر انحصار کر رہے تھے اور ٹیکس میں اضافے پر تیار نہ تھے۔ اور جب ۱۹۸۰ء کے ابتدائی عشرے میں ریگن کی حکومت نے دفاعی اخراجات پر کثیر رقم خرچ کرنے اور ٹیکس کی شرح میں ممکنہ حد تک کمی کرنے کا فیصلہ کیا اور ادھر ادھر کے سرکاری اخراجات میں کوئی خاص کٹوتی نہیں کی تو اس کے نتیجے میں میزانیاتی خسارے میں ہوش ربا اضافہ ہو گیا اور اسی طرح قرض بھی بڑھ گیا۔ اس کا اندازہ جدول نمبر ۴۳ سے بخوبی ہو جائے گا۔

جدول نمبر ۴۳: امریکہ کی میزانیاتی خسارہ قرض اور منافع

۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء

(بلین ڈالر میں)

	خسارہ	قرض	سود پر قرض
۱۹۸۰ء	۵۹٫۶	۹۱۳٫۳	۵۲٫۵
۱۹۸۴ء	۱۹۵٫۳	۱۳۸۷٫۹	۸۷٫۸
۱۹۸۵ء	۲۰۲٫۸	۱۸۲۳٫۱	۳۹

نہایت تشویش کے ساتھ یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر یہی صورت حال رہی تو ۲۰۰۰ء میں امریکی قرض کی رقم ۱۳ ٹریلین ڈالر تک جا پہنچے گی۔ یہ شرح ۱۹۸۰ء کے مقابلے میں چودہ گنا زیادہ ہو گی اور اس قرض پر جو سود ادا کیا جائے گا وہ ۱٫۵ ٹریلین ڈالر ہو گا یعنی ۱۹۸۰ء کے مقابلے میں انتیس گنا زیادہ! ممکن ہے سود کی شرح کم ہونے کی صورت میں یہ اعداد و شمار اتنے نہ رہیں تاہم بحیثیت مجموعی یہ صورت حال خاصی ناخوشگوار ہے۔ اگر اس میزانیاتی خسارے میں سالانہ سو بلین ڈالر کی کمی ہو جاتی ہے تو بھی اکیسویں صدی کے آغاز میں لیے ہوئے قرض اور اس پر سود کی ادائیگی اتنی پیچیدہ صورت اختیار کر لے گی کہ ملک کا کثیر سرمایہ اسی مد میں صرف ہو جائے گا۔ اگر تاریخی طور پر جائزہ لیا جائے کہ آخر ایسی کون سی عظیم طاقت تھی جو زمانہ امن میں بھی قرض میں ڈوبی ہوئی تھی تو اس کی واضح مثال ۱۸۷۰ء کے عشرے میں فرانس کی ملتی ہے۔ تب وہاں کے مالیاتی بحران نے سیاسی بحران کو جنم دیا تھا۔

موجودہ عالمی معیشت میں امریکہ کی تجارت اور خسارہ دونوں ایک دوسرے کا ردعمل معلوم ہوتے ہیں۔ اس کیفیت کی بہتر انداز میں توضیح یوں کی گئی ہے کہ تیار مال کی تجارت اور خدمات کے معاوضے پر صرف ہونے کی بجائے بین الاقوامی سرمایہ کہیں اور منتقل ہو چکا ہے۔ چونکہ عالمی معیشت میں ایک ربط کی کیفیت پائی جاتی ہے لہذا تجارت کے حوالے سے مصنوعات اور مالیاتی خدمات کا دائرہ پہلے کی نسبت زیادہ پھیل گیا ہے۔ دونوں ہی پر سالانہ تین ٹریلین ڈالر خرچ ہوتا ہے۔ چونکہ دنیا کے بازار زر کے ذریعہ سرمایہ بے پناہ گردش کر رہا ہے' لہذا پہلی صورت اب برقرار نہیں رہی ہے۔ تنہا لندن میں یورپی ڈالر پر مبنی بازار زر کے ذریعے پچیس فی صد عالمی تجارت روبہ کار ہو رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں جو واقعات رونما ہوئے تھے مثلاً مقررہ زر مبادلہ کی شرح کی بجائے رواں شرح کا نفاذ ان سے مذکورہ رجحان میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ پھر امریکہ کا میزانیاتی خسارہ بھی اس کو فروغ دینے کا سبب بنا تھا۔ یہاں یہ تصور کرنا خاصا مشکل نظر آتا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے ابتدائی عشرے میں بیرونی سرمایہ کی در روی کے بغیر امریکی معیشت آخر کس طرح چلتی رہی' اگرچہ اس کے نتیجے میں زرمبادلہ خرچ ہوتا رہتا اور امریکہ کی صنعتی اور زراعتی برآمدات پر مضر اثرات

مرتب ہوتے رہتے۔ یہاں نہایت اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سارا بیرونی سرمایہ واپس منگوا لیا جاتا اور اس کے نتیجے میں ڈالر کی قیمت بہت ارزاں ہو جاتی تو ملک میں کیا صورت حال پیدا ہوتی۔

مذکورہ رجحانات کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ متنبہ کرنے والے لوگ امریکی معیشت کے تاریک پہلو کو تو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کر رہے ہیں' لیکن یہ باور نہیں کرتے کہ زیادہ تر صورت حال فطری نوعیت کی ہے اور اس کا وقوع پذیر ہونا ناگزیر تھا۔ مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی حصے کے وسط میں جو زرعی زمین ہے' وہ اتنی بار آور نہیں لیکن خریدنے والوں نے مہنگے داموں اسے خریدا اور بہت زیادہ سود بھی ادا کیا۔ پھر امریکہ میں صنعت و حرفت سے متنوع ملازمتوں کی جانب رجوع کرنے کا جو رجحان ہے وہ قابل فہم ہے۔ نیز تمام ترقی یافتہ ممالک میں یہی صورت حال ہے یہ بھی واضح رہے کہ اگرچہ کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے' اس کے باوجود صنعتی پیداوار بڑھتی جا رہی ہے اور یہ بھی سراسر فطری انداز ہے اس لیے کہ دنیا مادی پیداوار کی نسبت معلوماتی پیداوار کی جانب زیادہ توجہ دے رہی ہے۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو بھی غلط قرار نہیں دیا جا سکتا کہ امریکہ کے مالیاتی ادارے دنیا کے مالیاتی ادارے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان کے دفاتر ٹوکیو' لندن اور نیویارک میں قائم ہیں۔ وہ نہ صرف وسیع پیمانے پر سرمائے کی منتقلی کا کام انجام دے رہے ہیں بلکہ منافع بھی کما رہے ہیں اور اس طرح کی خدمات کی انجام دہی سے اس ملک کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ افراط زر سے حاصل ہونے والے پیسے کے نتیجے میں ملک کا میزانیاتی خسارہ اور بڑھتا ہوا قرض اتنا سنگین نظر نہیں آتا۔ چنانچہ بعض حلقوں میں یہ توقع قائم کی جا رہی ہے کہ ملک کی معیشت خسارے کے اس بحران سے نجات پا لے گی اور سیاست دان ٹیکس میں اضافہ کر کے اور غیر ضروری اخراجات میں کٹوتی کر کے اس مالیاتی خلا کو پر کر دیں گے۔ بہرحال میزانیاتی خسارے کو جلد از جلد ختم کرنے کے نتیجے میں مالیاتی بحران پر قابو پا لیا جائے گا۔

یہ بات بھی دیکھنے میں آ رہی ہے کہ امریکہ کی معیشت میں مثبت تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ ملازمتوں اور خدمتوں کی وسعت کی وجہ سے امریکی حکومت گذشتہ عشرے سے نہایت وسیع پیمانے پر روزگار فراہم کر رہی ہے۔ یہ صورت حال زمانہ امن میں بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ روزگار کی فراہمی کا یہ انداز مغربی یورپ سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ کا محنت کش طبقہ ملازمتوں/خدمتوں کے اس سلسلے کو آسان تر بنا رہا ہے۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اعلیٰ درجے کی تکنیک کے سلسلے میں امریکہ تعاون پیش کر رہا ہے جو صرف کیلی فورنیا ہی میں نہیں بلکہ نیو انگلینڈ' ورجینیا' اریزونا اور ملک کے دیگر بہت سے حصوں میں بھی فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس طرح پیداوار کے فروغ کی توقع قائم ہو گئی ہے اور قومی دولت میں اضافہ بھی ممکن ہو چکا ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے روس پر بالادستی حاصل ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ یہ سب کچھ امریکی معیشت کا کمال ہے جو تارکین وطن کی کشش کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور ہزاروں ہزار نئے کاروبار پھلتے پھولتے نظر آ رہے ہیں۔ ملک میں آنے والے کثیر سرمائے سے مزید ترقی انجام پائے گی۔ اگر عالمی تجارت کے رجحان کے تحت غذائی اشیاء اور خام مال کی قیمت کم ہو رہی ہے تو اس سے امریکہ کی اقتصادیات کو فائدہ پہنچے گا اور وہ اس طرح کہ جہاں

پہلے تیل' فلزیات وغیرہ کی درآمدات ہوا کرتی تھیں اور اس پر بے پناہ ڈالر صرف ہوتا تھا' اب وہاں مذکورہ سستی چیزیں آیا کریں گی جاہے مخصوص صنعت کاروں اور کسانوں کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔

مذکورہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ امریکی معیشت وسیع اور متنوع ہونے کی وجہ سے ہر جگہ یکساں انداز میں فروغ نہیں پا رہی ہے۔ کہیں تو ترقی کی رفتار تیز ہے اور کہیں ست! چنانچہ اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے لیے جو بھی اقدامات کیے جاتے ہیں اور بحران کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ خام مال کی گرتی ہوئی قیمت ۱۹۸۵ء میں ڈالر کے مبادلے کی بہت اونچی شرح اور سود کی شرح میں کمی--- یہ تین ایسے عناصر ہیں جن کا لامحالہ اثر افراط زر اور کاروباری اعتبار پر پڑا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض ماہرین اقتصادیات مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔

تاہم امریکہ کی حکمت عملی اور اقتصادی بنیاد کے پیش نظر حالات بہت زیادہ خوش آئند نظر نہیں آتے۔ پہلی بات تو یہ کہ ۱۹۴۵ء سے امریکہ نے دنیا بھر کے فوجی معاملات کی جو ذمہ داری سنبھال رکھی ہے اس کی انجام دہی کے لیے اس کے پاس اب وہ صلاحیت نہیں رہی جو کئی عشرے پہلے اسے حاصل تھی۔ اس وقت دنیا کی مجموعی پیداوار میں اس کا حصہ بہت زیادہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی زراعت کسی بحران سے بے نیاز تھی۔ ادائیگی کا توازن نہایت خوش آئند تھا۔ حکومت کا بجٹ متوازن ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ اس قدر مقروض بھی نہ تھا۔ اس وسیع تناظر میں بعض سیاسی مبصرین نے موجودہ امریکہ اور ماضی کی زوال پذیر سلطنتوں کے مابین جو مماثلت پائی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے کہ آج امریکہ کے دانشور طبقے میں حزن و ملال کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ ایڈورڈ دور کے برطانیہ کی تمام سیاسی جماعتوں میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی اور جس کے نتیجے میں بہتر کارکردگی کی تحریک وجود میں آئی تھی۔ یعنی ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والوں' تاجروں اور تعلیمی شعبے سے تعلق رکھنے والوں میں اس بات پر غور و فکر کا سلسلہ شروع ہوا کہ آخر کون سے اقدامات اختیار کیے جائیں کہ دیگر ترقی یافتہ معاشروں کے مقابلے میں یہ ملک مستحکم پوزیشن حاصل کر لے۔ اس وقت یہ صورت حال تھی کہ ۱۹۰۰ء کی بڑی طاقت کاروباری اہلیت' تعلیم و تربیت' پیداواری کارکردگی' آمدنی کی سطح' زندگی کے معیار' صحت و تندرستی اور رہائش کے معاملے میں بہت پسماندہ ہو چکی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ طویل المیعاد فوجی صلاحیت بری طرح متاثر ہوئی۔ چنانچہ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں نے اصلاح احوال کے لیے مناسب اقدامات کرنے پر زور دیا۔ اس طرح کی تحریک سے یہاں وہاں اصلاحات نافذ تو ہو جاتی ہیں لیکن یہ تادیر قائم بھی نہیں رہتیں۔ ویسے مشہور ادیب جے کے چسٹرٹن نے صحیح کہا ہے کہ "عام حالات میں جسم کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی' لیکن جب کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو صحت و تندرستی کی باتیں کرنے لگتا ہے" یہی کیفیت سپر پاورز کی ہوا کرتی ہے۔ جب تک وہ مضبوط اور توانا ہے نیز اسے کسی چیلنج کا سامنا بھی نہیں تو اپنی صلاحیتوں کا کبھی جائزہ نہیں لیتی لیکن جب اس میں ذمہ داریاں پوری کرنے کی اہلیت باقی نہیں رہتی تب ہوش میں آتی ہے۔

محتاط انداز میں یہ بات کہی جائے گی کہ اگر امریکہ کی صنعتی بنیاد کمزور پڑنے لگتی ہے تو اس کے نہایت دور رس اثرات فوجی صلاحیت پر بھی مرتب ہوں گے۔ اگر بڑی طاقتوں کے درمیان ایٹمی

جنگ ہلاکت آفرینی کے خیال سے نہیں ہوتی اور روایتی انداز کی لڑائی نہایت وسیع پیمانے پر چھڑ جاتی ہے تو اس صورت میں امریکہ کی پیداواری صلاحیت پر کیا اثرات رونما ہوں گے جبکہ اس کی متعدد صنعتیں کئی برسوں سے روبہ زوال ہیں اور محنت کشوں کے لیے روزگار کا خاصا فقدان پایا جاتا ہے۔ یہاں ہیورن کی وہ بات یاد آ رہی ہے جو اس نے ۱۹۰۲ء میں برطانیہ کی صنعتی زوال کی وجہ سے ملک کی طاقت پر مرتب ہونے والے مضر اثرات کے متعلق کہی تھی:

"اگر یہ مان لیں کہ ملک کی کوئی ایسی صنعت جس پر قومی دفاع کا انحصار ہے' اسے بیرونی ممالک سے مسابقت کا خطرہ لاحق ہو تو پھر ایسی صورت میں آپ کہاں ہوں گے؟ آپ فولادی کارخانے اور بڑے پیمانے کی انجینئرنگ کے سامان کی تجارت کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتے۔ آج کے طریقہ حرب میں آپ ان چیزوں کے بغیر نہایت اعلیٰ کارکردگی کے حامل بحری جہاز بنا سکتے ہیں نہ ہی دفاعی سازوسامان!"

اس بات پر مشکل سے یقین آتا ہے کہ امریکہ کی صنعتی صلاحیت اس درجہ زوال پذیر ہو جائے گی۔ حالانکہ اس کے کارخانے ایڈورڈ کے برطانوی عہد سے کہیں وسیع و عریض ہیں۔ پھر سب سے اہم بات یہ بھی ہے کہ دفاعی نوعیت کی صنعت کو نہ صرف پینٹاگون کی پشت پناہی حاصل رہی ہے بلکہ اس کو اعلیٰ قسم کی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ بھی کر دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آئندہ خام مال پر انحصار کم ہو جائے گا۔ اسی طرح نیم موصل جو غیر ممالک میں باہم جوڑے جاتے ہیں اور پھر جہاز پر لاد کر امریکہ روانہ کیے جاتے ہیں یا کوئی اور صنعتی سامان کی ترسیل یا امریکہ کی جہاز سازی کی صنعت کا خاتمہ یا وہاں کی کانوں اور تیل کے کنوؤں کا بند ہو جانا ——— یہ تمام باتیں آئندہ سپرپاور کے درمیان ہونے والی جنگ کے لیے مضر ثابت ہوں گی۔ اگر تاریخی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو گی کہ دوران جنگ سب سے زیادہ متاثر ہونے والا شعبہ تجربہ کار کاریگروں کا ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر ہمیں حد سے زیادہ حیرانی ہوتی ہے کہ امریکہ میں یہی طبقہ بے روزگاری کا بری طرح شکار ہو رہا ہے۔

ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کا مسئلہ بھی وہاں درپیش ہے جو فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ معیشت کی غیر تسلی بخش ترقی سماجی اور سیاسی لحاظ سے بھی تشویش ناک ہے۔ بہت سے یورپی باشندوں کے لیے یہ بات باعث حیرت ہے کہ بیسویں صدی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بظاہر "طبقہ وار سیاست" سے اجتناب برتا ہے۔ اس کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ نقل مکانی کر کے آنے والوں کا تعلق ناخوشگوار ماحول سے رہا ہے۔ پھر اس وسیع و عریض ملک نے ان لوگوں کو جو اپنی معاشی پوزیشن سے محروم ہو گئے تھے یہاں آنے کی اجازت مرحمت کی۔ ساتھ ہی ساتھ محنت کش طبقے کی تنظیم کو فرانس اور برطانیہ کے مقابلے میں خاصا سخت بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان تارکین وطن نے جغرافیائی ماحول کی مطابقت اور کاروباری مواقع کی دستیابی کی وجہ سے سرکاری مداخلت سے آزاد سرمایہ دارانہ نظام کو ترقی سے ہمکنار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کسی بھی ترقی یافتہ صنعتی ملک کے برعکس امریکہ میں امیر و غریب طبقے میں آمدنی کا خاصا وسیع خلا پایا جاتا ہے اور اسی طرح ان ممالک کے مقابلے میں امریکی حکومت سماجی بہبود کے کاموں پر مجموعی قومی پیداوار کا بہت کم حصہ صرف کرتی ہے۔ البتہ جاپان اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہاں خاندان

کی بنیاد خاصی مستحکم ہے اور اسی وجہ سے غریبوں اور عمر رسیدہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ دیکھ بھال ہوتی ہے۔

اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سماجی اور اقتصادی لحاظ سے معاشرے میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود "طبقہ وار سیاست" کا نام و نشان نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے عشرے سے وہاں کی پیداوار میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے اور آبادی کا کثیر حصہ خوشحال ہے۔ بایں ہمہ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ امریکہ کی آبادی کا ایک تہائی حصہ بہت زیادہ غریب ہے اور اس کے لیے باقاعدہ ووٹر بننے کے انتظامات نہیں کیے گئے ہیں۔ امریکہ کی موجودہ اقتصادی سیاست کے پیش نظر یہ رائے قائم کر لینا مناسب نہیں ہو گا کہ ڈالر کی قلیل القدری اور ست حکومت کے اخراجات کم کر دیے جائیں گے اور طبقہ امراء سے فاضل ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً" سفید فام اور سیاہ فام باشندوں کے درمیان پیدائش کی مختلف شرح' تارکین وطن کا امنڈتا ہوا سیلاب' معیشت کی تبدیلی جس کی وجہ سے کارخانوں میں اچھی تنخواہ پانے والے لاکھوں محنت کشوں کی کمی اور دفتروں میں کم تنخواہ والی لاکھوں آسامیوں کا اضافہ! اس طرح یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ امریکہ کو درپیش بیرونی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دفاعی بجٹ میں جو اضافہ کرنا پڑ رہا ہے اور میزانیاتی خسارے کی وجہ سے سماجی بہبود کے کاموں پر ہونے والے اخراجات میں جو تخفیف کرنی پڑ رہی ہے اس سے یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں سیاسی ردعمل کا اظہار نہ ہو جائے۔ جیسا کہ زیر نظر باب میں دیگر طاقتوں کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے' دفاع' صرف اور سرمایہ کاری کے مابین پائے جانے والے سہ رخی بحران کے پیش نظر ترجیحات کا انتخاب خاصا مشکل کام ہے۔

اس صورت حال کے نتیجے میں ہمارے سامنے اقتصادی ترقی اور بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات کا باہمی ربط واضح ہو جاتا ہے۔ ویسے "دفاعی خرچ کی اقتصادیات" ایک متنازعہ قسم کا موضوع ہے۔ چنانچہ امریکہ کی وسیع و عریض اور متنوع معیشت کو ذہن میں رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس کام کے لیے حکومت کی طرف سے دیے جانے والے ٹھیکے اور اسلحے کے متعلق تحقیق کا تذکرہ اتنا آسان نہیں! لیکن ہمارے موضوع کے لیے جو چیز کارآمد ہے' وہ مقابلہ آرائی کی مختلف جہتیں ہیں۔ جیسا کہ بارہا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ اگر ہائزن آور کے دور میں مجموعی قومی پیداوار کا دس فی صد دفاعی اخراجات پر خرچ کیا گیا اور کینیڈی کے دور میں ۹ فی صد صرف ہوا تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عالمی پیداوار اور دولت میں اس وقت امریکہ کا حصہ تقریباً" دوہرا تھا۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت امریکہ کو اپنی روایتی یا اعلیٰ تکنیکی نوعیت کی صنعت میں کسی قسم کا چیلنج درپیش نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اگر فی الوقت امریکہ اپنے اہم اقتصادی حریف ملک جاپان کے کم دفاعی اخراجات کے مقابلے میں قومی پیداوار کا سات فی صد اس مد میں خرچ کرتا ہے تو اس صورت میں اول الذکر کے پاس سول نوعیت کی سرمایہ کاری کے لیے خاصا فنڈ بچ رہے گا۔ اسی طرح اگر امریکہ ترقیاتی کاموں کے لیے مختص کی جانے والی رقم کو فوجی سازوسامان کی تیاری پر خرچ کر دیتا ہے جبکہ جاپان اور مغربی جرمنی کاروباری ترقی کی جانب توجہ دیتے ہیں اور اگر پینٹاگون تمام انجینئروں اور سائنس دانوں کو اشیائے صرف تیار کرنے کی بجائے فوجی سازوسامان بنانے پر مامور کر دیتا ہے تو اس بات کا خدشہ ہے کہ عالمی مصنوعات میں امریکہ کا حصہ آہستہ کہ عالمی مصنوعات میں امریکہ کا حصہ آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جائے گا۔ پھر ان ممالک کے مقابلے میں جہاں کے انجینئر اور سائنس دان صارفین کی ضرورت کے لیے سامان تیار کر رہے ہیں اور جہاں منڈی کی طلب کو دفاعی ضروریات پر ترجیح دی جا رہی ہو' امریکی معیشت کے ترقی کرنے کی رفتار بہت مدھم ہو گی۔

یہ کہنا خاصا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب و عوامل کی وجہ سے امریکہ تذبذب کی کربناک کیفیت سے دوچار ہو جائے گا۔ مگر حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ امریکہ اس وقت دنیا میں سپرپاور کی حیثیت رکھتا ہے اور جاپان و جرمنی جیسی علاقائی طاقتوں کے مقابلے میں اس کی عسکری ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا اسے وافر تعداد میں فوجیوں کی ضرورت ہے۔ اس امریکی ضرورت کی مماثلت سلطنت چین سے ملتی جلتی ہے جسے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں بہت بڑی فوج درکار تھی۔ یا پھر عہد وکٹوریہ کے برطانیہ سے جسے دیگر ممالک کی بہ نسبت" زیادہ وسیع بحریہ کی ضرورت درپیش تھی۔ نیز اہم بات یہ بھی ہے کہ روس اقصائے عالم میں امریکی مفادات کا سب سے بڑا دشمن ہے لہٰذا وہ امریکہ پر بالادستی حاصل کرنے کی خاطر اپنی قومی پیداوار کا معتدبہ حصہ دفاع پر خرچ کر رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں امریکی حکومت کے پالیسی ساز اس فکر میں غلطاں ہیں کہ ان کا ملک روس کے ساتھ ہونے والی اسلحہ کی دوڑ میں پیچھے رہا جاتا ہے۔ ویسے یہ افراد اس بات کو بھی بخوبی محسوس کر رہے ہیں کہ اسلحے کے انبار نے روسی معیشت کو زبوں حال بھی تو بنا دیا ہے۔ پھر انھیں یہ بھی احساس ہے کہ اگر دونوں سپرپاورز اپنی قومی دولت کو اسلحے کی غیر بار آور پیداوار میں اسی طرح ضائع کرتی رہیں تو نہایت سنگین نوعیت کا یہ سوال سامنے آئے گا کہ "ان میں سے کس کی معیشت سب سے پہلے تباہ ہو جائے گی جبکہ جاپان اور چین جیسے ممالک ترقی کی حدل کی جانب بڑھتے ہی چلے جائیں گے؟" امریکہ نے اس وقت تمام روئے زمین پر پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔ ایسی صورت میں اسلحے پر کم سے کم خرچ اس کے لیے کمزوری کا سبب بن جائے گا اور وہ ہر جگہ بے وقعت ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر مختصر مدت میں زیادہ سے زیادہ تحفظ کے حصول کے لیے وسیع پیمانے پر سرمایہ لگایا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں امریکی اقتصادیات میں کاروباری مسابقت کی صلاحیت باقی نہیں رہے گی۔ پھر آگے چل کر خود ملک و قوم کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے گا۔

یہاں کچھ ایسی تاریخی مثالیں بھی ہیں جو کسی طرح سے حوصلہ افزا نظر نہیں آتیں۔ سابقہ دور میں اول درجے پر فائز ممالک بھی اسی تذبذب کا شکار تھے۔ یعنی ایک طرف تو ان کی اقتصادی حالت دگرگوں تھی اور دوسری جانب انھیں بیرونی چیلنجوں کا سامنا تھا۔ چنانچہ انھیں مجبوراً" اپنے زیادہ تر وسائل محکمہ دفاع کے لیے بروئے کار لانے پڑے۔ اس کے نتیجے میں پیداواری عمل کے لیے سرمایہ نہیں رہا، ترقی کی شرح گرتی چلی گئی، زیادہ سے زیادہ ٹیکس عائد ہوتے رہے، اشیائے ضرورت کے برعکس غیر ضروری مدوں میں رقم خرچ ہوتی رہی۔ اس طرح ان ممالک میں اتنی بھی سکت نہیں رہی کہ وہ دفاعی اخراجات کا بوجھ سہ سکیں۔ اگر تاریخ کا یہی انداز ہے تو شاہ کا یہ مقولہ دہرانا پڑے گا: "روم شکست سے دوچار ہوا۔ بابل کو زوال آیا۔ اب تیزی سے اڑنے والے کی باری ہے۔"

بہرحال عوام کے ذہنوں میں جو یہ سوال ابھر رہا ہے کہ آیا امریکہ کا وجود باقی رہے گا بھی یا نہیں؟ ـــــ تو اس کا واضح جواب ہے "نہیں"! اس کا سیدھا سادا سبب یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کا عروج تا ابد قائم نہیں رہا ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو مختلف انداز کی ترقی جو زمانہ قدیم سے پیداوار، تکنیک اور عسکری نظام میں ہوتی چلی آ رہی ہے وہ رک جاتی۔ تاریخ سے مثال دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ماضی کی ہسپانیہ اور نیدر لینڈ جیسی ممتاز طاقتوں کی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی زوال آشنا ہو جائے گا یا روم اور آسٹریا۔ ہنگری کی سلطنتوں کی طرح تتر بتر ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ ملک اتنا بڑا ہے کہ اول الذکر حالت پیدا ہونے کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور یہ اتنا یک رنگ و یکساں ہے کہ آخرالذکر سانحہ پیش نہیں آئے گا۔

حتیٰ کہ برطانیہ کی مماثلت جس کا موجودہ پولیٹیکل سائنس میں بڑا چرچا ہے، بیکار محض ہوگی اگر مختلف نوعیت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسے بادی النظر میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اپنے حدود اربعہ، آبادی اور قدرتی وسائل کی بناء پر جزائر برطانیہ کے متعلق یہ بات ذہن میں آ سکتی ہے کہ دنیا کی مجموعی دولت اور طاقت ۲ سے ۳ فی صد حصہ اس کے پاس ہو گا جبکہ بقیہ چیزیں برابر برابر ہوں گی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ بقیہ چیزیں یکساں نہیں ہیں۔ البتہ اپنے عروج کے زمانے میں برطانیہ خاصا وسیع تھا اور دنیا کی دولت و طاقت کا ۲۵ فی صد حصہ اس کے پاس ہوتا تھا۔ چونکہ پہلے جیسے حالات نہیں رہے، لہٰذا یہ ملک اپنے "قدرتی" حدود اربعہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے وسیع حدود اربعہ آبادی اور قدرتی وسائل کی بناء پر اسے دنیا کی مجموعی دولت اور طاقت کے ۱۶ یا ۱۸ فی صد حصے کا مالک ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تاریخی واقعات اور تکنیکی پیش رفت اتنی سازگار تھی کہ ۱۹۴۵ء تک یہ شرح ۴۰ فی صد سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ اور اس وقت ہمارے سامنے یہ صورت حال ہے کہ مذکورہ غیر معمولی شرح گھٹ کر قدرتی سطح پر آ گئی ہے۔ لیکن اس زوال پذیر کیفیت کی پردہ پوشی عسکری صلاحیتوں کے انبار اور امریکی سرمایہ اور کلچر کے بین الاقوامی پھیلاؤ کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ اگر مستقبل میں امریکہ دنیا کی مجموعی دولت و طاقت میں "قدرتی حصے" سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا تو بھی کثیرالمحورائی دنیا میں اپنے حدود اربعہ کی وجہ سے یہ ایک طاقت ور ملک کے درجے پر ضرور فائز رہے گا۔

آنے والے عشروں میں امریکی سیاست دانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ جائزہ لیتے رہیں کہ رجحاناتی تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ پھر معاملات اس طرح حل کرنے ہوں گے کہ امریکہ کی پوزیشن آہستہ آہستہ روبہ زوال ہو نہ کہ ایسی پالیسی سے اسے تیز تر کر دیا جائے جو قلیل المیعاد قسم کا فائدہ تو پہنچا دے لیکن آگے چل کر نقصان کا باعث بن جائے۔ اس سلسلے میں ایوان صدر سے لے کر نچلی سطح تک یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ آج کی دنیا میں پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے تکنیکی، سماجی اور اقتصادی تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ عالمی برادری آج سیاسی اور ثقافتی طور پر پہلے کی نسبت زیادہ گوناگوں نظر آتی ہے۔ اس کے مسائل کے حل کے لیے جو معمولی قسم کی امداد واشنگٹن یا ماسکو فراہم کرتا ہے، اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ معاشی اور پیداواری طاقت کا توازن ۱۹۴۵ء کی طرح امریکہ کے حسب خواہ نہیں رہا ہے۔ حتیٰ کہ فوجی شعبے میں بھی توازن کی تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں اور یہ نظام دو قطبی دنیا سے کہیں زیادہ کثیرالمحورائی دنیا کی جانب مرکوز ہو گا۔ تب، امریکہ کی معاشی اور فوجی طاقت کا مجموعہ دیگر ممالک کی نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہو گا۔ لیکن ایسا غیر متوازن بھی نہیں ہو گا جیسا دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دنوں میں تھا۔ کسنجر نے دو قطبی دنیا میں پالیسی وضع کرنے اور اس پر عمل درآمد کے جو نقصانات گنوائے ہیں اس لحاظ سے مذکورہ کیفیت اتنی بری بھی نہیں! البتہ یہ چیز بد سے بدتر ہوگی اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عالمی طاقت کے بدلتے ہوئے نظام سے روس بری طرح متاثر ہو گا۔ امریکی قیادت کے زوال کے سلسلے میں جو بحث و تمحیص ہوئی ہے اس کے پیش نظر یہ بات بار بار دہرانے کی ہے کہ جس زوال کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ جزوی ہے حتمی نہیں! ـــــ اور پھر یہ قدرتی نوعیت کا ہے۔ نیز یہ بات بھی خاطر میں رہے کہ امریکہ کے بنیادی مفادات کو خطرہ اسی وقت لاحق ہو گا جب وہ نئے عالمی نظام سے مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہے گا۔

امریکہ کو اس وقت جو متنوع صلاحیتیں حاصل ہیں ان کے پیش نظر اسے نئی مطابقت کے

لیے سفارتی اور حکمت عملی کی سطح پر پیش رفت کرنی ہوگی تاکہ والٹر لپ مین کے تاریخ قول کے مطابق وہ ملک کی ذمہ داریوں اور طاقت کے درمیان توازن پیدا کر سکے" اس وقت کوئی بھی ملک ایسا دکھائی نہیں دیتا جو امریکہ پر عائد عالمی ذمہ داریوں کو اپنے سر اسی انداز میں لے سکے جس انداز میں ۱۹۴۰ء کے عشرے کے دوران امریکہ نے برطانیہ کا بوجھ اٹھایا تھا۔ امر واقعہ یہ بھی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نہ تو اسپین کی طرح چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے اور نہ تو نیدرلینڈ جیسی صورت ہے جو فرانس اور انگلینڈ کے درمیان پس رہا تھا اور نہ ہی اس کی حالت سلطنت برطانیہ کی مانند ہے جسے ان گنت چیلنج کرنے والوں کا سامنا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ امریکہ کے اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت بری بڑی آزمائشیں ہیں، خصوصاً" اقتصادی شعبے میں! لیکن ملک کے وسائل کافی ہیں صرف انھیں مناسب طریقے سے روبہ کار لانا ہے۔ نیز امریکہ کی تنگ دامنی اور طاقت کے مواقع دونوں کا صحیح ادراک بھی کرنا ہے۔

اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو امریکہ☆ کے تذبذب کی کیفیت کوئی انوکھی نہیں! آخر دنیا میں کون سا ایسا ملک ہے جسے مناسب فوجی حکمت عملی وضع کرنے اور بندوق، مکھن اور سرمایہ کاری کے درمیان انتخاب کرنے میں دشواریاں پیش نہ آتی ہوں؟ دوسرے انداز سے نگاہ ڈالی جائے تو امریکہ کی پوزیشن خصوصی اہمیت کی حامل دکھائی دے گی۔ اپنی تمام تر اقتصادی اور فوجی تنزلی کے باوجود یہ ملک پیرے ہسر کے بقول "ہر توازن اور ہر معاملے میں اہم کردار کی حیثیت رکھتا ہے" چونکہ امریکہ کے پاس اچھی یا بری طاقت وافر انداز میں موجود ہے، مغربی اتحاد کے نظام میں اسے دھرے کی کیل کی حیثیت حاصل ہے اور موجودہ عالمی معیشت میں امتیازی کردار کا حامل ہے، لہٰذا یہ جو کچھ بھی کرتا ہے یا جو کچھ نہیں بھی کرتا ہے وہ دوسری طاقتوں کے کرنے نہ کرنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

حرف آخر

عظیم طاقتوں کے عروج و زوال کے پانچ سو سالہ دور کا جائزہ لینے کے بعد اب آخری حصے کو اختتام تک پہنچانے کا سوال ہے۔ چنانچہ مصنف خود کو ان عنوانات تک محدود رکھے گا: "متعلقہ طاقت کا دورانیہ اور جنگ" "عالمی جنگ، عوامی قرض اور طویل دورانیہ" "سلطنتوں کا حدود اربعہ اور دورانیہ" ان تمام موضوعات کے متعلق پولیٹیکل سائنس کے ماہروں کی رائے اور پھر مستقبل کے حوالے سے لائحہ عمل کی تجویز! لیکن یہ کوئی پولیٹیکل سائنس کا مقالہ نہیں ہے، اگرچہ اس مضمون سے تعلق رکھنے والے ان دانشوروں کے لیے حقائق اور وضاحتیں کافی تفصیل سے پیش کی گئی ہیں جو جنگ کے وسیع انداز اور عالمی نظام میں تبدیلی کے اثرات کی تحقیق کر رہے ہیں۔

اس حصے میں کتاب کا خلاصہ بھی پیش نہیں کیا جائے گا کہ آخر ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اس طرح کتاب کی خصوصیت جاتی رہے گی اور اس کا دیا ہوا یہ پیغام غت ربود ہو جائے گا، یعنی بین الاقوامی نظام مسلسل تبدیلی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں صرف وہی نظام شامل نہیں ہے جو سیاست دانوں کے روزمرہ کے اقدامات اور سیاسی و عسکری واقعات کے نتیجے میں بدلتا رہتا ہے بلکہ عالمی طاقت کی بنیادوں میں تغیرات کی وجہ سے بھی ظہور پذیر ہوتا ہے۔

تاہم یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ختم کرنے سے پہلے چند مشاہدات بیان کر دیے جائیں۔ اس پوری کتاب میں یہ نقطہ نظر پیش کیا جاتا رہا ہے کہ جہاں تک عالمی نظام کا تعلق ہے، دولت اور طاقت یا اقتصادی استحکام یا فوجی استحکام ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم رہے ہیں اور انھیں اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے چونکہ یہ چیزیں باہم مربوط ہیں اور دنیاوی معاشرہ تبدیلی پذیر ہے، لہٰذا بین الاقوامی نظام کبھی بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہے گا۔ چنانچہ جو سیاست دان اس کے برعکس خیال کرتے ہیں وہ نادان ہیں۔ مختلف ممالک کے درمیان فسطائی اور ساجھتی طرز کی دشمنی کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ گزشتہ پانچ سو سال کی تاریخ جو بین الاقوامی معاملات پر مبنی ہے وہ جنگ و جدال کی تاریخ بھی ہے۔ یا کم از کم جنگ کی تیاری کی روداد ہے------ بہرحال دونوں صورتوں میں وسائل صرف ہوتے رہے جو بحالت دیگر کسی "اچھے" مصرف میں بھی آ سکتے تھے------ چاہے سرکاری شعبے میں یا نجی کاروبار میں!

ہر صدی میں اقتصادی اور سائنسی لحاظ سے کیسی ہی ترقی کیوں نہ ہوئی ہو لیکن یہ موضوع بھی زیر بحث رہا ہے کہ عسکری مقاصد کے لیے قومی دولت کا آخر کس قدر حصہ مختص کیا جائے۔ یہ مسئلہ بھی زیر غور رہا ہے کہ ملک میں خوشحالی کو کس طرح فروغ دیا جائے تاکہ عام آدمیوں کو فائدہ پہنچے، دولت حاصل ہو اور معاشی استحکام سے بڑی طاقت مستحکم ہو---- یہ سب باتیں کسی ملک کے لیے یوں بھی ضروری سمجھی گئیں کہ بین الاقوامی سطح پر برپا ہونے والی جنگ میں کامیابی ان ہی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بڑی طاقتوں کے درمیان ہونے والی عظیم و طویل جنگ ملک کی مستحکم معیشت سے متاثر

ہوئے بغیر نہیں رہی ہے----- یہ تاثرات دو طریقے سے رونما ہوتے رہے ہیں۔ ایک تو جنگ کے دوران دوسرے مختلف جنگوں کے وقفے کے مابین جب ملکی معیشت کی بدلتی ہوئی صورت متحارب قوتوں پر اثر انداز ہوئی اور جس کے نتیجے میں وہ میدان جنگ میں یا تو کامیابی سے ہمکنار یا شکست سے دوچار ہوئیں۔ اس حقیقت کا اظہار ۱۵۰۰ء سے ۱۹۴۵ء تک کے عرصے میں لڑی جانے والی جنگوں سے بخوبی ہو جاتا ہے---- یعنی معیشت کی بساط پر ہی جنگ کا پانسہ پلٹتا رہا ہے۔ پھر ہر جنگ کے بعد مقبوضہ علاقوں کی وجہ سے اقتدار کا نیا نظام قائم ہوتا رہا ہے اور یہ روایت بین الاقوامی نوعیت کی رہی ہے۔ تاہم امن قائم ہو جانے کے بعد بھی مذکورہ نظام میں تبدیلی کا عمل جاری رہا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عظیم طاقتیں اب، اقتصادی ترقی کے دوش بدوش، عروج و زوال کے مراحل سے بھی گزرتی رہیں گی۔

دنیا کے فسطائی نظام میں بڑی طاقتیں جس طرح عروج و زوال سے ہمکنار ہوتی رہیں گی اس کے نتیجے میں یہ ضروری نہیں کہ محاذ آرائی بھی ہو۔ ویسے تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ عظیم طاقت کے نظام اور جنگ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جدید تجارتی نظریہ زر کے حامی اور سیاسی جغرافیہ کے ماہر میکنڈو کا خیال ہے کہ "تاریخ کی بڑی بڑی جنگیں بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ممالک کی غیر مساوی ترقی کا ہی نتیجہ رہی ہیں" لیکن کیا جنگ برپا ہونے کا یہ انداز ۱۹۴۵ء میں کالعدم ہو گیا تھا؟ ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ ایٹمی ہتھیاروں کی ایجاد اور ان کے تباہ کن اثرات کے دھڑکے نے اس جنگ کو برپا ہونے سے روک لیا جو عموماً" بڑی طاقتوں کے توازن میں تبدیلی کے باعث برپا ہوا کرتی تھی۔ البتہ چھوٹے پیمانے پر ہونے والی بالواسطہ اور "سیاسی" جنگ برقرار رہ گئی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی تباہ کاریوں کے خوف سے بڑی طاقتوں کے مابین لڑی جانے والی جنگ غیر نیوکلیرائی یعنی روایتی انداز کی ہو گی۔ اگرچہ اس بات کا احتمال ہے کہ میدان جنگ میں استعمال ہونے والے جدید اسلحہ کی وجہ سے یہ جنگ بھی سراسر خون ریز ثابت ہو گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی ان پیچیدہ سوالوں کے جواب سے آشنا نہیں! بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آج انسانیت اتنی نادان نہیں کہ وہ بڑی طاقت کی ہولناک اور مہنگی جنگ لڑنے پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن ان لوگوں کو یہ یاد دلانا ضروری ہو گا کہ اس طرح کی بات تو انیسویں صدی کے دوران بھی کہی جاتی تھی۔ پھر نارمن اینجل کی دنیا بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہو جانے والی کتاب "دی گریٹ الوزن" تو ۱۹۱۰ء میں ہی شائع ہو چکی تھی۔ اس میں یہ جملہ تحریر کیا گیا تھا کہ "جنگ فاتح اور مفتوح دونوں کے لیے اقتصادی لحاظ سے تباہ کن ثابت ہو گی" لیکن اسی زمانے میں یورپ کا جنرل اسٹاف چپکے چپکے جنگ کے منصوبے کو حتمی شکل دے رہا تھا۔

بہرکیف بڑے بڑے ممالک کے مابین چاہے ایٹمی جنگ ہو یا روایتی محاذ آرائی لیکن یہ بات طے ہے کہ طاقت کے توازن میں نہایت تیزی سے استحکام پیدا ہو رہا ہے اور یہ عمل مسلسل جاری رہے گا۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ توازن اقتصادی پیداوار اور فوجی طاقت دونوں سطح پر قائم ہو رہا ہے۔ اگر گزشتہ دو عشروں کی روایات دہرائی نہیں جاتیں (اور کیوں دہرائی جائیں؟) تو عالمی سیاست کا انداز حسب ذیل ہو گا:

اول: دنیا کے بہت سے ممالک میں طاقت کے پانچ اہم ستون سے توجہ ہٹا کر مجموعی عالمی

پیداوار اور مجموعی عالمی اخراجات برائے دفاع کے مناسب حصص کے حصول پر زور دیا جائے گا۔ لیکن یہ مرحلہ آہستہ آہستہ طے ہو گا۔ پھر یہ بات بھی طے ہے کہ مستقبل قریب میں امریکہ، روس، چین، جاپان اور یورپی اقتصادی برادری کی پنچایت میں کوئی اور ملک شریک نہیں ہو سکے گا۔

دوم: مذکورہ پانچ ممالک کے درمیان عالمی پیداوار کا توازن مختلف سمتوں میں جھک رہا ہے----- یعنی روس اور امریکہ سے دور، حتیٰ کہ یورپی اقتصادی برادری سے بھی----- چین اور جاپان کی جانب! بہرحال اسے اقتصادی لحاظ سے پانچ رخوں والا متوازن انتظام نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یورپی اقتصادی برادری دونوں پیداواری اور تجارتی لحاظ سے اتنی مستحکم نظر نہیں آتیں۔ (البتہ اول الذکر کو فوجی لحاظ سے فوقیت حاصل ہے) پھر روس اور جاپان بھی ایک دوسرے کے مماثل نہیں!☆ (البتہ آخرالذکر نہایت تیز رفتاری سے ترقی کی جانب گامزن ہے) اور عوامی جمہوریہ چین تو ابھی بہت پیچھے ہے پھر بھی بقیہ چاروں کے مقابلے میں نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

سوئم: فوجی نقطہ نظر سے دو قطبی دنیا کا وجود ہنوز برقرار ہے۔ یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین محض ایک دوسرے کو ہی نہیں بلکہ کسی بھی ملک کو تباہ و برباد کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تاہم یہ دو تطبیت ایٹمی سطح اور روایتی سطح پر ختم ہو جائے گی۔ ایٹمی سطح پر ختم ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بہت سے حالات میں اس نوع کے اسلحے کا استعمال ممکن نہیں! پھر چین، فرانس اور برطانیہ اپنے ایٹمی اسلحہ خانے میں اضافہ ہی کرتے چلے جا رہے ہیں اور روایتی سطح پر دو تطبیت کے تصور کا خاتمہ یوں ممکن ہے کہ چین اس معاملے میں بہت طاقتور بن چکا ہے۔ بایں ہمہ یہ بات بھی محسوس کی جا رہی ہے کہ مغربی جرمنی، فرانس اور (بہت ممکن ہے) برطانیہ و اٹلی کے درمیان بری، بحری اور ہوائی فوج کا تشکیل پانے والا مشترکہ منصوبہ عملی شکل اختیار کر جانے کے بعد طاقت کا بہت بڑا سرچشمہ بن جائے گا بشرطیکہ مذکورہ ممالک اس کو کامیابی سے ہمکنار کریں۔ پھر ملکی سیاست کے پیش نظر بھی ایٹمی جنگ کا احتمال نہیں! نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوامی رد عمل اپنی جگہ برقرار ہے لہٰذا دو تطبیت کے فعال ہونے کا امکان نہیں! یہاں یہ رائے قطعاً" ظاہر نہیں کی جا رہی ہے کہ جاپان ایک بڑی فوجی طاقت کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ بایں ہمہ جو لوگ عالمی سیاست میں جنگ اور تبدیلی کے انداز سے بخوبی واقف ہیں انہیں چنداں تعجب نہ ہو گا جب ایک روز جاپان اپنی اقتصادی طاقت کو فوجی طاقت میں ڈھال لینے کا فیصلہ کر لے۔

اگر واقعی جاپان ایسا فیصلہ کر لے تو اس کی تمام تر وجہ یہ ہو گی کہ وہ محض ایک "تجارتی ملک" کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھنا پسند نہیں کرے گا۔ اپنی مسلح افواج مضبوط تر بنانے کے جذبے کے پس منظر میں دراصل جاپان بین الاقوامی سطح پر وہ طاقت اور وہ اثر و رسوخ حاصل کرنے کا خواہاں ہو گا جو غیر عسکری اقدامات (یعنی تجارت) کے ذریعے ممکن نہیں! تاہم گزشتہ پانچ سو سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بین الاقوامی قسم کی دشمنی کے تحت "فوجی تحفظ" کے جو اقدامات کیے گئے وہ کبھی کافی نہیں رہے۔ اس طرح مختصر مدت میں دشمن ملک کی یا تو مزاحمت کی جا سکتی تھی یا اسے شکست سے دوچار کیا جا سکتا تھا۔ (اور یہ بات سیاسی قائدین اور عوام کے لیے باعث اطمینان تھی) لیکن اگر فتح کے نتیجے میں ملک جغرافیائی لحاظ سے وسیع ہو جاتا ہے اور لا محالہ دفاع پر قومی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ صرف ہونے لگتا ہے تو ظاہر ہے وہاں کی معیشت کمزور پڑنے لگے گی۔ پھر تو یہ حالت ہو گی کہ شہریوں کی اشیائے صرف کی نہ طلب پوری ہو گی اور نہ ہی دنیا میں امتیازی مقام حاصل ہو گا۔ بہر صورت حال سوویت یونین ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ

کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ چین اور مغربی جرمنی دونوں فوجی اخراجات میں اضافے سے گریز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ دفاعی اخراجات ترقی کے طویل المیعاد منصوبوں کو غت ربود کر دیں گے۔

بہرحال ہم اب اس چیستاں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس نے زمانہ قدیم سے فوجی ماہروں، معاشیات دانوں اور سیاسی لیڈروں کو الجھائے رکھا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں ایک بڑی طاقت کی تعریف یہ ہے کہ وہ دوسرے ملک کی بجائے خود اپنی ذمہ داریاں نبھائے اور اس کے لیے ایک مستحکم معیشت کی بنیاد ناگزیر ہے۔ لیکن لسٹ کا یہ کہنا ہے کہ "کسی صنعتی طاقت کو اول درجے کا ملک بننے کے لیے جنگ یا اس کے امکانات ناگزیر ہیں" تاہم یہ واضح رہے کہ جنگ لڑنے یا ملکی صنعت کا زیادہ حصہ غیر بار آور اسلحے کی تیاری میں خرچ کر دینے سے قومی معیشت کی بنیاد ہل کر رہ جاتی ہے۔ پھر ان ممالک کے سامنے کوئی وقعت نہیں رہتی جو اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ بار آور سرمایہ کاری میں صرف کر رہے ہیں اور اس طرح طویل المیعاد ترقی کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔

سیاسی معیشت کے تمام کلاسیکی ادیبوں نے مذکورہ حقائق کو تسلیم کیا ہے۔ ان میں آدم اسمتھ ہے جس نے دفاعی اخراجات کو کم سے کم تر رکھنے پر زور دیا ہے۔ لیکن جو لوگ اسمتھ کے نظریہ جنگ کے حامی ہیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں فوج کا جم غفیر موجود ہو۔ اگر یہ لوگ واقعی مخلص ہوتے تو انھیں یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ معاملہ انتخاب کا ہے اور انتخاب بھی نہایت سخت ترین! حقیقت تو یہ ہے کہ "نفع" اور "طاقت" دونوں کا باہمی ربط ضروری ہے۔ اسی تصور کی بناء پر سیاست دانوں کو بسا اوقات تذبذب کا شکار ہونا پڑا ہے۔ مثلاً" خطرے کے عالم میں فوجی سازوسامان کی خریداری اور پھر یہی اسلحہ بعد ازاں قومی معیشت پر بوجھ بن گیا یا ملک کے دفاعی اخراجات کو حد سے زیادہ کم رکھا گیا، جس سے دوسرے ملک کی طاقت کے سامنے مذکورہ ملک کے مفادات معرض خطر میں پڑ گئے۔

آج کے عالمی نظام میں موجود بڑی بڑی طاقتوں کو پچھلی حکومتوں کی طرح دو اہم چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اول یہ کہ ترقی کی شرح غیر تسلی بخش ہونے کے باوجود دوسری طاقتوں کے مقابلے میں زیادہ دولت مند اور مضبوط بن جانا چاہتی ہیں۔ دوسرے بیرونی ممالک میں مسابقت کی جو لہر ہے اور کبھی کبھی تشویش ناک منظر نامے ابھرتے ہیں، ان کو دیکھ کر یہ طاقتیں اس تذبذب میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ آیا فوری طور پر فوجی تحفظ کا سامان کریں یا طویل المیعاد معیشتی ترقی کی داغ بیل ڈالیں۔ اس سلسلے میں کوئی ایسا قاعدہ قانون نہیں ہے جو فیصلہ سازوں کو مناسب عملی اقدام کرنے میں رہنمائی کر سکے۔ بہرحال اگر وہ مناسب انداز میں فوجی دفاع کا اہتمام نہ کر سکے تو دشمن ملک ان کی عسکری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر حملہ آور ہو سکتا ہے اور وہ منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور اگر وہ فوجی سازوسامان کے حصول پر بے دریغ رقم خرچ کر دیتے ہیں یا فوجی طاقت کی بحالی کے لیے قومی آمدنی صرف کرتے رہتے ہیں تو گویا وہ خود پر بہت زیادہ بوجھ ڈالتے رہیں گے۔ ان کی حیثیت اس بوڑھے شخص کی سی ہو جائے گی جو اپنے قویٰ سے بڑھ کر محنت و مشقت کا کام انجام دینا چاہتا ہو۔ جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے اصول و قوانین نے اس مشکل کو کبھی آسان نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی شخص ۲۰۲۰ء میں صرف ایک لڑاکا طیارہ بنانے کے سلسلے میں امریکی ہوائی فوج کا پورا بجٹ خرچ ہونے سے روک دے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔۔ اس لیے کہ جدید ہتھیاروں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی قیمت تمام حکومتوں کے لیے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ بے چارے ٹیکس دہندہ بھی اس صف میں شامل ہیں۔

آج کی ہر بڑی طاقت امریکہ، روس، چین، جاپان اور یورپی اقتصادی برادری تذبذب کی روایتی کیفیت سے دوچار ہے۔ ہر ایک کے سامنے متعدد اور متنوع مسائل ہیں مثلاً" عروج و زوال کی فکر، پیداواری شرح کی بدلتی ہوئی کیفیت کا احساس، تکنیکی ایجاد سے متمتع ہونے کا خیال، بین الاقوامی معاملات کے تغیرات کا دھڑکا، ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی قیمت پر تشویش اور طاقت کے بدلتے ہوئے توازن کا اندیشہ! یہ وہ باتیں نہیں ہیں جن پر کوئی بھی ملک یا تنہا کوئی شخص قابو پا لے۔ یہاں بسمارک کا مشہور و معروف بیان نقل کرنا ناگزیر ہو گا:

> "یہ تمام طاقتیں وقت کے دھارے پر بہتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ تو ان سبھوں کی تخلیق ہے اور نہ ان کے ماتحت۔ یہ طاقتیں دھارے کا رخ موڑنے کی بھی سکت نہیں رکھتیں۔ البتہ ان کا جتنا تجربہ اور جتنی مہارت ہو گی اسی کے مطابق اسے کھے سکتی ہیں"

مذکورہ طاقتیں اس بحری سفر سے کس طرح نبرد آزما ہوتی ہیں اس کا تمام تر انحصار واشنگٹن، ماسکو، ٹوکیو، پیکنگ اور یورپ کے مختلف دارالسلطنتوں کی سرکاری ذہانت و بصیرت پر ہو گا۔ سطور بالا میں پیش کیے گئے تجزیے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذکورہ حکومتوں کی کیا ترجیحات ممکن ہو سکتی ہیں اور بڑی طاقت کا مجموعی نظام کس انداز میں مرتب ہو سکتا ہے۔ یہاں پھر یہ بات دہرائی جائے گی کہ وقت کے دھارے پر کامیابی سے بہنے کے لیے ان طاقتوں کو مہارت اور تجربے کی ضرورت درپیش ہو گی۔

THE GREAT BOOKS SERIES 7

THE RISE AND FALL OF THE GREAT POWERS

By: Paul Kennedy

Translated by

Dr. Mahmood-ur-Rehman

پال کینیڈی کی یہ تصنیف جدید تاریخ نویسی کا ایک بہت بڑا شاہکار ہے جو مقبول عام واقعاتی تاریخ کے انداز سے ہٹ کر تاریخی مسائل کے تجزیے اور مستقبل کے رجحانات کے جائزے پر مبنی ہے۔ اپنے چھپنے کے بعد یہ کتاب اہلِ فکر و نظر کے حلقے میں اس قدر مقبول ہوئی کہ دنیا کے اکثر ممالک میں اسے کئی بار طبع کیا گیا۔

پال کینیڈی ییل یونیورسٹی میں ۱۹۸۳ء سے تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے آکسفورڈ سے ڈی فل کی ڈگری حاصل کی تھی اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۳ء تک ایسٹ اینجیلیا یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ وہ آکسفورڈ کے تھیوڈور ہیوس ریسرچ فیلو اور پرنسٹن یونیورسٹی میں وزٹنگ فیلو بھی ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب "اکیسویں صدی کی تیاری" بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب کو دنیا کے اکثر اہلِ علم نے تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا ہے اور ان کے خیال میں ٹائن بی کے بعد یہ ایک اور شخص اُبھرا ہے جس نے جدید اور معاصر تاریخ نویسی کو اُس کے دقیق پہلوؤں اور باریک نکتوں کے حوالے سے دیکھا ہے۔ بعض عالمی رسالوں اور جریدوں نے اس کتاب کو ایک "رزمیہ" قرار دیا ہے اور بعض کے نزدیک یہ مستقبلیات کی اہم بنیاد ٹھہرتی ہے۔

BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION

Price Rs. 320/-